بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

علامہ اقبالؒ قائدِاعظمؒ

پرویزؒ ○ مودودی

اور

تحریکِ پاکستان

مؤلف

چوہدری حبیب احمد مرحوم (مؤلف تحریک پاکستان اور نیشنلسٹ علماء)

○

رفیق احمد ۹۶۸-ایف گلستان کالونی فیصل آباد

ہے کہ کوتاہی کو مانو اور غلطی تسلیم کرو لیکن یہ لوگ خدائے قدوس کے حکم کو اس صورت میں چیلنج کرتے ہیں کہ جاؤ ہم نہیں مانتے کہ ہم نے یہ غلطی اور کوتاہی کی ہے بلکہ اپنے اقدام کو درست ثابت کرنے کے لئے تاویلات کے پھندے بُنے اور بنائے جا رہے ہیں۔ ہندوستان میں مسلمانوں کا جو حشر ہے اور خصوصاً ۱۹۷۹ء میں مسلمانوں کے ساتھ بدسلوکی کی ملک گیر مہم ابھی کل ہی کی تو بات ہے جو ایسے لوگوں کی آنکھیں کھول دینے کے لئے کافی ہونی چاہئے۔

تحریک پاکستان کا ننھا مجاہد اور میراثِ پدر کا تھوڑا بہت وارث ہونے کے ناطے میرا یہ فرض ہے کہ والد محترم نے تحریک پاکستان کی جو حقیقی، واقعاتی، فکری و نظری، درست اور بیباکانہ تاریخ پیش کی ہے اسے پاکستان کے ہر اس فرد تک پہنچانے کی کوشش کروں جو اس ملک کے لئے مخلص ہے اور اس کی نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کرنا چاہتا ہے جو اس ملک کے حصول کے لئے تحریک کی درست تاریخ جاننا چاہتا ہے اور اپنی آیندہ نسلوں کو اس سے روشناس کرانے کا متمنّی ہے۔

یہ کہا جاتا ہے کہ ہم نے تحریک پاکستان اور نظریۂ پاکستان کی مخالفت نہیں کی بلکہ ہم تو اس قیادت یا قائدِ اعظمؒ کے مخالف تھے، یہ اسی طرح ہے جیسے کوئی یہ کہے کہ ہم اسلام کے خلاف تو نہیں تھے صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالف تھے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہمارے اکابرین نے جنگِ آزادی لڑی۔ تحریف و تثلیث اور غیر ملکی تسلّط سے تو نجات اور کفرو کانگرس سے موالات! اور اپنے ہی دینی بھائیوں کے خلاف جنگ! یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ان کی جنگ آزادی کن کے خلاف تھی؟ جنگِ آزادی تو کافر بھی لڑا کرتے ہیں اور ہندو کافر نے بھی لڑی تھی!

مسلمانوں کا ایک گروہ اپنے چند بزرگوں کے غلط سیاسی نظریات اور ہندو کانگرس کی ہمنوائی کے باوجود اپنی تمام قوّت ان کے دفاع میں صرف کر دیتا ہے اس بات پر فخر محسوس نہیں کرتا کہ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ[1] اور پاکستان کے پہلے مفتیٔ اعظم حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ ہمارے ہی مذہبی بزرگ تھے کہ جنہوں نے تحریک پاکستان میں حضرت قائدِ اعظمؒ اور مسلم لیگ کا بھرپور ساتھ دیا تھا۔

جن ہندوستانی مسلمانوں نے تحریکِ قیام پاکستان کی مخالفت کی ہے انہوں نے نہ تو سرسید احمد خانؒ کی آرزو کی مخالفت کی ہے، نہ حضرت علامہ اقبالؒ کی سوچ کی اور نہ ہی حضرت قائدِ اعظمؒ کے عمل کی، انہوں نے بلاواسطہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّت کی مخالفت

---

[1]: مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے حضرت قائدِ اعظمؒ کا جنازہ بھی پڑھایا تھا۔

کی ہے وہ اس طرح کہ جب مکہ کے اندر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دین کی ترویج میں دقتیں پیش آئیں اور مصائب کا سامنا کرنا پڑا تو انہوں نے مدینہ کی صورت میں ایسا گوشۂ عافیت تلاشش کیا جہاں اپنے خدا کے حکم کے مطابق زندگی گزار سکیں ۔ اسی طرح اسلامیان ہند بھی یہ چاہتے تھے کہ ان کے اکثریتی علاقے انہیں مل جائیں تو اپنے خدا کی اطاعت میں قانونِ خداوندی کے تحت زندگی بسر کرنے کے لئے کوشاں ہو سکیں ۔

تحریک قیام پاکستان کے مخالفین کو یہ مت بھولنا چاہیئے کہ پاکستان کے ایک بڑے شہر لاہور کی حالت قیام پاکستان سے پہلے کیا تھی ؟ سید اقبال حیدر زیدی کا ایک مضمون جمعہ ایڈیشن ۷ اگست ۱۹۸۱ء کے " نوائے وقت میگزین " کے صفحہ ۴۲ پر " کیا پاکستانی ناشکرے ہیں " کی مندرجہ تحریر ملاحظہ ہو ! ۔۔

" میں اعلیٰ تعلیم کیخاطر ۱۹۴۰ء میں لاہور آیا تھا یہاں آکر مجھے اولین ناکامی کسی مسلمان مالک سے ایک کمرہ برائے رہائش حاصل کرنے کے سلسلہ میں ہوئی ۔ میری پہلی رہائش ایک ہندو کا مکان اور دوسری قیامگاہ ایک کرسچین کا مکان تھا ۔ میرے پچانوے فی صد کلاس فیلو ہندو ، سکھ ، عیسائی تھے ۔ مسلمانوں کی فرسودہ قسم کی دوکانیں جہاں دن بھر رات کا گماں تھا ۔ انارکلی میں صرف چار اور مال روڈ پر آثار قدیمہ کی ہم پلہ تین تھیں لاہور کے تمام خیراتی ، تفریحی ، کاروباری مراکز کے مالکان اور منتظمین غیر مسلم تھے جن میں سکھ ، کرسچین اور پارسی بھی شامل تھے لیکن خانسامہ ۔ بیرے ، دیٹر ، بھٹیارے ، حجام وغیرہ ہوٹلوں اور ریستورانوں میں سب مسلمان تھے ۔ منڈیوں میں پانڈی ، پلے دار ، تولے ، قلی ، لکڑہارے ، مالی ، تانگہ ، یکہ اور گاڑی بان بھی مسلمان ہی تھے ۔ علیٰ ہذالقیاس مسلمان اہل حرفہ ، درزی ، موچی ، زردوزی ، ٹھٹھیار ، رفوگر ٹھیگر ، کاتب ، سنار ، لوہار ، قلعی گر ، ترکھان ، ورق کٹ ، خرادیئے ، ڈھلیئے سب غیر مسلم دوکانداروں اور کارخانہ داروں کے لئے کام کرتے تھے غیر مسلم ملکیتی سنیماؤں کے چوکیدار گیٹ کیپر آج کل کے شاہ صاحب ، مرزا صاحب ، خانصاحب ، چودھری صاحب ، بٹ صاحب میاں صاحب اور حاجی صاحب تھے ۔ لاہور کے وسیع و عریض پاور ہاؤس میکلوڈ روڈ پر صرف ایک مسلمان بطور چپڑاسی ملازم تھا جسے غیر مسلم افسران کلاہ لالہ رنگ پہنائے رکھتے تھے ۔"

ایک دفعہ حضرت علامہ اقبال ؒ نے مولینا محمد علی جوہر کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ انہیں محمد علی ؒ کی حقیقی عظمت کا اندازہ اسوقت ہوا تھا جب وہ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شرکت کے لئے لندن روانہ ہونے سے پہلے ان کے پاس لاہور آئے تھے اور دوران گفتگو انہوں نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے برملا کہا " اقبال کانگرس سے تعاون کے معاملے پر ہم غلطی پر تھے اور

ششم

آپ درست تھے[1]

دیکھا آپ نے کہ عظمت اپنی غلطی کے اعتراف میں کبھی نادم نہیں ہوتی اور جھجک محسوس نہیں کرتی:

۲۰ راگست ۱۹۸۱ء کے روزنامہ "نوائے وقت" کے صفحہ ۱۲ پر وحید عشرت صاحب کے تحریر کردہ ایک مضمون میں چنڈی گڑھ یونیورسٹی کے ایک پروفیسر ڈاکٹر راجندر سنگھ دیگیر کے الفاظ میں یوں تحریر کیا ہے کہ سکھ ایک توحیدی مذہب ہے اور سکھوں کا ہندوؤں سے کسی بھی قسم کا مذہبی اور ثقافتی ناتا نہیں بن سکتا۔ ڈاکٹر راجندر سنگھ دیگیر نے کہا کہ سکھوں کے تمام مقدس مقامات پاکستان میں ہیں اور بھارت کی نسبت سکھوں کا ذہنی مرکز پاکستان بنتا ہے جب ان سے کہا گیا کہ قیام پاکستان کے وقت سکھوں نے اس حقیقت کا احساس کیوں نہ کیا جبکہ ماسٹر تارا سنگھ کو کہا گیا تھا کہ وہ مسلم لیگ کا ساتھ دیں، انہوں نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ یہ سکھوں کی ایک ایسی تاریخی غلطی تھی جیسی تحریک پاکستان کے دیگر مخالفین نے کی تھی۔ ماسٹر تارا سنگھ کانگریس کے ہاتھوں میں کھیلتے رہے تاہم جلد ہی سنت فتح سنگھ کو سکھوں کی اس تاریخی غلطی کا احساس ہوا" صفحہ ۱۱

ایسے عناصر جو تحریک قیام پاکستان کی مخالفت کی زد میں آتے ہیں اپنی کوتاہ نظری اور گھناؤنے کردار کو نئی نسل کی معصوم نگاہوں سے اوجھل رکھنے کے لئے یہ شور بھی مچائیں گے کہ اس وقت قومی یکجہتی کی ضرورت ہے اور شاید یہ وقت تحریک پاکستان کی فکری، نظری اور درست واقعاتی تاریخ کے اجاگر کرنے کا نہیں ہے تو ان کے لیے عرض ہے کیا تحریک قیام پاکستان کے وقت آپ کے کردار نے تحریک کو نقصان پہنچانے میں کوئی کسر باقی رہنے دی تھی؟ اب قوم کی نئی پود کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ ہمارے بعض نام نہاد اکابرین کی کوتاہ نظری نے حضرت قائداعظمؒ کے مطلوبہ پاکستان کو کسقدر نقصان پہنچایا جس میں کہ مشرق میں پورا بنگال اور آسام اور مغرب میں پورا پنجاب بھی شامل تھا۔ ماضی کی کوتاہیوں کو سامنے رکھ کر کے ہی مستقبل کے لئے ایک مثبت اور مضبوط بنیاد رکھی جا سکتی ہے اور ان غلطیوں سے اجتناب کیا جا سکتا ہے جو ہمارے بعض عناصر سے سرزد ہوئیں۔

بے جا عقیدتیں مجروح ہو کر کے ہی حقیقتیں سرفراز ہوا کرتی ہیں، ابولہب نے بتوں سے بے جا عقیدت نہ چھوڑی تو فرمانِ الٰہی نازل ہوا تَبَّتْ يَدَآ اَبِىْ لَهَبٍ وَّتَبَّ[2] (ٹوٹ گئے ہاتھ ابی لہب کے، اور ٹوٹ گیا وہ آپ) اگر وہ بتوں سے بے جا عقیدت کو چھوڑ دیتا تو حقائق

---

[1] : روزنامہ نوائے وقت "لاہور" م ش کی ڈائری ص ۲ - ۲۳ دسمبر ۱۹۸۱ء [2] : بھارت

ربّانی کی حقیقتوں سے سرفراز ہو جاتا۔

پاکستان اور نظریۂ پاکستان کی مخالفت اور تخریبی ذہنی سوچ رکھنے والی موجودہ نسل پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنے زندہ وسلامت دادا یا نانا سے یہ پوچھے کہ قیام پاکستان سے پہلے اُن کا کوئی کارخانہ؟ کوئی فیکٹری؟ کوئی ریستوران؟ کوئی کاروباری، تفریحی، تعمیراتی مرکز؟ کوئی دوکان، کوٹھی یا مکان تھا؟ اگر تھا تو وہ کیسا تھا؟ یا یہ کہ حکومت کے کون سے عہدہ دار اور افسر تھے؟ اگر جواب میں چپ یا مایوسی کے سوا اور کچھ سامنے نہ آسکے تو دشمنانِ پاکستان اور ان کے منفی نظریات کی حمایت میں اپنے ہی پاؤں پر کلہاڑا چلانا کہاں کی دانشمندی ہے؟ غیر ملکی نظریات کو اپنانا نہ صرف اپنی موت کو دعوت دینا ہے بلکہ اپنی ذات کے ساتھ بھی انتہا کی بد دیانتی ہے۔

خدارا صحیح سوچنے، درست کو ماننے، غلط کو جھٹلانے کی قوّت ایمانی کے پیدا کرنے کے لئے خدائے قدوس سے دعا کیجئے کہ وہ رحم فرمائے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل اور قائدِ اعظمؒ کے ان احسانات کو مت بھولیئے کہ جن کے صلہ میں آپ آجکل کے شاہ صاحب، مرزا صاحب، ملک صاحب، خان صاحب، چودھری صاحب، بٹ صاحب، میاں صاحب، رانا صاحب راجہ صاحب، خواجہ صاحب، شیخ صاحب، انصاری صاحب اور حاجی صاحب ہیں۔ پاکستان کے لئے زندہ رہیئے اور پاکستان پر کوئی آنچ آنے سے پہلے خود کو قربان کر دیجئے یہی آپ سب کا فرضِ منصبی ہے۔

محترم پرویز صاحب کے عقائد سے تو کسی کو اختلاف ہو سکتا ہے اس بات کو جھٹلایا نہیں جا سکتا کہ وہ اقبال شناس ہیں اور اقبال قرآن شناس اور انہوں نے تحریکِ پاکستان کی بھرپور حمایت کرتے ہوئے عامۃ المسلمین کی امنگوں کی ترجمانی ہی نہیں کی بلکہ مودودی صاحب کی طرف سے تحریک پاکستان کی مخالفت کے ہر وار اور قدم کو روکا۔ انگریز تسلط کے ایک بڑے سرکاری ملازم ہوتے ہوئے بھی مسلم لیگ کے مقصد کی بھرپور علمی حمایت کی۔

نظریۂ پاکستان کی اصطلاح اور چوہدری حبیب احمد مرحوم لازم و ملزوم ہیں چوہدری صاحب نے اس کے لئے اسقدر کام کیا کہ آج پاکستان کا کونہ کونہ، قریہ قریہ اور بستی بستی اس لفظ سے آشنا ہے۔

ہشتم

چوہدری صاحب نے زندگی بھر رات دن نظریۂ پاکستان کی خدمت میں گزارا یہاں تک کہ اپنی ضروریاتِ زندگی کے لئے تگ و دو سے بھی بے نیاز رہے۔ زندگی کی آخری شب اپنی کتاب کے آخری باب کی غلطیاں درست کروانے کے لئے کاتب کی تحریر کردہ کاپی کاتب کو دے کر آئے اور اس کی درستگی کے بعد صبح ہی واپس لانے کو کہا۔ کاتب کا بیٹا اگلی صبح سات بجے کے قریب کاپی لایا تو اس وقت چوہدری صاحب اس جہانِ فانی سے عالمِ بقا کو کوچ کر چکے تھے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ ان کے احباب اور میرے احساس نے یہ ضروری جانا کہ ان کے مختصر حالاتِ زندگی، نظریۂ پاکستان اور اقبال شناسی کے لئے تگ و دو اور ان کے متعلق بعض بزرگوں کے تاثرات شامل کر دیئے جائیں تاکہ اس طرح پاکستان کے صفِ اوّل کے مجاہد اور کارکن کو پاکستان کے لئے وقف زندگی پر خراجِ تحسین پیش کیا جا سکے۔

رفیق احمد

۷ر دسمبر ۱۹۸۱ء

دو قابلِ احترام جھنڈے
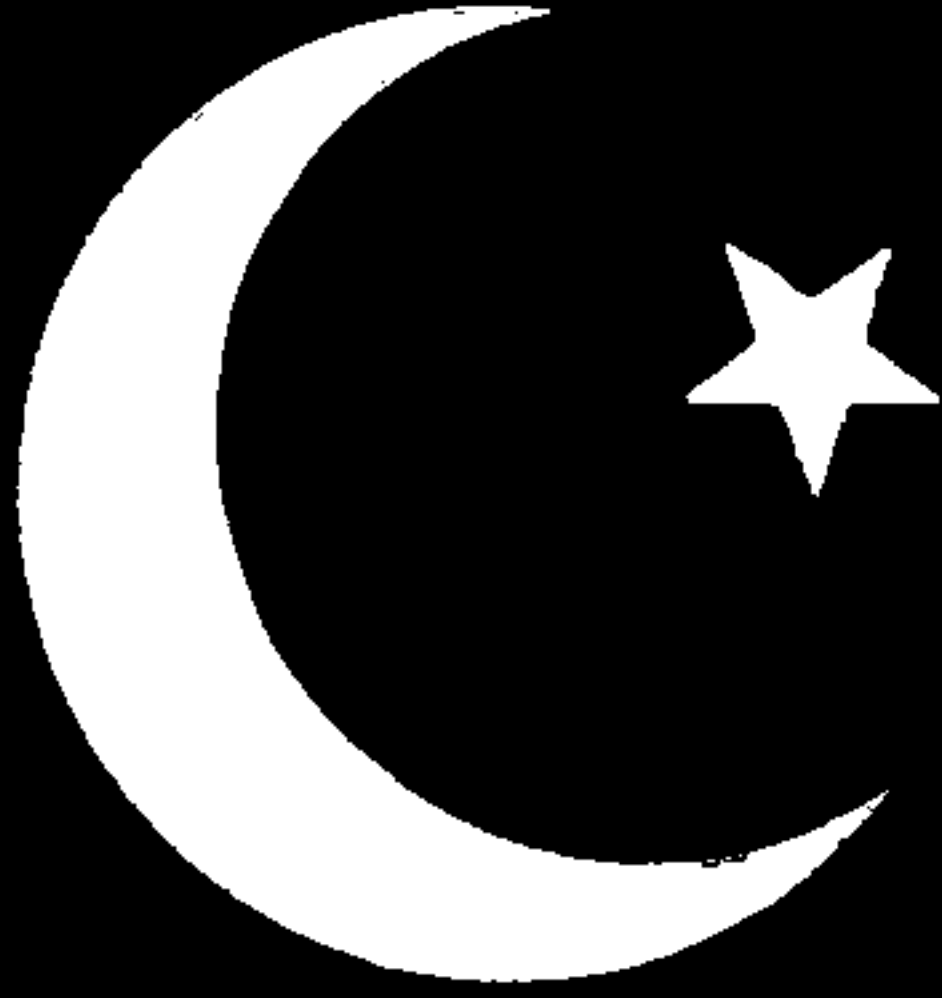
یہ وہ جھنڈا ہے جس نے پاکستان بنایا اور
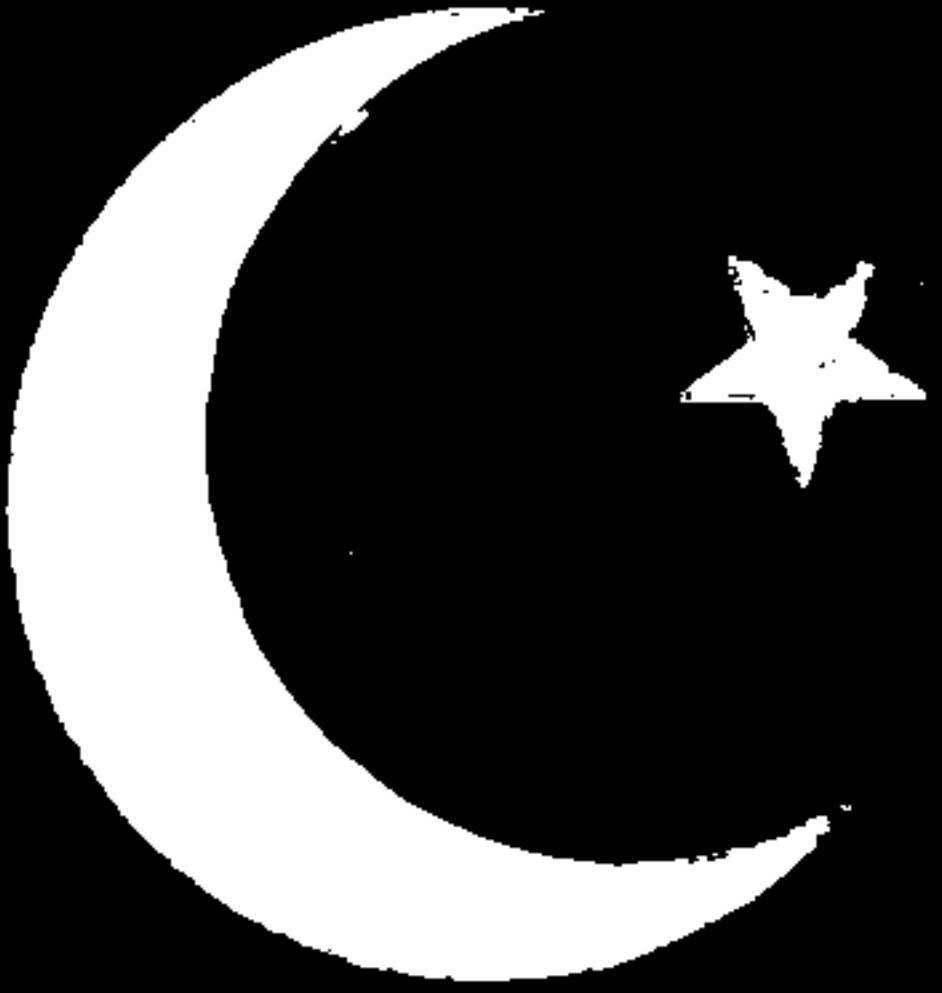
یہ وہ جھنڈا ہے جسے پاکستان نے بنایا

فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

ناظرین کرام! مؤرخ کوئی سٹوری۔ کوئی داستان اور کوئی سرگزشت یونہی بیان نہیں کرتا۔ وہ قوموں کی سرگزشتیں بیان کرے یا اقوام کی داستانیں، ان میں ایک اصولی بات ہوتی ہے۔ تاریخ کسی کے ذاتی خیالات کا آئینہ نہیں ہوتی وہ ٹھوس واقعات کا مجموعہ ہوتی ہے۔ تاریخ کی گزرگاہوں میں کچھ ایسے موڑ بھی آتے ہیں جہاں مورخ کو دشوار گزار مرحلوں، عوم شکن منزلوں اور نہایت حوصلہ سوز مقامات سے گزر کر تاریخی شہادات کو نہایت جرأت و بے باکی سے سامنے لانیکا فرض ادا کرنا پڑتا ہے۔ قوموں کی تاریخ، کیسے کیسے پُرخطر رستوں سے گزر کر اور کیسے کیسے مہیب موانع کو راہوں سے ہٹا کر آگے بڑھتی ہے۔ یہ حقیقت ہر صاحب بصیرت پر روشن ہے۔

جہاں تاریخ میں بڑے بڑے سحر کار نہایت حسین و دلفریب طریق اور فریب انگیز دروغ بافیوں سے لبریز تحریروں اور طلسم انگیز، ہوش رُبا فن کاریوں سے روشن حقائق۔ واضح صداقتوں کو مسخ کرنے کی سعیٔ مذموم کرتے ہیں وہ حق و صداقت کے نہایت واضح اُلجھے بکھرے اور ابھرے ہوتے صاف و شفاف روشن راستوں کو تاریکیوں کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں ڈبونے کی کوشش ناتمام اور حقیقت سوزیوں کا ارتکاب کرتے ہیں

تاریخی ریکارڈز کو دھندلانے کے لیے غلط نولیسیاں، غلط نگاریاں، کذب بیانیاں اور حقیقت سوز حرکتیں کرتے ہیں کہ ناطقہ سر بگریباں رہ جاتا ہے اسے کیا کہیئے۔ لیکن قافلۂ آدمیت اور کاروانِ انسانیت میں ایسے افراد بھی موجود ہوتے ہیں جنہیں خدا نے حقیقت بینی۔ حق نولیسی اور حق گوئی و بے باکی کی نعمت سے نوازا ہوتا ہے وہ اُن کی تاریخی تحریفات کا نوٹس لیتے ہیں اور جب وہ محسوس کرتے ہیں کہ مسخ شدہ تاریخ کا سرطان اور غلط بینی کا جذام اُن کی ملت کو لاحق ہونے کا عظیم خطرہ درپیش ہے تو وہ اُن کی مفسدانہ ذہنیت اور باطل فروغ طبیعت کی پیدا کردہ رنگ آمیزیوں کو حقائق کے تسلسل سے فنا کر کے رکھ دیتے ہیں صداقت

تاریخ کے سچے شواہد و دلائل کا اژدہا ان کے اعراض کو اس طرح نگل جاتا ہے جیسے قرآن کے دلائل کا اژدہا فرعون کے سامریوں کے دلائل کے سانپوں کو نگل گیا تھا۔ مورخ کے بے لاگ تبصرات، تاریخی حقیقتوں اور ان کے مذموم و قابلِ نفرین کردار کو عریاں و بے نقاب اور ان نہاں کردہ صداقتوں اور پوشیدہ اصلیتوں کو چشمِ بینا کے سامنے لے آتے ہیں۔

ہر دور میں حیلہ گروں، فتنہ بازوں اور فتنہ پردازوں نے ایسا کیا اور ہر زمانے میں ایسا ہوتا رہے گا۔ ان کی طلسم ریز نکتہ آفرینیاں ان کی سحر انگیز کذب بیانیاں اور فریب لبریز موشگافیاں اعراضِ حقائق کا لبادہ اوڑھتی رہیں۔ لیکن ہر دور میں حق پرستوں کے عزم و عمل کی تیغ عریاں نے ان کے سینۂ باطل کے اس مقدس لباس اور بظاہر قابلِ احترام لبادے کو تار تار کر کے رکھدیا جس میں وہ اپنی دجل آمیز باطل نگاریوں کو چھپائے ہوتے تھے۔

قارئین کرام! ہمارے ہاں بھی بدقسمتی سے عجیب عجیب قسم کی تاریخی الجھنیں پیدا ہوگئیں یا پیدا کی گئیں۔ آپ جانتے ہیں کہ میں نے اپنی بساط کے مطابق تاریخِ تحریکِ پاکستان کو محفوظ و منضبط کرنے کے لیے مقدور بھر کام کیا ہے اور میں اسے فریضہ ملی سمجھ کر سر انجام دے رہا ہوں۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے یوں تو ہر دور، ہر زمانہ اور ہر عہد میں تاریخی حقائق کو مسخ کرنے کی نازیبا جسارتیں کی گئیں لیکن میرے نزدیک جس متقدسانہ، صالحانہ اور مومنانہ انداز اختیار کیے ہوتے تاریخِ تحریکِ پاکستان کو مسخ کرنے کی سعیٔ ناپاک ہمارے ہاں کی گئی ہے۔ تاریخ شاید ہی اس کی مثال پیش کر سکے۔ میں نے جب آنکھوں دیکھے تاریخی واقعات اور مخالفین قیام پاکستان کے تاریخی کردار کو اس طرح بدلتے ہوئے دیکھا تو اپنا فرضِ ملی سمجھا کہ اس باطل میں جو حق مضمر ہے اسے نکھار، ابھار اور نتھار کر سامنے لے آؤں۔ اس کے لیے ایک ہی دلیل قابلِ پذیرائی قرار پا سکتی ہے کہ معاملہ مجھ سے یا کسی اور فرد سے نہیں، معاملہ تاریخِ تحریکِ پاکستان سے متعلق ہے۔ اس لیے اسے صحیح انداز میں پیش کرنا نہایت ضروری ہے۔ میری جدوجہد تو اس حقیقت کو باقی رکھنے

کے لیے مردمتدانہ اقدام اور میری بحث علمی اور تحقیقاتی ہے، فریب کارانہ داستان طرازی نہیں۔

کسی کے سابقہ کردار پر غور و فکر کا ایک ذریعہ تاریخ کے تاریخی نوشتے۔ تاریخی سرگزشتوں اور صحیح تاریخی شہادتوں کا مطالعہ ہی ہو سکتا ہے اور مطالعۂ تاریخ کا ایک طریق یہ بھی ہے کہ ہم حقیقی شہادات تاریخ سے صحیح نتیجہ پر پہنچ جائیں

بقولِ اکبرؔ
کہتے ہیں ہرج کیا ہے جو باریک ہے وہ پل
ہم سائیکل پہ گزریں گے راہِ صراط سے

دیانتداری کا تقاضا ہے اور میری مورخانہ ذمہ داری کہ میں تاریخ تحریک پاکستان کی زندہ شہادات اور صداقت افروز واقعات کو اربابِ علم و تحقیق کے سامنے لاؤں جہاں تک میری آواز کام کرتی ہے میری ذمہ داری ہے کہ میں آواز اٹھاؤں اور جہاں تک میرا قلم کام کرتا ہے ان تاریخی شواہد کو ابھرنے والی نسل کی خدمت میں پیش کردوں تاکہ اربابِ تحقیق و علم اور صاحبانِ فراست آئینۂ الفاظ اور نگارشات کی صورتوں کے پردے میں چھپے ہوئے حقائق کو دیکھ سکیں۔ جو ان درخشاں و تاباں حقیقتوں کو اپنے اندر سموئے اور سمیٹے ہوتے ہیں۔ راقم کو یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ تاریخ کے ان محکم نوشتوں کو مسخ کرنے کی جسارتیں "صالحین" کے اس طائفہ نے کی ہیں جو جنگِ حصولِ پاکستان میں میرِ قافلۂ ملت کے شریکِ سفر نہ تھے بلکہ پاکستان ان کی کھلی مخالفت کے علی الرغم معرضِ وجود میں آیا۔ اور تاریخ کی بارگاہ سے جنہیں رسوائی اور روسیاہی کے سوا کچھ نصیب نہ ہوا۔ ضمناً تمہیدی کلمات میں یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ تاریخ تحریکِ پاکستان اس صداقت کی آئینہ دار ہے کہ انہوں نے اپنی تحریروں میں حضرت قائداعظم پر پھبتیاں کسنے سے بھی گریز نہیں کیا تھا شہاداتِ تاریخ کے زریں اوراق یہ ثبوت بھی فراہم کر رہے ہیں کہ ان کی زبان و قلم سے نہ حصولِ پاکستان کی داعی جماعت مسلم لیگ بچی نہ ہی مسلم لیگ کا قابلِ صد احترام قائد جناحؒ۔

عزیزانِ گرامی! جس طرح ہم نے تاریخی نوشتوں سے گزرے ہوؤں کے حالات کو پڑھا ہے اسی طرح آئندہ نسلیں انہیں سے ہماری کشمکشِ حیات کا اندازہ کر سکیں گی ہمارے نزدیک پاکستان اربابِ عقل و بصیرت کی پکار تھی جو طلسمِ برہمن کی پیدا کردہ تاریکیوں سے

ہندی مسلمان کو زندگی کی جگمگاتی روشنی میں لے آنے کی نوید حیات افروز تھی۔ تحریکِ قیامِ پاکستان مسلمان کی شعوری سرگرمیوں کا ایک نیا سرچشمہ اور پاکستان ان کی شعوری زندگی کا ایک نیا مرکز۔ مخالفینِ قیامِ پاکستان جو بدقسمتی سے مسلمان بھی تھے۔ انہوں نے بقولِ اقبالؒ

شیخ ملت ! با حدیثِ دلنشیں
بر مرادِ او کند تفسیرِ دیں

انہوں نے دین کے نام پر دین کا نظام قائم کرنے کے لیے حاصل کیے جانے والے اقبالؒ و جناحؒ کے پاکستان کی شدید مخالفت کی۔

اقبالؒ و جناحؒ ان کے ہمفکروں، ہمقدموں، اور ہمسفروں نے دنیا جہان کی دلیلیں دیں کہ قرآن کی روشنی میں پاکستان کا قیام مفادِ مسلم میں ہے یہ بیدارئ ملت کا پیغام ہے اس کے حصول میں مسلمان کا رازِ زندگی مضمر ہے لیکن تمام تر عرض و التجا کے باوجود ان کی مخالفت کی شدت میں کوئی کمی نہ آئی بلکہ بڑھتی ہی چلی گئی۔

تاریخ کی ابدی صداقتیں (ENTERNAL TRUTHS) اس حقیقت پر گواہ ہیں کہ مخالفینِ قیامِ پاکستان نے تاریخ کی قوت (FORCE OF HISTORY) کا منہ چڑانے کے لیے مقدس نقاب میں چھپی ہوئی مخالفت کرنے کے لیے نہایت نقاب پرور فریب اختیار کیے۔ حقائق کو چھپانے اور مسلمانوں کو ورغلانے کے لیے غلط نویسیاں اور غلط بیانیاں شروع کر دیں اور فضائے پاکستان اور باقی عالم میں پریس کے ذریعے اسے نہایت شدومد سے پھیلایا گیا۔ اور یہاں تک حقائق سوزی کی جرات کی کہ نہایت دلیری اور بے باکی اور دھڑلے سے یہ کہنا شروع کر دیا کہ پاکستان تین شخصیتوں نے بنایا ہے۔ اقبالؒ و جناحؒ اور مودودی (مرحوم)

ناظرینِ کرام! میں نے جب تاریخ کے واقعاتی تسلسل کو باطل آرائی اور دروغ بیانی کے نرغے میں دیکھا اور فنِ تحریر و تشہیر دروغ کا بڑھتا ہوا پھیلاؤ محسوس کیا تو میرے ضمیرِ زندہ نے میری ذمہ دارانہ حیثیت کو جھنجھوڑا اور ادائے فرض کے لیے مجبور کیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اگر میں یوں تاریخِ پاکستان کی زندہ شہادت کو مسخ ہوتے دیکھ کر خاموش و غافل رہوں گا تو روزِ محشر مجرم گردانا جاؤں گا۔ اور اگر میں یہ صداقتیں پیش نہ کروں تو یہ تاریخی حقیقت مشتبہ ہو کر رہ جائیگی۔ چنانچہ میں نے کمرِ ہمت باندھ لی اور تاریخی ریکارڈ کو نہایت ذمہ داری اور محنتِ شاقہ سے جمع کیا۔ اس مقام پر رک کر یہ بھی عرض کرتا چلا جاؤں

کہ اس کتاب "علامہ اقبالؒ، قائداعظمؒ، پرویز، مودودی اور تحریک پاکستان" کا زیادہ تر انحصار ان شائع شدہ شہادات اور تحریری ریکارڈز پر ہے، جو عہد حاضر کی حکومت اور اس سے پہلی مارشل لا حکومتوں کے علاوہ سول حکومتوں کے زمانہ میں اشاعت پذیر ہوا ہے۔ میں نے انہی کو جمع کیا ہے اور اس پر رائے زنی کا حق استعمال کیا ہے۔

قارئین کرام! جس طرح تاریخ ہی سے اقوام گزشتہ کی داستانیں، ان کے اعمال کی زندہ شہادتیں بنکر ہمارے سامنے آتی ہیں، ہماری موجودہ تاریخ بھی آنیوالی نسلوں کے سامنے اسی طرح آئے گی۔ میری تاریخی تحقیق اس حقیقت پر پڑا ہوا پردہ اٹھا رہی ہے کہ جو لوگ تاریخ تحریک پاکستان کو مسخ کرنے کی سعیٔ مذموم کر کے حقائق کی دنیا میں خود آپ اپنا مذاق اڑاتے ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ وہ اپنے اس گھناؤنے اور قابل مذمت کردار پر اس طرح پردہ ڈال سکیں گے یہ ان کی بھول ہے۔ حقائق کی یہ روشن اور تابناک کرنیں خورشید تاریخ سے چھن چھن کر اپنی پوری تابانی و تابناکی اور تیز روشنی کے ساتھ ہر فریب باطل کو حقیقی روپ میں دکھا کر رہے گی جن کی موجودہ روش یہ ہے کہ حقیقت کو باطل نگاری کے تانے بانے کے بُنے ہوئے پردے میں چھپا دیا جائے، وہ یقیناً اس مقصدِ مذموم میں ناکام ہوں گے۔

جاؤ تاریخ کے اوراق اُلٹ کر دیکھو کہ جب کہیں بھی غلط بیانوں اور غلط نگاروں نے روشن و چمکدار حقیقتوں کو چھپانے کے لیے دجل و فریب سے کام لیا تو کس طرح اربابِ علم و ایقان نے ان کے باطل ارادوں کو صداقت کے ہتھوڑوں سے ریزہ ریزہ کر کے رکھدیا ہے؟ اور اُن کے طائرِ فلک پرواز نے کس طرح ان کے بھیانک حقیقت شکن پروگراموں کو بھانپ کر ان کی کھیر کو دلیا کر دیا ہے۔

میری یہ کتاب جو کچھ میں نے اُوپر لکھا ہے اس کے ایک ایک حرف کی تصدیق و توثیق کرے گی۔ تاریخ ہی ہے جس کی کہنہ داستانوں سے ہم ماضی کی تصویر دیکھتے ہیں اور پُر از حکمت تاریخی حقائق ہی تو ہیں جو رزم گہِ حیات میں آگے بڑھنے والے مسافرانِ حیات کے لیے دلیلِ راہ اور چراغِ منزل بنتے ہیں۔ کسی مسافرِ راہ کی سیدھی راہوں میں الجھاؤ پیدا کرنا تاکہ وہ اس پیچ و خم میں الجھ کر رہ جائے۔ اور راہ حقیقت نہ پا سکے ایک ایسی معیوب حرکت ہے کہ جس کے قابلِ نفرین ہونے کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔

عزیزانِ ملت! تاریخی شہادتوں سے نتائج اخذ کرنے کے طریق کو تذکیر کہتے ہیں
ہوا ایسا کیوں کیا یوں کیوں نہ کیا۔ جب آپ تاریخِ تحریکِ پاکستان کے واقعات پر پھیلتی
ہوئی نگاہ ڈالیں گے تو راقم کی اس کتاب میں پیش کردہ صداقتیں آسمانِ حیات کی
بلندیوں پر جگمگاتے ستاروں کی طرح راہ نما بنکر آپ کو حقیقت کے روشن راستے
دکھانے کے لیے آگے بڑھیں گی۔ اور آپ کے ذہن پر وہ صحیح تاریخی حقائق اس طرح
نمودار ہو جائیں گے جس طرح لیموں کے عرق سے لکھے ہوئے الفاظ کاغذ کو آگ کے سامنے
رکھنے سے خود بخود ابھرتے چلے آتے ہیں۔ میری یہ جہدِ راہِ حقیقت میں کجی پیدا کرنیوالوں
کی کوششوں کو خاک میں ملا دے گی۔ اور اُن کی سحر نگاری۔ کذب بیانی اور غلط نویسی،
نے لوگوں کی نگاہوں میں جو خیرگی پیدا کر دی ہے وہ اس روشنی کی تیز لَو سے ختم ہو
جائے گی۔ اُن کا حقائق سے اعراض اور اتنے لمبے عرصے سے واقعات و حقائق کشی،
ان کی ہزار تدبیر و احتیاط کے باوجود صداقت کا یہ آئینہ سامنے آتے ہی یہ اپنا سا منہ
لے کر رہ جائیں گے۔

آپ جانتے ہیں کہ اجتماعی اعمال کے نتائج بھی اجتماعی ہوتے ہیں۔ اس جماعت کی
لغزش کی تاریخ اُس کے کردار کے ریکارڈ کو محفوظ کریگی اور اس سے اس کا سارا کیا دھرا
تاریخ کے صفحات پر ثبت رہے گا۔

ناظرین کرام! گو یہ سفر بڑا لمبا اور پُر مشقت تھا لیکن احساسِ فرض نے مجھے رواں
دواں رکھا اور میں اپنے دل کی کشاد اور ارادے کی وسعت کے ساتھ آگے بڑھتا چلا گیا
میرا یہ عرض کرنا آپ کے لیے کوئی نئی بات نہ ہوگا۔ کہ جہانِ تاریخ میں اپنے کردار کی وجہ
سے بعض چہرے روشن اور تابناک اور بعض رو سیاہ ظلمت آگیں ہوتے ہیں۔ وہ جنہوں
نے تحریکِ قیامِ پاکستان کے وقت قیامِ پاکستان کی قولاً، فعلاً، علماً اور عملاً مخالفت
کی ملت سوزی کا مظاہرہ کیا، اُن کی داغدار اور سیاہ پیشانیاں آج بھی آئینہ تاریخ
میں دیکھی جا سکتی ہیں اور روزِ آخرت تک دیکھی جا سکیں گی اور جنہوں نے علماً اور عملاً
تائیدِ ملت کی سعادت حاصل کی۔ وہ یہاں بھی کامیاب و کامران ہوئے اور یقیناً اخروی
زندگی میں بھی سرفراز و سربلند ہوں گے۔ وہ سیلابِ عظیم جس میں یہ تاریخِ تحریکِ
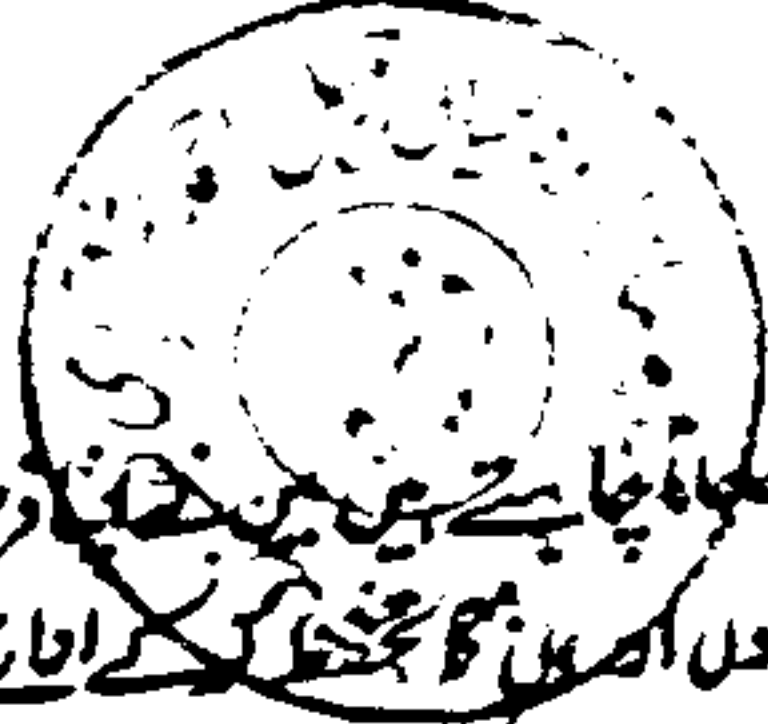
پاکستان کی زندہ شہادتوں اور انمٹ صداقتوں کو بہا کر لے جانا چاہتے ہیں میں نے ضروری سمجھا فرض
جانا کہ اس کے آگے حقائق و واقعات کا مضبوط بند باندھوں اور یوں تاریخ کی خدمت کے ادائے
فرض سے سبکدوش ہو جاؤں اور یہ ظاہر کر دوں کہ اُن کے تحریکِ قیامِ پاکستان کی نوشتیں
اور سرگزشتیں ان کے اعمال و افعال و کردار کی زندہ شہادتیں ہیں۔ میں نے یہ کتاب
"علامہ اقبال، قائداعظم، سید مودودی اور تحریکِ پاکستان" لکھنے کے لیے اِدھر اُدھر سے قیاسی سراغ نہیں لگائے
بلکہ بقولِ اقبالؒ نشانِ راہ ز ریگِ رواں گیر کے مصداق میں نے ان کے اعمال و کردار کے
نشانات ولوِ عمل سے اپنی بساط اور فہم و ادراک کے مطابق زندہ شہادتوں کو چنا ہے
اور حضورِ ملت پیش کر دیا ہے اور یہ شرمندگی و رسوائی بھی میں نے ان کے پلے نہیں باندھی۔ یہ
تحریر خود اُن کے اپنے اعمال و کردار کی عکاس ہے۔

فرزندانِ ملت! میں نے یہ بھی نہیں کیا کہ دس شنی اور نیس بنا کر آپ کے سامنے پیش
کر دی۔ آپ خود ہی غور فرمائیے کہ جب اس قسم کی غلط بیانیاں، غلط نویسیاں، کذب گوئیاں
اور حقیقت سوزیاں جہانِ علم و دانش میں سیلاب کی طرح بہنے لگ جائیں تو پھر صداقتیں
اور ان کی شہادتیں تو منہ چھپائے چھپائے پھریں گی۔ کئی بار سوچا کہ یہ حقیقتیں نہ بیان
کروں لیکن ادائے فرض نے مجبور کر دیا اور ہم یہ قصۂ درد سنانے پر مجبور کیے گئے ہیں۔
تاکہ تاریخ تحریکِ پاکستان کی معتبر شہادتیں ابھرنے والی نسل کے سامنے آ جائیں اور
فرض کی ادائیگی میں کوتاہی نہ ہو۔ یہ کتاب ۸۹۸ صفحات اور ۳۱ ابواب پر مشتمل ہے
کتابت کے مراحل جس انداز سے طے پاتے اور یہ زیرِ تکمیل کتاب جس محنت اور لگن
سے پایۂ تکمیل تک پہنچی اس کا ذکر یہاں ضروری نہیں ہے۔ یہ انسانی فروگزاشتوں
سے مبرا اور منزہ نہیں۔ مجھے اپنی کم مائیگی، کوتاہیوں اور لغزشوں کا پورا پورا احساس
ہے لیکن یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ میں نے حتی المقدور کوشش کی ہے کہ میں کتابت
کے اغلاط کی زیادہ سے زیادہ تصحیح کر سکوں۔ اس کے باوجود اگر آپ کی تیز نگاہی
دیگر عیوب و اسقام کو دیکھے تو یہ ایک انسانی کوشش ہے جو غلطی و خطا اور سہو
و لغزش سے پاک نہیں ہو سکتی۔ مجھے امید ہے کہ قارئین کرام سہو و خطا سے درگزر
کریں گے۔ صاحبِ فکر و نظر مفید مشوروں سے نوازیں گے۔ یہ ناچیز ربّ العالمین
اور ربّ الناس کا شکر گزار ہے جس نے یہ توفیق و ہمت بخشی اور قوتِ عمل سے

سرفراز فرمایا کہ مجھ ناتواں کو یہ طاقت و قوت عطا کی کہ اتنا کچھ جمع کر کے حضورِ ملت پیش کر سکے۔

ناظرینِ کرام! درس کے معنی گاہنا ہیں۔ گیہوں یا دوسرے اناج کی بالوں کو زمین پر بچھا کر اس پر بیلوں کو مسلسل اور متواتر چلاتے رہنا تاکہ بھوسہ اور اناج الگ الگ ہو جائے۔ میں نے اسی لیے بعض .... کو بعض کی تائید و ترتیب سے الگ الگ اور بار بار دیا ہے تاکہ اس کے مفہومات و مطالب اور مقاصد و معنی نکھر اور ابھر کر سامنے آ جائیں اور قارئین ان پر مسلسل اور بار بار غور و فکر کریں تاکہ الفاظ کے پردوں میں جو حقائق مستور ہیں، وہ واضح ہوتے چلے جائیں۔ امید ہے لوٹا لوٹا کر لائے جانیوالے ریفرنس آپ پر گراں نہیں گزریں گے۔ میرے نزدیک ضروری تھا کہ ہر ایک کا دیا ہوا حوالہ اس کے حوالے کے ساتھ دیا جائے۔ تاکہ مجھے اپنے پیشِ نظر مقصد میں تقویت ملے۔ اس غرض کے ساتھ آپ نے بار بار دیئے جانیوالے حوالہ جات کی اہمیت و ضرورت کو سمجھ لیا ہو گا۔ اب یہ کہا جا سکتا ہے کہ ناقابلِ تغیر حقیقتیں ہمیشہ ناقابلِ تغیر رہتی ہیں

قارئین کرام! راقم نے ان بکھرے ہوئے حقائق اور پوشیدہ افکار کو ایک سمٹی ہوئی مربوط شکل میں آپ کے حضور پیش کر دیا ہے۔ اس تمہیدی تعارف سے آپ نے اندازہ فرما لیا ہو گا کہ اُن کی یہ غلط بیانیاں اور تضادات کی یہی کشمکش اس نئی کشمکش کی قدمِ اوّل بنی۔

چودھری حبیب احمد

چودھری حبیب احمد (مرحوم)

تبصرات

جماعت اسلامی کا رخ کردار

مکرمی تسلیم! عنوان مذکرہ بالا پر جناب حبیب احمد چودھری کے جرأت مندانہ، محققانہ اور فاضلانہ مضامین موقر جریدے میں شائع ہوتے ہیں۔ اور ان کے متعلق اکثر خطوط بھی نگاہ سے گذرے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ چودھری حبیب احمد نے ان مضامین کو شروع کر کے وقت کی ہی نہیں، ملت کی ایک اہم ضرورت کو پورا کیا ہے۔ اور ایسا موضوع شروع کیا ہے جس پر اکثر جبینیں شکن آلود ہوں گی۔ مگر یہ کتنی بڑی ستم آفرینی ہے، کہ ایک جماعت اور اس کے محترم سربراہ جن کے پیش نظر اپنا سیاسی اقتدار ہے اور اس کے حصول کیلئے وہ ہر آن کوشاں ہیں کی مساعی کبھی پاکستان کی تحریک کے ہم آہنگ نہیں ہوئیں، اور پاکستان کے قیام سے وہ اپنی مخصوص روش سے بددلی، تشکیک اور پست حوصلگی پھیلا رہے ہیں لیکن انہوں نے اس طرح اسلام کا لبادہ اپنے اوپر اوڑھا ہوا ہے۔ کہ پورا ملک ان سے مرعوب ہو کر بیٹھا ہوا ہے اور کسی کو جرأت نہیں پڑتی کہ ان صالحین کے عزائم پر حرف گیری کر سکے۔ تحریک پاکستان کے کارکنوں کیلئے اولین معیار یہ ہے کہ ۱۹۴۷ء کی جدوجہد پاکستان میں کسی گروہ، جماعت یا اس کے نائندے نے کیا حصہ لیا تھا کیونکہ پاکستان اسلام کی حفاظت اور مسلمانوں کی سربلندی کیلئے قائم کیا جارہا تھا وہ لوگ جو پاکستان کی تحریک میں عامۃ المسلمین کے ساتھ یا اس تحریک کے رہنماؤں کے ساتھ نہیں تھے تو یقیناً وہ اسلام کی حفاظت اور مسلمانوں کی سربلندی کی بدیہی ضرورت کو یا سمجھ نہیں سکتے تھے اور یا اس کی اہمیت کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ اول الذکر گروہ کو قائدانہ اہلیت کا حامل قرار نہیں دیا جا سکتا اور ثانی الذکر طبقہ کسی طرح اپنے فیصلے میں دیانتدار نہیں تھا۔ اب یہ وقت کی ستم ظریفی ہے کہ ایک طرف تو تاریخ میں برِّ صغیر کے ان مسلمانوں کو کامران حیات جاوید مل گئی جنہوں نے پاکستان کے قیام کے لئے جدوجہد کی اور دوسری طرف انا و لاغیری کے بہت سے بت خود بخود گر کر پاش پاش ہو گئے اور دیکھنے والے حیران و ششدر ہو کر توڑنے والوں کے بظاہر نحیف بازوؤں اور ٹوٹنے والوں کے سنگین خولوں کو دیکھ رہے ہیں مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ ایسا ہی ہونا تھا

اور ایسا ہی ہوتا رہا ہے ،

جماعتِ اسلامی کے صالحین کرام نے جنگِ پاکستان میں بلاشبہ مداہنت اور منافقت سے کام لیا ہے، انہوں نے لوگوں کے قوائے عمل کو سست رَو اور مفلوج کرنے کی کوشش کی انہوں نے اتحادِ ملت کو پارہ پارہ کیا۔ انہوں نے قلوب و اذہان کو ایسے وقت میں سطحی اور فروعی مسائل میں اُلجھانے کی کوشش کی جب ایک عظیم تر مقصد کیلئے قلبی یک سوئی اور ذہنی یک جہتی کی ضرورت تھی۔ اور جب مسلمان کامیاب ہوئے اور یہ ناکام ہوئے تو انہوں نے دینی تفوق اور مذہبی برتری کا خود ساختہ پیراہن اپنی قامت پر راس کر لیا۔ اور وہ مجاہد اور سپاہی جو نمود و نمائش کی خواہش کے بغیر اس جنگ میں کود پڑے تھے ، اور اس میں سرخرو ہوئے تھے۔ جماعتِ اسلامی کے فضائل کی کمانیں ان کے سینوں کی طرف کھنچ گئی تھیں۔ اور آج تک تیر برسا رہی ہیں ۔ بلاشبہ تحریکِ پاکستان مختلف صورتوں میں بڑی حد تک قرونِ اولیٰ کی تاریخ دہرا رہی ہے۔ اور وہ گنہگار اور خطاکار مسلمان جنہوں نے بعونہٖ تعالیٰ پاکستان حاصل کیا اپنی تمام کوتاہیوں کے باوجود اسوۂ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم پر کاربند ہوئے جس کا مظاہرہ بارگاہِ رسالت سے فتح مکہ کے بعد ہوا تھا اور ان غلامانِ محمدؐ نے قیام پاکستان کے بعد وہی منظر پیش کر دیا۔ قیام پاکستان کے بعد سب کیلئے عفوِ عام تھا کسی سے احتساب کسی پر گرفت۔ کسی پر نکتہ چینی نہیں تھی ۔ اور پاکستان کی کشادہ باہوں نے بلا امتیاز سب کو اپنے آغوشِ امن و راحت میں لے لیا۔ اس کے بعد ہمارے سامنے پاکستان کی تعمیر اور پاکستان کے استحکام کا اہم مرحلہ تھا جو پہلے مراحل سے بھی بوجوہ زیادہ ضروری تھا مگر وہ طبقہ جس نے تحریکِ پاکستان میں مسلمانوں کا ساتھ نہیں دیا تھا۔ قرآنِ حکیم کا مفسرِ اعظم بن کر سامنے آ گیا۔ حالاں کہ ان کا اپنا کردار کم از کم ان لوگوں کا سا رہا جنہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ کہا تھا۔ کہ "تم اور تمہارا رب دشمنوں سے لڑے"۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ ان کے مخاطب مثلِ موسیٰ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت تھی اور خدائے پاک و اقدس نے اپنے حبیب پاک کے طفیل اس امت کو فاتح بنا دیا۔ جماعتِ اسلامی کے اعاظم نے امتِ مسلمہ کی وہ جنگ دیکھی ہے جو قائد اعظم رحمتہ اللہ علیہ کی قیادت میں لڑی گئی تھی ۔ اس جنگ میں صالحین کے معتوب اور مغضوب مسلمانوں نے قرآنِ حکیم کی روشنی کو اپنا رہنما بنایا تھا۔ اور یہ جنگ بحمد اللہ جیتی گئی جماعت

اسلامی کے قائد اور صلحا برہمن ازم کے تابع اپنے آپکو قرآن پاک کا مفسر سمجھتے ہیں انہوں نے ملت کے خلاف محاذ قائم کیا اور پاکستان کے خلاف اپنی لڑائی میں وہی دلائل مستعار لئے جو پاکستان کے عوام اپنی جنگ میں استعمال کرتے تھے مگر یہ صلحا کچھ واضح فرق بھول گئے ہیں وہ فرق یہ ہیں :-

ا ۔ اُمت مسلمہ کا جہاد غیر مسلم استعمار اور فرنگی سامراج کے خلاف تھا مگر ان کے تیروں کا ہدف صرف مسلمان ہیں ۔

ب ۔ اُمت مسلمہ کے سامنے ایک قومی اور اجتماعی نصب العین پاکستان تھا جماعت اسلامی کے سامنے صرف اپنا اقتدار ہے ۔

ج ۔ اُمت مسلمہ کیلئے اسلام اور قرآن حکیم راہنمائی کے مراکز تھے اور جماعت اسلامی نے قوم کی بدقسمتی سے اسلام اور قرآن کو ہتھیار اور نقاب کے طور پر استعمال کرنا شروع کیا ہوا ہے ۔

اللہ کی جنگ میں جماعت اسلامی کے قائد اور اس کے ساتھی پہلے بھی غلط مقام پر تھے آج بھی غلط مقام پر ہیں ۔ پاکستان کا قیام اس کا سب سے بڑا ثبوت ہے ، اور یہ ثبوت خدا کے فضل سے دائمی قائم رہے گا ، پاکستان کی جنگ جیتنا تو ایک بڑا فخر اور سرمایہ غرور ہے ، اس جنگ کی تقدیس کا یہ عالم ہے کہ اگر خدانخواستہ ملت مسلمہ کو یہ جنگ لڑتے ہوئے ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا تو بھی اس کی عظمت اور برتری میں فرق نہیں آ سکتا تھا ۔ وہ خوش نصیب جو اس عظیم جہاد میں جانی و مالی نقصان سے دوچار ہوں ۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے دروازے دونوں جہانوں میں ان کے لئے کھلے ہوئے ہیں ، وہ خوش نصیب ہیں جو اس جنگ میں فتح یاب ہوئے وہ آزادی و سربلندی کے انعامات سے بہرہ ور ہو رہے ہیں ۔ اور وہ لوگ جن کے نام خواہ کتنے بڑے ہیں جن کے خطابات و القاب کتنے مرعوب کن ہیں ، اگر اس جنگ میں غلط مقام پر تھے ۔ وہ یقیناً اس شرف سے محروم ہیں ۔ محروم رہیں گے ۔ اور محروم رہنے چاہئیں ، کہ قوم ان پر کبھی اعتبار کرے ۔

جماعت اسلامی ۔ اس کے قائد اور ان صلحا کے لئے صحیح راستہ یہ تھا کہ وہ اپنے علم پر علم کو غالب آ جانے دیتے ۔ غرور کی بجائے عجز اختیار کرتے ۔ اور اپنے غلط فیصلوں پر پشیمانی کا اظہار کرتے ہوئے قوم کا سامنا کرتے ۔ شائد اللہ تعالیٰ جو سب کچھ جانتا ہے ان کو معاف کر دے کہ وہ غفار ہے ۔ تحریک پاکستان کے کارکن اور سپاہی جانتے ہیں کہ ان کے

سینوں میں ایمان کی حرارت اور دامن میں اخلاص کا سرمایہ ہے وہ تسلیم کرتے ہیں کہ حالات کی برق رفتاری نے ان کے قافلے کی صفوں میں بعد پیدا کیا ہوا ہے، لیکن پاکستان اور پاکستان کے حقیقی مقاصد ان کی نگاہوں سے اوجھل نہیں یہ کارکن پاکستان کی حفاظت کریں گے۔ اور وہ لوگ جن کا ظاہر خواہ کتنا ہی غریب ہو مگر جو پاکستان کے مخالف ہیں یا رہے ہیں ان پر کڑی نگاہ رکھیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق دے آخر میں ملت کے اہل قلم اور اصحاب فکر سے گذارش ہے کہ وہ جنگ پاکستان کے اس مرحلے میں بھی پہلے کی طرح کام کریں اور جو خطرات آج ہمیں درپیش ہیں ان کا احساس کریں خدائے تعالیٰ مقلوب القلوب ہے۔ شائد جماعت اسلامی اور ان کے قائد کسی وقت پاکستان کیلئے مفید ثابت ہو جائیں

خلیق قریشی۔ لائلپور۔ (روزنامہ امروز ۲۴ فروری ۱۹۶۳ء)

میزان — جماعت اسلامی کا رُخ کردار

نقاب پوش مصلحین اصلی روپ میں

مرتبہ :- چودھری حبیب احمد ملنے کا پتہ۔ پاکستان ٹائمز پریس لاہور۔ قیمت پانچ روپے

جماعت اسلامی کا کردار ہماری آج کی اخبارات کی دنیا کا گرما گرم موضوع ہے، اس جماعت نے جس منظم طریقے سے پاکستان عوام کے ہر طبقہ میں نفوذ کیا ہے، اب وہ اس ملک کے کئی درد مندوں کو اضطراب کی حد تک پہنچ گیا ہے چودھری حبیب احمد تحریک پاکستان کے جیالے لیکن بے غرض سپاہی تھے۔ اقبال اور جناح ان کے قائد تھے اور ایک آزاد اور زندہ اسلامی ریاست ان کا مطمح نظر۔ انہیں وہ دن کیسے بھول سکتے ہیں جب وہ پاکستان کیلئے سینہ سپر تھے۔ پھر انہوں نے وہ دن دیکھے کہ پاکستان قائم ہو گیا اقبال اور جناح کی کوششیں پھل لے آئیں۔ اور یہی مولانا مودودی جو اس پھل میں کیڑے ڈالتے نہ تھکتے تھے۔ اسی میں حصہ بٹانے پاکستان چلے آئے۔

پھر یوں ہوا کہ وہی قوم جو مولانا مودودی کے خیال میں پاکستان کی مہم چلا کر اسلام سے لاتعلق ہو گئی تھی اب مولانا کو بہت پیاری ہو گئی اور انہوں نے اسے نئی نئی پٹیاں پڑھانی شروع کر دیں۔ یہ راہ ان ارباب اختیار کا جو پاکستان کے مقصد عظیم کو عملی جامہ پہنانے میں ناکام رہے ہیں۔ ایک تو پاکستان ایک زندہ اسلامی ریاست نہ بن سکا اور اس پر مستزاد یہ

کہ پاکستان دشمن مولویوں کو اپنے فتنہ زدہ مذہب کی زہریلی جھاڑیاں بونے کا موقع مل گیا وہ زمین جو زندہ اسلام کے لئے اقبالؒ اور جناحؒ کے خون پسینے سے تیار ہوئی تھی، میدان خالی دیکھ کر مولانا مودودی صاحب نے اپنی فصل منافقت بو دی۔ ان کی موقع شناسی میں کوئی کلام نہیں۔

لیکن ابھی ملک میں چند لوگ ایسے بھی ہیں جنہیں یاد ہے کہ پاکستان کیوں بنا تھا، اور ان کے افکار میں اور مولانا مودودی کے افکار میں کیا فرق ہے۔ چودھری حبیب احمد اس ملک کے کروڑوں عوام کے شکریہ کے مستحق ہیں، کہ انہوں نے پاکستان کے نظریہ پر جماعت اسلامی نے جو گہرے پردے ڈالے ہیں، انہیں جماعت اسلامی ہی کی چھری سے تار تار کر دیا ہے۔ انہوں نے اس جماعت کے قائد کی تحریروں سے اس جماعت کے کردار کا جو رخ دکھایا ہے۔ وہ دیکھنے کے لائق ہے۔ مسلمانوں کو ایسے کرداروں سے زخم کھانے کا ہمیشہ سے شوق رہا ہے۔ لیکن کب تک ۔ یہ قوم کب تک یوں ڈسی جاتی رہے گی؟ شائد اس وقت تک جب تک اس کا ہر جوان چودھری حبیب احمد نہ بن جائے کہ اب پیغمبر تو آنے سے رہے جو اکیلے ہی قوموں کو بیدار کر دیتے تھے۔

(عبداللہ حسر) ماہنامہ نصرت ستمبر ۱۹۶۳ء

جماعت اسلامی کا رخ کردار

مرتبہ چودھری حبیب احمد، پبلشر پاکستان ٹائمز پریس لاہور صفحات ۳۶۸

قیمت ۵ روپے (پانچ روپے)

علامہ اقبالؒ نے اس سے تقریباً چالیس برس قبل لکھا تھا "میرا عقیدہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نقطۂ نگاہ سے زمانۂ حال کے "جورس پروڈنس" پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کے احکام قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کرے گا۔ وہی اسلام کا مجدد ہوگا اور بنی نوع انسان کا سب سے بڑا خادم بھی وہی شخص ...... اس لئے کہ .... اسلام اس وقت گویا زمانے کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے اور شاید تاریخ اسلام میں ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا" لیکن افسوس ہے کہ گذشتہ چالیس برسوں میں وہ کام جو عین خدمت اسلام تھا بہت کم انجام پایا اور ماضی بعید کے بعض ادوار کی

طرح عصرِ جدید میں بھی علمائے سُو نے تقدس کا لبادہ اوڑھ کر اور مختلف عقیدے، مسلک اور جماعت کا لیبل اپنے اپنے ماتھوں پر لگا کر عامۃ المسلمین کو گمراہ کرنے کی سعی جاری رکھی۔ زیرِ نظر کتاب میں جیسا کہ نام سے ظاہر ہے فاضل مرتب نے جماعت اسلامی اور اس کے سربراہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے طرزِ فکر اور طریقِ عمل سے پردہ اُٹھایا ہے۔ اور قارئین کو ان کا وہ رُخ دکھایا ہے۔ جو عام طور پر نگاہوں سے مخفی رہا۔ کتاب کی تدوین میں دو باتیں بنیادی طور پر پیشِ نظر رکھی گئی ہیں۔ اوّل۔ مولانا مودودی کے "اسلامی" نظریات اور مختلف قومی امور پر ان کے بیانات اور تحریروں کا تجزیہ، دوم جماعتِ اسلامی کے طرزِ عمل سے پردہ کشائی اور سیاسی معاملات پر اس کی پیدا کردہ گمرہی کا تدارک جناب مرتب نے برصغیر میں نیشنلسٹ مسلمانوں کی تحریکوں کے حوالے سے اپنے موضوع کا آغاز کیا ہے۔ اور ان کے فکری تضاد اور موقع پرستانہ اقوال و اعمال کی حقیقت واضح کی ہے۔ جماعتِ اسلامی کی جانب سے تحریکِ پاکستان کی مخالفت پاکستان آنے والے مہاجرین کو "بزدلی" اور "بے اصولے پن" کے طعنے، جہادِ کشمیر کی تردید و تکذیب، اسلام کے نام پر دو قومی نظریئے سے شدید عناد اور محبِ وطن جماعتوں اور قومی حکومتوں کے خلاف معاندانہ پروپیگنڈا اور ان سب سے سوا شخصی امارت کا ایوان کھڑا کرنے کی سعیِ بلیغ۔ غرض کہ جماعت کے اقوال و کردار سے پردہ کشائی، صحت اور مہارت کے ساتھ ان اوراق میں کی گئی ہے۔ اور اس سلسلے میں خود جماعت اور اس کے سربراہ کی تحریروں اور بیانوں کے علاوہ دیگر مستند کتابوں سے افادہ کیا گیا ہے۔ طرزِ تحریر دوٹوک ہے۔ مدلل اور بے لاگ ہے۔ کتاب کا مطالعہ طالب علموں، سیاسی کارکنوں اور ان کے لوگوں کیلئے بالخصوص سودمند نہ ہوگا جو جماعتِ اسلامی کی نام نہاد حق پرستی سے متاثر ہیں کتابت اور طباعت موزوں ہے۔ (لیل و نہار ۲۵ راگست ۱۹۶۳ء)

رسید کتب :- **جماعتِ اسلامی کا رُخ کردار**

از چودھری حبیب احمد صاحب، ۳۶۸ صفحات مجلد قیمت ۵ روپے

پبلشر :- پاکستان ٹائمز پریس لاہور

کتاب کا عنوان ثانی ہے "نقاب پوش مصلحین اصلی روپ میں" اور اس سے کتاب کی

81209

نوعیت پوری ہی روشنی میں آجاتی ہے، مولانا مودودی کی تضاد بیانی، اُن کی پاکستان دشمن تصریحات، مسلم لیگ اور اُن کے قائدوں سے ان کی دیرینہ مخالفت علا خصوصاً علمائے دیوبند کا اُن کے خلاف محاذ وغیرہ بیسیوں عنوانوں کے نیچے وہ سب کچھ جمع کیا گیا ہے، جو اُن کے خلاف ملنا ممکن تھا اور اس کشکول میں قدرتہ رطب بھی ہے یا بس بھی جا بجا انداز بیان شدید تلخ ہو گیا ہے اور سیاست کے خارزار میں اُلجھ کر الیا ہونا شائد ناگزیر بھی ہے۔ یہ وضاحت ضروری ہے کہ اس میں مثالب جتنے بھی اکٹھے کر دیئے گئے ہیں۔ ان کا تعلق محض مولانا مودودی کی ذات اور ان کے چند پاکستانی رفیقوں سے ہے، ہندوستان کی جماعت اسلامی سے کتاب کا ذرا بھی تعلق نہیں،

(ہفتہ وار صدق لکھنؤ ۲۳، اکتوبر ۱۹۶۴ء)

جماعت اسلامی کا رُخ کردار

مرتبہ: حبیب احمد چودھری، طابع و ناشر: پاکستان ٹائمز پریس لاہور

ہمارے محترم دوست چودھری حبیب احمد اخبارات کی دُنیا میں غیر متعارف نہیں ہیں انہوں نے حال ہی میں ایک جامع کتاب مرتب کی ہے جس میں دور حاضر کے سب سے زیادہ منظم "فرقے" کے سربراہ اعلیٰ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تحریروں کا عکس لیکر انہیں قارئین سے مواخذہ و احتساب کیلئے پیش کیا گیا ہے، اس کتاب پر چند حروف لکھنے سے پہلے اس دور کے پس منظر کا ذکر ضروری ہے جس میں آج کے عوام سانس لے رہے ہیں،

قیام پاکستان اس صدی کا ہی نہیں تاریخ کا ایک بہت اعجاز نما کارنامہ ہے۔ قائداعظم کی فراست، سیاست، بصیرت اور قیادت میں مسلمانوں کا پریشان احوال طبقہ منظم ہوا اور نہایت قلیل عرصے میں اللہ تعالیٰ نے ان کی دعاؤں کو قبول کر کے برصغیر میں پاکستان سے قیام کی راہیں صاف کر دیں تا آنکہ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان قائم ہوا اور بحمداللہ اسے سیاسی استحکام و دوام حاصل ہونے کے اسباب بھی حاصل اور مہیا ہوں گے،

حقیقتاً قیام پاکستان کی صورت میں پہلی دفعہ مسلمانوں نے طویل پسپائیوں کے بعد اللہ تعالیٰ کی فتح و نصرت کی بشارت پائی اور مسلمان اسے اس محبت اور عقیدت سے دیکھتے ہیں جس کا یہ ملک قدرتی طور پر مستحق ہے، برصغیر کی جدوجہد آزادی

کئی منزلوں سے گذر رہی تھی اور انیسویں صدی کے آخری نصف سے لیکر بیسویں صدی کے پہلے ثلث تک جن تحریکوں نے مسلم عوام میں قبول پایا کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ وہ آزادی کے حصول تک لوگوں کا ساتھ نہ دے سکیں اور آزادی کے وقت مسلم عوام بلا استثنیٰ قائداعظمؒ کی قیادت و سیادت ہی کو تسلیم کرتے تھے۔ تحریک پاکستان اور قیام پاکستان نے جہاں عوام کو ضبط و نظم، یقین محکم اور اعتماد کی دولت دی وہاں قائدین کی صفوں میں ایک عجیب اضطراب بھی پیدا ہوتا رہا اور وہ لوگ اور گروہ جو پیشے کے لحاظ سے اپنے آپکو سکہ بند لیڈر سمجھتے تھے۔ اور جن کی علمی کم اساسی اور سیاسی کم سوادی کے ساتھ اقتصادی تنگ ظرفی بھی بسا اوقات قوم کے لئے وجہ تحقیر بنتی رہی اور جو بارہا خطابت و نقابت کی جھولی میں قوم کی سوداگری کا عوضانہ بھی وصول کرتے رہے اِس صورتِ حال سے زیادہ پریشان مگر بے بس تھے،

ان کے علاوہ ایسے لوگ بھی میدان میں آچکے تھے، جنہیں اپنا بھرم رکھنے کا ڈھب آتا تھا جن کے خیال میں قائداعظمؒ کی زندگی کے شب و روز ان کے پیمانے کے مطابق ایسے نہیں تھے جو قوم کے پیشہ ور لیڈروں کے ہوتے ہیں، یہ لوگ ایک طرف تو اپنی تمناؤں کی بر آری کیلئے زیادہ مناسب ماحول کا کچھ وقت انتظار کرسکتے تھے اور دوسری طرف انہیں یہ یقین تھا، کہ قائداعظمؒ ایسا مسلمان ہے جس کی بود و ماند بہت حد تک دورِ حاضر میں مغرب سے متاثر مسلمانوں کی مانند ہے اور جس نے قیام پاکستان کی جنگ خدا اور رسولؐ کے نام پر جیتی ہے۔ یہ لوگ اپنے مزعومہ علمی تبحر سے اُسے میدان خالی کرنے پر مجبور کردیں گے۔ اور پھر انہی ہتھیاروں سے وہ مسلمانوں کو اپنے گرد جمع کرنے میں کامیاب ہوجائیں گے،

مؤخر الذکر طبقہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور ان کے ساتھیوں پر مشتمل تھا، ان اصحاب نے اپنے گرد ثقاہت و متانت کے دبیز پردے ڈالے ہوئے تھے۔ علم دینی کی اجارہ داری اور مزاج آشنائی رسالتؐ کے دعادی سے انہوں نے اِن لوگوں کو بہرحال مرعوب کرلیا جو خود قائداعظمؒ کی زندہ و جاوید اصابتِ رائے اور ثباتِ قدم کی صفات سے محروم تھے اور ملک کی بدقسمتی سے کسی نہ کسی طرح انتظام و انصرام میں دخل انداز ہو چکے تھے قائداعظم علیہ الرحمتہ کی وفات کے بعد کئی سال مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور ان کے

ساتھیوں کو پوری آزادی سے قوم میں تشکیک۔ بددلی۔ پاکستان پر حقارت آفرین نظر ڈالنا اور اپنے معاشرے کو سب سے پست تصور کرنے کا سبق دینے کا موقعہ ملا۔

اس صورت حالات سے وہ مخلص کارکن کڑھتے تھے جو مولانا مودودی کی بے تابی کو جانتے تھے لیکن مولانا مودودی نے بجا طور پر یہ جان کر پاکستان میں برسرکار افراد کو مطالعہ حصول علم اور استنباط علمی سے کم شغف ہے اپنے گرد علم و فضائل کا خود کشیدہ اور خود آفریدہ دائرہ کھینچ لیا اور ہر موقع پر جب بھی ان کی جبلی شہنشاہیت جوئی کا کوئی گوشہ بے نقاب ہوتا وہاں علم اور نامی کی ذومعنی تحریروں کے بھرکم پردے ڈال دیتے جاتے۔ بہرحال۔

وہ کارکن جنہیں پاکستان سے والہانہ عشق ہے۔ جن کے لئے پاکستان کارخانوں، فیکٹریوں۔ اراضیات، وزارتوں، سفارتوں، منصوبوں اور حصول دولت و سرمایہ کا نام نہیں بلکہ برصغیر میں دس کروڑ مسلمانوں کے آزاد وطن اسلام کی نشاۃ ثانیہ اور مشرق کی آزادی کا نام ہے، وہ اپنی کم مائیگی کے باوجود ان حالات کا مقابلہ کرتے رہے چودھری حبیب احمد بھی اسی صنف کے کارکن ہیں، جن کا دل قومی و ملی جذبات سے آسودہ اور دامن حرص و آز سے خالی ہے، چودھری حبیب احمد نے کسی لمبے چوڑے دعوی کے بغیر جماعت اسلامی کی اپنی تحریروں اور اقتباسوں کے تراشوں سے وہ سب کچھ پیش کر دیا ہے جسے جماعت اسلامی کے رہنما اپنے لئے سم قاتل سمجھتے ہیں۔ اور جس صداقت کو چھپانے کی یہ ہمیشہ کوشش کرتے ہیں۔

جماعت اسلامی کا رُخ کردار، حقیقت پسند، محب وطن اور حق پرست انسان کے مطالعہ کے قابل ہے۔ پاکستان ٹائمز پریس نے یہ ضخیم کتاب معقول اہتمام کے ساتھ شائع کی ہے، جو ۵ روپے میں پاکستان ٹائمز پریس لاہور سے طلب کی جاسکتی ہے۔ خلیق قریشی (مدیر اعلیٰ روزنامہ عوام، لائلپور)

تبصرہ جماعت اسلامی کا رُخ کردار

روزنامہ خالات ۲۰ اکتوبر ۱۹۶۳ء

لائلپور کے مشہور صاحب قلم حبیب احمد چودھری تحریک پاکستان کے مخلص ترین

کارکنوں اور حضرت علامہ اقبالؒ کے پُر جوش شیدائیوں میں سے ہیں، مندرجہ کتاب انہی کے قلم کی ایک پُر اسرار معلومات پیش کش ہے جسے حال ہی میں پاکستان ٹائمز پریس نے شائع کیا ہے۔ کم و بیش چار سو صفحات کی اوسط سائز کی یہ ضخیم اور دیدہ زیب کتاب جماعت اسلامی اور اس کے امیر مولانا سید ابوالاعلیٰ کے سیاسی کردار اور مذہبی تصورات کا ایک بھرپور جائزہ پر مشتمل ہے۔ اس وقت جماعت اسلامی اور اس کے امیر پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام کے سب سے بڑے مدعی سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن فاضل مصنف نے ان حضرات کی اپنی تحریروں سے پاکستانی عوام کو یہ سمجھانے کی سعی کی ہے، کہ تحریک پاکستان کی مخالفت میں کس قدر زہر پھیلانے میں کوشاں رہا۔ صالحین کا یہ گروہ ان کا اسلام کس طرح ان کی ذاتی ضرورت کی خاطر بار بار بدلتا رہا۔ جماعت اسلامی سے موافقت یا مخالفت سے قطع نظر اس کتاب کی نمایاں خوبی یہ ہے کہ مصنف نے اپنی طرف سے اظہار خیال کی بجائے جو کچھ لکھا ہے، وہ مولانا مودودی اور ان کے رفقاء کی اپنی تحریروں اور تقریروں سے اخذ کیا گیا ہے، اور ساتھ ہی پورے پورے حوالہ جات بھی موجود ہیں۔ تاکہ ہر صاحب تحقیق ان حوالوں کی مدد سے اصل تحریروں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لے اور یہ فیصلہ کر سکے، کہ جماعت اسلامی کے بلند بانگ دعوے اس کے اپنے پیش کردہ لٹریچر کی روشنی میں کس قدر حقیقت یا فریب پر مبنی ہیں۔ اس لحاظ سے تنقید کا یہ انداز کسی طرح بھی غیر ذمہ دارانہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ بلکہ یہ مذکورہ جماعت کے دعوؤں کے لئے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے، اور اگر جماعت اسلامی اور اس کے امیر اپنے دعوؤں میں سچے ہیں تو آگے بڑھ کر اسی سطح پر اس کی تردید پیش کریں۔

پچھلی نصف صدی میں مختلف جماعتیں اور گروہ ہماری قوم کو مقدس نعروں کے ذریعے کافی کچھ مبتلائے فریب کر چکے ہیں، آج بھی فضا میں اسی قسم کے نعرے گونجتے سنائی دے رہے ہیں۔ ضرورت ہے کہ قوم کا صاحب تحقیق ذہن اپنے فریضہ کی ادائیگی کے لئے جرأت و ہمت سے آگے بڑھے اور ہر جماعت کا تحریری لٹریچر سامنے رکھ کر اس کا پورا تجزیہ قوم کے سامنے پیش کرے۔ زیر نظر کتاب اسی قسم کی ایک کامیاب کوشش ہے۔ اور اس میں جگہ جگہ اس مقصد کو پیش نظر رکھا گیا ہے کہ ملک کی منظم جماعت کے بارے میں جو کچھ عوام کے سامنے لایا جائے، وہ فرضی ڈھکوسلوں پر مبنی نہ ہو بلکہ اس

جماعت کے ذمہ دار لوگوں کی اپنی تحریروں سے اخذ کیا جائے، اور ہر اقتباس کے متعلق پوری نشان دہی شامل ہو،

اِس کتاب میں مصنف نے جس ذمہ دارانہ سعی و کاوش کا ثبوت دیا ہے، ہم اسے قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اور ہماری رائے یہ ہے کہ ہر وہ پاکستانی جو دورِ حاضرہ کی اسلامی تحریکات کے مالہٗ اور ماعلیہ کے ہر گوشے کو تحقیقی نقطۂ نظر سے سمجھنا چاہتا ہے اُسے اِس کتاب کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیئے تاکہ وہ محض مقدس نعروں کی دلکشی میں نہ کھو جائے بلکہ علیٰ وجہ البصیرت ان کے لٹریچر کے بین السطور کو بھی پوری طرح سمجھنے کے قابل ہو سکے، کتابت و طباعت کے اعتبار سے بھی کتاب ایک معیاری درجہ رکھتی ہے، سہ رنگے حسین گرد پوش نے بھی اِس کی زیبائش میں کافی اضافہ کیا ہے اور بجا طور پر کہا جا سکتا ہے۔ کہ تمام خوبیوں کی بناء پر اس کی قیمت پانچ روپے کچھ زیادہ نہیں ہے۔

جماعتِ اسلامی کا رُخِ کردار (نوائے وقت)

تالیف۔ چودھری حبیب احمد، ضخامت ۳۷۰ صفحات (بڑا سائز) کتابت طباعت عمدہ، قیمت مجلد پانچ روپے، ناشر۔ پاکستان ٹائمسٹر پریس لاہور،

"نقاب پوش مصلحین اصلی رُوپ میں"

جماعتِ اسلامی اور اس کے سربراہ مولانا مودودی کا اِن دِنوں اخباری کالموں اور سیاسی بیانات میں بہت ذکر ہو رہا ہے۔ اور ان کے متعلق اور خلاف بہت سی پُرانی باتوں کا بھی اعادہ کیا جا رہا ہے، مثلاً جماعتِ اسلامی نے قیام پاکستان کی مخالفت کی تھی۔ مولانا مودودی نے کشمیر میں جہاد کے خلاف فتویٰ دیا تھا۔ اِس جماعت کا مقصد مذہب کے راستے سیاسی اقتدار حاصل کرنا ہے۔ چودھری حبیب احمد صاحب کی تالیف "جماعتِ اسلامی کا رُخِ کردار۔ نقاب پوش مصلحین اصلی رُوپ میں" میں بھی اوّل تا آخر جماعتِ اسلامی اور اس کے امیر مولانا مودودی کے بارے میں اسی نوعیت کا مواد بڑی محنت و تلاش سے یکجا کر دیا گیا ہے لیکن اس میں حسنِ ترتیب و تنقید کا پورا خیال نہیں رکھا گیا۔ چودھری صاحب کی اِس تالیف کا بیشتر حصہ ایک مقامی روزنامہ میں مقالات کی صورت میں شائع ہوا تھا) ٹھوس تنظیم کے لحاظ سے جماعتِ

اسلامی اس وقت پاکستان کی سرفہرست سیاسی جماعت ہے۔ اس کا مظاہرہ جماعت کی حالیہ پاکستان گیر کانفرنس منعقدہ لاہور میں ہو گیا ہے کہ انتظامیہ کی واضح حوصلہ شکنی، غنڈہ عنصر کی بے خوف یلغار حتیٰ کہ ایک کارکن کی روز روشن اور برسر اجتماع ہلاکت کے باوجود کانفرنس کو ملتوی نہ کیا گیا۔ اس درجہ کی تنظیم کا مظاہرہ اب تک پاکستان کی کسی دوسری سیاسی جماعت نے نہیں کیا جماعت اسلامی کے ترجمان و راہنما اپنی مخالفت بالخصوص تازہ مخالفانہ مہم کو جماعت کی تنظیم سے حسد اور خوف و مرعوبیت کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ یہ انداز فکر درست اور حقیقت پسندانہ ہے یا نہیں ؟ اس کے متعلق اختلاف ہو سکتا ہے لیکن یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے۔ کہ کئی حلقے جماعت اسلامی کے کردار اور کارکردگی سے مطمئن یا خوش نہیں ہیں۔

جماعت اسلامی والے یہ کہتے ہیں۔ کہ دو قومی نظریے کے بارے میں سب سے زیادہ مؤثر [illegible] مولانا مودودی نے پیش کیا حتیٰ کہ مسلم لیگیوں نے ہی انہیں کانگرسی علماء کے مقابلہ میں منظم اسلام کا خطاب دیا۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ جب تحریک پاکستان نے اسلامیان برعظیم کیلئے فیصلہ کن حیثیت اختیار کر لی تو مولانا مودودی ”اسلام پہلے اور مسلمانوں کیلئے جداگانہ وطن بعد میں“ کی منطق کی دلدل میں پھنس گئے۔ اس دوران ان کے قلم سے کئی ایسی باتیں صفحۂ قرطاس پر منتقل ہو گئیں جو ان کے ذاتی، نظریاتی، سیاسی مخالفین اب ان کے سامنے رکھ دیتے ہیں اور ان سے کوئی جواب نہیں بن پڑتا۔ مولانا مودودی نے ۴۱۔۱۹۴۰ء میں جماعت اسلامی کے قیام سے عین پہلے کی ایک منطق سے جون ۱۹۴۷ء میں پنڈ چھڑانے کی کوشش کی تھی۔ اور سلہٹ اور سرحد کے ریفرنڈم میں جماعت اسلامی کے کارکنوں کو ہدایت کی کہ وہ پاکستان میں شمولیت کے حق میں ووٹ ڈالیں اور ڈلوائیں عین آخری مرحلہ پر یہ حقیقت پسندی شاید چھ سالہ نظری مخالفت کے کفارہ کے طور پر قبول کر لی جاتی لیکن قیام پاکستان کے بعد مولانا مودودی پھر حقیقت پسندی سے معرا منطق کا شکار رہ گئے اور پاکستان سے وفاداری کے حلف اور جہاد کشمیر سے متعلق ان کی ناقابل فہم آراء نے ان کی جماعت کے ماضی کو ایک مرتبہ پھر خاص اہمیت سے بہرہ ور کر دیا۔ اس کی پاداش میں وہ ڈیڑھ

پونے دو سال نظر بند رہے۔ نظری علم اور عملی حقائق میں اس عدم مطابقت کا اعادہ انہوں نے ۱۹۵۰ء کے پنجاب کے عام انتخابات میں کیا، جب انہوں نے انتخابات میں ازخود امیدوار بننے کو اسلامی تعلیمات کے منافی قرار دیا اور سیاسی اصطلاحات میں "صالحیت" کے اضافہ کا موجب بنے۔ ان انتخابات میں جماعت اسلامی کا صرف ایک امیدوار کامیاب ہوا جس نے اسمبلی میں ایک مرتبہ بھی اظہارِ خیال نہ کرنے کا ریکارڈ قائم کیا۔

قیامِ پاکستان کے بعد جماعت اسلامی دوسری اہم آزمائش سے ۱۹۵۳ء کی احمدیہ ایجی ٹیشن میں دوچار ہوئی، مولانا مودودی کو اس میں حصہ لینے کی پاداش میں سب سے سخت (موت کی) سزا سنائی گئی، لیکن جو عناصر اس ایجی ٹیشن کے آج بھی ہیرو بنتے ہیں انہوں نے اس کے باوجود مولانا کو قابلِ پذیرائی نہ سمجھا۔ اور ان دنوں جماعت اسلامی سے متعلق اور اس کے خلاف جو بیان بازی ہو رہی ہے اس میں شریک عناصر وزیر داخلہ کے سب سے بلند آہنگ ہمنوا ہیں۔

دستور کو اسلامی بنانے کی جدوجہد میں مولانا مودودی نے سرگرم حصہ لیا۔ اس سلسلہ میں انہوں نے ملک بھر کے رنگا رنگ ۳۵ سرکردہ لیکن مختلف الخیال علماء کو ۲۲ بنیادی نکات پر متفق کرنے میں کامیاب کردار ادا کیا۔ قراردادِ مقاصد منظور ہونے کے بعد جماعت اسلامی مملکت کی اسلامی بنیادوں کے بارے میں تو مطمئن ہوگئی لیکن اس کے بعد اسلام دوستوں اور سیکولر پسندوں میں جو علمی مباحث اور مذاکرے ہوئے اس میں سب سے زیادہ نشانہ تنقید جماعت اسلامی ہی کو بنایا گیا۔ ۱۹۵۶ء کے آئین نے اس بحث کی شدت کو کم کر دیا لیکن اس کے بعد ملک کے سیاسی حالات میں انتشار کو غلبہ حاصل ہونے لگا جو بالآخر اکتوبر ۱۹۵۸ء کے فوجی انقلاب پر منتج ہوا۔ اس دوران جماعت اسلامی بھی اپنی پندرہ سولہ سالہ تاریخ میں پہلی مرتبہ سخت داخلی انتشار سے دوچار ہوئی اور اس کے سرکردہ رکن اس سے علیحدہ ہو گئے۔ ان میں جماعت اسلامی کے تین سربراہ مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا عبدالجبار غازی اور مولانا عبدالغفار حسن بھی شامل تھے۔ زیرِ نظر تالیف میں یہ بحث پوری تفصیل سے موجود ہے۔

مارشل لاء کے ساڑھے تین سال میں جماعت اسلامی بھی ختم ہوگئی۔ لیکن یہ حقیقت

ہر واقف حال پر واضح تھی۔ کہ جمہوریت و سیاست بحال ہوتے ہی جو جماعت سب سے پہلے انگڑائی لیکر (ما قبل اکتوبر ۱۹۵۸ء کی حالت میں) اُٹھ کھڑی ہوگی وہ صرف جماعت اسلامی ہوگی، اور ہوا بھی یہی۔ بحالی جمہوریت کے بعد سیاسی تنظیم کے میدان میں جو خلاء جاری بلکہ روز افزوں ہے، اس نے جماعت اسلامی کی تنظیم کو اور نمایاں کر دیا ہے۔ بحالی جمہوریت کا مسئلہ متحدہ یا قومی جمہوریت کے محاذ کے مذاکرات میں مولینا مودودی نمایاں حصہ لیتے رہے ہیں، اور بعض حلقوں کا یہ خیال ہے کہ مشرقی پاکستان نے تنسیخ آئین کا جو غیر مشروط نعرہ بلند ہوا تھا اسے آئین میں ترمیم کے مطالبہ و تحریک میں تبدیل کرنے میں جن اصحاب نے مؤثر حصہ لیا ان میں مولانا مودودی سر فہرست ہیں، اگر مولانا مودودی کے ۱۹۴۱ء حتیٰ کہ ۵۰-۱۹۴۹ء کے مؤقف کا آج کے انداز فکر سے موازنہ کیا جائے، تو صاف معلوم ہوتا ہے، کہ اب جماعت اسلامی کوئی مذہبی تنظیم نہیں بلکہ سیاسی جماعت ہے۔ اب وہ صرف اسلام کی علمبردار نہیں بلکہ اسلام کے ساتھ جمہوریت کی بھی داعی ہے، یہ کوئی معمولی بات نہیں،

یہ طویل جائزہ اس لئے ضروری معلوم ہوا کہ آج جماعت اسلامی ایک مرتبہ پھر بحث و نظر کا موضوع بن گئی ہے، زیر نظر تالیف "جماعت اسلامی کا رُخ کردار" میں اس جماعت کے متعلق مخالفانہ مواد کسی جرح و تنقید و ترتیب کے بغیر جمع کر دیا گیا تھا حتیٰ کہ بعض ایسے کانگریسی[1] اور احراری علماء کے فتوے بھی شامل کر دیئے گئے جو تحریک پاکستان کی مخالفت میں مولانا مودودی سے ایک دو قدم نہیں کئی کوس آگے تھے محض مخالفت سے قطع نظر جماعت اسلامی "مسلم سیاسیات" کے مطالعہ کا ایک اچھا موضوع ہے۔ اسلام کی نشاۃ ثانیہ، اسلامی حکومت کا احیاء، اسلامی قانون کا نفاذ مسلمانوں میں ایک دل پسند خیال، مقبول تحریک اور دلکش نعرہ رہا ہے، اور آج بھی ہے، صدر ایوب نے اپنی یکم نومبر کی (دوسری ماہانہ) نشری تقریر میں "سیاسی اقتدار کیلئے مذہب کا استعمال" کے ضمن میں جو باتیں کہی ہیں۔ ان میں اگرچہ جماعت اسلامی کا نام نہیں لیا گیا لیکن اشارہ اسی جماعت کی طرف ہے، صدر ایوب نے بھی یہ کہا ہے کہ ہمارے ملک کے لوگ دنیا میں سب سے زیادہ مذہب پسند ہیں، لیکن اس ساتھ ہی وہ سیدھے سادھے

---

[1] جو مسلمان مذہبی لحاظ سے انہیں سند سمجھتے ہیں انکی تسلی و اطمینان کیلئے درج کئے ہیں (مرتب)

اور بھروسہ کرنے والے بھی ہیں، اور مذہب کے نام پر وہ ہر بات قبول کرنے کیلئے تیار ہو جاتے ہیں، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جماعتِ اسلامی کی اپیل مسلمانوں کے مذہبی جذبے سے ہے لیکن اس اپیل کو وہ ہمہ گیر کیفیت حاصل نہیں ہو سکی جو عصرِ حاضر میں تحریکِ پاکستان کا منفرد اعزاز اور لازوال کارنامہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جماعتِ اسلامی شروع ہی سے نظری استدلال کو عملی حقائق اور مقتضیاتِ زمانہ سے زیادہ اہمیت دیتی آئی ہے مثلاً

۱۔ دو قومی نظریہ کی علمی حمایت لیکن تحریکِ پاکستان سے عملی علیحدگی،
۲۔ پاکستان کو مسجد کی طرح مقدس سمجھنا لیکن اس سے حلف وفاداری میں تامل،
۳۔ کشمیر کو پاکستان کی شہ رگ قرار دینا لیکن اس کے حصول کی عملی مساعی میں تامل و اضطراب
۴۔ انتخابات میں حصہ لینے لیکن اُمیدوار نہ بننے پر ناقابلِ فہم اصرار،

یہ سب نظری استدلال کو عملی حقائق اور مقتضیاتِ زمانہ سے زیادہ اہمیت دینے کا عجیب نتیجہ اور خود جماعتِ اسلامی کے لئے پریشان کن شاخسانہ ہے ؎

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر
تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریفِ سنگ

جماعتِ اسلامی اس وقت بھی نظری استدلال اور عملی حقائق میں عدم مطابقت کی ایک اور الجھن میں گرفتار ہے، ہماری مراد جمہوریت کی علمبرداری اور اپنے وابستگان کی جمہوریت کے معروف معمول کے منافی درجہ بندی کی ہے، جماعتِ اسلامی اسے تربیت کا تقاضا قرار دیتی ہے، حالاں کہ متفق الخیال کو بنیادی سطح پر مساوی قرار دیکر بھی تربیت کے تقاضے پورے کئے جا سکتے ہیں۔ جماعتِ اسلامی کے وابستگان کی درجہ بندی اسی نوعیت کی ہے جس طرح کمیونسٹ پارٹی کی ہے، یا فسطائیوں اور نازیوں کی تھی، محدود رکنیت سے بلاشبہ تنظیم مستحکم رہتی ہے لیکن معروف زمانہ جمہوری معمول سے گریز و انحراف سے نہ جمہوری شان پیدا ہو سکتی ہے، اور نہ جمہوری پذیرائی۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے، کہ فیصلے تو جماعتِ اسلامی کے ارکان کرتے ہیں، لیکن ان پر جرح و تنقید کی مدافعت ہمدرد و متفقین کرتے ہیں،

جماعتِ اسلامی نے تجربہ و مشاہدہ کے بعد اپنے فکر و نظر میں کافی تبدیلی اور لچک پیدا

کی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تربیت کے نام پر وہ متفق الخیال جمہور کی جو درجہ بندی اب علمبرداری جمہوریت کے دور میں بھی ضروری سمجھتی ہے آگے چل کر وہ اس سدِ راہ کو ہٹانے کی ضرورت محسوس کرے۔ مذہبی عقائد کی اور بات ہے لیکن حالاتِ زمانہ کے تحت خیالات (سیاسی خیالات بھی اسی ضمن میں آتے ہیں) تغیر پذیر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے جو شخص یا مفکر ایسا دعویٰ کرتا ہے وہ حقائق کی جگہ خوابوں کی دنیا میں رہتا ہے۔ جماعت اسلامی اس وقت درمیانہ (معاشرتی، معاشی و علمی) کے اسلام پسندوں پر مشتمل ہے (غریب جن کی وطن عزیز میں بھاری اکثریت ہے) اس جماعت میں سرِ دست کوئی ٹھوس کشش محسوس نہیں کر سکتے کیونکہ اسلام کو جمہوریت کی علمبردار ہونے کے باوجود جمہور المسلمین کی بہبود کیلئے اس نے اب تک کوئی دوٹوک معاشی پروگرام مرتب اور پیش نہیں کیا۔ پڑھے لکھے اور دانشور بھی اس جماعت سے کوئی خاص دلچسپی نہیں رکھتے جن عصری تقاضوں سے پڑھے لکھے لوگ متاثر ہیں۔ ان کے نزدیک جماعت اسلامی ان کے احساس و شعور سے معرا ہے۔ رہ گئے امیر و مقتدر لوگ تو وہ جن اقتدار سے مسحور و مرعوب ہیں، جماعت اسلامی کا دامن ان سے یکسر خالی ہے۔

ہمیں احساس ہے کہ اس جائزہ میں زیرِ نظر تالیف "جماعت اسلامی کا رُخِ کردار" کی جگہ جماعت اسلامی کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ لیکن اس جائزہ کا اس کتاب کے موضوع سے بہرحال براہ راست تعلق اور گہری مناسبت ہے۔ جو اصحاب جماعتِ اسلامی کا تنقیدی مطالعہ کرنا چاہتے ہیں، "جماعت اسلامی کا رُخِ کردار" میں پیش کردہ مواد ان کے بہت کام آسکتا ہے۔

چودہری حبیب احمد صاحب تحریکِ پاکستان کے ایک مخلص کارکن ہیں، جن عناصر نے تحریکِ پاکستان کی مخالفت کی وہ نئی نسل کے سامنے انہیں بے نقاب کرنے کو اپنا مشن قرار دے چکے ہیں۔ "جماعت اسلامی کا رُخِ کردار" کی نقاب کشائی سے فارغ ہونے کے بعد اب وہ کانگریسیوں احراریوں وغیرہ کے متعلق مواد جمع کر رہے ہیں۔ ان کا ارشاد ہے، کہ یہ مواد بھی آنکھیں کھول دینے والا ہوگا۔ اُمید ہے کہ وہ رسوائے زمانہ یونینسٹوں کو نہیں بھولیں گے، کیوں کہ اس طبقہ اور اس کے اندازِ فکر نے سیاستِ پاکستان میں موقع پرستی، بے اصولی، مفاد پرستی کو ایسی مستقل حیثیت دے دی ہے کہ اصلاح

احوال کی ہر سعی و تدبیر ان کی بدولت ناکام ہو جاتی ہے (رازی)
روزنامہ "نوائے وقت" ۵ نومبر ۱۹۶۴ء

جماعت اسلامی کا رخ کردار

اس کتاب میں جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، جماعت اسلامی کے کردار کو اس کے حقیقی رنگ و روپ میں سامنے لایا گیا ہے اور اس طرح اس کے اس مقدس نقاب کو اٹھایا گیا ہے جس کی اوٹ میں یہ لوگ عوام کو دھوکا دیتے ہیں۔ کتاب کے مؤلف لائلپور کے چودھری حبیب احمد ہیں۔ اور انہوں نے جماعت اسلامی کے امیر محترم ابوالاعلیٰ صاحب مودودی اور دیگر اکابرین کی سینکڑوں تحریروں کے اقتباسات سے بتایا ہے، کہ یہ جماعت گذشتہ تیس برس میں تحریک پاکستان، تحریک جہاد کشمیر اور دیگر اہم سیاسی اور مذہبی امور میں کس طرح ملت کے اجتماعی مفاد کے خلاف سرگرم کار چلی آرہی ہے، اور اس کا اسلام کیونکر اپنی مصلحت کوشیوں اور مفاد پرستیوں کی خاطر آئے دن بدلتا رہتا ہے۔ اس کتاب کے ذریعے وہ تضاد بیانیاں بھی اپنے اصلی الفاظ منظر عام پر آگئی ہیں جو اس جماعت کے امیر، اقامت دین کے پردے میں کئی سالوں سے روا رکھے ہوئے ہیں، اور اس سے واضح ہو جاتا ہے، کہ یہ کس قسم کا انوکھا اسلام ہے جسے اس شد و مد سے مسلمانوں کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے،

کتاب کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے، کہ مؤلف نے ان تحریروں کو یکجا کرنے میں خاصی محنت اور عرق ریزی سے کام لیا ہے، اور اس طرح ان لوگوں کو جو جماعت اسلامی اور اس کے امیر کی حقیقت کو سمجھنا چاہتے ہیں، اس زحمت سے بچالیا ہے، کہ وہ ان حضرات کی تمام کتابوں اور پمفلٹوں کے مطالعہ کی کاوش میں مبتلا ہوں،

جماعت اسلامی، پاکستان اور اسلام دونوں کیلئے بڑے خطرے کا موجب ہے، اور چونکہ روپیہ ان کے پاس بے پناہ ہے، اس لئے ملک کے پراپیگنڈہ کی مشینری پر

انہیں قبضہ حاصل ہے۔ ان حالات میں ان کی حقیقت کو واشگاف کرنے کیلئے جو کوشش بھی جاتے وہ ملت اور اسلام دونوں کی نگاہوں میں مستحسن قرار پائے گی۔ اس اعتبار سے ہم مؤلف کی اس کوشش کو قابل مبارکباد سمجھتے ہیں۔ کتاب میں جس قدر مواد جمع کیا گیا ہے۔ اگر اس کی ترتیب میں بھی اسی قدر کاوش کی جاتی تو کتاب کی افادیت بڑھ جاتی اُمید ہے اس کے آئندہ ایڈیشن میں وہ اس کمی کو پورا کر دیں گے۔

کتاب ..۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اور پاکستان ٹائمز پریس نے اسے بڑے خوبصورت انداز سے شائع کیا ہے۔ اس کتاب کی ضخامت اور حسن صوری کے اعتبار سے پانچ روپے قیمت زیادہ نہیں۔ (نقد و نظر، طلوعِ اسلام اگست ۱۹۶۳ء)

جماعتِ اسلامی کا رُخ کردار

مرتبہ۔ چودھری حبیب احمد، طابع و ناشر۔ پاکستان ٹائمز پریس لاہور، قیمت پانچ روپے

ہمارے محترم دوست چودھری حبیب احمد اخبارات کی دُنیا میں غیر متعارف نہیں ہیں، انہوں نے حال ہی میں ایک جامع کتاب مرتب کی ہے جس میں دورِ حاضر کے سب سے زیادہ منظم فرقے کے سربراہِ اعلیٰ مولانا مودودی کی تحریروں کا عکس لیکر انہیں قارئین کے مواخذہ و احتساب کیلئے پیش کیا ہے۔ اس کتاب پر چند سطور لکھنے سے پہلے اسی دور کے پس منظر کا ذکر ضروری ہے جس میں آج کے عوام سانس لے رہے ہیں۔

قیام پاکستان اس صدی کا ہی نہیں تاریخ کا ایک بہت بڑا اعجاز نما کارنامہ ہے قائدِ اعظمؒ کی فراست، سیاست، بصیرت اور قیادت میں مسلمانوں کا پریشان احوال طبقہ منظم ہوا اور نہایت قلیل عرصے میں اللہ تعالیٰ نے ان کی دعاؤں کو قبول کر کے برِصغیر میں پاکستان کے قیام کی راہیں صاف کر دیں تا آنکہ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان قائم ہوا، اور بحمد اللہ اسے سیاسی استحکام و دوام حاصل ہونے کے اسباب بھی حاصل اور مہیا ہو گئے حقیقتاً قیام پاکستان کی صورت میں پہلی دفعہ مسلمانوں نے طویل پسپائیوں کے بعد اللہ تعالیٰ کی فتح و نصرت کی بشارت پائی، اور مسلمان اسے اسی محبت و عقیدت سے دیکھتے ہیں جس کا یہ ملک [illegible] طور پر مستحق ہے۔

برِصغیر کی جدوجہد آزادی کئی منزلوں سے گزر رہی تھی۔ اور انیسویں صدی کے آخری

نصف سے لیکر بیسویں صدی کے پہلے ثلث تک جن تحریکوں نے مسلم عوام میں قبول پایا۔ کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ وہ آزادی کے حصول تک لوگوں کا ساتھ نہ دے سکیں، اور آزادی کے وقت مسلم عوام بلا استثنیٰ قائدِ اعظم کی قیادت و سیادت کو ہی تسلیم کرتے تھے۔ تحریک پاکستان اور قیامِ پاکستان نے جہاں عوام کو ضبط و نظم، یقین محکم اور اعتماد کی دولت دی۔ وہاں قائدین کی صفوں میں ایک عجیب اضطراب بھی پیدا ہوتا رہا، اور وہ لوگ اور گروہ جو پیشے کے لحاظ سے اپنے آپ کو سکہ بند لیڈر سمجھتے تھے اور جن کی علمی کم اساسی اور سیاسی کم سوادی کے ساتھ اقتصادی کم ظرفی بھی بعض اوقات قوم کے لئے وجہ تحقیر بنی رہی۔ اور جو بارہا خطابت و نقابت کی جھولی میں قوم کی سوداگری کا معاوضہ بھی وصول کرتے رہے ہیں، اس صورتِ حال سے زیادہ پریشان مگر بے بس تھے،

(نقد و نظر) روزنامہ عوام ۳۱ جنوری ۱۹۶۳ء لائلپور

ہفت روزہ "نظریۂ پاکستان"

مدیر۔ جناب حبیب احمد چودہری ، مقامِ اشاعت :۔ لائلپور

پہلا اقتباس | تحریک پاکستان کے نامور مجاہد اور نظریۂ پاکستان کے بے باک مبلغ جناب حبیب احمد چودہری کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں انہوں نے نظریۂ پاکستان کی حفاظت اور حصانت کیلئے تنہا اتنا کام کیا ہے۔ کہ شائد کوئی مکمل ادارہ بھی ان کی برابری کا دعویٰ نہ کر سکے،

حبیب احمد چودہری پاکستان کیلئے اتنے متعصب ہیں کہ ہر محب وطن پاکستانی کو ان پر رشک آتا ہے۔

دوسرا اقتباس | وقت نے ثابت کر دیا ہے کہ پاکستان کیلئے ہر دل میں وہی عصبیت حسنہ ہونی چاہیئے تھی جو حبیب احمد چودھری کے دل میں ہے۔ پاکستان کا قیام اور پاکستان کی بقا اس کے بغیر (خدانکردہ) ممکن ہی نہیں۔ پاکستان کے دشمنوں نے پاکستان کو نقصان پہنچانے کا کبھی کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ تحریک پاکستان سے سنگدلانہ بیگانگی اور نظریۂ پاکستان سے مجرمانہ اغماض نے ہمیں بدتر حالات سے دوچار کیا ہے، اور جب تک ہم پاکستان کی نظریاتی اساس کو جزوِ ایمان نہیں بنائیں گے

اور اس کی حفاظت کے لئے مجاہدانہ کردار نہیں پیدا کریں گے ہم پاکستان کو زندہ وسلامت یا وہ مقصد حاصل کرنے کے قابل نہیں بنا سکیں گے جس کے لئے پاکستان قائم ہوا ہے، اس محاذ پر جناب حبیب احمد چودھری ڈٹے ہوئے ہیں۔

متذکرہ بالا اقتباسات ہم نے اس ریویو سے لئے ہیں جو جناب خلیق قریشی (مرحوم ومغفور) نے ہفت روزہ "نظریۂ پاکستان" لائلپور رپۂ عوام" میں کیا تھا۔ جو راقم کی مجبوری اور دفتر سے غیر حاضری اور کارکنوں کی غیر ذمہ دارانہ تحریرات اور اقدامات کی وجہ سے بند ہو گیا تھا۔ اور بندہ ابھی تک جس کی بحالی اور اجراء کی ابھی اپنے اندر سکت نہیں پاتا اور ہمت نہیں رکھتا۔ حالات خوشگوار اور سازگار ہوئے تو دیکھا جائے گا۔ (مرتب)

جماعتِ اسلامی کا رُخ کردار

مرتب۔ چودھری حبیب احمد، ضخامت۔ ۳۶۸ صفحات، قیمت پانچ روپے
ناشر:۔ پاکستان ٹائمز پریس۔ لاہور

جماعتِ اسلامی کے سیاسی مقاصد کیا ہیں، ان مقاصد کے حصول کیلئے صلحا کی یہ جماعت کیا حربے اور طریقے استعمال کرتی ہے، جماعت اسلامی تحریک پاکستان کی کیوں مخالف تھی، مسلمانان ہند کی جدوجہد آزادی اور تحریک پاکستان کی مخالفت میں اس جماعت اور اس کے قائدین نے کیا کردار ادا کیا، قیام پاکستان کے بعد جماعت اسلامی نے کیا روش اختیار کی اور کس طرح اسلام کے مقدس نام پر سیاست گری کا بازار گرم کیا اور غلبہ و تفوق حاصل کرنے کیلئے تحریر و تقریر سے عوام کو کس کس طرح گمراہ کیا، یہ وہ سوال ہیں جن کا جواب آپکو اس کتاب میں ملے گا، چودھری حبیب احمد نے جماعت اسلامی کے لٹریچر اور مولانا مودودی کی تصانیف اور بیانات ہی کے حوالوں سے اس جماعت اور اس کے متعلقین کے عزائم کو بے نقاب کیا ہے۔ یہی نہیں اسلامی تعلیمات اور عقائد کے بارے میں اس جماعت کی تصریحات اور تنقیحات پر فاضلانہ تبصرہ کیا ہے۔ اور ثابت کیا ہے کہ وہ لوگ جو فہم قرآن میں اپنے آپکو فرد وگرد انتے ہیں، اور جو صرف اپنے رفقاء ہی کو صالح اور سچا مسلمان اور عامۃ المسلمین کو نسلی مسلمان کہتے ہیں۔ اپنے کردار اور گفتار کے اعتبار سے

ان کی حیثیت کیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ جہاں اسلام کا نام آیا مسلمانوں نے تکریم میں گردن جھکالی اور جس نے چاہا اسلام کے مقدس نام پر انہیں اپنے مقاصد کے حصول کا آلہ کار بنالیا اس کاروبار میں جماعت اسلامی ہمیشہ پیش پیش رہی ہے۔ اس نے اسلام ہی کے نام پر قیام پاکستان کی مخالفت کی، اور اب اسلام ہی کے نام پر پاکستانی عوام میں تفرقہ و انتشار کے بیج بو رہی ہے، لیکن اس چابکدستی اور ہنرمندی کے ساتھ کہ بہت کم نگاہیں جو پس پردہ حقائق کو دیکھتی ہوں، اگر کوئی شخص "صلحاء" کے اصل مقاصد کو بھانپ بھی لیتا ہے، تو محض اس ڈر سے خاموش رہتا ہے، کہ کہیں "قدوسیوں" کا یہ گروہ اسلام کے نام پر اسے زندیق و ملحد قرار دینے کی مہم شروع نہ کردے۔ چوہدری حبیب احمد نے یقیناً بڑی جرأت اور دلیری سے اس جماعت کے فکری و نظری اور عملی ڈھانچے پر نقد و نظر کی ہے، اور ایک ایسے فتنے کی نشاندہی کردی ہے، جو بڑھا تو ملک و قوم ایک آزمائش سے دوچار ہو جائے گی، ان کا استدلال وقیع انداز بیان پر اثر اور ہر دعویٰ مبنی بر حقائق ہے، اس کتاب کے مطالعے سے مصنف کی حب الوطنی اور دردمندی کا احساس ہوتا ہے غالباً یہی وجہ ہے، کہ کہیں کہیں ان کے لب و لہجے میں تلخی آگئی ہے، مجموعی طور پر یہ ایک دلچسپ مطالعہ ہے، اور غالباً یہ پہلا موقعہ ہے، کہ ایک "منظم تحریک" کا اتنا مبسوط محاسبہ کیا گیا ہو، کتابت و طباعت معیاری ہے (روزنامہ "امروز" ۲۸ جولائی ۱۹۶۳ء)

The Pakistan Times 11 Aug 1963

BOOK REVIEW

"Jama'at-i-Islami Ka Rukh-i-Kirdar," by Chaudhri Habib Ahmed. Published by the author. Price Rs. 5.00, Pp. 368.

The well organised propaganda machinery of reaction that works under the name of Jama'at-i-Islami in this country needs no expose of its aims and objects, because its own pronouncements on important aspects of national policy, like Kashmir, have given it away time and again. In the name of reviving Islam, this group of so-called reformers is trying to turn back the wheel of history and negate the entire revolutionary teachings of our nation's great minds, like Sir Sayyed Ahmed Khan, Allama Iqbal and the Quaid-i-Azam. Laying stress on all the prejudices of our decadent feudal period, and serving the needs of colonialist powers, they equate Islam with landlordism and capitalism. They have discovered sanctions even for slavery in women.

This book by Chaudhri Habib Ahmed (a close associate of Maulana Maudoodi, with whom he parted company when the Maulana designated the struggle of the Muslims of Kashmir for independence as "no more than a "riot") is written with the purpose of giving a detailed view of Jama'at-i-Islami's real face behind its mask of piety. It brings to light the numerous contradictions of ideology, policy and tactics, which fill the literature and lives of the leaders of this group of neo-fascists. It gives a resume of the careers of Maulana Maudoodi, Nasrullah Khan Aziz, and Kausar Niazi among others, and seeks to prove that far from being the reformers of Pakistani society as they claim to be, these gentlemen worked day and night to distract, disrupt and destroy the movement of Muslim masses for an independent homeland. Having failed in their unholy war against the Muslims they migrated to Pakistan to sow seeds of dissension and subvert the country from within. The well-informed and scholarly writer of this book has brought together quotation after quotation from the writings and speeches of the leaders of Jama'at-i-Islami to give the lie to their sympathy for Muslims (whom they do not even regard as Muslims until they join the "Jama'at"), and exposes them as fascists who are against the entire revolutionary struggle of the people for a better life. The aim of their propaganda machinery, which is extremely well organised, and therefore dangerous, is to discredit the real leaders of Muslims like the Quaid-i-Azam, and to establish their own leadership by hook or by crook, and lead the country back into the darkness of colonial rule.

The author needs to be congratulated on his research. It rambles and goes back and forth in time, not sticking to a well-organised plan, but it is extremely helpful in providing the people with a mass of historical material on the machinations of Jama'at-i-Islami.

—MANZAR

(The book is available from Chaudhri Habib Ahmed, c/o The Pakistan Times Press, Lahore).

Just for a single moment — Habib Chaudhry

پہلا باب

مولانا مودودی اور مسلم لیگ

قلابازی

مودودی صاحب نے ۱۴ اگست ۱۹۷۶ء نوائے وقت لاہور میں ایک بیان شائع کیا ہے جس میں وہ فرماتے ہیں کہ:-

آپ کی معلومات کیلئے اتنا کہنا کافی سمجھتا ہوں کہ ہوش سنبھالنے کے بعد جب میں نے ملکی سیاست میں دلچسپی لینی شروع کی تھی۔ میرے دل میں مسلمانوں کے جن لیڈروں کا احترام سب سے زیادہ تھا اُن میں قائدِ اعظمؒ مرحوم بھی تھے میں نے ہمیشہ اُن کو ایک با اصول راست باز اور مضبوط سیرت و کردار کا مالک انسان سمجھا، اور ۱۹۲۰ء سے ۱۹۴۸ء تک کبھی میرے دل میں اُن کے متعلق بدگمانی پیدا نہیں ہوئی کہ وہ اپنے ضمیر کے خلاف بھی کوئی بات کہہ سکتے ہیں۔"

قارئین کرام! مولانا مودودی بے ہوشی اور نشۂ ہوسِ اقتدار کی مدہوشی میں حضرت قائدِ اعظمؒ کے بارے میں کیا کیا دلخراش، توہین آمیز اور ہتک انگیز باتیں کہہ گئے ہیں، ان کی تحریرات کے آئینہ میں دیکھئے۔ مودودی صاحب کا ۱۴ اگست ۱۹۷۶ء کا تازہ بیان آپ حضرات کے سامنے ہے، اسی لئے ہم پہلے باب میں ہی انکے مصلحتی جھوٹ اور فریب آمیز طرزِ نگارش کو بے نقاب کر رہے ہیں، اس "اللہ کے شاہکار" نے اللہ اور رسولؐ کے دین کی روشنی میں اٹھائی گئی تحریکِ پاکستان اور قائدین تحریک قیامِ پاکستان کے خلاف کس قدر زہر اُگلا ہے۔ اسے حقیقت کی آنکھ سے دیکھئے اور بے لاگ علم و شعور سے پرکھیئے، وہ لوگ جو سیم وزر کے بہتے سیلاب میں بہے، شاہ کے وظیفہ خوار کی حیثیت رکھتے ہیں، ہم ان سے دلی طور پر معذرت خواہ ہیں، یہ معروضات دیدۂ کور، دیدۂ خفاش کے لئے نہیں ہماری گذارشات دیدۂ بینا کے لئے ہیں، ؎

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی
ہو دیکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئی (اقبالؒ)

پھر آج جن مسلمانوں کو درسِ جمہوریت دیا جا رہا ہے، قائدِ اعظمؒ اور تحریکِ قیامِ پاکستان کی مخالفت و مخاصمت کے وقت وہ مودودی صاحب کو کیا نظر آ رہے تھے اور انہیں کن کن خطابات سے نوازا جا رہا تھا۔ وہ بھی قابلِ توجہ اور لائقِ انصاف ہیں، مؤرخ کو اس سے تعلق نہیں کہ اب پاکستان میں سیاست کا رُخ کیا ہے، دیکھنا تو صرف یہ ہے کہ جس پاکستان میں سیاست بازوں کا یہ مصلحتی جھوٹ بکنار گروہ اب سرگرمِ سیاست ہے، اس کے حصول کی تحریک میں اس کا کیا کردار تھا۔ ہم نے طبیعت مفاہمت نا آشنا پائی ہے، یہی وجہ ہے کہ ؎

اپنے بھی خفا مجھ سے بیگانے بھی سب ناخوش
میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند (اقبالؒ)

آئیے! اب ہمارے ساتھ جماعتِ اسلامی کے امیر و امام اور اُن کی جماعت کے تاریخی کردار پر نظر ڈالئے، اور اُن کی ذہنی قلابازیاں ملاحظہ فرمائیے۔ (چوہدری حبیب احمدؒ)

مسلمانوں کیلئے قابلِ غور و فکر

مسلمانوں سے مودودی کا تعلق ۱؎

"مسلمانوں سے ہمارا تعلق صرف اسی حد تک ہوگا جس حد تک ان کا تعلق اسلام سے ہے۔ جو اپنی خواہشِ نفس اور ہر غیر اللہ کی بندگی چھوڑ کر صرف اللہ کی بندگی میں آ جائے وہ ہمارا بھائی اور رفیق ہے، خواہ وہ نسلی مسلمانوں میں سے آئے یا غیر مسلمانوں میں سے۔ ہم پیدائشی مسلمانوں کو بھی اسی مسلک کی طرف دعوت دیں گے اور پیدائشی غیر مسلمانوں کو بھی۔ ہمارے نزدیک اسلام کا دامن نسلی مسلمانوں کے دامن سے بندھا ہوا نہ ہوگا۔ کہ وہ اُٹھیں تو وہ بھی اُٹھے اور یہ نہ اُٹھیں تو وہ بھی نہ اُٹھے، اسلام انکے باپ دادا کی جائیداد نہیں ہے، یہ اس کیلئے جینے اور اس کے لئے مرنے پر تیار ہوں تو ہم خوش اور ہمارا خدا خوش۔ ورنہ جس جہنم میں ان کا جی چاہے جا کر گر جائیں، ہم اللہ کا کلمہ دوسرے انسانوں کے پاس لے جائیں گے۔"

۱؎ صفحہ ۱۲۲ عنوان، اسلام کی راہِ راست اور اس سے انحراف کی راہیں

میں حذف کرتے چلے جا رہے ہیں، لوگوں کے پاس محفوظ ہیں لیکن کیا کیا جائے مولانا مودودی جس مصلحتی اسلام کے داعی ہیں، اس میں انہوں نے بوقت ضرورت جھوٹ بولنے کی اجازت مرحمت فرمائی ہوئی ہے ایسوں کو تو خدا ہی سمجھے،

آگے چل کر "افسوس کہ اس 'روشن' کارنامے کو بھی ہم بدترین غلطیوں سے واغدار پاتے ہیں اور بری طرح ان کا خمیازہ بھگت رہے ہیں تقسیم ہند کا معاملہ جس طریقے سے طے کیا گیا وہ غلطیوں بلکہ حماقتوں کا ایک مجموعہ تھا۔

(صفحہ ۱۳۶، ترجمان القرآن۔ جولائی ۱۹۴۸ء)

ٹھیک ہے آپ کے نزدیک تقسیم ہند غلطیوں اور حماقتوں کا مجموعہ ٹھہری لیکن ان حماقتوں اور غلطیوں کا گہوارہ (پاکستان) اس میں آپکی دلچسپیاں اس قدر کیوں ہیں کیا آپ پاکستان اور اسلام پر رحم نہیں کر سکتے اور کرم نہیں فرما سکتے (راقم)

مخصوص ہتھیار سفید جھوٹ

مودودی صاحب مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ دوم صفحہ ۵۰ (چھٹا ایڈیشن) میں لکھتے ہیں، "ہندوؤں کا پہلا حملہ اسلامی قومیت پر ہے، وہ مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ تم سرے سے کوئی قوم ہی نہیں ہو۔ یہ محض برطانوی سامراج کا ایک داؤں اور چند سامراجی ایجنٹوں کا پروپیگنڈہ ہے جس نے تمہارے دماغ میں یہ ہوا بھر دی ہے کہ تم ایک قوم ہو، حالانکہ سیاسی اور معاشی نقطۂ نظر سے ہندوستان میں صرف ہندوستانی قوم ہی پائی جاتی ہے اور اس قوم کے اندر ایک دوسری قوم کا موجود ہونا سراسر ایک لغو تخیل ہے۔ (لیکن انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ) مسلمان غیر مسلموں کے ساتھ ایک قومیت بنانے اور اس میں جذب ہو جانے کے لئے تیار نہیں ہو سکتے۔

(جلد دوم صفحہ ۵۰)

دوسرا اقتباس "مسلمانوں کو اپنے مسلم نام پر بڑا فخر ہے۔ خدا کا رکھا ہوا نام اور وہ نام ہے جس سے بڑھ کر عزت و افتخار کا نام آج تک دنیا کی کسی قوم کو نصیب نہیں ہوا۔"

(مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش، جلد دوم صفحہ ۶۳)

دوسرا روپ

(مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم میں) ان کا سلسلہ مضامین جو ماہنامہ ترجمان القرآن بابت فروری ۱۹۴۱ء اور مارچ ۱۹۴۱ء میں شائع ہوئے، فرماتے ہیں:۔

"یہ انبوہ عظیم جس کو مسلمان قوم کہا جاتا ہے اس کا حال یہ ہے کہ اس کے ۹۹۹ فی ہزار افراد نہ اسلام کا علم رکھتے ہیں، نہ حق و باطل کی تمیز سے آشنا ہیں، نہ ان کا اخلاقی نقطۂ نظر اور ذہنی رویہ اسلام کے مطابق تبدیل ہوا ہے، باپ سے بیٹے اور بیٹے سے پوتے کو مسلمان کا نام ملتا چلا آرہا ہے، اس لئے یہ مسلمان ہیں، نہ انہوں نے حق کو حق جان کر قبول کیا ہے۔ نہ باطل کو باطل جان کر اسے ترک کیا ہے۔ ان کی کثرت رائے کے ہاتھ میں باگیں دیکر اگر کوئی شخص یہ امید رکھتا ہے کہ گاڑی اسلام کے راستے پر چلے گی تو اس کی خوش فہمی قابلِ داد ہے ..... ایک قوم کے تمام افراد کو محض اس وجہ سے، کہ وہ نسلاً مسلمان ہیں، حقیقی معنوں میں مسلمان فرض کر لینا اور یہ امید رکھنا کہ ان کے اجتماع سے جو کام بھی ہوگا، اسلامی اصول ہی پر ہوگا، پہلی اور بنیادی غلطی ہے"

(حصہ سوم ۔ صفحہ ۱۳۰)

مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ اوّل ملاحظہ فرمایئے۔

فرماتے ہیں ــــ "قانونی حیثیت سے ہر وہ شخص مسلم ہے، جو کلمہ طیبہ کا زبانی اقرار کرے اور ضروریات دین کا منکر نہ ہو..... ہم ایسے شخص کو کافر نہیں کہہ سکتے، نہ وہ حقوق دینے سے انکار کر سکتے ہیں جو مجرد اقرارِ اسلام سے اس کو مسلم سوسائٹی میں حاصل ہوتے ہیں۔" (حصہ اوّل صفحہ ۶۵)

لیکن ــ حصہ سوم میں یہ پیکرِ تضادات کہتا ہے کہ:۔

"یہاں جس قوم کا نام مسلمان ہے، وہ ہر قسم کے رطب و یابس سے بھری ہوئی ہے۔ کیرکٹر کے اعتبار سے جتنے ٹائپ کافر قوموں میں پائے جاتے ہیں، اتنے ہی اس قوم میں موجود ہیں۔" (جلد سوم صفحہ ۶۶)

قابل توجہ ــــ "اسلام کو تانبے کے ان سکوں کا خزانہ مطلوب نہیں جن پہ اشرفی کا ٹھپہ لگا دیا گیا ہو وہ سکے کے نقوش دیکھنے سے پہلے یہ دریافت کرتا ہے

کہ اِن نقوش کے نیچے خالص سونے کا جوہر بھی ہے یا نہیں یہ ایسا ایک سکہ اِن جعلی اشرفیوں کے ڈھیر سے، اُس کے نزدیک، زیادہ قیمتی ہے (جلد سوم صفحہ ۱۶۷)

جماعتِ اسلامی اور تحریکِ پاکستان

اس موضوع پر ۱۴ اگست ۱۹۷٦ء نوائے وقت لاہور کی اشاعت میں جناب مودودی نے ایک مبسوط مقالہ شائع کرایا،

فرماتے ہیں، "یہی وہ زمانہ تھا جس میں مسلم لیگ کانگریس کا مقابلہ کرنے کیلئے ایک زبردست عوامی قوت کی حیثیت سے قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ کی قیادت میں اُبھری۔ وطنی قومیت کا طلسم ٹوٹ گیا مسلمان اِس کے فتنے سے بچ گئے، اور ان کے اندر یہ جذبہ شدت کے ساتھ پیدا ہو گیا کہ ہندوستان میں ان کی قومیت کے اِمتیازی وجود کو ایک آزاد اور مستقل حیثیت ہونی چاہیئے"

دُوسرا اِقتباس - "اِس تحریک کے آغاز ہی سے عام مسلمان یہ سمجھ رہے تھے کہ اُن کی تمناؤں کا مرکز پاکستان ایک اِسلامی مملکت ہو گا جس میں اِسلام کا قانون جاری ہو گا اور اِسلامی تہذیب زِندہ کی جائے گی۔ اِس لیے اِس کا نعرہ یہ تھا کہ پاکِستان کا مطلب کیا، لا الٰہ الا اللّٰہ ——— مسلم لیگ کے لیڈر بھی اپنی تقریروں میں یہی خیال ظاہر کر رہے تھے اور سب سے بڑھ کر خود قائدِ اِعظمؒ مرحوم و مغفور نے مسلمانوں کو یقین دِلایا تھا کہ پاکِستان کا دستور قرآنی ہو گا"

بیان مودُودی صاحب ۱۴ اگست ۱۹۷٦ء

"قائدِ اعظمؒ مرحوم کے متعلق مجھے کبھی یہ شبہ نہیں ہوا کہ وہ پاکِستان کو اسلامی ریاست بنانے کے معاملے میں مخلص نہ تھے"

آپکی معلومات کیلئے آگے بڑھیئے۔ مولانا مودُودی قائدِ اعظمؒ کے احترام کا مظاہرہ فرماتے ہیں،

"افسوس کہ لیگ کے قائدِ اعظمؒ سے لیکر چھوٹے مقتدیوں تک ایک بھی ایسا نہیں جو اِسلامی ذہنیت اور اِسلامی طرزِ فکر رکھتا ہو اور معاملات کو اِسلامی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہو" (مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش جلد سوئم، صفحہ ۳۷)

• ایسے لوگوں کو محض اِس لئے مسلمانوں کی قیادت کا اہل قرار دینا کہ وہ مغربی سیاست کے ماہر یا مغربی طرز تنظیم کے استادِ فن ہیں اور اپنی قوم کے عشق میں ڈوبے ہوئے ہیں، سراسر اسلام سے جہالت اور غیر اسلامی ذہنیت ہے (جلد سوم صفحہ ۷۰)

• ان لوگوں کی عملی زندگی اور ان کے خیالات، نظریات، طرزِ سیاست اور رنگِ قیادت میں خوردبین لگا کر بھی اسلامیت کی کوئی چھینٹ نہیں دیکھی جا سکتی

(جلد سوم صفحہ ۴۷)

• ان میں سے اکثر کے گھروں میں آپ جائیے تو آپ کو نماز کے وقت کوئی یہ بتانے والا نہ ملے گا کہ سمتِ کعبہ کدھر ہے اور اسبابِ عیش و عشرت سے بھری ہوئی کوٹھیوں میں سے ایک جانماز بھی فراہم نہ ہو سکے گا۔ سارے لیڈروں کو بٹھا کر اسلام کے بنیادی اور ابتدائی مسائل کے متعلق امتحان لیجیے تو شاید کوئی صاحب دو فی صدی سے زیادہ نمبر نہ لے سکیں گے۔" (جلد سوم، صفحہ ۷۷)

نیشنلسٹ مسلمانوں کے گھر مصلّے اور جانمازوں سے بھرے ہوئے تھے، ان علماء کو علمِ دین بھی تھا۔ مودودی صاحب نے ان کی بھی مخالفت کی (مرتب)

• نہ ان کی جماعت اسلامی مفہوم کے اعتبار سے جماعت ہے

نہ ان کی اس امارت کو کسی حیثیت سے بھی سمع و طاعت کا حق پہنچتا ہے۔ محض لفظ "مسلمان" سے دھوکہ کھا کر جو لوگ جاہلیت کی پیروی کرنے والوں کی تنظیم کو تنظیم سمجھتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اس نوعیت کی کوئی تنظیم اسلامی نقطۂ نظر سے مفید ہو گی ان کی کند ذہنی ماتم کی مستحق ہے۔" (مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم صفحہ ۸۲)

ارشاد فرماتے ہیں ـــــ "مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرے لئے اس مسئلہ میں بھی کوئی دلچسپی نہیں کہ ہندوستان میں جہاں مسلمان کثیر التعداد ہیں، وہاں ان کی حکومت قائم ہو جائے۔" (مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش جلد سوم صفحہ ۹۳)

قارئین کرام! یہ ہیں مودودی صاحب جنہیں یہ کبھی شبہ نہیں ہوا کہ قائدِ اعظم اسلامی ریاست بنانے کے معاملہ میں مخلص نہ تھے (مرتب)

یہ بھی حضرت مولانا مودودی صاحب نے ہی فرمایا تھا کہ :-

"مسلم لیگ کے کسی ریزولیشن اور مسلم لیگ کے ذمہ دار لیڈروں میں سے کسی کی تقریر میں آج تک یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ ان کا آخری مطمع نظر پاکستان میں اسلامی نظام حکومت قائم کرنا ہے .... جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں، کہ اگر مسلم اکثریت کے علاقے ہندو اکثریت کے تسلط سے آزاد ہو جائیں اور یہاں جمہوری نظام قائم ہو جائے تو اس طرح حکومت الٰہی قائم ہو جائے گی، ان کا گمان غلط ہے، دراصل اس کے نتیجہ میں جو کچھ حاصل ہوگا، وہ صرف مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہو گی، بلکہ اس سے بھی زیادہ قابل لعنت۔" (مسلمان اور موجودہ کشمکش جلد سوم صفحہ ۳۲-۱۳۱)

دیکھا ان کا مخصوص ہتھیار، سفید جھوٹ۔ (راقم)

قائد اعظمؒ کی پشاور میں تقریر ۲۴ نومبر ۱۹۴۵ء — "ہمارا مذہب، ہمارا کلچر اور اسلام کے نظریات حیات آزادی حاصل کرنے کے لئے ہمارے محرکات ہیں۔"

"پاکستان کا مطلب صرف آزادی نہیں، اس کا مفہوم اس مسلم آئیڈیالوجی کو محفوظ کرنا ہے، جو ایک بیش بہا متاع کی صورت میں ہمیں ورثہ میں ملی ہے۔"

۲۳ مارچ ۱۹۴۵ء پاکستان ڈے کی تقریب پر قائد اعظمؒ نے فرمایا۔ "یاد رکھو! اگر ہم اس جدوجہد میں ناکام رہ گئے تو نہ صرف یہ کہ ہم تباہ ہو جائیں گے، بلکہ اس برصغیر میں مسلمانوں اور اسلام کا نام و نشان تک باقی نہیں رہے گا۔"

اس زمانے میں مودودی صاحب فرماتے تھے — "جو اسمبلیاں یا پارلیمنٹیں موجودہ زمانہ کے جمہوری اصول پر مبنی ہیں، ان کی رکنیت حرام ہے، اور ان کے لئے ووٹ دینا بھی حرام ہے۔" (رسائل و مسائل حصہ اول ستمبر ۱۹۵۱ء ایڈیشن صفحہ ۴۵۷)

— اور پھر عین حلال۔ (مرتب)

مودودی صاحب نے کہا "یہ خیال کرنا کہ جماعت اسلامی کا قیام مسلم لیگ کا مقابلہ کرنے اور تحریک پاکستان کے خلاف ایک دوسری تحریک اٹھانے کیلئے کیا گیا تھا محض ایک بے جا بدگمانی ہے .... یہ بدگمانی صرف اسی صورت میں صحیح ہو سکتی تھی، جبکہ جماعت نے تحریک پاکستان

کے خلاف کوئی مہم چلائی ہو یا کوئی جلسہ کیا ہوتا یا کوئی قرارداد پاس کی ہوتی یا اس کے اجتماعات میں مخالفانہ تقریریں کی ہوتیں، لیکن اگست ۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۷ء تک جماعت کی پوری کارروائیوں میں کسی ایسی چیز کی نشاندہی نہیں کی جا سکتی، زیادہ سے زیادہ اگر کچھ کہا جا سکتا ہے تو بس یہ کہ ہم نے تحریک پاکستان میں حصہ نہیں لیا.... بہرحال ہم نے جس وقت یہ کام شروع کیا، اس وقت بھی اسے برحق سمجھتے تھے اور آج اس سے زیادہ برحق سمجھتے ہیں۔" (نوائے وقت ۱۴ اگست ۱۹۷۶ء)

سازش کا نشتر اقلیتی صوبوں میں زہر افشانی کیلئے جماعت اسلامی نے اپریل ۱۹۴۷ء کے اواخر میں ٹانک، مدراس اور پٹنہ میں جماعت کے خصوصی اجلاس منعقد کئے، ٹانک میں ایک اجلاس ۱۸/۱۷ اپریل ۱۹۴۷ء کو منعقد ہوا، مودودی صاحب سے متعین سوال کیا گیا کہ جب مطالبہ مسلمانوں کیلئے ایک مملکت حاصل کرنے کا ہے. تو پھر کون سا امر مانع ہے کہ ہم ان کا ساتھ نہ دیں۔ اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا کہ :-

"جب آپ ایک تحریک کو خود غیر اسلامی مان رہے ہیں تو پھر کس منہ سے ایک مسلمان سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ اس کا ساتھ دیا جائے جن مسائل اور مصائب کا اس قدر رونا رویا جا رہا ہے یہ مسائل اور مصائب سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتے اگر مسلمان اسلام کے فی الواقعہ سچے نمائندے ہوتے اور اگر مسلمان اب بھی سچے مسلمان بن جائیں تو آج ہی یہ سارے مسائل ختم ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ ہندوستان کے ایک ذرا سے کونے میں پاکستان بنانے کو اپنا انتہائی مقصد بناتے ہوئے ہیں، لیکن اگر یہ فی الواقعہ خلوص قلب سے اسلام کی نمائندگی کے لئے کھڑے ہو جائیں تو سارا ہندوستان، پاکستان بن سکتا ہے (روداد جماعت اسلامی حصہ پنجم شائع کردہ مکتبہ جماعت اسلامی۔ ذیلدار پارک۔ اچھرہ لاہور صفحہ ۹۵، ایڈیشن کا سال نہیں دیا گیا)

پٹنہ میں جلسہ امین احسن اصلاحی پٹنہ میں فرما رہے تھے :-

"آپکو معلوم ہے کہ جو نازک حالات اس وقت پیدا ہو گئے ہیں یہ سرسری اور سطحی نہیں بلکہ ان کے اسباب نہایت گہرے ہیں جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ غنڈوں اور

بدمعاشوں کے پیدا کئے ہوئے ہیں، اور دیر یا سویر یہ درست ہو جائیں گے، وہ سخت غلط فہمی میں مبتلا ہیں، ہمارے نزدیک یہ سارے حالات اس قومیت کی تعلیم کا نتیجہ ہیں جس کو پیدا کرنے کے لئے اس ملک کے لیڈروں نے جدوجہد کی ہے ..... اس وجہ سے آپکو صرف موجودہ ہنگاموں اور موجودہ فسادات پر ہی غور نہیں کرنا ہے، بلکہ آئندہ کے مفاسد پر بھی غور کرنا ہے، اور ایک سوچی سمجھی ہوئی اسکیم کے ماتحت آپکو اس طرح کام کرنا ہے، کہ فساد کی جو فصل ہمارے لیڈروں کے ہاتھوں اس ملک میں بوئی گئی ہے وہ نشو ونما نہ پانے پائے اور اس کے پھلنے اور پکنے سے پہلے لوگوں میں اس کے بس بھرے ہوئے کا یقین پیدا ہو جاتے۔" (روئداد جماعت اسلامی۔ حصہ پنجم صفحہ ۱۴۲)

پٹنہ کے اس اجلاس میں جماعت اسلامی کی دعوت پر خود مہاتما گاندھی اپنی شام کی پرارتھنا کو ملتوی کر کے شریک ہوئے اور انہوں نے اصلاحی صاحب کی اس تقریر کو سننے کے بعد فرمایا تھا کہ "میں نے آپکی تقریر کو بڑے غور سے سنا اور مجھے اسے سن کر بہت مسرت ہوئی۔ (روئداد جماعت اسلامی حصہ پنجم صفحہ ۱۷۲)

قارئین کرام! کیا اب بھی آپ بدگمان ہیں، کہ جماعت اسلامی نے ۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۷ء تک کوئی بھی بات پاکستان کے خلاف کہی ہو یا قائد اعظمؒ کا مودودی صاحب نے احترام نہ کیا ہو اور یا کوئی مہم قیام پاکستان کیلئے جدوجہد کرنیوالی قیادت کے خلاف جاری کی ہو؟ سچ ہے کہ مودودی صاحب اور ان کی تحریک اسلامی کے کارکنوں کی ایک ایک ادائے دلفریب پر مٹنے کو جی چاہتا ہے لیکن ہم اس زمرہ عشاق میں سے کہاں کہ ان کے مقدس جھوٹ کو جھوٹ و کذب بیانی نہ کہیں، کیا مودودی قلابازیوں کے بارے میں اب بھی مزید کسی تبصرہ و تنقید کی ضرورت ہے؟

انہی دنوں جناب پنڈت نہرو کیا کہتے تھے

"ہماری اسکیم یہ ہے کہ اس وقت مسٹر جناح کو پاکستان بنا لینے دیں اور اس کے بعد معاشی طور پر یا دیگر انداز سے ایسے حالات پیدا کئے جائیں جن سے مجبور ہو کر مسلمان گھٹنوں کے بل جھک کر ہم سے درخواست کریں کہ ہمیں پھر سے ہندوستان میں مدغم کر لیجئے"۔ (PAKISTAN FACES INDIA P. 99, 1948)

جماعت اسلامی کے قیّم کا ارشاد "موجودہ حکومت پاکستان غیر اسلامی ہے اس لئے ہم مسلمانوں کو اس کی فوج یا رینجرز دستوں میں بھرتی ہونے کا مشورہ نہیں دے سکتے"۔

(نوائے وقت لاہور ۱۳ اکتوبر ۱۹۴۸ء، بحوالہ جماعت اسلامی پر ایک نظر صفحہ ۵۵)

یہ تھا مولانا مودودی کا قائد اعظمؒ کی تحریک پاکستان کے ساتھ سلوک جنہیں وہ ایک با اصول، راست باز اور مضبوط سیرت و کردار کا مالک انسان کہتے ہیں واہ رے مصلحتی جھوٹ تیرے کیا کہنے۔ (راقم)

احترام کے دعاوی

مودودی صاحب کے آئینہ تحریر میں

"اگر یہ (یعنی قومی رہنما) اس کھیل میں نتائج سے بے خبر تھے، تو سخت اناڑی تھے۔ ایسے اناڑی اس قابل نہیں کہ کروڑوں انسانوں کی قسمتوں کے ساتھ بازی گری کرنے کے

کے لئے انہیں چھوڑ دیا جائے اور اگر انہوں نے جان بوجھ کر یہ سارا کھیل کھیلا ہے۔ تو درحقیقت یہ انسانیت کے اور خود اپنی قوم کے دشمن ہیں، ان کا صحیح مقام پیشوائی کی مسند نہیں بلکہ عدالت کا کٹہرا ہے، جہاں ان کا محاسبہ ہونا چاہیئے۔

(ترجمان القرآن جون ۱۹۴۸ء)

قارئین کرام! یہ ہے وہ احترام قائد اعظمؒ جنہیں مودودی صاحب با اصول سمجھ کر ۱۹۲۰ء سے ۱۹۴۸ء تک کرتے رہے ہیں۔ اسے احترام کہتے ہیں تو توہین و تضحیک کسے کہتے ہیں، کیا ربع صدی کی قیادت کرنے والوں میں قائد اعظمؒ شامل نہیں ہیں؟ (چودھری حبیب احمدؒ)

آپکی زبان کہاں چلی گئی تھی "آج ایک سال کے بعد کہا جا رہا ہے، کہ یہ سب کچھ ماؤنٹ بیٹن نے اپنی زبردستی سے کیا تھا اور ہم اس پر راضی نہ تھے۔ مگر سوال یہ ہے کہ جب یہ زیادتی کی جا رہی تھی اور آپ دیکھ رہے تھے۔ کہ ماؤنٹ بیٹن ہماری بربادی کے کیا سامان کر رہا ہے۔ اس وقت آپکی زبان

کہاں چلی گئی تھی، کیوں نہیں آپ نے اپنی قوم کو اور ساری دُنیا کو اس شرارت کی اِطلاع دی، کیوں آپ خاموشی کے ساتھ وہ سب کچھ قبول کرتے چلے گئے جو مسلمانوں کے لئے سخت تباہ کن تھا، کیوں آپنے اسی وقت یہ اعلان نہ کیا کہ یہ سب کچھ ماؤنٹ بیٹن اپنی ذمہ داری پر کر رہا ہے، اور ہم برضا و رغبت اس کی ذمہ داری میں شریک نہیں ہیں، صرف یہی نہیں کہ اس وقت آپ خاموش رہے۔ بعد میں جب اس غلط طرز تقسیم کے تحت ہولناک نتائج رونما ہو گئے اور لاکھوں مسلمانوں کو اس کا بدترین خمیازہ بھگتنا پڑا اس وقت بھی آپنے اپنی پوزیشن صاف کرنے کی کوئی ضرورت محسوس نہ کی۔

(ترجمان القرآن جولائی ۱۹۴۸ء صفحہ ۱۳۷)

یہ تو مولانا فرما رہے ہیں، دُوسری طرف ماؤنٹ بیٹن یہ کہہ رہا ہے کہ ایک آدمی کی (ضد) نے ہمیں پاکستان دینے پر مجبور کر دیا۔ ورنہ ہمارا مشن متحدہ ہندوستان رکھنے کا تھا۔ ایسے شخص کی تمام مخالفانہ تدابیر اور سازشوں کا مقابلہ کر کے پاکستان منوالینا کس قدر قابلِ تحسین وستائش ہے، اور پھر اب ماؤنٹ بیٹن کی اپنی شہادت اِس حقیقت کی تصدیق کر رہی ہے لیکن مودودی ہیں کہ قائداعظمؒ کے ہر کام میں کیڑے ڈالتے چلے جا رہے ہیں۔ ان کی مجبوریوں کے باوجود ان کی کامیابیوں پر اُن کی نظر نہیں جاتی۔ کیوں نہ ہو آخر سید مولانا ابوالاعلیٰ مودودی ٹھہرے قائداعظمؒ تو بیچارے کیا۔ ان کے تیر ہدف سے صحابہؓ، انبیاء کرامؑ اور اولیاء عظام تک نہ بچے بلکہ ہے غضب ہے سطر قرآن کو چلیپا کر دیا تو نے (راقم)

مسٹر جناح کے ۱۴ یا ۲۴ نکات

"ظاہر ہے کہ کوئی غیر مسلم مسٹر جناح کے ۱۴ یا ۲۴ نکات پر تو ایمان نہیں لا سکتا نہ مسلم لیگ یا مجلس احرار یا جمعیت العلماء کے ریزولیشنوں میں کوئی ایسی چیز ہے جس پر کوئی ایمان لاتے۔ ایمان اگر کوئی لا سکتا ہے، تو لا الٰہ الا اللہ پر لا سکتا ہے بشرطیکہ ایک جماعت اس کلمہ کیلئے جینے اور اس پر مرنے والی اس کے سامنے موجود ہو مگر وہ ہے کہاں ؟ (صفحہ ۱۱۹ مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم)

مودودی صاحب اور انکی جماعت اسلامی نے پاک و ہند میں کتنے غیر مسلموں کو ایمان سے سرفراز کیا؟ کیا ان کی تعداد بتائی جا سکتی ہے، پھر اہل بصیرت اور صاحبان ایمان اور اصحاب دین و دانش جانتے ہیں کہ مسٹر جناح کا تو موقف یہی تھا کہ ؎

خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمیؐ (اقبالؒ)

اسی بنیاد پر مولانا حسین احمد مدنی سے نظری و فکری بحث چھڑی اور معرکہ دین و وطن بپا ہوا، پھر ان کی اسی اسلام سوز کیفیت کے پیش نظر ترجمان اسلام حکیم الامت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ نے فرمایا تھا کہ ؎

پڑھ کے خیبر سے ہے معرکہ دین و وطن — اس زمانے میں کوئی حیدرؓ کرار بھی ہے

آگے بڑھیئے :-

انکی قیادت میں غلطی ہے

"عموماً جو اجتماعی تحریکیں مسلمانوں میں پھیل رہی ہیں، وہ اسلامی نقطۂ نظر سے غلط ہیں، ان کے مقاصد میں غلطی ہے، ان کی قیادت میں غلطی ہے اور ان کی روحی کیفیت میں غلطی ہے، بہت سے لوگوں کو تو بے شعوری کی وجہ سے اس غلطی کا احساس ہی نہیں ہوتا، اس لئے وہ جوش و خروش کے ساتھ ان تحریکوں کو چلاتے ہیں، ان کے نزدیک کسی تحریک کے درست ہونے کے لئے بس یہی بات کافی ہے کہ اس میں مسلمانوں کا فائدہ ہے۔"

صفحہ ۴۳، عنوان: نسلی مسلمانوں کے لئے دو راہیں،

(مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم)

جناب مودودی صاحب کے نزدیک تحریک قیام پاکستان نسلی مسلمانوں کی تحریک تھی ٹھیک ہے انہوں نے پاکستان کیلئے جدوجہد کی، قائد اعظمؒ کی مومنانہ فراست، اعلیٰ قیادت سے پاکستان معرض وجود میں آیا۔ نصرت خداوندی ان گنہگار مسلمانوں کے شامل حال رہی۔ تقسیم ہند کے بعد یہ لوگ جائے اماں میں آگئے۔ لیکن وہ کو نسلی مسلمان جو اس قیادت پر پھبتیاں کستے رہے اور پاکستان کو ناپاکستان کہتے رہے، بلکہ خدا کی نگاہ میں غیر مسلموں کی حکومت سے زیادہ مبغوض کہتے رہے، آخر ان کے لئے کیا وجہ جواز اور اخلاقی گنجائش تھی کہ وہ شدید ترین مخالفت کے باوجود پناہ کیلئے اسی پاکستان میں چلے آئے۔ سچ ہے باحیاؤں اور بے حیاؤں میں فرق ضرور ہے (راقم)

اِسکی وجہ منافقت ہے!

۲۴ دسمبر ۱۹۶۷ء کو لاہور میں قائدِ اعظمؒ کی یاد میں منعقد کردہ جلسہ میں، میاں طفیل محمد صاحب (امیر جماعت مغربی پاکستان) نے اپنی تقریر میں قائداعظمؒ کو اپنا خراجِ عقیدت پیش کیا، اس پر بعض حلقوں کی طرف سے یہ اعتراض کیا گیا کہ تحریک پاکستان اور اس کے بعد تک تو جماعت اسلامی، اس تحریک کی مخالفت کرتی اور قائدِ اعظمؒ کی شان میں ایسے ذلت آمیز الفاظ استعمال کرتی رہی جن کی جرأت ان کے کسی بدترین غیر مسلم دشمن کو بھی نہیں ہوئی تھی تو اب اس جماعت پر کون سی آسمانی وحی نازل ہوئی ہے جس نے ان پر یہ حقیقت بے نقاب کر دی ہے، کہ قائدِ اعظمؒ ان کے خراجِ عقیدت کے مستحق ہیں، ان اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے میاں صاحب موصوف نے (اخبار ایشیا کی ۱۲ جنوری ۱۹۶۸ء کی اشاعت میں) ایک لمبا چوڑا بیان شائع کیا ہے جس میں کہا گیا ہے، کہ ملک میں اور افراد اور جماعتیں بھی ہیں جنہوں نے تحریک پاکستان اور قائدِ اعظمؒ کی مخالفت کی تھی، اور اب وہ ان کی مداح ہیں، ان کے خلاف اس قسم کے اعتراضات کیوں نہیں کئے جاتے؟

ہم میاں صاحب کی خدمت میں یہ عرض کریں گے کہ ان افراد اور جماعتوں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ انہوں نے تحریک پاکستان یا قائدِ اعظمؒ کی مخالفت نہیں کی تھی وہ یا تو خاموش ہیں اور یا اپنی اس وقت کی غلطی کا اعتراف کرتی ہیں، لیکن جماعت اسلامی ملک کو یہ باور کرانے کی کوشش کر رہی ہے، کہ اس نے نہ تحریک پاکستان کی مخالفت کی تھی، نہ قائدِ اعظمؒ کی شان میں کوئی گستاخانہ کلمہ کہا تھا۔ حالاں کہ اس جماعت کا اس زمانے کا لٹریچر ان کے اس دعویٰ کی خود تردید کرتا ہے۔ جماعتِ اسلامی کی یہ منافقانہ روش ہے جس کی بنا پر ان کے خلاف اعتراضات کئے جاتے ہیں اگر یہ جماعت دیانتداری سے اس کا اعتراف کرے کہ اُن سے اس زمانے میں غلطی ہوئی تھی جس کے لیے وہ نادم ہے، اور بحضورِ ملت معذرت خواہ، تو پھر ان کے خلاف اس قسم کا اعتراض نہیں کیا جا سکے گا، اس جماعت کا یہ دوغلا پن ہے جس کی وجہ سے یہ لوگوں کی نگاہوں میں ذلیل ہو رہی ہے

میاں صاحب نے یہ بھی کہا ہے، کہ اگر جماعت اسلامی نے تحریک پاکستان میں مسلم لیگ کا

عملاً ساتھ نہیں دیا، تو کیا ہوا؟ یہ اپنے طور پر قوم کی خدمت کرتی رہی۔ اس لئے قوم کو اس کا مرہونِ منت ہونا چاہیئے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ میاں صاحب کے اس سوال کا جواب روزنامہ نوائے وقت کی ۲۸ جنوری ۱۹۶۶ء کی اشاعت کے اداریہ میں ملتا ہے، اس میں کہا گیا ہے، کہ اگر لیگ اپنے مخصوص انداز میں قوم کی خدمت کو معیار قرار دیا جائے تو:

"اس طرح تو یونینسٹ اور نیشلسٹ مسلمانوں بھی اپنے "مخصوص انداز" میں برصغیر کے مسلمانوں کی خدمت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا ہوگا، کل کو یہ بھی کہا جانے لگے گا۔ کہ خضر حیات خاں یا مولانا ابوالکلام آزاد اور ان کے رفقاء بھی پاکستان کے لیڈر تھے، تو پھر یہ سلسلہ کہاں جا کر رکے گا۔" ط۔ ۱ مارچ ۱۹۶۸ء (صفحہ ۳۸، ۳۹)

سچ ہے کہ انہوں نے اپنے "مخصوص انداز" میں حضرت قائداعظمؒ کو ملفوف گالیاں دیں اور قوم کو اپنے "مخصوص انداز" سے صحابہ کبارؓ کی عظمت و رفعت اور بزرگانِ دین کی عزت و وابستگی سے دُور کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ (مرتب)

خواہ مخواہ لیگی لیڈروں کا تذکرہ "سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مولانا کے دل میں مسلم لیگ، دُوسرے لیڈروں اور پاکستان کی حکومت کے خلاف اس قدر حقارت کیوں تھی، اس حقارت کا اظہار وہ کھلے بندوں اور شدت سے کرتے رہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس موضوع پر بیحد جذباتی ہو چکے تھے۔ یہ موضوع ان کی دُکھتی رگ بن گیا تھا اور اس طرح ان کے دل میں کانٹا سا لگ گیا تھا کہ کسی مسئلے پر بھی بات کرتے تو خواہ مخواہ لیگی لیڈروں کا تذکرہ شروع کر دیتے حالانکہ یہ تذکرہ قطعی طور پر بے جوڑ اور بے تعلق ہوتا۔"

یہ تحریر ممتاز علی عاصی نے "مولانا مودودی اور جماعت اسلامی" کے صفحہ ۹۲ پر تحریر فرمائی ہے۔ سچ ہے کہ قیام پاکستان، مولانا مودودی کے پندار ریاضی کے سازِ شکستہ کی آواز ہے۔ ان کے قلم و زبان کی تمام جولانیوں کے باوجود اللہ تعالیٰ نے گنہگار مسلمانوں پر کرم کیا کہ خطۂ ارض پر ایک "خداداد مملکت" پاکستان "عطا کر دی،

انہیں غصہ و غم ہے کہ ایسا کیوں ہو گیا۔ اس کرمِ خداوندی پر مولانا غصہ کا اظہار کرتے ہیں، مجبور ہیں بیچارے کیا کریں۔ (راقم)

قائدِ اعظمؒ کے خلاف "دس سال سے مسلمانوں کی قیادتِ عظمیٰ جس لائحہ عمل پر چل رہی تھی وہ سلطان عبدالحمید خان کی سیاست سے ملتا جلتا تھا۔ جس طرح وہ ۳۳ سال تک محض دولِ یورپ کی باہمی رقابتوں سے فائدہ اُٹھا کر جیتے رہے اور اس دوران میں خود ٹرکی کی کوئی طاقت انہوں نے نہ بنائی جس کے بل بوتے پر وہ جی سکتا اسی طرح اس قیادت کا بھی سارا سیاسی کھیل بس انگریز اور کانگریس کی کشمکش سے فائدہ اُٹھانے تک محدود تھا۔

پورے دس سال میں اس نے خود اپنی قوم کی اخلاقی، مادی اور تنظیمی طاقت بنانے اور اس کے اندر قابلِ اعتماد سیرت پیدا کرنے کی کوئی کوشش نہ کی جس کی بناء پر وہ اپنے کسی مطالبہ کو خود اپنی طاقت سے منوا سکتی اسی کا نتیجہ تھا کہ جونہی انگریز اور کانگریس کی باہمی کشمکش ختم ہوئی اس قیادتِ عظمیٰ نے اپنے آپ کو ایسی حالت میں پایا جیسے اس کے پاؤں تلے زمین نہ ہو۔ اب وہ مجبور ہو گئی کہ جو کچھ جن شرائط پر بھی ملے اسے غنیمت سمجھ کر قبول کرے۔ بنگال و پنجاب کی تقسیم اسے بے چون وچرا ماننی پڑی حدوں کی تعین جیسے نازک مسئلے کو اسے صرف ایک شخص کے فیصلے پر چھوڑ دیا۔ انتقالِ اختیارات کے لئے جو وقت اور جو طریقہ تجویز کر دیا گیا اسے بھی بلا تامل اس نے مان لیا۔ حالانکہ یہ تینوں امور صریح طور پر مسلمانوں کے حق میں مہلک تھے۔ انہی کی وجہ سے ایک کروڑ مسلمانوں پر تباہی نازل ہوئی، اور انہی کی وجہ سے پاکستان کی عمارت اوّل روز ہی سے متزلزل بنیادوں پر اُٹھی۔" (ترجمان القرآن جون ۱۹۴۸ء صفحہ ۱۲۵، ۱۲۶)

مودودی صاحب کی طرف سے یہ زہر اُس زمانہ میں قائدِ اعظمؒ کے خلاف اُگلا جا رہا تھا جب وہ موت و حیات کی کشمکش میں گرفتار تھے اور پاکستان چاروں طرف سے خطرات اور اغیار کی حوصلہ شکن، عزم پاش سازشوں کے اندر گھرا ہوا تھا۔ (مرتب)

وفات کے بعد

مودودی صاحب کا ارشاد گرامی

قائد اعظمؒ کا طرزِ حکومت کیسا ہوگا۔ پھر بھی لوگ رحمت و بخشش کے پھول نچھاور اور نیک دعاؤں سے یاد کریں گے۔ بغض و حسد کی آگ کیونکر سرد ہو۔ دیکھتے جاتیے، کہ مودودی صاحب کس طرح دل کے پھپھولے پھوڑتے چلے جارہے ہیں اور ان کی آتشِ انتقام کس قدر تیز سے تیز تر ہے۔ جو حکومت قائم ہوگی وہ ؟

فرماتے ہیں۔ مسلمانوں کی کافرانہ حکومت (ہوگی جو) اسلامی نقطۂ نظر سے غیر مسلموں کی کافرانہ حکومت سے مقابلہ میں کچھ بھی قابلِ ترجیح نہیں ہوگی بلکہ اس سے بھی زیادہ قابلِ لعنت ہوگی۔" (ترجمان القرآن۔ محرم ۱۳۶۰ھ صفحہ ۲۸)

توجہ فرمایئے ـــــ "اس قسم کے لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار آنے کے معنی یہ ہیں، کہ ہم اسی مقام پر کھڑے ہیں، جس مقام پر غیر مسلم حکومت میں تھے، بلکہ اس سے بھی بدتر مقام پر، کیونکہ وہ قومی حکومت جس پر اسلام کا نمائشی لیبل ہوگا اسلامی انقلاب کا راستہ روکنے میں اس سے بھی زیادہ جسری و بے باک ہوگی جتنی غیر مسلم حکومت ہوتی ہے۔ غیر مسلم حکومت جن کاموں پر قید کی سزا دیتی ہے وہ "مسلم قومی حکومت" ان کی سزا پھانسی اور جلاوطنی کی صورت میں دیگی، اور پھر بھی اس حکومت کے لیڈر جیتے جی غازی اور مرنے پر رحمتہ اللہ علیہ ہی رہیں گے۔

پس یہ سمجھنا غلط ہے کہ اس قسم کی "قومی حکومت" کسی معنی میں بھی اسلامی انقلاب لانے میں مددگار ہوسکتی ہے۔ اب سوال یہ ہے، کہ اگر ہم اس حکومت میں بھی اجتماعی زندگی کی بنیادیں بدلنے ہی کی کوشش کرنی پڑے گی، اور اگر ہمیں یہ کام حکومت کی مدد کے بغیر، بلکہ اس کی مزاحمت کے باوجود اپنی قربانیوں ہی سے کرنا ہوگا، تو ہم آج ہی سے راہِ عمل کیوں نہ اختیار کریں؟ اس نام نہاد "مسلم حکومت" کے انتظار میں اپنا وقت یا اس کے قیام کی کوشش میں اپنی قوت ضائع کرنے کی حماقت کیوں کریں جس کے متعلق ہمیں یہ معلوم ہے کہ وہ ہمارے مقصد کیلئے نہ صرف غیر مفید ہوگی بلکہ کچھ زیادہ ہی سدِ راہ ثابت

ہو گی ؟ (ترجمان القرآن ۔ محرم ۱۳۶۰ھ ، صفحہ ۶۱)

مودودی صاحب کا حکم ہے کہ اس قائد اعظم رح کو جن کی جہد مسلسل اور کوشش پیہم سے پاکستان کا قیام عمل میں آیا ، جس میں جناب مولانا نے دار الاسلام پٹھانکوٹ سے بھاگ کر پناہ لی ، اور ٹرکوں پر اپنا سامان لاد کر لاتے ، اگر نہ لا سکے تو صرف وہ خطوط جو حکیم الامت علامہ اقبال علیہ الرحمتہ نے انکو دار الاسلام آنے کیلئے لکھے ؟؟؟ اور جس پاکستان میں اب وہ اسلامی نظام کے قیام کے خواہاں بتلائے جاتے ہیں ، اور اس "نام نہاد مسلم حکومت" کے متعلق اب یہ بھی کہنا شروع کر دیا ہے ، کہ یہ اسلام کے نام پر اسلام کیلئے قائم ہوا ہے) اور جس میں یہ اپنی قوت ضائع کرنے کی حماقت" فرما رہے ہیں لیکن اس کے باوجود ملت پاکستانیہ کے اس محسن عظیم کو ان کے نزدیک رحمتہ اللہ علیہ" کہنا درست نہیں ، مودودی صاحب ، چشم مسلم کو بیدار تو ہو لینے دیجئے یہ مخالفین قیام پاکستان پر قیامت تک اظہار نفریں کرتے ، اور قائد اعظم رح کہتے رہیں گے ، یہ طلسم انگیز اور سحر خیز انشا پردازیاں کب تک سادہ دل ، سادہ لوح اور سادہ مزاج مسلمان کو فریب دینے میں کامیاب رہ سکیں گی ؟ (مرتب)

یہ ناممکن ہے

بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ ایک دفعہ غیر اسلامی طرز ہی کا سہی ، مسلمانوں کا قومی اسٹیٹ تو قائم ہو جاتے ، پھر رفتہ رفتہ تعلیم و تربیت اور اخلاقی اصلاح کے ذریعہ اسکو اسلامی اسٹیٹ میں تبدیل کیا جا سکتا ہے ، مگر میں نے تاریخ سیاسیات اور اجتماعیات کا جو تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے ، اس کی بنا پر اس کو ناممکن العمل سمجھتا ہوں اور اگر یہ منصوبہ کامیاب ہو جائے تو میں ایک معجزہ سمجھوں گا ۔"

(ترجمان القرآن ۱۳۶۰ھ ، صفحہ ۶۰)

مسلمانوں کی کافرانہ حکومت

جناب مودودی گوہر افشاں ہیں ؛

"جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ اگر مسلم اکثریت کے علاقے ہندو اکثریت کے تسلط سے آزاد ہو جائیں اور یہاں جمہوری نظام قائم ہو جائے ، تو اس طرح حکومت الٰہی قائم ہو جائے گی ، ان کا گمان غلط ہے ، در اصل اس کے نتیجہ میں جو

کچھ حاصل ہوگا، وہ مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہوگی"
(ترجمان القرآن محرم ۱۳۶۰ھ صفحہ ۲۹)

لادینی مملکت کا شوشہ

جنت الحمقاء میں رہنے والے لوگ اپنے خوابوں میں خواہ کتنے ہی سبز باغ دیکھ رہے ہوں لیکن آزاد پاکستان اگر فی الواقع وہ بنا بھی تو لازماً جمہوری لادینی اسٹیٹ کے نظریہ پر بنے گا جس میں غیر مسلم اسی طرح برابر کے شریک ہوں گے جس طرح مسلمان اور پاکستان میں ان کی تعداد اتنی کم اور ان کی نمائندگی کی طاقت اتنی کمزور نہ ہوگی، کہ شریعت اسلامی کو حکومت کا قانون اور قرآن کو اس جمہوری نظام کا دستور بنایا جاسکے (ترجمان القرآن فروری ۱۹۴۶ء)

ٹونک میں جماعت اسلامی کا جلسہ

قیام پاکستان سے کوئی چار ماہ قبل ۱۷، ۱۸ اپریل ۱۹۴۷ء کو جماعت اسلامی کا ایک اہم جلسہ ہوا جس میں مولانا مودودی صاحب سے مسلم لیگ کے بارے میں بھی سوالات کئے گئے اور یہ بھی پوچھا گیا کہ جب غیر مسلم قومیں مسلمانوں کو مٹانے کیلئے سفاکی سے کام لیکر خونریزی و قتل تک سے گریز نہیں کر رہیں تو ایسی حالت میں مسلم لیگ کا ساتھ کیوں نہ دیا جائے، یہ بھی کہا گیا کہ اگر ان حالات میں ہم نے اس کا ساتھ نہ دیا تو یہ غیر مسلم اکثریت سارے ہندوستان پر قابض ہو جائیگی، اور ظاہر یہ تسلط مسلمانوں کے لئے مضر اور مہلک ہوگا اور دشمنان اسلام کی ہلاکت آفرینیاں اس قدر ہوشربا ہونگی، جس کا تصور بھی جسموں میں کپکپی پیدا کر دینے کے لئے کافی ہے،

مودودی صاحب نے ان سوالات کا حسب ذیل جواب دیا:-

"ان سوالوں کا واضح مطلب یہ ہے، کہ موجودہ حالات میں مسلمانوں کی اس قومی تحریک کا ساتھ دیا جائے اور جب یہ حالات ختم ہو جائیں تو پھر ان کا ساتھ چھوڑ دیا جائے، کیونکہ اسے تو سائل صاحب خود بھی تسلیم کرتے ہیں کہ یہ تحریک غیر اسلامی ہے، مگر میں ان کو یقین دلاتا ہوں، کہ جس قسم کے حالات دیکھ کر وہ ہم سے اس وقت یہ مطالبہ کر رہے ہیں ایسے حالات کبھی ختم نہ ہوں گے، مسائل پر مسائل پیدا ہوتے جائیں گے، اور ہر مسئلہ پہلے مسئلہ سے شدید تر ہوگا، اور آپ کبھی بھی لکیر نہیں کھینچ سکیں گے، کہ فلاں حد تک تو ہم ان قومی تحریکوں کا ساتھ دیں گے، اور وہاں پہنچ کر ہم ان کا ساتھ چھوڑ دیں گے، یہ تو ہے اس کا ایک رُخ۔

دُوسرا رُخ جو اس سے کہیں زیادہ قابلِ غور ہے، وہ یہ ہے کہ جب آپ تحریک کو خود غیر اسلامی مان رہے ہیں تو پھر کس مُنہ سے ایک مسلمان سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ اس کا ساتھ دیا جائے، جن مسائل اور مصائب کا اس قدر رونا رویا جا رہا ہے، یہ مسائل اور مصائب سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتے، اگر مسلمان اسلام کے فی الواقع سچے نمائندے ہوتے، اور اگر مسلمان اب بھی سچے مسلمان بن جائیں تو آج ہی یہ سارے مسائل ختم ہو جاتے ہیں، یہ لوگ ہندوستان کے ایک ذرا سے کونے میں پاکستان بنانے کو اپنا انتہائی مقصد بنائے ہوئے ہیں لیکن اگر یہ فی الواقع خلوصِ قلب سے اسلام کی نمائندگی کیلئے کھڑے ہو جائیں تو سارا ہندوستان پاکستان بن سکتا ہے، اور اس میں ایک لادینی جمہوری حکومت (SECULAR DEMOCRACY) یا عوامی پارلیمنٹری حکومت (POPULAR PARLIMENTARY GOVT) نہیں بلکہ خالص خُدا کی حکومت کتاب و سُنت کے اصُول پر قائم ہو سکتی ہے،

اسلام کی لڑائی اور قومی لڑائی ایک ساتھ نہیں لڑی جا سکتی، اگر لوگ اسلام اور اسلامی طریقِ کار کو اپنی خواہشاتِ نفس کے خلاف پا کر ان کو ترک کر دینا چاہتے ہیں تو ہیر پھیر کے راستوں سے آنے کے بجائے صاف صاف کیوں نہیں کہتے کہ اللہ اور رسُول کے کام کو چھوڑ دیجئے اور ہمارے نفس کے کام میں حصّہ لیجئے (ترجمان القرآن جلد ۳۰ - عدد ۶ بحوالہ جماعتِ اسلامی پر ایک نظر صفحہ ۳۳)

ایک اور نیش زنی

مصائب و آلام کا اصلی سبب

جماعتِ اسلامی کے اجتماع مدارس میں دورانِ تقریر میں ۲۶ اپریل ۱۹۴۷ء کو فرماتے ہیں:

"عنقریب ملک تقسیم ہو جائیگا۔ ہندوؤں کو انکی اکثریت کے علاقے اور مسلمانوں کو انکی اکثریت کے علاقے الگ الگ مل جائیں گے، دونوں اپنے اپنے علاقوں میں پُوری طرح خود مختار ہوں گے اور اپنی مرضی کے مطابق اپنے اسٹیٹ کے نظام چلائیں گے، یہ بڑا تغیر اس نقشے کو بدل دیگا جس پر اس وقت تک حالات چلتے رہے ہیں، اس کی وجہ سے ہندوؤں اور مسلمانوں اور دُوسری تمام قوموں کے مسائل اور انکی نوعتیں بالکل بدل جائیں گی........ بدلتے ہوئے حالات میں ان سب کو سوچنا پڑے گا کہ جو کچھ اب تک وہ کرتے رہے ہیں، اس نے انہیں کہاں لا کھڑا کیا ہے، اور اب اس نئے دورِ زندگی میں ان کیلئے راہِ عمل کیا ہے۔"

"آج کے بنے اور جمے ہوئے عقیدے اس وقت تک مہمل ہو جائیں گے، آج کے خیالات اور ـــــ تصورات کے لئے اسوقت کوئی جگہ نہ ہوگی، آج کے نعرے اس وقت کھوٹے سکے ہوں گے جنہیں کوئی مفت بھی نہ پوچھے گا۔ جن بنیادوں پر آج کی قومی تحریکیں اور جماعتیں قائم ہیں، وہ خود بخود ڈھ جائیں گی، اس لئے صرف یہی نہیں کہ آج کی لیڈریاں طبعی موت مر جائیں گی بلکہ بعید نہیں کہ جو لوگ آج انہیں اپنا نجات دہندہ سمجھ رہے ہیں کل وہی ان کو اپنے مصائب و آلام کا اصلی سبب سمجھنے لگیں۔"

(بحوالہ مولانا مودودی۔ دعاوی اور عمل صفحہ ۱۰۹)

خدا کا کرم اور احسان عظیم ہے کہ قائد اعظمؒ کے ہمقدم اور ہمسفر تو ایک طرف رہے پیپلز پارٹی تک نے قائد اعظمؒ کا سال اور مفکر پاکستان اقبالؒ کا سال منایا اور ان کے تاریخ ساز کردار کا اعتراف و اقرار کیا (مرتب)

بیابان مرگ کی پھبتی

سنیئے اور سر دھنیئے فرماتے ہیں ـــــ "ہندو اکثریت کے علاقے میں مسلمان عنقریب یہ محسوس کرلیں گے کہ جس قوم پرستی پر انہوں نے اپنے اجتماعی رویہ کی بنیاد رکھی تھی وہ انہیں بیابان مرگ میں لاکر چھوڑ گئی ہے اور ان کی قومی جنگ جسے وہ بڑے جوش و خروش سے بغیر سوچے سمجھے لڑ رہے تھے ایک ایسے نتیجے پر ختم ہوئی ہے جو ان کے لئے تباہی کے سوا اپنے اندر کچھ نہیں رکھتا۔"

مرکب حماقت

اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کو اکساتے ہوئے۔ ملاحظہ فرمایئے ـــــ "یہ ایک ظاہر و باہر حقیقت تھی مگر مسلمانوں نے اسکی طرف سے جانتے بوجھتے آنکھیں بند کیں اور دوہری حماقت کا ارتکاب کیا کہ ایک طرف تو نظام حکومت کیلئے مغرب کے انہی جمہوری اصولوں پہ راضی ہوگئے اور دوسری طرف خود اپنی طرف سے تقسیم ملک کا یہ اصول پیش کیا کہ جہاں ہم اکثریت میں ہیں وہاں ہم حاکم اور تم محکوم ہو اور جہاں تم اکثریت میں ہو وہاں تم حاکم اور ہم محکوم ہوں کئی سال کی تلخ اور خون ریز کشمکش کے بعد اب یہ مرکب حماقت کامیابی کے مرحلے پر پہنچ گئی ہے یعنی اکثریت کی آزاد خود مختار حکومت جس میں وہ بہ حیثیت ایک قوم کے محکوم ہوں گے، اور محکوم بھی اس اکثریت کے جس سے وہ قومی جنگ لڑتے رہے ہیں۔" (ایضاً)

آہِ سرد ناکامی و ناکامیابی کا اظہار

آخر میں ایک سرد آہ بھری اور فرمایا: "اگر یہ (مسلمان) قوم پرستانہ سیاست کی راہ اختیار کرنے کے بجائے اس راہ کو اختیار کرتے اور جس طرح پچھلے دس سال میں انہوں نے اپنی پوری قومی طاقت کو اس راہ پہ لگایا ہے، اسی طرح کہیں اِس راہ (مودودی صاحب کی متعین فرمودہ) پر لگایا ہوتا تو آج ہندوستان کی سیاست کا نقشہ بالکل بدلا ہوا ہوتا اور دو چھوٹے چھوٹے پاکستانوں کی جگہ سارے ہندوستان کے پاکستان بن جانے کے امکانات ان کی آنکھوں کے سامنے ہوتے لیکن اِس وقت میری یہ دعوت انہیں دشمن یا ایک دیوانے دوست کی دعوت محسوس ہوئی۔" (ایضاً)

خود مسلمانوں کے خلاف

یہ باتیں مودودی صاحب نے اُسوقت اُن علاقوں میں کہی تھیں جہاں مسلمان اقلیت میں تھے جب مسلمانانِ ہند کی تقدیر کے آخری فیصلے ہو رہے تھے، یہ مہم مودودی صاحب نے دس سال قبل شروع کی تھی، کہ قیامِ پاکستان کی تحریک کے خلاف مسلمانوں کو اُبھاریں، انہیں کے آئینہ تحریر میں دیکھئے:

"ایک حقیقی مسلمان کی حیثیت سے جب میں دُنیا پر نگاہ ڈالتا ہوں تو مجھے اس امر پہ اظہارِ مسرت کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی، کہ ترکی پر ترک، ایران پر ایرانی اور افغانستان پہ افغانی حکمران ہیں .... مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرے لئے اس مسئلہ میں کوئی دلچسپی نہیں ہے، کہ ہندوستان میں جہاں جہاں مسلمان کثیر التعداد ہیں وہاں اُن کی حکومت قائم ہو جائے ...... مسلمان ہونے کی حیثیت سے میری نگاہ میں اس سوال کی کوئی اہمیت نہیں کہ ہندوستان ایک ملک رہے یا دس ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے ... . مسلمان کی حیثیت سے میرے نزدیک یہ امر بھی کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتا کہ ہندوستان کو انگریزی امپریلزم سے آزاد کرایا جائے۔"

(ترجمان القرآن بابت ذی الحجہ ۱۳۵۱ھ)

مسلم لیگی رہنماؤں کے متعلق ارشادِ گرامی؟

"...... یہ مسلمانوں کی قوم میں پیدا ہوئے۔ اس لئے مسلمانوں کی حکومت ان کا نصب العین بن گیا ہے۔ یہی ہندوؤں میں پیدا ہوتے تو مونجے اور ساورکر بنتے۔ جرمنی میں پیدا ہوتے تو ہٹلر اور گوئرنگ کے روپ

میں نمودار ہوتے کسی اطالوی کی آغوشِ محبت میں جنم لیتے تو مسولینی کی صورت اختیار کرتے۔" (ترجمان القرآن، ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ ص ۱۹۲)

صوبہ سرحد کا ریفرنڈم اس نازک ترین وقت جس میں مودودی صاحب اپنے ارکان کو کسقدر مدبرانہ مومنانہ اور مفکرانہ ہدایت دیتے ہیں، یہ سفید جھوٹ ہے کہ اس جماعت نے وہاں پاکستان کے حق میں پروپیگنڈہ کیا۔ (مرتب)

توجہ فرمایئے "رہا یہ سوال کہ کس چیز کے حق میں رائے دیں۔ تو اس معاملے میں جماعت کی طرف سے کوئی پابندی عائد نہیں کی جاسکتی۔ کیونکہ جماعت اپنے ارکان کو صرف ان امور میں پابند کرتی ہے جو تحریکِ اسلامی کے اصول اور مقصد سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور یہ معاملہ نہ اصولی ہے نہ مقصدی۔ اس لیے ارکانِ جماعت کو اختیار ہے کہ وہ اپنی صوابدید کے مطابق جو چاہیں رائے دیں۔" (بحوالہ مولانا مودودی۔ دعاوی اور عمل ص۸)

سنہ ۱۹۴۵ء کے انتخابات اور ہدایتِ امیر

اب پاکستان میں اسلامی نظام کے دعویدار مودودی صاحب اس خطۂ ارض جسے پاکستان کہا جاتا ہے جہاں اس کے حصول کے لیے مسلم لیگ اغیار سے ستیزہ کار تھی تو مودودی صاحب کی مفکرانہ مفسرانہ اور محققانہ صلاحیتیں اور مومنانہ فراست اُن سے کیا اگلوا رہی تھی۔ (مرتب)

توجہ فرمایئے "ووٹ اور الیکشن کے معاملہ میں ہماری پوزیشن صاف صاف ذہن نشین کرلیجئے۔ پیش آمدہ انتخابات یا آئندہ آنیوالے انتخابات کی اہمیت جو کچھ بھی ہو اور ان کا جیسا بھی اثر ہماری قوم یا ملک پر پڑتا ہو، بہرحال ایک بااصول جماعت ہونے کی حیثیت سے ہمارے لیے یہ ناممکن ہے کہ کسی وقتی مصلحت کی بنا پر ہم ان اصولوں کی قربانی

گوارہ کر لیں جن پہ ہم ایمان لاتے ہیں۔
(کوثر ۲۸۔ اکتوبر ۱۹۲۵ء بحوالہ مولانا مودودی دعاوی اور عمل)

قارئین کرام! یہ ہیں امیر جماعت اسلامی (سابق) جن کے موجودہ امیر جناب میاں طفیل صاحب فرماتے ہیں" کہ پاکستان تین شخصیتوں نے بنایا ہے۔ علامہ اقبال جنہوں نے الگ مملکت کا تصور دیا۔ مولانا مودودی جنہوں نے نظریہ دیا۔ اور حضرت قائد اعظم جنہوں نے پہلے دو حضرات کی سوچ کو عملی شکل دی اور دین کے نظریہ و تصور کی بنیاد پر پاکستان حاصل کیا۔ (نوائے وقت۔ ۲۱ مئی ۱۹۷۶ء)

ان مصلحین اسلام کے پیکروں اور ان صالحین و مقدسین کے طائفہ کے بارے میں کیا کہا جائے۔ آپ خود ہی انصاف فرمائیں کہ گوش آدم نے اس سے بڑا جھوٹ خالق ارض و سما کے پیدا کردہ اس آسمان کے نیچے سنا ہے؟ کیا یہ دجل و فریب اور کذب بیانی کی انتہائی شرمناک افسوسناک اور حیرت ناک مثال نہیں ہے۔ اس" بااصول جماعت" کے چہرۂ روشن کو دیکھئے کیا اس سے قابل مذمت اور نفرت انگیز کردار آپ کے سامنے ہے؟ اور کیا یہ اس صدی کا سب سے بڑا جھوٹ نہیں ہے؟

پیر مودودی اور میاں مرید کا واضح اختلاف

قابل غور و فکر " ہم اس بات کا کھلے دل سے اعتراف کرتے ہیں کہ تقسیم ملک کی جنگ سے ہم غیر متعلق رہے ہیں اس کارکردگی کا سہرا ہم صرف مسلم لیگ کے سر باندھتے ہیں۔ اور اس میدان میں کسی حصے کا اپنے آپ کو دعویدار نہیں سمجھتے۔"
(ترجمان القرآن نومبر ۱۹۶۳ء صفحہ ۶۹)

عزیزان ملت! اختلاف دونوں میں صرف اتنا سا ہے۔ جھوٹ کہنے میں اصل میں دونوں ایک ہیں۔ کیا کریں حقیقت کشائی ضروری ہو جاتی ہے۔ (مرتب)

" پاکستان بنانے میں ہمارا بہت بڑا ہاتھ تھا " (ملاحظہ ہو ترجمان القرآن بابت اکتوبر ۱۹۵۰ء)

ترجمان القرآن جون ۱۹۴۷ء

یہ آخری شمارہ ہے جو متحدہ ہندوستان میں شائع ہوا تھا، جس میں مفسر قرآن مفکر اسلام اور محقق دین مولانا حضرت مودودی صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

"میں آپ لوگوں سے اکثر کہتا رہا ہوں کہ اسلامی انقلاب پیدا کرنے کا جتنا امکان مسلم اکثریت کے علاقوں میں ہے، قریب قریب اتنا ہی امکان غیر مسلم اکثریت کے علاقوں میں بھی ہے۔ میری اس بات کو بہت سے لوگ ایک غرق تخیل آدمی کا خواب سمجھتے ہیں اور بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ غالباً تصوف کا کوئی نکتہ ہے جو ہماری سمجھ سے بالا ہے۔"

(بحوالہ جماعت اسلامی پر ایک نظر ص۴۴)

قیام پاکستان کے بعد پہلا ترجمان القرآن

جون ۱۹۴۸ء

اس میں محسن ملت، شیدائی اسلام، اللہ کے شاہکار مودودی کی زہر فشانیاں، اور شکست ماضی کا غم و غصہ اور قائدین تحریک قیام پاکستان کے خلاف نفرت انگیز لب و لہجہ دیکھئے مسلم لیگی قیادت سے متعلق۔

رقمطراز ہیں:۔

"اس نے حصول پاکستان کی جنگ میں اُن علاقوں کے مسلمانوں کو شریک کیا جنہیں لامحالہ ہندوستان ہی میں رہنا تھا۔ آج یہ اسی کا خمیازہ ہے کہ ہندوستان کی سرزمین ان غریبوں کے لیے جہنم بن گئی ہے حالانکہ اگر تقسیم کے بعد ہندوستانی اور پاکستانی مسلمانوں کا مستقبل ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہو جانے والا تھا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ تقسیم سے پہلے دونوں کی پالیسی ایک ہوتی۔" (ص۳)

آگے بڑھیئے۔

"پچھلے دس سال کی قومی تحریک میں اسلام کا نام جس قدر لیا گیا اس کا پچاسواں حصہ بھی مسلمانوں کے اندر اسلامی اخلاق پیدا کرنے کے لیے کام نہیں کیا گیا بلکہ اس کے قومی اخلاق کو پہلے سے کچھ زیادہ ہی پست کر دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ قومی جنگ میں مسلمان ان تمام اخلاقی جرائم کے مرتکب ہوئے جن کا ارتکاب ان کے حریفوں نے کیا یا مظالم کی ابتدا میں چاہے

کتنا ہی فرق رہا ہو۔ مگر نظام کی نوعیت میں دونوں کے کارنامے ایک دوسرے سے کچھ مختلف نہ رہے اگر ہماری قومی قیادت نے ہمارے عوام کی اخلاقی تربیت کے لیے کوشش کی ہوتی اور اکثریت کے علاقوں کے مسلمان وہ حرکات نہ کرتے جو انہوں نے کیں تو اقلیت کے مسلمان اس بری طرح سے نہ پیسے جاتے۔ اور آج پاکستان کی اخلاقی پوزیشن ہندوستان سے اتنی زیادہ اونچی ہوتی کہ ہندوستان اس سے آنکھ ملا کر بات نہ کر سکتا۔" (ایضاً)

ہم اس تکرار پر معذرت خواہ ہیں اس لئے کہ "بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر (مرتب)

"یہ بحث سے لوگوں کا منہ کالا کر دینے والی ہے جنہوں نے پچھلے ربع صدی میں ہماری سیاسی تحریکوں کی قیادت فرمائی ہے۔" (ایضاً ص۴۲)

یاد رہے کہ اسوقت پاکستان کی قیادت حضرت قائد اعظم علیہ الرحمۃ فرما رہے تھے۔ پتہ نہیں کہ جماعت اسلامی کے سابقہ اور حالیہ امیر کے نزدیک بلند کرداری اور بلند اخلاقی کا مفہوم و معنی کیا ہے۔ اگر یہی ہے جو مندرجہ بالا تحریرات میں آپ نے دیکھ لیا ہے کہ ایسا کھلا جھوٹ بولتے ہوتے بھی نہیں شرماتے جس کی مخالفت و مذمت موجودہ حالات میں بھی نوائے وقت کرنے پر مجبور ہوا۔ تو پھر ہم مان لیتے ہیں کہ اخلاقی تربیت، اخلاق سنوارنا اسی کو کہتے ہیں۔ ایک تربیت کرنے والے اور ایک تربیت یافتہ دونوں کی بلندی سیرت کا ملاحظہ اور ان کی اخلاقی اقدار کا معائنہ فرمائیے گا جناب مولانا کی بربہار بس کی تربیت اور میاں صاحب کی افادیت پیش نظر رہے کہ جن تین شخصیتوں نے پاکستان بنایا ہے ان میں ان کے امام مودودی بھی ہیں (مرتب)

دین میں جتنا ہلکا اتنا اوپر

جناب مودودی کا ترجمان القرآن جولائی ۱۹۴۷ء کا پرچہ جسمیں لکھا گیا

"یہ تھیں وہ بنیادیں جن پر ہماری یہ قومی تحریک اوّل روز سے اٹھی اور آخر تک بڑھتی چلی گئی۔ اس کے اجزاء ترکیبی میں مومن اور منافق اور کھلے کھلے ملحد سب شامل تھے۔ بلکہ دین میں جو جتنا ہلکا تھا اتنا ہی اوپر آیا۔ اس میں اخلاق کی سرے سے کوئی پوچھ نہ تھی۔ عام کارکنوں سے لے کر بڑے بڑے ذمہ دار لیڈروں تک میں انتہائی ناقابل اعتماد سیرت کے لوگ موجود تھے۔ بلکہ تحریک کا قدم جتنا آگے بڑھا، اس قسم کے عناصر کا تناسب بڑھتا ہی چلا گیا۔ اس میں اسلام کو اتباع کے لیے نہیں بلکہ صرف عوام میں مذہبی جوش پیدا کرنے کے لیے فریق جنگ بنایا گیا تھا۔ کبھی ایک دن کے لیے بھی اس کو یہ حیثیت نہیں دی گئی کہ وہ حکم دے اور یہ اسے مانیں اور کوئی قدم اٹھاتے وقت یہ اس سے استصواب کریں۔ پھر چونکہ مقابلہ ہندو سے تھا، اس لیے بھی ضروری تھا کہ اس کے ہر حربے کا جواب ویسے ہی حربے سے، ہر چوٹ کا جواب ویسی ہی چوٹ سے اور ہر چال کا جواب ویسی ہی چال سے دیا جائے۔ جن جن پستیوں میں وہ گرا مسلمان بھی اس کی ضد میں گرے۔ اور جو جو کچھ وہ اپنی قومی خود غرضیوں کی خاطر کرتا چلا گیا، مسلمانوں نے اس دلیل پر اس کا ارتکاب کیا کہ ہندو ایسا کر رہا ہے۔ اس مقابلہ و مسابقت نے مسلمانوں کی عام اخلاقی سطح اتنی گرا دی کہ شائد اس سے پہلے وہ کبھی اخلاقی حیثیت سے اتنے نہ گرے تھے۔

(ترجمان القرآن شمارہ جولائی ۱۹۴۶ء صفحہ ۶)

ترجمان القرآن میں فرمایا گیا ہے کہ دین میں جتنا ہلکا، اتنا اوپر۔ تاریخ پاکستان سے تھوڑی سی واقفیت رکھنے والا بھی حقیقت آشنا ہے کہ سینکڑوں نہیں ہزاروں کی تعداد میں ایسے نیک کردار، نیک خصلت، اور شمع رسالت کے پروانے تحریک پاکستان میں مسلمانوں کی قیادت کر رہے تھے۔ جن میں ایک قائد اعظم بھی تھے جن کی راست گوئی دیانت، اور پاکبازی کے ان کے دشمن تک معترف تھے۔ پھر مولانا شبیر احمد عثمانی، پیر صاحب مانکی شریف، میاں عبدالباری (مرحومین و مغفورین) کے علاوہ پیران عظام، علمائے کرام اور ایسے ایسے کارکنان بھی تھے جن کے کیریکٹر کی بلندی شائد ہی ایسوں کو نصیب ہو۔ جو مسلم لیگی قیادت پر حرف زنی کر رہے ہیں یہ درست ہے کہ اس امت میں بقول حضرت حکیم الامت

تھے ان میں کاہل بھی ہیں غافل بھی ہیں ہشیار بھی ہیں

لیکن پھر بھی اللہ کے نام پر یہی گنہگارانِ اُمت میدانِ عمل میں نظر آئے اور خود ساختہ و پرداختہ صالحین و مقدسین کا طائفہ اِس جہدِ مستحسن کے خلاف ہی سرگرم عمل نظر آیا اور جس منافقت کا مظاہرہ آج یہ لوگ کر رہے ہیں شاید ہی تاریخ عالم میں حقائق مسخ کرنیوالے دوسرے ایسے فنکار نظر آسکیں۔ اس کاروانِ ملت میں بے مثال اخلاقی طور پر بلند و برتر جوانانِ ملت جو نوجوان مسلمان کی قیادت کر رہے تھے۔ محترم خان عبدالستار خاں نیازی ایم اے اور حمید نظامی ایسے پاک خیال، پاک نگار اور اعلیٰ کردار بھی تھے ہاں جب بزرگانِ مسلم لیگی قیادت میں ابھرے ہوئے لوگوں میں سردار عبدالرب نشتر بھی تھے اور مولانا ظفر عثمانیؒ بھی۔ ان میں مولانا راغب احسن ایم اے ایسے درویشِ خدامست اور پاکباز و پاک سیرت بھی تھے کہ دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں پھر اسی منزلِ مراد کو پا لینے والے کارواں میں جو شریکِ سفر تھے اُن میں حضرت مولانا عبدالحامد بدایونیؒ اور عبدالرحمٰن صدیقیؒ بھی تھے۔ جناب مولانا بشیر احمد اختر بی اے اور کس کس کا ذکر کریں۔ یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جا سکتی ہے۔ یہ سب کے سب ان منافقین سے بلند و بالا کریکٹر رکھتے تھے جو ایڑی سے چوٹی تک قائدین تحریکِ پاکستان کی مخالفت کرنے، ان پر طعن و تشنیع کے تیر برسانے کے علاوہ ان کی ذات میں کیڑے ڈالنے میں شب و روز مصروف و مشغول رہے۔ اور آج اِس شرمناک انداز پر جھوٹ بول رہے ہیں کہ انہوں نے حصولِ پاکستان میں بھرپور حصہ لیا ہے اور نظریہ پاکستان کی قولاً، فعلاً اور عملاً تائید و حمایت کی ہے۔ کیا خواجہ ناظم الدین مرحوم کی دینداری اور اسلام سے شیفتگی میں کوئی شک کر سکتا ہے۔ کیا خان لیاقت علی خاں کی بے لوثی کو کوئی چیلنج کر سکتا ہے۔ بعد مرنے کے (شہادت) اُن کے گھر سے کیا سامان نکلا۔ در اصل یہ تو مسلم لیگی قیادت سے نفرت و عداوت ہے جو مودودی صاحب سے ایسے نازیبا کلمات نکلوا رہی ہے۔ مسلم لیگی قیادت و سیادت میں کئی ایک مردانِ خدا تھے جن کی ایمان افروز جہد و ہمت اور خدمتِ ملت کے جذبوں سے سرشاریوں نے مسلمانانِ ہند کو ایک علیحدہ آزاد مملکت خداداد پاکستان کے حصول میں کامیاب و کامران کیا۔

ترجمان القرآن
اگست ۱۹۴۷ء ص ۳

" اس پورے گروہ میں سے ایک کوہ کن بھی نہ نکلا جو بازی کھو دینے کے بعد سر دے سکتا۔ ساری جماعت بازی گروں سے پٹی پڑی تھی جنہوں نے عجیب عجیب قلابازیاں کھا کر دنیا کو اپنی بودی سیرت اور کھوکھلے اخلاق کا تماشا دکھایا اور اس قوم کی رہی سہی عزت بھی خاک میں ملا دی۔"

خیال فرمایا آپ نے مودودی صاحب کی گوہر افشانیاں اور زہر چکانی اس زمانے میں ہو رہی ہے جب پاکستان انتہائی نازک دور سے گزر رہا تھا۔ اس وقت پاکستان دوستی، حب الوطنی اور عظمت اسلام اور احترام ملت کا تقاضا تو یہ تھا کہ مودودی صاحب فرزندان اسلام میں اعتماد و بھروسہ پیدا کر کے ان میں خود اعتمادی، حوصلہ اور پاکستان کو مضبوط اور مستحکم بنانے کا جذبہ و ولولہ پیدا کرتے، لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ ان قیامت خیز، ہمت شکن حالات میں حضرت مولانا مسلسل اور متواتر اس ملک کو حاصل کرنے والی مسلمان قیادت کے خلاف زہر اگلے جا رہے ہیں۔

مودودی صاحب کی نظر بندی کے بعد جہلم کے نوجوان فضل الرحمٰن جناب نعیم صدیقی کے رشحات قلم کا نمونہ دیکھئے۔ ترجمان القرآن جون، جولائی ۱۹۴۶ء کے پرچے کو صاحب مذکور نے ترتیب دیکر شائع کیا۔ آپ کے ارشادات کے بیشتر حصے کو پریس نے چھاپنے سے انکار کر دیا تھا۔ جو کچھ شائع ہوا وہ دیکھئے۔ فرماتے ہیں :۔

" چنانچہ انڈیا اور پاکستان کے لاکھوں عوام کی زندگیوں سے ستّہ کا جوا کھیلنے والے جو کھلاڑی دونوں مملکتوں کے ایوان ہائے اقتدار کی مسندوں پر قابض ہیں ان کو۔ اور جس لحاظ سے بھی جانچا گیا ہو۔ ان کا اخلاقی معائنہ بہر حال نہیں کیا گیا.......

یہ ایک تاریخی عجوبہ ہے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد بھی زندگی کی امامت انہی لوگوں کے قبضہ میں ہے جو اپنے اخلاقی افلاس اور اپنے ضمیر کے دیوالیے پن کا پورا پورا ثبوت بہم پہنچا چکے ہیں"

اس کے بعد انہوں نے چند ایک ایسی خرابیوں کا ذکر کیا جو کانگریس اور مسلم لیگ

دونوں قیادتوں میں پائی جاتی تھیں۔ ازاں بعد پھر مسلم لیگ قیادت کی طرف توجہ فرمائی گئی اور کہا گیا کہ

مسلم لیگ کی قیادت

"انڈیا کی قیادت کرنیوالی ٹیم جن افراد پر مشتمل ہے ان کے پاس اور کچھ نہیں تو کم از کم کچھ "خدمات" اور "قربانیاں" ضرور ہیں (اگرچہ ان خدمات اور قربانیوں کے باوجود موجودہ وزارت اور قیادت کے خلاف نفرت کا کھلا کھلا اظہار ہونے لگا ہے اور کلکتہ کے حالیہ واقعات تو نہرو گورنمنٹ کے خلاف عدم اعتماد کا نہایت تلخ مظاہرہ ہیں) لیکن پاکستان کی سربراہ کاری کے لیے جو ٹیم تقدیر الٰہی کی طرف سے نامزد ہوئی ہے، اس کے افراد پر زمانہ اتنا مہربان رہا ہے کہ وہ ایک جتنے کی قربانی دیئے بغیر اپنی عادات میں کسی قسم کا تغیر و تبدل کئے بغیر سیدھے صوفوں سے اٹھ کر قالینوں پر قدم رکھتے ہوئے اقتدار کی مسندوں پر براجمان ہو گئے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو محض اپنی جاگیرداریوں، اپنی ملازمتوں اپنے کاروباروں اور اپنی وکالتوں کے زور سے لیڈر بنے ہیں اور ان کے علم و اخلاق اور سیاسی خدمات میں امتیازی مقام حاصل کرنے کی ضرورت کبھی پیش نہیں آئی۔

"اب ایسے لوگوں کو اگر قوم کے سیاہ و سپید کا مالک بنا دیا جائے تو وہ اس کے سوا آخر اور کریں گے کیا کہ انہیں اپنی اغراض کو پورا کرنے کے لیے جو مواقع مل سکیں ان سے فائدہ اٹھائیں۔ قانون اور اختیار سے جو خدمت لی جا سکے وہ لیں۔ عیش و راحت کے زیادہ سے زیادہ ذرائع پر قبضہ کر لیں ٹھاٹھ باٹھ اور شان کے مظاہرے کریں۔ قوم اور ریاست کے خزانے پر زیادہ سے زیادہ بار ڈالیں۔ اس کے سوا آخر اور کس چیز کی توقع ان حضرات سے کس بنا پر کی جا سکتی ہے۔"

(ترجمان القرآن جون جولائی ۱۹۴۸ء صفحہ ۲۳)

آبرو باختہ قیادت

پھر لکھتے ہیں :-

"پھر یہ عین وہی لوگ ہیں جو اپنی پوری سیاسی تحریک میں اپنی غلط سے غلط سرگرمیوں میں اسلام کو ساتھ ساتھ گھسیٹتے پھرے ہیں۔ انہوں نے قرآن کی آیتوں

اور حدیث کی روایتوں کو اپنی قوم پرستانہ کشمکش کے ہر مرحلے میں استعمال کیا ہے انہوں نے پاکستان کے معنی ہمیشہ لا الہ الا اللہ بتایا ہے لیکن افسوس کہ ان کی محبت اسلام کے ان کی خدا پرستی کے، ان کی حبِّ رسالت کے، ان کے قرآن دوستی کے، اور ان کی لا الہٰ خوانی کے جو عملی مناظر پاکستان کی تیئیس ماہ کی تاریخ کے عجائب خانے میں آراستہ ملتے ہیں ان کو دیکھ کر ہر خوشحال مسلمان کی گردن شرم سے جھک جاتی ہے

کسی ملک و قوم کی انتہائی بدقسمتی یہی ہو سکتی ہے کہ نااہل اور اخلاق باختہ قیادت اس کے اقتدار پر قابض ہو جائے۔ ایک سفینہ حیات کو غرق کرنے کے لیے طوفان کی موجیں وہ کام نہیں کر سکتیں جو اس کے خیانت کار ملاح کر سکتے ہیں کسی قلعہ کی دیواروں کو دشمن کے گولے اس آسانی سے نہیں چھید سکتے جس آسانی سے اس کے فرض ناشناس سنتری اس کی تباہی کا سامان کر سکتے ہیں بالکل اسی طرح ایک ملت کے لیے بیرونی خطرے اتنے مہلک نہیں ہوتے جتنا کہ نااہل قیادت کا داخلی خطرہ مہلک ہوتا ہے۔ پھر اگر حالات معمولی نہ ہوں بلکہ ایک قوم کی تعمیر کا آغاز ہو رہا ہو اور یہ آغاز بھی نہایت ناسازگار حوال کے درمیان ہو رہا ہو ایسے حالات میں کسی غیر صالح قیادت کو ایک منٹ کے لیے بھی گوارا کرنا خلاف مصلحت ہے، ایک غلط قیادت کی بقا کے لیے کسی طرح کی کوشش کرنا ملک اور قوم سے سب سے بڑی غداری ہے اور غلط قیادت سے نجات دلانے کی فکر کرنا اس کی سب سے بڑی خیرخواہی ہے۔ (ایضاً صفحہ ۷۶)

اب بھی کوئی کہے کہ مودودی صاحب اور ان کی جماعت اسلامی نے قیادت قیام پاکستان اور حصول پاکستان کی تحریک کی مخالفت کی تھی؟ نعیم صدیقی صاحب! تاریخ کا عجوبہ یہ نہیں جو آپ نے تحریر کیا ہے تاریخ تحریک قیام پاکستان کا عظیم المیہ اور تاریخ کا سب سے بڑا عجوبہ یہ ہے کہ اس زہر فشانی کے بعد آپ کے امیر و امام سے لے کر ادنیٰ کارکن تک سبھی یہ لکھتے ہیں کہ ہم نے تحریکِ قیام پاکستان اور مفکرِ تحریک پاکستان کی حمایت و رہنمائی میں قدم بڑھائے ہیں کیا اس سے زیادہ کذب بیانی، دروغ گوئی اور اخلاق باختگی کا اور کوئی ثبوت آپ کے اخلاقی معاشرہ کے بعد مل سکتا ہے۔

آپ کے یہ ارشادات جون جولائی ۱۹۴۹ء کے ہیں قیادت تشکیلِ پاکستان کے بعد حکیم الامت حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کے انتخاب کردہ قائد اعظم، لیاقت علی خاں مرحوم و مغفور اور جناب خواجہ ناظم الدین ایسے صاف و شفاف کیریکٹر کے لوگوں

کے ہاتھ میں تھی۔ آپ کی اخلاقی بلندیاں کیا کہنے! راقم السطور آگے چل کر اس پر بھی روشنی ڈالے گا۔ یہاں اختصار پیشِ نظر ہے۔

سنہ ۱۹۴۵ء میں مودودی صاحب کی زہر فشانی

دہریوں اور کافروں کی قیادت

"ہمارا اپنے آپ کو بندگیٔ رب کے حوالے کر دینا اور اس حوالگی و سپردگی میں ہمارا منافق نہ ہونا بلکہ مخلص ہونا اور پھر ہماری زندگی کو تناقضات سے پاک کر کے مسلم حنیف بننے کی کوشش کرنا لازمی طور پر اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ ہم اس نظامِ زندگی میں انقلاب چاہیں۔ جو آج کفر و دہریت، شرک، فسق و فجور اور بداخلاقی کی بنیادوں پر چل رہا ہے۔ اور جس کے نقشے بنانے والے مفکرین اور جس کا عملی انتظام کرنے والے مدبرین سب کے سب خدا سے پھرے ہوئے ہیں اور اس کی شرائع کی قیود سے نکلے ہوئے لوگ ہیں۔ جب تک زمام کار ان ہاتھوں میں رہے گی اور جب تک علوم و فنون، آرٹ و ادب، تعلیم و تدریس، نشر و اشاعت، قانون سازی اور تنفیذِ قانون، مالیات، صنعت و حرفت، تجارت، انتظامِ ملکی اور تعلقاتِ بین الاقوامی، ہر چیز کی باگ ڈور یہ لوگ سنبھالے رہیں گے۔ کسی شخص کے لیے دنیا میں مسلمان کی حیثیت سے زندگی بسر کرنا اور خدا کی بندگی کو اپنا وظیفۂ حیات بنا کر رہنا نہ صرف عملاً محال ہے بلکہ آئندہ نسلوں کو اعتقاداً بھی اسلام کا پیرو چھوڑنا ناممکن ہے۔ فساق و فجار اور خدا کے باغی اور شیطان کے مطیع (دنیا کے امام اور پیشوا رہیں اور پھر دنیا میں ظلم و فساد، بداخلاقی اور گمراہی کا دور دورہ نہ ہو۔ یہ عقل اور فطرت کے خلاف ہے اور آج تجربے و مشاہدے سے کالشمس فی النہار ثابت ہو چکا ہے کہ ایسا ہونا ناممکن ہے۔ پس ہمارا مسلم ہونا خود اس بات کا متقاضی ہے کہ ہم دنیا سے آئمہ ضلالت کی پیشوائی ختم کر دینے، اور غلبۂ کفر و شرک مٹا کر دینِ حق کو اس کی جگہ قائم کرنے کی سعی کریں۔" (ایضاً ص ۸۰)

یہ مودودی صاحب کی ایک تقریر کا اقتباس ہے جب قیادت قائدِ اعظم رحمہ کے ہاتھوں میں تھی۔ (مرتب)

عبد المجید صدیقی

ترجمان القرآن نومبر ۱۹۶۳ء کے شمارے میں عبد المجید صدیقی "اشارات" میں اعتراف حقیقت کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :-

"ہم اس بات کا کھلے بندوں اعتراف کرتے ہیں کہ تقسیم ملک کی جنگ سے ہم غیر متعلق رہے ہیں۔ اس کارکردگی کا سہرا ہم صرف مسلم لیگ کے سر باندھتے ہیں اور اس میدان میں کسی حصہ کا اپنے آپ کو دعویدار نہیں سمجھتے۔"

کتنی معقول بات (جماعت اسلامی میں ہوتے ہوئے) جناب عبد المجید صدیقی کے قلم سے نکل گئی۔ جناب! آپ نے میاں طفیل محمد صاحب امیر جماعت اسلامی (موجودہ) سے مشورہ کیوں نہ کیا؟ اور ہدایت کیوں نہ لی؟ بھولے صدیقی صاحب! پاکستان تو بنایا ہی صرف تین شخصیتوں نے ہے۔ ایک حکیم الامت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ، دوسرے قائد اعظمؒ اور تیسرے آپ کے مودودی صاحب، اور آپ کہہ رہے ہیں کہ یہ سہرا ہم صرف مسلم لیگ کے سر باندھتے ہیں اور اس میدان میں کسی حصہ کا اپنے آپ کو دعویدار نہیں سمجھتے حیرانی سی ہے کہ آپ جماعت اسلامی میں کیوں ہیں؟ (مرتب)

سب کچھ جانتے بوجھتے

جریدہ ایشیا لاہور کی ۱۱۔اکتوبر کی اشاعت میں ڈاکٹر الٰہی علوی صاحب سابق کونسلر آل انڈیا مسلم لیگ کا ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے "اسلامی آئین اور قائد اعظم" اس میں انہوں نے بتایا ہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس جو ۱۹۴۲ء میں کراچی میں منعقد ہوا تھا (اور جس میں ڈاکٹر علوی صاحب خود شریک تھے) ایک قرارداد منظور ہوئی تھی جس میں کہا گیا تھا کہ پاکستان میں جو آئین ہوگا وہ قرآن و سنت کے مطابق ہوگا اور رائج الوقت قوانین میں جلد از جلد شریعت کے مطابق تبدیلی کی جائے گی۔

ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ اس تجویز کی موافقت میں متعدد تقاریر ہوئیں اور اس کی مخالفت میں کوئی ایک آواز بھی نہ اٹھی۔ خود قائد اعظم نے اس کے حق میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ :۔

"جہاں تک اس تجویز کا تعلق ہے، وہ ہر مسلمان کے دل کی پکار ہے اور قرارداد پاکستان کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ مسلم لیگ کا مشن اور پاکستان کا مقصد اس کے سوا اور کیا ہے کہ پاکستان میں اللہ کے دین کا نظام قائم ہو"

ڈاکٹر صاحب نے اس کے بعد لکھا ہے کہ وہ (اس اجلاس کے بعد مودودی صاحب سے ملنے پٹھانکوٹ دارالسلام) گئے۔ اور ان سے اس اجلاس کی کارروائی اور قرارداد کا تذکرہ کیا۔ اور مولانا سے عرض کیا کہ لیگ کے قائد اور ممبران کا یہ میلان دیکھتے ہوئے مسلمانوں کے لیے اب آپ کا مشورہ کیا ہے مولانا نے فرمایا کہ مسلم لیگ میں اس رجحان کو تقویت دینے کے لیے مخلص اور دیندار لوگوں کا اس میں رہنا ضروری ہے۔

یہ ۱۹۴۲ء کا واقعہ ہے سوال یہ ہے کہ اس کے بعد

۱۔ مودودی صاحب خود مسلم لیگ میں شریک ہو گئے۔ اگر نہیں ہوئے تو کیوں؟

۲۔ کیا انہوں نے اپنی جماعت کے اراکین کو مشورہ دیا کہ وہ مسلم لیگ میں شریک ہو جائیں۔ ظاہر ہے کہ ان ہی کے لیے تو "مخلص اور دیندار" ہوں گے ہی؟

۳۔ کیا مودودی صاحب نے اپنی کسی تحریر یا تقریر میں مسلم لیگ کی اس قرارداد کا تذکرہ کیا یا عام مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ مسلم لیگ میں شریک ہو جائیں۔

اس کے برعکس کیا یہ واقعہ نہیں کہ

۴۔ مودودی صاحب بدستور مسلم لیگ اور اس کے مطالبہ پاکستان کی مخالفت کرتے رہے؟ حتیٰ کہ (۱) انہوں نے نومبر ۱۹۴۶ء کے ترجمان القرآن میں لکھا کہ ..

جنت الحمقاء میں بسنے والے لوگ اپنے خوابوں میں خواہ کتنے ہی سبز باغ دیکھ لیے ہوں لیکن آزاد پاکستان (اگر فی الواقع وہ بنا بھی تو) لازماً جمہوری لادینی اسٹیٹ کے نظریہ پر بنے گا۔ اور

۳- اپریل ۱۹۴۷ء میں ان کی جماعت کے ایک اجلاس منعقدہ ٹونک) میں ان کی جماعت کے بعض افراد نے مسلم لیگ میں شمولیت کے متعلق سوال کیا تو انہوں نے کہا "جب آپ ایک تحریک کو غیر اسلامی مان رہے ہیں تو پھر کس منہ سے ایک مسلمان سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ اس کا ساتھ دے۔ حالانکہ جب اسی قسم کی قرارداد پاکستان کی مجلس دستور ساز نے پاس کی (جسے قرارداد مقاصد کہا جاتا ہے) تو مودودی صاحب نے ارشاد فرمایا کہ اس سے یہ مملکت مسلمان ہو گئی ہے یعنی مملکت پاکستان تو اس قرارداد سے مسلمان ہو گئی لیکن تحریک پاکستان اس قسم کی قرارداد کے باوجود غیر اسلامی کی غیر اسلامی رہی۔ اور اس کے ساتھ ہی مودودی صاحب بھی) اپنے ہم نواؤں کی نگاہ میں بدستور امام احمد حنبل اور امام ابن تیمیہ کے ہم پایہ رہے

اے زر تو خدا نہ ای ولیکن بخدا

ستار العیوبی و قاضی الحاجاتی

(ط-۱، دسمبر ۱۹۷۰ء، صفحہ ۵۹، ۶۰)

مملکت پاکستان تو قرارداد مقاصد سے اس لیے مسلمان ہو گئی کہ وہاں مودودی صاحب کی خواہش اقتدار کے پورا ہونے کا سہانا خواب تو باقی رہ سکتا تھا۔ اگر جناب وہ تحریک قیام پاکستان کو یہ درجہ دے دیتے تو جو لوگ ان کے پیچھے لگے ہوئے تھے ان کو اپنے دام فریب میں رکھنے کے لیے پھر وہ کیا دلیل دیتے؟ ہمیں سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر کیوں لوگ مودودی صاحب کی اجتہادی صلاحیتوں اور اسلامی خدمتوں کے معترف دقائل نہیں ہوتے؟ (مرتب)

مودودی صاحب کی تقریر،

غلط بیانیاں اور فریب بیاں

طلوع اسلام کی اشاعت بابت اکتوبر ۱۹۷۰ء میں، مودودی صاحب کی اس تقریر کا، جو انہوں نے جماعت اسلامی کے یوم تاسیس کی تقریب پر ۲۶- اگست کو کی تھی، جو

تجزیہ پیش کیا گیا تھا۔ للہ الحمد! کہ اس نے بڑے خوشگوار نتائج پیدا کیے۔ اُن لوگوں پر جو نیک نیتی سے مودودی صاحب کی غلط بیانیاں اور فریب دہیاں اس طرح بے نقاب ہوئی ہیں کہ ان کی اصل و حقیقت واضح طور پر سامنے آگئی ہے۔ اس جماعت سے متعلقین کے دوسرے طبقہ کی طرف سے جس قسم کے سب و شتم سے لبریز لیکن گمنام، خطوط موصول ہوئے ہیں، اُن سے ان کی بلبلاہٹ نمایاں طور پر سامنے آجاتی ہے اور تیسری چیز یہ کہ اس وقت تک ہماری نظروں سے اس جماعت کا کوئی جریدہ ایسا نہیں گزرا جس میں ہمارے پیش کردہ حقائق کی تردید کی گئی ہو۔ ان کی تردید ممکن ہی نہیں۔ طلوعِ اسلام کبھی کوئی غیر مستند بات نہیں لکھا کرتا

ہم نے لکھا تھا کہ مودودی صاحب کی تقریر میں اور بھی بہت سی غلط بیانیاں ہیں جن کا جائزہ کسی آئندہ اشاعت میں لیا جائے گا۔ ان میں سے چند ایک اشاعت حاضرہ میں سامنے لائی جاتی ہیں۔

مسلمان قوم

مودودی صاحب نے اپنی تقریر میں کہا ہے کہ ۱۹۳۸ء میں جب انہوں نے سیاسی کشمکش لکھنی شروع کی تھی تو اس وقت میرے پیش نظر اولین کام یہ تھا کہ۔ مسلمانوں کو کسی طرح اپنی قومی شخصیت اور قومی انفرادیت فراموش نہ ہونے دوں اور ان کو غیر مسلم قوم کے اندر جذب ہونے سے بچاؤں۔ ظاہر بات ہے کہ جو شخص بھی اسلام کو یہاں سربلند کرنا چاہے وہ ضرور یہ خیال کرے گا کہ میرے پاس پہلے سے جو سرمایہ موجود ہے وہ ضائع نہ ہو جائے۔ اور اس کے بعد وہ مزید سرمایہ حاصل کرنے کی کوشش کریگا جو لوگ پہلے سے کلمہ لا الٰہ الا اللہ کے قائل ہیں اور اپنے آپ کو مسلمان سمجھتے ہیں پہلے ہمیں ان کی فکر ہونی چاہیئے کہ کہیں وہ بھی ضائع نہ ہو جائیں۔ دوسروں کو مسلمان بنانے کی فکر تو بعد ہی میں کی جا سکتی ہے۔ اس لیے میں نے اپنا پورا زور اس کام میں صرف کر دیا کہ مسلمانوں کو غیر مسلم قومیت کے اندر جذب ہونے سے بچایا جائے۔ اور ان کے اندر یہ احساس پیدا کیا جائے کہ تم ایک مستقل قومیت رکھتے ہو۔ تمہارے لیے یہ کسی

طرح ممکن نہیں ہے کہ تم دوسری قومیت میں ضم ہو جاؤ۔ (ایشیا ۲ ستمبر ۱۹۷۰ء)
یہ کھلا ہوا جھوٹ ہے۔ تحریک پاکستان کے دوران مسلم لیگ اور مودودی صاحب کے درمیان مابہ النزاع مسئلہ ہی یہ تھا کہ مسلم لیگ کہتی تھی کہ موجودہ مسلمان جیسے کچھ بھی ہیں انہیں ہندوؤں کے اندر جذب ہونے سے بچا لیا جائے اور اس کا عملی حل یہ ہے کہ ان کی ایک جداگانہ مملکت قائم کر لی جائے۔
اس کے برعکس مودودی صاحب کا موقف یہ تھا کہ یہ "پیدائشی مسلمان" ایک جنس کاسد ہیں جنھیں بچانے کی کوشش بے معنی ہے یہ رہیں یا نہ رہیں اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا انھیں "مسلمان" بنانے کی فکر کرنی چاہیئے۔ یہ "انبوہ عظیم جس کو مسلمان قوم کہا جاتا ہے اس کا حال یہ ہے کہ اس کے ۹۹۹ فی ہزار افراد نہ اسلام کا علم رکھتے ہیں نہ حق و باطل کی تمیز سے آشنا ہیں۔ نہ ان کا اخلاقی نقطۂ نظر اور ذہنی رویہ اسلام کے مطابق تبدیل ہوا ہے۔ باپ سے بیٹے اور بیٹے سے پوتے کو بس مسلمان نام ملتا چلا آیا ہے اس لیئے یہ مسلمان ہیں۔" آپ اس نام نہاد مسلم سوسائٹی کا جائزہ لیں گے تو اس میں آپ کو بھانت بھانت کا مسلمان نظر آئے گا۔ مسلمان کی اتنی قسمیں ملیں گی کہ آپ شمار نہ کر سکیں گے۔ یہ ایک چڑیا گھر ہے جس میں چیل، کوتے، گدھ، بٹیر تیتر اور ہزاروں قسم کے جانور جمع ہیں۔ ان میں سے ہر ایک چڑیا ہے کیونکہ چڑیا گھر میں داخل ہے۔ (سیاسی کشمکش حصہ سوم) ان مسلمانوں کے متعلق وہ کہتے تھے کہ "اسلام کو تو ان سکوں کا خزانہ مطلوب نہیں ہے۔ جن پر اشرفی کا ٹھپہ لگا دیا گیا ہو۔ وہ سکے کے نقوش دیکھنے سے پہلے یہ دریافت کرتا ہے کہ ان نقوش کے نیچے خالص سونے کا جوہر بھی ہے یا نہیں، ایسا ایک سکہ ان جعلی اشرفیوں کے ڈھیر سے اس کے نزدیک زیادہ قیمتی ہے۔" (ایضاً)
آپ نے غور فرمایا کہ مودودی صاحب کے نزدیک ان مسلمانوں کی قیمت کیا تھی جن کے متعلق وہ فرما رہے ہیں کہ انہیں ان کے بچانے کی بڑی فکر تھی۔ کہا جائے گا کہ انہوں نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ یہ مسلمان باقی رہیں یا ہندوؤں میں جذب ہو جائیں اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ انہوں نے یہی کہا تھا اور انہی الفاظ میں کہا تھا۔ غور سے سنیے۔ ان کے الفاظ تھے :-

"اگر ہندوستان کے مسلمانوں نے دین سے بے بہرہ لوگوں کی قیادت میں ایک بے دین قوم کی حیثیت سے اپنا علیحدہ وجود برقرار رکھا بھی (جیسا کہ ترکی اور ایران میں برقرار رکھے ہوئے ہیں) تو ان کے اس طرح زندہ رہنے میں اور کسی غیر مسلم قومیت کے اندر فنا ہو جانے میں فرق ہی کیا ہے۔ پتھر نے اگر اپنی جوہریت ہی کھو دی تو پھر جوہری کو اس سے کیا دلچسپی کہ وہ کم بخت پتھر کی صورت میں باقی رہے یا منتشر ہو کر خاک میں رل مل جائے۔ (ترجمان القرآن" مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش بابت فروری ۱۹۴۱ء صفحہ ۱۵)

اس کے بعد ان کی ۲۶ اگست والی تقریر کا وہ اقتباس دوبارہ پڑھئے جسے پہلے درج کیا گیا ہے اور پھر آپ خود ہی فیصلہ کیجئے کہ کیا یہ کھلا ہوا جھوٹ اور فریب کاری ہے یا نہیں؟ مودودی صاحب نے سمجھ رکھا ہے کہ ان کی جماعت نے چونکہ سیاسی کشمکش حصہ سوم کے سابقہ ایڈیشن (یا ترجمان القرآن کے متعلقہ پرچے) سب تلف کر دیئے ہیں اس لیے اب وہ دھڑلے سے غلط بیانی کر سکتے ہیں لیکن انہیں معلوم ہونا چاہئیے کہ (ان کے نامۂ اعمال کے علاوہ) لوگوں کے پاس ان کی یہ تحریریں اب بھی محفوظ ہیں اس لئے وہ بچ کر نہیں جا سکتے۔ مودودی صاحب نے اپنی تقریر میں کہا تھا۔

کافرانہ حکومت

اب گویا تین مسئلے در پیش تھے۔ اگر ملک تقسیم نہ ہو تو مسلمانوں کو بچانے کے لیے کیا کیا جائے۔ ملک تقسیم ہو جائے تو جو مسلمان ہندوستان میں رہ جائیں گے ان کے لیے کیا کیا جائے۔ ملک تقسیم ہو جائے تو جو ملک مسلمانوں کے حصے میں آئے گا اس کو مسلمانوں کی کافرانہ حکومت بننے سے کیسے بچایا جائے اور اسے اسلامی حکومت کے راستے پر کیسے ڈالا جائے۔

ان تین مسئلوں میں سے پہلا مسئلہ یہ تھا کہ اگر ملک تقسیم نہ ہو تو مسلمانوں کو بچانے کے لیے کیا کیا جائے۔ اس سلسلہ میں آپ سیاسی کشمکش حصہ سوم کا وہ اقتباس دیکھ چکے ہیں جسے ہم پہلے درج کر چکے ہیں اور جس میں مودودی صاحب نے فرمایا تھا کہ انہیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ ہندوستان کا مسلمان باقی رہتا ہے یا ختم ہو جاتا ہے۔

جہاں تک دوسرے مسئلے کا تعلق ہے (یعنی ملک تقسیم ہو جائے تو جو مسلمان

ہندوستان میں رہ جائیں گے ان کے لیے کیا کیا جائے۔ یہ واضح ہو سلسلہ میں ان کا مجاہدانہ کارنامہ یہ تھا کہ خود بھاگ کر پاکستان تشریف لے آئے اور ہندوستان کے مسلمانوں کے متعلق فتوٰی صادر فرما دیا کہ پاکستان کے مسلمانوں کا ان کے ساتھ شادی بیاہ بھی کرنا ناجائز ہے۔ پاکستان کے متعلق مودودی صاحب نے اپنی تقریر میں کہا تھا۔

"آج بعض حضرات مجھے یہ طعنہ دیتے ہیں کہ تم بھاگ کر پاکستان کیوں آگئے ؟ مجھے اس کا اندازہ ہے کہ پاکستان میں میرا موجود ہونا ان کے لیے کس قدر شدید غم کا موجب ہے اور اس غم میں میری دلی ہمدردیاں ان کے ساتھ ہیں۔ لیکن انہیں شاید معلوم نہیں کہ میں اسوقت مشرقی پنجاب میں تھا اور اس علاقہ کو جس طرح جبراً مسلمانوں سے خالی کرایا گیا، اس کی وجہ سے میرے لیے پاکستان آنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

مولانا صاحب! آپ ہی کی طرح کے قیام پاکستان کے مخالف مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کے علاوہ دیگر کئی ایک با اصول کانگریسی یعنی نیشنلسٹ مسلمان، بھی تو مشرقی پنجاب میں تھے جنکی غیرت اور اصول نے انہیں وہیں رکھا۔ اور وہ "ناپاکستان" نہیں آئے۔ مودودی صاحب! آپ کا وجود؟ منافق اور مخالف دین نبویؐ کا نام وکام خالق ارض وسما کو کھٹکتا ہے

کتاب زندہ قرآن عزیز اس کا شاہد ہے (مرتب)

اور ہم کہیں گے کہ مودودی صاحب کو شاید معلوم نہیں کہ ہندوؤں کے اس تمام جبر و استبداد کے باوجود ایسے مسلمان بھی تھے جو مشرقی پنجاب میں بدستور ڈٹے رہے اور انہوں نے حالات کا بڑی جانبازی سے مقابلہ کیا۔ اور مرتے دم تک وہیں رہے ہمارے سامنے ایسی مثالیں بھی ہیں کہ ساری لبستی میں تنہا ایک مسلمان گھرانہ رہا مسلمان کی حیثیت سے جیا اور مسلمان کی حیثیت سے مرا لیکن سنیئے مودودی صاحب یہ فرما رہے تھے کہ ان کے پیش نظر جو تین مسائل تھے ان میں تیسرا مسئلہ یہ تھا کہ اگر ملک تقسیم ہو گیا تو پاکستان کی کافرانہ حکومت کو اسلام کے راستے پر کس طرح ڈالا جائے۔ دریافت طلب بات یہ ہے کیا آپ پاکستان اپنے اس مشن کو لیکر برضا و رغبت آئے تھے یا ہندوؤں کے بھگائے ہوئے جبراً ؟

اب آیئے ان کے اس دعوے کی طرف کہ ان کے پیش نظر مقصد یہ تھا کہ اگر ملک تقسیم ہو گیا تو پاکستان کی کافرانہ حکومت کو اسلام کی طرف کیسے لایا جائے ـــــ یہ بھی صریحاً غلط بیانی ہے۔ تحریک پاکستان کے دوران مودودی صاحب سے کہا جا رہا تھا کہ اس وقت انگریز اور ہندو کے خلاف جو سیاسی جنگ ہو رہی ہے اس میں ہمارے پیش نظر یہ مقصد ہے کہ مسلمانوں کے لیے ایک خطۂ زمین حاصل کر لیا جائے جب یہ مقصد حاصل ہو جائے تو پھر اس خطۂ زمین میں صحیح اسلامی حکومت قائم کرنے کے لیے کوشش کر لی جائے گی ـــ سنیئے کہ اس کا مودودی صاحب کیا جواب دیتے تھے۔ ان کا ارشاد تھا۔

"تکرار" بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ ایک دفعہ غیر اسلامی طرز ہی کا ہی مسلمانوں کا قومی اسٹیٹ قائم ہو جائے پھر رفتہ رفتہ تعلیم و تربیت اور اخلاقی اصلاح کے ذریعے اس کو اسلامی اسٹیٹ میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ مگر میں نے تاریخ سیاسیات اور ادر اجتماعیات کا جو تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے۔ اس کی بنا پر میں اس کو ناممکن العمل سمجھتا ہوں۔ اور اگر یہ منصوبہ کامیاب ہو جائے تو میں اسکو ایک معجزہ سمجھوں گا۔" (ترجمان القرآن مارچ ۱۹۴۱ء صفحہ ۲۰)

سوال یہ ہے کہ جب آپ کو یہ یقین تھا کہ اگر قومی حیثیت سے مسلمانوں کی آزاد مملکت قائم ہو گئی تو اس میں اسلامی حکومت قائم کرنا ناممکن ہے تو پھر یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ اسوقت آپ کے پیش نظر یہ بھی تھا کہ اگر ملک تقسیم ہو گیا تو پاکستان کی کافرانہ حکومت کو اسلامی کس طرح بنایا جائے۔ کیا یہ دونوں باتیں باہدگر متضاد نہیں؟ اور پھر یہ کہ جب آپ جانتے ہیں کہ مسلمانوں کا یہ قومی اسٹیٹ اسلامی مملکت نہیں بن سکتا، تو آپ تیئس سال سے یہاں اسلامی نظام کے قیام کی جدوجہد کیوں کر رہے ہیں۔؟

جماعت اسلامی سے متعلق (یا عقیدت مندوں) میں سے بعض حضرات نے ہمیں لکھا ہے کہ اتنا تو آپ بھی تسلیم کریں گے کہ مودودی صاحب نے جو کہا ہے کہ بانیان پاکستان کا یہاں اسلامی نظام قائم کرنے کا ارادہ نہیں تھا، یہ بالکل صحیح ہے۔ ہم اسے تسلیم کریں گے یا نہیں، اسے چھوڑیے۔ آپ یہ فرمایئے کہ اسے آپ تسلیم کریں گے یا نہیں کہ مودودی صاحب

کے اس بیان کے بعد (کہ تشکیل پاکستان کے بعد) اس قومی اسٹیٹ میں اسلامی نظام کا قیام ناممکنات میں سے ہو گا، ان کی طرف سے یہاں اسلامی نظام قائم کرنے کی بات و نعرہ محض فریب ہے یا نہیں جس بات کو ایک شخص ناممکن العمل سمجھے اُس کے لیے کوشاں ہونا یا تو خود فریبی ہے یا فریب دہی۔

لیکن ان حضرات کو اس میں بھی کوئی تضاد دکھائی نہیں دے گا۔ اندھی عقیدت کا یہی نتیجہ ہوتا ہے۔

اسلامی نظام یہ حضرات کہتے ہیں کہ مودودی صاحب نے اس راز کو پا لیا تھا کہ بانیانِ پاکستان کا یہ ارادہ ہی نہیں تھا، کہ یہاں اسلامی نظام رائج ہو اور ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ مودودی صاحب کی پہلے دن سے آج تک یہ کوشش رہی ہے کہ یہاں اسلامی نظام رائج نہ ہونے پائے اور اس کے لیے ہمارے پاس کھلے کھلے دلائل موجود ہیں۔ غور سے سنیئے۔

مودودی صاحب نے یہاں روزِ اوّل سے یہ کہنا شروع کیا۔ اور اب تک کہتے چلے آ رہے ہیں کہ اسلامی نظام کا مقصد یہ ہے کہ

۱. پبلک لاز تمام مسلمانوں کے لیے کتاب و سنت کے مطابق نافذ ہوں۔ اور
۲. پرائیویٹ (شخصی) قوانین کی حد تک، مختلف فرقوں کی کتاب و سنت کی تعبیر اپنی اپنی ہو۔ پہلے ہم پوچھتے ہیں کہ کتاب و سنت کی رُو سے وہ کون سا اسلامی نظام ہے جس میں پبلک لاز اور پرائیویٹ لاز کی اس طرح کی تفریق جائز ہو؟ کیا کتاب اللہ کی رُو سے یہ تفریق جائز ہے؟ یا کیا سنتِ رسول اللہ میں اس کا کہیں جواز آیا ہے؟ کتاب و سنت کی رو سے تو فرقوں کا وجود ہی غیر اسلامی ہے۔

اب آگے چلیئے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ کتاب و سنت کی رُو سے ایسے پبلک لاز مدوّن کیے جا سکیں گے جو مسلمانوں کے تمام فرقوں کے نزدیک اسلامی ہوں! (جیسا کہ طلوعِ اسلام کی سابقہ اشاعت میں لکھا جا چکا ہے) اب خود مودودی صاحب کو بھی اس کا اعتراف کرنا پڑا ہے کہ "کتاب و سنت کی کوئی ایسی تعبیر ممکن نہیں جو تمام فرقوں کے نزدیک متفق علیہ ہو۔" جب صورت یہ ہے تو کیا مودودی صاحب کے اصول کے

مطابق پاکستان میں کوئی ضابطہ قوانین نافذ کیا جا سکتا ہے جسے تمام فرقوں کے مسلمان اسلامی تسلیم کر لیں ؛ فرمائیے! پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام کے راستے میں کون روک بنکر کھڑا ہے ؟ مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ یہاں فقہ حنفی کو بطور ضابطۂ قوانین نافذ کر دیا جائے۔ کیا اس ضابطے کو تمام فرقے اسلامی تسلیم کر لیں گے ؟

لیکن ٹھہریئے! مودودی صاحب کا یہ کہنا کہ یہاں فقہ حنفی رائج کر دی جائے گی، اکثریت سے ووٹ حاصل کرنے کا حربہ ہے۔ ورنہ عملاً وہ اسے تسلیم ہی نہیں کرتے کہ تمام مسلمان ایک نظام کے تابع زندگی بسر کریں۔ وہ اپنی ۲۶ اگست والی تقریر میں لکھتے ہیں کہ :-

"لیکن ہر مسئلہ میں قرآن وسنت کے ارشادات واحکام کی لازماً صرف ایک ہی تعبیر نہیں ہو سکتی بلکہ مختلف تعبیریں ممکن ہیں اور عملاً کی بھی گئی ہیں جن کی بدولت مسلمانوں میں مختلف مکاتب فکر رکھنے والے گروہ پائے جاتے ہیں اب اگر ہم اپنے اندر یہ رواداری پیدا نہیں کریں گے کہ ہم میں سے جو گروہ جس تعبیر کو صحیح سمجھتا ہو اس پر خود عمل کرے اور دوسرے گروہ پر اپنی تعبیر کو زبردستی نہ ٹھونسے بلکہ اس کا بھی یہ حق تسلیم کرے کہ جو تعبیر اس کے نزدیک صحیح ہے اس پر وہ عمل کرتا رہے، تو ہمارے لیے مل کر کام کرنا اور پورے ملک میں قرآن وسنت کا قانون نافذ کر دینا کسی طرح ممکن نہ ہوگا۔"

یعنی یہ رواداری (کہ ہر فرقہ اپنی اپنی تعبیر کے مطابق عمل کرے اور دوسروں پر اپنی تعبیر زبردستی ٹھونسنے کی کوشش نہ کرے) جماعت اسلامی کے ساتھ مل کر اسلامی نظام کے قیام کی کوشش تک تو برقرار رہے گی لیکن جب اسلامی نظام قائم ہو جائے گا۔ تو پھر اس رواداری کو ختم کر دیا جائے گا۔ اس وقت مودودی صاحب کو اس کا حق حاصل ہوگا۔ کہ قرآن وسنت کی جس عملی تعبیر کو یہ صحیح سمجھتے ہیں اسے دوسروں پر زبردستی ٹھونس دیا جائے۔

یہ ہے وہ "اسلامی نظام" جس کی تنفیذ کے لیے مودودی صاحب کوشاں ہیں! کیا اس قسم کے نظام کا قیام ممکنات میں سے ہے ؟ جو شخص خالی الذہن ہو کر ان حقائق پر غور کرے گا اسے اس حقیقت کے سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی کہ مودودی صاحب

کی ساری زندگی تضادات کا مجموعہ ہے اور ان کی زیر نظر تقریر غلط بیانیوں کا مرقع، لیکن اس کا کیا علاج کہ چاندی اور سونے کی چمک نگاہوں کو اس قدر خیرہ کر دیتی ہے کہ ان لوگوں کو اس قدر کھلی ہوئی حقیقتیں بھی دکھائی نہیں دیتیں!

(طلوع ۱۰ نومبر ۱۹۶۷ء صفحہ ۱۱ تا ۱۶)

مودودی صاحب کی تضاد خیالیاں، غلط بیانیاں اور دروغ بافیاں اسقدر ہیں کہ انہیں بے شمار ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔ ان کی تحریرات اسقدر اسلام سوز اور یقین شکن ہیں کہ تھوڑی سی بھی سوجھ بوجھ رکھنے والا بے غرض، لالچ سے پاک شخص اُن کی ملمع سازی اور فریب کاری کو سمجھ کر ان کی نگارشات سے بیزار اور ان کے اسلام شناسی کے دعووں کو باطل قرار دینے کے لیے مجبور ہو جاتا ہے۔ رہے ان کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر تو ایمان شکن مصلحتیں دامن کشاں ہیں۔ کیا کیا جائے۔ وہ ان کی یا ان کے ذریعے پوری ہونے والی اغراض و مفاد کی زلفوں کے اسیر ہیں۔ رہیں ان کی پاکستانی قیادت کے متعلق افترا پردازیاں اور کذب طرازیاں تو ان کا شمار مشکل (مرتب)

مصلحتی مغالطہ

اسی طرز کا ایک اور مغالطہ یہ ہے کہ مودودی صاحب کو تو مسلم لیگ بلکہ خود قائداعظم نے علماء کرام کی اس کمیٹی کا رکن مقرر کیا تھا، جو پاکستان کے لیے ایک اسلامی آئین مرتب کرنے کی غرض سے نامزد کی گئی تھی" تحریکِ آزادی ہند اور مسلمان" کے مرتب مسٹر خورشید احمد نے لکھا ہے کہ :-

" مولانا مودودی صاحب نے اس کی رکنیت قبول کی اور کام میں پوری دلچسپی لی (ص ۲۸)

یہ کمیٹی کیا تھی؟ کس نے بنائی تھی؟ اور مودودی صاحب نے اس کے کام میں کس طرح پوری دل چسپی لی تھی۔ آئیے اس کی تفصیل مشہور مفسر قرآن حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی کی زبانی سنیے:-

---

لہ آپ دیکھتے ہیں کہ فرقوں کے وجود کو لفظی ایرپھیر سے کن پردوں میں چھپانے کی کوشش کی جارہی ہے۔

"جنوری ۱۹۵۶ء میں دارالمصنفین اعظم گڑھ (بھارت) نے مولانا محمد اسحاق صاحب سندیلوی استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کی ایک کتاب "اسلام کا سیاسی نظام" شائع کی جس پر پیش لفظ مولانا دریابادی مدظلہ کے قلم سے ہے۔ اسمیں وہ لکھتے ہیں :۔

"یہ کتاب جو آپ کے پیش نظر ہے، اپنی تسوید و تالیف کی ایک مختصر سی گو ذرا افسوسناک تاریخ بھی رکھتی ہے۔ سن غالباً ۱۹۴۲ء تھا، یا شاید اس سے بھی کچھ قبل جب مسلم لیگ کا طوطی ہندوستان میں بول رہا تھا۔ کہ ارباب لیگ کو خیال یہ پیدا ہوا کہ جس اسلامی حکومت (پاکستان) کے قیام کا مطالبہ شد ومد سے کیا جا رہا ہے خود اس کا نظام نامہ یا قانون اساسی بھی خالص اسلامی ہونا چاہیئے۔ اور اسی غرض سے یو پی کی صوبہ مسلم لیگ نے ایک چھوٹی سی مجلس ایسے ارکان کی مقرر کر دی۔ جو اس کے خیال میں شریعت کے ماہرین تھے کہ یہ مجلس ایسا نظام نامہ مرتب کر کے لیگ کے سامنے پیش کرے۔"

اس مجلس کے چھ ممبران میں سے ایک مولانا مودودی بھی تھے۔ اور مولانا دریابادی لکھتے ہیں کہ مسلم لیگ کی فراخ مشربی اسی سے واضح ہے کہ اس مجلس کے بیشتر ممبر لیگ کے ممبر نہ تھے۔ پھر کیا ہوا۔ مولانا فرماتے ہیں کہ مجلس کا تمہیدی اجلاس دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ہال میں ہوا اور مجلس کے داعی علامہ سلیمان ندوی قرار پائے اور طے پایا کہ مجوزہ کتاب کا ابتدائی مسودہ مولانا حکیم احمد اسحاق سندیلوی تیار کریں جس کی ایک ایک نقل ہر ممبر کے پاس بھیج دی جائے۔ اور پھر یہ ممبران ایک بار جمع ہو کر اس مسودہ کو آخری شکل دے دیں۔ مولانا اسحاق نے یہ کتاب چند مہینوں میں مرتب کر لی۔ اس کی ایک ایک نقل بھی ہر ممبر کو بھجوا دی گئی۔ مگر مولانا دریابادی کے الفاظ ہیں :۔

"سید صاحب پر ہجوم کار اتنا تھا کہ ممبران کے یکجا ہونے اور بحث و گفتگو ہونے کی منزل کبھی نہ آسکی۔"

گویا (ا)۔ یوپی مسلم لیگ نے ۱۹۴۲ء میں ایک کمیٹی قائم کی۔

(ب)۔ یہ کمیٹی کسی جماعتی غرض سے نہیں بلکہ ایک علمی کام کی غرض سے قائم ہوئی

(ج) اس کا اجلاس ایک ہی مرتبہ ہوا۔ مودودی صاحب اس "اکلوتے" اجلاس میں

شامل ہوئے کہ نہیں اسکی کوئی تصریح نہیں ملتی۔

اور یہ ہے وہ کارنامہ جس کے بارے میں جماعت کا دعویٰ یہ ہے کہ "مودودی صاحب نے کام میں پوری دلچسپی لی۔

چلئے مان لیتے ہیں کہ یہ خاکہ مرتب کرنے میں مودودی صاحب کا بھی بڑا عمل دخل تھا۔ مگر ہم یہ پوچھتے ہیں کہ اس خاکہ میں پاکستان کے لیے جو نظام حکومت تجویز کیا گیا ہے مودودی صاحب آج اسے اپنانے کا اعلان کیوں نہیں فرماتے ؟

مولانا سندیلوی کی یہ کتاب مولانا دریابادی کے لفظوں میں وہی خاکہ ہے جو سید صاحب کی وفات کے بعد مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی نے ان کے کاغذات کے انبار سے ڈھونڈ نکالا ہے۔ اور اب جب کہ اسے لیگ کے سپرد کرنے کا سوال ہی باقی نہیں رہ گیا سوا اس کے کہ اسے پریس کو دے دیا جائے اور کوئی حل خیال میں نہیں آتا۔ ہندوستان کے نہیں دنیا کے جس گوشہ کے بھی مسلمان اس سے جتنا فائدہ اٹھانا چاہیں اٹھا سکتے ہیں۔"

اب ذرا پاکستان کے اس نظامِ حکومت کی ایک جھلک بھی ملاحظہ ہو جس کے بارے میں مسٹر خورشید کا کہنا ہے کہ اسکی ترتیب میں مودودی صاحب نے بڑی دلچسپی لی تھی۔

قانون ساز اسمبلی کے موضوع پر فرمایا گیا ہے کہ :۔

"مندرجہ بالا امور کی روشنی میں ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ارکانِ مجلس کا انتخاب تو جائز ہے اور مجموعی طور پر عام مسلمانوں کو حق رائے دہی بھی حاصل ہے۔ لیکن یہ حق ہر کہہ و مہ کو حاصل نہیں۔ بلکہ اس کے لیے کچھ امتیازی صفات و شرائط کی احتیاج ہے جو مسلمان ان شرائط کو پورا کریگا اسے حق رائے دہی حاصل ہوگا اور جو اس امتیاز سے محروم ہوگا۔ وہ حق رائے دہی سے بھی محروم ہوگا۔ (صفحہ ۲۰۵ و ۲۰۶)

"اور اس کے لیے اسلام شرطِ اولین ہے۔ اسلام سے مراد وہی اسلام ہے، جو صحابہ کرام کا تھا۔ اور آج سوادِ اعظم کے نزدیک حقیقی اسلام وہی ہے۔ غیر مسلموں اور گمراہ فرقوں کو حق رائے دہی کے یہ معنی ہیں کہ مآل کار کے لحاظ سے انہیں اہل اسلام پر ایک قسم کا تسلط ہو جائے"

" عدل بھی ایک اہم اور ضروری شرط ہے۔ فاسق کی خبر شرعاً غیر معتبر ہے۔ اس کا یہ دور رس سیاسی اقدام کیسے معتبر ہو سکتا ہے ؟

"عورتوں کے حق میں رائے دہی کا ثبوت دلائلِ شرعیہ میں سے کسی دلیل سے بھی نہیں ملتا اس کے خلاف دلائل ذکر کرنے کی بھی ہمیں ضرورت نہیں۔"

ان حوالوں کے لیے ملاحظہ ہو ("اسلام کا سیاسی نظام") صہ ۲۰۶ و ۲۰۷)

اس خاکہ میں غیر مبہم لفظوں میں بالغ رائے دہی کو غیر اسلامی قرار دیا گیا ہے، غیر مسلموں اور گمراہ فرقوں (یعنی ؟) کو ووٹ کا حق نہیں دیا گیا۔ یہ حق صرف سوادِ اعظم کے لیے مخصوص ہے۔ صاف صاف کہا گیا ہے کہ ووٹ صرف صالح افراد دے سکیں گے۔ فاسق مسلمان نہیں، عورت کے تو ووٹ دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اگر مولانا مودودی صاحب اس خاکہ کی تیاری کا کریڈٹ لینا چاہتے ہیں تو شوق سے لیں ہم اس میں آڑے آنے والے کون ہیں۔ ہاں اُن سے اتنا ضرور پوچھنے کو جی چاہتا ہے کہ حضرت! جب ایک زمانہ میں آپ کا "اسلام" یہ کہتا تھا تو آج کس مُنہ سے آپ جمہوریت بالغ رائے دہی، "مسلمہ اسلامی فرقوں" کے حقوق کی نگہداشت، غیر مسلموں کے لیے سیٹوں کے تعین اور عورتوں کے حقوق کی حفاظت کے نعرے لگا رہے ہیں۔ کیا اسلام بھی موم کی کوئی ناک ہے کہ اس کو جدھر چاہا موڑ لیا۔؟"

" مودودیت عوامی عدالت میں" (صفحہ ۱۰۰ تا ۱۰۵)

جناب کوثر نیازی! آپ خواہ مخواہ اپنے سابق امیر و امام سے ناراض و برہم ہو رہے ہیں اور فرما رہے ہیں کہ اسلام بھی کوئی موم کی ناک ہے کہ جدھر چاہا موڑ لیا۔ جناب والا! گراں نہ گزرے تو عرض کروں کہ جناب مودودی کا صالحانہ اور مقدسانہ اسلام آپ کے دورِ خلوت گزینی اور جلوت آفرینی میں بھی ایسا ہی تھا۔ اسوقت آپ کو اُن کی خدمت اسلام کی یہ خوبیاں اور صلاحیتیں اسوجہ سے نظر نہیں آ رہی تھیں کہ چشم دل بیدار نہ تھی۔ اور ایک باطلانہ خمار تھا جس میں آپ مخمور تھے۔ ہمارے نزدیک جس خاکہ اسلامی کی ترتیب و تدوین میں ایک بھی نیشنلسٹ مولوی شریک تھا، قرآن عزیز اور اسوۂ محمد الرسول اللہ والذین معہ کی روشنی میں وہ خاکہ اسلامی ہو ہی نہیں سکتا۔ رہے مسٹر خورشید، تو مودودی کی آستین میں ایسے ہی خورشید ہوں گے، جو ایسی ہی روشنی پھیلائیں

گئے۔ آپ دیکھ نہیں رہے ہے کہ حق شعاری اور صداقت کس طرح ضو فشاں ہے
اور تاریخی صداقتوں کی شعاعیں کیسا نور بکھیر رہی ہیں یہ ہے وہ خورشید جن سے
عالم بقعہ نور ہوتا ہے، تو عرض ہے کہ ؎

جن کے ہوتے ہیں خورشید آستینوں میں
انہیں کہیں سے بلاؤ بڑا اندھیرا ہے (مرتب)

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور دو قومی نظریہ

جماعت اسلامی سے متعلق حضرات بڑے فخر سے دعویٰ کرتے ہیں کہ دو قومی نظریہ سب سے پہلے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے پیش کیا تھا۔ یہ تو خیر ان حضرات کی تعلّی ہے کہ اس نظریہ کو مودودی صاحب نے سب سے پہلے پیش کیا تھا۔ یہ نظریہ کہ ع خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی — اقبال رحؒ کے اس بانگِ درا میں موجود ہے۔ جو اس زمانے میں چھپ کر شائع ہوا تھا۔ جب مودودی صاحب ہنوز کانگریسی اخبارات کے حلقۂ ادارت میں کام کیا کرتے تھے۔ لیکن یہ واقعہ ہے، کہ مودودی صاحب نے اپنے قیام حیدرآباد کے دوران متحدہ قومیت کے خلاف اور دو قومی نظریہ کے حق میں مضامین لکھے تھے اور یہی مضامین ان کی مقبولیت کا باعث اور اُن کے دارالسلام (پٹھانکوٹ) آنے کا موجب بنے تھے۔ لیکن اب کیفیت یہ ہے کہ یہی مودودی صاحب ۱۹۵۶ء کے اس دستور کو اسلامی قرار دے رہے ہیں اور اُسے نافذ کرنے کا مطالبہ کر رہے ہیں جو متحدہ قومیت کا علمبردار ہے حتیٰ کہ انہوں نے ۱۹۶۳ء میں انتخابات کے سلسلہ میں) یہاں تک بھی کہہ دیا تھا کہ

"اگر کنونشن مسلم لیگ کسی فرشتے کو بھی امیدوار کھڑا کرے گی تو جماعت اس کی حمایت نہیں کریگی۔ کیونکہ ہمیں اس کے اصولوں سے اختلاف ہے، اس کے برعکس، اگر ایک ہندو جمہوریت کی حمایت کرتا ہے تو اُسے میری تائید حاصل ہوگی۔ اس لیے کہ اس نے یہ اصول تسلیم کر لیا ہے کہ ملک کا نظام اکثریت کے نظریہ کے مطابق ہونا چاہیئے (امروز ۶/۹۳ ۲)

یہ وہی جمہوریت" ہے جسے مودودی صاحب" مسلمانوں کی کافرانہ حکومت کہکر پکارا کرتے تھے۔ (ترجمان القرآن محرم ۱۳۶۰ھ) ط۔ اجوری ۱۹۷۰ء ص ۲۳،۲۴)

بھلا جناب مودودی اس ہندو کی کیوں نہ تائید کریں، پہلے قیام پاکستان کی تحریک کے زمانہ میں مسلمانوں کی اکثریت تو ایک "کافرانہ حکومت" ۔۔۔۔ اور "ناپاکستان" قائم کر رہی تھی۔ اب جناب مولانا اس ہندو کی تائیدی جمہوریت سے اسلامی نظام قائم کریں گے۔ اب اس دودھ سے نکلا ہوا مکھن بھی دھ دھ سے زیادہ زہریلا نہیں ہوگا۔ مولانا کے اسلامی تفکر و تفحص کے کیا کہنے "اسلامی سوشلزم" غیر اسلامی اور "اسلامی جمہوریت" عین اسلام کے مطابق۔ جب یہ لوگ مودودی صاحب کو مفکر اسلام کہتے ہیں، میں سوچا کرتا ہوں کہ پھر بھی لوگ حضرت حکیم الامت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کو کیوں مفکر اسلام کا خطاب دیتے ہیں؟ کہاں جناب مودودی کا فکر بلند اور کہاں بیچارے اقبال ؒ ۔۔۔۔ جن کی فکر کا سر چشمہ قرآن ہے جو اسی کی روشنی میں ہر بات کا وزن کرتے ہیں اور ان تیزیٔ ادراک بھی اس شمع نورانی سے فروزاں ہے، پھر نہ ہی ان کا قلم مودودی کی طرح آوارہ اور حدود فراموش، انصاف کا تقاضا ہے کہ دونوں میں سے ایک ہی کو مفکر اسلام کہنا موزوں ہے۔ (مرتب)

ہم نے پاکستان کی قدر نہ جانی!

عنوان بالا سے جناب زیڈ اے سلیری جمعرات ۹ دسمبر ۱۹۷۶ء کے نوائے وقت میں رقمطراز ہیں:
"ایک قوم کی تاریخ اسکی شخصیت کا پرتو ہوتی ہے اگر تاریخ مسخ ہو جائے تو اس قوم کی شکل بھی بگڑ جاتی ہے۔ اس لیے قوموں میں جنگ وجدل کے علاوہ تاریخ کا میدان مبارزت بھی کھلا ہوتا ہے جس میں ایک دوسرے کا خاکہ اڑایا جاتا ہے۔ یورپی مصنفین نے اسلام کی تاریخ کا خاکہ اڑانے میں ید طولیٰ حاصل کیا۔ لیکن میرے خیال میں انہیں جو موقع ہم نے پاکستان کا حلیہ بگاڑنے کے لئے دیا ہے، وہ شاید ہی کسی قوم نے اپنے دشمنوں کے ہاتھ میں دیا ہوگا۔ اب قائد اعظم ؒ کے متعلق جو کچھ معلومات ہمارے نوجوانوں کو مل رہی ہیں وہ اغیار کی کتابوں سے ملتی ہیں۔ ہماری قومی زندگی میں قائد اعظم ؒ کے غیاب سے جو تہی دامنی پیدا ہوئی ہے وہ ہمارے سروں کو فخر

سے اونچا اٹھنے نہیں دیتی۔ ورنہ جس قوم میں قائدؒ جیسا لیڈر پیدا ہوا ہو وہ فخر و مباہات کے جذبات سے بے بہرہ ہوتی، دراصل لیڈر ہی قوم کے مرتبے کو متعین کرتے ہیں قائدِ اعظم سے بے اعتنائی برت کر۔ اور اس میں حکمران اور عوام دونوں شامل ہیں ہم ان کی تاریخی و عالمی عظمت کو تو کم نہیں کر سکتے، کہ وہ چاند اور سورج کی طرح عیاں ہے لیکن ہم نے اپنے اور ملک کے مرتبے کو ضرور گھٹا دیا ہے۔ اگر قائدؒ کا صحیح نقش ہمارے دل پر کندہ ہوتا، تو ہم اپنے اندر پاکستان کے اقدار سے وہی وابستگی پیدا کرتے جو ان کے کردار کا خاصا تھی۔ اگر انہوں نے مسلم قومیت کے نظریے پر انگریزوں اور ہندوؤں سے کسی قسم کی مفاہمت نہ کی، تو وہ ان بنگالیوں سے بھی نہ دبے جو اردو کی قومی حیثیت کو نزاعی بنانا چاہتے تھے۔ محب الوطنی کے اس ماحول میں کسی پاکستان مخالف جماعت کو سر اٹھانے کی جرأت نہ ہوتی۔ اور کسی ولی خاں کو یہ کہنے کی جسارت نہ ہوتی کہ "ہم نہ کہتے تھے کہ یہ ملک نہ چل سکے گا۔"

دوسرا اقتباس "ملک کی اہمیت کو کم کرنے میں اگر مسلم لیگی اور غیر مسلم لیگی حکومتوں نے کام کیا تو جماعتِ اسلامی نے بھی اس ضمن میں اہم کردار ادا کیا۔ پاکستان بنتے ہی اس نے نظامِ اسلام کا پُرزور مطالبہ کر دیا۔ اب یہ مطالبہ بجائے خویش غلط نہ تھا۔ لیکن جماعت کے حوالے سے اسکی خصوصی نوعیت ہو گئی تھی۔ جماعت نے نظامِ اسلام کے نفاذ کو ہی برِصغیر میں پیشِ نظر رکھا تھا۔ لیکن انہوں نے کسی آزاد اور مسلم مملکت کی ضرورت محسوس نہ کی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ ان کے معنوں میں نظامِ اسلام متحدہ ہندوستان میں ہی قائم ہو سکتا تھا۔ خواہ اس کا حکمران انگریز ہو یا ہندو۔ مولانا مودودی مسلمانوں کے ہندوؤں سے الگ تشخص کے ضرور قائل تھے لیکن ان کے لیے بھی کسی قومی مملکت کی ضرورت محسوس نہ کرتے تھے۔ اس لئے انہوں نے نہ خود کسی آزاد مملکت کا مطالبہ کیا اور نہ تحریکِ پاکستان سے کوئی دلچسپی ظاہر کی۔ لیکن پاکستان میں انہوں نے نظامِ اسلام کے نافذ کرنے میں بہت جارحانہ اندازِ عمل اختیار کیا۔ اور براہ راست مسلم لیگ سے مڈبھیڑ کی۔ اور اپنے اس ادعا کو ثابت کرنے پر تُلے کہ اس کے لیڈر نظامِ اسلام نافذ کرنے کے اہل نہیں ہیں یہ اندازِ عمل اس موقف سے بالکل مختلف تھا جو جماعت نے متحدہ ہندوستان میں اختیار کیا تھا، اور جو مبلغانہ اور صلح جویانہ تھا............ کچھ اسی قسم کی چال غفار خاں نے سرحد میں استصواب رائے کے خلاف اختیار کی تھی۔ انہوں نے کہا کہ وہ

پختونستان میں قرآنی حکومت قائم کریں گے۔ کہاں غفار خاں اکھنڈ بھارت اور متحدہ قومیت کے علمبردار تھے۔ اور کہاں وہ پٹھان قومیت اور قرآنی حکومت کے داعی بن گئے مقصد مسلم لیگ کی مخالفت اور پاکستان کی تخریب تھا۔ اب جماعت مسلم لیگ کو گرانے میں تو کامیاب ہو گئی۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ پاکستان کی اہمیت کو کم کرنے میں بھی کامیاب ہوئی۔ جماعت نے پاکستان بنانے کے لیے مسلم لیگ کی خدمات کو کبھی نہیں سراہا۔ جب بھی اس کا ذکر کیا طعن و تشنیع سے کیا۔ اس سے یہ نتیجہ بھی ناگزیر ہو گیا کہ پاکستان کا بننا بہت معمولی واقعہ قرار پایا۔ پاکستان کے بنانے کے لیے کوئی تحسین و تعریف کا مستحق نہ تھا خواہ وہ قائد ہو یا مسلم لیگ۔

ہمارے نزدیک نیشنلسٹ علماء ہوں یا جماعت اسلامی۔ ان کا "برہمو سماجی" اور "مودودی اسلام" قائدین تحریک پاکستان کے خلاف ہی فریب کار رہا ہے۔ گاندھی بھی انہیں میں سے ایک ہیں۔ یہی مقدس حربہ غفار خاں نے بھی استعمال کیا۔ افسوس تو ان لوگوں پر ہے جو اعتراف جرم و خطا کے باوجود اُن کی مقبولیت و شہرت اور عزت و عظمت کا باعث بن رہے ہیں جو مجرمان ملت اور غداران اسلام بنوی ہیں اور آج اُن کے خلاف ستیزہ کار اور صف آراء نہیں ہیں۔

(چوہدری حبیب احمد)

رُوس کو سرزنش

اور امریکہ والوں کو تنبیہہ

تقریر لاہور ۱۸ دسمبر

"اس سلسلے میں دوسری بات یہ ہے کہ خود اینگلو امریکی بلاک کو بھی سوچنا چاہیئے کہ اگر وہ صرف مسلمان حکمرانوں سے معاملہ کرنا چاہتا ہے اور مسلمان قوم کے ساتھ کوئی معاملہ نہیں کرنا ہے تو الگ بات ہے۔ لیکن اگر اس کی خواہش یہ ہے کہ مسلمان ممالک کے عوام بھی اس کے ساتھ تعاون کریں تو اس معاملہ میں ہمیں وضاحت کے ساتھ یہ بتا دینا چاہیئے کہ مسلمان ملکوں کے ساتھ آپ کی جو پالیسی اب تک چل رہی ہے وہ ایسی ہرگز نہیں کہ پاکستان اور دوسرے ممالک کے عوام کا دلی تعاون آپ کو حاصل ہو سکے۔"

(اخبار تسنیم ۲۰ دسمبر ۱۹۵۵ء)

تقریر کراچی

" اگر یہ بلاک فی الواقعہ یہ چاہتا ہے کہ کمیونزم کی روک تھام کے لیے اسے مسلم عوام کا دلی تعاون حاصل ہو تو اسے اپنی بنیادی پالیسی میں بنیادی تغیر کرنا پڑے گا۔ اسے یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ اسے مسلم ممالک کے حکمرانوں سے ساز باز کرنا ہے یا مسلم ممالک کے عوام کا تعاون حاصل کرنا ہے۔ یہ اُس کے سوچنے کا کام ہے کہ اسے کون سی راہ اختیار کرنی چاہیئے۔ اسے ان حکمرانوں کی ضرورت ہے جو عوام پر سطحی اثر بھی نہیں رکھتے یا عوام کے تعاون کی ضرورت ہے جو طاقت کا اصلی سرچشمہ ہوتے ہیں۔ پچھلی جنگ عظیم نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ حکومت خواہ کتنی ہی مضبوط کیوں نہ ہو پوری طاقت نہیں لگا سکتی جب تک مُلک کے باشندے اس جنگ کو اپنی جنگ نہ سمجھیں۔ اگر معاملہ برعکس ہوتا ہے تو ملک کے باشندے جابر حکمرانوں کے چنگل سے نکلنے کے لیے اس موقع سے پورا فائدہ اٹھاتے ہیں۔" (تسنیم ۱۶۔ دسمبر ۱۹۵۵ء)

قرائن بتا رہے ہیں کہ یہ تقریر دلپذیر قلب امریکہ پر گہرے طور پر اثر انداز ہوئی۔ اتنا تو دنیا نے ضرور دیکھا کہ امریکا والوں نے مودودی صاحب کو امپیریل ازم کے حمایتی کے طور پر نمبر ایک تسلیم کر لیا ہے۔ رابطہ اسلامی دریعے کیا کیا کچھ نہیں ہو رہا۔ چشم بینا یہ نظارہ مدتوں سے دیکھ رہی ہے۔ وہ اسلام جو غریبوں کا ملجیٰ اور کمزوروں اور ناتوانوں کا سہارا تھا، اسے کس طرح دم توڑتی سرمایہ داری کا سہارا، اور امپیریلزم کی کمزوری و ناتوانی کے لیے بیساکھی بنا دیا گیا ہے۔ (مرتب)

تحریک پاکستان اور جماعت اسلامی
مولانا مودودی کی تضاد بیانیاں اور خلاف حقیقت قلمی جولانیاں،

ایڈیٹر نوائے وقت نے مولانا مودودی سے ایک مکتوب میں گزارش کی تھی کہ وہ

"قائدِ اعظمؒ اور ہیں" اور "تحریکِ پاکستان اور جماعتِ اسلامی" میں سے کسی ایک عنوان پر اپنے خیالات کا اظہار کریں۔ اگرچہ مولانا اپنی تمام قوتیں سیرتِ پاک کی تکمیل کے لیے اپنی بیماری کے باوجود صرف کر رہے ہیں تاہم انہوں نے دوسری مصروفیتوں سے بچنے کے باوجود دونوں عنوانات پر لکھا۔

مولانا تحریر فرماتے ہیں :-

"میرے دل میں جن لیڈروں کا احترام سب سے زیادہ تھا، اُن میں سے ایک قائدِ اعظم مرحوم بھی تھے میں نے ہمیشہ ان کو ایک با اصول، راست باز اور مضبوط سیرت و کردار کا مالک انسان سمجھا اور ۱۹۲۰ء سے ۱۹۴۸ء تک کبھی میرے دل میں ان کے متعلق بدگمانی پیدا نہیں ہوئی کہ وہ اپنے ضمیر کے خلاف بھی کوئی بات کہہ سکتے ہیں۔ قائدِ اعظم مرحوم کے متعلق مجھے کبھی یہ شبہ نہیں ہوا کہ وہ پاکستان کو اسلامی ریاست بنانے کے معاملے میں مخلص نہ تھے۔"

مولانا کی محولہ بالا تحریر بعید از حقیقت ہے اس میں نہایت زیرکی اور ہشیاری سے تاریخی حقائق کے برعکس کہا گیا ہے۔ لہٰذا ہم بھی "دلیل اور شائستگی" سے صحیح اور غلط، درست و نادرست کو الگ الگ کر کے نسلِ نو کو اس طلسم آمیز اور سحر خیز پروپیگنڈے سے باخبر کرنا اپنا ملی فرض سمجھتے ہیں ہم اپنے دعوے کے ثبوت میں انہی کی تحریرات کو لائیں گے تاکہ یہ تاثر نہ دیا جا سکے کہ یہ مخالفت برائے مخالفت ہے اور کچھ نہیں۔ قارئینِ کرام! آپ دیکھ چکے ہیں کہ مولانا رقمطراز ہیں کہ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۴۸ء تک میں قائدِ اعظمؒ سے کبھی بدگمان نہیں ہوا۔ اور مجھے کبھی یہ شبہ بھی نہیں ہوا کہ وہ پاکستان کو اسلامی ریاست بنانے کے معاملے میں مخلص نہ تھے۔ اب آئینہ تحریر دیکھئے مولانا مودودی بقلم خود لکھتے ہیں۔

" افسوس کہ لیگ کے قائدِ اعظم سے لیکر چھوٹے مقتدیوں تک ایک بھی ایسا نہیں جو اسلامی ذہنیت اور اسلامی طرزِ فکر رکھتا ہو اور معاملات کو اسلامی نقطۂ نظر سے پرکھتا ہو۔ . . . . . . ان کے خیالات، نظریات اور طرزِ سیاست اور رنگِ قیادت میں خوردبین لگا کر بھی اسلامیت

کی کوئی حیثیت نہیں دیکھی جا سکتی۔ (ترجمان القرآن ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ صفحہ ۳۳)

مسلمانوں کی کافرانہ حکومت

مولانا مودودی گوہر فشاں ہیں:-

"جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ اگر مسلم اکثریت کے علاقے ہندو اکثریت کے تسلط سے آزاد ہو جائیں اور یہاں جمہوری نظام قائم ہو جائے تو اس طرح حکومت الٰہی قائم ہو جائے گی۔ ان کا گمان غلط ہے۔ در اصل اس کے نتیجہ میں جو کچھ حاصل ہو گا، وہ مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہو گی۔" (ترجمان القرآن محرم ۱۳۶۰ھ صفحہ ۲۹)

لادینی حکومت کا شوشہ

"جنت الحمقا میں رہنے والے لوگ اپنے خوابوں میں خواہ کتنے ہی سبز باغ دیکھ رہے ہوں لیکن آزاد پاکستان (اگر فی الواقع وہ بنا بھی تو) لازماً جمہوری لادینی اسٹیٹ کے نظریہ پر بنے گا جس میں غیر مسلم اسی طرح برابر کے شریک ہوں گے جس طرح مسلمان اور پاکستان میں ان کی تعداد اتنی کم اور ان کی نمائندگی کی طاقت اتنی کمزور نہ ہو گی کہ شریعت اسلامی کو حکومت کا قانون اور قرآن کو اس جمہوری نظام کا دستور بنایا جا سکے"

(ترجمان القرآن فروری ۱۹۴۶ء)

قیام پاکستان کے بعد پہلا ترجمان

"یہ بحث سب لوگوں کا منہ کالا کر دینے والی ہے جنہوں نے ربع صدی میں ہماری سیاسی تحریکوں کی قیادت فرمائی ہے۔" صفحہ ۴

• اس پورے گروہ میں سے ایک وہ کن بھی نہ نکلا جو بازی کھو دینے کے بعد سر دے سکتا۔ ساری جماعت بازی گروں سے بڑھ چڑھ گئی جنہوں نے عجیب عجیب قلابازیاں کھا کر اپنی بودی سیرت اور کھوکھلے اخلاق کا تماشا دکھایا اور اس قوم کی رہی سہی عزت بھی خاک میں ملا دی۔" (صفحہ ۴)

ہم جناب سید ابو الاعلیٰ مودودی سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ وہ کون تھا، جس کی تحریرات کے مندرجہ بالا اقتباسات ہیں؟ پھر جب آپ اس معاملہ میں

بدگمان نہیں تھے کہ قائداعظمؒ پاکستان کو اسلامی ریاست بنانا نہیں چاہتے تھے تو آپ کے نوکِ قلم سے ایسی ولولہ انگیز اور اعتماد شکن خامہ فرسائی صاف ظاہر نہیں کرتی کہ آپ اپنے دعاوی میں سچے نہیں۔ اور آپ محض یہ کہکر نہیں بچ سکتے کہ "زیادہ سے زیادہ اگر کچھ کہا جاسکتا ہے تو وہ بس یہ کہ ہم نے تحریکِ پاکستان میں حصہ نہیں لیا تھا۔ ہمارے پاس ان کی تضاد بیانیوں اور خلافِ حقیقت قلمی جولانیوں کا اسقدر ذخیرہ ہے کہ اگر تمام درخت قلمیں اور تمام سمندر سیاہی بن جائیں اور اللہ تعالیٰ عمرِ خضر عطا فرما دیں تو پھر بھی اس ضحوکہ نگاری کے متعلق پورا نہ لکھ سکیں۔ مولانا سچ سچ کہیے مصلحتی جھوٹ کا سہارا نہ لیجئے کہ تحریکِ آزادی ہند اور مسلمان حصہ اول کے نام سے کئی ایک پہلی تحریرات کو حذف کر کے ابھرنے والی نسل کو مقدس فریب نہیں دیا جارہا؟ جن کے پاس پرانے ایڈیشن ہیں اور وہ آپ کے ایجنٹوں سے ہوشیار اور خبردار بھی ہیں وہ تو جانتے ہیں کہ تاریخ کی زندہ شہادتیں اور انمٹ صداقتیں کیا ہیں۔ پھر آپ کی ۱۴ اگست کی تحریر میں یہ کھلا تضاد موجود ہے۔ ایک طرف تو آپ "علیٰ وجہ البصیرت" یہ محسوس کر رہے تھے کہ جس تحریک کی قیادت حضرت قائداعظم فرما رہے تھے اس کے نتیجے میں قومی ریاست تو بن سکتی ہے اسلامی ریاست بنانے کے معاملے میں مخلص نہ تھے۔ ان کے پسماندگان میں لیاقت علی (قائدِ ملت) نے بھی یہی عزم وارادہ کا اظہار کیا تھا۔ ان کے رفقاء میں سے مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور جناب پیر سید جماعت علی شاہ صاحبؒ ایسے بزرگ اور بے شمار دردمند ہمسفر و ہمقدم تھے۔ ہم خوفِ تنگیٔ داماں کی وجہ سے سمیٹنا چاہتے ہیں۔ ورنہ ؏

مجھ سے کچھ پنہاں نہیں اسلامیوں کا سوز و ساز (اقبالؒ)

کریں کیا جو کل نوائے وقت کے لیے سراپا ناز تھے۔ نیرنگیٔ زمانہ یہ ہے کہ وہ آج مجبورِ نیاز ہیں۔ وہ مے سرکش اقبالی جسکی حرارت سے مینائے

ملّت گداز ہوا کرتی تھی۔ وہ حالات کے تقاضوں کی وجہ سے اب عام نہیں کی جا سکتی۔ ہمیں یقین تو ہے کہ جوانانِ ملّت کی آنکھیں آج نہیں تو کل ضرور کھل جائیں گی، وہ آپ کی ________ شخصیت و حیثیت اور عادت و ذہنیت کو بے نقاب دیکھیں گے۔ آپ نے اپنی کارکردگی اور خدمت اسلام کا بلند بانگ دعویٰ کیا ہے کہ جماعت اسلامی پاکستان، ۲۔ جماعت اسلامی ہند۔ ۳۔ جماعت اسلامی مقبوضہ کشمیر ان تینوں جماعتوں کو تینوں حکومتوں نے

ڈرا دھمکا کر منانے کی کوشش کی لیکن یہ اپنے محاذ پر ڈٹے رہے۔ اس موضوع پر ابھی ہم کچھ لکھنا مناسب نہیں سمجھتے۔ عصرِ حاضر کے مورّخ کی آنکھ آپ کی خدمات کو بھی سامنے لے آئیگی۔ آپ نے اپنے تحفظ کے لیے آخر میں لکھا ہے کہ علماء کے مختلف گروہ اور کمیونسٹ اور قادیانی اور منکر حدیث پوری قوت سے اُن کے مددگار بنے رہے۔" اس مقام پر ہم یہ ثابت کرنا ضروری نہیں سمجھتے کہ قابلِ شمار علماء کرام نے جناب کو بھی منکرِ حدیث لکھا ہے صرف ایک سادہ سا سوال کرنا چاہتے ہیں کہ آپ کے نزدیک محترم حمید نظامی مرحوم و معفور علماء کے کس گروہ میں سے تھے۔ کمیونسٹ، یا قادیانی یا منکرِ حدیث؟ اُن کی ایک تحریر درج مضمون کرنے کی اجازت فرمایئے۔ یہ تو آپ بخوبی جانتے ہیں کہ مرحوم و معفور "ملّت کے ترجمان" تھے۔ یہ یاد رہے کہ اس زمانہ میں جناب نظامی نوائے پاکستان شائع کر رہے تھے۔ اسے غالباً دولتانہ حکومت نے بند کر رکھا تھا۔

یہ مخالفت نہیں تو اور کیا ہے؟

عنوانِ بالا سے جناب حمید نظامی ادارتی مقالہ میں لکھتے ہیں۔

"مولوی مودودی صاحب نے اب ایک یونٹ کے منصوبہ کی بھی مخالفت شروع کر دی ہے اور اس پر مولوی صاحب کی طرف سے ایک بیان جاری کیا گیا جو حرف بحرف درج ذیل ہے۔

"بعض اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ میں نے حیدرآباد میں وحدتِ مغربی پاکستان کی مخالفت کی ہے۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس خبر میں میرے خیالات کی غلط ترجمانی کی گئی ہے میں نے آجتک اس کے خلاف نہ کوئی اظہار رائے کیا ہے نہ اسکی موافقت ہی کی ہے درحصل جو بات میں نے حیدرآباد میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہی تھی وہ یہ تھی کہ ایک یونٹ یا دس یونٹ کا مسئلہ کوئی حقیقی اہمیت نہیں رکھتا حقیقی اہمیت جس چیز کی ہے وہ یہ ہے کہ یہاں ایک صحیح اسلامی نظام قائم کر کے مسلمانوں کے رشتۂ اخوت کو مضبوط کر دیں اور ہر باشندۂ پاکستان کو یہ اطمینان دلا دیں کہ از روئے انصاف اس کے جملہ حقوق محفوظ ہیں یہ بات اگر حاصل ہو گئی تو ایک یونٹ بھی مفید ہو گا اور دس یونٹ بھی رہیں تو نقصان دہ ثابت نہ ہو سکیں گے۔ ورنہ مصنوعی طور پر وحدت پیدا کرنے کی کوششوں کا اچھا نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا

جناب حمید نظامی فرماتے ہیں

ہم حیران ہیں اگر یہ وحدتِ مغربی پاکستان کی مخالفت نہیں تو مخالفت کسے کہتے ہیں؟ مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ اول تو یہ مسئلہ کوئی حقیقی اہمیت ہی نہیں رکھتا مولوی صاحب کا حد سے بڑھا ہوا تکبر انا اور نفس پرستی ہی ایسی بات ان کے منہ سے نکلوا سکتے ہیں ورنہ معمولی عقل کا آدمی بھی یہ جانتا ہے کہ کم از کم اس وقت ملک بالخصوص مغربی پاکستان کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ ہی یہ ہے مگر مولوی صاحب فرماتے ہیں کہ اس مسئلہ کی تو کوئی حقیقی اہمیت ہی نہیں ہے حقیقی اہمیت غالباً قربانی کی کھالوں کے مسئلہ کو حاصل تھی جو اس کے لیے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا بھی ضروری سمجھا گیا۔ پھر یہ ارشاد ہوتا ہے کہ ایک یونٹ اور دس یونٹ میں کوئی فرق نہیں ایک یونٹ بن گیا تو کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچے گا۔ اور دس یونٹ بن گئے تو کوئی خاص نقصان نہیں ہو گا۔ یعنی ایک طرف یہ کہ صحیح اسلامی نظام...... دوسری طرف یہ کہ ایک یونٹ سے کوئی اور فائدہ نہ سہی۔ اسلامی نظام کے نظریہ کو تقویت حاصل اور سندھی پٹھان، بلوچی، بہاولپوری، خیرپوری اور قبائلی دس قومیتوں کو مان کر ان کی بنیاد پر دس یونٹ بنا دیے جائیں تو (کوئی اور نقصان نہ سہی) اسلامی نظام کے نظریہ کو بھی کوئی نقصان نہ پہنچے گا۔ ایک ہی سانس میں دو باتیں کوئی ایسا شخص ہی کہہ سکتا ہے جو یا تو پرلے درجے کا احمق

ہو یا حسن بن صباح یا راسپوٹین کی طرح عیّار۔ آخری فقرہ میں یہ فرمایا گیا ہے کہ "ورنہ مصنوعی طور پر وحدت پیدا کرنے کی کوششوں کا نتیجہ اچھا نہ ہوگا۔ اس پر یہ بھی ارشاد ہے کہ یعنی آج تک وحدت کے خلاف اظہار کرتے نہیں کیا۔ افسوس کہ پاکستان کو تیس برس گزر گئے مودودی صاحب نے ابھی تک مسلمان عوام کا یہ قصور معاف نہیں کیا کہ انہوں نے مودودی صاحب کی بجائے قائد اعظم کی بات کیوں مانی اور پاکستان کیوں بنایا۔"

(نوائے وقت لاہور، لائلپور ۲ ستمبر ۱۹۵۵ء صـ۳)

ہم نے اس قدر طویل اداریہ رجس کا حسب مدعا حصہ نقل کیا گیا اور باقی چھوڑ دیا محض اس لیے نذرِ قارئین کیا ہے کہ یہ انداز تردید اختیار نہ فرمایا جائے کہ "سیاق و سباق توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ہے۔ یہاں حقیقی پاکستانی نظامی مرحوم نے جن خطابات سے جناب مودودی کو نوازا ہے قارئین دلنشیں فرمالیں۔

چوہدری حبیب احمد

متکبر صالح

دوسرا اداریہ

کے زیرِ عنوان اقتباس پیش ملت ہے:۔

"قائد اعظم اور تحریک پاکستان کے خلاف مولانا مودودی کا بغض آج بھی اسی طرح قائم ہے۔ ہم الزام لگاتے ہیں کہ مولانا کی تحریک ہرگز ایک اسلامی تحریک نہیں۔ وہ حسن بن صباح کی طرح سیاسی ڈھونگ رچائے ہوئے ہیں۔ اور ان کا مقصد دین کی سربلندی کی بجائے سیاسی اقتدار کا حصول ہے ہم مولانا مودودی کو چیلنج کرتے ہیں کہ وہ مولانا احمد علی اور مولانا میکش کی طرح ہمارے خلاف بھی ازالہ حیثیتِ عرفی کا مقدمہ چلائیں اور عدالت میں ان الزامات کی صفائی پیش کریں۔" (نوائے وقت لاہور، لائلپور ۱۳ جولائی ۱۹۵۵ء صـ۳)

زیرِ نظر تحریر میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ با اصول، راست باز جناب مجید نظامی پر مودودی نے کسقدر کیچڑ اچھالا ہے۔ رہا ضمیر کے خلاف کوئی بات کہنا، تو مودودی صاحب اس میدان میں آپ کا کوئی ہمسر کیوں ہو؟ ایسا کہاں ممکن ہی نہیں سکتا۔

(مرتب)

مسلم لیگ کی مخالفت

پہلا ارشاد :- "ان لوگوں کا قاعدہ یہ ہے کہ وہ ان سب لوگوں کو جو از روئے پیدائش مسلمان قوم سے تعلق رکھتے ہیں اپنی جماعت کی رکنیت کا بلاوا دیتے ہیں اور جو اس کو قبول کرے اس کو ابتدائی رکن بنا لیتے ہیں۔ پھر ان میں ابتدائی ارکان کے دوٹوں سے ذمہ دار کارکن اور عہدے دار منتخب ہوتے ہیں اور انہیں کی کثرت رائے سے تمام معاملات سرانجام دیے جاتے ہیں۔"

دوسرا فرمان :- "مسلم لیگ کے کسی ریزولیشن اور لیگ کے ذمہ دار لیڈروں میں سے کسی کی تقریر میں آج تک یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ اُن کا آخری مطمح نظر پاکستان میں اسلامی نظامِ حکومت قائم کرنا ہے۔"

اور اب رقمطراز ہیں :- "یہ خیال کرنا کہ جماعت اسلامی کا قیام مسلم لیگ کا مقابلہ کرنے اور تحریک پاکستان کے خلاف ایک دوسری تحریک اٹھانے کے لئے کیا گیا تھا، محض ایک بے جا بدگمانی ہے۔ (نوائے وقت ۱۴۔ اگست ۱۹۷۶ء)

ناظرین کرام! یہ اقتباسات ہم نے اپنے ہی ایک مقالہ کے درج کئے ہیں جو جناب مولانا عبدالستار خاں صاحب نیازی اور رانا نصر اللہ خاں صاحب دو بزرگوں اور راقم کے کہنے کے باوجود مجید نظامی صاحب نے نوائے وقت میں شائع کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ یہ مضمون "تحریک پاکستان اور جماعتِ اسلامی" کے جواب میں تھا جو کچھ مودودی صاحب نے خلافِ حقیقت "نوائے وقت" میں ایڈیٹر نوائے وقت، کو انٹرویو دیکر عام کیا تھا۔ میرا یہ حقیقت کشا مضمون روزنامہ مساوات ۲۹ اگست ۱۹۷۶ء ۳۰۔ دسمبر، ۳۱ دسمبر ۱۹۷۶ء میں قسط وار شائع ہوتا رہا۔ یہ طویل مضمون سارے کا سارا کتاب میں درج نہیں کیا جا سکتا۔ لہذا اس کا آخری حصہ نقل کر کے ہم آگے بڑھتے ہیں۔

مولانا کا مصلحتی اسلام

"مولانا کا مصلحتی اسلام سیاسی مجبوریاں، اور ہوسِ اقتدار کے لیے حکمتِ عملی کی شرمناک خیال آفرینیاں انہیں (مودودی صاحب کو) کیا کیا کچھ لکھنے بولنے پر آمادہ و مجبور کر رہی ہیں۔ علم و سیاست شعور و آگہی سے بھرپور اور مانوس و بریز فضاؤں اور نورِ بصیرت سے منور دل و دماغ رکھنے والے فرزندانِ اسلام کے علمی و دینی ماحول اور حقیقت بینی اور حق شناسی سے متاثر ہواؤں میں ایک نامحرم، ناموسِ حیات تو جو جی میں آئے کہہ سکتا ہے لیکن ایک ذمہ دار مردِ حق پرست اس قسم کی ذہنی قلابازیاں نہیں کھا سکتا۔ اور نہ ایسی افسوسناک جسارتیں کر سکتا ہے، جسے آج کی کہی ہوئی بات کی کل گرفت کا ڈر ہو۔ اور محاسبہ و مواخذہ کا خوف وہ کبھی اس جرأت سے غلط بیانی اور دلیری سے غلط نویسی کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔ لیکن کیا کیا جائے اگر ایک شخص نے اپنے حلقہ ارادت میں خود ہی اذنِ عام کر دیا ہو، کہ حکمتِ عملی کی رو سے دروغ بافیاں انتہائی ضروری ہیں۔ آپ میرے نقوشِ پا پر چلیے تو پھر انہیں روکنے والا کون؟ عصرِ حاضر کے یہ صالحین کرام اس جرأت و بے باکی سے جھوٹ کہتے، جھوٹ بولتے اور جھوٹ لکھتے ہیں (اور اسلام کی روشنی میں) کہ خدا، مصطفیٰؐ و جبرائیلؑ حیرت میں ہیں۔"

۲۳ مارچ ۱۹۴۵ء

۲۳ مارچ ۱۹۴۵ء کو پاکستان ڈے کی تقریب میں انتخابات کی اہمیت کے پیشِ نظر قائدِ اعظم نے وضاحت سے فرمایا کہ:۔

"یاد رکھو اگر ہم اس جدوجہد میں ناکام رہ گئے تو نہ صرف یہ کہ ہم تباہ ہو جائیں گے۔ بلکہ اس برصغیر میں مسلمانوں اور اسلام کا نام و نشان تک بھی باقی نہیں رہے گا۔"

آپ مودودی صاحب کے آئینہ تحریر میں دیکھ چکے ہیں کہ وہ قائدِ اعظم اور جمہورِ اسلام کو کتنی ملفوف گالیاں دینے کے بعد کس قدر صداقت شکن صفائی پیش کرنے

کی صالحانہ کوشش فرما رہے ہیں۔ چشم فلک ان کی اس نازیبا حرکت پر خندہ زن، اور
علم و اسلام ان کی اس ناموزوں جسارت پر حیرت و استعجاب میں ہے۔ ہم تو اس عیارانہ
صفائی پر جو کہ قارئین پر روشن ہے، یہی عرض کر سکتے ہیں کہ ؂

مکن اسے بے خبر رسوا حرم را (اقبالؒ)

ہمیں یقین ہے کہ احساس و خیال کے ان صحراؤں میں ایسے ذہنی زلزلوں، اور
باطل سوز تحریروں سے فولادی عزم کے ہتھوڑوں کی صداقت نواز ضربوں سے
تازہ چشموں کی نمود ہو کر رہے گی۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ ان زندہ شہادات کو
صداقت کے طلبگاروں کے سامنے بار بار لایا جائے تاکہ قلب و ذہن پر ان کی پھیلائی
ہوئی تاریکیاں چھٹ جائیں۔ افسوس ہے کہ :- ؂

جہاں قرآن بنکر حرفِ حق کو جگمگانا ہے
وہ خطہ آج گہرے اندھیرے کا ٹھکانا ہے

ہم نے اس شعر میں تصرف کیا ہے۔ ہم واشگاف الفاظ میں کہتے ہیں، کہ
مودودی اسلام کے نام پر ملت سوزیاں کرتے رہے ہیں اور اب نور کہکر تاریکیاں
پھیلا رہے ہیں۔ (مساوات ۳۱۔ دسمبر ۱۹۷۶ء)

حقیقت ریز

مقام شکر ہے کہ مندرجہ بالا مقالہ میں ہم حقیقت ریز تھے۔ اس قلابازنے
انگریزی اخبار پاکستان ٹائمز کے نمائندہ کو انٹرویو دیتے ہوئے سوال و جواب
میں کہا :-

"جو لوگ تحریک پاکستان کی صف اول میں شامل تھے، وہ ہمیں سچے مسلمان
نظر نہیں آتے تھے۔ ہمارے دل میں اس تحریک کے اسلامی ہونے کے متعلق شکوک
کی یہ وجہ تھی، ہم (صرف) قائد اعظم کے خلاف نہیں تھے۔ ہم اس پوری کی پوری قیادت
کے خلاف تھے، جو تحریک پاکستان چلا رہی تھی (پاکستان ٹائمز مورخہ ۲۵/۹/۷۷)

اس پر نوائے وقت نے ۴۔ اکتوبر ۱۹۷۶ء میں

گزارشِ احوالِ واقعی

کے زیر عنوان اداریہ میں تحریر کیا :-

"بانی جماعت اسلامی مولانا مودودی نے چند روز قبل معاصر پاکستان ٹائمز کو جو انٹرویو دیا تھا، اسمیں انہوں نے ایک بار پھر بلا تخصیص تحریک پاکستان کی ساری قیادت کے مسلمان نظر نہ آنے کے بارے میں اپنی جس پرانی منطق کو دہرایا تھا ہم اس کا نوٹس لینے پر اس لیے بھی مجبور ہوئے کہ موجودہ بحرانی حالات میں ان باتوں کو دہرانے کی کوئی تُک ہی نہ تھی۔ پاکستان میں انقلاب کی دعویدار کسی بھی شخصیت کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ تحریکِ پاکستان کی اس قیادت کو جس نے پاکستان تخلیق کیا اور جو اب اللہ تعالیٰ کو پیاری ہو چکی ہے طعن و طنز کا نشانہ بنائے۔ قائد اعظمؒ نے برصغیر کی سیاسی تاریخ میں مسلمانوں کے حقوق کی ایک عظیم اور کامیاب جنگ لڑی تھی۔ انہوں نے مولانا سمیت ہم سب پاکستانیوں کو ہندو کی غلامی میں جانے سے محفوظ کیا۔ مولانا کو ایسی سرزمین حاصل کر دی جس میں وہ اسلام نافذ کر سکیں۔ ان کا یہ اتنا بڑا کارنامہ ہے کہ جسے کوئی احسان فراموش ہی بھلا سکتا ہے۔ تاریخ میں بطور بانیِ پاکستان انہیں جو مقام حاصل ہے اسے کوئی منفق کوئی تحریک ختم نہیں کر سکتی۔ مولانا مودودی نے ۱۹۴۰ء میں جبکہ وہ اپنی عمر کی مناسبت سے ابھی ذہنی پختگی کی منزلیں طے کر رہے تھے۔ تحریک پاکستان کی قیادت کے بارے میں اگر صحیح رائے قائم نہ کر سکے یا وہ تحریک پاکستان کی کامیابی کی پیش بینی نہ کر سکے تو کیا یہ ضروری ہے کہ وہ آج بھی اسی رائے پر اصرار کریں۔

قائد اعظمؒ نے اس اعتراض کے جواب میں کہ آپ کانگرس سے بھی وابستہ رہے ہیں یوں اعترافِ حقیقت کر کے کہ میں کبھی پرائمری میں بھی پڑھتا تھا، اپنی عظمت کا ثبوت بہم پہنچایا۔ قائد اعظم کی عظمت کا راز ہی یہ ہے کہ وہ درست گو اور راست باز تھے۔ اور سیاست میں دُور بین نگاہ رکھتے تھے عظیم شخصیتیں اپنی خامیوں اور غلط اندازوں پر اصرار نہیں کیا کرتیں۔ اور یہ بات اُن کی اس صلاحیت کی آئینہ دار ہوتی ہے کہ وہ شخصیت کے نقائص

دور کر سکتی ہے۔ ہمیں افسوس کیساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مولانا مودودی قیامِ پاکستان سے قبل برصغیر کے مسلمانوں کی سیاسی ضرورت کا کماحقہٗ ادراک نہ کرسکے۔ اس لیے بھی زیادہ افسوس اس بات پر ہے کہ انہوں نے پختہ عمر میں بھی اپنی رائے کو بدلنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

دوسرا اقتباس:- "اس مرتبہ انہوں نے خود ردِعمل ظاہر نہیں کیا بلکہ ان کی بیگم صاحبہ غصے سے لال پیلی ہوئی ہیں غصے کی شدت ہیں وہ یہاں تک کہہ گئی ہیں کہ دو قومی نظریہ مولانا مودودی ہی کا ایجاد کردہ ہے

انہوں نے نوائے وقت کو اپنی صالح زبان میں الزام دیا ہے کہ شائد اسے پیپلز پارٹی والوں سے امداد مل رہی ہے۔ اس طرح کا لین دین ممکن ہے جماعتِ اسلامی والوں کا اصول ہو، کم از کم ہمارا نہیں۔"

تیسرا اقتباس:- قائد اعظمؒ پر بیگم صاحبہ نے اعتراض کیا ہے کہ انہوں نے بھی اسلام کو نافذ نہ کیا۔ معترضین اگر انشراحِ صدر سے غور کریں تو انہیں معلوم ہوگا، کہ اسلام کے نفاذ کے لیے پہلے ایک خطہ زمین کی ضرورت تھی۔ پہلے مرحلے کو قائد اعظمؒ نے بخیر و خوبی مکمل کر دیا۔ دوسرے مرحلے کے کام کے لیے انہیں مہلت نہ ملی۔ وہ قیام پاکستان کے بعد صرف تیرہ ماہ زندہ رہے۔ ان کی صحت اس قدر خراب تھی کہ بعد میں وزیر اعظم ایٹلی نے کفِ افسوس ملتے ہوئے کہا کہ اگر انہیں قائد اعظم کی اس بیماری کا علم ہو جاتا تو وہ برصغیر کے سیاسی حل کو کچھ عرصہ کے لیے مؤخر کر دیتے۔ اس طرح تقسیم عمل میں نہ آتی اور متحدہ (اکھنڈ بھارت) ہندوستان قائم رہتا۔

مولانا سیاسیات سے ریٹائر ہو چکے ہیں۔ انہیں اب گوشۂ خاموشی میں ہی رہنا چاہیئے ان کی عزت اور عظمت اسی میں ہے لیکن اگر سیاسیات سے ریٹائر ہو جانے کے باوجود متنازعہ سیاسی آراء دیں گے تو ان سے اختلاف بھی ہوگا اور ان پر اعتراض بھی۔

آگے چلکر

"موزوں بات تو یہ ہوتی کہ مولانا مودودی اپنے واضح انٹرویو پر ہمارے اصولی

اعتراض کا جواب خود دینے کی زحمت گوارا فرماتے۔ انہوں نے ایسا کرنا شایان شان نہ سمجھا تو کیا ضروری تھا کہ بیگم صاحبہ سیاسی شعور سے عاری اپنی تنقید میں نوائے وقت کے ساتھ بانئ پاکستان کو بھی ہدف بنالیں۔"

ہم نے لکھا ہے کہ اپنی معروضات میں ہم حقیقت بیان نکلے جس کا اعتراف واقرار نوائے وقت بھی کر رہا ہے کسی کو یہ کہہ دینا کہ اس کا شہرت کا قد فلاں دراز قامت شخصیت کے برابر نہیں، اس لیے ہم اس کے بیان کردہ زندہ حقائق شائع نہیں کریں گے۔ کوئی وزنی دلیل اور معقول عذر نہیں اور کسی ایسے قائداعظمؒ دشمن کی حقیقت سوز تحریر کے جواب میں کسی پاکستانی کا جواب قابل اشاعت قرار نہ دینا موزونیت سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔ اگر ایک صحرا میں بھی دو چار خیموں میں دو چار بد قسمت کے بھی سچے مسلمان اور محکم ایمان مسلمان رہتے ہوں اور اُن میں سے ایک شیطان پر لعنت کرنا اپنا فرض حیات گردانتا ہو تو کیا وہ اس لیے قابل توجہ اور لائق ستائش نہیں کہا جاسکتا کہ وہ عالمی شہرت میں ابلیس کے پاسنگ نہیں۔

قارئین کرام! آپ جناب حمید نظامی کے اداریے بھی پڑھ چکے ہیں اور محولا بالا مقالہ بھی اہل نظر کے لیے ان دونوں میں حرارتِ ایمانی اور حق بیانی کا واضح فرق ہے۔ دونوں اداریے اپنے اپنے مقام پر ہیں اس کے بعد جناب زیڈ اے سلہری نے بھی بارہا اس حقیقت کو اپنے مقالات میں نمایاں کیا ہے۔ مولانا مدنی نے اقبالؒ کی وفات کے چھ ماہ بعد ان کے خلاف زہر اگلا۔ مودودی نے قائداعظمؒ کی وفات کے بعد ـــــ اصل میں دونوں ایک ہیں۔

ماہنامہ طلوعِ اسلام اپنی اشاعت جنوری ۱۹۷۸ء کے صفحہ ۴۹ پر "ریکارڈ میں رکھیے" کے عنوان سے لکھتا ہے:۔

ریکارڈ میں رکھیے

"اخبارات میں شائع ہونے والی خبروں کی عمر ایک آدھ دن سے زیادہ نہیں ہوتی

لیکن بعض خبریں ایسی اہم ہوتی ہیں کہ انہیں مستقل طور پر ریکارڈ میں رکھنا چاہیئے۔ ان پر تنقید و تبصرہ اپنے وقت پر کیا جائے گا۔

مودودی صاحب

مودودی صاحب نے انگریزی اخبار پاکستان ٹائمز کے نمائندہ کو انٹرویو دیتے ہوئے ایک سوال کے جواب میں فرمایا :-

اس پر روزنامہ نوائے وقت (جسے بالواسطہ جماعت اسلامی کا نقیب سمجھنا چاہیئے) اپنی اشاعت بابت ۲۷ ستمبر کے اداریہ میں حسب ذیل تبصرہ شائع کیا۔

نوٹ :- یہ اداریہ حسب ضرورت پہلے لکھا جاچکا ہے (چوہدری حبیب احمد)

آگے بڑھیئے

روزنامہ مساوات ۲ اکتوبر کی اشاعت میں لکھتا ہے

لاہور ہائیکورٹ اور ڈسٹرکٹ و سیشن کورٹس کے ۱۰۰ وکلا

لاہور ہائی کورٹ اور ڈسٹرکٹ و سیشن کورٹس کے ۱۰۰ وکلا نے مشترکہ بیان میں مولانا مودودی کے اس انٹرویو کی سخت مذمت کی ہے جو انہوں نے ایک مقامی روزنامے کو دیا ہے۔ اس انٹرویو میں مولانا مودودی نے کہا تھا کہ قائداعظمؒ سمیت تحریک پاکستان کے تمام قائدین سچے مسلمان نہیں تھے۔ ان وکلاء نے کہا ہے کہ تحریک پاکستان میں شاعر مشرق علامہ اقبالؒ، شہید ملت لیاقت علی خاں، علامہ شبیر احمد عثمانی، مولوی تمیزالدین، سردار عبدالرب نشتر، مولوی فضل الحق حسین شہید سہروردی، مولانا بھاشانی، مولانا عبدالباری، پیر جماعت علی شاہ، پیر صاحب سیال شریف، پیر جماعت علی شاہ، پیر صاحب مانکی شریف اور دوسرے دیندار مسلمان رہنما پیش پیش تھے۔ جن کا مذہبی اور سیاسی رتبہ مسلّم ہے ان وکلا نے چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ اس انٹرویو کا سختی سے نوٹس لیں جس میں انہوں نے قائداعظمؒ اور تحریک پاکستان کے دوسرے قائدین کے خلاف زہر افشانی کی ہے۔ انہوں نے اس امر پر حیرت کا اظہار کیا ہے کہ وطن عزیز کو معرض وجود میں آئے تیس برس گزر چکے ہیں

لیکن مولانا مودودی کے خیالات میں ذرہ بھر بھی تبدیلی نہیں۔ وہ آج بھی ملک اور تحریک پاکستان کے قائدین کے متعلق وہی نظریات رکھتے ہیں جن کا پرچار وہ ۱۹۴۷ء سے قبل کرتے تھے۔"

مفتی محمود صاحب اور نظریۂ پاکستان

معاصر نوائے وقت اپنے اسی اداریہ میں جس کا ذکر پہلے آچکا ہے، لکھتا ہے :۔

اس سے قبل قومی اتحاد کے سربراہ مولانا مفتی محمود بھی اس معاصر سے اپنے خصوصی انٹرویو میں یہ کہہ چکے ہیں کہ وہ متحدہ ہندوستان میں زیادہ صوبائی خود مختاری میں مسلمانوں کا مفاد بہتر طور پر محفوظ سمجھتے تھے۔ اس لیے تحریک پاکستان کے مخالف تھے تیس سال گزر جانے کے باوجود اگر تحریک پاکستان کی قیادت اور غرض و غایت کے متعلق آپ کے ذہن یا دل صاف نہیں ہو سکے، تو حقیقت تسلیم نہ کرسکنے کی صورت میں آپ اس معاملے میں خاموش بھی رہ سکتے ہیں، اور اگر کوئی سوال پوچھا جائے تو اس کا جواب دینے سے معذرت بھی کر سکتے ہیں آخر نئے سرے سے ایسی بحثوں بلکہ کج بحثی کا دروازہ کھولنے (اور وہ بھی عین انتخابی مہم کے دوران میں) کیا تک ہے ؟

(مورخہ ۲۷ ستمبر ۱۹۷۷ء)

آپ لگے ہاتھوں اس خبر کو بھی نوٹ کر رکھئے جو تقسیم ہند سے پہلے حیدر آباد دکن کے اخبار "رہبر دکن" کی ۲۱۔ اکتوبر ۱۹۴۵ء کی اشاعت میں شائع ہوئی تھی۔

"مولانا حسین احمد صاحب نے مسلم لیگ میں مسلمانوں کی شرکت کو حرام قرار دیتے اور قائد اعظم کو کافر اعظم" کا لقب دیتے ہوئے حال ہی میں جو فتوی دیا تھا۔ اس کا مولانا شبیر احمد عثمانی دیوبندی نے اپنے مکتوب میں جو دہلی کے ایک روزنامہ میں شائع ہوا۔ حسب ذیل جواب دیا ہے کہ .... (ہم یہ جواب درج نہیں کر رہے ہیں)

(بحوالہ تحریک پاکستان اور نیشنلسٹ علماء ص ۱۰۱۲)

قارئین کرام کو اتنا تو ضرور معلوم ہوگا کہ مولانا حسین احمد مدنی مرحوم (اس دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث تھے جس سے مفتی محمود صاحب نے سند فضیلت حاصل کی تھی اور مولانا مدنی اس جمعیت العلماء ہند کے صدر بھی تھے جو نیشنلسٹ علماء کی نمائندہ جماعت تھی اور مفتی صاحب جس کے اہم رکن تھے۔"

(طلوعِ اسلام لاہور جنوری ۱۹۷۸ء)

مودودی صاحب کا انٹرویو

اس "ریکارڈ" کی شق ۱ میں آپ نے اس انٹرویو کا اقتباس ملاحظہ فرمایا ہے جو مودودی صاحب نے روزنامہ پاکستان ٹائمز کے نمائندہ کو دیا تھا۔ اس انٹرویو کا اردو ترجمہ، جماعت اسلامی کے ترجمان 'ایشیا' کی ۲۔اکتوبر ۱۹۷۷ء کی اشاعت میں شائع ہوا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اسے بھی ریکارڈ میں محفوظ کر لیا جائے۔ لیکن اس سے پہلے پاکستان ٹائمز میں شائع ہونے والے انٹرویو کے ذرا تفصیلی اقتباس کی ضرورت لاحق ہوگئی ہے۔ وہ یوں ہے:-

سوال:- اگر جیسا کہ آپ کہتے ہیں، دین کے قیام کے لیے مملکت کا اقتدار ضروری ہے تو پھر آپ نے تحریک پاکستان کے لیڈروں کی مخالفت کیوں کی تھی؟

جواب:- ہمارے لئے اصل بات یہ ہے کہ اگر ہمیں ایک ٹکڑہ زمین ایسی مل جائے، جہاں خدا کی مشیئت کا غلبہ ہو تو وہ خطہ دوسروں سے زیادہ مقدس ہوگا۔ ہم چاہتے تھے کہ پورا ہندوستان سرزمین اسلام ہو، لہٰذا ہم اسلام کے نام پر حاصل کئے جانے والے ملک کی مخالفت کس طرح کر سکتے تھے۔؟ لیکن جو لوگ تحریک پاکستان کی صفِ اوّل میں شامل تھے، وہ ہمیں سچے مسلمان نظر نہیں آتے تھے۔ ہمارے دلوں میں اس تحریک کے اسلامی ہونے کے متعلق شکوک کی وجہ یہ تھی کہ ہم قائد اعظمؒ ہی کے خلاف نہیں تھے۔ ہم اس پوری کی پوری قیادت کے خلاف تھے جو تحریک پاکستان کو چلا رہی تھی، جب پاکستان قائم ہو گیا تو ہم نے اسلامی نظام کے قیام کی جدوجہد جاری رکھی" (پاکستان ٹائمز ۲۵ $\frac{9}{77}$)

آپ نے پاکستان ٹائمز میں شائع شدہ انٹرویو کا متعلقہ حصہ دیکھ لیا۔ اب دیکھئے کہ ایشیا میں یہ حصہ کس طرح شائع ہوا ہے۔ اس کا عنوان ہے :-

پاکستان ٹائمز کے خصوصی نامہ نگار کا۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب سے اہم انٹرویو"

اس کے بعد اس کا متعلقہ حصہ یوں شائع ہوا ہے۔

تحریک پاکستان کے لیڈروں کی مخالفت کے بارے میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے مولانا مودودی نے کہا کہ :- سچی بات یہ ہے کہ اگر ہمیں ایک گز زمین ایسی مل جائے جہاں اللہ کے حکم پر عمل کیا جا سکے تو یہ خطہ دوسرے خطوں سے زیادہ مقدس ہوگا۔ ہم چاہتے تھے کہ پورا ہندوستان سرزمین اسلام ہو۔ اس کے بعد ہم اسلام کے نام پر حاصل کیے جانے والے ملک کی کس طرح مخالفت کر سکتے تھے۔ جب پاکستان قائم ہو گیا تو ہم نے اسلامی نظام کے قیام کی جدوجہد جاری رکھی ...... (الخ)

(ایشیا ۲۔ اکتوبر ۱۹۷۷ء صفحہ ۶)

آپ نے دیکھا کہ اس میں سے وہ حصہ غائب ہی کر دیا ہے جس میں تحریک پاکستان کے لیڈروں کے سچے مسلمان نہ ہونے کا ذکر تھا۔ ایک صاحب نے بتایا ہے کہ جماعت اسلامی کے دوسرے ترجمان روزنامہ جسارت (کراچی) میں بھی اس انٹرویو کا متعلقہ حصہ اس طرح شائع ہوا ہے جس طرح ایشیا میں شائع ہوا ہے۔ کچھ عرصہ بعد پاکستان ٹائمز میں شائع ہونے والا انٹرویو تو لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو جائے گا۔ اور یہ حضرات ایشیا اور جسارت میں شائع ہونے والا انٹرویو لوگوں کو دکھائیں گے اور کہیں گے کہ جو لوگ کہتے ہیں کہ مودودی صاحب نے تحریک پاکستان کے لیڈروں کے سچے مسلمان ہونے پر اعتراض کیا تھا وہ کس قدر بہتان تراشی اور افترا پردازی سے کام لیتے ہیں۔ مولانا صاحب نے کبھی ایسا نہیں کہا تھا"

("طلوع اسلام" ص ۵۴ جنوری ۱۹۷۸ء)

توڑ دیتا ہے کوئی "موسیٰ" طلسم سامری

قائد اعظمؒ کے یوم پیدائش کی تقریب (دسمبر ۱۹۷۶ء) پر جناب پرویز کا خطاب ہے جس کے چند اقتباسات میاں طفیل حالیہ امیر جماعت کی مفاہمت قائد اعظمؒ کی دروغ

بانی کو طشت از بام کرنے کے لیے پیشِ قارئین کئے جا رہے ہیں۔ یہ یاد رہے کہ عرصہ دراز سے جماعتِ اسلامی کے بانی مودودی صاحب اور ان کے نائبین، معتقدین متاثرین اور مریدین یہ کہتے چلے آ رہے ہیں کہ مولانا نے قیامِ پاکستان کی تحریک، نظریۂ پاکستان اور قائدِ اعظمؒ کی مخالفت نہیں کی تھی۔ اسی ضمن میں واقفانِ حقیقت ان کے اس باطل آمیز دعوے کا تردید کرتے چلے آتے ہیں لیکن مودودی صاحب اور ان کی اسلامی جماعت برابر مسلسل اور متواتر یہ کہتی چلی جاتی ہے اور جا رہی ہے کہ انہوں نے تحریکِ پاکستان کی مخالفت نہیں کی۔

جماعت کے حالیہ امیر میاں طفیل محمد صاحب

اِدارہ طلوعِ اسلام گلبرگ نے جناب پرویز کے اس خطاب کا جو پمفلٹ شائع کیا ہے اس کے صفحہ ۱۰-۱۱ پر تحریر ہے آپ نے خطاب میں فرماتے ہیں۔

"یہ داستان پرانی ہونے کی وجہ سے کچھ فرسودہ سی ہو گئی تھی، کہ اس جماعت کے حالیہ امیر میاں طفیل محمد صاحب نے حال ہی میں اس کا باندازِ نو اعادہ فرمایا ہے۔ انہوں نے ۲۳ نومبر کی شب پاکستان ٹیلی ویژن پر اپنے ایک انٹرویو میں اس سوال کے جواب میں کہ جماعت اسلامی نے تحریکِ پاکستان کی مخالفت کیوں کی تھی، فرمایا، کہ یہ الزام قطعاً غلط ہے اور اصل واقعات خود اس کی تردید کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ :-

واقعہ یہ ہے؟

واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۴۱ء میں جماعتِ اسلامی کی تشکیل کے بعد جماعت کے اس زمانے کے سیکرٹری قائدِ اعظمؒ کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ تقسیمِ ملک کا آپ کا مطالبہ سچا اور درست لیکن اگر یہ مطالبہ منظور بھی کر لیا گیا۔ تو اس سے اسلامی مملکت وجود میں نہیں آسکے گی۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ پہلے "پیدائشی مسلمانوں" کو حقیقی مسلمان بنایا جائے۔ ان کی ذہنیت کو بدلا جائے ان کی سیرت و کردار کو اسلامی سانچے میں ڈھالا جائے۔ یہ وہ مسلمان ہوں گے جن سے

اسلامی مملکت وجود میں آسکے گی۔ اس پہ قائد اعظم نے فرمایا کہ جو کچھ آپ کہتے ہیں بالکل صحیح
ہے لیکن مسلمانوں کے اندر قلب و دماغ کے اس قسم کے تغیر اور سیرت و کردار کی اس قسم کی
تبدیلی کے لیے صدیاں درکار ہوں گی اور یہاں حالت یہ ہے کہ ہندوستان کی بساطِ سیاست
پر اس تیزی سے تغیرات رونما ہو رہے ہیں کہ اگر میں اس ذہنی تبدیلی کے کام میں لگ
گیا تو انگریز پورے کے پورے ملک کو ہندوؤں کے حوالے کر کے چلا جائے گا جو انگریز
کی غلامی سے بھی بدتر ہو گی۔ انہوں نے فرمایا کہ مناسب یہ ہو گا کہ میں تقسیم ہند کی لڑائی لڑتا
رہوں اور آپ ذہنی اور اخلاقی تبدیلی کے لیے کوشش کرتے رہیں۔ اس طرح یہ دونوں
متوازی تحریکیں ایک ہی منزل کی طرف رواں دواں رہیں۔ میاں صاحب نے فرمایا کہ قائد اعظم
اور جماعتِ اسلامی اس مفاہمت کے بعد کیا کوئی باور کر سکتا ہے کہ مودودی صاحب نے
تحریکِ پاکستان کی مخالفت کی تھی؟
یہ تھا اس سوال کا جواب جو میاں طفیل محمد صاحب نے ٹیلی ویژن پر دیا۔ واضح رہے کہ
اس انٹرویو کا تحریری ریکارڈ شائع نہیں ہوا۔ جو کچھ اوپر کہا گیا ہے یہ میاں صاحب کے
جواب کا ملخص یا مفہوم ہے جسے ہزاروں لاکھوں انسانوں نے سنا تھا۔

قائد اعظمؒ اس قسم کی مفاہمتوں کے قائل نہ تھے

دوسرا اقتباس

اس مبینہ مفاہمت کا کوئی ریکارڈ نہ مسلم لیگ کے ضخیم لٹریچر میں ملتا ہے اور
جہاں تک میری نگاہ یاوری کرتی ہے نہ ہی جماعتِ اسلامی کے لٹریچر میں اس کا کہیں ذکر
ہے۔ اور نہ ہی میاں صاحب نے اس کا کوئی حوالہ دیا ہے۔ یہ مبینہ واقعہ پیش آیا جماعت
اسلامی کے اس زمانے کے سیکرٹری جنرل اور قائد اعظمؒ کے درمیان۔ غالباً اس کا کوئی
تیسرا شاہد بھی نہ تھا۔ قائد اعظمؒ اس وقت دنیا میں موجود نہیں جو اس کی تائید یا تردید کرتے
نہ ہی مودودی صاحب یا جماعت اسلامی نے اسے قائد اعظم کی زندگی میں کبھی بیان کیا ——
مودودی صاحب نے آج تک اپنے کسی بیان میں اس مفاہمت کا ذکر نہیں کیا لہٰذا اس

کی تائید یا تردید میں قرآن کی رُو سے ہی کچھ کہا جا سکتا ہے۔ قرآن اس کی شہادت
دیتے ہیں کہ نہ تو قائد اعظمؒ نے جماعت اسلامی کے ساتھ اس قسم کی کوئی مفاہمت کی
تھی ـــ وہ اس قسم کی مفاہمتوں کے قائل ہی نہ تھے اور نہ ہی مودودی صاحب نے کبھی
مسلم لیگ اور جماعت اسلامی کو ایسی متوازی تحریکیں قرار دیا تھا جو ایک ہی منزل کی طرف
رواں دواں تھیں۔ اس خاکسار[1] کو تحریک پاکستان کے دوران قائد اعظمؒ اور مسلم لیگ کے
دیگر زعماء کے ساتھ ہم کاری کی سعادت حاصل رہی ہے۔ ان میں سے کسی نے کبھی اس
(مبیّنہ) مفاہمت کا ذکر تو ایک طرف، اسکی طرف اشارہ تک بھی نہیں کیا۔ اس زمانے
کے "طلوعِ اسلام" کے فائل موجود ہیں ہیں اس کی طرف اشارہ تک نہیں ملتا۔ قوم کی
بدقسمتی ہے، تحریک پاکستان کی کوئی مصدقہ یا مستند تاریخ مرتب نہیں ہوئی، لیکن
(ایک عینی شاہد کی حیثیت سے) میں نے اپنا یہ فریضہ قرار دے رکھا ہے کہ اس تحریک
کے متعلق جہاں کوئی خلافِ واقعہ بات کہی جائے میں اسکی تردید یا تصحیح کر دوں۔
میری یہ وہی ذمہ داری ہے جس کی بنا پر میں ضروری سمجھتا ہوں کہ میاں طفیل محمد
صاحب کے اس بیان کا جائزہ لے کر اصل حقیقت قوم کے سامنے پیش کر دوں۔
مجھے اس سلسلہ میں بہت سے استفسارات موصول ہوئے جن میں مجھ سے تقاضا کیا گیا
ہے کہ میں حقیقت کی وضاحت کر دوں۔ یاد رہے کہ میاں صاحب کا یہ بیان آج
تو محض ایک اخباری خبر کی حیثیت رکھتا ہے، لیکن مستقبل میں یہی خبر تاریخ کا حصہ
اور حقائق کو مسخ کرنے کا موجب بن جائے گی۔ اس بنا پر بھی اس بیان کا جائزہ لینا
ضروری قرار پا جاتا ہے۔ اس قسم کے فریضہ کی ادائیگی میرے لیے کوئی خوشگوار امر نہیں
لیکن اس احساس سے کہ ایسے مواقع پر خاموش رہنے سے میں کتمانِ شہادت کے جرم
کا مرتکب نہ قرار پا جاؤں اپنے آپ کو اس کے لیے مجبور پاتا ہوں کہ ع

اگر خاموش بنشینم، گناہ است

اس سے آگے چلکر

تیسرا اقتباس:۔ میاں صاحب کے بیان کی رُو سے یہ واضح ہے کہ:۔

۱؎ پرویز صاحب

۱۔ اس مفاہمت کے مطابق جب یہ تسلیم کر لیا تھا کہ تحریکِ پاکستان اور جماعت اسلامی دو متوازی تحریکیں ہیں جن کا مقصود و مطلوب ایک ہی ہے تو پھر جماعتِ اسلامی کو مسلم لیگ کی مخالفت نہیں کرنی چاہیئے تھی۔ بلکہ اس کے حلیف کی حیثیت سے کام کرنا چاہیئے تھا۔ ہمیں دیکھنا یہ ہوگا کہ کیا جماعتِ اسلامی، تحریکِ پاکستان اور قائدِ اعظمؒ کی حلیف کی حیثیت سے سرگرمِ عمل رہی تھی یا اس کے شدید ترین دشمن کی حیثیت سے آپ کی مخالفت میں مصروف۔

۲۔ جب یہ تسلیم کر لیا گیا تھا کہ ملک کی تقسیم خود جماعت اسلامی کے مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے، یعنی ایک اسلامی مملکت کے قیام کا ذریعہ ـــــ تو مودودی صاحب کو تقسیمِ ہند کے مطالبہ کی تائید کرنی چاہیئے تھی۔ دیکھنا یہ ہوگا کہ کیا مودودی صاحب نے تقسیمِ ملک کی تائید کی تھی یا آخر تک اس مطالبہ کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگاتے رہے تھے۔

میں ان ہر دو دفعات کے متعلق اپنی طرف سے کچھ نہیں کہوں گا ـــ مودودی صاحب اور جماعتِ اسلامی کے دیگر زعماء کی تحریریں پیش کروں گا جو خود اس کی شہادت پیش کر دیں کہ میاں صاحب کا یہ بیان کس قدر حقیقت پر مبنی ہے۔"

اس کے بعد پرویز صاحب نے لکھا ہے کہ قائدِ اعظمؒ نے مطلوبہ مملکت کا مقصد کیا ہے، اپنی تقریر اور بیانات میں واضح طور پر پیش کیا ہے اس ضمن میں وہ پروفیسر خورشید احمد جو جماعت اسلامی کے رہنماؤں میں سے ہیں ان کی کتاب "پاکستان میں آئین کی تدوین اور جمہوریت کا مسئلہ" کے حوالوں سے تحریر کرتے ہیں کہ بانیٔ پاکستان نے تقسیمِ ملک سے قبل، نظریہ پاکستان کی ان الفاظ میں وضاحت فرمائی تھی۔

۱۔ "پاکستان کا منشاء و مقصد صرف آزادی اور خود مختاری نہیں بلکہ اسلامی نظریہ ہے جو ایک بیش بہا عطیہ اور خزانے کی حیثیت سے ہم تک پہنچا ہے جس کو ہمیں قائم اور برقرار رکھنا ہے۔ اور جس کی بابت ہمیں توقع ہے کہ دوسرے بھی

اس سے متمتع ہوں گے۔ (جون ۱۹۴۵ء)

(ii) مسلمان پاکستان کا مطالبہ کرتے ہیں تاکہ وہ اپنے ضابطہ حیات، اپنی روایات اور اسلامی قوانین کے مطابق حکومت کر سکیں جو ہمیں خود مختاری حاصل کرنے کے لیے آگے بڑھاتے ہیں۔ (نومبر ۱۹۴۰ء)

(iii) لیگ اس بات کی دعویدار ہے کہ ہندوستان کے ان علاقوں میں جہاں مسلمان تعداد کے لحاظ سے اکثریت میں ہیں، ایسی مملکت قائم کریں جہاں وہ اسلامی قوانین کے تحت حکومت کر سکیں۔ (دسمبر ۱۹۴۰ء)

(iv) ہمارے وجود کی اساس اسلام پر ہے۔ ہم ایک ہیں۔ اور ہمیں ایک قوم کی حیثیت سے آگے بڑھنا چاہیے۔ یہی صورت ہے جس سے ہم پاکستان کو قائم رکھ سکتے ہیں۔ (مارچ ۱۹۴۳ء)

یہ تھا وہ نظریہ جسے قائد اعظمؒ اور مسلم لیگ نے بڑی ہی وضاحت کے ساتھ پیش کیا لیکن مودودی صاحب اور ان کی جماعت کے دوسرے لوگوں کا تحریری ریکارڈ جو قائد اعظمؒ مسلم لیگ اور قیام پاکستان کی مخالفت میں کتابوں میں محفوظ ہے، اس کے اقتباسات پرویز صاحب نے اس خطاب میں دیے ہیں۔ یہ حوالے ہماری اس کتاب میں صفحہ صفحہ، جگہ جگہ پر نمایاں ہیں۔ اس لیے صاحب خطاب کے ثبوت میں پیش کردہ حوالوں کو یہاں درج کرنا ضروری نہیں۔ اس مقام پر ہمیں صرف صاحب دعویٰ میاں طفیل محمدؒ صاحب جو اس زمانہ میں قیم جماعت اسلامی تھے کی ذاتی تحریر کا ایک حوالہ دینا ہے گا جس سے ان کے مفاہمت کے دعویٰ کی قلعی کھل جاتی ہے۔

بقلم میاں صاحب

پرویز صاحب کے خطاب کے پمفلٹ کے صفحہ ۲۰ اور ۲۱ پر تحریر ہے کہ:-

"یہاں تک بات مودودی صاحب کے بیانات تک محدود تھی۔ لیکن اب ہمارے سامنے خود میاں طفیل محمدؒ صاحب کے ہاتھوں کی ایک ایسی تحریر آئی ہے جو آئینے کی طرح بات واضح کر دیتی ہے۔ پاکستان مسلم لیگ (زمانہ قبل از تقسیم) کے ایک ایل اکاؤنٹنٹ

مقصود رضا خاں صاحب کا ایک مقالہ ہفت روزہ ذوالفقار کی اشاعت بابت ۱۳-
نومبر ۱۹۷۰ء میں شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے کہا ہے کہ ۱۹۴۲ء کا ذکر ہے کہ
مسلم لیگ نے یہ کوشش کی کہ بعض علماء اور دوسرے ممتاز مسلمان جو مسلم لیگ سے علیحدہ
تھے، اس میں شامل ہو جائیں۔ اس غرض سے بعض صاحبان کو بطور اتمام حجت دعوت
دی گئی تھی۔ اور بعض مسائل پر ان کی رائے معلوم کرنے کی غرض سے ایک سوالنامہ سید
غلام مرتضٰے صاحب (جی ایم سید) کی طرف سے شائع ہوا تھا جو اس زمانے میں آل
انڈیا مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی، کونسل اور کمیٹی آف ایکشن کے ممبر اور سندھ صوبائی مسلم لیگ
کے صدر تھے۔ اس سلسلے میں ایک خط مودودی صاحب کو بھی بھیجا گیا تھا۔ اس خط کا جواب
مودودی صاحب نے ارسال فرمایا وہ میاں طفیل محمد صاحب کے قلم سے لکھا گیا تھا مقصود
رضا خاں صاحب نے اس خط کا فوٹو مذکورہ بالا ہفت روزہ (ذوالفقار) میں شائع کیا ہے
اس خط پر ۲۰/۹/۶۲ (ہجری) کی تاریخ ثبت ہے، جو انگریزی کلنڈر کے حساب سے
ستمبر ۱۹۴۲ء کے پہلے ہفتے کی تاریخ بنتی ہے۔ اس خط کا متن حسب ذیل ہے۔

مکرمی و محترمی السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

ملاحظہ فرمائیے:-

عنایت نامہ ملا۔ سید غلام مرتضٰے صاحب کی طرف
سے جو سوالنامہ آیا تھا، اس کا جواب میں دے چکا ہوں نیز دہلی سے بعض صحابنے
جو تحریر اس سلسلہ میں بھیجی تھی، ان کے سامنے بھی میں نے اپنا نقطۂ نظر واضح کر دیا
تھا۔ اگر آپ میرے ان جوابات کو ملاحظہ فرمائیں، تو آپ کو خود اندازہ ہو جائے گا
کہ دہلی حاضر ہو کر میں کوئی خدمت انجام نہیں دے سکوں گا۔ علاوہ بریں میں ایک بات
اور بھی صاف صاف کہہ دینا چاہتا ہوں۔ مسلم لیگ کی قیادت اس وقت جن حضرات
کے ہاتھ میں ہے، ان کے طرز عمل سے صریح طور پر محسوس ہوتا ہے کہ ان کے اندر اسلام کی
پیروی کا قطعاً کوئی ارادہ موجود نہیں ہے۔ بلکہ مسلمانوں میں سے زیادہ سے زیادہ جو
لوگ اسلامیت سے منحرف ہیں، وہ بھی مسلم لیگ کے موجودہ لیڈروں کی آواز ردی پر نہ لکہ
کہہ سکتے ہیں۔ اس کے بعد جب ہم مسلم لیگ کی طرف سے اس قسم کی آوازیں سنتے ہیں کہ
وہ مسلمانوں میں صحیح اسلامی روح پیدا کی جائے۔ اور ان تمام غیر اسلامی رسوم و افکار کا

استعمال کرنے کے لیے جو مسلمانوں میں رائج ہو گئی ہیں، موثر ذرائع اور طریق کار تجویز کیے جائیں۔" اور ان مقاصد کے لیے کمیٹیاں مقرر کی جاتی ہیں تو ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ مسلمانوں میں اس قیادت کا اعتبار جمانے کی ایک منافقانہ کوشش ہے اور یہ محسوس ہونے کے بعد پھر اس کوشش میں حصہ لینے کو کسی طرح ضمیر گوارا نہیں کرتا۔"

گو یہ میری دلی خواہش ہے کہ میں مسلمانوں میں جو کام بھی کسی صحیح مقصد کے لیے صحیح طرز پر ہو رہا ہو اس میں حصہ لوں۔ اور جو کچھ بھی بھلی یا بری خدمت مجھ سے بن آئے سرانجام دوں۔ لیکن مسلمانوں کو فریب میں مبتلا کرنے کی کسی کوشش میں یہ صاف جانتے ہوئے تعاون کرنا ممکن نہیں ہے۔

(بالفاظ سید ابوالاعلیٰ مودودی)

خاکسار، طفیل محمد قیم جماعت اسلامی برائے سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب)

قارئین کرام! میاں طفیل محمد صاحب کی بیان کردہ مفاہمت کی رو سے قائداعظمؒ کے ذمے تقسیم ہند کی لڑائی لڑنے کا کام تھا۔ آپ نے یہ جنگ نہایت حسن تدبر اور مومنانہ فراست سے لڑی۔ اور پاکستان حاصل کر کے مسلمانوں کو دے دیا۔ اخلاقی اصلاح کا ذمہ جماعت اسلامی نے اٹھایا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد پھر جماعت اسلامی کے جرائد و رسائل۔ امیر متفقین و متاثرین یہ کیوں کہتے اور لکھتے رہے ہیں کہ مسلمان محض نام کے مسلمان ہیں جس کام کی ذمہ داری مودودی کی جماعت نے قبول کی تھی وہ تو اس سے نہ ہو سکا۔ اور الٹا الزام مسلم لیگ کی قیادت پر تھوپتی رہی۔ شریفانہ انداز تو یہ تھا کہ اپنی ناکامی کا برملا اعتراف کرتے۔

خزاں تو موردِ الزام ہی سہی لیکن بفیضِ بادِ صبا بھی تو گل کہیں نہ کھلے

جیسا کہ راقم یہ عرض کر چکا ہے کہ میری اس کتاب میں آپ کو جگہ جگہ جماعت اسلامی کے بانی مودودی صاحب اور ان کے ہمنواؤں کی تحریرات قائداعظمؒ اور مسلم لیگ کے علاوہ قیام پاکستان کی مخالفت میں ملیں گی۔ اس کے لیے تگ و تاز سے لے کر اس کے قیام تک، پھر اس کے بعد بھی مودودی صاحب اور ان کے متاثرین نے قائداعظم اور مسلم لیگی قیادت کو نہیں بخشا۔ لیکن ان کا اپنا کردار اس کتاب کی سطر

سطر اور لفظ لفظ سے واضح ہے۔ پورے ہندوستان کو دارالسلام بنانے کے دعویدار مودودی صاحب اسی قائداعظمؒ کے حاصل کردہ پاکستان میں بھاگ آئے۔

تاریخی حقائق منہ بولتے ہیں

میاں صاحب کا دعویٰ یہ ہے کہ مفاہمت اس بات پر ہوئی تھی کہ قائداعظمؒ پاکستان حاصل کرنے کی جنگ لڑیں اور مودودی صاحب مسلمانوں کو سچے مسلمان بنانے کی جنگ جاری رکھیں گے۔ اس طرح یہ دونوں تحریکیں متوازی حیثیت سے ایک دوسرے کی حلیف بن کر کام کریں گی۔

میاں صاحب نے یہ فرمایا ہے کہ یہ مفاہمت اسلامی جماعت کے اس زمانہ کے سیکرٹری جنرل پروفیسر قمرالدین خاں، کی وساطت سے عمل میں آئی تھی۔

ڈان کیا کہتا ہے :

پروفیسر صاحب کا ایک مقالہ (انگریزی) ۲۹ اگست ۱۹۷۶ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ پروفیسر صاحب لکھتے ہیں۔

"تحریک پاکستان کے دوران کچھ اہم تخریبی قوتیں مثل خاکسار تحریک اور جماعت اسلامی بھی مصروف کار تھیں (قائداعظمؒ نے انہیں بھی مسلم لیگ میں سمونے کی کوشش کی۔ اس مقصد کے لیے انہیں لیگ میں شامل ہونے کی دعوت دی اور اس کی بھی اجازت دے دی کہ وہ اپنی تنظیموں کو لیگ کے ذیلی اداروں کی شکل میں باقی رکھ لیں ان کے ساتھ گفتگو راجہ صاحب محمود آباد کے توسط سے ہوئی تھی۔ میں ان امور سے بخوبی واقف ہوں۔ کیونکہ میں اس زمانہ ۴۲-۱۹۳۹ء میں راجہ صاحب کا ایک قریبی دوست تھا۔ اور لیگ کے پروپیگنڈہ کے سلسلہ میں ان کے دوروں اور لیکچروں میں ان کے ساتھ رہتا تھا۔ علامہ مشرقی (مرحوم) کے ساتھ اس گفتگو کا سلسلہ، منصب (STATUS) کے نقطہ پر آکر ٹوٹ گیا۔ وہ لیگ کی قیادت کے تحت کام کرنے

کے لیے تیار نہیں تھے۔

جہاں تک مولانا مودودی کا تعلق ہے، میں ان کا ذاتی نمائندہ تھا۔ مسلم لیگ کا مدراس کا اجلاس قریب آ رہا تھا۔ مودودی صاحب کو میری وساطت سے لیگ سیشن سے خطاب کرنے کی دعوت دی گئی۔ راجہ صاحب محمود آباد نے ان کے اخراجات برداشت کرنے کا ذمہ لیا۔ عین وقت پر مودودی صاحب نے جانے سے انکار کر دیا۔ اور کہا کہ جب تک انہیں مسٹر جناح کی طرف سے تحریری دعوت نامہ موصول نہیں ہوگا، وہ لیگ کے سیشن میں شامل نہیں ہوں گے۔

یہ ناممکن تھا۔ کیونکہ لیگ کے جلسوں میں شمولیت کے لیے لوگوں کو شادی بیاہ کی طرح تحریری دعوت نامے نہیں بھیجے جایا کرتے تھے۔ بایں ہمہ میں نے کہا کہ میں فوراً دہلی جاتا ہوں اور مودودی صاحب کے لیے تحریری دعوت نامہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ لیکن مودودی صاحب نے لیگ سیشن میں شامل ہونے سے صاف انکار کر دیا۔ اور کہا کہ میں لیگ کے انبوہ میں کھوئے جانے کے لیے تیار نہیں (انہوں نے کہا کہ) میں اپنی پاکیزہ تحریک کو نام نہاد نسلی مسلمانوں کے ہجوم میں، جن پر لیگ کی ممبرشپ مشتمل ہے دفن کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہو سکتا۔ (میں اس زمانے میں جماعت اسلامی کا سیکریٹری جنرل تھا۔)

اس قسم کے ناسف انگیز تجارب کے باوجود قائداعظمؒ نے نہ کبھی اپنے مزاج میں تلخی یا ترشی کا شائبہ آنے دیا اور نہ ہی کسی قسم کا جذبۂ انتقام جنم پیدا ہونے دیا

(بحوالہ ڈان انگریزی مورخہ ۲۹ اگست ۱۹۶۷ء)

اس آئینہ تحریر میں میاں طفیل محمد صاحب کا دعویٰ پرکھا جا سکتا ہے کہ کس حد تک صداقت پر مبنی ہے۔ اور یہ سچے اسلام کی کسقدر خدمت کر رہے ہیں۔

دوسرا باب
حقائق کشی

طلسم دوش وفردا

مغالطہ آفرینیاں اور غلط بیانیاں

ایک بات جو صاحبِ عقل و ہوش انسان کے لئے ناقابلِ تسلیم ہو، اور پھر جس کے پیچھے تائیدی شہادتیں، اور حالات و واقعات کا اتفاق ہو، تو وہ ایسی مغالطہ آفرینیوں اور غلط بیانیوں کو کریدنے لگ جاتا ہے اور حقائق کی تہ تک پہنچنے کی پوری پوری کوشش کرتا ہے۔ اسکی چشم بیدار اس کو واقعات کو حقیقی شکل میں دیکھنے کے لئے مجبور کرتی ہے۔ اس کا ذوقِ تجسس و تحقیق، اسے اس تلاش و جستجو میں منہمک و مشغول اور تلاشِ حق میں مصروف کر دیتا ہے۔ اس کا ذوقِ سلیم، دلِ بیدار اور فہم و فراست اُسے اس راستے پر ڈال دیتی ہیں جو حقیقت و صداقت کی وادی تک جا پہنچتا ہے گو اس راہرو کی منزل دُور بھی، اور دشوار بھی ہوتی ہے لیکن چونکہ یہ جذب و جنون میں ڈوبا ہوا متلاشی حق مسافر کسی بھی مقام پر نہ دل برا کرتا ہے اور نہ کسی قسم کی تھکان محسوس کرتا ہے۔ یہی وہ عزمِ تلاشِ حقیقت ہوتا ہے جو اُسے بالآخر اُس کے مقصدِ متعین میں کامیاب و کامران بنا دیتا ہے۔

ہمارے ذہن میں ایک صداقت نقش تھی جو ہمارے گوشِ حق نیوش تک محترم سید نذیر نیازی صاحب سے زبانی گفتگوؤں اور اُن کے محررہ خط (جسے ہم کتاب میں کسی جگہ نقل کر رہے ہیں) سے پہنچی تھی۔ ہم نے "اوراقِ گم گشتہ" اور "سید ابوالاعلیٰ مودودی" دونوں کتابوں کی حیرت انگیز اور ناقابلِ یقین تحریرات دیکھ کر غور و فکر کیا۔ اور ایک صحیح نتیجہ اخذ کر لیا۔

عقلی دلائل

پاکستان کا قیام عمل میں آیا تو مودودی صاحب نے بھی جو پورے ہندوستان

کو "دارالاسلام" بنانا چاہتے تھے اور بدیں وجہ چوہدری صاحب نیاز علی خان کی درخواست پر بھی تحریکِ قیامِ پاکستان کے لیے کام کرنے کے لیے آمادہ و تیار نہ ہوئے اور جنھیں اس "ناپاکستان" سے تو ایک مربعہ میل زمین ہی پیاری تھی۔ پھر جنھوں نے لکھا تھا کہ "مسلم لیگ کے قائد اعظمؒ سے لیکر اس کے مقتدیوں تک ایک بھی اسلامی ذہنیت نہیں رکھتا۔" اقبالؒ کے اس انتخاب کردہ قائد اعظمؒ کے پاکستان میں جنہیں حکیم الامتؒ نے دس سالہ مسلسل ترغیب و تبلیغ سے ملّت کی قیادت کے لیے آمادہ و تیار کیا تھا، آنے کے لیے ٹرک طلب کیے۔ محترم راجہ حسن اختر جو اس وقت گورداسپور میں اعلیٰ عہدہ پر تھے، اور خواجہ عبدالرحیم

ع زباں پہ بارِ خدایا یہ کن کا نام آیا۔ دونوں نے مولانا کو احساس دلانے کے لیے کہا بھی، کہ مودودی صاحب! اس "ناپاکستان" میں آپ کیوں آنا چاہتے ہیں جس کو قائد اعظمؒ اور ان کے رفقاء نے حاصل کیا ہے جن میں اسلام کی چھینٹ تک نہیں (یہ بات بارہا راقم الحروف نے ان دونوں بزرگوں سے سنی) مولانا کی التجا و درخواست پر انہیں رحم آ ہی گیا۔ چنانچہ ٹرکوں کا انتظام کر دیا گیا۔

تشہیر کا ساز

وہ مسلمان جو دلِ بینا اور عقلِ سلیم رکھتا ہے ہم سے اختلاف کی گنجائش نہیں پائے گا کہ حضرت مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی قائد اعظمؒ کے اس پاکستان میں تشریف لا رہے ہیں، جو اقبالؒ کی جہدوں، کاوشوں، نہیں نہیں دعائے نیم شبی کا ثمر تھا، تو جب وہ ٹرکوں پر بہت سارا سامان لدوا کر پاکستان لائے تو کیا وہ خط کا ایک پرزہ جو وزن میں نہایت ہی ہلکا پھلکا اور اپنی حیثیت میں سارے سامان سے زیادہ قیمتی اور مودودی صاحب کے لیے حفظِ عزت و جان کا گراں بہا قیمت پروانہ راہ و مقام تھا۔ آخر وہ کیوں ساتھ نہ لایا گیا؟

یہ اس لیے ضروری بھی تھا، کہ اگر کچھ دل جلے جو مودودی صاحب کی پاکستان کی تحریک اور قائدینِ تحریکِ پاکستان کے ساتھ "وفاؤں" سے آشنا تھے اور

ان کی کتاب "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصّہ سوم" جن کے دل و دماغ کو آتشِ احساس سے جلا رہی تھی، وہ احتساب کرتے (اور یہ جواب طلبی ان کا ملّی حق تھا)، تو مولانا صاحب حضرت قائدِ اعظمؒ اور ان محتسبوں کو حضرت حکیم الامّت علّامہ اقبال علیہ الرحمۃ کا خط دکھا سکتے۔ یہ بات قرینِ عقل و قیاس و وہم و گمان نہیں کہ مودودی صاحب گھر کا سارا سامان اور بے شمار کتابوں کا انبار تو لاد لاتے ہیں اور اگر اُن کے پاس حضرت علّامہ کا تحریر کردہ یا ان کی جانب سے لکھوایا ہوا کوئی خط ہوتا تو یہ ساتھ نہ لاتے۔ ہمارے نزدیک یہ شعار آذری ہے جواب سیاسی مصلحت کے بتوں کو تراشنے پر ان لوگوں کو مجبور کر رہا ہے لیکن شانِ خلیل بھی ہے جو ایسے جرنلسٹک حربوں کو عیاں کر دیتی ہے۔ ہم مولانا سے اب بھی مؤدبانہ عرض کرتے ہیں کہ اگر اُن کے پاس ایسا کوئی خط ہے تو شائع کریں۔ آپ کے اس فرمان کو کوئی ذی ہوش، عقل و خرد سے بہرہ ور اور دولتِ ایمان و فراست سے مالا مال تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہے کہ آپ ان واقعات و حالات کی روشنی میں ایسا ضروری خط دارالاسلام چھوڑ دیں اور اس سے بہت ہی کم قیمت کا بہت سا سامان ٹرکوں پر لاد لائیں۔

راجہ حسن اختر اور راقم

جناب راجہ حسن اختر مرحوم و مغفور سے میرے تعلقات اس ایک واقعہ سے استوار ہوئے۔ محترم سیّد حسین شہید سہروردی مرحوم حضرت علّامہؒ کی قیام گاہ پر رہائش پذیر تھے۔ ایک روز بعد نمازِ عصر کوٹھی کے لان میں جناح عوامی مسلم لیگ کا ایک اجلاس زیرِ صدارت جناب سہروردی ہوا۔ مجھے یاد ہے اس میں چودھری نصراللہ خاں مرحوم ایڈووکیٹ بھی شامل تھے۔ مشاورت اور بحث و تمحیص میں، میں بھی حصّہ لے رہا تھا۔ چند باتیں طے ہوئیں، کچھ قرار دادیں مرتب کرنا تھیں۔ سہروردی صاحب نے راجہ صاحب کو حکم دیا کہ وہ اندر جا کر ترتیب دے لیں۔ محترم راجہ صاحب کرسی

سے اُٹھے اور راقم کو ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ چنانچہ میں بھی اُن کے ساتھ ہو لیا۔ ہم کمرہ میں بیٹھ گئے تو جناب راجہ یوں گویا ہوئے۔ عزیزم مجھے آپ کے خیالات واحساسات اور میلانات و رجحانات سے حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کے افکار کی بو آرہی ہے۔ میں نے صاد کیا اور عرض گزار ہوا کہ آپ نے خوب پہچانا۔ میں اُن کا ادنیٰ سا طالب علم ہوں۔ اور ۱۹۳۸ء ہی سے (اُن کی وفات کے تین ماہ بعد) میں نے حسبِ استعدادِ علمی ان کے فرمودات کا مطالعہ شروع کر رکھا ہے۔ وہ دن اور ان کے دمِ آخریں تک ان کا رویّہ اور سلوک میرے ساتھ نہایت شفقت آمیز رہا۔ وہ میری ہی خوشنودی کے لیے متواتر تین چار سال باقاعدہ مجلسِ اقبالؒ لائل پور کے سالانہ اجلاس میں شریک ہوتے رہے۔ اور مجلسِ اقبال مرکزیہ کے اجلاس میں سٹیج پر دوسری قطار انھوں نے میرے لیے اور جتنے رفقاء میں ساتھ لاہور لے جاؤں، ریزرو کر رکھی تھی۔ واقفانِ حال خوب جانتے ہیں کہ جب میں ایک ایشوع پر مجلسِ اقبال لائلپور سے الگ ہوا (جس کا میں ہی محرک تھا) تو پھر راجہ صاحب مجلسِ اقبالؒ لائلپور کے اجلاس میں شرکت کے لیے تشریف نہیں لائے محترم خواجہ عبدالرحیم بیرسٹر ایٹ لاء سے بھی یہی قلبی رشتہ تھا۔

مجبورِ نوا

ہم تو پاکستان میں یوں رہنا چاہتے تھے کہ تعمیر و استحکام ملک و ملّت کے لیے کام ہوتا جائے۔ اور زندگی کے آخری دن حضورِ ربّ السموات والارض الحاج وزاری اور اُس کے احکام کی فرماں پذیری اور اطاعت شعاری میں گزارنے کی کوشش کی جائے۔ لیکن وائے بدنصیبی کہ گلستانِ اقبالؒ و جناحؒ میں بادِ نسیم کے بجائے بادِ صرصر کے جھونکے اس طرح آئے کہ اُن کے زہریلے اثرات سے شجرِ ملّت کی نمی و برومندی میں کمی سے کمی واقع ہوتی چلی گئی۔ آرزو تو یہ تھی کہ:

ع
ہزار گونہ سخن در دہان و لب خاموش

ایسا پر سکون، پاکیزہ ماحول اور متوازن و خوشگوار معاشرہ میسر آجاتے لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ راقم خدائے بزرگ و برتر کی قسم کھا کر کہتا ہے کہ جب ۱۹۶۲ء میں "جماعت اسلامی کا رخ کردار" شائع ہوئی تو نہ تو راجہ صاحب نے اور نہ ہی خواجہ صاحب نے اظہار ناپسندیدگی کیا۔ بلکہ میری اس کاوش کو سراہا۔ اور نہ ہی کبھی انہوں نے ذکر کیا کہ مودودی صاحب کو حضرت علامہؒ نے خط لکھ کر بلایا تھا۔ جناب مولانا عبدالستار خاں نیازی، پروفیسر مرزا عبدالحمید (مرحوم) اور نہ ہی کبھی حمید نظامی مرحوم و مغفور اور (م۔ش) نے اس کا ذکر کیا۔ حمید نظامی مرحوم کی تو تحریروں سے واضح ہے کہ ایسا نہ تھا۔ اب یہ کٹھن اور مشکل ترین فرض مجھے ہی ادا کرنا پڑا جو ضروری ہو گیا تھا۔

مردِ بزرگ دوست
راجہ حسن اختر مرحوم

روزنامہ "عوام" ۱۸ر نومبر ۱۹۶۴ء

سن یاد نہیں خواجہ عبدالرحیم صاحب حکیم الامتؒ کی کوٹھی میں قیام پذیر تھے حسین شہید سہروردی بھی انہی کے ساتھ رہتے تھے۔ وہ ان دنوں عوامی مسلم لیگ کے قائد تھے۔ آپ نے ایک روز اپنی رہائش گاہ پر عوامی مسلم لیگ کا ایک اہم اجلاس بلایا جس میں شرکت کے لیے لائلپور سے چوہدری نصراللہ خاں مرحوم ایڈووکیٹ، ملک عبدالرحمٰن، چوہدری عبدالستار بگل (ایڈووکیٹ) ملک محمد شریف صاحب راقم السطور کے علاوہ چند اور دوست بھی اجلاس میں شریک ہوئے۔ مختلف موضوعات پر بحث و تمحیص کے بعد تنظیمی امور کے بارے میں چند اصولوں پر اتفاق قرار پایا۔ قائد ملت سہروردی مرحوم نے راجہ حسن اختر (مرحوم) کو اہم قراردادوں کی ترتیب کا حکم دیا۔ مختلف اضلاع سے مختلف احباب اس اجلاس میں شریک تھے۔ راجہ صاحب نے مجھے فرمایا۔ عزیز من! میرے ساتھ آیئے تاکہ یہ قراردادیں لکھ لیں جب ہم کاغذ قلم لیکر بیٹھ گئے، تو فرمانے لگے کہ آپ کو علم ہے

کہ میں نے آپ کو کیوں چُنا ہے۔ میں نے عرض کیا، جناب مجھے علم نہیں مسکراتے ہوئے مشفقانہ و دلبرانہ انداز اور بزرگانہ لہجے میں گویا ہوئے کہ آپ کے خیالات و نظریات سے میں نے محسوس کیا ہے کہ آپ حضرت علامہؒ سے خاص طور پر متاثر ہیں مجھے آپ کے جذبوں ولولوں اور آپ کی تمناؤں اور آرزوؤں میں فکر اقبالؒ کا پرتو نظر آرہا ہے۔ میں نے عرض کیا۔ ہاں قبلہ! میں اقبالؒ کا ایک طالب علم ہوں اور پاکستانی معاشرہ کو ان خطوط و نقوش پہ ترتیب پاتا دیکھنے کے لیے متمنی و آرزو مند" اس کے بعد ہم اسی رشتہ کی بنا پر روز بروز ایک دوسرے کے قریب ہوتے گئے۔ زندگی مختلف مراحل سے گزرتی رہی۔ جماعتیں بنتی اور بگڑتی رہیں ہمارا فکر و نظر کا تعلق گہرا اور استوار ہوتا گیا۔ راجہ صاحب نے تادم آخر اپنی بزرگ دوستی اور میں نے ان کے ایک عزیز کی حیثیت کو برقرار رکھا۔ . . . .

. . . .

میں نے چند رفقاء کے ساتھ مل کر لائل پور میں مجلس اقبالؒ کی تاسیس کی میں ایک اختلاف کی بنا پر ساتھیوں سے الگ ہو گیا۔ راجہ صاحب سالانہ اجلاس کی صدارت کے لیے مسلسل چار سال تک لائل پور تشریف لاتے رہے۔ اس کے بعد راجہ صاحب کسی سالانہ اجلاس میں تشریف نہ لائے۔ . . . .

ایک واقعہ اور یاد آگیا۔ ایک دفعہ آپ مجلس اقبالؒ کی صدارت کے لیے لائلپور تشریف لائے ہوئے تھے۔ اور ان دنوں آپ خواجہ عبدالرحیم صاحب بیرسٹر اور میں بھی جناب سردار عبدالرب نشتر مرحوم کی اپیل پر دوبارہ اسی مسلم لیگ میں شامل ہو گئے تھے جس پر میاں ممتاز دولتانہ کا قبضہ تھا۔ حکیم ملک محمد شریف صاحب شہری مسلم لیگ کے صدر تھے۔ حکیم صاحب نے آپ کو مسلم لیگی کارکنوں سے خطاب کے لیے مسلم لیگ ہال منٹگمری بازار میں دعوت دی۔ راجہ صاحب ہال میں تشریف لائے تو ملک صاحب نے تعارفی الفاظ میں فرمایا کہ

"ہم راجہ صاحب کے شکر گزار ہیں کہ وہ ہماری دعوت پر لائلپور تشریف لائے"
راجہ صاحب نے جب اپنے فرمودات کا آغاز کیا تو سب سے پہلے جو بات بھی وہ یہ تھی کہ حکیم صاحب زیادتی فرما گئے "حقیقت یہ ہے کہ میں لائل پور میں جن کی دعوت پر حاضر ہوا ہوں وہ حبیب چودھری صاحب ہیں۔"

ایک خط میں لکھتے ہیں :-

برادرم سلام علیکم !

مجھے شیخ ظفر حسین صاحب نے بتایا ہے کہ فتح علی مبارک علی قوالوں نے پچھلے سال لائلپور میں "اقبال ڈے" کے موقعہ پر جو شاندار قوالی کی، اس کا ٹیپ ریکارڈ کسی مقامی افسر نے لیا ہے میں اسے اپنے ٹیپ ریکارڈ پر لانا چاہتا ہوں پس اس افسر کا پتہ لکھیں۔

دعا گو
حسن اختر ۲۴/۴/۶۴

صدر دی پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن

جناب مرزا عبدالحمید صدر دی پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن ہفت روزہ "وفاق" میں "تحریک پاکستان اور طلبہ" کے عنوان سے رقمطراز ہیں :-

" میں نے پندرہ جون ۱۹۴۶ء سے ۳۰ جون تک اپنے پرپرزے درست کئے جو طلبہ اور نمازی میرے غمگسار تھے اور جو احباب مجھے قریب سے دیکھتے سمجھتے اور اس ذمہ کا احساس کرنے میں میرے دکھ کے ساتھی بنے وہ ابتداءً بہت کم لوگ تھے ان میں چوہدری نصراللہ خاں ایڈووکیٹ مرحوم کو نہیں بھول سکتا جو خاموش نگاہوں اور درد بھرے دل کے ساتھ اس "بچوں کے کھیل" کو قومی معرکہ بنانے میں میرے دستِ راست بن گئے۔ میرے درس کے طلبہ ورفقاء میں سے حافظ نذیر احمد (جو اسلامیہ کالج لاہور میں پروفیسر رہے ہیں) حبیب چوہدری، ڈاکٹر محمد شریف

عبدالستار اور کچھ دوسرے رفقاء ابتدائی کام کے لیے آگے بڑھے۔ اشفاق احمد محمد صادق، سید محمد صغر اور کچھ دوسرے طلبہ بھی آملے۔ افسوس ہے کہ مجھے سب نام زبانی یاد نہیں۔ اگر کچھ عزیز اور احباب اس مضمون کو پڑھیں تو مقدمۃ الجیش کے سب نام یا زیادہ سے زیادہ ریکارڈ پر آنے ضروری ہیں۔

پروفیسر مرزا عبدالحمید اور مودودی

جناب پروفیسر مرزا عبدالحمید مودودی صاحب کے کالج چھوڑنے کے بعد اسلامیہ کالج لاہور میں اسلامیات کے پروفیسر، آسٹریلیا جامع مسجد ریلوے روڈ کے خطیب اور فیڈریشن کے صدر تھے۔ اس آتش ریز، آتش نوا اور درد و احساس پیدا کر دینے والے مقرر کی آتش نوائی اور احساس خیزی نے تحریک قیام پاکستان میں زندگی پیدا کر دی تھی۔ ان کے زیر اہتمام اسلامیہ کالج کی گراؤنڈ میں جو کانفرنس منعقد ہوئی تھی، اُن کا خطبہ اور خان عبدالستار خان نیازی کی تقریر سنکر حضرت قائد اعظمؒ نے بہت تعریف کی تھی۔ سید محمد قاسم رضوی مرحوم سابق کمشنر، حکیم آفتاب قرشی اور احمد سعید کرمانی کے علاوہ ان کے سینکڑوں آتش بجاں شاگرد تھے۔ جو تحریک قیام پاکستان کے کارکنوں کی حیثیت سے قائد اعظمؒ کا پیغام ملک کے کونے کونے میں پھیلانے کے لیے تمام گوشوں میں پھیل گئے تھے۔

مودودی صاحب نے اسلامیہ کالج بھی دارالاسلام کی طرح اُسی وجہ سے چھوڑا یا یوں سمجھئے کہ وہ وہاں گوارا نہ کئے گئے، تو ان کے بعد مرزا صاحب مرحوم و مغفور نے نقیب ملت بن کر اقبالؒ و جناحؒ کے پیغام کو پنجاب کے کونے کونے میں پہنچایا۔ اور سندھ کے ریگزار بھی ان کے شاگردوں اور رفقاء کے پاؤں سے آشنا ہوئے دور دراز فضاؤں اور موافق و ناموافق ہواؤں میں انہوں نے پیغام حق سنایا۔

(چودھری حبیب احمد)

اوراق گم گشتہ

"اوراق گم گشتہ" کے نام سے جناب پروفیسر رحیم بخش شاہین ایم اے نے حضرت حکیم الامت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کی غیر مدون تحریریں شائع کی ہیں پبلشر اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ لاہور ہے۔ اس کتاب کے صفحہ ۸۱ پر "علامہ اقبالؒ اور مولانا مودودی" کے عنوان سے لکھتے ہیں۔

علامہ اقبالؒ کے ایک معروف عقیدت مند اور مقرب بارگاہ سید نذیر نیازی کی یہ تحریر ہفت روزہ "ایشیا" لاہور کے اقبال نمبر بابت ۲۰ اپریل ۱۹۶۹ء میں "علامہ اقبالؒ کی دعوت پر مولانا مودودی پنجاب میں" کے زیر عنوان شائع ہوئی تھی

۱۹۳۹ء میں حضرت علامہ اقبالؒ کی وفات سے غالباً چند ہفتے پہلے چودھری نیاز علی صاحب جاوید منزل (میورروڈ لاہور) تشریف لائے۔ علامہ محمد اسد (سابق لیوپولڈ ولیس) بھی ان کے ساتھ تھے۔ چودھری صاحب نے علامہ اقبالؒ کی مزاج پرسی کے بعد عرض کیا کہ انہوں نے قلعہ جمال پور میں ایک وقف دارالاسلام کے نام سے قائم کیا ہے تاکہ وہاں مسلمانوں کی اصلاح و تربیت اور دینی تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ ان کی خواہش تھی کہ حضرت علامہ اس کام میں ان کی راہ نمائی فرمائیں اور جیسا ان کا مشورہ ہوا اس کے مطابق بعض علمائے دین کو دارالسلام آنے کی دعوت دی جائے۔

حضرتِ علامہ نے فرمایا کہ دینی مدارس کی تو کوئی کمی نہیں، بہتر ہوگا چوہدری صاحب اس وقف سے کوئی اور کام لیں۔

چودھری صاحب نے عرض کیا کہ آپ ہی فرمائیے۔ اس وقف سے کیا کام لینا چاہیے:
حضرت علامہ نے فرمایا۔

" میرے نزدیک اس وقت مسلمانوں کی سب سے بڑی ضرورت فقہ اسلامی کی تشکیلِ جدید ہے۔ بحالتِ موجودہ ہم روز بروز اسلام سے دور ہٹ رہے ہیں

اور اس کی وجہ ہیں وہ سیاسی و اجتماعی مسائل جنہوں نے موجودہ زمانے میں ایک خاص شکل اختیار کر لی ہے ۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ علماء ان مسائل کو سمجھیں اور حالات کو اسلامی شرائع کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کریں"

اس پر سوال پیدا ہوا کہ اکابر علماء کا تو دارالاسلام آنا محال نظر آتا ہے ، وہ اپنے اپنے مراکز میں بیٹھے دینی خدمات سرانجام دے رہے ہیں ۔ حضرت علامہ رح نے کہا کہ یہ ٹھیک ہے مگر اس کے باوجود ملک میں ایسے پڑھے لکھے نوجوانوں کی کمی نہیں ، جن کے دل میں اسلام کا درد ہے ۔ اور جو مسائل حاضرہ سے بھی بخوبی واقفیت رکھتے ہیں ۔ ان میں نئے اور پرانے تعلیم یافتہ سبھی شامل ہیں ، ضرورت ان کو جمع کرنے کی ہے ۔ پھر حضرت علامہ رح نے محمد اسد صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چوہدری نیاز صاحب سے کہا دیکھیے یہ آپ کے سامنے بیٹھے ہیں ، کیوں نہ یہ اس کام کو ہاتھ میں لیں ۔ چودھری صاحب نے کہ اسد صاحب ضرور اس کام میں میرا ہاتھ بٹائیں گے ، مگر اس کام کے لیے تو ایک جماعت کی ضرورت ہے ! حضرت علامہ رح نے فرمایا ، آپ ٹھیک کہتے ہیں جہاں تک کچھ اور لوگوں کو جمع کرنے کا تعلق ہے شائد میں کچھ نام تجویز کر سکوں ۔ سردست ایک نام میرے ذہن میں آتا ہے حیدرآباد سے ترجمان القرآن کے نام سے ایک بڑا اچھا رسالہ نکل رہا ہے ۔ مودودی صاحب اس کے ایڈیٹر ہیں ۔ میں نے ان کے مضامین پڑھے ہیں ۔ دین کے ساتھ ساتھ مسائل حاضرہ پر بھی نظر رکھتے ہیں ان کی کتاب الجہاد فی الاسلام مجھے بہت پسند آئی ہے ۔ آپ کیوں نہ انہیں دارالاسلام آنے کی دعوت دیں میرا خیال ہے کہ وہ دعوت قبول کر لیں گے ۔ اس پر سوال پیدا ہوا کہ مودودی کو دارالاسلام آنے کی دعوت کون دے ۔ طے پایا کہ اس پوری گفتگو کے حوالے سے میں ان کی خدمت میں علامہ کی طرف سے مفصل لکھوں اور دریافت کروں کہ وہ دکن سے دارالسلام آسکتے ہیں یا نہیں ۔ چنانچہ میں نے مودودی صاحب کی خدمت میں مفصل خط لکھا جس کے جواب میں انہوں نے دارالاسلام آنے پر آمادگی ظاہر فرمائی ، مگر اس

کے ساتھ اپنی بعض مجبوریوں اور ذمہ داریوں کا ذکر بھی کیا جن کی تفصیل چودھری نیاز علی صاحب کو پہنچا دی گئی۔ کچھ دنوں کے بعد چودھری صاحب پھر لاہور تشریف لائے تو معلوم ہوا کہ انہوں نے مودودی صاحب کے دارالاسلام آنے کے لیے جملہ انتظامات کر دیئے ہیں۔ حضرت علامہ نے فرمایا یہ آپ نے بہت اچھا کیا۔ کام کی ابتدا کر دیجئے۔ جیسے جیسے کام بڑھے گا اور لوگ بھی شریک ہوتے جائیں گے۔

مودودی صاحب کا خط چونکہ میرے نام تھا، لہٰذا چودھری صاحب کے ارشادات کے مطابق پھر میں نے انہیں مفصل خط لکھا جس کے جواب میں انہوں نے فرمایا کہ میں رختِ سفر باندھ چکا ہوں، چند ایک معاملات ہیں، ان کے تصفیے کے بعد دارالاسلام آنے میں کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہے گی۔ میں ایک طرح سے مودودی صاحب کی آمد کا منتظر تھا۔ کیونکہ میرا خیال تھا اور شاید انہوں نے اپنے خط میں اشارہ بھی کیا تھا کہ وہ اول لاہور آئیں گے پھر دارالاسلام کا رخ کریں گے۔ لیکن ہوا یہ کہ مودودی صاحب حیدر آباد سے سیدھے دارالاسلام پہنچے، شاید ۱۸ یا ۱۹ اپریل کو، ۲۱ اپریل کو حضرت علامہؒ کا انتقال ہو گیا اور مودودی صاحب کی یہ خواہش کہ ان سے مل کر پیشِ نظر کام کے بارے میں مفصل گفتگو کی جائے، پوری نہ ہو سکی چنانچہ اگلے روز جو انہوں نے ایک طرح تعزیتی خط لکھا، ہمیں اس امر پر دلی افسوس کا اظہار بھی کیا۔

میرے خیال میں یہ سب باتیں مولانا مودودی کے ذہن میں ہوں گی اور وہ ان کی تصدیق فرمائیں گے۔ میری زیرِ طبع کتاب " اقبالؒ کے حضور میں " میں یہ تمام واقعات بہ تفصیل درج ہیں نیز اس تاریخی خط و کتابت کا پورا ریکارڈ میرے پاس بحفاظت موجود ہے۔

نوجوان ادیب اور مشہور شاعر جناب عابد نظامی نے ہفت روزہ " ایشیا " بابت

۱۹-اپریل ۱۹۷۰ء میں "کیا مولانا مودودی علامہ اقبالؒ کی دعوت پر پنجاب آئے تھے؟ کے زیرِ عنوان دادِ تحقیق دی۔ اس سے علامہ اقبالؒ کی تعلیمی و تربیتی کوششوں پر روشنی پڑتی ہے۔

گزشتہ دنوں لاہور اور کراچی کے اخبارات میں یہ مسئلہ موضوعِ بحث بنا رہا کہ مولانا مودودی کو علامہ اقبال مرحوم نے پنجاب آنے کی دعوت دی تھی یا نہیں۔ لاہور کے ایک اشتراکی مجلّے نے بڑی تحدّی سے اس واقعہ کا انکار کیا اور ظاہر کیا کہ یہ سارا افسانہ پراپیگنڈہ کے لیے کھڑا کیا گیا ہے۔ چنانچہ ضرورت محسوس ہوئی کہ اس مسئلے پر علمی اور تحقیقی گفتگو کی جائے تاکہ قارئین اس بحث سے پوری واقفیت حاصل کر سکیں۔

یہ ۱۹۳۷ء کی بات ہے۔ مولانا مناظر احسن گیلانی نے دکن یونیورسٹی میں دینیات کی تدریس کے لیے مولانا مودودی کا نام پیش کیا۔ ان کا خیال تھا کہ کالج کی نئی نسل کو مذہب کی تعلیم جس طرح مولانا مودودی دے سکتے ہیں کوئی اور شخص نہیں دے سکتا۔ چنانچہ انہوں نے سر اکبر حیدری سے مشورت کے بعد مولانا کو پروفیسری قبول کرنے کی دعوت دی لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہوگی کہ مولانا کی طبیعت ملازمت کی تنگنائیوں میں گھرنے اور تنخواہ دارانہ کردار ادا کرنے سے کچھ بُعد رکھتی ہے اُن کے سامنے جو کام تھا وہ ذہن و ضمیر کی آزادی ہی میں کیا جا سکتا تھا۔

یونیورسٹی کی طرف سے دوبارہ درخواست کی گئی کہ اگر آپ ہمہ وقت نہ پڑھا سکتے ہوں تو جز وقتی طور پر ہی یہ خدمت انجام دیں۔ مگر مولانا مودودی نے جز وقتی ملازمت بھی قبول نہ کی۔۔۔۔۔

یہ وہ زمانہ تھا جب مولانا حیدرآباد سے ترجمان القرآن نکالتے تھے۔ ترجمان کی مالی حالت اچھی نہ تھی۔ مولانا کو ہر پرچے کی اشاعت پر گرہ سے رقم لگانی پڑتی تھی۔ ایسے وقت میں یونیورسٹی کی پروفیسری کو ٹھکرا دینا بڑے دل گردے کا کام تھا۔ مولانا مودودی نے یہ قربانی عظیم تر ملّی مفاد کی خاطر دی۔ ان دنوں وہ ترجمان القرآن کے ذریعے سیکولر اسٹیٹ اور متحدہ قومیت وغیرہ نظریات کے خلاف جہاد کر رہے تھے جس کو علامہ اقبالؒ مرحوم خاص طور پر دلچسپی سے پڑھ رہے تھے۔ چنانچہ مولانا مودودی کی اپنی تحریریں

سے متاثر ہو کر علامہ اقبالؒ نے انہیں فقہ اسلامی پر لکھنے کی دعوت دی مگر مولانا مودودی نے لکھا کہ وہ سردست جس کام میں مشغول ہیں ادھر سے توجہ ہٹانا نہیں چاہتے (بحوالہ مکتوب چوہدری نیاز علی خاں بنام راقم مورخہ ۴۔جولائی ۱۹۶۹ء)
مولانا مودودی نے حیدر آباد کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنایا مگر علامہ مرحوم کا خیال تھا کہ مسلمانوں کی سیاسی بیداری کے لیے پنجاب کو مرکز بنانا زیادہ مفید ہے چنانچہ قائد اعظمؒ کے نام ان کے خطوط پڑھنے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ وہ قائد اعظمؒ پر بھی زور دیتے تھے کہ وہ اپنی سرگرمیوں کا مرکز پنجاب کو بنائیں۔ علامہ اقبالؒ کی رائے تھی کہ مولانا مودودی جو دعوت پیش کر رہے ہیں اس کا کسی ریاست سے اٹھنا سود مند نہیں کیونکہ انگریز کسی وقت بھی والیٔ ریاست کے کندھے پر بندوق رکھ کر چلا سکتا ہے اس لیے وہ غلامی در غلامی کے ماحول سے نکل کر دکن سے پنجاب آنے کا ماجرا ایک دفعہ مولانا مودودی نے خود بیان کیا تھا جو سیارہ مئی ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا تھا۔ مولانا فرماتے ہیں۔

"علامہ اقبالؒ نے خواہش ظاہر کی تھی کہ میں پنجاب چلا آؤں، زیادہ تفصیل نہیں لکھی تھی۔ اس وقت تو میں نہیں سمجھ سکا تھا کہ ان کی مصلحت کیا ہے۔ البتہ ۱۹۳۷ء کے وسط تک پہنچ کر مجھے خود یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ جنوبی ہند کو چھوڑ کر مجھے شمالی ہند کی طرف رخ کرنا چاہیئے۔ اسی زمانے میں چوہدری نیاز علی صاحب نے اصرار کیا کہ میں پنجاب کا سفر کروں اور کم از کم ان کے اس مقام کو دیکھ لوں جو انہوں نے ایک ادارہ قائم کرنے کے لیے وقف کیا تھا۔ میں خود بھی ضرورت محسوس کر رہا تھا کہ شمالی ہند کا سفر کر کے کسی ایسی جگہ کا انتخاب کروں جہاں اپنے عزائم کے مطابق مجھے کام کرنے کا موقع ملے۔ اسی خیال سے میں نے شاید اگست کا آخر تھا، ۳۷ء میں پنجاب کا سفر کیا اور جالندھر ہوتے ہوئے پٹھانکوٹ پہنچا۔ اس سفر میں علامہ اقبال مرحوم سے تفصیلی گفتگو ہوئی اور انہوں نے مجھے فرمایا کہ چوہدری نیاز علی صاحب نے جو جگہ وقف کی ہے، میں اسی کا انتخاب کروں اور وہ ادارہ قائم

کروں جس کا ذکر میں نے چودھری صاحب کے نام اپنے خط میں لکھا تھا۔"

جناب سید نذیر نیازی جو "مجلس اقبال" کے "ساغر کش" ہیں نے ایک مضمون میں اس مسئلے پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ آپ اس مضمون کا ایک اقتباس پڑھ لیجئے۔

"۱۹۳۷ء میں حضرت اقبالؒ کی وفات سے غالباً چند ہفتے پہلے چوہدری نیاز علی صاحب جاوید منزل (میو روڈ لاہور) تشریف لائے۔ علامہ محمد اسد (سابق لیوپولڈ دایس) بھی ان کے ساتھ تھے۔ چودھری صاحب نے حضرت علامہ کی مزاج پرسی کے بعد عرض کیا کہ انہوں نے قلعہ جمال پور میں ایک وقف دارالاسلام کے نام سے قائم کیا ہے۔ تاکہ وہاں مسلمانوں کی اصلاح و تربیت اور دینی تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ ان کی خواہش تھی کہ حضرت علامہ اس کام میں ان کی رہنمائی فرمائیں اور جیسا ان کا مشورہ ہو اس کے مطابق بعض علمائے دین کو دارالاسلام آنے کی دعوت دی جائے . . . . . اس پر سوال پیدا ہوا کہ اکابر علماء کا تو دارالاسلام آنا محال نظر آتا ہے۔ وہ اپنے اپنے مراکز میں بیٹھے دینی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ حضرت علامہؒ نے کہا یہ ٹھیک ہے مگر اس کے باوجود ملک میں ایسے پڑھے لکھے نوجوانوں کی کمی نہیں جن کے دل میں اسلام کا درد ہے۔"

نوٹ :۔ وہی خط جو پہلے درج کیا جا چکا ہے۔ (چودھری حبیب احمد)

علامہ اقبالؒ کی دعوت پر مولانا کا پنجاب میں تشریف لانا ایک امر واقعہ ہے۔ ہر چند یہ کوئی ایسا واقعہ نہیں جس سے مولانا مودودی کی عظمت میں غیر معمولی اضافہ ہو۔ یا اسے پروپیگنڈہ کا ذریعہ بنایا جائے تاہم اس واقعے کی ایک تاریخی حیثیت ضرور ہے۔ ارباب بصیرت سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ مولانا مودودی اور علامہ اقبال مرحوم کی تعلیمات میں غایت درجہ مطابقت پائی جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان دونوں نے مسلمانوں کے روحانی اور سیاسی امراض کے علاج کے لیے جو نسخہ تجویز فرمایا وہ ایک ہی تھا۔ کہ اسلام بحیثیت مکمل دین و نظام حیات ہے۔ علامہ اقبال مرحوم نے جن فکر کی شعاعیں ماحول میں بکھیری تھیں اور جس نے لوگوں

کے جذبات میں ایک ہلچل برپا کر دی تھی وہ مستقبل میں ظہور پذیر ہونے والی تحریکِ اسلامی کا پیش خیمہ تھی۔ خود علامہ مرحوم کی زبردست خواہش تھی کہ اس تحریک کے لیے کوئی نہ کوئی شخصیت ایک پیغامِ انقلاب لے کر اُٹھے چنانچہ اس مقصد کے لیے انہوں نے مولانا مودودی کو منتخب کیا۔ ممتاز احمد برماہی "فنون" لاہور میں لکھتے ہیں۔

"اقبالؒ کی جذباتی اپیل سے قائداعظمؒ نے اور ان کی فکری تحریک سے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے احیائے اسلام کے کام کو آگے بڑھایا۔"

علامہ اقبال مرحوم کے فرزند ڈاکٹر جاوید اقبال سے ایک اخبار نویس نے پوچھا کہ کیا آپ کو علم ہے کہ علامہؒ نے مولانا مودودی کو پنجاب آنے کی دعوت دی تھی؟

ڈاکٹر جاوید اقبال نے کہا

"مجھے ذاتی طور پر تو اس دعوت کا کچھ علم نہیں، لیکن علامہ کے قریبی دوستوں سے اس کا تذکرہ سنا ہے۔ یقیناً علامہ نے مولانا مودودی کو پنجاب میں کام کرنے کے لیے مدعو کیا ہوگا۔ یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ علامہ کی دور بین نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ بس ہوا چاہتا ہے اور مسلم اکثریت کے علاقوں میں انہوں نے جس اسلامی ریاست کا خواب دیکھا ہے، اس کے پورے ہونے میں چند برسوں کا وقفہ حائل ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ یہ ریاست جیسے ہی وجود میں آئے اس کے مرکز میں ایسے لوگ موجود ہوں جو اسلام کو سیاسی و تمدنی قوت کی حیثیت سے فی الفور آگے بڑھا دیں۔ وہ لاہور کو تو خاص طور پر اسلامی تمدن کا مرکز بنانا چاہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے قائدِ اعظمؒ کو بار بار اپنے مکاتیب میں تاکید کی تھی کہ وہ مسلمانوں سے متعلق تاریخی اہمیت کے فیصلے شہر لاہور میں کیا کریں۔ مولانا مودودی چونکہ اس زمانے میں اسلام کو ایک تحریکی قوت کی حیثیت سے لیکر اٹھے تھے، اس لیے علامہ کی نظر فوراً ان کی طرف

گئی ہوگی اور اُن سے کہا ہوگا کہ اگر آپ یہ کام کرنا چاہتے ہیں تو اس کا صحیح مقام پنجاب ہے۔"

"ڈ ایشیا" اقبال نمبر، ۱۷ اپریل ۱۹۶۹ء

علامہ اقبالؒ کی دعوت پر پنجاب میں مولانا کی آمد کے بارے میں میاں محمد شفیع (م ش) کی یہ تحریر بڑی اہمیت رکھتی ہے کیونکہ میاں صاحب کا شمار علامہ مرحوم کے ذاتی دوستوں میں ہوتا ہے خصوصاً علامہ کی آخری زندگی میں میاں صاحب کا اٹھنا بیٹھنا ان کی خدمت میں زیادہ رہا۔ میاں صاحب لکھتے ہیں:-

"مولانا مودودی درحقیقت نیشنلسٹ مسلمانوں کی ضد تھے اور میں پوری ذمہ داری سے عرض کرتا ہوں کہ میں نے حضرت علامہ اقبالؒ کی زبان سے کم و بیش ہر ہفتہ کے الفاظ سنے تھے کہ مودودی کانگرسی مسلمانوں کی خبر لیں گے۔"

جہاں علامہ اقبالؒ بالکل واضح طور پر آزاد اور مولانا مدنی کے نقاد تھے، وہاں وہ مولانا مودودی کا ماہنامہ ترجمان القرآن جستہ جستہ مقامات سے پڑھوا کر سننے کے عادی تھے۔ اور اس امر کے متعلق تو میں سو فیصد ذمہ داری سے یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ علامہ مرحوم نے مولانا مودودی کو ایک خط کے ذریعے حیدر آباد دکن کی بجائے پنجاب کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنانے کی دعوت دی تھی۔ بلکہ وہ خط انہوں نے مجھ سے ہی لکھوایا تھا"

یہاں یہ سوال ذہنوں میں ابھر سکتا ہے کہ ڈاکٹر سید نذیر نیازی صاحب فرماتے ہیں کہ میں نے مودودی صاحب کی خدمت میں مفصل خط لکھا جس کے جواب میں انہوں نے دارالاسلام آنے پر آمادگی ظاہر فرمائی اور م ش کہتے ہیں کہ وہ خط انہوں نے (علامہ اقبالؒ نے) مجھ سے ہی لکھوایا تھا، ان دونوں تحریروں میں تضاد کیوں ہے؟ جب یہ دونوں (بظاہر متضاد) تحریریں میری نظر سے گزریں تو مجھے خیال آیا کہ ممکن ہے علامہ اقبالؒ مولانا مودودی کو پنجاب بلانے کے معاملے میں زیادہ دلچسپی

لے م ش (میاں محمد شفیع) صاحب سے یا سید نذیر نیازی صاحب سے کسی کی ما بینی (م ت

لیتے ہوں اور انہوں نے ڈاکٹر نذیر نیازی کو بھی خط لکھنے کا حکم دیا ہو اور ایک خط میاں محمد شفیع (م ش) سے بھی لکھوایا ہو۔ اس خیال پر میں نے مولانا مودودی کی خدمت میں خط بھیجا، اور استفسار کیا کہ کیا علامہ اقبال ؒ سے آپ کی خط و کتابت ایک سے زائد مرتبہ ہوئی تھی؟

مولانا نے میرے خط کے جواب میں جو مکتوب بھجوایا وہ درج ذیل ہے۔

"آپ کا عنایت نامہ ملا، علامہ اقبال مرحوم سے میری خط و کتابت ایک سے زائد مرتبہ ہوئی تھی۔ وہ مراسلت میرے پاس محفوظ تھی مگر مشرقی پنجاب کے ہنگاموں میں جب پٹھانکوٹ سے نکلنا پڑا۔ تو میری بہت سی قیمتی کتابوں اور اہم ریکارڈ کے ساتھ ساتھ یہ مراسلت بھی وہیں رہ گئی۔ آپ جوہر آباد میں چودھری نیاز علی خاں صاحب کو لکھ کر دریافت کریں۔ شاید وہ دارالاسلام کے کاغذات پٹھانکوٹ سے لانے میں کامیاب ہوئے ہوں اور ان کے پاس اس مراسلت کی کچھ نقلیں محفوظ ہوں۔"

مولانا مودودی کے اس مکتوب کے مطابق میں نے جوہر آباد میں چودھری نیاز علی خاں صاحب کو خط لکھا۔ میرے عریضے کے جواب میں انہوں نے جو مکتوب بھجوایا۔ اس کے اہم حصے درج ذیل ہیں۔

"آپ نے اپنے خط میں صرف اس سوال پر معلومات حاصل کرنی چاہی ہیں کہ آیا مولانا مودودی صاحب پنجاب میں حضرت علامہ اقبال مرحوم کے ایماء پر تشریف لائے تھے؟ اس کے متعلق جو کچھ مجھے یاد ہے وہ عرض کرتا ہوں میں ایک دفعہ حضرت علامہ ؒ کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے فرمایا کہ ہم نے آپ کے ادارہ کے لیے ایک عالم تلاش کر لیا ہے۔ میں نے پوچھا کون؟ تو انہوں نے فرمایا کہ مولانا سید مودودی صاحب جو آج کل حیدر آباد میں مقیم ہیں۔ ان دنوں سید صاحب کی ترجمان القرآن کی وجہ سے شہرت ہو چکی تھی۔ میرا خیال ہے کہ حضرت علامہ ایک کتاب فقہ اسلامی پر لکھنا چاہتے تھے۔ اور اس کے لیے ان کو ایک اچھے صاحب قلم عالم کی ضرورت تھی مگر ان کے کہنے پر مولانا موصوف نے انکار کر دیا تھا کہ وہ ایک کام میں لگ چکے ہیں

اسے نہیں چھوڑ سکتے۔ دوسرے خط میں میں نے ادارہ میں آنے کے لیے لکھا تھا۔ ادھر میں نے ایک خط حضرت مولانا کو لکھا تھا کہ ہم پٹھانکوٹ کے قریب ایک دینی ادارہ اسی قسم کا جاری کرنا چاہتے ہیں آپ مجھے کسی اچھے عالم کا پتہ دیں۔ سید صاحب نے کئی موزوں علماء کے پتے لکھے اور فرمایا کہ میں ان کی طرف رجوع کروں۔ اس پر میں نے ان کو لکھا کہ وہ خود ہی اس خدمت کو کیوں قبول نہیں فرماتے۔ اس کا انہوں نے مجھے بھی وہی جواب دیا جو حضرت علامہ کو دے چکے تھے۔ اور میں نے یہ قصہ حضرت علامہ کو سُنایا۔

کچھ عرصے کے بعد نیشنلسٹ جمعیت العلماء اسلام ہند اور کانگریس کی ایک میٹنگ دہلی میں بنام یونیٹی کانفرنس منعقد ہوئی جس کے بعد انہوں نے ترجمان القرآن میں وہ سلسلہ مضامین لکھنا شروع کیا جو بعد میں "مسلمان اور سیاسی کشمکش" کے نام سے موسوم ہو کر کتابی صورت میں شائع ہوا۔ یہ مضامین پڑھ کر میں نے حضرت مولانا صاحب کو لکھا کہ اگر آپ کے یہی خیالات ہیں اور جیسا کہ معلوم ہوتا ہے آپ اس پر کچھ اقدام کرنا چاہتے ہیں تو پھر آپ حیدر آباد میں کیوں بیٹھے ہیں۔ علامہ اقبالؒ کا مشورہ قبول کیجیے اور پنجاب میں چلے آیئے۔ اس کا انہوں نے مجھے جواب دیا کہ ہاں، میرا خود بھی یہی خیال ہو رہا ہے کہ میں پنجاب یا کسی جگہ بالائی ہندوستان کے کسی مقام پر منتقل ہو جاؤں۔ اس کے ساتھ انہوں نے مجھے یہ بھی لکھا کہ وہ دہلی آ رہے ہیں، میں ان کو وہاں آ کر ملوں، وہ مجھ سے کچھ مشورہ کریں گے۔ چنانچہ ان کے دہلی تشریف لانے کی اطلاع ملنے پر میں اور ایک مشہور مجاہد ملک مستری محمد صدیق صاحب دہلی پہنچے اور ایک دوست کے مکان پر ٹھہر کر حضرت مولانا سے ملتے رہے۔ آخر یہ فیصلہ ہوا کہ مولانا صاحب خود تشریف لا کر ہمارے پٹھانکوٹ والے ادارہ کو دیکھیں۔ چنانچہ وہ تشریف لائے اور چند روز میرے پاس ٹھہرے۔ اس کے بعد میں مولانا صاحب کو لاہور لے آیا۔ اور اپنے قدیم بزرگ مہربان کے ہاں ٹھہر کر حضرت علامہؒ کے ساتھ مولانا صاحب کی ملاقاتوں کا سلسلہ شروع کرایا۔ ہم تین روز لاہور ٹھہرے اور تینوں

روز مولانا کی طویل ملاقاتیں حضرت علامہ سے ہوتی رہیں۔ لاہور سے واپسی پر حضرت مولانا صاحب نے مجھے فرمایا کہ "چند ... میں آپ کے ادارہ میں آجاتا ہوں میں نے کہا کہ الحمدللہ"

(محررہ ۴ جولائی ۱۹۶۹ء)

میں اس خط پر کوئی تبصرہ نہیں کرونگا۔ ڈاکٹر سید نذیر نیازی، میاں محمد شفیع اور سب سے بڑھکر چوہدری نیاز علی خاں صاحب کے اس خط سے یہ مسئلہ پوری طرح حل ہو جاتا ہے۔

اب آخر میں مولانا مودودی صاحب کے وہ تاثرات ملاحظہ فرمائیے۔ جو انہوں نے پنجاب آنے پر "ترجمان القرآن" میں تحریر فرمائے۔ ان تاثرات سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ علامہ اقبال مرحوم مولانا مودودی کو کیوں دکن سے پنجاب بلانا چاہتے تھے۔

مولانا لکھتے ہیں:۔

"پنجاب میں آکر میں نے اچانک محسوس کیا کہ قبرستان سے منتقل ہوکر زندہ انسانوں کی بستی میں آگیا ہوں جو مجھ سے میرا مقصد، پروگرام، لائحہ عمل اور طریق کار پوچھنے کی ضرورت محسوس کرتے اور اطمینان حاصل ہونے پر تعاون کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہیں۔"

پنجاب کی سرزمین کو مرکز بنا کر مولانا مودودی نے احیائے اسلام کی جو شاندار تحریک چلائی اور وہ جس طرح بار آور ہوئی، اس کے اجر میں علامہ مرحوم کا بھی بہت بڑا حصہ ہے۔

اقبالؒ میرا روحانی سہارا

اوراقِ گم گشتہ
از رحیم بخش شاہین ایم اے
صفحہ ۸۱ تا ۹۲

مشہور ادبی مجلہ ماہنامہ "سیارہ" لاہور کے اقبال نمبر مئی ۱۹۶۳ء میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کا ایک انٹرویو شائع ہوا جس میں انہوں نے علامہ اقبال کے بارے میں اپنی یادوں کا ذکر کیا۔ اس انٹرویو کو جناب غلام حسین اظہر نے قلمبند کیا انٹرویو حسبِ ذیل ہے۔

ب اقبالؒ میرا روحانی سہارا تھا...... (لہ مادّی سہارا لکھا تھا (مرتب)

پہ چند سال ہوئے ترجمان القرآن کی ورق گردانی کرتے ہوئے یہ الفاظ میری نظر سے گزرے۔ ان الفاظ میں مجھے جذبات و احساسات کی شدت محسوس ہوئی۔ ان الفاظ کے پردہ میں کیا المیہ کارفرما ہے۔ یہ جاننے کی چیز تھی۔ بارہا خواہش پیدا ہوئی کہ مولانا سے اس موضوع پر گفتگو کی جائے۔ لیکن ہر بار مولانا کی گوناگوں مصروفیات کا آتے ہی یہ خواہش دب کے رہ گئی۔ اب کے "سیارہ" کے اقبال نمبر کا مرحلہ آیا۔ تو میں نے اس موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے مولانا سے اس دیرینہ خواہش کا اظہار کیا۔ مولانا نے کسی شام کو حاضر ہونے کو کہا چنانچہ میں ۱۴ اپریل کی شام کو مولانا کے ہاں حاضر ہوا۔ مولانا سے گفتگو کا ماحصل پیش خدمت ہے۔

"مولانا! آپ نے ایک مرتبہ لکھا تھا کہ اقبال میرا روحانی سہارا تھا۔ اس کے پس منظر میں کیا المیہ کارفرما ہے؟"

"ڈاکٹر صاحب مرحوم نے مجھے پٹھانکوٹ میں آنے کو لکھا تھا اور مجھ سے وعدہ فرمایا تھا کہ اگر تم اس جگہ آکر بیٹھ جاؤ تو میں بھی سال میں چھ مہینے وہاں گزارا کروں گا۔ اس میں ایک ایسی جاذبیت تھی جس کی وجہ سے میں نے فوراً ہی اس تجویز کو قبول کر لیا۔ اور حیدرآباد سے پٹھانکوٹ چلا آیا۔ مگر اس ساری داستان کا المیہ یہ ہے کہ مارچ میں، میں پٹھانکوٹ منتقل ہوا۔ اور اپریل میں ڈاکٹر صاحب مرحوم کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت مجھ پر اس حادثہ کا شدید اثر تھا۔ اسی احساس نے مجھے یہ الفاظ لکھنے پر مجبور کیا تھا۔"

"مولانا آپ کے اور علامہ اقبالؒ کے درمیان اس سلسلہ میں جو مراسلت یا گفتگو ہوئی اسے اگر تفصیلاً بتا دیں تو مفید ہو گا۔"

"وہ خطوط تو میرے پاس نہیں ہیں، میں دوسری تفصیلات بتائے دیتا ہوں۔"

مولانا نے اپنے مخصوص دھیمے دھیمے انداز میں کہنا شروع کیا۔

چوہدری نیاز علی صاحب نے دین کی خدمت کے پیش نظر ایک ادارہ قائم کرنے کے لیے زمین وقف کی۔ اور عمارات بنانی شروع کیں۔ لیکن اُن کے سامنے یہ متعین نہ تھا کہ ادارہ کس قسم کا ہو۔ انہوں نے مجھ سے مشورہ طلب کیا کہ کس قسم کا ادارہ قائم کیا جانا چاہیئے۔ میں نے ایک خاکہ لکھ کر بھیجا جو ان خطوط پر تھا جو بعد میں میں نے دارالاسلام کے بارے میں شائع کیا۔

اس دوران میں انہوں نے علامہ صاحب سے بھی رہنمائی کی غرض سے خط و کتابت کی۔ اس خط و کتابت کی تفصیلات مجھے معلوم نہیں ہیں۔ البتہ یہ مجھے چوہدری نیاز علی صاحب سے معلوم ہوا کہ میری تجویز کردہ اسکیم انہوں نے علامہ مرحوم کو دکھائی تھی اور انہوں نے اسے پسند کیا تھا۔ اور فرمایا تھا کہ اس وقت کرنے کے یہی کام ہیں۔ اس سلسلہ کی ساری خط و کتابت چوہدری نیاز علی صاحب کے پاس محفوظ ہے۔ اور اُن سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ بلکہ وہ غالباً ایک دفعہ شائع بھی کر چکے ہیں۔ تقریباً ۱۹۳۶ء ہی کا زمانہ تھا جب پہلی مرتبہ علامہ صاحب نے مجھے نذیر نیازی صاحب یا میاں شفیع صاحب کے ہاتھ سے خط لکھوایا تھا کہ میں حیدر آباد چھوڑ کر پنجاب منتقل ہو جاؤں مگر اس وقت میں نے اظہار معذرت کر دیا تھا۔ کیونکہ اس وقت میں حیدر آباد ہی میں رہنے کا خیال رکھتا تھا۔ اور وہاں میں نے زمین بھی اس غرض سے خرید لی تھی کہ اس طرح کا ایک ادارہ قائم کروں گا جس کی تجویز انہوں نے کی تھی۔"

"علامہ صاحب نے آپ کے پنجاب آجانے کے لیے کوئی خاص وجہ لکھی تھی؟"

"بس یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ میں پنجاب چلا آؤں، زیادہ تفصیل نہیں لکھی تھی۔ اس وقت تو میں نہیں سمجھ سکا تھا کہ اسکی مصلحت کیا ہے۔ البتہ ۱۹۳۷ء کے وسط تک پہنچ کر مجھے یہ خود محسوس ہونے لگا تھا کہ جنوبی ہند کو چھوڑ کر مجھے شمالی ہند کی طرف رُخ کرنا چاہیئے۔ اسی زمانہ میں چوہدری نیاز علی صاحب نے اصرار کیا کہ میں پنجاب کا سفر کروں اور کم از کم ان کے اس مقام کو دیکھ لوں جو انہوں نے ایک ادارہ قائم کرنے کے لیے وقف کیا تھا۔ میں خود بھی ضرورت محسوس کر رہا تھا کہ شمالی ہند کا سفر کر کے کسی ایسی جگہ کا

انتخاب کروں جہاں اپنے عزائم کے مطابق مجھے کام کرنے کا موقع ملے۔ اسی خیال سے میں نے شاید اگست کا آخر تھا، ۳۷ء میں پنجاب کا سفر کیا۔ اور جالندھر اور لاہور سے ہوتا ہوا پٹھانکوٹ پہنچا۔ اس سفر میں علامہ اقبال مرحوم سے تفصیلی گفتگو ہوئی اور انہوں نے مجھ سے فرمایا کہ چودھری نیاز علی صاحب نے جو جگہ وقف کی ہے میں اسی کا انتخاب کروں اور وہ ادارہ قائم کروں جس کا خاکہ میں نے چوہدری صاحب کے نام اپنے خط میں لکھا تھا"

" آپ کو شمالی ہند کو مرکز بنانے کا ارادہ کیوں ہوا ؟ "

" میں نے یہ محسوس کیا کہ جنوبی ہند میں کام کرنے کے مواقع روز بروز کم ہوتے جا رہے ہیں۔ و- جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ان کے مستقبل کا فیصلہ بڑی حد تک شمالی ہند میں ہو گا۔"

"آپ کی اور علامہ اقبال مرحوم کی جو گفتگو ہوئی اس میں کون سے مسائل زیادہ زیر بحث رہے"

" اسوقت جو گفتگو ہوئی وہ یہی تھی کہ مسلمانوں کے لئے کس نوعیت کے تعمیری کام کی ضرورت ہے۔ اس معاملہ میں میرے اور علامہ مرحوم کے خیالات قریب قریب یکساں تھے اور کام کا وہی خاکہ اُن کے پیش نظر تھا، جو میں نے پیش کیا تھا۔ اسی کو عملی جامہ پہنانے کی تدابیر ہی ہم اس گفتگو میں سوچتے رہے۔ تفصیلات مجھے یاد نہیں رہی ہیں۔

" کیا اس وقت یہ چیز پیش نظر تھی کہ ہندوستان میں ایک اسلامی تحریک چلائی جائے؟

"اس وقت تحریک پیش نظر نہ تھی۔ اسوقت دو چیزیں پیش نظر تھیں۔ ایک یہ کہ علمی حیثیت سے ان گوشوں کو پُر کیا جاتے جن کے خالی ہونے کی وجہ سے اسلامی نظامِ زندگی موجودہ زمانے کے لوگوں کو ناکافی اور ناقابل عمل نظر آرہا ہے دوسرے یہ کہ ایسے لوگ تیار کئے جائیں جو مسلمانوں کی فکری اور عملی رہنمائی کرنے کے قابل ہوں. ایک خالص اور جامع اسلامی تحریک کا تخیل اسوقت واضح طور پر سامنے نہیں تھا "

"علامہ اقبال اس وقت علمی میدان میں کون سے کاموں کو زیادہ اہمیت دیتے تھے؟

" تفصیل یاد نہیں۔ اسلامی قانون اور فلسفہ کی تدوین ان کے پیش نظر تھی۔ اس دفعہ جو بات ہوئی تھی یہی تھی۔"

مولانا! سنا ہے علامہ اقبال ترجمان القرآن کا خاص طور پر مطالعہ کیا کرتے تھے؟

" یہ مجھے بعد میں نذیر نیازی صاحب اور میاں شفیع صاحب سے معلوم ہوا کہ علامہ مرحوم ترجمان القرآن بڑے غور سے پڑھا کرتے تھے اور الجہاد فی الاسلام پڑھوا کر سُنی تھی اور بہت پسند کیا تھا۔"

" مولانا! اسلامی نقطہ نظر سے اقبال کو کونسی چیز عظمت بخشتی ہے؟

" اس وقت حقیقت میں ایک ایسے انسان کی ضرورت تھی جو مغربی تعلیم پر فخر کرنیوالے عام لوگوں سے زیادہ تعلیم پائے ہوئے ہو۔ اور ان سے بڑھ کر مغربی علوم پر نگاہ رکھتا ہو اور پھر وہ اس پُر زور طریقے سے اسلامی نظریات کی تائید کرے کہ مغرب زدہ لوگ اس کے سامنے بولنے کی ہمت نہ کر سکیں۔ علامہ اقبال کا اصل (CONTRIBUTION) یہ ہے کہ اس وقت جو مغربی علوم و فنون کا رعب تھا اور ایک عام تصور تھا کہ خالص اسلام اس زمانے میں نہیں چل سکتا۔ مغربی تہذیب سے (COMPROMISE) کرنا ضروری ہے اور اسلامی نظریات کو مغربی نظریات میں ڈھالا جائے۔ اس تصور کو اقبال نے توڑا۔ اس لحاظ سے اس وقت اسلامی تحریک کے لئے اقبال کی شخصیت اہم سہارا تھی بحیثیت مجموعی انہوں نے جو خدمت سر انجام دی وہ بہت اہم اور قابل قدر ہے۔

(اوراقِ گم گشتہ ص ۳۶۶ تا ۳۷۰)

مودودی صاحب اور علامہ اقبالؒ

اس عنوان سے طلوع اسلام اپریل ۱۹۷۶ء لکھتا ہے۔

کچھ عرصہ اُدھر کا ذکر ہے کہ ملک میں اس بات کا عام چرچا کیا گیا ہے کہ علامہ اقبالؒ کے مودودی صاحب کے ساتھ بڑے گہرے تعلقات تھے۔ انہوں نے مودودی صاحب کو حیدر آباد (دکن) سے پنجاب آجانے کی دعوت دی تھی۔ اور دارالاسلام (پٹھانکوٹ) بھیجا تھا۔ کہ وہاں اطمینان سے بیٹھ کر فقہ جدید مرتب کریں اور دیگر اہم اسلامی موضوعات پر ریسرچ کریں جہاں تک ہمیں معلوم ہے مودودی صاحب خود تو اس باب میں خاموش رہے اور یہ چرچا ان کے

مصاحبوں کی طرف سے ہوتا رہا۔ اور کچھ عرصہ کے بعد فضا کی پہنائیوں میں گم ہو گیا۔
کراچی کے ایک نوجوان طالب علم، علامہ اقبالؒ کی زندگی سے متعلق کوائف جمع کر رہے ہیں انہوں نے اس سلسلہ میں مودودی صاحب کو بھی لکھا کہ وہ حضرت علامہ کے ساتھ اپنے تعلقات کے بارے میں کچھ معلومات بہم پہنچائیں۔ اس طالب علم نے یہ خط و کتابت ہمیں بھیجی ہے کہ اسے طلوعِ اسلام میں شائع کیا جائے۔ اس کا مقصد اس مقالہ کے آخر میں درج ہے۔ آپ وہ خط و کتابت ملاحظہ فرمائیں۔

مکتوب نگار کا خط مودودی صاحب کے نام

مولانائے محترم! السلام علیکم

"میں علامہ اقبالؒ کے کوائفِ حیات سے دلچسپی رکھتا ہوں اور اس سلسلے میں ضروری مواد اکٹھا کر رہا ہوں۔

آپ کے متعلق معلوم ہوا ہے کہ آپ ان کی دعوت پر ۱۹۳۷ء کے آخر میں حیدر آباد سے دارالسلام (پنجاب) تشریف لائے تھے۔ علامہ اقبالؒ کی وفات اپریل ۱۹۳۸ء کو ہو گئی۔
کیا آپ براہِ کرم یہ فرمائیں گے کہ اس دوران میں آپ کتنی بار حضرت علامہ سے ملے اور کب؟
نیز یہ بھی کہ آپ نے ان کی وفات پر ہمیں کچھ لکھا تھا یا نہیں۔؟ اگر کچھ لکھا تھا تو کس پرچہ میں؟ اور اس کا حوالہ کیا ہے؟
میں شکر گزار ہوں گا اگر آپ ان مختصر سے سوالات کا جلد جواب عنایت فرمائیں گے

والسلام

مودودی صاحب کا جواب

محترمی و مکرمی! السلام علیکم و رحمۃ اللہ

عنایت نامہ ملا۔ میں ۱۹۳۷ء کے ماہ اگست میں یا شاید ستمبر میں دو مرتبہ علامہ اقبال مرحوم سے لاہور میں ملا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ انہیں کی تحریک و ترغیب پر میں حیدر آباد دکن سے دارالاسلام پہنچا۔ اس کے بعد دوسرے ہی مہینے علامہ مرحوم کا انتقال ہو گیا اس زمانے میں ان کی وفات پر میں نے ترجمان القرآن میں ایک مضمون لکھا تھا۔ اس وقت

معیّن طور پر یاد نہیں ہے کہ کس شمارہ میں وہ شائع ہوا تھا۔ کراچی میں حکیم نعیم الدین زبیری صاحب نے ترجمان کا انڈکس تیار کیا ہے۔ آپ اُن سے معلوم کرلیں۔ اُن کا پتہ یہ ہے۔

جناب حکیم نعیم الدین زبیری صاحب

۵۔ سی۔ ۲۱۔ ناظم آباد۔ کراچی ۱۸

خاکسار:- ابوالاعلیٰ

مکتوب نگار نے ہمیں لکھا ہے کہ مودودی صاحب کے ارشاد کے مطابق وہ حکیم نعیم الدین زبیری صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ علامہ اقبالؒ کی وفات کے سلسلہ میں مودودی صاحب کے (مبیّنہ) مضمون کے متعلق وہ معیّن طور پر کچھ نہ بتا سکے البتہ انہوں نے دو ایک حوالے دیئے کہ شائد ان میں کچھ مل جائے۔ ان حوالوں میں اس موضوع پر کچھ نہیں تھا۔ البتہ ترجمان القرآن بابت محرم ۱۳۵۷ھ کے "اشارات" میں حضرت علامہ کی وفات کا ذکر ضمناً موجود ہے۔ وہ "اشارات" ذیل میں درج ہیں۔

ترجمان القرآن، محرم ۱۳۵۷ھ جلد ۱۲، عدد۔۱

اشارات۔ صفحہ ۲۔۳

"اِس اشاعت سے" "ترجمان القرآن" کی زندگی کا چھٹا سال شروع ہو رہا ہے پچھلے سال کے آغاز میں جو دعا میں نے اپنے مالک سے مانگی تھی۔ اس وقت ذہن میں اس امر کا تصوّر بھی نہ تھا، کہ سال پورا ہونے سے پہلے ہی ایک ٹوٹی ہوئی کشتی کو سمندر کی طوفانی موجوں کے مقابلے میں لے جانے کا حوصلہ فرسا کام میرے سپرد کیا جائے گا۔ اس وقت محض ایک دھندلا سا خیال تھا کہ شائد مستقبل قریب میں ایسی کوئی صورت پیش آجائے۔ اس لیئے میں نے تمنا کی تھی، کہ اگر میرا آقا ایسا کوئی بوجھ میرے کندھوں پر رکھنے والا ہے تو اسکو سنبھالنے کی طاقت بھی عطا کرے۔ مجاہد کا سا ایمان دے۔ ایسی عزیمت دے جو مادّی سہاروں سے قطعی مستغنی ہو۔ اور تمام سہاروں کے چھوٹ جانے پر بھی نہ ٹوٹے۔ ایسا ارادہ دے جسے کوئی طاقت اپنے مقصد کے راستے سے نہ ہٹا سکے۔ آج جب اپنے حال پر غور کرتا ہوں تو پھر ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اور بھی

زیادہ لجاجت اور الحاح کے ساتھ اسی دعا کا اعادہ کروں۔ اب فی الواقع وہی صورت پیش آچکی ہے۔ ساحل کے سکون و عافیت سے نکال کر سمندر کے منجدھار میں پھینک دیا گیا ہوں۔ وہی خوابِ تصور والی ٹوٹی ہوئی کشتی میرے حوالے کی گئی ہے جس کا تختہ تختہ الگ اور جس کے بادبان تار تار ہیں۔ سب سے بڑا مادی سہارا جس سے مدد کی توقع تھی، اقبال کا سہارا تھا، سو وہ بھی یہاں قدم رکھتے ہی چھین لیا گیا۔ (رحمۃ اللہ وطاب ثراہ) خود اپنی طاقت کو دیکھتا ہوں تو بمنزلۂ صفر کے ہے۔ دو چار جو ساتھی ملے ہیں ان کو دیکھتا ہوں تو وہ مجھ سے بھی زیادہ خستہ و درماندہ ہیں۔ اور دوسری طرف وہ حال نظر آتا ہے جس کو دیکھ کر سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے اپنے پروردگار سے عرض کیا تھا کہ رَبَّنَا اِنَّكَ اٰتَیْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ زِیْنَةً وَّاَمْوَالًا فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا لِیُضِلُّوْا عَنْ سَبِیْلِكَ۔ اب سوائے خدا کے اور کوئی سہارا نہیں۔ سب مادی سہارے جھوٹے اور ناقابلِ اعتماد ہیں۔ وہی اصلی اور حقیقی سہارا ہے۔ وہی طاقت کا منبع ہے۔ وہی اسباب کا مالک اور مسبب ہے اور وہی حامی و ناصر ہے۔ عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا۔ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِیْنَ۔"

ان اشارات میں علامہ اقبال کی وفات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ لیکن ان کے متعلق صرف اتنا کہا گیا کہ وہ مودودی صاحب کے لئے "سب سے بڑا مادی سہارا" تھے جس کے چھن جانے کا انہیں صدمہ تھا۔ یعنی علامہ اقبال کے ساتھ مودودی صاحب کا اتنا ہی تعلق تھا کہ وہ ان کے لئے کسی مادی سہارا کا موجب تھے۔ ان کی ذات سے ان کا مودودی صاحب کا کوئی علمی یا فکری تعلق نہیں تھا جس کے نہ رہنے کا انہیں صدمہ ہو۔ اس "مادی سہارا" سے مودودی صاحب کا اشارہ غالباً دار الاسلام اور اس کی اراضیات وغیرہ کی طرف تھا جہاں سے انہیں الگ ہونا پڑا تھا۔ اس کی وجہ علامہ اقبال کی وفات نہیں تھی، کچھ اور تھی۔ بہرحال مودودی صاحب کو علامہ اقبال کی وفات سے اگر کچھ صدمہ ہوا تھا تو صرف اس وجہ سے کہ ان کا ایک مادی سہارا ختم ہو گیا۔

علامہ اقبال رح کی وفات، ۲۱- اپریل ۱۹۳۸ء کو ہوئی تھی مکتوب نگار نے لکھا ہے کہ انہوں نے اپریل سے لے کر ۱۹۳۸ء کے آخر تک ترجمان القرآن کا پورا فائل کھنگال ڈالا ہے۔ اس میں وہ مضمون کہیں نہیں ملا جس کا ذکر مودودی صاحب نے اپنے خط میں کیا ہے۔

ضمناً، طلوع اسلام کا پہلا پرچہ اپریل ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا تھا۔ وہ چھپ تو گیا تھا، ۲۱- اپریل سے پہلے، لیکن شائع ہوا تھا اس کے بعد۔ چنانچہ اس کے پہلے صفحہ پر "نالۂ یتیم" کے عنوان سے ہمارا وہ الم انگیز نوحہ چھپا تھا جسے ہم نے حضرت علامہ کی وفات پر حزن کے آنسوؤں سے سپردِ قرطاس کیا تھا۔ ترجمان القرآن (بابت محرم ۱۳۵۷ھ) کے جس پرچہ کے "اشارات" اوپر درج کئے گئے ہیں۔ اس سے اگلے پرچہ بابت صفر ۱۳۵۷ھ) میں طلوع اسلام کے مذکورہ صدر (پہلے پرچہ) پر تبصرہ شائع ہوا تھا۔ اور وہ یہ ہے۔

مجلہ طلوع اسلام پر ترجمان القرآن کا تبصرہ

ترجمان القرآن جلد ۱۲- عدد ۲- ماہ صفر ۵۷ھ مطابق اپریل ۱۹۳۸ء

طلوع اسلام۔ مرتبہ حکیم زکی احمد خاں صاحب

ضخامت ۸۰ صفحات شرح چندہ سالانہ ۵ روپے

ملنے کا پتہ:- رسالہ طلوع اسلام دہلی

"یہ رسالہ پہلے سید نذیر نیازی صاحب کی ادارت میں نکلتا تھا۔ مگر بعض وجوہ سے بند ہو گیا تھا۔ اب از سرِ نو اسکی اشاعت شروع ہوئی ہے اور اس مرتبہ ایک شخص کے بجائے اسکی زمامِ ادارت ایک مستقل بیدار مغز جماعت کے ہاتھ میں ہے جو پورے عزم اور اخلاص کے ساتھ میدان میں آئی ہے۔ اس کے اغراض و مقاصد اسی کے الفاظ میں یہ ہیں۔

"پیامِ اقبال رح کی نشر و اشاعت۔ اس کا مقصد ہو گا" یہ مجلہ ملت اسلامیہ کی ہیئتِ اجتماعیہ کا نقیب ہو گا۔ اور ... کہ ملی زندگی کے ہر مسئلہ کا حل قرآن کریم

کی روشنی میں پیش کرے گا۔"

اس دور میں جبکہ زندگی کے ہر شعبہ میں غیر اسلامی تصورات سرایت کر رہے ہیں، اور ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ بغیر سوچے سمجھے ان سے متاثر بلکہ مسحور ہو رہا ہے" امتِ مرحومہ کی اس سے بڑی اور کوئی خدمت نہیں ہو سکتی کہ اسلامی فکر و نظر کو زیادہ سے زیادہ اصلی رنگ میں پیش کیا جائے۔ تاکہ اوہام و ظنون کی وادیوں میں بھٹکنے والے، اپنے اور غیر سب کے سب ہر مشکل کا صحیح حل پا سکیں رسالہ اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب نظر آتا ہے۔ یہ اس کا پہلا نمبر ہے۔ جس کے مضامین نہایت مفید اور بلند پایہ ہیں خصوصاً "دین فطرت" "نظریۂ قومیت کتاب وسنت کی روشنی میں اور" کانگریس لیگ اور مسلمان" کے عنوان سے جو سنجیدہ اور تحقیقی مقالے لکھے گئے ہیں بہت خوب ہیں۔ آخر میں" رفتار زمانہ" کے تحت سیاسیاتِ عالم پر ایک مجمل لیکن پرمغز تبصرہ ہے۔

طلوعِ اسلام کے دور اوّل کا بھی ہم نے صمیم قلب کے ساتھ خیر مقدم کیا تھا اور اب دور ثانی کا بھی اسی طرح خیر مقدم کرتے ہیں، بلکہ اسکی حیاتِ نو ہمارے لیے پہلے سے بھی کچھ زیادہ موجب مسرت ہے۔ اس لیے کہ وہ ہم کو ایک ایسا رفیقِ سفر نظر آتا ہے جو ٹھیک اسی نصب العین کی طرف چل رہا ہے جس کی طرف ہم گامزن ہیں جاہلیت جدیدہ کے مقابلے میں فکر اسلامی کی تبلیغ کرنے والے آج اس قدر کمیاب ہیں کہ جب "تاریکی میں سے کوئی مجاہد نمودار ہوتا ہے تو ہمیں اتنی ہی خوشی ہوتی ہے جتنی کسی کال کے مارے ہوئے کسان کو آسمان پر لکۂ ابر دیکھ کر ہوا کرتی ہے۔"

(ترجمان القرآن صفحہ ۱۵۴، ۱۵۵)

آپ نے غور فرمایا کہ اس تبصرہ میں بھی علامہ اقبالؒ کی وفات کے سلسلہ میں اشارہ تک نہیں کیا گیا۔ حضرت علامہؒ کی وفات ایک عالمگیر صدمہ کا موجب تھی اور اس پر ہندوستان ہی نہیں دنیا بھر کے اخبارات و رسائل نے اداریے لکھے مسلم اور غیر مسلم مفکرین نے تعزیت کے پیغامات شائع کئے مہینوں تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ لیکن ایک تحقیق کرنے والے طالب علم کو اگر اس ضمن میں کسی کی طرف

سے کچھ نہیں ملتا تو وہ مودودی صاحب ہیں جو حضرت علامہ کے ساتھ اپنے خصوصی تعلقات کے مدعی ہیں۔ اس طالب علم کی درخواست ہے کہ اگر کسی صاحب کو علامہ اقبال رح کی وفات کے سلسلہ میں مودودی صاحب کی کسی تحریر کے متعلق کچھ معلوم ہو تو براہ کرم انہیں طلوع اسلام کی وساطت سے مطلع کریں جس کے لیے وہ ان کے شکر گزار ہوں گے (صفحہ ۴۳ تا ۴۷)

چشم دل وا ہو تو معاملہ کسقدر بے حجاب ہے۔ اور جو لائے اسرار حقیقت کے سامنے ہر بات صاف طور پر آشکار ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ سب کچھ چشم بینا کے لیے ہے۔ دیدۂ خفاش کے لیے نہیں۔ جو لوگ اپنے گوشۂ دل میں کسی صداقت کو قبول کرنے کے لیے کوئی جگہ نہیں رکھتے۔ انہیں جرنلسٹک حربوں کے پردوں میں چھپی ہوئی حقیقتیں لاکھ عریاں دکھائی جائیں وہ اس کھلی صداقت کو کیونکر قبول و منظور کریں گے؟ (مرتب)

خوشی کس بات کی؟

۲۰ فروری ۱۹۷۲ء کے نوائے وقت میں م.ش (میاں محمد شفیع صاحب) اپنی ڈائری میں لکھتے ہیں:-

"۱۹۷۲ء میں پاکستان کی جماعت اسلامی کی مجلس مشاورت کی طرف سے زرعی زمین کی نجی ملکیت پر ایک سو ایکڑ سے لیکر دو سو ایکڑ تک تحدید (زمین کی پیداواری کیفیت کے مطابق) کا مطالبہ اس صدی کے چھٹے دہا کے (۶) میں حضرت مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے اس نعرۂ مستانہ سے، کہ زمین کی ملکیت پر کوئی حد از روئے شریعت اسلامیہ مقرر نہیں کی جاسکتی۔ (جس کا اظہار انہوں نے اپنی ایک مشہور کتاب "زمین کی ملکیت کا مسئلہ" نامی میں کیا تھا، اگرچہ دور کا بھی تعلق نہیں رکھتا۔ لیکن حقیقت یہی ہے کہ ۱۸ فروری کو لاہور میں مجلس مشاورت نے اس مطالبہ کو امیر جماعت اسلامیہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی زیر صدارت ایک متفق علیہ قرارداد کی شکل

یں پاس کیا جماعتِ اسلامی کی اس مکمل کایا کلپ میں تعجب کی کوئی بات، بلکہ میرے لیے سراسر مسرت اور اطمینان کا باعث ہے کہ حالات نے جماعتِ اسلامی کو جسے عرفِ عام میں دائیں بازو کی جماعت سے منسوب کیا جاتا ہے، ملک کے کروڑوں کاشتکار کسانوں کے معاشی مسائل کو ذہنی لچک سے پرکھنے کی ڈگر پر ڈال دیا ہے۔"

ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کونسا واقعہ تھا جس پر م۔ش صاحب اس طرح جشنِ مسرت منا رہے ہیں! ہوا یہ کہ ایک شخص نے کہا کہ ازروئے شریعت اسلامیہ، زمین کی ملکیت پر کسی قسم کی حد بندی نہیں کی جا سکتی۔ اور اس کے بعد، اس کی جماعت کی مجلس مشاورت نے خود اس کی زیر صدارت، یہ قرارداد منظور کی کہ زمین کی ملکیت پر اسقدر حد بندی ضروری ہے لیعنی اس جماعت نے اپنے امیر سمیت شریعتِ اسلامیہ کی اس طرح کھلی ہوئی خلاف ورزی کی۔ اور اس سے علانیہ سرکشی برتی۔ کیا یہ واقعہ ماتم گساری ہے یا جشنِ مسرت منانے کا؟ م۔ش اظہارِ اطمینان و مسرت فرما رہے ہیں کہ (شکر، الحمد للہ) اس جماعت اور اس کے امیر نے اس طرح شریعت اسلامیہ کا مذاق اڑایا اور اس کی خلاف ورزی کی؟ اگر ہوتا یہ کہ مودودی صاحب اپنی جماعت کے سامنے اس امر کا اعتراف کرتے کہ انہوں نے جو لکھا تھا کہ ازروئے شریعت زمین کی ملکیت کی تحدید نہیں ہو سکتی، وہ غلط تھا، میں خدا سے اپنی تقصیر کی معافی مانگتا ہوں اور جماعت، ان کے اس اعترافِ گناہ پر تبریک و تہنیت کا ریزولیشن پاس کرتی، تو یہ واقعہ فی الحقیقت م۔ش صاحب کے لیے جشنِ مسرت منانے کا تھا۔ لیکن مودودی صاحب نے ایسا نہیں کیا۔ انہوں نے اس کا اعتراف نہیں کیا۔ تو ان حالات میں مجلسِ مشاورت کا یہ فیصلہ مولانا مودودی صاحب کی بیان کردہ شریعتِ اسلامیہ کی خلاف ورزی نہیں تو اور کیا ہے

اس کے بعد م۔ش صاحب لکھتے ہیں۔

"مجھے جو گونا گوں قلبی عقیدت اور احترام شروع ہی سے امیر جماعت اسلامی سے رہا ہے اور جس کا اظہار میرے قلم اور میری زبان سے موقع بہ موقع ہوتا رہا ہے اس کے پیش نظر میں ایک لحظہ کے لیے بھی یہ سوچ نہیں سکتا ہوں کہ جماعت کی بنیادی پالیسی میں یہ خوشگوار تبدیلی موقع پرستی کی بنا پر ہوئی ہے۔ میں یہی کہوں گا، کہ جماعت نے اپنی تنظیمی بنیادوں کو وسیع تر کرنے کے لیے عوام کے گھمبیر معاشی اور اقتصادی مسائل پر اپنے نقطۂ نگاہ میں انقلابی پیدا کرنے کا بروقت احساس کر لیا ہے الحمدللہ علیٰ ذالک۔"

جہانتک کسی کا کسی سے عقیدت اور احترام کا تعلق ہے یہ ہر شخص کا ذاتی مسئلہ ہے۔ جس پر کسی دوسرے کو تنقید کا حق حاصل نہیں۔ لوگ پتھر کے بتوں سے عقیدت رکھتے ہیں اور سانپوں کی پرستش کرتے ہیں۔ اس لیے ہم م ش صاحب کی عقیدت کے سوال پر بحث نہیں کرتے۔ انہوں نے کہا ہے کہ وہ ایک لحظہ کے لئے بھی یہ سوچ نہیں سکتے کہ جماعت کی بنیادی پالیسی میں یہ خوشگوار تبدیلی موقع پرستی کی بنا پر ہوئی ہے۔ بہت خوب! لیکن وہ اگلے ہی فقرہ میں لکھتے ہیں کہ "میں یہی کہوں گا کہ جماعت نے اپنی تنظیمی بنیادوں کو وسیع تر کرنے کے لیے (ایسا کیا ہے)" ہم م ش صاحب سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ کسی جماعت کا اپنی تنظیمی بنیادوں کو وسیع تر کرنے کے لیے اپنے مسلک میں تبدیلی پیدا کرنا، موقعہ پرستی اور مصلحت کوشی نہیں تو اور کیا کہلا سکتا ہے؟ پھر م ش صاحب فرماتے ہیں کہ اس جماعت نے اس مقصد کے لیے اپنے نقطۂ نگاہ میں "انقلابی تبدیلی کرنے کا بروقت احساس کر لیا ہے۔" ہم ان کی خدمت میں عرض کریں گے کہ یہ اس جماعت کا "نقطۂ نگاہ" نہیں تھا جس میں انہوں نے تبدیلی پیدا کی ہے۔ یہ خود ان کے امیر کے ارشاد کے مطابق شریعت اسلامیہ کا فیصلہ تھا جسے انہوں نے ٹھوکر مار کر مسترد کر دیا ہے۔

م ش صاحب سوچئے کہ آپ کس بات پر جشن مسرت منا رہے ہیں اور کس فیصلہ پر اس جماعت کو مبارکباد دے رہے ہیں (طلوع اسلام ۱۔ اپریل ۱۹۶۷ء صفحہ ۵۲ ۔ ۵۴)

جناب میاں محمد شفیعؒ ایم اے (م ش) ہمارے بزرگ دوستوں میں سے ہیں۔ وہ تحریر فرماتے ہیں کہ "مجھے گوناگوں قلبی عقیدت اور احترام شروع ہی سے امیر جماعت اسلامی سے رہا ہے اور جس کا اظہار میرے قلم اور میری زبان سے موقع بہ موقع ہوتا رہا ہے اس کے پیش نظر میں ایک لحظہ کے لیے بھی یہ سوچ نہیں سکتا ہوں کہ جماعت کی بنیادی پالیسی میں یہ خوشگوار تبدیلی موقع پرستی کی بنا پر ہوئی ہے۔"

ہم ایک حساس، فرض شناس، ایک پاکستانی اور قائد اعظمؒ کے ادنیٰ کارکن کی حیثیت سے جناب میاں سے یہ استفسار کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ یہ قلبی عقیدت اور احترام، کیا اس دور میں تھا جب مودودی صاحب کو "مسلم لیگ کے قائد اعظم سے لے کر اس کے مقتدیوں میں اسلامی ذہنیت کی جھلک تک بھی نظر نہیں آتی تھی؟ یا پھر یہ تبدیلی کی وجہ موقعہ پرستی ٹھہری ہے

(چوہدری حبیب احمد)

قارئین کرام! میں نے میری پہلی کتاب جو "جماعت اسلامی کا رخ کردار" کے نام سے شائع ہوئی تھی، اس کا نام "تضادات مودودی" رکھا تھا۔ اس کتاب کے کاتب استاد قمرالدین جالندھری نے ۳/۶۲ ۵ کو مبلغ سو روپے وصول کرنے کی جو رسید دی تھی، یہ حقیقت اس سے ظاہر ہے۔

روزنامہ "امروز" لاہور میں جماعت اسلامی کے متعلق میری کئی ایک اقساط شائع ہوئیں امروز والوں نے عنوان "جماعت اسلامی کا رخ کردار" دینا شروع کر دیا چنانچہ (صفدر سلیمی مرحوم و مغفور) جو طرز تحریر میں راقم کے استاد تھے۔ انہوں نے حکم دیا۔ کہ اب اپنی کتاب کا نام "جماعت اسلامی کا رخ کردار" لکھ لیں تعمیل ارشاد کی گئی۔

دوسری رسید جو ۹۷ ستانوے روپے کی کاتب صاحب نے ۴/۶۲ ۳ کو دی — اس میں کتاب کا نام جماعت اسلامی کا رخ کردار درج ہے۔ ثبوت کے لیے رسیدات کی نقل (فوٹو کاپی) پیش خدمت ہے۔ قارئین کرام اندازہ فرمالیں کہ بندہ

حقائق وعبر

الیکشن کی برکات

مودودی صاحب نے کبھی خود تو ایسا نہیں کیا (اور وہ ایسی باتیں جن پر گرفت کا اندیشہ ہو، اپنے قلم اور زبان سے کہا بھی نہیں کرتے جس کے سینکڑوں زر خرید قلم اور مملوک زبانیں ہوں وہ ایسی باتیں براہ راست خود کیوں کہے۔ لیکن کچھ عرصہ سے ان کے حاشیہ برداروں نے یہ مشہور کرنا شروع کر رکھا ہے کہ علامہ اقبالؒ کو اپنی زندگی کے آخری ایام میں کسی ایسے صاحب بصیرت مردِ راہ داں کی تلاش تھی جن کے سپرد وہ اپنا وہ کام کر سکیں جسے وہ کرنا چاہتے تھے لیکن نہیں کر پائے تھے۔ اس مقصد کے لیے اُن کی نگہ انتخاب مودودی صاحب پر پڑی۔ چنانچہ انہوں نے انہیں خاص طور پر حیدر آباد دکن سے بلوایا۔ یعنی انہوں نے اُن سے درخواست کی، اور انہوں نے درخواست کو شرف باریابی فرمایا۔ اور یہ شمع ان کے ہاتھ میں دیکر یہ کہتے ہوئے دُنیا سے رخصت ہو گئے کہ

بگیر ایں ہمہ سرمایہ بہار از من
کہ گل بدست تو از شاخ تازہ تر ماند

لیکن جب سے جماعت اسلامی کے حلقہ میں اس کا چرچا ہوا، اہلِ پاکستان حیران تھے، کہ مودودی صاحب ۱۹۳۲ء میں حیدر آباد دکن سے پنجاب آئے۔ دس سال کا عرصہ قبل از تقسیم اور تیئیس سال کا عرصہ اس کے بعد، اس تمام عرصہ میں کسی نے نہ انکی زبان سے کبھی اقبالؒ کا نام سُنا، نہ ان کی تحریریں اُن کا ذکر آیا۔ حتیٰ کہ ان کی تصانیف یا ترجمان القرآن میں کبھی بھولے سے بھی اقبال کا کوئی شعر درج نہ ہوا۔ جہانتک ہمیں یاد پڑتا ہے، انہوں نے ایک مرتبہ (۱۹۳۹ء) میں اقبال ڈے میں شرکت کی تھی اور اس میں دو قومی نظریہ کے موضوع پر ایک مقالہ پڑھا تھا۔ اس کے بعد ملک میں اقبال کی یاد میں ہر سال سینکڑوں تقاریب منعقد ہوتی رہیں۔ مودودی صاحب نے ان میں سے کسی میں بھی قدم رنجہ فرمانے کی زحمت

گوارا نہ کی۔ لیکن اس دفعہ اچانک ہم دیکھتے ہیں کہ یونیورسٹی ہال (لاہور) میں منعقدہ اقبال ڈے میں تشریف فرما ہیں۔ اور ایسی معذوری کی حالت میں جس کا ذکر انہوں نے اپنی تقریر کے افتتاحیہ میں ان الفاظ میں فرمایا کہ :-

"میں آپ حضرات سے معافی چاہتا ہوں کہ بیٹھ کر تقریر کر رہا ہوں۔ دراصل میری صحت آج کل اتنی خراب ہے کہ کھڑے ہو کر تقریر کرنا تو درکنار، بیٹھ کر تقریر کرنا بھی میرے لیے دشوار ہے۔ میں صرف اس لیے حاضر ہوا ہوں کہ حضرت اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی خدمات کو خراج تحسین پیش کرنے کا جو موقع مل رہا ہے اس سے محروم نہ رہ جاؤں۔"

اللہ اللہ! کتنی گہری عقیدت ہے انہیں حضرت علامہ اقبالؒ سے! یہ صاحب لندن، اور مراکش تک تو ہو آئے لیکن سیالکوٹ اور لاہور میں رہتے ہوئے گزشتہ تیس سال میں انہیں اقبال سے متعلق کسی تقریب میں شرکت کا موقع (اس سے پہلے) کبھی نہ مل سکا۔

انہوں نے اپنی تقریر میں فرمایا :-

"واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۲۴ء سے ۱۹۳۸ء تک چودہ سال کے عرصہ میں اسلامی جذبے، اسلامی شعور، اسلامی تہذیب اور اسلامی قومیت کے احساس کو مسلمانوں میں قائم رکھنے کے لیے اگر کوئی قیادت کام کر رہی تھی تو وہ اکیلے اقبالؒ کی ذات تھی۔"

اس کے بعد کہا۔

"اس نے مسلمانوں کو یہ شعور دیا کہ قومیت، وطن پر نہیں، دین اور عقیدے پر مبنی ہے۔ تمہاری قومیت ان لوگوں سے بالکل مختلف ہے جو تمہارے ساتھ عقیدے کا اختلاف رکھتے ہیں۔"

اور پھر یہ کہ،

"اقبال نے ایک علیحدہ مملکت کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے یہ واضح طور پر کہا تھا کہ اس سے سیاسی آزادی مقصود نہیں بلکہ اسلام کی حفاظت مقصود ہے۔"

اور پھر یہ کہ

"اقبالؒ نے آپ کو نظریہ دیا۔ اور قائد اعظمؒ نے اس نظریہ کی بنیاد پر ایک وطن حاصل کیا۔ (ایشیا۔۲۶۔ اپریل ۱۹۷۰ء)

ظاہر ہے کہ اقبالؒ نے جو کچھ کہا ۱۹۳۸ء سے پہلے کہا۔ اپریل ۱۹۳۸ء میں ان کی وفات ہوگئی تھی۔ اور مودودی صاحب نے ۱۹۳۹ء سے اپنی تالیف "مسلمان اور سیاسی کش مکش" (حصہ سوئم) کے مقالات کا سلسلہ شروع کیا اس میں انہوں نے بصراحت کہا کہ :-

"مسلم لیگ کے کسی ریزولیشن اور لیگ کے ذمہ دار لیڈروں میں سے کسی کی تقریر میں آج تک یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ ان کا آخری مطمح نظر پاکستان میں اسلامی نظام حکومت قائم کرنا ہے۔"

اور یہ کہ :-

"لیگ کے قائد اعظم سے لیکر چھوٹے مقتدیوں تک ایک بھی ایسا نہیں جو اسلامی ذہنیت اور اسلامی طرز فکر رکھتا ہو۔ اور معاملات کو اسلامی نقطہ نظر سے پرکھتا ہو۔"

جتنا کہ،

"ان کے خیالات، نظریات اور طرز سیاست اور رنگ قیادت میں خوردبین لگا کر بھی اسلامیت کی کوئی چھینٹ نہیں دیکھی جا سکتی۔"

اور کسے معلوم نہیں کہ علامہ اقبالؒ نہ صرف مسلم لیگ کے سرکردہ لیڈروں میں سے تھے، بلکہ وہ پنجاب کی صوبائی لیگ کے صدر بھی رہ چکے ہیں مودودی صاحب کی ان تنقیدات میں اقبالؒ کی بھی استثنا نہیں کی گئی۔ اور کسی جگہ اتنا کہنے کی توفیق نصیب نہیں ہوئی کہ انہوں نے البتہ صحیح اسلامی نظریہ پیش کیا تھا۔

اب، تیس سال کے بعد اقبال اور اس کی اسلامیت کے گیت گائے جا رہے ہیں۔ کہیئے کہ آپ الیکشن کی کس کس برکت کا انکار کریں گے؟

(ط۔ ۱ جون ۱۹۷۰ء (ص ۶۹ تا ۷۱)

فون نمبر ۸۱۳۱۰
۲۴-بی گلبرگ نمبر ۲ لاہور
تاریخ ۴ / ۷ / ۱۹۷۶

شیخ سراج الحق
۲۴-بی گلبرگ، لاہور

مکرمی و محترمی چوہدری حبیب صاحب السلام علیکم

آپ کا گرامی نامہ مورخہ ۲۶-جون موصول ہوا۔ آپ نے جس واقع کے متعلق دریافت فرمایا ہے وہ آج سے قریب چالیس سال پہلے کی بات ہے اس لئے اس کا مدار حافظہ پہ ہی ہو سکتا ہے۔

۱۹۳۷ء کے موسم گرما کی بات ہے جب ہم اپنے دفاتر کے ساتھ شملہ میں مقیم تھے ایک دن میاں بشیر احمد صاحب مرحوم (مدیر ہمایوں۔ مرتب) نے چوہدری صاحب (چوہدری صاحب سے میری مراد پرویز صاحب ہیں) سے آکر کہا کہ انہیں قائداعظم نے یاد فرمایا ہے۔ چوہدری صاحب جب قائداعظم سے مل کر واپس آئے تو انہوں نے مجھ سے بیان کیا کہ قائداعظم نے ایک بڑی ذمہ داری کی ڈیوٹی سونپی ہے انہوں نے فرمایا ہے کہ یہ مولوی صاحبان تحریک پاکستان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اس محاذ کو میں تمہارے سپرد کرنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے یہ کچھ غالباً علامہ اقبال مرحوم کے ایما پر فرمایا ہوگا۔ اس پر ہم دوستوں نے اپنے طور پر مشورہ کیا۔ اور اس مقصد کے لئے سر دست ایک ماہنامہ جاری کرنے کی تجویز ٹھہری۔ اس کے تھوڑے عرصہ بعد ہم دفاتر کے ساتھ دہلی آ گئے۔ وہاں پہنچ کر ماہنامہ طلوع اسلام کی تفصیلات طے پائیں۔ اس کے کرتا دھرتا آپ کو معلوم ہے پرویز صاحب ہی تھے مگر وہ اپنی ملازمت کی پابندیوں کی وجہ سے پبلک کے سامنے نہیں آ سکتے تھے۔ واضح رہے کہ چودھری صاحب قاعدہ اور قانون کے بڑے پابند رہے ہیں۔ اور اب تک ان کی یہی حالت ہے۔ اس ضمن میں سب سے پہلا مرحلہ طلوع اسلام کے لئے مدیر کی تلاش تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب متحدہ قومیت کا بڑا زور شور تھا۔ اور دو قومی نظریے کے

متعلق کہیں سے بھی آواز بلند نہیں ہوتی تھی۔ اگر حسنِ اتفاق سے کسی طرف سے بھی آواز کان میں پڑ جاتی تو اُسے غنیمت سمجھا جاتا تھا۔ حیدر آباد دکن سے ایک ماہنامہ شائع ہوتا تھا جس کا نام ترجمان القرآن تھا اور اس کے مدیر ابوالاعلیٰ مودودی صاحب۔ وہ اپنے پرچہ میں قومیت کے اسلامی نظریہ کے حق میں مضامین لکھا کرتے تھے۔ چودھری صاحب کے اس بنا پر اُن سے مراسم بھی تھے۔ اور ان کے مضامین بھی اس رسالہ میں چھپا کرتے تھے۔ ہماری نگہِ انتخاب طلوعِ اسلام کی ادارت کے لیے مودودی صاحب پر پڑی۔ وہ اس زمانہ میں حیدر آباد کے اندر بڑی عسرت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ انہوں نے خود چودھری صاحب کو ایسا لکھا تھا چنانچہ ہم نے سوچا کہ اگر مودودی صاحب کو اس مقصد کے لیے بُلا لیا جائے تو دونوں کام ہو جائیں گے۔ طلوعِ اسلام کی ادارت کے لیے قانونی شرط بھی پوری ہو جائے گی۔ اور مودودی صاحب کی مالی مشکلات بھی دور ہو جائیں گی چنانچہ مودودی صاحب کے سامنے یہ تجویز پیش کر دی گئی۔

اس دوران میں ایک اور مسئلہ سامنے آ گیا۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہوگا، علامہ اقبال نے دارالسّلام کا ایک تصوّر پیش کیا تھا اور خانصاحب چوہدری نیاز علی مرحوم نے اس تصوّر کو عملی شکل دینے کے لیے اپنی جائیداد کا ایک معتدبہ حصّہ وقف کر دیا تھا علامہ اقبال کا ارادہ خود وہاں منتقل ہو جانے کا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے وہ شدید بیمار ہو گئے اس پر یہ طے پایا تھا کہ سرِدست وہاں کسی مناسب شخص کو بلا لیا جائے جو دارالسّلام کے ابتدائی مراحل طے کرنے میں مدد دے۔ دیگر ممالک سے سکالرز بلانے کے لیے بھی علامہ اقبال کی طرف سے خط و کتابت ہو رہی تھی۔ پہلے تجویز ہوا کہ خود پرویز صاحب ملازمت چھوڑ کر دارالسّلام منتقل ہو جائیں لیکن قائدِ اعظم اس سے متفق نہ ہوئے کہ چودھری صاحب ملازمت کو چھوڑ دیں۔ وہ چاہتے تھے کہ چوہدری صاحب دہلی میں اُن کے قریب رہیں۔ چنانچہ اس پر طے پایا کہ دارالسّلام کے لیے مودودی صاحب کو بلا لیا جائے۔ چودھری نیاز علی صاحب نے اس تجویز سے اتفاق کیا اور جہاں تک مجھ کو

ہو پڑتا ہے نیاز علی صاحب مرحوم نے علامہ اقبال کی اجازت سے مودودی صاحب
دعوت نامہ بھیجا تھا۔ جب جنوری ۱۹۳۸ء میں ہم دہلی والوں کا قافلہ جس میں علامہ
علم چیراجپوری۔ چوہدری پرویز صاحب' قاضی محمد اشرف صاحب اسد ملتانی صاحب
ور یہ خاکسار شامل تھے۔ یوم اقبالؒ کے سلسلہ میں لاہور آیا اور علامہ اقبال کی خدمت
یں باریابی کی سعادت حاصل ہوئی تو وہاں بھی طلوع اسلام اور دارالاسلام کا تذکرہ ہوتا
رہا۔ مودودی صاحب چوہدری نیاز علی کی دعوت پر پنجاب آنے پر آمادہ ہو گئے اور
دارالاسلام جانے سے پہلے چند روز دہلی ٹھہرے۔ اس دوران چوہدری صاحب سے
ان کی ملاقاتیں ہوتی رہیں مجھے یاد پڑتا ہے کہ جب وہ آخری شام ہم سے رخصت
ہوئے تو چوہدری صاحب نے اُن سے مذاقاً کہا تھا کہ مودودی صاحب آپ پہلی
بار پنجاب تشریف لے جا رہے ہیں محتاط رہیئے گا۔ یہاں کے لوگ اچھے بھلے آدمی کو نبی
بنا دیا کرتے ہیں۔ یہ اس لئے کہ ہم لوگوں نے ملاقاتوں کے دوران اُن کی گفتگو سے
کچھ ایسا ہی محسوس کیا تھا۔ بہرحال مودودی صاحب دارالاسلام پہنچ گئے۔ طلوع اسلام
کے لیے کسی دوسرے آدمی کا انتظام کرلیا گیا۔ ایک یا ڈیڑھ ماہ کے بعد علامہ اقبال
کا انتقال ہوگیا۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے، مودودی صاحب علامہ اقبال سے
ملنے کے لیے تو ایک طرف انکی عیادت کو بھی لاہور نہیں گئے اور نہ ہی اُن کی وفات
پر تعزیت کے لیے ۔ سب سے بڑی حیرت یہ ہے کہ انہوں نے حضرت علامہ کی وفات
پر اپنے رسالہ میں بھی کچھ نہ لکھا۔

دارالاسلام کا ایک ٹرسٹ تھا۔ اور چوہدری نیاز علی صاحب کے ہمخیال دوستوں
پر مشتمل ایک بورڈ تھا۔ اس ٹرسٹ کے متعلق چوہدری نیاز علی صاحب چوہدری
پرویز صاحب سے مشاورت کرتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ اسی سلسلے میں دہلی بھی تشریف
لاتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد چوہدری نیاز علی صاحب نے یہ لکھنا شروع کر دیا کہ مودودی
صاحب جنہیں اس بورڈ کا ممبر بنا لیا گیا تھا۔ کچھ ایسی حرکتیں کر رہے ہیں جن سے
خطرہ لاحق ہوتا ہے کہ وہ اس ٹرسٹ پر قبضہ ہی نہ جمالیں۔ بڑھتے بڑھتے بات
یہاں تک پہنچی کہ خود پرویز صاحب کو دارالسلام جانا پڑا اور کافی تگ و دو کے

بعد مودودی صاحب کو دارالسلام کو خیرباد کہنا پڑا۔ اور اس ٹرسٹ کی مودودی
صاحب کے پنجے سے جان چھوٹی اور وہ لاہور آن بیٹھے۔ دوبارہ کس طرح دارالسلام
پہنچے گئے۔ یہ الگ داستان ہے۔ چودھری نیاز علی صاحب کے پرویز صاحب کے
ساتھ اور اس خاکسار کے ساتھ بڑے مخلصانہ مراسم تھے جو پاکستان آنے کے بعد
بدستور قائم رہے۔ ان سے جب بھی کہا گیا کہ مودودی صاحب کے متعلق ان واقعات
کو عام کر دیں تاکہ قوم کو اصل واقعات سے آگاہی ہو جائے۔ وہ یہ کہہ کر معذرت
کر دیتے کہ ان بھڑوں کے چھتے کو چھیڑنے کی مجھ میں ہمت نہیں میں یہاں خاموشی
سے زندگی کے دن بسر کرنا چاہتا ہوں۔ اور وہ اسی خاموشی کے ساتھ دنیا سے رخصت
ہو گئے۔ میں نے اس واقعہ کی موٹی موٹی تفاصیل جن تک میری یادداشت میری
رہنمائی کرتی ہے لکھ دی ہیں۔ آخر میں اتنا عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ میں
بھی پرویز صاحب کے ساتھ ۱۹۳۰ء کے پاکستانیوں میں شامل ہوں اور میری
ساری زندگی چوہدری صاحب کی معیت میں گزری ہے یہ ہم آہنگی فکر و نظر کی
بڑی پائندہ مثال ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے اسی طرح قائم رکھے۔

والسلام

نیازمند

سراج الدین

PHONE NO 81310

24-B, Gulberg II, Lahore

Dated 4.7.1926

مکرمی و محترمی چوہدری حبیب صاحب۔ السلام علیکم

آپ کا گرامی نامہ مورخہ 26 جون موصول ہوا۔ آپ نے جس
واقعہ کے متعلق دریافت فرمایا ہے وہ آج سے قریب چالیس

پہلے کی بات ہے اِس لئے اُس کا مدار حافظہ پر ہی
سکتا ہے۔

۱۹۳۷ء کے موسم گرما کی بات ہے جب ہم اپنے دفاتر کے
سلسلہ میں شملہ میں مقیم تھے۔ ایک دن میاں بشیر احمد صاحب
نے چودھری صاحب (چودھری صاحب سے مری مراد پرویز صاحب ہیں)
سے آکر کہا کہ انہیں قائد اعظم نے یاد فرمایا ہے۔ چودھری صاحب
جب قائدِ اعظم سے مل کر واپس آئے تو انہوں نے مجھ سے بیان کیا کہ
قائد اعظم نے مجھ کو ایک بڑی ذمہ داری کی ڈیوٹی سپرد کی ہے انہوں نے
کہا کہ یہ جو مولوی صاحبان تحریک پاکستان کے خلاف اٹھ
کھڑے ہوئے ہیں اِس محاذ کو میں تمہارے سپرد کرنا چاہتا ہوں
انہوں نے یہ بھی غالباً علامہ اقبال مرحوم کے ایما سے فرمایا ہوگا
اس پر ہم دوستوں نے اپنے طور پر مشورہ کیا اور اِس مقصد کیلئے
سرِ دست ایک ماہنامہ جاری کرنے کی تجویز ٹھہری۔ اِس کے
تھوڑے عرصہ بعد ہم دفاتر کے ساتھ دہلی آگئے وہاں
آکر ماہنامہ طلوعِ اسلام کی تفصیلات طے پائیں۔ اِس
کے لئے ادھر تو آپ کو معلوم ہے پرویز صاحب ہی تھے مگر وہ اپنی
ملازمت کی پابندیوں کی وجہ سے پبلک کے سامنے نہیں آسکتے تھے۔ واضح
ہو کہ چودھری صاحب قاعدہ اور قانون کے بڑے پابند واقع ہوئے ہیں
اور ابتک اُن کی یہی حالت ہے۔ اِس ضمن میں سب سے پہلا مرحلہ
طلوعِ اسلام کیلئے مدیر کی تلاش تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب متحدہ قومیت کا بڑا زور شور تھا
دو قومی نظریہ کے متعلق کہیں سے بھی آواز بلند نہیں ہوئی تھی
حسن اتفاق سے کسی طرف سے بھی یہ آواز کانوں میں پڑ جاتی تو ا
سے تعصب سمجھا جاتا تھا - حیدرآباد دکن سے ایک ماہنامہ نک
نکلتا تھا جس کا نام ترجمان القرآن تھا اور اس کے مدیر تھے ابوالا
مودودی صاحب - وہ اپنے پرچہ میں قومیت کے اسلامی نظریہ کے
میں مضامین لکھا کرتے تھے - چودھری صاحب بھی اسی نظریہ
کے قائل تھے اور ان کے مضامین بھی اس رسالہ میں چھپا کرتے
ہماری نگاہ انتخاب طلوع اسلام کی ادارت کیلئے مودودی صاحب
پر پڑی - وہ اس زمانہ میں حیدرآباد کے اندر بڑی عسرت کی ز
بسر کرتے تھے - انہوں نے خود چودھری صاحب کو ایسا لکھا تھا - چنانچہ
نے سوچا کہ اگر مودودی صاحب کو اس مقصد کیلئے بلا لیا جائے
دونوں کام ہو جائینگے - طلوع اسلام کی ادارت کیلئے قانونی ض
بھی پوری ہو جائیگی اور مودودی صاحب کی مالی مشکلات کا مداوا
ہو جائیگا - چنانچہ مودودی صاحب کے سامنے یہ تجویز پیش کر دی گئی -

اس دوران میں ایک اور مسئلہ سامنے آگیا۔ جیسا کہ آپ کو
ہوگا علامہ اقبال نے دارالاسلام کا ایک تصور پیش کیا تھا
صاحب چودھری نیاز مرحوم نے اس تصور کو عملی شکل دینے کے لئے
جائیداد ایک معتد بہ حصہ وقف کر دیا تھا۔ علامہ اقبال
ارادہ خود وہاں منتقل ہو جانے کا تھا لیکن بدقسمتی سے وہ
بیمار ہو گئے۔ اس پر یہ طے پایا تھا کہ سردست وہاں
مناسب شخص کو بلا لیا جائے جو دارالاسلام کے ابتدائی مراحل
کرنے میں مدد دے۔ دیگر ممالک سے سکالرز بلانے کیلئے بھی
اقبال کی طرف سے خط و کتابت ہو رہی تھی۔ پہلے تجویز ہوا کہ
پرویز صاحب ملازمت چھوڑ کر دارالاسلام منتقل ہو جائیں لیکن
اعظم اس سے متفق نہ ہوئے کہ چودھری صاحب ملازمت کو چھوڑ دیں
چاہتے تھے کہ چودھری صاحب دہلی میں ان کے قریب رہیں۔ چنانچہ
بات طے پایا تھا کہ دارالاسلام کیلئے مودودی صاحب کو بلا لیا جائے
دھری نیاز علی صاحب نے اس تجویز سے اتفاق کیا اور جہاں تک مجھ کو یاد
ہے چودھری نیاز علی صاحب مرحوم نے علامہ اقبال کی اجازت سے مودودی صاحب
دعوت نامہ بھیجا تھا۔ جب فروری 1938ء میں ہم دہلی والوں کا قافلہ
جس میں علامہ اسلم جیراجپوری صاحب، چودھری پرویز صاحب۔ قاضی محمد اشرف
صاحب۔ اسد ملتانی صاحب اور یہ خاکسار شامل تھے۔ یوم اقبال کے سلسلہ
میں لاہور آیا اور علامہ اقبال کی خدمت میں بھی باریابی کی سعادت
حاصل ہوئی تو وہاں بھی علوم اسلام اور دارالاسلام کا تذکرہ

ہوتا رہا۔ مودودی صاحب چودھری نیاز علی صاحب کی دعوت پر پنجاب آنے پر آمادہ
ہو گئے اور دارالاسلام جانے سے پہلے چند روز دہلی ٹھہرے۔ اِس دوران میری
صاحب سے ان کی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ جب وہ آخری شام
سے رخصت ہوئے تو چودھری صاحب نے اُن سے مذاقاً کہا تھا کہ مودودی
آپ پہلی بار پنجاب تشریف لے جا رہے ہیں محتاط رہئے گا یہاں کے لوگ
بھلے آدمی کو بھی بنا دیا کرتے ہیں۔ یہ اِس لئے کہ ہم لوگوں نے ملاقاتوں
کے دوران اُن کی گفتگو سے کچھ ایسا ہی محسوس کیا تھا۔ بہرحال مودودی
دارالسلام پہنچ گئے۔ طلوع اسلام کیلئے کسی دوسرے آدمی کا انتظام کر لیا گیا
ایک یا ڈیڑھ ماہ کے بعد علامہ اقبال کا انتقال ہو گیا۔ جہاں تک مجھے یاد
ہے مودودی صاحب علامہ اقبال سے ملنے کے لئے تو ایک طرف اُن کی عیادت
کو بھی لاہور نہیں گئے اور نہ ہی اُن کی وفات پر تعزیت کیلئے۔ سب
سے بڑی حیرت یہ کہ انہوں نے حضرت علامہ کی وفات پر اپنے
رسالہ میں بھی کچھ نہ لکھا۔

دارالاسلام کا ایک ٹرسٹ تھا اور چودھری نیاز علی صاحب کے
ہم خیال دوستوں پر مشتمل ایک بورڈ تھا جس کے زیر نگرانی وہ ٹرسٹ
کام کرتا تھا۔ اِس ٹرسٹ کے متعلق چودھری نیاز علی صاحب چودھری
پرویز صاحب سے برابر مشاورت کرتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ اسی
سلسلہ میں دہلی بھی تشریف لائے تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد چودھری نیاز علی صاحب
نے یہ لکھنا شروع کر دیا کہ مودودی صاحب جنہیں اِس بورڈ کا ممبر
بنا لیا گیا تھا کچھ ایسی حرکتیں کر رہے ہیں جن سے خطرہ لاحق ہوا
کہ وہ اِس ٹرسٹ پر قبضہ ہی نہ جما لیں۔ بڑھتے بڑھتے

قارئین کرام! شیخ صاحب جیسا کہ مندرجہ بالا خط سے ظاہر ہے۔ پرویز صاحب چوہدری نیاز علی مرحوم کے دیرینہ رفیق ہیں یہ پیری ہیں جوان "شیخ" پرویز صاحب کی خلوتوں اور جلوتوں کا امین ہے میں نے انہیں عریضہ لکھا تھا کہ کچھ تو کہیئے، وہ تو بہت کچھ کہہ رہے ہیں۔ انہوں نے کرم فرمائی کی۔ اُن کے مندرجہ گرامی نامہ سے حقیقت حال کی کافی حد تک وضاحت ہو جاتی ہے چند چھوٹے چھوٹے واقعات جو زبانی طیور کی ہم نے بھی سنے ہیں شیخ صاحب قبلہ یا تو دانستہ چھوڑ گئے یا پھر ان کی نوک قلم پر نہیں آئے۔ بہر حال قبلہ ان طائران پیش رس میں سے ہیں جنہوں نے محاذ قلم پر تحریک پاکستان کو عام کرنے کے لیے یعنی اقبالؒ کو افراد ملت کے دل و دماغ تک پہنچانے کے لیے مقدور بھر کام کیا ہے ہم شیخ صاحب کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے ہمیں مایوس نہیں کیا جو یادداشتیں محفوظ کر دی ہیں یہ تاریخی حقائق ہیں۔ اس خط کی فوٹو کاپی بھی پیش کی جاتی ہے تاکہ سند رہے۔

اب ہم جناب سید نذیر نیازی صاحب کا مکتوب گرامی پیش خدمت کر رہے ہیں جس سے ایک حقیقت مزید نکھر جائے گی جسے دھندلایا جا رہا ہے مکتوب کی نقل بھی ملاحظہ فرمالیں۔

لاہور، ۲۲ مئی ۱۹۷۱ء

محبی چودھری صاحب

السلام علیکم! معاف فرمایئے کا میں علالت کی وجہ سے آپ کے
کا جواب نہ دے سکا۔ اب بھی ہسپتال میں بیٹھا یہ سطور لکھ رہا ہوں۔ بات دراصل
جو زبانی عرض کی تھی کہ مودودی صاحب چودھری نیاز علی کی دعوت پر پٹھانکوٹ
آئے۔ ایسا نہیں تھا کہ حضرت علامہؒ کی دعوت پر آئے تھوں حضرت
علامہ کا کہنا تو یہ تھا کہ چودھری صاحب کے یہاں جتنے بھی اہل قلم جمع ہو جائیں،
چاہیے تاکہ باعتبار حالات اسلامی تعلیمات کی ترجمانی میں غور و فکر اور محنت
سے کام کریں۔ اس لیے یہ سطور آپ کی تسلی کے لیے کافی ہوں گی۔
باقی رہا لوگ سو جو جی چاہے لکھ دیں انہیں روکنے والا کون ہے۔ آپ اس
معاملے کو زیادہ اہمیت نہ دیجیے۔

احقر

نیازی

دوستن گرامی نامے آپ کی نظروں سے گزر گئے ہیں۔ اب پورے حالات
و واقعات کی روشنی میں قارئین کرام خود فیصلہ فرمائیں گے کہ جرنلسٹک
حربوں سے کام لیکر اور حقائق کو مسخ کر کے مودودی کو اقبالؒ کا
انتخاب ثابت کرنے والے کہاں تک سچے ہیں
محترم سید نذیر نیازی صاحب کے مکتوب کی فوٹو نقل ساتھ منسلک ہے
ملاحظہ فرمایئے:۔

(چودھری حبیب احمد)

دو اقبالی مجرم!

مودودی کی زندگی کا پس منظر

مولانا محمد یوسف بنوری کا شمار ملک کے چوٹی کے علماء میں ہوتا ہے۔ وہ مدرسہ عربیہ نیو ٹاؤن، کراچی کے بانی اور وفاق المدارس عربیہ کے صدر ہیں تحریک ختم نبوت کے سلسلہ میں وہ مجلس تحفظ ختم نبوت کے صدر کی حیثیت سے ملک بھر میں شہرت حاصل کر چکے ہیں انہوں نے ماہنامہ "بینات" کراچی، کی اگست ۱۹۷۶ء کی اشاعت میں عنوان بالا کے تحت حسب ذیل شذرہ شائع کیا ہے جسے ہم روزنامہ "صداقت" کراچی، مورخہ ۲ر اگست ۱۹۷۶ء کے حوالہ سے درج ذیل کرتے ہیں۔

" مودودی صاحب بچپن ہی سے طباع اور ذہین مگر معاشی پریشانیوں میں مبتلا تھے۔ ابتداء میں اخبار مدینہ بجنور میں ملازم ہوئے اور پھر دہلی میں جمعیت علماء ہند کے اخبار "مسلم" سے وابستہ رہے، اور پھر چند سالوں کے بعد اخبار "الجمعیۃ" میں ملازم ہوئے جو جمعیۃ علماء ہند کا ترجمان تھا۔ دہلی سے نکلتا تھا۔ غالباً سہ روزہ تھا۔ تاریخ کے جواہر پاروں کے عنوان سے ان کے مضامین بہت آب و تاب سے نکلتے تھے۔ اس طرح مودودی صاحب کی قلمی تربیت مولانا احمد سعید صاحب کے ذریعے ہوتی گئی۔ والد مرحوم کی وفات کی وجہ سے اپنی تعلیم نہ صرف یہ کہ مکمل نہ کر سکے بلکہ ابتدائی عربی تعلیم کی کتابوں میں رہ گئے۔ نہ جدید تعلیم سے بہرہ ور ہو سکے۔ پرائیویٹ انگریزی تعلیم حاصل کی اور انگریزی سے کچھ مناسبت ہو گئی۔ اس دور کے اچھے لکھنے والوں کی کتابوں اور تحریرات اور مجلات و جرائد سے بہت کچھ فائدہ اٹھایا۔ اور قلمی قابلیت روز افزوں ہوتی گئی۔ بدقسمتی سے نہ کسی دینی درسگاہ سے فیض حاصل کر سکے نہ جدید علوم کے گریجویٹ بن سکے۔ نہ کسی پختہ کار عالم کی صحبت نصیب ہو سکی۔ اور ایک مضمون میں خود اس کا اعتراف کیا ہے جو عرصہ ہوا ہندوستان متحدہ میں مولانا

عبدالحق مدنی مرادآباد کے جواب میں شائع ہوا تھا بلکہ نیاز فتحپوری جیسے ملحد و زندیق کی صحبت نصیب ہوئی۔ ان سے دوستی رہی۔ ان کی صحبت و رفاقت سے بہت کچھ غلط رجحانات و میلانات پیدا ہو گئے۔ حیدرآباد دکن سے ۱۹۳۳ء میں ماہنامہ ترجمان القرآن جاری کیا۔

حضرت مولانا مسعود عالم مرحوم اور مولانا امین احسن اصلاحی جیسے عالم عربی دان مل گئے۔ جنہوں نے کتابیں تالیف کیں اور ہر کتاب مودودی صاحب اپنے نام سے چھپواتے رہے۔ دوسروں کی قابلیت سے خود وجاہت کا فائدہ اٹھایا۔ ورنہ مودودی خود عربی لکھنے سے معذور، انگریزی لکھنے سے معذور ہے۔ نہ عربی لکھ سکتا ہے نہ بول سکتا ہے۔ یہی انگریزی کا بھی حال ہے لیکن جو کتابیں ترجمہ کی گئیں اس کے سرورق پر بھی لکھا گیا تالیفات المودودی، کہیں یہ نہیں لکھا کہ یہ ترجمہ مسعود عالم کا ہے۔ یا عاصم حداد کا۔ لوگ یہ سمجھے کہ اردو کا یہ ادیب کیا ٹھکانہ عربی ادب کا بھی امام ہے۔ میری معلومات کے مطابق حضرت حسین احمد مدنی رح پہلی شخصیت ہیں جنہوں نے اپنے مکاتیب میں اس فتنے کی نشاندہی فرمائی۔ ان کے بعد دیگر علماء کرام کے ساتھ ساتھ حضرت مولانا شیخ الحدیث محمد زکریا صاحب نے ایک کتاب "فتنہ مودودیت" کے نام سے شائع کی۔

اب اس مودودی کے بارے میں سکوت جرم عظیم معلوم ہوتا ہے اور چالیس سال جو مجرمانہ سکوت کیا۔ اس پر بھی افسوس ہوا۔ اور اس دور کا سب سے بڑا فتنہ مودودی ہے۔"

غنیمت ہے کہ ان حضرات نے چالیس سال بعد ہی سہی اس فتنہ کا احساس تو کر لیا۔ ورنہ ان کی کیفیت یہ تھی کہ یہ طلوع اسلام کو اس لیے ہدف دشنام طرازی بناتے رہے کہ یہ مودودی صاحب کی مخالفت کیوں کرتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ اس فتنہ کے سدباب کے لیے کیا کرتے ہیں۔

طلوع اسلام اکتوبر ۱۹۷۶ء
صفحہ ۵۲ — ۵۳

اخبار الجمعیتہ

۱۹۲۴ء میں مودودی صاحب، جمعیت العلماءِ ہند کے اخبار "الجمعیتہ" سے وابستہ ہو گئے۔ یہ اخبار نیشنلسٹ علماء کا سب سے مشہور ترجمان تھا۔ وہ ۱۹۲۹ء تک اس اخبار سے وابستہ رہے۔ اس کے بعد جب اس اخبار کی مالی حالت خراب ہو گئی، تو وہ حیدر آباد دکن چلے گئے۔ جہاں ان کے برادرِ بزرگ، محترم ابوالخیر مودودی صاحب سررشتہ تالیف و ترجمہ سے وابستہ تھے (غالباً) ۱۹۳۳ء میں مولانا مودودی صاحب نے ماہنامہ ترجمان القرآن کی ادارت کا فریضہ سنبھالا۔ وہاں یہ کانگریسی خیالات کی تبلیغ نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے اس رسالے میں ایسے مضامین لکھنے شروع کئے جن سے علامہ اقبالؒ کے پیش کردہ نظریۂ قومیت کی تائید ہوتی تھی۔ اس زمانے میں ابھی طلوعِ اسلام کا اجراء عمل میں نہیں آیا تھا اس لیے اگر کسی گوشے سے بھی اسلامی نظریہ قومیت کی تائید ہوتی تھی تو مذہبی حلقوں میں وہ آواز بڑی مقبول ہو جاتی تھی۔ اس طرح "اقبالی حلقہ" میں مودودی صاحب فکری طور پر متعارف ہوئے۔ یہاں سے ایک ایسے مرحلہ کا آغاز ہوتا ہے جہاں اس ہیچمیرز کا نام بھی شریکِ داستان ہو جاتا ہے اس کے لیے میں احباب سے معذرت خواہ ہوں۔

طلوعِ اسلام کا اجراء

جب نیشنلسٹ علماء کی طرف سے مطالبۂ پاکستان کی مخالفت شدت تک پہنچ گئی تو ضرورت محسوس ہوئی کہ کوئی ایسا آرگن ہو جو ان کی طرف سے اٹھائے گئے اعتراضات کا جواب خدا اور رسولؐ کے ارشادات کی روشنی میں دے۔ اس کے لیے قرعۂ فال اس "دیوانے" کے نام پر پڑا۔ اور قائدِ اعظمؒ کے ارشاد کی تعمیل میں[1] ماہنامہ

---

[1] محترم میاں بشیر احمد (مرحوم) نے مجھے بتایا تھا کہ اس کے محرک علامہ اقبالؒ تھے حضرت علامہؒ کے ارشاد کی تعمیل میں پہلے طلوعِ اسلام محترم سید نذیر نیازی صاحب کے زیرِ اہتمام اور زیرِ ادارت شائع ہوتا تھا لیکن چند شماروں کے بعد وہ بند ہو گیا تو ۱۹۳۸ء میں اسی نام سے یہ رسالہ جدید اہتمام کے تحت شائع کیا گیا۔

طلوعِ اسلام کے اجراء کی تجویز زیرِ غور آئی ۔ میں مرکزی حکومتِ ہند کی ملازمت سے منسلک تھا۔ اس لیے ضابطہ کی رُو سے اس مجلّہ پر کسی حیثیت سے میرا نام نہیں آسکتا تھا۔ اگرچہ یہ بات ڈھکی چھپی نہیں تھی کہ مجھے قائدِ اعظمؒ کی خدمت میں شرفِ باریابی بھی حاصل تھا۔ اور فکرِ اقبالؒ کے شیدائی اور مبلّغ ہونے کی بنا پر تحریکِ پاکستان کے فروغ کے لیے میری مساعی کا بھی عام چرچا ہے۔ اس زمانے میں تو مجھے ایسا سوچنے کا ہوش ہی نہیں تھا۔ لیکن جب میں آج اس دور پر نگہِ بازگشت ڈالتا ہوں تو حیران رہ جاتا ہوں کہ میں اس آگ سے کس طرح بیباکانہ کھیلتا رہا۔ جس کے قریب تک جانے کی بھی ملازمینِ سرکار جرأت نہیں کرتے تھے۔ میں نے تو کبھی اس کا ذکر کرنا بھی مناسب نہیں سمجھا۔ لیکن پیر علی محمد راشدی صاحب نے اس دور کے واقعات قلمبند کئے ہیں۔ اس سلسلہ میں ان کا ایک مبسوط مقالہ روزنامہ جنگ (کراچی) کی ۸ نومبر ۱۹۶۹ء کی اشاعت میں شائع ہوا۔ اس میں انہوں نے لکھا تھا:۔

۱۹۳۸ء سے لیکر آخر ۱۹۳۹ء تک میں دہلی میں رہا۔ میں اس کمیٹی سے والبتہ تھا (بلکہ اس کا سیکرٹری) تھا جو پاکستان سکیم بنا رہی تھی۔ آخر ۱۹۳۹ء سے وسط ۱۹۴۰ء میں لاہور میں رہا۔ جہاں وہ تاریخی اجلاس ہوا جس میں قراردادِ پاکستان منظور ہوئی۔ یہ سارا عرصہ مجھے یہ ضرورت رہی کہ مسلمان سرکاری افسروں کے تعاون سے پاکستان سکیم کے سلسلے میں ضروری معلومات حاصل کروں۔ اور اگر ہو سکے، تو لیگ کے اجلاس کو کامیاب بنانے کے سلسلے میں ضروری معلومات حاصل کروں اور اگر ہو سکے تو لیگ کے اجلاس کو کامیاب بنانے کے سلسلے میں ان کی مدد سے فائدہ اٹھاؤں مگر مجھے سارے ہندوستان میں سوائے تین کے اور کوئی بڑے عہدے پر لگا ہوا مسلمان افسر نہیں ملا جو نظریۂ پاکستان کا حامی ہو یا اس نظریہ کو صحیح ثابت کرنے اور اس کو پھیلانے کے کام میں مدد دے سکے۔ یہ تین افسر تھے۔

۱۔ مرحوم و مغفور جسٹس شاہ سلیمان۔ جو اسوقت فیڈرل کورٹ کے جج تھے۔
۲۔ سر مولوی) غلام احمد صاحب پرویز۔ جو اس زمانے میں مرکز کے کسی محکمہ میں ملازم

ہ۔اور

۳۔ خواجہ عبدالرحیم صاحب جو اس زمانے میں کسی بڑے عہدے پر فائز تھے۔ مجھے
ی فرصت ملی تو اس دور کے واقعات تفصیل کے ساتھ لکھوں گا، جن سے مِن
ث الجماعت مسلمان افسروں کی انتہائی سرد مہری کی نشاندھی ہوگی۔
اسی سلسلہ مضامین کی ایک کڑی میں جو ۲۰ مارچ ۱۹۷۲ء کے روزنامہ جنگ
چی، میں شائع ہوئی تھی، انہوں نے چند ایک دانشوروں کے نام لکھے جنہوں نے پاکستان
یکم کی تیاری میں مدد دی تھی (ان میں بھی میرا نام شامل تھا) اس کے بعد لکھا:۔
ایک بات خاص طور پر نوٹ کرنے کے قابل تھی۔ وہ یہ کہ جن حضرات کے اسماء
می میں ابھی بتا چکا ہوں، ان کے سوا کسی اور مسلمان سرکاری افسر نے اس زمانے
ں ہماری کوئی مدد نہیں کی۔ بلکہ ان میں سے اکثر تو پاکستان کے تخیل کا مضحکہ
اتے تھے۔ اور اس ڈر کے مارے کہ انگریز یا ہندو ان سے خفا نہ ہو جائے وہ ذیڈ سر پلیس
راستے سے (جہاں یہ اسکیم مرتب کی جا رہی تھی) گزرتے ہی نہیں تھے۔"
بہر حال، یہ تھے وہ حالات، جن میں طلوع اسلام کے اجراء کا قرعہ اس دیوانے
ے نام پڑا۔ مودودی صاحب کے مذکورہ بالا مضامین کی وجہ سے ان کے ساتھ میرے
عارف ہی نہیں، مراسم بھی تھے، ان کے رسالہ میں میرے مضامین بھی شائع ہوتے
تھے۔ اور وہ جب دہلی تشریف لاتے (جو ان کا وطن تھا) تو ان سے اکثر ملاقاتیں بھی
ہتیں۔ انہی مراسم کی بنا پر انہوں نے مجھے لکھا کہ حیدر آباد میں اُن کی مالی حالت
ڑی سقیم ہو چکی ہے۔ میں نے مناسب سمجھا کہ انہیں طلوع اسلام سے وابستہ ہونے
کے لیے دہلی آجانے کی دعوت دوں۔ اسی دوران میں ایک اور واقعہ رونما ہو گیا۔
علامہ اقبالؒ ایک قرآنی مرکز قائم کرنا چاہتے تھے جس میں دنیائے اسلام کے ممتاز
اہل علم و تحقیق، مختلف موضوعات پر ریسرچ میں مصروف ہوں، مذاکروں کا اہتمام
ہو، خطبات کا انصرام ہو۔ طلباء تعطیلات گزارنے وہاں آئیں اور اس علمی فضا سے
بہرہ یاب ہوں۔

دارالاسلام پٹھانکوٹ

ان کے ایک والہانہ عقیدت مند، چوہدری نیاز علی خاں نے (جن کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے) اس مرکز کے لیے، یوں کہیے کہ ایک جاگیر وقف کردی۔ اس کا نام دارالاسلام تھا حضرت علامہؒ کا ارادہ خود وہاں منتقل ہو جانے کا تھا۔ لیکن اس کے ابتدائی مراحل طے ہو گئے تو اُن کی طبیعت ناساز ہو گئی۔ انہوں نے تجویز کیا کہ سرِدست وہاں کوئی ایسا شخص بٹھا دینا چاہیئے جو اس کے مبادیات کی دیکھ بھال کر سکے۔ پہلے خیال ہوا کہ میں ملازمت چھوڑ کر وہاں چلا جاؤں لیکن قائدِ اعظمؒ نے مجھے اسکی اجازت نہ دی۔ چنانچہ میرے اور چودھری صاحب مرحوم کے مشورہ سے طے پایا کہ اس کام کے لیے مودودی صاحب کو بلا لیا جائے۔ انہوں نے (غالباً حضرت علامہ کے استصواب سے) مودودی صاحب کو دارالاسلام آنے کی دعوت دی۔ چنانچہ مودودی صاحب ان کی اس دعوت پر دارالاسلام جانے کے لیے حیدر آباد سے پہلے دہلی آئے۔ میرے ہاں ان کی نشستیں بھی رہیں۔ عام طور پر مشہور کیا جاتا ہے کہ علامہ اقبال نے مودودی صاحب کو دعوت دی تھی کہ وہ ایک جدید فقہ کی تدوین کریں اور وہ اسی مقصد کے لیے حیدر آباد سے اِدھر منتقل ہوئے تھے۔ اس کا تو مجھے علم نہیں، لیکن اتنا علم ضرور ہے کہ مودودی صاحب دہلی سے سیدھے دارالاسلام پٹھانکوٹ چلے گئے تھے۔ اور راستے میں حضرت علامہ سے ملاقات کے لیے لاہور ٹھہرے بھی نہیں تھے نہ ہی وہ وہاں سے اُن کی عیادت کے لیے لاہور آئے تھے۔ حالانکہ اس زمانے میں علامہ یوں کہیے کہ مرض الموت میں مبتلا تھے۔ اور نہ ہی اپریل ۱۹۳۸ء میں اُن کی وفات کے بعد ان کی تعزیت کے لیے۔ حتیٰ کہ انہوں نے اُن کی وفات پر اپنے رسالہ ترجمان القرآن میں ایک لفظ تک نہیں لکھا تھا۔ ایک جگہ ضمناً یہ کہا تھا کہ اقبالؒ ان کے لیے ایک مادی سہارا تھا، وہ بھی نہ رہا۔ بہرحال اس طرح یہ حیدر آباد سے منتقل ہو کر دارالاسلام گئے۔ مجھے اس کا احساس ہے اور اب جب میں اس پر نگہِ بازگشت ڈالتا ہوں تو اس کوتاہی پر میرا سر ندامت سے جھک جاتا ہے کہ ہم نے اس وقت مودودی صاحب

کے متعلق کسی تحقیق و تفتیش کی ضرورت نہ سمجھی اور ان کے چند ایک مضامین سے یہ سمجھ لیا کہ وہ فکر اقبالؒ کے دلی ہم نوا اور تحریک پاکستان کے قلبی مؤید ہیں ان نشستوں میں جو میرے ہاں ہوتی تھیں مجھے ان میں انانیت کے جراثیم کی جھلک نظر آتی تھی لیکن میں نے اسے چنداں اہمیت نہ دی"

اسلام اور پاکستان کیخلاف گہری سازش (ملاحظہ خطاب جناب پرویز کنونشن منعقدہ اکتوبر ۱۹۷۶ء
صفحہ ۲۲ تا ۲۵

دوسرا اقتباس

ادھر آنے کے بعد انہوں نے ایک سلسلہ مضامین شروع کیا جس میں تحریک پاکستان کے بنیادی اصولوں کی تائید ہوتی تھی (یہ ۳۸-۱۹۳۷ء کی بات ہے) اس سے ان کی مقبولیت میں بڑا اضافہ ہوا۔ ورنہ اس سے پہلے (کم از کم ان علاقوں میں) انہیں کوئی جانتا تک نہیں تھا۔ بعد میں یہ مضامین ان کی کتاب "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ اول و دوم میں شائع کر دیے گئے (حصہ اول اور دوم) کی تخصیص تو خاص طور پر ذہن میں رکھیئے کیونکہ اس کے بعد حصہ سوم میں یہ اپنی نقاب الٹ کر سامنے آ گئے تھے۔)

(اسلام اور پاکستان کے خلاف گہری سازش صفحہ ۲۵

اس کے بعد جناب پرویز مودودی صاحب کی کتابوں سے متعلقہ اقتباسات پیش کرتے ہیں جن سے مودودی صاحب کی قلابازی کا پتہ چلتا ہے اور آگے چلکر "یہ ہیں وہ بزرگوار جو اپنے آپ "حقیقی مسلمان" اور باقی سب کو پیدائشی مسلمان قرار دیتے ہیں۔ اس مقام پر میں اتنا اور عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ (جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے) مودودی صاحب کو پنجاب کی طرف آنے کی دعوت دینے کے "جرم" کا میں بھی مرتکب ہوں۔ لیکن میں کسی حد تک اس حقیقت کو کفارہ کے طور پر پیش کرنا چاہتا ہوں کہ جب مودودی صاحب نے ان خیالات کا اظہار کیا (جن اقتباسات کے بارے میں عرض کیا گیا ہے۔ راقم) تو سب سے پہلے میں نے ان کی مخالفت کی اور کھلے الفاظ میں مخالفت کی حالانکہ اس زمانے میں شاید ہی کسی اور نے انہیں پہچانا ہو۔ (ملاحظہ

ہو طلوعِ اسلام بابت دسمبر ۱۹۷۰ء)

(اسلام اور پاکستان کے خلاف گہری سازش ص۳۰)

قارئین کرام! میری کتاب میں آپ دیکھیں گے کہ حضرت مولانا محمد یوسف بنوری فرماتے ہیں کہ میں "مجرم" ہوں کہ میں نے چالیس برس تک اس فتنۂ عظیم (مودودی) کے متعلق لب کشا نہ ہوا۔ پرویز صاحب بھی اپنے کو ایسے ہی جرم کا مرتکب بتاتے ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ راقم ایک لمحہ بلکہ لمحہ کے لیے بھی حضرتِ مودودی سے متاثر نہیں ہوا۔

مقامِ شکر ہے کہ پرویز صاحب کی یہ تحریر ہماری ان اخذ کردہ معلومات سے ہم آہنگ ہے جو ہم نے جناب سید ابوالاعلیٰ مودودی اور پرویز صاحب کے متعلق حاصل کی تھیں ہماری رائے کا پہلا اظہار "جماعت اسلامی کا رُخِ کردار" نامی کتاب کی صورت میں ہوا۔ اور دوسرا اس کتاب کی شکل میں راقم نے مودودی صاحب کی تائید و حمایت کا جرم کبھی نہیں کیا میری بصیرتِ ایمانی اور فراستِ قرآنی نے کبھی ان کی طرف مائل نہیں کیا۔

ہم نے دو اقبالی مجرم حاضرِ پیشِ ملت کر دیے ہیں ایک حقیقتاً اقبالی، دوسرے اقبالی مجرم۔ حقیقی اقبالی مجرم نے مودودی صاحب کی ذہنی قلابازیوں اور دروغ بافیوں کو بے نقاب کر کے اپنے جرم کا کفارہ ادا کر دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مودودی کے چہرۂ افکار کے اصلی خط و خال دیکھنے کے لیے پرویز کا آئینہ تحریر ضروری ہے۔ حضرت مولانا کو اب احساس ہوا ہے کہ انہوں نے مودودی سے صرفِ نظر کر کے فاش غلطی اور ملی کوتاہی کی ہے۔ وہ اب کفارہ کی ادائیگی کے لیے سوئے فرض تیز خرام ہیں۔ خدا قبول فرمائے۔

(چودھری حبیب احمد)

بیوروکریسی اور مودودی صاحب

پرویز صاحب رقمطراز ہیں -

"میں نے محترم علی محمد راشدی صاحب کے مقالہ سے جو مختصر سا اقتباس پہلے دیا ہے - اس میں انہوں نے کہا ہے کہ "ماسوا دو تین افسروں کے کسی اور سرکاری افسر نے اس زمانے میں ہماری کوئی مدد نہیں کی - بلکہ ان میں سے اکثر تو پاکستان کے تخیل کا مضحکہ اڑاتے رہتے تھے - اور اس ڈر کے مارے کہ انگریز یا ہندوان سے خفا نہ ہو جائے وہ وزڈمر پلیس کے راستے سے گزرتے ہی نہیں تھے رواضح رہے کہ وزڈمر پلیس وہ مقام تھا جہاں سیٹھ عبداللہ ہارون (مرحوم) رکن اسمبلی کی حیثیت سے سرکاری مکان میں قیام پذیر تھے - اور وہیں پاکستان کی اسکیم مرتب کرنے کا کام ہوا کرتا تھا) اس کے بعد راشدی صاحب نے لکھا ہے :-

" بعد میں جب پاکستان بن گیا تو اس زمانے کے کئی جغادری افسر . . . . . پاکستان کے مرکز اور صوبوں میں بڑے بڑے عہدوں پر قابض ہو گئے - اور لوگوں کے سامنے یہ دعوے کرتے رہے کہ وہ شروع سے پاکستان کے لیے کام کرتے رہے تھے - حالانکہ ان کے یہ دعوے غلط تھے - ان کی ہمدردیاں پاکستان کی طرف اس وقت مڑیں جب ان کو معلوم ہو گیا کہ پاکستان کا وجود اب ناگزیر ہے" (روزنامہ جنگ کراچی ۲۰ مارچ ۱۹۷۲ء)

یہ بالکل صحیح ہے میں خود مرکزی حکومت پاکستان سے وابستہ تھا - اور یہ تمام حالات میرے بھی چشم دید ہیں - ان افسروں کی کیفیت یہ تھی کہ انگریز اور ہندو کے ڈر سے مسلم لیگ کے تو کبھی دفتر کے سامنے سے بھی نہیں گزرتے تھے - لیکن ان کے بنگلوں پر مودودی صاحب کی دعوتیں ہوا کرتی تھیں جو تحریک پاکستان کے اس قدر مخالف تھے - یہی حضرات یہاں پہنچنے پر حکومت کی مسندوں پر متمکن ہو گئے - انہی کے بل بوتے پر تشکیل پاکستان کے بعد مودودی صاحب کی جرأتیں اس قدر بے باک ہو گئیں اور انہی کی سازشوں سے ان کی تقریریں بھی ریڈیو پر نشر ہونے لگیں (ریڈیو پر تقریروں کے علاوہ مودودی صاحب پاکستان کے مختلف شہروں میں بھی اس قسم

ل مولانا بھی وفات پا گئے - (مرتب)

کی تقریریں کرتے پھر رہے تھے۔) جاننے والے جانتے ہیں کہ اس قسم کے انتظامات نچلے افسروں کے توسط سے سرانجام پا جاتے تھے۔ گورنر جنرل (قائدِ اعظمؒ) کو نہ اسکی فرصت تھی اور نہ ہی اسکی ضرورت کہ وہ معلوم کرتے پھرتے کہ ریڈیو پر تقریروں کی اجازت کس کس کو مل رہی ہے۔ ویسے بھی وہ بڑے ہی وسیع الظرف واقع ہوئے تھے۔ غیر محل نہ ہوگا کہ اگر میں اس مقام پر ایک اور اہم نقطہ بھی سامنے لے آؤں جس سے ہویدا ہو کہ تشکیلِ پاکستان کے بعد مودودی صاحب کس برتے پر اس ملک میں مسلسل انتشار پھیلاتے چلے آ رہے تھے۔ ۱۹۵۵ء میں حکومتِ پاکستان نے فیصلہ کیا کہ خارجہ پالیسی میں ان کا رجحان امریکی بلاک کی طرف ہونا چاہیئے۔ اس مقام پر مودودی صاحب نے لاہور اور کراچی کے پبلک جلسوں میں تقریر کرتے ہوئے کھلے الفاظ میں کہا کہ

"اگر یہ بلاک فی الواقعہ یہ چاہتا ہے کہ کمیونزم کی روک تھام کے لیے اسے مسلم عوام کا دلی تعاون حاصل ہو تو اسے اپنی بنیادی پالیسی میں بنیادی تغیر کرنا پڑے گا۔ اسے یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ اسے مسلم بلاک کے حکمرانوں سے ساز باز کرنا ہے یا مسلم ممالک کے عوام کا تعاون حاصل کرنا ہے۔ یہ اس کے سوچنے کا کام ہے کہ اسے کونسی راہ اختیار کرنی چاہیئے۔ اسے حکمرانوں کی ضرورت ہے جو عوام پر سطحی اثر بھی نہیں رکھتے یا عوام کے تعاون کی ضرورت ہے جو طاقت کا اصل سرچشمہ ہوتے ہیں۔۔ مسلمان ملکوں کے ساتھ آپ کی جو پالیسی اب تک چلی آ رہی ہے وہ ایسی ہرگز نہیں ہے کہ پاکستان اور دوسرے ممالک کے عوام کا دلی تعاون آپ کو حاصل ہو سکے۔"

(اخبار تسنیم مورخہ ۱۶ تا ۲۰۔ دسمبر ۱۹۵۵ء)

میں اس تقریر پر کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ یہ سب کچھ اپنی زبان سے آپ کہہ رہی ہے۔ حیرت ہے کہ اس پر حکومت کی طرف سے کوئی نوٹس نہ لیا گیا۔ حالانکہ کسی مملکت کے شہری کا بیرونی طاقت کو اس قسم کی دعوت دینا، اپنی مملکت کے خلاف بغاوت کے مترادف ہے۔ انہی دنوں اخبارات میں اس قسم کی خبریں شائع ہوئیں کہ مودودی صاحب نے چوہدری محمد علی صاحب سے جو ان دنوں پاکستان کے

وزیر اعظم تھے، راتوں کو ملاقاتیں کرتے ہیں؟ اس پر مستفسر کے سوال کے جواب میں
حسب ذیل خط اخبارات میں شائع کیا گیا:

"آپ کے سوال کا جواب یہ ہے کہ چوہدری محمد علی سے میرے ذاتی تعلقات پندرہ سولہ
برس پرانے ہیں اور برادرانہ حد تک۔ پاکستان بننے سے پہلے بھی وہ میرے ہاں تشریف
لاتے تھے۔ اور میں اُن کے ہاں جاتا تھا۔ پاکستان بننے کے بعد وہ ہمیشہ مجھ سے ملتے رہے
ان کی سرکاری پوزیشن اور میری سیاسی پوزیشن کبھی ان تعلقات میں مانع نہیں ہوتی
اب ان کے وزیر اعظم بن جانے کے بعد آخر یہ ذاتی دوستی کیوں ختم ہو جاتے۔

بعض لوگوں نے ازراہِ شرارت میری اور اُن کی ملاقات کو "خفیہ ملاقات" قرار دیا ہے
اور اکتوبر کی ایک ملاقات کا ذکر اس طرح کیا ہے، گویا میرے اور اُن کے درمیان کوئی سازباز
ہوا تھا۔ حالانکہ میں جب کبھی کراچی جاتا ہوں ان سے دو ایک ملاقاتیں ضرور ہوتی ہیں
اور چونکہ رات ہی کا وقت میری اور ان کی فرصت کا ہو سکتا ہے۔ اس لیے ملاقات رات
ہی کے وقت ہوتی ہے۔ اس ذاتی میل جول کی کوئی سیاسی حیثیت نہیں ہے۔ اس لئے کوئی
وجہ نہیں ہے کہ اس کا ذکر اخبارات میں آئے۔ البتہ جس روز امیر جماعت اسلامی
اور وزیر اعظم پاکستان کی کوئی بات چیت سیاسی گفت و شنید کی نوعیت کی ہوگی۔ تو
انشاء اللہ وہ منظر عام پر ہوگی۔

افسوس ہے سستیا بازوں کو ہر چیز میں سستیا بازی اور گٹھ جوڑ ہی نظر آتا ہے
مگر میں ان کا ہم جنس نہیں ہوں۔ نہ کسی کی طعن و تشنیع سے اپنی وضع میں تغیر
کر سکتا ہوں۔"

خاکسار (ابوالاعلیٰ)

بحوالہ تسنیم مورخہ ۶ $\frac{1}{56}$

یہ ان دنوں کی بات ہے جب پولیس جماعت اسلامی کے دفاتر پر چھاپے مار کر
ان کے بہت سے کاغذات لے گئی تھی۔ اس زمانہ کے وزیر اعلیٰ (پنجاب) ڈاکٹر خان صاحب
نے اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے اپنی پریس کانفرنس میں کہا تھا کہ:۔

جماعت اسلامی اچھے کام نہیں کر رہی۔ دوسرے ممالک میں ایسی تخریبی کارروائیوں کو کبھی برداشت نہیں کیا جاتا جو لوگ بیرونی ممالک کے سامنے پاکستان کی بھیانک تصویر پیش کریں انہیں کبھی وفادار شہری نہیں کہا جا سکتا ایسی کارروائیاں کرنے والے کبھی پاکستان کے مخلص بہی خواہ نہیں سمجھے جا سکتے۔"

اس کے بعد انہوں نے کہا:۔

"حال ہی میں حکومت مغربی پاکستان کو ڈاکخانہ سے سنسر کے دوران قابل اعتراض مطبوعہ لٹریچر ہاتھ آیا جو مشرق وسطیٰ کی بعض سیاسی جماعتوں کے نام بھیجا جا رہا تھا۔ جماعت اسلامی کے دفاتر پر چھاپے اسی بنا پر مارے گئے ہیں۔"

بحوالہ ڈان مورخہ ۱۶/۵/۶
گہری سازش (صفحہ ۴۹ تا ۵۱)

میں مولانا مودودی کو جانتا ہوں

آپ کے موقر اخبار میں سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی بابت بہت سے خطوط شائع ہوئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے والوں میں سے کوئی بھی سید صاحب سے پوری طرح واقف نہیں میں مولانا مودودی صاحب کو ۳۵ سال سے جانتا ہوں۔ اور ان کے تمام حالات سے اچھی طرح واقف ہوں۔ اس لیے مناسب سمجھتا ہوں کہ میں بھی کچھ عرض کروں۔ اختصار کے خیال سے پورے حالات تو بہر حال نہیں دیئے جا سکتے۔ مختصراً عرض ہے کہ حصولِ علم و فضل کے بعد مودودی صاحب کی پبلک زندگی کا آغاز جمعیت العلمائے ہند کے اخبار "الجمعیتہ" کی ایڈیٹری سے ہوتا ہے کون نہیں جانتا کہ جمعیت العلمائے ہند اوّل درجے کی کانگریسی جماعت ہے۔ چنانچہ مودودی صاحب بھی اس وقت پکے کانگریسی اور مسلم لیگ کے سخت مخالف تھے۔ چند سال بعد الجمعیتہ کی مالی حالت خراب ہو جانے کی وجہ سے چونکہ سید صاحب کو چھ چھ ماہ کی تنخواہ نہ ملتی تھی، وہ وہاں سے الگ ہو گئے۔ اور بظاہر کانگریس میں بھی نہ رہے لیکن لیگ سے اختلاف بھی نہ گیا۔ بلکہ اب تک

موجود ہے۔ مودودی صاحب کی ہمیشہ ہی سے اپنے علم و فضل کے متعلق بے انتہا خوش اعتمادی رہی ہے۔ اور وہ ابتدائے عمر سے لیڈر بننے اور پسماندہ مسلم قوم کی خدمت کرنے کا تہیہ کر چکے تھے۔ دہلی کے بعد وہ اسی خیال سے حیدر آباد تشریف لے گئے۔ اور کئی سال وہاں سے ایک رسالہ نکالتے رہے۔ اور بہت سی کتابیں بھی شائع کیں۔ جو سب کی سب مذہبی اصلاح کے خیال سے تحریر کی گئی تھیں۔ بڑی کوششوں کے بعد پٹھانکوٹ میں آپ نے ایک دارالاسلام قائم کیا۔ جو تقسیم ہند تک قائم رہا۔ اس کے بعد وہ اپنے رفقائے کار سمیت پاکستان میں تشریف لے آئے۔ اس دوران میں آپ نے ایک جماعت قائم کر لی تھی جس کا نام جماعتِ اسلامی ہے۔ لیکن یہ جماعت بنانے سے پہلے مودودی صاحب اس بات کے سخت مخالف تھے کہ مذہبی لائنوں پر مذہبی نام سے کوئی جماعت بنائی جائے۔ کیونکہ اس سے اسلام میں فرقہ بندی زیادہ ہوتی ہے۔ لیکن تجربے کے بعد آپ کو یہ رائے بدلنی پڑی۔

اس جماعت کا عقیدہ یہ ہے (گو اس کا علی الاعلان اظہار نہیں کیا جاتا) کہ اس وقت روئے زمین پر کہیں بھی کوئی ایسا مسلمان موجود نہیں جو حقیقت میں مسلمان ہو۔ کیونکہ مودودی صاحب کی رائے میں مسلمان صرف وہی ہے جو خود رسول کریم یا حضورؐ کے صحابہ کبار جیسا متقی اور متورع ہو۔ اس جماعت کے ارکان کا یہ بھی عقیدہ ہے، کہ مودودی صاحب یا ان کے کسی خلیفہ کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے بعد ہر مسلمان پکا اور سچا مسلمان بن سکتا ہے۔

جہاں تک سیاسی خیالات کا تعلق ہے، پہلے وہ سخت کٹر کانگریسی تھے۔ پھر جمعیتہ کے ساتھ ساتھ کانگریس سے بھی الگ ہو گئے۔ لیکن مسلم لیگ کے ہمیشہ مخالف رہے اور اب تک سخت مخالف ہیں۔ آپ کا قول ہے کہ مسلم لیگی سب کے سب مغربیت زدہ لوگ ہیں، ان کی نظر، ان کا دل، ان کے خیالات سب مغربی ہیں جن کو اسلام سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ مسلم لیگ نے قیام پاکستان کے واسطے جو جہاد کیا ہے، آپ اس کے بھی مخالف تھے۔ گو کہنے کو آپ نے اپنی جماعت کو ہدایت کر رکھی تھی کہ اپنے آپ کو غیر جانبدار رکھو۔ لیکن جتنے "اسلامی" نمائندوں سے تبادلۂ خیالات کا

موقع ملا سبھی کو قیام پاکستان کے خلاف پایا۔ اور اس اختلاف کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ لوگ جو پاکستان کی بنیاد ڈال رہے تھے، سچے مسلمان نہیں تھے۔ لیکن اب جو پاکستان بن گیا تو مودودی صاحب اور آپ کی جماعت سب کی یہ خواہش ہے کہ اس کی حکومت اپنے ہاتھ میں لے لیں۔

مسلمان قوم کی تباہی کے ہزاروں اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی ہے کہ بہت کم مسلمانوں کو اپنی صحیح قدر و قیمت معلوم ہے۔

مودودی صاحب کو حقیقت میں اتنا بھی تو معلوم نہیں کہ آج کل کن کن علوم میں مہارت کی ضرورت ہوتی ہے اور ان کے نام کیا کیا ہیں۔ مودودی صاحب کی پاکستان دشمنی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ آپ نے جہادِ کشمیر جیسی ضروری اور متبرک تحریک کے خلاف فتویٰ دیا اور فقہی عذر لنگ پیش کیا اس سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ کو فنِ حکومت کی الف بے تے بھی نہیں آتی۔ چنانچہ مولانا شبیر احمد عثمانی سے خط و کتابت کرنے کے بعد آپ نے اپنی غلطی یا دوسرے الفاظ میں علمی ناواقفیت کا اقرار بھی کر لیا۔ اب قارئینِ کرام خود فیصلہ کر لیں کہ ہم پاکستانی اپنے وطنِ عزیز کی تقدیر ایسے لوگوں کے ہاتھ میں کس طرح دے سکتے ہیں۔ ہمارے وطنِ عزیز کی عمر ابھی صرف دو سال کی ہے۔ باہر یہ چاروں طرف دشمنوں سے گھرا ہوا ہے اور اندر ہزاروں جاسوسوں سے بھرا ہوا ہے

ہم مودودی صاحب اور آپ کی جماعت سے بہت عاجزانہ درخواست کرتے ہیں کہ وہ حکومت کرنے کی بجائے مسلمانوں کے اخلاق کی اصلاح کی کوشش کریں اور ان میں اسلامی تعلیم پھیلائیں۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو ملک کو بھی فائدہ ہوگا اور پبلک خود بخود ان کو حکومت کے تخت پر لا کر بٹھا دے گی۔

از، محمد محترم انصاری

مراسلات "جنگ" کراچی ۱۴۔ نومبر ۱۹۴۹ء

باب سوئم

حمید نظامی- نوائے وقت

——— اور ———

مودودی

پہلا اداریہ لیڈری کی دکان چمکانے کے لیے

"ہم ان لوگوں کے حامی نہیں جو محض اپنی لیڈری کی دکان کو چمکانے کے لیے شریعت کا نعرہ بلند کر رہے ہیں۔ اور ایسے لوگوں کی تعداد کچھ کم نہیں۔ اِن میں سے ایک گروہ ایسے افراد کا ہے جو مختلف وجوہ سے ۱۵۔ اگست ۱۹۴۷ء تک پاکستان کی مخالفت کرتے رہے ہیں۔ اور آج بھی اُن کی رائے یہی ہے کہ مسلم لیگ نے مسلمانوں کے سامنے پاکستان کا نصب العین رکھ کر غلطی کی۔

مگر چونکہ عامۃ المسلمین پاکستان کے خلاف کوئی بات سننے کے روادار نہیں اور یوں بھی پرانی پالیسی اب خالی از خطرہ نہیں۔ اس لیے یہ بزرگ نئے بھیس بدل کر مسلمانوں کے سامنے آ رہے ہیں۔ بقول کسے جن لوگوں کے نزدیک کل تک ایک مسلمان حکومت کے قیام کا مطالبہ غلط تھا، آج وہ اسلامی حکومت کے قیام کے داعی و علمبردار ہیں۔ مگر مسلمانوں اور اسلام کی خدمت نہ پہلے ان کا مقصد تھا اور نہ اب ہے۔ اِن بزرگوں نے نہ پہلے کبھی مسلمانوں کی جدوجہد میں حصہ لیا۔ اور نہ آج کوئی حصہ لے رہے ہیں۔ ان کی حیثیت پہلے بھی نکتہ چین تماشائیوں یا دشمن کے خیمہ برداروں کی تھی۔ اور آج بھی وہ دور از کار موشگافیوں میں مشغول ہیں اور مین میخ نکالنے کو ہی قوم کی سب سے بڑی خدمت سمجھتے ہیں۔"

(نوائے وقت لاہور، ۴ جولائی ۱۹۴۸ء)

یہ جناب حمید نظامی مرحوم و مغفور ایڈیٹر نوائے وقت بانیٔ اخبار ھذا فرما رہے ہیں۔ حبیب چودھری نہیں۔ اب تو تسلیم کر لو کہ ان کی نیتیں

اور طور و اطوار کیا ہیں ؟ یا یہ قسم اٹھا رکھی ہے کہ ہم اس تنخواہ میں تاریخ تحریک پاکستان کی زندہ شہادتوں اور روز روشن کی طرح واضح صداقتوں کو تسلیم ہی نہیں کریں گے، بلکہ ان کی پیش کردہ فریب انگیز اور دجل آمیز تحریرات کو سچ بنا کر سامنے لائیں گے ؟ (راقم)

اسلام کی آڑ

دوسرا اداریہ

" جو لوگ اس مطالبے (اسلامی حکومت) کی آڑ لے کر اور اسلام کو بہانہ بنا کر ملک کی جڑیں کھوکھلی کرنے میں مصروف ہیں۔ وہ دانستہ یا نادانستہ ملک سے غداری کر رہے ہیں۔ اور ان سے وہی سلوک ہونا چاہیئے جو دنیا کے دوسرے ملکوں میں غداروں سے ہوتا ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ حضرت عثمانؓ اسلام کے نام پر ہی شہید کیے گئے۔ حضرت علیؓ کو جام شہادت پلانے والے بھی اسلام کے نام پر ہی میدان عمل میں اترے تھے۔ اور خارجیوں کا نعرہ بھی اسلام ہی کا تھا "

(نوائے وقت لاہور۔ ۱۰ر اکتوبر ۱۹۴۸ء)

حمید نظامی اور مودودی

جناب حمید نظامی مرحوم و مغفور بانی "نوائے وقت" مودودی صاحب کو کیا سمجھتے تھے۔ اور اپنے ہزاروں، لاکھوں قارئین کو ان کے خط و خال دکھانے کی کوشش کرتے تھے۔ آج نسل نو کی نظر سے ان کی محققانہ، بے باکانہ اور مومنانہ تحریرات کو چھپایا جا رہا ہے۔ اور حقیقتیں ان کے سامنے افسانے اور افسانے حقیقتیں بنا کر پیش کیے جا رہے ہیں۔ (راقم)

فرمودات نظامی

تیسرا اداریہ

"ہم مولانا مودودی کو مذہبی سے زیادہ ایک سیاسی شخصیت سمجھتے ہیں - اور ہماری رائے میں ان کے مقاصد دینی نہیں سیاسی ہیں۔ وُہ مذہب کا نام اپنی سیاست میں کامیابی کے لیے استعمال کرتے ہیں ۔"

(روزنامہ نوائے وقت لاہور ولائلپور ۱۳ جون ۱۹۵۵ء ص ۳)

نام اور سہرے کا

جناب مودودی صاحب نے ۱۹۵۳ء کے واقعات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک بیان دیا تھا۔ کہ :۔

"اس کارروائی سے دو باتیں میرے سامنے بالکل عیاں ہو گئیں۔ ایک یہ کہ احرار کے سامنے اصل سوال تحفظِ ختم نبوت کا نہیں ہے، بلکہ نام اور سہرے کا ہے۔ اور یہ لوگ مسلمانوں کے جان و مال کو اپنی اغراض کے لیے جوئے کے داؤ پر لگا دینا چاہتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ رات کو بالاتفاق ایک قرارداد طے کرنے کے بعد چند آدمیوں نے الگ بیٹھ کر سازباز کی ہے اور ایک دوسرا ریزولیوشن بطور خود لکھ لائے ہیں میں نے محسوس کیا کہ جو کام اس نیت اور طریقوں سے کیا جائے۔ اس میں کبھی خیر نہیں ہو سکتی۔ اور اپنی اغراض کے لیے خدا اور رسول کے نام سے کھیلنے والے جو مسلمانوں کے سروں کو شطرنج کے مہروں کی طرح استعمال کریں۔ اللہ کی تائید سے کبھی سرفراز نہیں ہو سکتے .... الخ

(روزنامہ تسنیم، لاہور ۲۔ جولائی ۱۹۵۵ء)

امیرِ جماعتِ اسلامی کے اس بیان پر جناب حمید نظامی نے حسبِ ذیل اداریہ لکھا ہے :۔

نقاب اٹھ جانے کے بعد

چوتھا اداریہ

مولانا مودودی سے بھی بجا طور پر دو سوال کئے جا سکتے ہیں

ا- کیا یہ راز آپ پر آج فاش ہوئے ہیں؟ اگر آپ پر یہ خود غرضی شروع سے ہی روشن تھی تو جب "مسلمانوں کے سروں کو" آپ کے قول کے مطابق "شطرنج کے مہروں کے طور پر استعمال کیا جا رہا تھا۔ اس وقت آپ نے قوم کو کیوں خبردار نہ کیا کہ اس سے دھوکہ کیا جا رہا ہے؟ ۵ مارچ کو گورنمنٹ ہاؤس کے اس جلسہ میں جو امن کی اپیل کے لیے بلایا گیا تھا، آپ کا رویہ آپ کے اس بیان کے بالکل برعکس تھا ــــ اور مسلمانوں کے سروں کو بچانے کے لیے امن کی اپیل پر دستخط کرنے سے آپ نے صاف انکار کر دیا تھا۔ امن کے لیے اس اجلاس کی ناکامی کی ذمہ داری اگر کسی فردِ واحد پر عائد کی جا سکتی ہے تو وہ آپ ہیں۔ آخر اس وقت گورنر پنجاب، وزیر اعلیٰ پنجاب اور لاہور کے ذمہ دار اکابر و عمائد کے جلسہ میں آپ نے اس راز کو کیوں فاش نہ کیا کہ سوال تحفظِ ختمِ نبوت کا نہیں بلکہ نام اور سہرے کا ہے۔ اور خود غرض لوگ اپنی ذاتی اغراض کے لیے خدا اور رسول کے نام سے کھیل رہے ہیں اور مسلمانوں کے سروں کو شطرنج کے مہروں کے طور پر استعمال کر رہے ہیں؟ آج ۲۷/۲۸ ماہ بعد اس انکشاف سے تو ایک آدمی اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ آپ کے سامنے بھی سوال تحفظِ ختمِ نبوت کا نہیں "نام اور سہرے" کا تھا۔ اور آپ اپنی اغراض کے لیے خدا اور رسول کے نام سے کھیل رہے ہیں۔ اور آپ نے بھی مسلمانوں کے جان و مال کو اپنی اغراض کے لیے جوئے کے داؤں پر لگا دیا۔"

ب:- دوسرا سوال یہ ہے کہ آپ جو پوری ملتِ اسلامیہ کی انقلابی قیادت کے دعویدار ہیں۔ کیا آپ ایسے ہی ڈھلمل یقین آدمی ہیں کہ خود اپنے قول کے مطابق آپ یہ رائے قائم کرتے ہیں کہ "...... میں نے فوراً یہ رائے قائم کی کہ مجھے اٹھ کر ابھی کنونشن سے علیحدگی کا اعلان کر دینا چاہیئے۔ چنانچہ میں نے ....
......" لیکن چند ہی منٹ بعد خود آپ کے بیان کے مطابق "اس کے بعد دوسرا خیال میرے ذہن میں آیا....." اور آپ نے اپنی رائے بدل دی۔ اور آپ کنونشن سے چمٹے رہے۔ اور اب پورے سوا دو سال بعد آپ کو یہ خیال آیا کہ آپ کو مسلمانوں کو

اس خطرہ سے خبردار کر دینا چاہیئے۔ خود ہی فرمایئے کہ ،
ایسے ڈھل مل یقین اور مذبذب کیریکٹر کے لیڈر کے متعلق اس امر کی کیا ضمانت ہے کہ وہ آیندہ کسی ایسے ہی کرائسس کے وقت قوم کی کشتی کو عین منجدھار میں نہ جا ڈبوئے گا۔ اخبار نوائے وقت لاہور (ٹائیلپوس) ۱۹ جولائی ۱۹۵۵ء ص ۳، ۴)

کج بحثی پر افسوسناک اصرار،

:- پانچواں اداریہ :-

مودودی صاحب نے مسئلہ کشمیر کے متعلق اپنے اخبار میں ایک بیان چھپوایا تھا۔ ہم نے اس بیان پر دو دن کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ اور نہ ہمارا یہ ارادہ تھا کہ اب ہم اس موضوع پر کچھ لکھیں۔ اس لیے کہ ہم اس بحث کو طول نہیں دینا چاہتے تھے۔ مودودی صاحب مصر ہیں کہ مسلمانوں کو جہاد کشمیر میں کشمیری مسلمانوں کی امداد نہیں کرنی چاہیئے کیونکہ کشمیر کی جنگ مولانا کے نزدیک پاکستانیوں کے جہاد نہیں بلکہ اس لڑائی میں پاکستانی مسلمانوں کا لڑنا از روئے قرآن ناجائز ہے۔

"مودودی صاحب علم دین کے لحاظ سے کچھ زیادہ ممتاز شخصیت نہیں، آپ ایک اچھے انشاء پرداز اور ادیب ہیں، مگر دین کے متعلق آپ کا علم کچھ زیادہ قابل اعتماد نہیں۔"

اس لیے خیال تھا کہ اگر آپ سے بہتر اور فاضل تر علماء آپ کو سمجھا دیں گے کہ اس معاملہ میں آپ کو غلطی ہوئی ہے۔ تو آپ اس پر اصرار نہیں کریں گے۔ مگر بدقسمتی سے مودودی صاحب علم و ادب میں منتہی ہونے کے دعویدار ہی نہیں امارت کے بھی مدعی ہیں۔ اس لیے آپ برابر اس پر اصرار کیے جا رہے ہیں کہ باقی سب کی رائے غلط ہے اور میں جو کہتا ہوں وہی صحیح ہے۔ قرآن کی رُو سے بھی مولانا صاحب کے موقف کو متعدد علماء نے غلط ثابت قرار دیا۔ مگر مولانا مصر ہیں کہ رائے میری ہی درست ہے۔ ہم نے مایوس ہو کر یہ فیصلہ کیا تھا کہ مولوی صاحب کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ کیونکہ بحث جاری رکھنے کا نتیجہ یہی تھا کہ زیادہ

نہ بھی چند لوگ ہی مولانا کے غلط استدلال سے گمراہ ہو کر مجاہدین کی امداد سے دستکش ہو جاتے۔ مگر مولانا نے نہ صرف ایک ایسا بیان جاری کر دیا جو ان کے پرانے ارشادات سے بھی زیادہ خطرناک ہے بلکہ اب یہ بیان کثیر تعداد میں چھپوا کر تقسیم بھی کیا جا رہا ہے اور عامۃ المسلمین میں کشمیر کے متعلق غلط فہمیاں اور انتشار پھیلانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ خدا جانے کیوں مگر اس مرتبہ قرآن کو چھوڑ کر مولانا صاحب نے اس بیان میں زیادہ تر ہندوستان اور پاکستان کے مابین مختلف اقتصادی، مالی اور تجارتی معاہدوں کا ذکر کیا۔ اور یہ فرمایا ہے کہ پاکستان اور ہندوستان کی مملکتوں کے معرضِ وجود میں آنے سے پہلے ہی ان دونوں کے درمیان معاہدہ ہو گیا تھا۔ کیونکہ یہ دونوں نئی حکومتیں ایک ہی برطانوی سکیم کے ماتحت قائم ہوئیں۔"

(اداریہ نوائے وقت ۱۵ اگست ۱۹۴۸ء)

مودودی خارجیت اپنے اصلی رنگ میں

چھٹا اداریہ

"جن کو ان کے خیالات سننے کا اتفاق ہوا ہے۔ ان کے لیے جماعت کے سیکرٹری کا خط قطعاً وجہ حیرت نہیں تھا۔ کیونکہ جماعت مودودی کے ارکان مسلمانوں بالخصوص فوجیوں میں اس قسم کا پروپیگنڈہ کرتے رہتے ہیں۔ اب عبدالجبار غازی صاحب نے یہ شکایت کہ ان کی جماعت کے متعلق یہ کہنا کہ وہ مسلمانوں کو فوجی بھرتی سے روکتی ہے غلط ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ دفاع کی تیاریوں میں پوری سرگرمی کے ساتھ حصہ لینا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ ظاہر ہے کہ دفاع کی تیاری میں پوری سرگرمی فوجی بھرتی کے بغیر نہیں دکھائی جا سکتی کیونکہ اس زمانہ میں فوج کے بغیر کسی ملک کا تحفظ یا دفاع ناممکن ہے۔ مگر "پوری سرگرمی" کی ترغیب کے باوجود امیر جماعت صاحب فوجی بھرتی کو دفاع کی تیاریوں سے ایک الگ چیز سمجھتے ہیں۔ اور جب وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم

مسلمانوں کی دفاع کی تیاریوں میں پوری سرگرمی کے ساتھ حصہ لینے کی ترغیب دیتے ہیں تو وہ فوج میں بھرتی کو دفاع کی ان تیاریوں سے علیحدہ چیز سمجھتے ہیں جبکہ وہ مسلمانوں کو ترغیب دیتے ہیں چنانچہ ترغیب دینے کے اس دعوے کے فوراً بعد ارشاد ہوتا ہے کہ وہ عام مسلمانوں کا فوج میں بھرتی ہونے نہ ہونے کا سوال تو اس کا فیصلہ ہم خود انکی صوابدید پر چھوڑتے ہیں۔ اس صورتِ حال کی بنا پر جس کا ذکر اس بیان کے آخر میں کیا جارہا ہے۔ ہم انہیں اس سلسلہ میں کوئی مشورہ دینے سے معذور ہیں۔ یعنی مودودی جماعت "مسلمانوں کو" دفاع کی تیاریوں میں پوری سرگرمی سے حصہ لینے کی ترغیب تو دیتی ہے مگر مندرجہ بالا سطور کے مطابق فوج میں بھرتی ہونے نہ ہونے کے سوال کا فیصلہ ان کے صوابدید پر چھوڑتی ہے۔ گویا فوج میں بھرتی کے بغیر بھی دفاعی تیاریوں میں حصہ لیا جاسکتا ہے! ارشاد ہوتا ہے کہ اس صورتِ حال کی بنا پر جس کا ذکر اس بیان کے آخر میں کیا جارہا ہے "ہم انہیں اس سلسلہ میں مشورہ دینے سے معذور ہیں۔" یہ فقرہ خاص طور پر اہم ہے۔

امیر صاحب یا تو خود احمق ہیں یا حکومت پاکستان کو احمق سمجھتے ہیں کہ وہ ان کی اس پرائیویٹ تنظیم کی حیثیت سے فوج سے تعاون منظور ہے مگر فوج میں بھرتی نامنظور۔ یہ تحریر منافقت اور ریاکاری کا ایک نہایت دلچسپ نمونہ ہے

. . . .

جماعت اسلامی ہندوستان میں بھی ہے۔ اور اس کے امیر بھی مودودی صاحب ہی ہیں۔ یہ کیا بات ہے کہ ان کے سارے فتوے پاکستان کے لیے ہی وقف ہیں؟ بندہ پرور! آپ غدار اور دشمن کے ایجنٹ نہیں ہوں گے۔ مگر خود ہی انصاف فرمائیے غدار اور دشمن کے ایجنٹ پاکستان کو اس سے زیادہ کیا نقصان پہنچا سکتے ہیں؟

(اداریہ نوائے وقت ۲۹۔ اکتوبر ۱۹۴۸ء)

مودودی خارجیت

مکرمی !

مودودی خارجیت پر نوائے وقت مورخہ ۲۸۔ اکتوبر میں جو کچھ آپ نے لکھا۔ بجا لکھا اور وقت پر لکھا۔ عرض یہ ہے کہ معمولی سمجھ کے مسلمانوں کو صاف نظر آ رہا ہے کہ اسلام کا نام لیکر مودودی صاحب کے چیلے چانٹے فریب کا جال پھیلا رہے ہیں۔ پاکستان میں حکومت اسلامی ہو یا غیر اسلامی یہ یقینی ہے کہ وہ گروہ جو اپنے آپ کو "اسلامی جماعت" کہتا ہے، پاکستان کا دشمن ہے اور دشمن رہے گا۔ اور جو قوم کی متحدہ کوششوں اور قربانیوں کا نتیجہ ہے بعض مردودوں کو پسند نہیں۔ بنی بنائی چیز پر ایک نہیں کئی جماعتیں قابض ہونا چاہتی ہیں

یہ تو ہے حقیقت، رہا یہ امر کہ تمام مسلمان کیا کریں گے ؟

آپ یقین رکھئے کہ قوم خارجیت، منافقت اور ہمچوقسم دیگر حرکات کو ٹھکرا رہی ہے۔ پیران پارسا کے جامۂ ریا کو زیادہ چاک کرنے کی ضرورت نہیں بہروپیوں کی تعداد میں دو چار کا اضافہ ہو جائے تو چنداں مضائقہ نہیں۔

(فقط لاہور۔ خاموش مسلمان)

'۳۱۔ اکتوبر ۱۹۴۸ء نوائے وقت'

متکبّر صالح

ساتواں اداریہ

یہ اداریہ بھی ملاحظہ فرمایئے :

"جماعت اسلامی اور جمعیت العلمائے پاکستان، مجلس احرار، جمعیت اہلحدیث اور مجلس تحفظ ختم نبوّت (بالخصوص مولانا احمد علی، سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری صاحب اور مولانا مرتضیٰ احمد میکش صاحب کے مابین جو جھگڑا جاری ہے۔ بہت سے اخبارات نے اس پر افسوس کا اظہار کیا اور فریقین سے یہ اپیل کہ اس ناگوار جھگڑے کو ختم کریں۔ یہ اپیل غیر مؤثر ثابت ہوئی اور اب

نوبت مقدمہ بازی تک جا پہنچی ہے۔

"صالحین" کے ترجمان اخبارات نے اس سلسلہ میں عجیب و غریب کردار کا مظاہرہ کیا ہے۔ اور نہ صرف مولانا احمد علی وغیرہ بزرگوں کو "کفن چور" اور "چور" کے خطابات سے سرفراز کیا۔ مصالحت کی اپیل کرنے والے عناصر کے متعلق بھی یہ لکھا کہ وہ چوروں کے بھائی بند ہیں۔ یہ انداز گفتگو اسلامی چھوڑ، عام شریف آدمیوں کا انداز گفتگو بھی نہیں۔ مگر صالحین کا تکبر اور غرور نہیں اس بات کی اجازت ہی نہیں دیتا کہ وہ اپنے سوا کسی دوسرے شخص کے متعلق بھی اس حسن ظن سے کام لے سکیں کہ وہ بھی کسی معاملہ میں ایماندارانہ رائے رکھ سکتا ہے۔ آج جماعت اسلامی کے اخبار نے مجلس احرار پر طعن و تشنیع اور دشنام و بہتان کے گولے برسائے ہیں اور "نوائے وقت" پر مفت میں گالیوں کی بوچھاڑ کر دی ہے۔ وجہ شکایت یہ بیان کی گئی ہے کہ آج سے کئی سال پہلے "نوائے وقت" نے مولانا مودودی کے اس بیان پر کیوں لے دے کی تھی، جس میں آپ نے جہاد کشمیر میں شرکت کو حرام قرار دیا تھا۔ صالح معاصر انتہائی بے حیائی کے ساتھ یہ کہتا ہے کہ اس جہاد کا نتیجہ آپ نے دیکھ لیا!

معاصر یہ سوال نہ ہی اٹھاتا تو اچھا تھا۔ مولانا مودودی کے اس بیان پر لے دے صرف "نوائے وقت" نے ہی نہیں کی تھی، پاکستان کے تمام اخبارات نے کی تھی۔ معاصر اب اس کا جواب دے کہ کیا مولانا مودودی نے جہاد کشمیر کو سبوتاژ کرنے کی کوشش کی تھی یا نہیں؟ جب ہزاروں مسلمان اپنی جانیں اس جہاد میں قربان کر رہے تھے۔ کیا مولانا مودودی نے یہ فتویٰ دیا تھا یا نہیں کہ اس جہاد میں شرکت حرام ہے؟ اور کیا اس فتویٰ کا قطعی نتیجہ یہ نہیں تھا کہ اس جہاد میں شہید ہونے والے مسلمان حرام موت مرے ہیں؟

ہم آج پھر یہ الزام عائد کرتے ہیں کہ مولانا مودودی نے جہادِ کشمیر کو سبوتاژ کرنے کی کوشش کی۔ اور اگر یہ جہاد ناکام رہا تو اس ناکامی میں مولانا مودودی کا بھی حصہ ہے۔ ہم یہ الزام عائد کرتے ہیں کہ مولانا کا یہ فعل اضطراری نہیں تھا، بلکہ

ان کی پاکستان دشمنی پر مبنی تھا جو مولانا کو پاکستان سے یہ بھی کہ اس مملکت کے بانی ہونے کا سہرا قائد اعظم کے سر کیوں ہے؟ میرے سر کیوں نہیں؟

حالانکہ یہ سہرا ان کے سر نہیں باندھا جا سکتا تھا۔ کیونکہ جماعت اسلامی اور مولانا مودودی نے نہ صرف تحریک پاکستان میں کوئی کام نہیں کیا تھا بلکہ اس کی مخالفت کی تھی اور جماعت اسلامی کے ممبروں کو یہ حکم دیا تھا کہ پاکستان کی بنیاد پر ہونے والے عام انتخابات میں غیر جانبدار رہیں۔ یعنی پاکستان کے حق میں ووٹ نہ دیں۔ اس انتخاب میں پاکستان کے حق میں ووٹ نہ دینے کا مطلب پاکستان کے خلاف ووٹ دینا تھا۔ ہم الزام لگاتے ہیں کہ قائد اعظم اور تحریک پاکستان کے خلاف مولانا مودودی کا بغض آج بھی اسی طرح قائم ہے۔ ہم الزام لگاتے ہیں کہ مولانا کی تحریک ہرگز ایک اسلامی اور دینی تحریک نہیں۔

وہ حسن بن صباح کی طرح سیاسی ڈھونگ رچائے ہوئے ہیں اور ان کا مقصد دین کی سربلندی کی بجائے سیاسی اقتدار کا حصول ہے۔ ہم مولانا مودودی کو چیلنج کرتے ہیں کہ وہ مولانا احمد علی اور مولانا میکش کی طرح ہمارے خلاف بھی ازالۂ حیثیت عرفی کا مقدمہ چلائیں اور عدالت میں ان الزامات کی صفائی پیش کریں"

{ نوائے وقت، لاہور، لائلپور
۱۵ جولائی ۱۹۵۵ء ص ۳ }

جماعت اسلامی اور آزاد پاکستان پارٹی

— آٹھواں اداریہ —

اداریہ خصوصی توجہ کا مستحق ہے۔ غور فرمایئے

"کمیونسٹوں یا آزاد پاکستان پارٹی اور جماعت اسلامی میں کیا قدر مشترک ہے؟ ایک گروہ خدا کے وجود تک کا منکر ہے اور مذہب کو افیون سمجھتا ہے۔ دوسرے

فریق کا نصب العین یہ ہے کہ ملک میں ایک ایسی حکومت قائم کی جائے جس کی بنیاد مذہب پر ہو۔ یعنی اصولاً دونوں ایک دوسرے کے بدترین دشمن ہیں مگر کافی عرصہ سے ان دونوں میں گٹھ جوڑ ہے۔ یہاں تک کہ امیر جماعت اسلامی کے اعزاز میں جماعت اسلامی کے مرکز میں اس کے مرکزی دفتر کی طرف سے دعوت افطار دی جائے تو مہمانوں میں اکثریت کمیونسٹ کارکنان کی ہوتی ہے جو سرے سے نماز روزہ ہی کے قائل نہیں۔"

(نوائے وقت لاہور، لائلپور، ۲ جولائی ۱۹۵۵ء صفحہ ۳)

قیادتِ عظمٰی کے مدعی

نوائے وقت کا اداریہ

حضرت مولانا ابوالاعلیٰ مودودی قائد اعظم مسلم لیگ اور پاکستان کے متعلق اپنے ایک مضمون میں یوں رقمطراز ہیں ۔ " اسی حل کو مسلمانوں نے قبول کیا (یعنی پاکستان کو (نوائے وقت) اور اپنی ساری قومی طاقت اپنے تمام ذرائع اور جملہ معاملات اس قیادت کے حوالہ کر دیے جو ان کے قومی مسئلہ کو اس طرح حل کرنا چاہتی تھی۔ دس برس کے بعد آج اس کا پورا کارنامہ ہمارے سامنے ہے اور ہم دیکھ چکے ہیں کہ اس نے کس طرح کس صورت میں ہمارے مسئلہ کا حل کیا، جو کچھ ہو چکا وہ تو امر واقعہ ہے۔ اب اسے بدلا نہیں جا سکتا (اگر بدلا جا سکتا تو حضرت ہندوستان کو پھر سے اکھنڈ کر دیتے؟ (نوائے وقت)

اس پر اس حیثیت سے بحث بیکار ہے کہ یہ نہ کیا جاتا تو کیا ہوتا۔ البتہ اس حیثیت سے اس پر بحث کرنا ضروری ہے کہ جو مسائل اب ہمیں در پیش ہیں کیا ان کے حل کے لیے بھی وہی قیادت موزوں ہے جو اس سے پہلے ہمارے قومی مسئلہ کو اس طرح حل کر چکی ہے؟ کیا اس کا ابتک کا کارنامہ یہی سفارش کرتا ہے کہ اب جو بڑے بڑے اور نازک مسائل ہمارے سر پر آ پڑے ہیں جن کا بیش تر

حقہ خود اسی قیادت کی کارفرمائیوں کے نتیجہ میں پیدا ہوا ہے، انہیں حل کرنے کے لیے ہم اس پر اعتماد کریں" (ترجمان القرآن) ۳۸ صفحہ ۱۲۸)

ہم خوش ہیں کہ حضرت مولانا نے دس سال کے عرصہ میں پہلی مرتبہ دل کی بات کھل کر کہی اور صاف لفظوں میں مسلمانوں سے کہا کہ محمد علی جناح کی جگہ مجھے قائد اعظم مانو۔ اب صرف اتنا کرم فرمائیں کہ مسلمانوں کو یہ بتادیں کہ آپ کا ٹھوس سیاسی پروگرام کیا ہے؟ اگر یہ پروگرام مسلمانوں کے حق میں بہتر ہوگا تو مسلمان قائد اعظم کو چھوڑ کر آپ کو اپنا لیڈر مان لیں گے۔

اپنا پروگرام نہ بتانا اور محض نعروں سے ہی مسلمانوں کا دل بہلانا یا قائد اعظم کو "احمق" "غلط کار اور" دین میں ہلکا ثابت کرنے کی کوشش میں لگے رہنا ہرگز آپ کے شایانِ شان نہیں۔ قائد اعظم کو مسلمان آزما چکے ہیں۔ اور ان کا ریکارڈ قوم کے سامنے ہے۔ آپ کو ابھی قوم نے آزمانا ہے جب تک آپ مسلمانوں کو اپنا (concrete) پروگرام نہیں بتائیں گے۔ آپ قائد اعظم کو ہزار گالیاں دیجئے۔ مسلمان آپ کے دستِ مبارک پر بیعت کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں گے۔" کا دروازہ کھٹکھٹانا بھی ضروری سمجھا گیا۔ (نوائے وقت ۳۱۔ جولائی ۱۹۴۸ء)

پھر ارشاد ہوتا ہے کہ ایک یونٹ اور دس یونٹ میں کوئی فرق نہیں۔ ایک یونٹ بن گیا تو کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچے گا۔ اور دس یونٹ بن گئے تو کوئی خاص نقصان نہیں ہوگا۔ یعنی ایک طرف یہ کہ صحیح اسلامی نظام.... لہ ... دوسری طرف یہ کہ ایک یونٹ سے (کوئی اور فائدہ نہ سہی) اسلامی نظریہ کو تقویت حاصل نہیں ہوگی اور سندھی پٹھان، بلوچی، بہاولپوری، خیر پوری، اور قبائلی دس قومیتوں کو مان کر ان کی بنیاد پر دس یونٹ بنا دیے جائیں تو (کوئی اور نقصان نہ سہی) اسلامی نظام کے نظریہ کو بھی کوئی نقصان نہ پہنچے گا۔ ایک ہی سانس میں دو باتیں کوئی ایسا شخص ہی کہہ سکتا ہے جو یا تو پرلے درجے کا احمق ہو، یا حسن بن صباح یا راسپوٹین کی طرح عیار۔ آخری فقرہ میں یہ فرمایا گیا ہے کہ مصنوعی طور پر وحدت پیدا کرنے کی کوششوں کا کوئی اچھا نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا یعنی وحدت کو مصنوعی کہہ دیا اور

یہ دھمکی بھی دے دی کہ اس کا نتیجہ اچھا نہ ہوگا۔ اس پر بھی یہ ارشاد ہے کہ میں نے آجتک وحدت کے خلاف اظہار رائے نہیں کیا۔

افسوس کہ پاکستان کو آٹھ برس گزر گئے مودودی صاحب نے ابھی تک مسلمان عوام کا یہ قصور معاف نہیں کیا کہ انہوں نے مودودی صاحب کی بجائے قائداعظم کی بات کیوں مانی؟ اور پاکستان کیوں بنایا۔ گزشتہ آٹھ سالوں میں ایک مرتبہ بھی تو پاکستان کے حق میں کوئی کلمۂ خیر ان کی زبانِ فیض ترجمان سے نہیں نکلا۔ پاکستان بہت بڑا سہی مگر آٹھ سالوں میں کوئی بات تو ایسی ہوئی ہوگی، جو حوصلہ افزائی کی مستحق ہوتی؟ مگر مولوی مودودی صاحب جب بھی بولیں گے، ایسی بات کہیں گے جس سے پاکستان کے مفاد پر کاری ضرب پڑتی ہو۔ عین اس زمانہ میں جب ہزاروں مجاہدین جہادِ آزادیٔ کشمیر میں حصہ لے رہے تھے اور سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے تھے، مودودی صاحب یہ فتویٰ دیا کہ یہ جہاد ہے ہی نہیں اور اس لڑائی میں شراکت حرام ہے۔ مگر جو شخص پاکستان کی لڑائی میں شرکت حرام سمجھتا رہا ہو، اس سے یہ توقع ہی عبث تھی کہ وہ جہادِ آزادیٔ کشمیر کی حمایت کرے گا۔ پاکستان کے متعلق بھی مولوی صاحب کی روش اسی قسم کی تھی کہ میں اس مسئلہ کی

ؔ یہاں اخبار کی عبارت اڑ گئی ہے (مرتب)

یہ مخالفت نہیں تو کیا ہے؟

دسواں اداریہ:

معاصر "لوائے پاکستان" نے اپنے ایک ادارتی مقالہ میں یہ لکھا تھا کہ مولوی مودودی صاحب نے ایک یونٹ کے منصوبہ کی مخالفت شروع کر دی ہے اس پر مولوی صاحب کی طرف سے ایک بیان جاری کیا گیا جو حرف بحرف درج ذیل ہے۔

"بعض اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ میں نے حیدرآباد میں وحدتِ مغربی پاکستان کی مخالفت کی ہے۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس

خبر میں میرے خیالات کی غلط ترجمانی کی گئی ہے میں نے آجتک اس کے خلاف نہ کوئی اظہار رائے کیا ہے اور نہ اس کی موافقت ہی کی ہے۔ درصل جو بات میں نے حیدرآباد میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہی تھی وہ یہ تھی کہ ایک یونٹ یا دس یونٹ کا مسئلہ کوئی حقیقی اہمیت نہیں رکھتا۔ حقیقی اہمیت جس چیز کی ہے وہ یہ ہے کہ یہاں ایک صحیح اسلامی نظام قائم کرکے مسلمانوں کے رشتۂ اخوت کو مضبوط کر دیں۔ اور ہر باشندۂ پاکستان کو یہ اطمینان دلا دیں کہ از روئے انصاف اس کے جملہ حقوق محفوظ ہیں۔ یہ بات اگر حاصل ہو گئی تو ایک یونٹ بھی مفید ہوگا اور دس یونٹ بھی رہیں، تو نقصان دہ ثابت نہ ہو سکیں گے۔ ورنہ مصنوعی طور پر وحدت پیدا کرنے کی کوششوں کا اچھا نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔"

ہم حیران ہیں کہ اگر یہ وحدت مغربی پاکستان کی مخالفت نہیں تو مخالفت کسے کہتے ہیں؟ مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ اوّل تو یہ مسئلہ کوئی حقیقی اہمیت ہی نہیں رکھتا۔ مولوی صاحب کا حد سے بڑھا ہوا تکبر، انا، اور نفس پرستی ہی ایسی بات ان کے منہ سے نکلوا سکتے ہیں۔ ورنہ معمولی عقل کا آدمی بھی یہ جانتا ہے کہ کم از کم اسوقت ملک بالخصوص مغربی پاکستان کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ ہی یہ ہے کہ مگر مولوی صاحب فرماتے ہیں کہ اس مسئلہ کی کوئی حقیقی اہمیت ہی نہیں حقیقی اہمیت غالباً قربانی کی کھالوں کے مسئلہ کو حاصل تھی جو اس کے لیے عدالت

کوئی حقیقی اہمیت نہیں سمجھتا پھر یہ فرمایا کہ مسٹر جناح اور مسلم لیگ والے اسلام کو ایک چھوٹے سے خطے میں محدود کر دینا چاہتے ہیں میں سارے ہندوستان میں اسلام کے غلبے کا خواہاں ہوں۔ پھر یہ حکم ہوا کہ پاکستان کے سوال پر ووٹنگ کے وقت غیر جانبدار ہو جاؤ۔ اور یہ حکم یہ جاننے کے باوجود دیا گیا کہ اس ووٹنگ پر ہی پاکستان کے قیام کا فیصلہ ہوگا۔ اس لیے پاکستان کو ووٹ نہ دینے کا مطلب پاکستان کے خلاف ووٹ دینا ہے۔

پاکستان کی اسقدر شدید مخالفت کے باوجود جب پاکستان قائم ہو گیا، تو مولوی مودودی صاحب جو سارے ہندوستان میں اسلام کو غالب بنانے کے عزم

کا اظہار فرمایا کرتے تھے۔ بھاگ کر سب سے پہلے پاکستان چلے آئے تھے۔ مولانا آزاد سید حسین احمد مدنی صاحب، مولوی حفظ الرحمٰن صاحب نے بھی پاکستان کی مخالفت کی تھی مگر جب پاکستان قائم ہو گیا، تو ان میں سے ہر ایک نے یہ کہا کہ پاکستانی مسلمانوں کو اپنا وطن مبارک ہو۔ ہم اس کی ترقی کے لیے دعا کرتے ہیں مگر ہم ہندوستان ہی میں رہیں گے اور ہندوستانی مسلمانوں کی خدمت کریں گے۔ مگر پورے نیم براعظم میں غلبۂ اسلام کے داعی مودودی صاحب کے نائب جناب نصر اللہ خاں عزیز اگست کے تیسرے ہفتہ میں ہی سول سیکرٹریٹ میں مسلم لیگی وزیروں کے دفاتر کا طواف کرتے دیکھے گئے کہ مولوی مودودی صاحب کو ہندوستان سے پاکستان پہنچانے کے لیے ٹرک عنایت ہو جائے۔ جماعت اسلامی کی ایک شاخ ہندوستان میں بھی رکھی گئی۔ مگر سیکولر ہندوستان میں اس جماعت کا موقف اس کے امیر کے بیان کے مطابق یہ ہے کہ ہم ایک غیر فرقہ وارانہ جماعت ہیں اور بلا امتیاز مذہب و ملت سب کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔ یعنی سیکولر اور لادینی ہندوستان میں تو اس ملک کے وفادار، اور خدائی خدمتگار، مگر پاکستان میں جو بہر حال مسلمانوں کا ملک ہے، خدائی فوجدار، اور اس ملک کی بہتری کی ہر تجویز کے مخالف۔"

(نوائے وقت لاہور/ لائلپور، ستمبر ۱۹۵۵ء صہ ۳)

آئینۂ گفتار

* روزنامہ عوام لائلپور سے جو ۳۔ فروری ۱۹۶۳ء کے شمارہ میں "آئینۂ گفتار" کے عنوان سے جناب خلیق قریشی مدیر عوام نے ایک نوٹ کے ساتھ شائع کیا تھا جناب حمید نظامی مرحوم اور نوائے وقت کے متعلق اس وقت جماعتِ مودودی کے احساسات کیا تھے، قارئین اس سے اندازہ فرمالیں۔ جناب خلیق قریشی رقمطراز ہیں:۔

" مولانا عبدالرحیم اشرف لائلپور کے ایک فہمیدہ اور معروف سیاسی رہنما ہیں۔ ان

کے افکار و خیالات اکثر و بیشتر اخبارات میں آتے رہتے ہیں جناب حبیب احمد چودھری نے نہایت خوبی و زبر کی سے بڑے بھرپور انداز میں ایک تبصرہ پیش کیا ہے۔ پاکستان میں ابھی تک حالات کی الجھنوں سے وہ گروہ پوری آزادی کے ساتھ میدانِ عمل میں نہیں آسکا، جو ذہنی اور فکری طور پر پاکستان کے نظریات کا امین اور محافظ ہے۔ اور ان اوقات میں پاکستان میں ذہنی و فکری ابتری پیدا کرنے کے لیے اکثر قوتیں بروئے کار رہی ہیں۔ ہمارے محترم دوست حبیب احمد چودھری متذکرہ گروہ کے سرخیل نوجوان ہیں۔ نظریہ پاکستان اور تحریکِ پاکستان ان کا محبوب موضوع ہے اور ہمیں خوشی ہے کہ ان کی نگاہ اور ان کا قلم مومن کے احتساب سے سرفراز ہیں۔

ہم شکریہ کے ساتھ یہ مضمون شائع کر رہے ہیں اور اس موضوع پر روزنامہ عوام کے صفحات حاضر رہیں گے۔ (ادارہ)

آئینۂ گفتار

کھول کر آنکھیں مرے آئینہ گفتار میں
آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ

راقم نے ابتدا ان الفاظ سے کی تھی :-

"مولانا عبدالرحیم اشرف اپنے مخصوص انداز میں ملک کے مسائل پر عموماً اظہارِ خیال کرتے رہتے ہیں۔ پاکستان کے نامور اخبار روزنامہ 'نوائے وقت' کے متعلق مولانا نے مختلف اوقات میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے — وہ میرے سامنے ہے میں محسوس کرتا ہوں کہ یہ تحریریں حقیقت میں جماعتِ اسلامی کے تربیت یافتہ زعماء کے قلبی آئینے کی تصویریں ہیں اور انہیں پر قیاس کیا جا سکتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔

میں ان اقتباسات کو پوری ذمہ داری کے ساتھ منظرِ عام پر لا رہا ہوں اور تحریکِ پاکستان کے جانثاروں کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ اٹھیں، اور اپنے محاذ پر سرگرمِ عمل ہو جائیں۔

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا، کہ تحریکِ پاکستان کی فکری قیادت میں نوائے وقت کا ناقابلِ فراموش حصہ ہے۔ ان اقتباسات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ان تمام شواہد و علامات کو لوگوں کی نگاہوں سے گرانے کے لیے کتنی منظم کوشش کی جا رہی ہیں جو شواہد و علامات پاکستان کے ساتھ وابستگی کا درجہ رکھتے ہیں۔

مولانا عبدالرحیم اشرف کی ایک تصنیف "کیا جماعتِ اسلامی حق پر ہے" آپ ملاحظہ فرمائیں۔ یہ چند اقتباسات اس میں سے حمید نظامی مرحوم (مغفور) اور روزنامہ 'نوائے وقت' کا تذکرہ کرتے ہوئے آپ لکھتے ہیں:-

"یہ اخبار اس ملک کے الحاد پسند عناصر کا بیرومیٹر BAROMETER ہے۔ ہم نے اسے اسلام کے حق میں آنے والے خطرات کو معلوم کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ پایا ہے۔ جب بھی حامیانِ حق پر کوئی افتاد پڑی ہے۔ یا اسلامی نظام کی جدوجہد کے خلاف ملاءِ اعلیٰ میں کوئی پروگرام مرتب کیا گیا ہے، تو اس "کان چور" نے تلمیحات و اشارات سے کام لیکر اپنے دل کی بات کہنا شروع کر دی۔ بعینہ یہ صورت ان دنوں سامنے آئی۔ نوائے وقت نے ایک طویل خاموشی کے بعد اپنی اشاعت مورخہ ۱۷ اگست ۱۹۵۵ء میں کراچی کی ڈائری کے عنوان سے لکھا۔

مزاج و منشا

"یہ حقیقت ناقابلِ تردید ہے اور ان حلقوں میں اسے خصوصی اہمیت دی جا رہی ہے کہ اسلامی اصولوں کی اساس پر آئین بنانے کے لئے جس غور و فکر کی ضرورت تھی وہ نہیں کی گئی۔ چنانچہ اس وقت اسلامی آئین کا کوئی واضح تصور نہیں پایا جاتا۔

یہ تصور اس وقت تک واضح نہیں ہو سکتا جب تک عصر حاضر کے مطابق اسلام کو سمجھا نہ جائے۔ اتفاق سے جو طبقہ اسلام کی ترجمانی کا دعویدار ہے وہ ان تقاضوں کو سمجھنے سے قاصر ہے اور جو طبقہ ان تقاضوں کو سمجھتا ہے۔ یا سمجھنے کی اہلیت رکھتا ہے، وہ اسلام سے نابلد ہے۔ (نوائے وقت ۱۷ اگست)

چند روز بعد

اس کے چند روز بعد اس نے مکرر اسی عنوان سے ایک دوسرا مضمون شائع کیا جس میں کھل کر اسلامی دستور کی مخالفت کی گئی تھی، اور یہ صاف طور پر کہہ دیا گیا تھا۔ کہ اب اسلامی دستور کے موضوع پر مزید وقت ضائع نہ کیا جائے۔ اس وقت سیکولر دستور بنا لیا جائے اور اسلامی دستور کا کام آئندہ نسلوں پر چھوڑ دیا جائے۔

اس اخبار کے غیر اسلامی دستور کی حمایت اور اسلامی دستور کی مخالفت پر مسلسل لکھنے سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا، کہ ایک حلقہ اب اس کے لیے مضطرب ہے کہ وقت کی اس افتاد سے جو جماعتِ اسلامی کے خلاف وقوع پذیر ہو چکی ہے، پورا پورا فائدہ اٹھایا جائے۔ لیکن یہ بات تعجب اور افسوس سے دیکھی جائے گی۔ کہ پورے ملک میں "نوائے وقت" کے اس زہرناک پروپیگنڈے کے خلاف جماعتِ اسلامی سے متعلق اخبارات کے علاوہ کسی نے آواز بلند نہیں کی۔" (کیا جماعت اسلامی حق پر ہے صفحہ ۳، ۳۶، ۳۷)

" ان حالات میں یہ کہنا کہ اسلامی آئین کا مسئلہ خارج از بحث ہے۔ ہمارے نزدیک ایسی شر انگیزی ہے جسے اگر زیادہ وسعت دی جائے گی تو ملک میں از سر نو ایسا خلفشار پیدا ہو گا۔ جس کا سدِّ باب ممکن نہیں۔

اگرچہ ہمیں معلوم ہے کہ "نوائے وقت" کے مدیر اسلامی دستور کے بدترین مخالفین میں سے ہیں۔ وہ ہمیشہ اسی تاک میں لگے رہتے ہیں کہ انہیں جب کہیں ایسا موقعہ ہاتھ لگے کہ وہ اسلامی دستور کے علمبرداروں کے خلاف زہر چکانی کر سکیں تو وہ اس سے پورا فائدہ اٹھائیں۔

لیکن ہم اس بنا پر کہ حمید نظامی اپنے آپ کو تحریک پاکستان اور مملکت پاکستان

دونوں کا سب سے بڑا وفادار ثابت کرنے کے لیے ہر وقت کوشاں رہتے ہیں۔ ان سے استدعا کریں گے کہ آپ ایسے اصحاب صحافت وسیادت کی نوازشات کے باعث یہاں کے عوام پہلے ہی شدید ترین انتشار کا شکار ہو چکے ہیں اب آپ ان پر رحم فرمائیے اور ان کے افکار کی اس اساس کو جو اسلام نے انہیں عطا کر رکھی ہے، منہدم کرنے کی سعی لاحاصل سے اپنا نام ان لوگوں میں لکھوانے کی کوشش نہ کیجئے۔ جو اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ تعلق ظاہر کرنے کے باوجود ان سے بے وفائی کے مرتکب ہوئے ہیں اور تاریخ میں ان کا مقام غداروں کا مقام ہے۔

بلیک آؤٹ

اسلامی دستور کی حمایت کی خبروں کی بلیک آؤٹ کرنے کی سب سے بھیانک مثال تو معاصر کی وہ رپورٹنگ ہے جو اس نے ارباب اختیار پاکستان کی تقاریر پر اختیار کی ہے۔ اس نے میجر جنرل سکندر مرزا کا وہ بیان شائع کیا ہے جو انہوں نے متو ریہ کے اجلاس کے مقابل دیا تھا۔ اس تمام بیان کو معاصر نے شائع کیا لیکن یہ جملہ حذف کر دیا کہ پاکستان کا دستور یقیناً اسلامی ہوگا۔"

ان منفی کوششوں کو ناکافی سمجھ کر اب "نوائے وقت" نے ایک تازہ مہم کا آغاز کیا ہے جس میں ازسر نو اس بحث کو شروع کیا گیا ہے کہ اسلامی آئین کی تدوین ممکن نہیں۔" (کیا جماعت اسلامی حق پر ہے ص ۳۸)

ارباب الحاد

یہ حضرات اس امر میں کوشاں ہیں کہ جو لوگ صحیح اسلام کے مبلغ و داعی ہیں اور جو نیک نیتی سے اس کے لئے کوشش کر رہے ہیں کہ کتاب وسنت کے مطابق نظام یہاں قائم ہو، ان کے خلاف نفرت وحقارت کا پروپیگنڈہ کیا جائے۔ انہیں حیلوں اور بہانوں سے بدنام کیا جائے۔ اُن کی معمولی لغزشوں کو عظیم جرائم کی حیثیت سے اچھالا جائے، اگر بس چلے تو ان کے خلاف سازشیں کی جائیں۔ ان کی آزادیاں سلب کرائی جائیں۔ اور ارباب اختیار کو اُن کے خلاف مشتعل کر کے انہیں مصیبتوں میں مبتلا کیا جائے۔ (۱)۔ اس ضمن میں لاہور کے اخبارات نے (تسنیم و کوثر وغیرہ (مرتب)

متعدد بار یہ حقائق شائع کئے ہیں اور مسٹر حمید نظامی کو چیلنج کیا ہے کہ وہ اتنے بڑے حریت پسند اور شہری آزادیوں کے تحفظ کے علمبردار بنے پھرتے ہیں، وہ بتلائیں کہ کیا یہ واقعات صحیح نہیں ہیں کہ :-

(ا) انہوں نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی امیر جماعتِ اسلامی پاکستان کی گرفتاری کے لیے متعدد بار ارباب اختیار کو بھڑکایا۔

(ب) 'تسنیم' کو کئی دفعہ سیفٹی ایکٹ وغیرہ کے تحت بند کروانے کی انہوں نے کوشش کی۔

(ج) حد یہ ہے کہ جماعتِ اسلامی کو خلافِ قانون قرار دیے جانے کے مشورے بھی انہوں نے حکامِ بالا کو دیئے۔ لیکن مسٹر حمید نظامی آج تک اِن الزامات کی تردید نہیں کر پائے۔ (کیا جماعتِ اسلامی حق پر ہے؟ ص ۲۹)

اقبال اکیڈمی

اِس ادارے کا کام علامہ اقبال مرحوم کے نام پر یہ ہے کہ علماء کے خلاف ذلیل ترین پروپیگنڈہ کیا جاتے اور یہ ثابت کیا جائے کہ صحیح اسلام سے یہ نابلد گروہ ابتداء آفرینش سے فتنوں اور تباہیوں کا سبب رہا ہے۔"

(کیا جماعتِ اسلامی حق پر ہے؟ ص ۳۱-۳۲)

مولانا عبدالرحیم اشرف صاحب

یہ کتاب مولانا عبدالرحیم اشرف صاحب نے جنوری ۱۹۵۶ء میں شائع کی۔ مولانا جماعت اسلامی کی مجلسِ شوریٰ کے رکن تھے۔ بعد میں جب چند بنیادی اصولوں پر ان کا امیر جماعت اسلامی کے ساتھ شدید اختلاف ہوا تو یہ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کی معیت میں اپنے رفقاء سمیت جماعت اسلامی سے الگ ہو گئے۔ اب ہفت روزہ "المنبر" کے مدیر اعلیٰ ہیں۔ مندرجہ بالا اقتباسات ہم نے مولانا موصوف کی مرتبہ

کتاب سے دیے ہیں۔

مولانا امین احسن اصلاحی کا بیان

ہم جو اسلامی جمہوریت و شورائیت کی ایک مثال قائم کرنے کا حوصلہ لے کر اٹھے تھے اور ابھی اس کی پہلی جھلک ہی ہم کو دیکھنی نصیب نہیں ہوئی تھی کہ شاید ہمارے جی اس سے بھر چکے اور ہم اس کی جگہ ایسی مطلقیت کا تجربہ کرنے کا شوق رکھتے ہیں جس کی نظیر کم از کم ماضی و حاضر میں تو کوئی اور نہ مل سکے۔ اسلامی جمہوریت و شورائیت کی شان میں تحریروں میں ابتک جو قصیدہ خوانی کرتے رہے ہیں وہ محض مشق کے طور پر تھیں یا محض اپنے ملک کے ارباب اقتدار کو ہدف بنانے کے لیے۔ آپ کے اصحاب میں سے جو لوگ جماعتی زندگی کی نزاکتوں کو نہیں سمجھتے اور جن کے نزدیک جماعت اسلامی نام ہی آپ کی (مودودی) ذات کا ہے۔ ان کو تو میں کچھ کہنا بے فائدہ سمجھتا ہوں۔ آپ کی (یعنی مودودی کی) اس قلابازی نے معاف کیجیے میرے اس حسن ظن کو بڑا نقصان پہنچایا ہے جو میں آپ سے رکھتا تھا

(نوائے وقت ۲۲ جنوری ۱۹۵۷ء)

میں آپ کا لٹریچر پڑھتا ہوں

نوائے وقت کے وقائع نگار خصوصی سے ایک انٹرویو کے دوران مولانا نے جن خیالات کا ذکر کیا۔

مجھے صدر مملکت نے گورنر ہاؤس میں بلایا اور ملاقات کے دوران کہا ہے "میں آپ کا لٹریچر پڑھتا ہوں اور مجھے اس سے اسلام کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے" بتائیے اس امر کے ذکر کی کیا ضرورت تھی۔ اس سے مقصود کیا تھا۔ صرف اس امر کی تشہیر مطلوب تھی کہ صدر مملکت میرا لٹریچر پڑھتے ہیں۔ کیا یہ اوچھے کردار اور بے غرضانہ سیاست کا مظہر ہے ... یہ اس خود نمائی میں بعض دفعہ مولانا سوقیانہ

باتوں پر اُتر آتے ہیں۔

مثلاً اس انٹرویو کا آخری پیرا پڑھیے جس میں لکھا ہے کہ جب اُن سے تذکرہ کیا گیا کہ "حکمران" طبقہ آپ کے لٹریچر سے استفادہ تو کرتا ہے لیکن اس کا اقرار کرتے ہوئے ہچکچاتا ہے تو مولانا نے فرمایا کہ ان کی پوزیشن ہندو دیویوں جیسی ہے، جو اپنے خاوندوں کا نام لیتے ہوئے شرماتی ہیں" کیا یہ الفاظ ایک عالم دین بلکہ اس زمانے کے بزعم خود (بہت بڑے مصلح) کے ہو سکتے ہیں۔ اس کا فیصلہ خود قاری کر سکتے ہیں۔ (نوائے وقت لاہور۔ ۷ نومبر ۱۹۶۳ء)

خارجی معاملات

مولانا مودودی نے خارجی معاملات میں اپنے مسلک کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا کہ پاکستان کو دنیا کے سب ملکوں سے دوستی کا موقف اختیار کرنا چاہیئے اور ایک ملک کی دوستی کو دوسرے ملک کی دشمنی کی قیمت ادا کر کے نہ خریدنا چاہیئے۔ اور ہمارے لیے یہ بھی مستحسن نہیں کہ ہم ایک طاقت کی گود سے اچھل کر دوسری طاقت کی گود میں اچک بیٹھیں۔ انہوں نے اس مسلک کو اتنا جامع اور اصولی رنگ دیا ہے کہ وہ اس کو کسی مزید توضیح کا محتاج نہیں سمجھتے ..... اس بیان کا حاصل یہ ہے کہ وہ اور جماعت اسلامی چین سے تعلقات بڑھانے کی مخالف ہے میں اس بات کا اعادہ کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جماعت اسلامی اور اس کے سربراہ کی اصلی کمزوری ہی یہ ہے کہ وہ عملی سیاست کے اہل نہیں۔ ان کے نظریے اور بے عمل طرز فکر، عملی دنیا کے تقاضوں کے فہم و ادراک کی صلاحیت سے عاری ہے۔ (زیڈ۔ اے سلیری، عنوان: جماعت اسلامی کی خارجہ پالیسی) نوائے وقت ۳۱ اکتوبر ۱۹۶۳ء

حکومت اور جماعت اسلامی

"نہ زمانے کی روح کو سمجھتے ہیں اور نہ سیاست کے اہل ہیں"

مجھے یقین ہے کہ جو لوگ علم اور مواقع نصیب ہونے کے باوجود اور برصغیر میں مسلمانوں کے خطرناک سیاسی بحران کا شعور رکھنے کا دعویٰ کرنے کے بعد تحریک پاکستان میں شامل نہیں ہوئے، وہ موجودہ دور کے ان تقاضوں کی نشاندہی کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے جن کی تسکین آج اسلام کی تعلیم کو سب سے بڑا چیلنج ہے۔ مجھ پر اس امر کا بھی پورا انشراح ہے کہ مولانا مودودی اپنے جذب وکشش کے باوجود نہ زمانے کی روح کو سمجھتے ہیں اور نہ سیاست کے اہل ہیں۔ ان کا یکسر نظری طرز فکر وطمح نگاہ عملی دنیا کے مسائل کے فہم سے عاجز ہے۔

(زیڈ اے سلیری)

نوائے وقت ۲۶۔ اکتوبر ۱۹۶۳ء

ذہنی اور فکری رشتہ

آج جبکہ حمید نظامی ہم میں نہیں، اس نازک وقت میں ان کا داغ مفارقت دے جانا کئی سعید روحوں کو اب تلک یاس والم کی نذر کئے ہوئے ہے۔ اس دور میں ان کے بے باک قلم کی ضرورت تھی لیکن قدرت کو کچھ ایسا ہی منظور تھا۔ اس عالم میں جب کہ مولانا عبدالرحیم اشرف بھی برسوں کی پرخلوص جدوجہد کے بعد جماعت اسلامی کے امام ونظام سے مایوس وبددل ہو کر اس جماعت سے الگ ہو چکے ہیں ہم ایک ایسا ناخوشگوار فرض سرانجام دینے کے لیے اپنے کو مجبور پاتے ہیں اور دیانتداری سے محسوس کرتے ہیں کہ ہم کوتاہی کے مرتکب ہوں گے۔ اگر ہم ایسا نہ کریں گے

جیسا کہ قارئین کی نظر سے گزر چکا ہے کہ مولانا نے نوائے وقت سے اپیل کی تھی یہ اس وقت کی بات ہے جب حمید نظامی مرحوم کا قلم ادائے فرض میں پیش پیش تھا۔

راقم نے لکھا تھا۔

"آج حمید نظامی مرحوم کے مداحوں کے زخمی دلوں کے تاروں کو "عوام" کی مضراب سے چھیڑ رہے ہیں۔ اگر ادنچے ایوانوں میں ہماری نواؤں کا دخل نہیں تو اس نوائے درمند سے ویرانوں کے دیوانے کیوں محروم رہیں ہم اپنی معروضات کا آغاز تو دوسری قسط میں کریں گے۔ اس لیے یہ عرض کرنے پر اکتفا کریں گے کہ وہ مشن جسکو حمید نظامی مرحوم نے شروع کیا تھا۔ آج آ[ج] شدت سے اسے زندہ رکھنے کی ضرورت ہے۔ یہ وضاحت بھی آئندہ چل کر کی جائے گی کہ اسلام کے نام لیواؤں کی عزت وعظمت کے علمبردار، اور جمہور اسلام کے مونس و غمگسار کیا حمید نظامی مرحوم اور ان کے ہمنوا تھے اور ہیں یا وہ کہ قدم قدم پر جن کا اسلام قیام پاکستان کا مخالف مفاد مسلم کا دشمن رہا ہے۔ مولانا عبدالرحیم اشرف کی تحریروں کے اور پہلوؤں پر تو انشاءاللہ کچھ نہ کچھ ضرور عرض کریں گے۔ چلتے چلتے ان سے صرف اتنی گزارش کریں گے کہ جس جماعت اسلامی کے امیر و امام کو بدنیت سمجھ کر آپ کنارہ کش ہوئے ہیں کیا یہ بات باعث فخر نہیں ہے کہ حمید نظامی مرحوم کی بصیرت ایمانی نے ان کے مذموم ارادوں کو پہلے بھانپ لیا تھا"

(روزنامہ عوام ۳ فروری)

متذکرہ بالا اقتباسات پر آئندہ سطور میں مختصر سا تبصرہ کیا جائے گا۔ جس سے آج اور کل کا فرق واضح کرنا بھی مقصود ہے (مرتب)

مختصرات

حمید نظامی کی رائے

۱۔ وہ مذہب کا نام اپنی سیاست میں کامیابی کے لیے استعمال کرتے ہیں۔
اداریہ نوائے وقت ۱۳ جون سنہ ۱۹۵۵ء صہ ۳

۲۔ ڈھلمل یقین اور مذبذب کیریکٹر کا لیڈر ، ، ، ۶ جولائی سنہ ۱۹۵۵ء صہ ۳ و ۴

سے نماز روزہ ہی کے قائل نہیں "
(نوائے وقت ۲۷ جولائی سنہ ۱۹۵۵ء صہ ۳)

۷۔ قائد اعظم کو "احمق" "غلط کار" اور "دین میں ہلکا" ثابت کرنے کی کوشش میں لگے رہنا ہرگز آپ کے شایانِ شان نہیں۔ آپ قائد اعظم کو ہزار گالیاں دیجیے مسلمان آپ کے دستِ مبارک پر بیعت کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں گے۔
(نوائے وقت ۳۱ جولائی سنہ ۱۹۴۸ء)

۸۔ ایک ہی سانس میں دو باتیں کوئی ایسا شخص ہی کہہ سکتا ہے جو یا تو پرلے درجے کا احمق ہو یا حسن بن صباح یا راسپوٹین کی طرح عیار
(نوائے وقت ۷ ستمبر سنہ ۱۹۵۵ء)

۳۔ مودودی صاحب علمِ دین کے لحاظ سے کچھ زیادہ ممتاز شخصیت نہیں۔ آپ ایک اچھے انشا پرداز اور ادیب ہیں مگر دین کے متعلق آپ کا علم کچھ زیادہ قابلِ اعتماد نہیں
(اداریہ نوائے وقت ۱۵ اگست سنہ ۱۹۴۸ء)

۴۔ امیر صاحب یا تو خود احمق ہیں یا حکومتِ پاکستان کو احمق سمجھتے ہیں کہ وہ ان کی اس پرائیویٹ تنظیم کی حیثیت سے فوج سے تعاون منظور، مگر فوج میں بھرتی نامنظور۔ یہ تحریر منافقت اور ریاکاری کا ایک دلچسپ نمونہ ہے۔
(اداریہ نوائے وقت ۲۹۔ اکتوبر سنہ ۱۹۴۸ء)

۵۔ جماعت اسلامی اور مولانا مودودی نے نہ صرف تحریکِ پاکستان میں کوئی کام

نہیں کیا تھا بلکہ اس کی مخالفت کی تھی۔ ہم الزام لگاتے ہیں کہ مولانا کی تحریک ہرگز ایک اسلامی اور دینی تحریک نہیں وہ حسن بن صباح کی طرح سیاسی ڈھونگ رچائے ہوئے ہیں اور ان کا مقصد دین کی سربلندی کی بجائے سیاسی اقتدار کا حصول ہے

(اداریہ ۱۵ جولائی ۱۹۵۵ء ص ۳)

۶۔ کمیونسٹوں یا آزاد پاکستان پارٹی اور جماعت اسلامی میں کیا قدر مشترک ہے مگر کافی عرصہ سے ان دونوں میں گٹھ جوڑ ہے۔ یہاں تک کہ امیر جماعتِ اسلامی کے اعزاز میں جماعت اسلامی کے مرکز میں اس کے مرکزی دفتر کی طرف سے دعوتِ افطار دی جائے تو مہمانوں میں اکثریت کمیونسٹ کارکنان کی ہوتی ہے۔ جو میرے

حمید نظامی اور نوائے وقت کا تذکرہ

به زبانِ جماعتِ اسلامی با

۱۔ یہ اخبار اس ملک کے الحاد پسند عناصر کا بیور و میٹر ہے۔

۲۔ یہ بات تعجب اور افسوس سے دیکھی جائے گی کہ پورے ملک میں "نوائے وقت" کے اس زہرناک پروپیگنڈے کے خلاف جماعتِ اسلامی سے متعلق اخبارات کے علاوہ کسی نے آواز بلند نہیں کی۔ (کیا جماعت اسلامی حق پر ہے ص ۳۵، ۳۶، ۳۷)

۳۔ اگرچہ ہمیں معلوم ہے کہ "نوائے وقت" کے مدیر اسلامی دستور کے بدترین مخالفین میں سے ہیں۔

اپنا نام ان لوگوں میں لکھوانے کی کوشش نہ کیجئے جو اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ تعلق ظاہر کرنے کے باوجود ان سے بے وفائی کے مرتکب ہوتے ہیں اور تاریخ میں ان کا مقام غداروں کا مقام ہے۔

(کیا جماعت اسلامی حق پر ہے ص ۳۸)

راسپوٹین کی طرح عیّار

ہم نے "نوائے وقت" کے چند اداریے جو حمید نظامی مرحوم و مغفور کے

رشحاتِ قلم کا نمونہ اور مولوی مودودی صاحب کی ذہنیت و نیت کے صحیح عکاس ہیں۔ قارئین کی خدمت میں پیش کئے ہیں آپ نے دیکھ لیا کہ انہوں نے جناب سیّد ابوالاعلیٰ مودودی صاحب امیر جماعت اسلامی کو حسن بن صباح اور راسپوٹین سے تشبیہہ دی ہے۔ ڈھلمل یقین اور مذبذب کیریکٹر کا لیڈر کہا ہے منافق اور ریاکار بھی، یہ بھی لکھا ہے کہ مودودی صاحب علم دین کے لحاظ سے کچھ زیادہ ممتاز شخصیت نہیں۔ آپ اچھے انشا پرداز ہیں مگر دین کے متعلق آپ کا علم کچھ زیادہ قابل اعتماد نہیں، یہ بھی کہا ہے کہ مولانا کی تحریک ہرگز ایک اسلامی اور دینی تحریک نہیں وہ حسن بن صباح کی طرح سیاسی ڈھونگ رچاتے ہوتے ہیں یہ کچھ بانی نوائے وقت کی نگارشات مودودی صاحب کی تعریف میں ہیں ـــــ اور

ع

باقی ہے ابھی رنگ مرے خونِ جگر میں

مانا وہ تب وتاب اور موزونیتِ مقام اور ذرائع و وسائل نہیں رکھتا لیکن مخالفتوں کے ہجوم اور مزاحمتوں کے سیلابِ بلا میں کشتیِ حقیقت کو ساحل مراد تک لے جانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اس مقام پر صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ کتاب کے مندرجات اور حوالہ جات کو خواہ وہ کسی کے نام سے ہوں جناب حمید نظامی کے فرمودات کی روشنی میں پرکھیں۔ آخر میں ہم یوم نظامی منانے والوں سے استدعا کریں گے کہ وہ دلوں کو ٹٹولیں کہیں دل و نگاہ مردہ، اور ضمیر کی موت تو واقع نہیں ہو چکی؟ اور ان مسلم لیگی حضرات سے بھی جو قائد اعظمؒ کے جانشین کہلانے پر مصر ہیں کہ وہ کہاں کھڑے ہیں؟

تو اے مسافرِ شب خود چراغ بن اپنا
کر اپنی رات کو داغِ جگر سے نورانی

یہ فضا کی تاریکی چھٹ جائے گی بشرطیکہ سرشت میں پاکی و درخشانی ہو یا پیدا کر لی جائے۔ اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک وہ بے باکی عود نہ کر آئے جو نظامی کی تحریروں اور قائد اعظمؒ کی تقریروں نے جسدِ مسلم لیگ

میں پیدا کی تھی۔ جب تک فضائے ملت اس بانگِ اذان سے بہرہ ور نہیں ہو گی جو حمید نظامی مرحوم و مغفور نے فضائے صحافت میں بلند کی تھی، تو یہ علم و حکمت شیشہ بازی سے آگے نہ بڑھ سکے گا۔ جماعت اسلامی کے زیر اہتمام وکلاء کا کنونیشن کیا آپ کی غیرت و غفلت کے لیے تازیانہ ثابت نہ ہوگا؟ خواب گراں میں مدہوش پاکستانی!

سحر کی اذاں ہو گئی اب تو جاگ

آسمانِ سیاست پر چھائے ہوئے تاریکیوں کے بادل اور کذب دریا کی گھنگھور گھٹائیں یہ سندیسہ دے رہی ہیں کہ جن تین شخصیتوں نے پاکستان بنایا ہے ان میں ایک وہ مولوی مودودی بھی ہیں جن کو نقیب پاکستان نظامی مرحوم جن القابات سے پکارتا اور جن اعزازات سے نوازتا ہے وہ آپکی نظروں سے گزر چکے ہیں۔ (چودھری حبیب احمد)

ہندوؤں سے سازباز

جناب حمید نظامی (مرحوم و مغفور رقمطراز ہیں:۔

"جب انہوں نے یہ دیکھا کہ ان کی تنہا کوششیں مسلم لیگ کی صفوں میں کوئی انتشار پیدا نہیں کر سکتیں تو انہوں نے ہندوؤں سے بھی سازباز شروع کی چنانچہ انہوں نے پٹنہ میں اپنے پہلے پبلک جلسہ میں مسٹر گاندھی کو دعوت دی اور انہوں نے اسمیں شرکت بھی کی لیکن ہمارا خیال ہے کہ بنیئے نے اس سودے کو کچھ منفعت بخش نہ سمجھا اور اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

(نوائے وقت مورخہ ۳۰ اپریل ۱۹۴۷ء)

یہ تشکیلِ پاکستان سے تین چار ماہ پہلے کا واقعہ ہے۔

پاکستان پہنچ کر

مودودی صاحب اور ان کی جماعت نے تحریکِ پاکستان کے خلاف جو کچھ

کیا تھا۔ اور وہ جس طرح مسلسل دس برس تک مسلم لیگ اور قائدِ اعظمؒ کے خلاف نفرت کے جذبات ابھارتے چلے آتے تھے۔ ذرا سوچیئے اگر معاملہ یوں ہوتا کہ یہی کچھ کسی پارٹی نے جماعتِ اسلامی کے ساتھ کیا ہوتا اور مودودی صاحب پاکستان کے گورنر جنرل ہوتے تو کیا وہ ان لوگوں کو پاکستان میں گھسنے کی اجازت دیتے ہے؟ اور اگر وہ زبردستی اندر آجاتے تو یہ ان کے خلاف کیا کچھ نہ کرتے۔ لیکن صاحب اقتدار قائدِ اعظمؒ جیسا وسیع الظرف سربراہ تھا۔ انہوں نے نہایت کشادہ نگہی اور خندہ جبینی سے کہا کہ لاتثریب علیکم الیوم۔ جو کچھ پہلے ہو چکا۔ اس پر کوئی مواخذہ نہیں ہوگا۔ اب آئندہ کے لیے امن اور سکون سے زندگی بسر کیجئے۔ کوئی اور ہوتا تو قائدِ اعظمؒ کے اس حسنِ سلوک پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اُن کا رہینِ منت رہتا۔ لیکن ان حضرات کے دل میں تو حسد کی آگ بھڑک رہی تھی کہ قائدِ اعظمؒ کی قیادت کامیاب کیوں ہو گئی اور ہماری اس مخالفت کے علی الرغم پاکستان وجود میں کیوں آگیا؟ چنانچہ انہوں نے ترجمان القرآن کے پہلے ہی شمارہ میں (جو جون ۱۹۴۸ء کو شائع ہوا تھا) تحریکِ پاکستان پر بھرپور تنقید کی اور اس کے بعد دل کے پھپھولے یہ کہہ کر پھوڑے کہ "یہ بحث ان سب لوگوں کا منہ کالا کر دینے والی ہے جنہوں نے پچھلے ربع صدی میں سیاسی تحریکوں کی قیادت فرمائی ہے۔"

(ترجمان القرآن اگست ۱۹۴۸ء)

آپ نے اس کتاب میں کسی جگہ پڑھ لیا ہوگا کہ حضرت مودودی جمہوریت کو خلافِ اسلام اور خلافِ قرآن کہتے ہیں لیکن اس جگہ ان کا انتخابی اسلام کیا کہتا ہے۔

"اگر کنونیشن مسلم لیگ کسی فرشتے کو بھی امیدوار کھڑا کرے تو جماعت اسکی حمایت نہیں کرے گی۔ کیونکہ ہمیں اس کے اصولوں سے اتفاق نہیں ہے۔ اس کے برعکس اگر ایک ہندو جمہوری نظام کی حمایت کرتا ہے تو ایسے میری تائید حاصل ہوگی۔ اس لیے کہ اس نے یہ اصول تسلیم کر لیا ہے کہ ملک کا نظام اکثریت کے نظریے کے مطابق ہونا چاہیئے۔"

(امروز ۲۰ اگست ۱۹۶۳ء)

(ط-۱ صفحہ ۱۹ تا ۲۲)

یہ ہے مرغ باد نما کا سا اسلام اور یہ ہے خدمتِ دین جو نبوی ﷺ اسلام کا حلیہ بگاڑ کر حضرت مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی فرما رہے ہیں جو جمہوریت پہلے از روئے قرآن و اسلام ناجائز تھی۔ اب ایوب خاں مرحوم کے مقابلہ میں اگر ہندو بھی اس منزہ و مقدس جمہوریت کی حمایت کرے تو مولانا صاحب اس کے ہمنوا۔ اور اس جمہوریت سے قائم کردہ حکومت کا فرانہ نہیں مومنانہ !!

ع کہوں کیا ماجرا، اس بے بصر کا (اقبالؒ)

(چودھری حبیب احمد)

روزنامہ نوائے وقت

۶ نومبر ۱۹۶۲ء

جماعتِ اسلامی کے تاریخی نقوش

از:۔ حمید اللہ خاں گوجرانوالہ

"مجھے نوائے وقت سے خاص اُنس ہے۔ اردو صحافت میں "نوائے وقت" ملک کا سب سے متین، بے باک اور محبِّ وطن اخبار ہونے کی وجہ سے ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے لیکن کچھ عرصہ سے نوائے وقت میں بعض ایسی باتیں شائع ہو رہی ہیں جو ایک نیازمند کے لئے تلخ بلکہ تشویشناک ہیں۔ میرے ذہن میں بار بار یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ وہی نوائے وقت ہے جو دشمنانِ پاکستان کے لیے ایک تازیانہ تھا جس نے تشکیلِ پاکستان میں نمایاں بلکہ درخشاں حصہ لیا تھا جس نے تشکیل کے بعد تعمیرِ پاکستان میں لاثانی خدمت کی۔ جس کی بے باکانہ کرنج اور فتنوں کی مؤثر نشاندہی سے دشمنانِ پاکستان ہمیشہ لرزاں رہے۔ لیکن آج "نوائے وقت" کدھر جا رہا ہے، آپکی قائداعظم کے ساتھ عقیدت مندی کیا ہوئی؟ وہ بانیٔ پاکستان کے ازلی دشمنوں کو کیوں "خوش آمدید" کہہ رہا ہے۔ میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں اور میں نے ایک خیرخواہ ہونے کی حیثیت سے اپنے خدشات اور شکایات (خدا کرے کہ

وہ غلط ہوں) آپ تک پہنچانے کا فیصلہ کیا ہے اور مجھے امید ہے کہ آپ انہیں شائع کر دیں گے۔

میری ان گزارشات کا محرک یہ احساس ہے کہ آج کل "نوائے وقت" جماعتِ اسلامی کا نقیب معلوم ہوتا ہے۔ اور آپ جسقدر پبلسٹی اس پاکستان دشمن جماعت کو دے رہے ہیں وہ میرے خیال میں "نوائے وقت" جیسے محبِ وطن اور سنجیدہ اخبار کو زیب نہیں دیتی۔

آپ کے وقائع نگار خصوصی نے "نوائے وقت" ۲۴ اکتوبر میں "جماعتِ اسلامی کے چند تاریخی نقوش" شائع کیے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ مولانا مودودی، اور جماعتِ اسلامی کی پاکستان اور قائدِ اعظم سے تاریخی دشمنی کا "تاریخی نقوش" کے اس مضمون میں رابطہ قائم نہیں ہو سکا۔ بلکہ جماعتِ اسلامی کو قائدِ اعظم اور لیاقت علی خاں مرحوم کے دور سے لے کر اب تک مظلوم ثابت کیا گیا۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر وقائع نگار خصوصی ان چند تحریرات کا حوالہ بھی دے دیتے جن میں مولانا مودودی نے پاکستان اور قائدِ اعظم کے متعلق معاندانہ گوہر افشانی فرمائی تھی اور جماعتِ اسلامی کے اس دور کا ذکر بھی کر دیتے جس میں وہ پاکستان کی تاریخی منزل پر حقارت کی نظر ڈال کر "کلکتہ میل" پر سوار ہو رہی تھی۔ اس مقصد کے لیے مولانا مودودی اور جماعتِ اسلامی کی چند تحریریں پیش خدمت ہیں جن سے ان کی پاکستان دشمنی کا ثبوت ملتا ہے۔ نیز ان کے اس دعوےٰ کی تردید بھی کھل جاتی ہے کہ انہوں نے کبھی پاکستان کے مطالبہ کی مخالفت نہیں کی۔ قائدِ اعظم کے متعلق ملاحظہ فرمائیں۔

● "افسوس کہ لیگ کے قائدِ اعظم سے لیکر چھوٹے مقتدیوں تک ایک بھی ایسا نہیں جو اسلامی ذہنیت رکھتا ہو اور اسلامی طرزِ فکر رکھتا ہو اور معاملات کو اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہو (مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم ص ۳۴)

● "میرے لیے اس مسئلہ میں بھی کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ ہندوستان میں جہاں مسلمان کثیر التعداد ہوں وہاں ان کی حکومت قائم ہو جائے۔"

(مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم ص ۳۵)

• اس نام نہاد مسلم حکومت کے انتظار میں اپنا وقت یا اس کے قیام کی کوشش میں اپنی قوت ضائع کرنے کی حماقت آخر ہم کیوں کریں جس کے متعلق ہمیں معلوم ہے کہ وہ ہمارے مقاصد کے لیے نہ صرف غیر مفید ہو گی بلکہ کچھ زیادہ ہی سدِّ راہ ہو گی"

(مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم ص ۱۳۲ حاشیہ)

• "باقی رہا نظامِ حکومت، وہ پاکستان میں بھی ویسا ہی ہو گا، جیسا ہندوستان میں ہو گا...... مسلمانوں کی کافرانہ اسلامی حکومت، اسلامی نقطۂ نظر سے غیر مسلموں کی کافرانہ حکومت کے مقابلہ میں کچھ بھی قابل ترجیح نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ قابلِ لعنت ہے۔

(مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم ص ۱۳۱ حاشیہ)

• "اور بالغرض اگر ایک گروہ اکثریت میں منتخب ہو بھی جائے تو یہ ممکن نہیں کہ آزاد پاکستان کے نظام کو اسلامی دستور میں تبدیل کیا جا سکے۔ کیونکہ ــــ جنت الحمقاء میں رہنے والے لوگ اپنے خوابوں میں کتنے ہی سبز باغ دیکھ رہے ہوں لیکن آزاد پاکستان (اگر فی الواقعہ بنا بھی تو) لازماً "جمہوری" لادینی اسٹیٹ کے نظریہ پر بنے گا۔"

(ترجمان القرآن فروری ۱۹۴۴ء ص ۱۵۴)

• "قرارداد پاکستان کے متعلق یوں گویا ہیں "جب میں مسلم لیگ ریزولیشن کو دیکھتا ہوں تو میری روح بے اختیار ماتم کرنے لگتی ہے

(مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم ص ۳۷)

"قائداعظم اور پاکستان کے متعلق مولانا مودودی کے ارشادات آپ نے ملاحظہ فرمائے آج کل وہ جمہوریت کے بڑے ہمدرد بنے ہوئے ہیں۔ اور وہ "مکمل بحالی جمہوریت" کا مطالبہ بڑی شد و مد سے کر رہے ہیں۔ اور وہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے "خون کی ندیاں" بہانے کی دھمکی بھی بالواسطہ طور پر دیا کرتے ہیں۔ لیکن یہ جاننا دلچسپی سے خالی نہیں ہو گا کہ جو شخص جمہوریت کا اتنا بڑا علمبردار بننے کی کوشش کر رہا ہے جمہوریت کے متعلق اس کے اپنے ذاتی خیالات کیا ہیں۔ اس سلسلہ میں مولانا کی تحریروں سے صرف چند ایک نمونے پیش کروں گا۔ جمہوریت یعنی ڈیموکریسی کے متعلق آپ فرماتے ہیں:۔

• "اگر آزادی کی یہ ساری لڑائی اس لیے ہے کہ امپیریلزم کے الٰہ کو ہٹا کر ڈیموکریسی

بت خانۂ حکومت میں جلوہ افروز کیا جائے تو مسلمان کے نزدیک درحقیقت اس سے
(کو)ئی فرق بھی واقع نہیں ہوتا۔ "لات گیا، منات آ گیا" ایک جھوٹے خدا نے دوسرے
جھوٹے خدا کی جگہ لے لی۔" (مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم ص ۹۵)

یہ تحریر مولانا مودودی نے اس زمانے میں لکھی جب ان کو یقین تھا کہ جماعت
اسلامی کبھی بھی جمہوری طریقہ سے مقبولیت حاصل کر کے برسر اقتدار نہیں آ سکتی
اس لیے جمہوری اصول کے مطابق بنی ہوئی اسمبلیوں اور پارلیمنٹیں موجودہ زمانے کے
جمہوری اصول پر مبنی ہیں ان کی رکنیت حرام ہے اور ان کے لیے ووٹ دینا بھی
حرام ہے۔" (رسائل و مسائل حصہ سوم ص ۴۵)

اور جمہوری انتخاب کے متعلق فرماتے ہیں :۔

"جمہوری انتخاب کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے دودھ زہر ملا ہو۔ تو اس سے
جو مکھن نکلے گا، قدرتی بات ہے کہ وہ دودھ سے زیادہ زہریلا ہو گا۔"

(مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم ص ۱۳۲)

جمہوریت کے متعلق مولانا مودودی کے ان خیالات کو ذہن میں رکھ کر مولانا کے
مکمل بحالی جمہوریت کے مطالبے پر نظر ڈالئے اور اس تضاد بیانی، دو عملی اور دوغلے
نظریات کی داد دیجیے۔ اس لیے کہ مولانا اپنی کتاب دستوری تجاویز ص ۱۴ پر فرماتے ہیں

و مجالس قانون ساز میں پارٹیاں بنانا از روئے دستور ممنوع ہونا چاہیئے۔

لیکن ۲۷۔ اگست سنہ ۱۹۶۲ء کو راولپنڈی پریس کلب میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا :۔

"بہرحال جماعت اسلامی قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں اسمبلی پارٹیاں ضرور قائم
کرے گی۔"

مولانا اپنے ذاتی اور جماعتی مفاد کی خاطر نظریات تبدیل کر لیتے ہیں اور اپنے
ہی قائم کردہ اصولوں کی مٹی پلید کرتے ہیں۔

(جاری ہے)

جماعتِ اسلامی کے تاریخی نقوش

از:- حمید اللہ خاں گوجرانوالہ

'نوائے وقت' کے وقائع نگار خصوصی نے بڑی خصوصیت سے ان سزاؤں کا ذکر کیا ہے جو مولانا مودودی کو "حکمرانوں" کی طرف سے عطا ہوئیں۔ لیکن یہ امر ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ مولانا مودودی کی نظربندی کی سزا سب سے پہلے لیاقت علی خاں مرحوم کے زمانۂ وزارتِ عظمیٰ میں ہوئی۔ یا پھر موجودہ کونسل لیگ کے صدر خواجہ ناظم الدین کے زمانے میں۔ اور خواجہ ناظم الدین کی بزرگی کا تو 'نوائے وقت' بھی بہت مدّاح ہے۔ درحقیقت مولانا کو سزائیں ان کی ملک دشمن حرکات کی وجہ سے ہوئیں۔ ان میں سے ایک حرکت کشمیر کی جنگ آزادی کے متعلق خیالات کا اظہار تھا۔ جس نے پاکستان کو سخت نقصان پہنچایا۔ چنانچہ جماعت اسلامی کے ترجمان روزنامہ "تسنیم" ۲۲۔ اگست ۱۹۴۸ء میں درج ہے۔

"جب تک پاکستان نے حکومتِ ہند سے دوستانہ تعلقات قائم کر رکھے ہیں پاکستانیوں کے لیے کشمیر میں ہندوستانی فوجوں سے لڑنا از روئے قرآن جائز نہیں ہے۔"

اب مولانا نے پینترہ بدلا ہے اور جہادِ کشمیر سے متعلقہ فتویٰ کو ایک "نجی رائے" میں تبدیل کر لیا ہے۔ مولانا مودودی کی شخصیت اور ان کی جماعت کو مدِّنظر رکھ کر "نجی رائے" کی اہمیّت کا اندازہ لگایئے۔ اپنی اس "نجی رائے" میں انہوں نے اپنی تنقیدی صلاحیتوں اور بھرپور طنز کے امتزاج کا ہدف قائدِ اعظم اور لیاقت علی خاں مرحوم کو بنایا۔ وہ کشمیر کے جہاد کو اس لیے جائز نہیں سمجھتے کیونکہ حکومت پاکستان کی فوج چھپ کر لڑ رہی تھی۔ دوسرے الفاظ میں حکومتِ پاکستان کی پالیسی پُرفریب تھی۔ کیونکہ وہ کر کچھ رہی تھی، اور ظاہر کچھ کہہ رہی تھی۔ اور بقول مولانا اگر حکومت پاکستان بھارت کے خلاف باقاعدہ اعلانِ جنگ کرتی تو پھر کشمیر کی جنگ جائز ہو جاتی۔ سیکرٹری صاحب نے اس کا خوب تجزیہ کیا ہے کہ وہ پاکستان کی انتہائی کمزوری کے دور میں اسے کھلم کھلا جنگ پر مجبور کر کے اسے بھارت کا نشانہ بنانا چاہتے تھے۔ اس

کے علاوہ ایسی صورت میں بھارت کے چار کروڑ مسلمانوں پر کیا کچھ قیامت گزرتی؟
اس سے کم قیمت پر مولانا کشمیر کی جنگ کو جائز قرار دینے پر آمادہ نہیں تھے۔ پھر اگر مولانا کشمیر کے جہاد کے خلاف نہیں تھے تو انہوں نے اس الزام کی تردید کیوں نہ کی جو "حکمرانوں" نے ان پر ۱۹۴۸ء میں عائد کیا تھا۔ اب مولانا فرماتے ہیں کہ میں نے تردید کرنا چاہی تھی، لیکن حکومت نے جماعت کے اخبار کو بند کر دیا۔ لیکن کیا وہ اس تردید کے متعلق ایک پوسٹر شائع نہیں کر سکتے تھے؟ حالانکہ پوسٹر بازی ان کی جماعت کا ایک محبوب مشغلہ ہے اور پاکستان میں پہلے پہل جماعت اسلامی صرف اپنے جہازی سائز کے پوسٹروں کی وجہ سے مشہور ہوئی تھی۔ اس سلسلے میں نواب ممدوٹ جیسے شریف النفس انسان کی گواہی بہرحال معتبر ہے۔ کیونکہ وہ سیاست سے عملی طور پر ریٹائر ہو چکے ہیں اور ان کو مولانا سے کوئی ذاتی عناد نہیں۔ اور اگر وہ چاہتے تو اپنے زمانہ کے اقدامات کی ذمہ داری لیاقت علی خاں مرحوم پر ڈال سکتے تھے۔ لیکن انہوں نے کمال جوانمردی کے ساتھ اظہار حق کر دیا کہ "میں مولانا کو ان کے کشمیر سے متعلقہ فتویٰ کی بنا پر جیل بھیج رہا تھا، لیکن چوہدری محمد علی آڑے آ گئے۔" چوہدری محمد علی کی مسلمہ شرافت کے باوجود مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ ان کی سب سے بڑی کمزوری مولانا مودودی ہیں وہ ان کو سب سے زیادہ شجاعت وبصیرت کا حامل سمجھتے ہیں۔ لیکن ہمیں تو صرف رونا ہے کہ مولانا کی یہ بصیرت و شجاعت اسوقت کہاں تھی جب دس کروڑ مسلمانوں کی عزت جان و مال کی بازی لگ رہی تھی۔ غیروں کے مقابلہ میں تو ان کی بصیرت کام آئی نہ شجاعت، اب اس بصیرت و شجاعت کے اظہار سے کیا فائدہ؟

مولانا کی باتوں اور تحریروں میں خودنمائی اور اپنے منہ سے اپنی تعریف کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ نوائے وقت کے وقائع نگار خصوصی سے ایک انٹرویو کے دوران مولانا نے جن خیالات کا اظہار کیا وہ اس کے گواہ ہیں۔

"مجھے صدر مملکت نے گورنر ہاؤس میں بلایا اور ملاقات کے دوران کہا کہ "میں آپ کا لٹریچر پڑھتا ہوں اور مجھے اس سے اسلام کو سمجھنے میں بڑی مدد ملی ہے"

" بتائیے اس امر کے ذکر کی کیا ضرورت تھی؟ اس سے مقصود کیا تھا؟ صرف اس امر

کی تشہیر مطلوب تھی کہ صدر مملکت میرا لٹریچر پڑھتے ہیں۔ کیا یہ ایک اونچے کردار اور بے غرضانہ سیاست کا مظہر ہے۔ اصل تعریف تو تب ہوتی جب صدر مملکت کسی عوامی مجلس میں اس کا تذکرہ کرتے۔ لٹریچر پڑھنے کی کیا بات ہے۔ میں ایک مخالف ہونے کے باوجود مولانا کا لٹریچر پڑھتا رہتا ہوں۔ اس خود نمائی میں بعض دفعہ مولانا سوقیانہ باتوں پر اتر آتے ہیں۔ مثلاً اس انٹرویو کا آخری پیرا پڑھیے جس میں لکھا ہے کہ جب اُن سے تذکرہ کیا گیا کہ "حکمران" طبقہ آپ کے لٹریچر سے استفادہ تو کرتا ہے لیکن اس کا اقرار کرتے ہوئے ہچکچاتا ہے تو مولانا نے فرمایا کہ "اُن کی پوزیشن ان ہندو دیویوں جیسی ہے جو اپنے خاوندوں کا نام لیتے ہوئے شرماتی ہیں۔" کیا یہ الفاظ ایک عالم دین بلکہ اس زمانہ کے بزعم خود بہت بڑے مصلح کے ہو سکتے ہیں۔ اس کا فیصلہ خود قاری کر سکتے ہیں۔

گزشتہ دنوں اپنے ان دوستوں سے جو جماعت اسلامی سے تعلق رکھتے ہیں لاؤڈ سپیکر کے استعمال پر پابندی پر تبصرہ سننے کا موقعہ ملا۔ میں ذاتی طور پر لاؤڈ اسپیکر کی ممانعت کے سخت مخالف ہوں۔ وہ اس پابندی کا موازنہ ان تکالیف سے کر رہے ہیں جو رحمۃ اللعالمین خاتم النبیین آنحضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اسلام کی ابتدائی حالت میں اٹھانی پڑی تھیں۔ اللہ اللہ دونوں جہانوں کے لیے رحمت لقب پانے والا تو طائف کی گلیوں میں پتھر کھا کر لہولہان ہو جاتا ہے اور اُف تک نہیں کرتا اور پھر بھی اپنی قوم کے لیے دعا ہی کرتا ہے۔ حیرت ہے صرف لاؤڈ سپیکر پر پابندی لگ جانے پر حکومت کو ان گنت ملاحیاں سنانے والے اپنی تکالیف کا موازنہ ایسی شخصیت سے کر رہے ہیں جسکی گرد تک کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔

لاہور میں جماعت اسلامی کے جلسۂ عام میں جو غنڈہ گردی ہوئی ہے وہ سخت مذمت کے قابل ہے۔ اور ہر صاحب عقل شخص اس پر غیر مشروط نفرت کا اظہار کرے گا۔ لیکن مولانا اس غنڈہ گردی کی ساری ذمہ داری کسی ثبوت کے بغیر حکومت پر ڈال رہے ہیں اور یہ کوئی مستحسن فعل نہیں۔ حکومت سے دشمنی میں اسقدر اندھا نہیں ہونا چاہیئے کہ جھوٹ اور سچ، حق اور باطل کی تمیز باقی نہ رہے۔ اور انسان مخالفت رائے کے جوش

میں اپنی تنقیدی توپوں کے دہانے بغیر کسی جرم ثابت کئے کھول دیے عام طور پر یہ ایک اصول بن گیا ہے کہ حکومت کی مخالف کسی جماعت کے جلسہ میں گڑبڑ ہو تو اسے حکومت وقت کا اقدام قرار دیا جاتا ہے اور ساری ملاحیاں اس کو سنائی جاتی ہیں ۔ لیکن اگر گڑبڑ اور غنڈہ گردی برسراقتدار لوگوں کے جلسوں میں ہو تو اسے حکومت کے خلاف عوام کی نفرت اور عوامی رد عمل کا مظہر قرار دیا جاتا ہے چوہدری محمد علی جب وزیر اعظم بنے اور انہوں نے اس حیثیت سے جب کراچی میں ایک جلسہ عام سے خطاب کرنا چاہا تو ان کے خلاف سخت غنڈہ گردی اور نعرے بازی کی گئی اور انہوں نے چند دن بعد اپنا استعفیٰ صدر کو پیش کر دیا۔ جو عوامل چوہدری محمد علی کے جلسہ میں گڑبڑ کرانے کے ذمہ دار تھے، کیا وہ جماعت اسلامی کے جلسہ میں کام نہ کر سکتے تھے ۔ ؟

جماعت اسلامی کے تین روزہ اجتماع کے پہلے دن ایک کارکن کی افسوسناک ہلاکت کو مولانا نے اللہ کی راہ میں شہادت قرار دیا لیکن کشمیر کی جنگ میں شہید ہونے والے مسلمان ان کے نزدیک حرام موت مر رہے تھے یہ درست ہے کہ اسوقت کہ ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی اس مضمون کی تحریر ثبوت کے طور پر پیش نہیں کی جاسکتی لیکن اس زمانہ میں آپ نے اشارۃً، کنایتاً اور نجی ملاقاتوں میں یہی تاثر دیا تھا اور اس کے گواہ اب بھی موجود ہیں اور اب مولانا ان کی خواہ کتنی تاویلیں اور تردیدیں کریں، سچائی کو جھٹلایا نہیں جاسکتا۔ (نوائے وقت، نومبر ۱۹۶۳ء)

مولانا کوثر نیازی اور مولانا مودودی

اعترافِ خطا و لغزش

جناب مولانا کوثر نیازی جنہوں نے سترہ برس جماعت اسلامی کے رکن کی حیثیت سے گزارے ہے۔ اور حضرت مولانا مودودی کو نہایت قریب سے دیکھا وہ اپنی کتاب "مودودیت عوامی عدالت میں" میں اپنے تاثرات بیان کرتے ہیں۔ ہم نے ان کی کتاب کے طویل اقتباسات اس لیے درج کتاب کیے ہیں کہ قارئین اندازہ فرما سکیں کہ ایک قریب و نزدیک سے دیکھنے والی آنکھ جماعت اسلامی کے امیر مودودی صاحب اور جماعت اسلامی کو کس زاویے سے دیکھتی ہے۔ مولانا کوثر نیازی پاکستان کی معروف شخصیت ہیں۔ اُن کی اس تحریر میں اُن کی بلند حوصلگی کا عکس بھی نمایاں ہے۔ آپ نے اعترافِ خطا و لغزش بھی کیا ہے۔ اور اس کتاب میں کھلے طور پر اپنا تجزیہ اور تجربہ پیش کیا ہے جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، اس کتاب سے کئی ایک انکشافات ایسے بھی سامنے آئیں گے جو ایک ایسے شخص کی نوکِ قلم پر ہی آسکتے تھے جسے مولانا مودودی کا اتنا قرب حاصل رہا ہو۔ قارئین کرام ہمارے ساتھ اتفاق کریں گے کہ ان اقتباسات سے سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کو اچھی طرح سے سمجھنے میں کافی مدد ملے گی۔

اب ملاحظہ فرماتے جائیے اور دیکھتے جائیے کہ مولانا کوثر نیازی اپنے آئینۂ تحریر میں مودودی صاحب کو کیا دکھاتے ہیں لیکن ایسی آنکھ ان صداقتوں کو کیا دیکھے گی جو بینا تو ہو اور بیدار نہ ہو (چودھری حبیب احمد)

مسئلہ دفاع اور فوجی بھرتی

" افسوس صد افسوس کہ ہندوستان میں تو مولانا حسین احمد مدنی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حفظ الرحمٰن اور مولانا احمد سعید مسلمانوں کو یہ مشورہ دے رہے ہیں کہ وہ حکومتِ ہند سے دل و جان کے ساتھ تعاون کریں مگر پاکستان میں اسلامی حکومت اور اسلامی نظام کے داعیوں کا طائفہ مسلمانوں کو یہ مشورہ دے رہا ہے کہ موجودہ حکومت غیر اسلامی اور موجودہ نظام کافرانہ ہے۔ لہٰذا دین میں تحریف کئے بغیر اس سے تعاون ناممکن ہے۔ گویا اگر اس عدم تعاون کے طور پر خدانخواستہ پاکستان ختم ہو جائے تو پھر یہاں اسلامی نظام رائج ہو جائے گا۔ جماعت اسلامی ہندوستان میں بھی ہے۔ اور اس کے امیر بھی مودودی صاحب ہی ہیں۔ یہ کیا بات ہے کہ ان کے سارے فتوے پاکستان کے لیے وقف ہیں۔"

"نوائے وقت" ۲۹۔ اکتوبر ۱۹۴۸ء

اداریہ ۳ ستمبر ۱۹۴۸ء

"جب تک انگریزوں کی حکومت تھی تو مودودی صاحب کے ہمدرد و معاون سرکاری افسر اور اہل کار انگریزی حکومت کی وفادارانہ خدمت کرتے رہے اور مودودی صاحب نے انہیں نہ روکا۔ نمائشی پروپیگنڈہ دوسری چیز ہے لیکن کوئی شخص اس سے انکار نہیں کر سکتا، کہ گورنمنٹ آف انڈیا کے بعض اعلیٰ افسر مودودی صاحب کے معاون و سرپرست، اور مودودی صاحب کو ان سے مالی اعانت بھی ملتی رہی۔ حیرت ہے کہ جب تک انگریز راج تھا، اس وقت تک مودودی صاحب نے نہ تو یہ فتویٰ دیا کہ لڑائی کے لیے فوج میں بھرتی حرام ہے۔ نہ یہ اعلان کیا کہ میرے معاونوں اور مریدوں کو انگریزی حکومت سے بغاوت کا اعلان کر دینا چاہیئے۔ لیکن پاکستان آکر انہوں نے اپنا معیار کچھ اس ڈھنگ کا بنایا کہ پاکستان کے انتہائی مشکل دور

میں قدم قدم پر ان کا حکومت سے تصادم ناگزیر ہو گیا۔ حلفِ وفاداری کے مسئلے پر حکومتِ پنجاب سے ان کی چپقلش اسی بنا پر ہوئی اور فوجی بھرتی کا قضیہ بھی اسی وجہ سے پیش آیا۔

"نوائے وقت"

مولانا مودودی کی خدمتِ بابرکت میں

"نوائے وقت" ۳۰۔ اپریل ۱۹۴۷ء

"مولانا مودودی جن خیالات کی مسلمانوں میں تبلیغ کر رہے ہیں وہ ہمیں ایک مدت سے معلوم ہیں ہم جانتے ہیں کہ ان کی رائے میں ہندوستان کے مسلمان صحیح معنوں میں مسلمان ہی نہیں ہیں اس لیے ان کی کوئی تحریک اور کوئی جماعت مولانا کی ہمدردی کی مستحق نہیں۔ مولانا کا نقطۂ نظر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ از سرِ نو مسلمان بنیں تو مولانا کی امداد کے مستحق ٹھہریں گے۔ ورنہ موجودہ صورت میں مولانا کو ان سے کوئی ہمدردی نہیں نہ اُن سے کوئی سروکار رکھنا چاہتے ہیں۔ غالباً یہی تلقین مولانا اپنے مریدوں کو بھی فرماتے ہیں۔

دُوسرا اقتباس

"یہ تو سنا تھا کہ مولانا مودُودی بھی اب میدانِ سیاست میں قائدانہ شان کے ساتھ اُترنے والے ہیں لیکن کیا یہ ضروری تھا کہ جماعتِ اسلامی کے پہلے پبلک جلسہ ہی میں مسٹر گاندھی کو بلا کر کہیں اور نہیں تو خاص بہار میں فساد اور فتنہ آرائی کی ساری ذمہ داری مسلمانوں کے سر تھوپ دی جائے کہ چونکہ وہ اسلام اور نیشنلزم کو خلط ملط کر رہے ہیں یعنی پاکستان کی نیشنلسٹ تحریک کو اسلامی سمجھتے ہیں) اس لیے اُن کی اس کج خیالی کا نتیجہ لوا کھلی، بہار اور پنجاب کے افسوسناک واقعات کی صُورت میں ظاہر ہوا۔

تیسرا اقتباس اسوقت جبکہ مسلمانوں کی دلی تمنا یہ ہے، کہ مولانا آزاد، خان عبدالغفار خاں، مولانا حسین احمد مدنی، علامہ مشرقی بھی ہندوستان ہیں (اسلام نہ سہی اس کا محافظ اللہ ہے) محض برائے نام اور کلمہ گو سہی بہرحال مسلمانوں کی بقا کی خاطر مسلمانوں کے متحدہ محاذ کو مضبوط بنائیں، کیا مولانا مودودی سے یہ مؤدبانہ گزارش گستاخی تو نہ سمجھی جائے گی، کہ وہ اس نازک مرحلے پر مسلمانوں میں انتشار پیدا کرنے سے احتراز فرمائیں تو ان پر احسان کریں گے۔"

اس پر خیال آرائی کرتے ہوئے سترہ برس مودودی کی معیت میں رہنے والے جناب کوثر نیازی "مودودیت عوامی عدالت میں" میں تحریر فرماتے ہیں۔

"جماعت اسلامی کے اجتماع پٹنہ میں گاندھی جی کی شرکت کا یہ واقعہ جماعت کی کانگریس دوستی کے اظہار کے لیے اپنی توضیح آپ ہے۔ ہم اس پر کوئی حاشیہ آرائی نہیں کرنا چاہتے۔ البتہ اس موقع پر قارئین کے غور وخوض کے لیے یہ عرض کر دینا افادیت سے خالی نہ ہوگا کہ ایک طرف تو جماعت کے جلسہ میں مسٹر گاندھی شریک ہوئے اور دوسری طرف تقسیم ہند تک جماعت اپنا کوئی ایک اجتماع بھی پیش نہیں کر سکتی جس میں مسلم لیگ کی صف اول کے راہنماؤں کا تو ذکر کیا۔ اس کی تیسری صف کا کوئی لیڈر بھی شریک ہوا ہو۔ اگر کچھ کارکن شریک بھی ہوئے تو جماعت کے اجتماع میں ان کی شان نزول اس کتاب کے پچھلے صفحات میں تفصیل سے بیان ہو چکی ہے اب یہ موازنہ کرنا قارئین کا کام ہے کہ تقسیم کے وقت بھی جماعت اسلامی اپنا وزن کس پلڑے میں ڈال رہی تھی۔

(مودودیت عوامی عدالت میں صفحہ ۶۰)

اسی ضمن میں

جماعت کے خلاف مسلم لیگی کارکنوں کے مظاہرے

مولانا کوثر نیازی مودودی صاحب کے نیاز مندِ دیرینہ جو پختگی شعور و سن کو پہنچ کر حسن بن صباحی ہتھکنڈوں کو پہچان گئے۔

جماعت اسلامی اور مودودی صاحب کی طرف سے مسلم لیگ پاکستان اور قائداعظم کی مسلسل مخالفت کرنے کی وجہ سے عام مسلمانوں میں ناراضگی اور نفرت کا پیدا ہو جانا ایک قدرتی امر تھا۔ اس زمانے میں مودودی صاحب کوئی ایسے قابل ذکر لیڈر نہ تھے کہ مسلم لیگ کا کوئی ذمہ دار لیڈر ان کا نوٹس لیتا البتہ بعض مقامات کے مسلم لیگی کارکنوں کی طرف سے ان کے جماعتی اجتماعات کے موقع پر زبردست مظاہرے ہوئے۔ اسی طرح ایک مظاہرہ مدراس کے مقام پر ہوا جس کی تفصیل خود میاں طفیل محمد قیم جماعت نے اپنی رپورٹ میں محفوظ فرمادی ہے یہاں اتنی گنجائش تو نہیں کہ اسے بتمام و کمال نقل کیا جاسکے۔ البتہ اس کے بعض جستہ جستہ حصے قارئین کی معلومات کے لیے پیش کئے جا رہے ہیں تاکہ تقسیم سے چند ماہ قبل تک مسلم لیگ کے کارکنوں میں مودودی صاحب کی خدمات اور جماعت کی سرگرمیوں کے متعلق جو ردِّ عمل پایا جاتا تھا، اس کا اندازہ لگایا جاسکے میاں صاحب نے خود لکھا ہے کہ "عوام کی ان افسوسناک حرکات کے بعد مدراس کے بعض ذمہ دار راہنماؤں نے بھی شرارت پھیلانے والے لوگوں کی علانیہ تائید کی۔"

واقعہ کی مختصر تفصیل یہ ہے کہ :-

"اجتماع کے پہلے اجلاس میں جماعت کی سالانہ رُوداد سنائی جا رہی تھی کہ ۴ بجے شام کے قریب چالیس پچاس آدمیوں پر مشتمل ایک گروہ مسلم لیگ کا جھنڈا لیے ہوئے نعرے بلند کرتا ہوا اجتماع گاہ کے صدر دروازے پر آکر رکا۔ اور

اُس نے نعروں اور دوسرے طریقوں سے اسقدر شور مچانا شروع کیا کہ باوجود لاؤڈ اسپیکر کے مقرر کی آواز سامعین تک پہنچنی مشکل ہو گئی۔ امیر جماعت نے جو اسوقت اجلاس کے صدر تھے، قیم صاحب کو رپورٹ بند کر دینے کو کہا اور شرکاء اجتماع پر بالکل خاموشی چھا گئی۔ باہر سے آنیوالا گروہ بدستور شور کرتا رہا۔ کچھ آدمی اجتماع گاہ کے صدر دروازے پر چڑھ گئے اور انہوں نے دروازے پر مسلم لیگ کا جھنڈا لگا دیا۔"

دوسرے اجلاس میں مولوی مظہر الدین صاحب اور قیم جماعت کی تقریر میں تمام حاضرین نے جن کی تعداد پانچ چھ سو تھی (اللہ اکبر! حاضرین کا یہ ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر (ک۔ن) جب قیم جماعت کی تقریر ختم ہوئی تو مسلم لیگ کے ایک سرکردہ رکن ڈاکٹر نعمت اللہ صاحب نے حسب ذیل سوال چٹ پر لکھکر قیم جماعت کو دیا۔

"کیا اسلام اور مسلمانوں کی خدمت ایک وقت میں نہیں کی جا سکتی۔ اگر نہیں تو کیوں ——؟

اس کے ساتھ ہی ایک مسلم لیگی عالم دین نے جو بہت بزرگ صورت اور عمر رسیدہ تھے" حسب ذیل سوال لکھ کر قیم جماعت کو جواب کے لیے دیا۔

" اگر ہم کسی فاسق و فاجر شخص کو اپنا راہنما بنا لیں تو کیا ہم جہنم میں جائیں گے

ان دونوں سوالوں کو ہاتھ میں لے کر قیم جماعت مائیکروفون پر ابھی آ کر کھڑے ہی ہوئے تھے کہ دو تین سو آدمی یکدم اجتماع گاہ میں کھڑے ہو گئے (گویا جلسہ کی نصف حاضری (ک ن) اور انہوں نے مسلم لیگ زندہ باد، جمعیتہ العلماء مردہ باد کے نعرے بلند کرنا شروع کر دیئے۔ اور اسقدر غل مچایا کہ کانوں پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔"

" اس کے بعد بلوائیوں نے پھر ہنگامہ برپا کرنا شروع کیا جلسہ گاہ سے نکل کر سٹور اور کچن میں گھس گئے۔ تقریباً پچاس آدمیوں کا کھانا لوٹ لے گئے

اور نہایت بے حیائی کے ساتھ ٹھٹھے مارتے ہوئے شارعِ عام پر دوڑ رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ ہم لوٹے ہوئے کھانے کو کھاتے رہے۔"

گیارہ بجے کے قریب جب بلوائی منتشر ہوئے اور بالکل امن ہو گیا اور کسی خرابی کا اندیشہ باقی نہ رہا۔ تب صدرِ اجلاس مولانا محمد اسمٰعیل صاحب اور قیمِ جماعت سٹیج سے اٹھے اور اپنی اپنی قیام گاہ کو چلے گئے۔"

اس مقام پر جناب کوثر نیازی معترض ہیں۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ مودودی صاحب اپنے قیمِ جماعت کے اعلان کے مطابق اگلے روز خود سوالوں کا جواب دیتے لیکن انہوں نے عافیت اسی میں سمجھی کہ جلسۂ عام ہی منسوخ کر دیا جائے۔ چنانچہ میاں صاحب کا کہنا ہے کہ قیمِ جماعت نے اس واقعہ کی رپورٹ امیرِ جماعت کو دی اور انہوں نے فرمایا کہ چونکہ ہم لوگوں کی اصلاح اور خدمت کے لیے آئے ہیں، ان کو فساد میں مبتلا کرنے نہیں آئے، اس لئے اجتماع گاہ کو چھوڑ دیا جائے اور کل کی ساری کارروائی میری قیام گاہ (کوٹھی مولوی نذیر حسین صاحب قصوری) پر ہو، نیز کل خطابِ عام کا جلسہ بھی موقوف کر دیا جائے۔

جناب مولانا کوثر نیازی خیال آراء ہیں

اجتماع گاہ تبدیل ہو گئی اور جلسۂ عام ملتوی ہو گیا۔ میاں صاحب کا کہنا ہے کہ دوسرے روز بہت سے لوگ امیرِ جماعت کو ملنے آئے لیکن

"ان سب باتوں کے باوجود ہم سخت افسوس اور رنج کے ساتھ اس امر کا اظہار کرنے پر مجبور ہیں کہ بجز سیٹھ محمد جمال صاحب کے بہت کم لوگ ایسے تھے جن کو صورتِ حال پر فی الواقع افسوس ہوا ہو۔ ان میں سے اکثر تو اس بات پر فخر کر رہے تھے کہ یہاں کے مسلمانوں میں مسلم لیگ نے اس قدر تعلق پیدا کر دیا ہے کہ اب وہ مسلمانوں میں کسی دوسری جماعت کے وجود کو گوارا ہی نہیں کر سکتے خواہ اس کی دعوت کیسی ہی حق اور صحیح ہو۔"

مولانا کوثر نیازی

میاں صاحب کا کہنا ہے کہ اگلے دن مغرب سے چند منٹ قبل مسلم لیگ کے
سات لیڈر آئے وہ ابھی مجھ سے بات چیت کر ہی رہے تھے کہ :-

"اجتماع گاہ میں ایک ہنگامہ شروع ہو گیا - اور اسقدر شور مچا کہ امیر
جماعت کی قیام گاہ میں بھی جہاں آج کے اجتماع کی کارروائی ہو رہی تھی،
کام کرنا مشکل ہو گیا۔

"بلوائیوں نے پورے اجتماع گاہ میں مسٹر جناح کی بیسیوں تصویریں لٹکا رکھی
تھیں - ہر طرف ابتری مچا رہے تھے اور اوباشی کا وہ مظاہرہ کر رہے تھے کہ الامان والحفیظ
ان کے لیڈروں نے کوئی گھنٹہ بھر کی مسلسل جدوجہد اور رد و کد کے بعد ہجوم
کو ذرا قابو میں کیا اور ان کے جذبات کو اپیل کرنے کے لیے کچھ نعرے بلند کئے
دو تقریریں بھی کیں اور ہمیں بتایا کہ آپ نے سٹیج کو تو فتح کر لیا ہے اب
لیئے کہ مولانا مودودی صاحب کی تقریر سننا چاہتے ہیں یا نہیں -؟

اگر آپ چاہتے ہیں تو وہ تقریر کریں گے اور نہیں چاہیں گے تو نہیں گے۔
لیڈر صاحبان نے انہیں منتشر ہو جانے کے لیے کہا لیکن ہجوم اس کے بعد بھی دیر
تک شور مچاتا رہا۔ اور ہنگامہ برپا کرتا رہا۔
اگلے روز جب اجتماع گاہ کے سامان کا جائزہ لیا گیا تو بہت سے برتن اور چٹائیاں
غائب تھیں" (روداد جماعت حصہ پنجم)

جناب کوثر فکر خام کے شکار غلط کار اور شعور بخت کے دور کے حق
ن، جنہوں نے سترہ برس جماعت اسلامی میں رہ کر جناب سید ابوالاعلیٰ
مودودی امیر و امام جماعت کی نیت و ذہنیت کو پہچانا اور اعتراف
حقیقت و صداقت کے طور پر ۱۹۶۲ء میں نقاب پوش مصلحین

واضح رہے کہ جماعت اسلامی کا امیر اور اس کے کارکن اس زمانے میں قائد اعظم
مسٹر جناح ہی کہا کرتے تھے حضرت قائد اعظم رحمۃ اللہ علیہ تو اب سلطنتاً ہی کہنا شروع
شروع کیا گیا ہے اور یہ حکمت عملی کی پالیسی کے تحت مصلحتی اسلام کی روشنی میں درست ہے

اپنے اصلی رُوپ میں" اور جماعتِ اسلامی کا رُخِ کردار پیش کرنیوالے اس راقم کی تائید و حمایت عملاً ۱۹۶۵ء سے شروع کی۔ اب اپنے انداز سے نقاب کشا ہیں۔
(مرتب)

قابلِ توجّہ

مولانا کوثر تحریر فرماتے ہیں،

" اجتماع مدراس کے یہ واقعات" جماعت اسلامی اور مسلم لیگ" کے ضرورت سے زیادہ "خوشگوار" تعلقات کا جو ثبوت پیش کر رہے ہیں، ان پر کسی تبصرے کی حاجت نہیں، صاف نظر آ رہا ہے کہ مودودی صاحب دو قومی نظریئے کے واحد اور بلا شرکتِ غیرے مصنف" ہونے کی حیثیت سے مسلمان عوام سے بھرپور خراج تحسین وصول کر رہے تھے اور مسلم لیگ قدم قدم پر یہ تسلیم کرتی جارہی تھی کہ پاکستان کے لیے جو سنہری خدمات" مودودی صاحب انجام دے رہے ہیں۔ وہ ان کے تمام معاصر مسلم راہنماؤں کی مجموعی خدمات بھی کہیں زیادہ ہیں۔"

پٹنہ کے اجتماع میں گاندھی جی کی شرکت

ادھر مسلم لیگ اور جماعت اسلامی کے درمیان تعلقات کی نوعیت یہ تھی اور ادھر کانگریس ۱۹۳۸ء سے لیکر ۱۹۴۷ء تک مودودی صاحب کے کام کی اتنی بڑی قدر دان تھی کہ جب اسی اپریل ۱۹۴۷ء میں پٹنہ کے مقام پر جماعت اسلامی کا اجتماع منعقد ہوا، تو گاندھی جی جماعت کی دعوت پر بنفس نفیس اس اجتماع میں شریک ہوئے یہاں تک کہ اس مقصد کے لیے انہوں نے اپنی پراتھنا کی تقریر بھی ملتوی کر دی۔ جماعت اسلامی کے جلسہ عام میں ان کی تشریف آوری کی تمام تفصیلات بھی روئدادِ جماعت اسلامی حصہ پنجم کے صفحہ نمبر ۱۷۰ تا ۱۷۷ کی زینت ہیں گاندھی جی کے ہمراہ دو خواتین بھی تھیں وہ کوئی پون گھنٹے تک سٹیج کے قریب بیٹھے جلسہ کی کاروائی سنتے رہے اور جب مقرر سٹیج سے اتر کر گاندھی جی کے پاس آیا تو گاندھی جی نے جماعت کی اپنی رپورٹ کے

طابق ان لفظوں میں مقرر کو داد دی کہ :-

"میں نے آپ کی تقریر کو بڑے غور سے سنا اور مجھے اسے سنکر بہت مسرت ہوئی۔"
اس پر ان سے کہا گیا کہ :-

گاندھی جی! ایک تقریر سے پوری بات کو پانا بہت مشکل ہے۔ اس لیے اگر
آپ کچھ وقت نکالیں تو ہم اپنی دعوت کو آپ کے سامنے پیش کرنے اور سمجھانے
کی کوشش کریں اور بہتر یہ ہوگا کہ آپ کچھ ہمارے لٹریچر کا مطالعہ بھی کریں گاندھی
جی نے جواب دیا کہ اب تو میں دہلی جا رہا ہوں۔ وہاں کچھ اہم معاملات درپیش ہیں
واپسی پر میں کچھ وقت نکالنے کی کوشش کروں گا۔ اس کے بعد انہیں اور ان کی
ساتھی خواتین کو ان کی موٹر میں سوار کر دیا گیا اور وہ واپس چلے گئے۔"

ایک محرم راز درون میخانہ

جناب مولانا کوثر نیازی رقمطراز ہیں

"گاندھی جی نے دلی سے واپسی کے بعد وقت نکالا کہ نہیں
اور وقت نکالا تو جماعت کے راہنماؤں سے انہوں نے کیا راز و نیاز کی باتیں
کیں یہ تفصیل ہمارے موضوع سے خارج ہے لیکن اجتماع پٹنہ میں گاندھی جی
کی شرکت کا یہ نتیجہ نکلا کہ مسلمانوں میں جماعت کے خلاف بیزاری کی عام لہر پھیل
گئی۔ جماعت کی اپنی رپورٹ کے مطابق :-

بعض مقامات پر تو جماعت اسلامی اور اس کے کارکنوں کو علانیہ گالیاں
دی جانے لگیں۔ ایک "مجاہد اسلام نے اپنے اخلاق کا ایسا عجیب مظاہرہ کیا جسے دیکھ
کر سخت رنج ہوا کہ موجودہ قوم پرستی کی تحریک (یعنی مسلم لیگ) نے مسلمانوں
کے اخلاق کا کس بری طرح دیوالیہ نکال دیا ہے۔ ان صاحب سے اجتماع کے انتظامات
کے سلسلہ میں کچھ سامان مستعار لیا گیا تھا۔ یہ سامان لیتے وقت ہمارے منتظمین
نے ان سے باصرار کہا تھا کہ آپ اس کا کرایہ لے لیں مگر انہوں نے کرایہ لینے سے
قطعی انکار کر دیا تھا۔ لیکن اجتماع کے بعد جب سامان واپس پہنچانے کے لئے گئے

تو انہوں نے ایسی درشتی کے ساتھ کرایہ طلب فرمایا کہ گویا کرایہ کا مطالبہ ان کی طرف سے تھا اور ہم اس کے ادا کرنے سے بچنا چاہتے تھے۔ کرایہ تو خیر ان کے ہاتھ پر فوراً رکھ دیا مگر یہ اندازہ ہو گیا کہ جب قوم پرستی لوگوں کا دین بن جاتی ہے تو کیسی کیسی ذلیل بد اخلاقیاں ان کے لیے عین اخلاق بن جاتی ہیں۔"

دیکھتے جایئے

مولانا کوثر رقمطراز ہیں :۔

"روئداد جماعت حصہ پنجم کے مطابق اپریل ۱۹۴۷ء تک پورے صوبہ سرحد میں جماعت کے ارکان کی کل تعداد ۲۸ تھی۔ مگر مودودی صاحب نے اس موقع پر بھی اپنی "متوہم انا" کا مظاہرہ کیا اور پاکستان کو ۲۸ ووٹ دینے میں بھی انتہائی تامل سے کام لیا۔ کیونکہ ان کے نزدیک یہ مسئلہ بھی کوئی اصولی اور مقصدی مسئلہ نہ تھا۔ فرمایا :۔

"یہ سوال کہ کس چیز کے حق میں رائے دیں، تو اس معاملے میں جماعت کی طرف سے کوئی پابندی نہیں عائد کی جا سکتی۔ کیونکہ جماعت اپنے ارکان کو صرف ان امور میں پابند کرتی ہے جو تحریک اسلامی کے اصول اور مقصد سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ معاملہ نہ اصولی ہے نہ مقصدی۔ اس لیے ارکانِ جماعت کو اختیار ہے کہ وہ اپنی صوابدید کے مطابق جو رائے چاہیں دے دیں۔

البتہ آخر میں ازراہِ سخاوت یہ رجحان ظاہر فرما دیا کہ :۔

"اگر میں خود صوبہ سرحد کا رہنے والا ہوتا تو استصواب رائے میں میرا ووٹ پاکستان کے حق میں پڑتا۔"

دیکھئے آپ نے حضرت مولانا مودودی کے جرنلسٹک حربے — یہ اٹھائیس ارکان کسی امر میں پابند نہیں جسے چاہیں، ووٹ دیں۔ خود جناب عالی تبار صوبہ سرحد کے رہنے والے نہیں۔ یہ ہیں علم الکلام کی سحر طرازیاں اور طلسم انگیزیاں جو سطحی اور شد بد کے آدمیوں کو ان کے دام فریب میں پھانس لیتی

ہیں۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ صوبہ سرحد کا ریفرنڈم ان کے نزدیک نہ اصولی ہے نہ مقصدی۔ اور یہ بھی آپ دیکھ رہے ہیں کہ جماعت اسلامی کے ۲۸ ارکان کا وزن کس پلڑے میں ڈالا جارہا ہے۔ قربان شوم۔ اسے کہتے ہیں، حسن بن صباح کی عیارانہ اور شاطرانہ وہ چالیں۔ اور یہ ہیں ابلیس سیاست کے فریب و مکر کے تاروں سے بُنے ہوتے سیاسی جال کے وہ تانے بانے اور یہ ہے وہ شاطر جسے جناب حمید نظامی مرحوم نے "راسپوٹین" اور "حسن بن صباح" کی طرح "عیار" لکھا ہے۔ (چودھری حبیب احمد)

جھنگ اور مودودی

۱۹۴۸ء میں جناب سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب میاں طفیل احمد صاحب کی معیت میں جھنگ کے دورے پر تشریف لائے تو جناب عرفان چغتائی (مرحوم و مغفور) مشہور صحافی جو ہوائی جہاز کے حادثہ میں شہید ہوئے) بعض دوستوں کے ہمراہ مودودی صاحب کے پاس آئے اور اُن کی توجہ ایک نمک پاش جگر سوز پوسٹر کیطرف مبذول کرائی جسمیں اسی طرح کی عبارت تھی اور جو دارالاسلام سے بھاگ کر آنیوالے مودودی کی جماعت نے شائع کیا تھا کہ :۔ "مسلمانو! تم نے باطل اصولوں کی خاطر گھر بار چھوڑا، عزیز و اقارب کو ذبح کرایا" اور آپ سے پوچھا (یعنی عرفان چغتائی صاحب نے) کہ مولانا! کیا وہ اصول باطل تھے جن کے لیے مشرقی پنجاب اور ریاستوں کے مسلمانوں کو ہجرت کر کے یہاں آنا پڑا۔ تو مولانا نے جواب دیا۔

"واقعی میرے نزدیک کسی کو مہاجر کہنا ازروئے شریعت ناجائز ہے کیونکہ مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کا یہ سفر ہجرت نہیں ہے۔"

عرفان صاحب کا دوسرا سوال یہ تھا کہ :۔

"کیا پھر آپ کے نزدیک مہاجرین کی جانی اور مالی قربانیوں کی کوئی قیمت نہیں۔"

اِس پر مولانا مودودی نے فرمایا۔

"نہیں وہ بھگوڑے اور بزدل ہیں۔ انہوں نے ایک غلط قدم اٹھایا تھا۔"
پیکرِ عقل و بصیرت، مجسمۂ فہم و فراست اور ہیولائے غیرت و حمیت نے
بھری بزم میں فرمایا کہ خطا معاف، کیا آپ بھی اسی زمرہ میں داخل نہیں
اور انہیں اس کا کچھ جواب نہ بن پڑا اور منہ پر مہر سکوت لگ گئی (مرتب)

اداکار

جون ۱۹۴۸ء کے ترجمان القرآن میں قائد اعظم کی وفات سے صرف دو ڈھائی
ماہ پہلے مودودی نے یہ خراجِ عقیدت قائد اعظم کو پیش کیا تھا جس کا صرف
ایک فقرہ یہاں نوٹ کیا جاتا ہے جو مسلم لیگ کے قائدین کہلانے والوں کی
غیرت کے لیے تازیانہ ہے اور حضرت قائد اعظم کو محسن ملت تسلیم کرنے والوں
اور انصاف پسندوں کے لیے لائقِ توجہ!

"اس اداکار کا پارٹ اس ڈرامے میں سب سے زیادہ ناکام ہے۔"

اس توہینِ محسن، اور اس بے ہودہ اور لچر جملے پر تبصرہ آرائی کرتے ہوئے
"مودودیت عوامی عدالت میں" کے صفحہ ۷، پر جناب کوثر نیازی لکھتے ہیں:

"ہمیں اسلامی ضابطۂ اخلاق کے مطابق لکھنے کا سلیقہ نہیں، ورنہ جواباً ہم بھی
عرض کرتے کہ مولانا اگر پاکستان کی سیاست واقعی کوئی کھیل تھی تو ذرا اس میں آپ
بھی تو اپنے مقام کا تعین فرمائیں کہ آپ اس کے "ولن" تھے۔ "ایکسٹرا" مگر ظاہر ہے کہ
اس طرح کی شرعی گالیاں دینے کا حق ہم ایسے گنہگاروں کو کیسے پہنچ سکتا ہے اس کے
جملہ حقوق تو سرف صالحین نے محفوظ کرا رکھے ہیں۔"

فریب کاریاں اور دروغ بافیاں

مسلمان اور موجودہ سیاسی کش مکش حصہ اول و دوم کو مسلم لیگ نے
بنداً کانگریس کے خلاف استعمال کیا لیکن جب انہوں نے مسلمان اور موجودہ

سیاسی کش مکش حصہ سوم لکھا۔ اس میں کانگریس اور کانگریسی خیال کے مسلمانوں کی مخالفت تو چھوڑ دی، قائداعظمؒ اور مسلم لیگ کو نشانۂ ستم بنایا اور تنقید و توہین کے ترکش کے تمام زہر آلود تیر ان پر برسائے۔ ان پاکستان سوز ملت کُش مضامین کی اشاعت پر جناب محمد ذکاء اللہ صاحب (نواب صاحب) نے جب "تضاداتِ مودودی" (یہی نام راقم نے اپنی کتاب کا رکھا تھا جو کہ صفدر سلیمی مرحوم و مغفور کے فرمان پر "جماعت اسلامی کا رُخ کردار" تبدیل کیا۔ (راقم) کو واضح کیا تو مولانا مودودی نے اپنے انتقامی اور مصلحتی اسلام کی رُو سے ترجمان کی اشاعت جو کہ سہ ماہی تھی دسمبر، اکتوبر، نومبر ۱۹۴۱ء میں نواب صاحب کا خوب مذاق اڑایا اور اعلان کیا کہ وہ اپنے نظریات کی اشاعت سے ہرگز ہرگز باز نہیں آئیں گے۔

اب ظاہر ہے کہ بعد کا عمل پہلے کا ناسخ ہوتا ہے تیسرے حصے پر گاندھی جی کی آتما پرسند ہوئی۔ وہ تقریر سے خوش ہوئے مقرر کو سراہا۔ ۵-۶-۷ اپریل ۱۹۴۶ء الٰہ آباد کے مقام پر جماعت اسلامی کا کل ہند اجتماع ہوا۔

میاں طفیل محمد اور جماعت کی کارگزاری

میاں صاحب نے جماعت کی کارگزاری پیش کرتے ہوئے فرمایا :۔

یہ اقتباس خصوصی توجہ اور غور و خوض کا مستحق ہے۔

میاں صاحب فرماتے ہیں :۔

اس کے علاوہ چونکہ ہمارے لٹریچر میں وقت کے سیاسی نظامات اور تحریکوں پر مفصل علمی تنقید کی گئی ہے۔ اس لیے جو سیاسی بیداری الیکشن کے زمانے میں لوگوں میں پیدا ہوئی (گو وہ ہمارے نزدیک قابل اطمینان اور صحیح نہ تھی) اس کی وجہ سے لوگوں نے اور زیادہ دلچسپی کے ساتھ ہمارے لٹریچر کی طرف رجوع کیا اور جیسا کہ کہا گیا ہے کہ بسا اوقات شر کی قوتیں بھی نادانستہ خیر کی خدمت کر گزرتی ہیں، الیکشن لڑنے والے فریقین نے ہمارے لٹریچر میں سے وہ چیزیں پبلک میں پیش کرنے

کی بکثرت کوشش کی جس کی زد دوسرے فریق پر پڑتی تھی اور اس طرح بھی پبلک کی ایک کافی تعداد ہمارے لٹریچر سے روشناس ہوگئی۔"

روئیداد جماعت اسلامی حصہ چہارم شائع کردہ مکتبۂ جماعت اسلامی کراچی لاہور ص ۵۳

مودودی صاحب کے شاگردِ رشید کے رشحاتِ قلم دیکھتے جائیے مسلم لیگ کو کانگرس کے ساتھ ہی شر کی قوت کہا ہے۔ مودودی صاحب کی نگارشات کو شر کی طرف سے خیر کی نادانستہ خدمت قرار دیا ہے۔ کیا اس کے بعد بھی نظریۂ پاکستان، پاکستان کی خدمت اور حمایت کا دعویٰ ہے؟ کیا یہ گنگ و جمن کا ملا ہوا پانی کوثر کہلا سکتا ہے اور کیا اسے "کوثر و تسنیم" کہکر مسلمانوں کے سامنے پیش کیا جاسکتا ہے۔ صرف یہی نا کہا جائے جھوٹوں پر خدا کی پھٹکار۔ اس ارشادِ ربانی کی روشنی میں کہ لعنۃ اللہ علی الکاذبین اور علامہ حسین میر کے تتبع میں علیٰ نقاب پوش مصلحین و مصلحتی و مفاہمتی مسلم کش مسلمین و علیٰ المقدسین۔ (مرتب)

مژدہ

میاں صاحب اپنے کارکنوں کو یہ مژدہ سناتے ہیں

"آپ یہ سنکر خوش ہوں گے کہ ان ملک گیر فسادات میں جہاں ہندوؤں سکھوں اور مسلمانوں کو جانی اور مالی دونوں قسم کا کثیر نقصان پہنچا وہاں ہمارے ارکان میں سے اینک خدا کے فضل سے کسی کا کوئی خاص نقصان نہیں ہوا۔ (ایضاً ص ۲۷)

دیکھا آپ نے مسلمان جدا۔ جماعت کے ارکان جدا۔ وہی قادیانی تکنیک، یعنی ارکانِ جماعت کا مسلمانوں سے کوئی تعلق نہیں (مرتب)

قیامِ پاکستان کے بعد

مولانا کوثر نیازی فرماتے ہیں:۔

" پاکستان قائم ہوگیا تو مودودی صاحب کو جلد از جلد اندازہ ہوگیا کہ ہندو ان خدمات کے باوجود ان کی کوئی خاص قدر نہیں کریں گے۔ دیسے بھی اب قائداعظم خاصے بوڑھے ہو چکے تھے اور اس پرانے حریف کے اٹھ جانے کے بعد پاکستان میں مودودی صاحب کو اپنی قیادت کا تخت بچھانے میں کافی آسانیاں نظر آ رہی تھیں۔ اس لیے آپ بادل ناخواستہ اپنے خود ساختہ "دارالاسلام" سے "ناپاکستان (یعنی ناپاک لوگوں کے ملک) میں تشریف لے آئے۔ مگر یہاں آکر بھی آپ نے ایک مدت تک نظریۂ پاکستان کی مخالفت اور اپنے پرانے موقف پر اصرار ترک نہیں کیا۔ قائداعظمؒ کو ملفوف گالیاں بھی دی جاتی رہیں۔ اور اس نو آزاد ملک کے لیے جو طرح طرح کے مسائل میں الجھا ہوا تھا۔ نئی نئی الجھنیں پیدا کرنے کا مشغلہ بھی برابر جاری رکھا گیا۔"

(مودودیت عوامی عدالت میں ص۶۲ از مولانا کوثر نیازی)

یہ خلوتیانِ راز میں سے جو مولانا مودودی کی خلوتوں جلوتوں میں جلوہ طراز رہے جناب کوثر نیازی کے الفاظ ہیں بتائیے؟ کہ راقم نے یا طلوع اسلام یا مودودی کے کسی اور پاکستانی ناقد نے اس سے کچھ زیادہ کہا ہے۔ موجودہ دور کے ان مسلم لیگی کہلانے والوں کی غیرت کو کیا ہوا۔ جو اس پاکستان کو ناپاکستان کہنے والی اسی پاکستان میں آکر پناہ لینے والی جماعت کا ساتھ دیکر اسکی مضبوطی اور مقبولیت، سچ کہا جائے تو تحفظ و استحکام کا سبب بنے ہوئے ہیں۔ کیا مسلم لیگ ایسی ناکارہ قیادت اور حمیت سے خالی سیادت سے قائداعظمؒ کی مسلم لیگ بنائی جاسکے گی؟ (مرتب)

مذہب اخلاق سے عاری

جناب مولانا کوثر نیازی "مودودیت عوامی عدالت میں" کے صفحہ ۷۰-۷۱-۷۲ پر تحریر کرتے ہیں۔

" یہ تحریک (تحریکِ پاکستان) ایک قومی تحریک تھی جس میں وہ سب لوگ شریک ہوئے

جو نام و نسب کے اعتبار سے مسلم قوم کے افراد تھے۔ یہ سوال اس میں سرے سے بے محل تھا کہ جو اس میں شریک ہوتا ہے وہ خدا و رسول آخرت، وحی، کتاب اور دین و شریعت کو مانتا ہے یا نہیں اور فجور و تقویٰ، دینداری اور بے دینی کی مختلف صفات میں کس صفت کے ساتھ متصف ہے۔ اصل مسئلہ قوم کو بچانے کا تھا۔ اور اس کے لیے قوم کے تمام عناصر کا متحدہ محاذ بنانا ضروری تھا پھر جو کام پیش نظر تھا وہ بھی فتویٰ اور امامت کا نہ تھا کہ دین و اعتقاد اور حرام و حلال کی تمیز کا قائل ہونے کی تجسس کی ضرورت پیش آتی۔

اور آخر میں تان اسی پرانے غم اور غصّے پر آکر ٹوٹی کہ ہمارے ہوتے ہوئے قائد اعظم کو کیوں لیڈر بنا لیا گیا۔

فرمایا:۔

"مقصود صرف قومی مدافعت تھی اور اس کے لیے تحریک کی شرکت تو درکنار اس کی قیادت و راہنمائی کے معاملے میں بھی یہ دیکھنے کی حاجت نہ تھی کہ جن لوگوں کو ہم آگے لا رہے ہیں ان کا اسلام سے کیسا اور کتنا تعلق ہے؟"

صرف اتنا کہ انہوں نے "بولہبی اور مصطفویؐ" میں خطِّ امتیاز کھینچ دیا اور گاندھی کو بتا دیا کہ ہم کلمہ طیّبہ کے اشتراک سے ایک ملّت رہیں اور جناب مفسّر قرآن مولانا مودودی صاحب کا مصلحتی اسلام "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم لکھنے کے بعد "ضرورتِ شعری" کی طرح "حکمت عملی" اور مصلحتی اسلام کے مطابق گاندھی کو بلاتا ہے اور ہندو مت کا یہ نمائندہ ان کی پاکستان دشمنی تحریکِ قیام پاکستان) کی مخالفت کی وجہ سے ان کی سرگرمیوں کی اشیر باد دیتا ہے مولانا ٹھیک ہے۔ متحدہ محاذ تو کمیونسٹوں نیشنلسٹوں کے ساتھ مل کر بنانا چاہیئے تاکہ اسلامی نظام قائم ہو سکے۔ (چودھری حبیب احمد)

اسی اشاعت میں مودودی صاحب نے مسلم لیگ اور قائد اعظم پر یہ الزام بھی عائد کیا کہ اس نے اپنے قومی مقاصد کے لئے اسلام کے مقدس نام کا استحصال کیا۔ مگر آج ایک دنیا جانتی ہے کہ مودودی صاحب اپنے "ذاتی مقاصد" کے لیے بھی اسلام کو کھلونا بنانے سے نہیں چوکتے۔) اس سلسلے میں انہوں نے مسلم لیگ اور اسلام کا تعلق

واضح کرنے کے لیے جو تشبیہات اور استعارے استعمال کیے اُن سے نہ صرف یہ کہ مسلم لیگ کو ایمان سے بھی خالی قرار دیا گیا، بلکہ خود اسلام کے لیے بھی ایسا پیرایہ اختیار کیا گیا جو ایک مفکرِ اسلام تو کجا، ایک سیاہ کار مسلمان کو بھی زیب نہیں دیتا۔

صفحہ ۱۳۲ پر آپ نے لکھا۔

"یوں اس تحریک سے وہ خدمت لی گئی جو بگڑے ہوئے نوابزادے اپنے خاندان کے کسی پرانے جانثار ملازم سے لیا کرتے ہیں مشورہ اور نصیحت اس کا کام نہیں ہوتا۔ یہاں لوگ اپنی مرضی سے جو چاہیں کریں، مگر آڑے وقت میں بوڑھے خادم کو پکارا جاتا ہے کہ آ، حقِ نمک ادا کر۔ پھر اگر وہ غریب اِن حرکات پر صبر نہیں کر سکتا جن کی وجہ سے بُرے وقت آتے ہیں اور بے چین ہو کر کبھی کہہ بیٹھتا ہے کہ صاحبزادے اپنے اطوار ٹھیک کر و تو اُسے ڈانٹ دیا جاتا ہے کہ "ایا نہ قدرِ خود بشناس" تو اپنے کام سے کام رکھ، تیری یہ حیثیت کب سے ہو گئی کہ ہمارے کام میں دخل دے۔"

اس پر بھی جی نہیں بھرا تو مسلم لیگی کارکنوں کو منافق اور ملحد ہونے کا طعنہ دیا اس کی قیادت کو مذہب سے عاری قرار دیا اور بڑی ہوشیاری سے حضرت قائداعظمؒ کے ایمان واخلاق پر بھی ہاتھ صاف کر گئے۔

فرمایا :-

"یہ تھیں وہ بنیادی باتیں جن پر ہماری یہ قومی تحریک اوّل دن سے اٹھی، اور آخر تک بڑھتی چلی گئی۔ اس کے اجزائے ترکیبی میں مومن اور منافق اور کھلے کھلے ملحد بھی شامل تھے۔ بلکہ دین میں جو جتنا ہلکا تھا وہ اتنا ہی اوپر آیا۔ اس میں اخلاق کی سرے سے کوئی پوچھ نہ تھی۔" (ص ۱۳۲)

لہ اس سے پہلے ۱۹۴۸ء جون کے ترجمان القرآن میں قیام پاکستان کی جدوجہد پر تبصرہ کرتے ہوئے حضرت مولانا نے فرمایا تھا "یہ بحث ان سب لوگوں کا منہ کالا کر دینے والی ہے جنہوں نے پچھلی ربع صدی میں ہماری سیاسی تحریکوں کی قیادت فرمائی۔

"مودودیت عوامی عدالت میں" کے صفحہ ۷۷، ۸۷ پر جناب کوثر نیازی رقمطراز ہیں۔

مودودی صاحب کی ان نگارشاتِ عالیہ پر غور کیا جائے تو ہر شخص بلا تامل اسی نتیجہ پر پہنچے گا کہ انہوں نے قیام پاکستان سے پہلے اور بعد غریب مسلمان قوم کا یہ جرم کبھی معاف نہیں کیا کہ اس نے ان کے سوا ایک اور شخص کو اپنا قائد اعظم کیوں بنا لیا۔ اس جرم کی پاداش میں انہوں نے قوم کی بھی توہین کی اور قائد اعظم کی بھی۔

پاکستان کی جنگ لڑی جا رہی تھی تو انہیں یہ دکھ لاحق تھا کہ انہوں نے آزادی کے جو تین خاکے پیش کئے، یا اڑائے تھے (مولانا کا اشارہ خیری برادرز کی جماعت اسلامی کی طرف ہے یہ جماعت پہلے انہوں نے تشکیل کی تھی (مرتب) انہیں پس پشت ڈال کر اقبال اور جناح کی تجویز کیوں تسلیم کر لی گئی۔ ان ایسے عالم فاضل کے ہوتے ہوئے اسلام سے ایک بالکل ناواقف آدمی کو قیادتِ عظمیٰ کا منصب کیوں پیش کر دیا گیا ہے۔ اور جب پاکستان بن گیا تو اپنی تمام تر مخالفتوں کے باوجود انہوں نے ایک مرتبہ پھر یہ کہکر قیادتِ عظمیٰ کی ذمہ داریوں کے لیے اپنے دوشِ ناتواں آگے کر دیے۔

شاید مجھے نکال کے پچھتا رہے ہوں آپ
محفل میں اس خیال سے پھر آ گیا ہوں میں

ستمبر ۱۹۴۸ء میں قائد اعظمؒ اللہ کو پیارے ہوئے تو یہ منصب آپ سے آپ خالی ہو گیا۔ اب حضرت مولانا کے ارمان پورے ہونے کے دن تھے۔ مگر افسوس! کہ قوم نے اب بھی آپ کی قدر نہ جانی۔ قائد ماننا تو ایک طرف الٹا آپ کو جیل میں ڈال دیا گیا۔ اور لیاقت علی خاں مرحوم اور اس کے بعد خواجہ ناظم الدین قوم کی راہنمائی کے

ف آج جماعت اسلامی شہید قائد ملت کے غم میں گھلی جا رہی ہے سوشلسٹوں پر ان کے قتل کا الزام دھرتی ہے۔ لیکن جب قائد ملت زندہ تھے تو ان کی سیادت سے لیکر

اہل قرار پائے۔ اس پر جماعتوں کی توپوں کا رُخ قائد اعظم کے ساتھ ساتھ ان بزرگوں کی طرف بھی ہو گیا۔ اور قوم کے ان مخلص راہنماؤں کی شان میں وہ گستاخیاں کی گئیں کہ شرافت سر پیٹ کر رہ گئی۔

ترجمان القرآن جون جولائی ۱۹۴۹ء

پھر یہ عین وہی لوگ ہیں جو اپنی پوری سیاسی تحریک میں اپنی غلط سے غلط سرگرمیوں میں اسلام کو ساتھ ساتھ گھسیٹتے پھرے ہیں۔ انہوں نے قرآن کی آیتوں اور حدیث کی روایتوں کو اپنی قوم پرستانہ کشمکش کے ہر مرحلے میں استعمال کیا ہے۔ انہوں نے پاکستان کے معنی ہمیشہ لا الٰہ الا اللہ بیان کئے ہیں لیکن افسوس! کہ ان کی محبت اسلام کے، ان کی خدا پرستی کے، ان کی حبِ رسالت کے، ان کی قرآن دوستی کے اور ان کی لا الٰہ خوانی کے جو عملی مناظر پاکستان ۲۳ ماہ کی تاریخ کے عجائب خانہ میں آراستہ ہیں، ان کو دیکھ کر ہر مسلمان کی گردن شرم سے جھکی جاتی ہے کسی ملک اور قوم کی انتہائی بدقسمتی یہی ہو سکتی ہے کہ نااہل اور اخلاق باختہ قیادت اس کے اقتدار پر قابض ہو جائے۔ ایک سفینۂ حیات کو غرق کرنے کے لیے طوفان کی موجیں وہ کام نہیں کر سکتیں جو اس کے خیانت کار ملاح کر سکتے ہیں کسی

ان کی بیگم کے غرارے تک ہر بات پر کیچڑ اچھالا جا رہا تھا۔ وہ امریکے کے دورہ سے واپس آئے تو مودودی صاحب نے ان کے اخراجات کا شرعی افسانہ تراشا، تو انہوں نے کراچی کے جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا۔

"یہاں ایک مولانا تشریف لاتے۔ انہوں نے کہا کہ میں نے اپنے دورۂ امریکہ پر پچیس لاکھ روپیہ خرچ صرف کیا۔ اس الزام میں ۵ فیصدی بھی صداقت نہیں۔ ہم علماء کا احترام کرتے ہیں لیکن اگر علماء ہی جھوٹ پر اتر آئیں تو پھر ملت کا خدا حافظ"

(امروز ۱۷۔ اگست ۱۹۵۰ء)

قلعہ کی دیواروں کو دشمن کے گولے آسانی سے نہیں چھید سکتے جس آسانی سے اس کے فرض ناشناس سنتری اس کی تباہی کا سامان کر سکتے ہیں۔

(مودودیت عوامی عدالت میں صہ۷۹-۸۰)

مظلوم مسلمانوں سے اظہارِ بریت

کے عنوان سے مولانا کوثر نیازی (مودودیت عوامی عدالت میں) کے صفحہ ۱۴۱ پر تحریر فرماتے ہیں "تحریکِ پاکستان منزلِ مقصود پر پہنچنے والی تھی کہ مظلوم اور نہتے مسلمانوں پر ہندوؤں نے منظم حملے شروع کر دیے۔ یہ ایسا موڑ تھا کہ آزادی کے لیے ہندوؤں کے دوش بدوش چلنے والے کارکن بھی خون کے آنسو رو اُٹھے۔ غیرت و حمیت کے تقاضوں پر انہوں نے لبیک کہی اور مظلوم مسلمانوں کو بچانے کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا مگر مودودی صاحب اس موقعہ پر بھی مسلمانوں کا ساتھ دینے کے لیے تیار نہ تھے۔ وہ اسے اللہ رسول کا نہیں، نفس کا کام قرار دے رہے تھے۔ ۱۷-۱۸ اپریل ۱۹۴۷ء کو ٹونک کے مقام پر جماعت اسلامی کا اجتماع ہوا۔ اس موقع پر جماعت کے ایک رکن نے ہندوؤں کی سفاکی کا حوالہ دیتے ہوئے مودودی صاحب سے اپیل کی کہ وہ اس سلسلے میں مسلمانوں کا ساتھ دیں۔ اس نے یہ بھی اپیل کی اب جب کہ انگریز ملک سے رخصت ہوا چاہتا ہے جماعت اسلامی کو مسلم لیگ کا ساتھ دینا چاہیئے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو اندیشہ ہے کہ ہندو اکثریت ہمیشہ کے لیے مسلمانوں پر مسلط ہو جائے گی۔ مگر مودودی صاحب اس پر بھی ٹس سے مس نہ ہوئے یہ سوال و جواب ہم بلا تبصرہ درج کرتے ہیں:

سوال:- "یہ تسلیم ہے کہ مسلم لیگ کے پیشِ نظر جو پروگرام ہے وہ غیر اسلامی ہے لیکن ہو قت صورتِ حال یہ ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت دین سے ناواقف ہے۔ علماء نے انہیں اسلام سمجھانے کی کوشش نہیں کی۔ اپنے سیاسی لیڈروں کے بتلائے ہوئے راستے ہی کو صراطِ مستقیم اور اسلام کا صحیح راستہ سمجھ رہے ہیں اور غیر مسلم قومیں اُن کے وجود کو مٹانے کے لیے سفاکی اور خونریزی سے کام لے رہی ہیں۔ ان حالات میں اُن کی

مظلومی میں جماعت اُن کا ساتھ کیوں نہ دے۔ اور غیر مسلموں سے اس مدافعانہ جنگ میں شریک کیوں نہ ہو۔"

(ب) ۱۔ اسوقت برطانیہ ہندوستان کی حکومت ہندوستانیوں کے سپرد کر رہا ہے۔ اور اس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ ہندوؤں کا حصہ ہندوؤں کے حوالے کیا جائے۔ اور مسلمانوں کا حصہ مسلمانوں کے حوالے کیا جائے۔ اور دوسرے کہ ملک کی باگ ڈور اکثریت یعنی ہندوؤں کے حوالے کر دی جائے۔ ظاہر ہے کہ اگر آپ نے مسلم لیگ کا ساتھ نہ دیا تو غیر مسلم اکثریت سارے ملک اور مسلمانوں پر مسلط ہو جائے گی۔

امیر جماعت فرماتے ہیں کہ "ان سوالوں کا واضح مطلب یہ ہے کہ موجودہ حالات میں مسلمانوں کی اس قومی تحریک کا ساتھ دیا جائے اور جب یہ حالات ختم ہو جائیں تو پھر ان کا ساتھ چھوڑ دیا جائے۔ اُسے سائل صاحب خود بھی تسلیم کرتے ہیں کہ یہ تحریک غیر اسلامی ہے۔ مگر میں ان کو یقین دلاتا ہوں کہ جس وقت کے حالات دیکھ کر وہ ہم سے یہ مطالبہ کر رہے ہیں۔ ایسے حالات کبھی ختم نہ ہوں گے مسائل پر مسائل پیدا ہوتے چلے جائیں گے اور ہر مسئلہ پہلے مسئلے سے شدید تر ہو گا۔ اور آپ کہیں بھی لکیر نہیں کھینچ سکیں گے کہ فلاں حد تک تو ہم ان قومی تحریکوں کا ساتھ دیں گے اور وہاں پہنچ کر ان کا ساتھ چھوڑ دیں گے۔ یہ تو ہے سوال کا ایک رُخ۔۔ دوسرا رُخ جو اس سے کہیں زیادہ قابل غور ہے وہ یہ ہے کہ جب آپ ایک تحریک کو خود غیر اسلامی مان رہے ہیں تو پھر کس منہ سے مسلمان سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ اس کا ساتھ دیا جائے۔ جن مسائل اور مصائب کا اس قدر رونا رویا جا رہا ہے۔ یہ مسائل اور مصائب سرے سے پیدا ہی نہ ہوتے۔ اگر مسلمان اسلام کے فی الواقع سچے نمائندے ہوتے اور اگر مسلمان اب بھی سچے مسلمان بن جائیں تو آج ہی سارے مسائل ختم ہو جاتے ہیں۔"

خصوصی توجہ کا مستحق :-

"یہ لوگ ہندوستان کے ایک ذرا سے کونے میں پاکستان بنانے کو اپنا انتہائی مقصد بنائے ہوئے ہیں۔ لیکن اگر یہ فی الواقع خلوص قلب سے اسلام کی نمائندگی کے

لیے کھڑے ہوجائیں تو سارا ہندوستان پاکستان بن سکتا ہے۔ اور اس میں ایک لادینی جمہوری حکومت یا عوامی پارلیمنٹری حکومت نہیں' بلکہ خالص خدا کی حکومت قائم ہوسکتی ہے۔

اسلام کی لڑائی اور قومی لڑائی ایک ساتھ نہیں لڑی جاسکتی۔ اگر تمام لوگ اسلام اور اسلامی طریق کار اپنی خواہشاتِ نفس کے خلاف پاکر ان کو ترک کردینا چاہتے ہیں تو ہیر پھیر کے راستوں سے آنے کے بجائے صاف صاف کیوں نہیں کہتے کہ اللہ اور رسولؐ کے کام چھوڑیئے اور ہمارے نفس کے کام میں حصہ لیجیئے۔"

(بحوالہ صد ۶۴-۶۵ روئداد جماعت اسلامی حصّہ پنجم)
(شائع کردہ مکتبہ جماعت اسلامی ذیلدار پارک)
(اچھرہ لاہور)

فی الواقع مودودی صاحب

اگر یہ "فی الواقع" (مودودی صاحب) خلوصِ قلب سے اسلام کی نمائندگی کے لئے کھڑے ہوئے تھے۔ اور "فی الواقع" یہ سارے ہندوستان کو پاکستان بنانا چاہتے تھے۔ اور فی الواقع ان کا مقصود یہی تھا تو یہ دارالاسلام پٹھانکوٹ سے" ذرا سے کونے والے پاکستان میں کیوں بھاگ آئے؟ اس سے صاف ظاہر ہے کہ "فی الواقع" مودودی کا اسلام ہوسِ اقتدار کا زینہ ہے اور یہ فی الواقع یعنی مودودی صاحب اپنی کہنی میں مخلص نہ تھے۔ (مرتب)

مدراس میں جماعت اسلامی کا اجتماع

اپریل ۱۹۴۷ء میں مدراس میں جماعت اسلامی کا ایک اجتماع ہوا۔ اس اقلیتی علاقہ کے مسلمانوں کو پتہ تھا کہ ہمارا علاقہ پاکستان میں شامل نہیں ہوگا۔ لیکن اس کے باوجود ملت کے ان غمگساروں' اسلام کے جانثاروں اور مسلم لیگ کے جاں سپاروں نے جن مومنانہ جذبوں، ولولوں اور جن کوہ شکن، آسماں پاش

ارادوں سے تحریک پاکستان کو کامیاب بنانے کے لیے شب و روز خلوص و ہمت سے کام کیا، ان کا یہ ناقابلِ فراموش، قابلِ رشک کارنامہ ہے اور صفحاتِ تاریخ تحریکِ پاکستان میں آبِ زریں سے لکھے جانے کے قابل ۔

جناب مودودی نے ان مردانِ وفا کے زخموں پر خوب نمک پاشی کی، اور یہانتک طعنہ دیا کہ تمہاری قومی تحریک (مسلم لیگ) تمہیں بیابانِ مرگ میں چھوڑ گئی۔ قیام پاکستان کی جدوجہد کو دوہری حماقت قرار دیا۔

مودودی کے اصل الفاظ کے آئینے میں

" سب سے پہلے مسلمانوں کے معاملے کو لیجیے۔ ہندو اکثریت کے علاقہ میں مسلمان عنصر یہ محسوس کریں گے کہ جس قوم پرستی پر انہوں نے اپنے اجتماعی رویّے کی بنیاد رکھی تھی وہ انہیں بیابانِ مرگ میں لاکر چھوڑ گئی ہے اور ان کی قومی جنگ جسے وہ بڑے جوش وخروش سے بغیر سوچے سمجھے لڑ رہے تھے، ایک ایسے نتیجے پر ختم ہوئی ہے جو ان کے لیے تباہی کے سوا اپنے اندر کچھ نہیں رکھتی۔ جن جمہوری اصولوں پر ایک مدت سے ہندوستان کا سیاسی ارتکاب ہو رہا تھا اور جنہیں خود مسلمانوں نے بھی قومی حیثیت سے تسلیم کرکے اپنے مطالبات کی فہرست مرتب کی تھی انہیں دیکھ کر بیک نظر معلوم کیا جاسکتا تھا، کہ ان اصولوں پر بنتے ہوئے نظامِ حکومت میں جو کچھ ملتا ہے" اکثریت کو ملتا ہے" اقلیت کو اگر ملتا ہے تو خیرات کے طور پر، نہ کہ حق کے طور پر۔ یہ ایک ظاہر و باہر حقیقت تھی۔ مگر مسلمانوں نے اس کی طرف سے جانتے بوجھتے آنکھیں بند کرلیں اور اس دوہری حماقت کا ارتکاب کیا . . . .
. . . کئی سال کی تلخ اور خونریز کشمکش کے بعد اب یہ مرکب حماقت" کامیابی[1] کے مرحلے میں پہنچ گئی ہے۔"

(روئداد جماعت اسلامی حصہ پنجم صفحہ ۱۱۴، ۱۱۵)

اس زمانے میں ہندو مسلمان پر جو ظلم وستم ڈھا رہا تھا، مودودی صاحب اور

---

[1] واضح رہے کہ" کامیابی" کے اردگرد کامے خود مودودی صاحب نے لگائے ہیں گویا موصوف ابھی تک قیام پاکستان کے اس عظیم کارنامے کو کامیابی ماننے سے انکاری تھے (مرتب)

اور ان کی جماعت نے اسکا ذمہ دار مسلم لیگ کو ٹھہرایا۔ ہندو پورے تر بے گنا
اس پر کوئی تنقید نہ کی۔ ٹونک کے اجتماع میں قیم جماعت اسلامی میاں طفیل محمد
نے جماعتی کام کی رپورٹ پیش کی۔ انہیں بتایا،

ان گئے گزرے حالات میں بھی جب کبھی ہمیں غیر مسلموں تک اللہ کا پیغام اس
کے رسول کے بتائے ہوئے طریقے پر پہنچانے کا موقع ملا۔ تو ہم نے دیکھا کہ ان کی
آنکھیں حیرت و استعجاب سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور منہ کھلے کے کھلے رہ گئے اور
مسلمان قوم کے سخت سے سخت دشمن نے بے قرار ہو کر کہا کہ صاحب اگر ہمیں یقین
ہو جائے کہ فی الواقع اسلام یہی ہے اور آپ لوگ واقعی اس کے پابند رہیں گے تو ہم
دل و جان سے آپ کے ساتھ ہیں اور آپ کے پیچھے چلنے میں سعادت سمجھیں گے لیکن
بُرا ہو قوم پرستی کا اور غیر اسلامی تحریکوں کے مسلمان علمبرداروں کا کہ انہوں نے خدا
کے بندوں کے لیے خدا کے دین کا دروازہ بند کر دیا۔"

(روئداد جماعت اسلامی حصہ پنجم ص۲۷)

کیوں نہ ہو، یہ زمانہ مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم کا ہے اور ان
دنوں آپ کا سارا زور بیان اور سحر قلم، تحریک قیام پاکستان کے خلاف صرف
ہو رہا تھا۔ میاں صاحب! صرف آپ ہی نہیں، ذہین و فہیم ہندو برہمن نے ہر
اس مسلمان کی بات کو سراہا ہے جس نے مسلم لیگ اور پاکستان کی مخالفت میں
کی اور جناب قائد اعظمؒ کے خلاف توہین آمیز جملے کسے۔ اس انداز کا تو ان دنوں
آپ کا شباب تھا۔

یہ تو بُرا ہو جناحؒ کا کہ انہوں نے فکر اقبالؒ کی روشنی میں قرآن حکیم کے مطابق
مسلمانوں کو سمجھا دیا کہ ع خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمیؐ
اور ان کے سمجھاتے ہوئے تربیت دادہ مسلمان نہ آپ کے نہ زیرک برہمن
کے پھندے میں پھنسے۔ کس کس کا ذکر کریں ہندو نے ایسے تمام عاقبت نااندیش
کی تعریف کی، ان کے جلسوں کی رونقیں بڑھائیں جو قیام پاکستان کے خلاف
لکھتے اور بولتے تھے۔ یہ صاف اور کھلی ہوئی بات ہے کہ مودودی صاحب

طفیل میاں طفیل ایسی باتیں کرتے ہیں۔ یہ اُن کی تربیت کا اثر ہے کہ میاں صاحب بڑے سے بڑا تاریخی جھوٹ بولتے ہوئے بھی نہیں شرماتے اور اپنی اس حق گوئی پر ناز بھی کرتے ہیں اور اتراتے بھی ہیں۔ (چوہدری حبیب احمد)

تین موقف

کے عنوان سے مولانا نیازی "مودودیت عوامی عدالت میں" کے صفحہ ۱۰۸ سے آغاز کرتے ہیں۔

یوں رقمطراز ہیں "قیام پاکستان کی جدوجہد میں مودودی صاحب اور اُن کی جماعت نے جو روڑے اٹکائے ہیں ان کی نشاندہی اور ان مغالطوں کی حقیقت کھول دینے کے بعد جنہیں یہ حضرات اپنی پاکستان دوستی کے لئے پیش کرتے ہیں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آخر میں تحریک پاکستان کے سلسلے میں جماعت کے دعاوی کی ترتیب بھی قارئین کے سامنے بیان کر دی جائے

قیام پاکستان سے پہلے ۱۹۴۷ء تک جماعت اسلامی کھلم کھلا یہ تسلیم کرتی تھی کہ اُس نے پاکستان کی مخالفت کی ہے۔ اس کی تحریک کو غیر اسلامی کہا ہے۔ چونکہ ٹونک کے اجتماع میں جس کا ذکر پیچھے گزر چکا ہے) میاں طفیل محمد صاحب نے اپنی رپورٹ میں بتایا کہ جماعت کے افکار سے مسلمانوں کے قومی لیڈروں کے اعمال و کردار میں تو تبدیلی نہیں ہوئی لیکن یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ جہاں وہ ایک طرف جماعت اسلامی کو برا بھلا کہتے ہیں کہ وہ ان کے قومی مقاصد کا ساتھ نہیں دیتی اور ان کو غلط اور غیر اسلامی کہتی ہے، دوسری طرف ان کی قومی جدوجہد کے قائدین تک کی زبان سے اب یہ کلمات بھی نکلنے لگے ہیں کہ فی الواقع اسلام میں کسی شخص کو حاکمیت کا حق حاصل نہیں۔ (روداد حصہ پنجم ص۳۲)

پاکستان بننے کے بعد بھی شروع شروع میں جماعت کا موقف یہی تھا کہ تقسیم سے قبل اس نے جو پالیسی اختیار کئے رکھی ہے پوری قوم اس وجہ سے نارض ہے۔

اگست ۱۹۴۸ء ترجمان القرآن میں:

مودودی صاحب نے لکھا:۔ "دوسری طرف جماعت (اسلامی) چونکہ خود مسلمانوں کی قومی تحریک سے بھی اسی طرح کنارہ کش تھی جس طرح کانگرس وطن

پرستی کی تحریک سے الگ رہی تھی۔ اِس لیے بجز ایک قلیل گروہ کے جو اسلام کے اصولوں کو فی الواقع سمجھتا اور اس کا سچا قدردان تھا، قوم کی قوم جماعت سے شاکی اور ناخوش تھی۔ اس لیے جماعت کے لیے یہ سخت مشکلات اور شدید آزمائش کا وقت تھا۔"[۶۱]

آگے چل کر جماعت نے اِس موقف میں یہ تبدیلی کر لی کہ وہ اس کا تو اعتراف کرنے لگی کہ تحریک پاکستان میں اس کا کوئی حصّہ نہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہا جاتا رہا کہ ہم اس تحریک سے غیر متعلق رہے تھے نہ اس کے حامی تھے، نہ اس کے مخالف۔

ترجمان القرآن نومبر ۱۹۶۳ء میں لکھا گیا۔

"ہم اس بات کا کھلے بندوں اعتراف کرتے ہیں کہ تقسیم ملک کی جنگ سے ہم غیر متعلق رہے ہیں۔ اس کارکردگی کا سہرا صرف مسلم لیگ کے سر باندھتے ہیں اور اس میدان میں کسی حصّے کا اپنے آپ کو دعویدار نہیں سمجھتے (صفحہ ۴۹)

اور اب آخری موقف یہ ہے کہ جماعت نے یک لخت تحریک پاکستان اور نظریۂ پاکستان کا سہرا اپنے سر باندھنا شروع کر دیا ہے۔ میاں طفیل نے دعویٰ کیا ہے کہ اس باب میں جو خدمات مودودی صاحب نے انجام دی ہیں وہ دوسرے تمام راہنماؤں کی خدمات پر بھاری ہیں۔ قائداعظم اور مودودی صاحب کے تعلقات کا چرچا کیا جا رہا ہے اور خیر سے خود مودودی صاحب نے بھی بنفس نفیس یہ چیلنج کر دیا ہے کہ کسی میں ہمت ہے تو ثابت کرے کہ میں نے کبھی بھی تحریک پاکستان کی مخالفت کی ہے۔

ہائی کورٹ کا فیصلہ

جماعت اور مودودی صاحب کی دیدہ دلیری اور سینہ زوری کو بے نقاب کرنے کے دو ہی راستے ہیں۔ ایک یہ کہ اس کے لیے باقاعدہ قانونی عدالت سے رجوع کیا جائے اور دوسرا یہ کہ کیس عوامی عدالت میں پیش کر دیا جائے۔

جماعت کا معمول یہ ہے کہ جب بھی اس کے بارے میں غیر ملکی امداد یا اس طرح کی کوئی دوسری بات کی جاتی ہے تو اس کے ہمنوا اخبارات و جرائد چیخنے لگتے ہیں کہ اس الزام کو عدالت میں ثابت کرو۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ جماعت کی اس خواہش کے مطابق جماعت کی پاکستان دشمنی کے بارے میں ہمارے پاس مغربی پاکستان ہائیکورٹ

کا ایک فیصلہ موجود ہے۔ عدالت عالیہ نے یہ فیصلہ اپریل ۱۹۵۴ء میں سنایا تھا اور اسے اب سولہ سترہ سال ہونے کو ہیں۔ مگر جماعت نے ابھی تک اِن ریمارکس کے خلاف سپریم کورٹ میں کوئی اپیل دائر کرنے کی جرأت نہیں کی۔ عدالتِ عالیہ کا یہ بنچ چیف جسٹس مسٹر محمد منیر اور مسٹر جسٹس ایم آر کیانی پر مشتمل تھا۔ فاضل ججوں نے اپنے فیصلہ میں لکھا۔

"جماعت نے مسلم لیگ کے تصورِ پاکستان کی علی الاعلان مخالفت کی۔ اور جب سے پاکستان قائم ہوا۔ جس کو "ناپاکستان" لکھ کر یاد کیا جاتا ہے۔ یہ جماعت موجودہ نظامِ حکومت اور اس کے چلانے والوں کی مخالفت کر رہی ہے ہمارے سامنے جماعت کی جو تحریریں پیش کی گئی ہیں ان میں سے ایک بھی نہیں جس میں پاکستان کی حمایت کا بعید سا اشارہ بھی موجود ہو۔ اس کے برعکس یہ تحریریں جن میں کئی ممکن مفروضے بھی ہیں۔ تمام کی تمام اس شکل کی مخالف ہیں جس میں پاکستان وجود میں آیا اور جس میں اتبک موجود ہے"

(رپورٹ تحقیقاتی عدالت صفحہ ۲۶۱)

خفی اور جلی مصلحتوں کے تحت

آگے چلکر مولانا کوثر لکھتے ہیں "بعض اخبارات اپنی خفی و جلی مصلحتوں کے تحت اس پروپیگنڈا کے نا قوس خصوصی بن چکے ہیں۔ اس کے سوا چارہ نہیں کہ یہ کیس خود عوام کی عدالت میں پیش کر دیا جائے۔"

بڑے سے بڑا جھوٹ بولنے سے نہیں شرماتے

مولانا کوثر نیازی لکھتے ہیں:۔ "میں آخر میں اپنے اہلِ وطن سے یہ عرض کرنا ہے کہ گزشتہ صفحات میں مودودی صاحب کا جو رول بیان کیا گیا ہے وہ اس کا غور سے مطالعہ کریں جب تحریک پاکستان جاری تھی تو مودودی صاحب پاک و ہند کنفیڈریشن کا نظریہ لے کر مطلع سیاست پر نمودار ہوئے تھے کانگریس اور مسلم لیگ کی کشمکش میں یہ تجویز برطانوی سامراج کے عین مطابق تھی۔ آج جبکہ استحکام پاکستان کی جنگ لڑی جا رہی ہے۔ "تحریک آزادی ہند اور مسلمان" نامی ایک کتاب کے ذریعہ سے مودودی صاحب کی اس تجویز کو پھر پھیلایا جا رہا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ

آج پھر ایک سامراجی طاقت اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانا چاہتی ہے۔ کل بھی مودودی صاحب ایک سامراج کی خدمت کر رہے تھے اور آج بھی ایک سامراج کی خدمت کر رہے ہیں۔ اس مقصد کے لیے انہیں بے پناہ وسائل فراہم کئے گئے ہیں۔ تشدد ان کے فلسفے کا سنگِ بنیاد ہے اور جھوٹ ان کے مقاصد کی نشر و اشاعت کا ایک ذریعہ ہے معاشی اصلاحات اور اسلام کے عدلِ عمرانی کے نفاذ کا مطالبہ کیا جائے تو کہا جاتا ہے کہ اس سے اسلام خطرے میں ہے۔ اب یہ فیصلہ کرنا پاکستانی قوم کا کام ہے کہ اسلام کے لیئے اپنا حق مانگنے والے گنہگار مسلمان ہیں، یا "مودودیت" نامی ایک "سیاسی مذہب" کے نام لیوا، وہ نام نہاد صالحین جو اسلام کے نام پر اتنے بڑے بڑے جھوٹ بولنے سے بھی نہیں شرماتے۔"

(مودودیت عوامی عدالت میں ص ۱۱۱ و ۱۱۲)

حرفِ آغاز کتاب "مودودیت عوامی عدالت میں"

مولانا کوثر نیازی لکھتے ہیں:- "اپنے زمانۂ طالب علمی سے میں تحریکِ پاکستان کا ایک ادنیٰ کارکن تھا۔ ۱۹۴۶ء میں الیکشن ہوئے تو اپنے سکول کے دوستوں کے ساتھ میں نے بھی پاکستان کا مطلب کیا۔ لا الٰہ الا اللہ کے روح پرور نعرے لگائے پاکستان بن گیا تو قائدِ اعظم کی زندگی تک میں مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن ہی سے وابستہ تھا۔ مگر قائدِ اعظم کی وفات کے بعد حالات کی خرابی نے بددل کر دیا۔ اس زمانے میں جماعت اسلامی، اسلامی دستور وغیرہ کے دلِ خوش کن نعرے لیکر میدانِ سیاست میں اتری تھی شعور ابھی ناپختگی کی منزل میں تھا۔ کہ جماعت کا ماضی کیا ہے۔ نہ اس وقت کا یہ موضوعِ بحث تھا، کہ اس سے کماحقہٗ واقفیت حاصل ہوتی۔ بعد کے مراحل میں معلومات حاصل ہوئیں ....

.... مگر: پچھلے کچھ دنوں سے میاں طفیل محمد اور مولانا مودودی صاحب نے جس جسارت سے تحریک پاکستان کو مسخ کرنے کی کوشش کی ہے اور جس طرح اپنی نام نہاد خدمات کا چرچا کیا ہے اس کے بعد اس مسئلہ پر وانفانِ حال کا سکوت ایک قومی جرم سے کم نہیں ....

مجھے امید ہے کہ پاکستانی قوم اس تحریر کے بعد اسلام کے نام پر اتنا بڑا جھوٹ بولنے والے

دنیا کو ان کے صحیح خد و خال کے ساتھ اچھی طرح پہچان لے گی۔

(کوثر نیازی لاہور ۹ فروری ۷۱ء)

میں نے جماعتِ اسلامی کیوں چھوڑی؟

اب کوثر نیازی صاحب کی دوسری کتاب "میں نے جماعت اسلامی کیوں چھوڑی" کے چیدہ چیدہ اقتباسات دیئے جا رہے ہیں ملاحظہ فرمایئے

سخن ہائے گفتنی

مودودی صاحب خدمتِ دین کے دلکش نعروں کے ساتھ منظرِ عام پر آئے، تو کیا کیا بلند ہستیاں ان کے گرد جمع نہیں ہو گئیں ان میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا منظور نعمانی اور مولینا امین احسن اصلاحی جیسے لوگ بھی شامل تھے جن کے حوالے سے ایک مرتبہ مودودی صاحب نے مولانا عبدالماجد دریابادی کی تنقید کا جواب دیتے ہوئے لکھا تھا "اگر مجھ میں زیغ ہوتا اور میں فتنہ کی طرف جانیوالا ہوتا تو ایسے ایسے اللہ کے بندے میرے ساتھ کیوں ہوتے" مگر اللہ کی شان، کہ یہ سب لوگ ایک ایک کر کے مودودی صاحب کا ساتھ چھوڑ گئے ورنہ صرف یہی تین ارکان علیحدہ ہوتے بلکہ جماعت کو چھوڑنے والوں کی فہرست پر نگاہ ڈالی جائے تو اس میں مولانا جعفر شاہ ندوی (یکے از بانیانِ جماعت) مولانا عبدالغفار حسن (سابق امیر جماعت اسلامی پاکستان، مولانا عبدالجبار غازی (سابق امیر جماعت اسلامی پاکستان، مولانا عبدالرحیم اشرف (سابق امیر حلقہ لائلپور) سردار محمد اجمل خاں لغاری (رکن مرکزی شوریٰ) مولانا عبدالحق جامعی (سابق امیر حلقہ بہاولپور) جناب سعید ملک (سابق امیر صوبہ پنجاب، راؤ خورشید علی خاں (ایم پی اے) ارشاد احمد حقانی (ایڈیٹر تسنیم) اور محمد عاصم الحداد سابق ناظم دارالعروبہ، تک کے نام نظر آتے ہیں۔ یہ وہ راہنما ہیں جو مودودی صاحب کے بعد جماعت کا اصل سرمایہ اور اثاثہ سمجھے جاتے تھے۔ کاش! مودودی صاحب کے اندھے مقلدوں کو سوچنے کی توفیق نصیب ہوتی کہ کیا ان سب قائدین کے دماغ خراب ہو گئے تھے؟ کیا یہ سب بک گئے تھے؟ کیا یہ سب بددیانت تھے؟ کیا یہ سب دین سے ناواقف تھے؟ اگر ان سب کی دیانت مشکوک تھی، ان سب کا علم ناقابل اعتماد تھا جو اپنے

اپنے وقت میں جماعت کے ستون تھے، تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ عوام جماعت کے باقی ماندہ تنخواہ دار کارکنوں کے علم و دیانت پر بھی کیوں بھروسہ کریں۔"

(میں نے جماعت اسلامی کیوں چھوڑی؟ صہ ۳۳ و ۳۴)

مولانا صاحب! ہوں گے تو یہ سب کے سب معاملہ فہم۔ واقفِ دین اور دیانتدار بھی۔ کاش اپنی طرح آپ ان کے متعلق بھی لکھتے کہ ان میں سے کتنے ہیں جنہوں نے تحریکِ قیامِ پاکستان میں حصہ لیا تھا۔ اور تحریکِ قیامِ پاکستان میں ان کی کتنے عرصے کی خدمت رہی ہے؟ اور یہ بات بھی واضح نہیں کہ ان میں سے بھی کتنے تنخواہ دار تھے۔ امید ہے کہ مولانا اگلے ایڈیشن میں یہ معلومات قارئین کو فراہم کریں گے۔ ایک مولانا کے متعلق جو قلم و زبان دونوں میں مہارت رکھتے ہیں ہم بھی جانتے ہیں کہ وہ پاکستان کی مخالف جماعت کے رکن تھے۔ (چودھری حبیب احمد)

مودودی صاحب کے علمی و عملی تضادات

دوسرا اقتباس :- "میں جماعت سے فروری ۱۹۶۵ء میں علیحدہ ہوا۔ میں اس وقت جماعتِ اسلامی حلقہ لاہور کا امیر تھا۔۔۔ جب تک میں دینی علم حاصل نہ کر سکا، عربی زبان نہیں جانتا تھا، مودودی صاحب کے لٹریچر کا سحر مجھ پر قائم رہا۔ مگر جب میں براہ راست کتاب و سنت کے سرچشمۂ فیض سے سیراب ہونے لگا اور میں نے علماء و مفسرین اور ائمہ و فقہا کی علمی و فکری کاوشوں کو سامنے رکھ کر مودودی صاحب کے لٹریچر کا تقابلی مطالعہ کیا تو مجھ پر مودودی صاحب کے علمی و عملی تضادات آشکار ہونے لگے۔ ان کے علمی تضادات تو معمولی اردو جاننے والوں پر بھی آشکار ہو جاتے ہیں بشرطیکہ نیت نیک ہو۔ رہے عملی تضادات تو ہمارے ناقص خیال اور اس کی محدود پرواز کے مطابق یہ تو خلوتوں جلوتوں میں آپ پر ہمہ وقت آشکار ہوتے رہتے ہوں گے۔ یہ تو مروّت و محبت اور عقیدت و پیار تھا جس نے آپ کو کبھی اس کا احساس نہ ہونے دیا ہو۔ ورنہ یہ بات کہنے کی نہیں اور مجھے اندازہ ہوا کہ یہ تو ایک جداگانہ مذہب ہے۔ یہ بات جماعت کے بہت

دوسرے لوگ بھی محسوس کرتے تھے۔ (اور مجھے ذاتی طور پر معلوم ہے کہ آج بھی محسوس کرتے ہیں) مگر اس جماعت میں شامل ہونے کے بعد اسے چھوڑنا کوئی آسان کام نہیں رشتے ناطے، کاروبار، تنخواہیں اور سہی بنیادی پر دوستیاں، دشمنیاں، کتنی ہی تانیں ہیں جو حسن بن صباح کی اس جنت سے نکلتے وقت زنجیر پا بن جاتی ہیں۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا خاص فضل و کرم تھا کہ اس نے مجھے یہ بیڑیاں کاٹنے کی توفیق عطا فرمائی" صـ۴

تیسرا اقتباس :- جماعت کو چھوڑے ہوئے مجھے پانچ سال ہو گئے۔ شہاب کے صفحات گواہ ہیں میں نے مودودی صاحب اور ان کی جماعت کے بارے میں اس وقت تک زبان نہیں کھولی جب تک "خلافت و ملوکیت" جیسی رسوائے زمانہ کتاب سامنے نہیں آگئی۔ جب میں نے دیکھا کہ مودودی صاحب کے قلم نما نیزے نے صحابہ کرام اور اہلبیت کے سینے چھلنی کر دیے ہیں تو میں نے طے کر لیا کہ اس نئی "خارجیت" کے بالمقابل سینہ سپر ہو جاؤں۔"

میرے بارے میں

چوتھا اقتباس " میرے بارے میں مودودی صاحب کی شہ پر ان کے تنخواہ دار کارکنوں نے ملک کے طول و عرض میں کیا کیا غلیظ پروپیگنڈہ نہیں کیا۔ مودودی صاحب کا جو خط اس کتابچے میں شامل ہے اس میں انہوں نے لکھا تھا "تم جو کچھ بولو گے میں اس پر صبر کروں گا"۔ لیکن ان کا یہ صبر، اس جاگیردار کا صبر ہے جو اپنے مخالفوں پر خود تو حملہ آور نہیں ہوتا لیکن اس کے پالتو غنڈے اس کی تکا بوٹی کر دیتے ہیں۔ مودودی صاحب کو اپنی زبان فیض ترجمان یا اپنے قلم گوہر بار سے کسی کے خلاف کچھ لکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ ان کے تنخواہ دار کارکن جو بس ہی کو پورا کرتے رہتے ہیں ان کے مشتبہ سرمایہ اور زرخرید اخبارات و جرائد کے ہاتھوں کس کی پگڑی سلامت ہے جو مودودی صاحب کو اس مقصد کے لیے خود کوئی زحمت کرنے کی ضرورت محسوس ہو" صـ۵

کیا خوب کہی اور کتنی سچی بات۔ مولانا کیا آپ اس حقیقت سے پردہ اٹھائیں گے، کہ لاہور کلوکیم میں جس میں ڈاڈ ہستی ایسا مورخ اور سکالر بھی

شرکت کے لیے آیا تھا) اور آپ اس وقت اس جماعت میں تھے جس کے متعلق اب آپ ہمارے ہمنوا اور ہمخیال ہیں کس نے پرویز صاحب کے مقالہ پر شور و ہنگامہ، ہُڑبونگ اور غنڈہ گردی کی اور کروائی تھی) اور وہ مودودی کے تنخواہ دار کون سے غنڈے تھے؟ آپ کو یاد تو ہوگا کہ لارڈ ہنٹی نے اس نازیبا اور ناپسندیدہ سفلانہ اور احمقانہ حرکت، کو دیکھ کر اپنا مقالہ پڑھنے سے انکار کر دیا تھا۔ اور وہ ناراض بھری بزم سے اٹھ کر تشریف لے گئے تھے؟ اب آپ حق نویسی اور حقیقت بیانی کی طرف آتے ہیں اس واقعہ کے متعلق کچھ تو کہیئے؟

ماہنامۂ میثاق

ماہنامۂ میثاق' جس کے ایڈیٹر جناب مولانا امین اصلاحی تھے، انہوں نے مولانا کوثر نیازی صاحب کے بیان پر جو اس میں شائع ہوا تھا، اس کے متعلق "پیش لفظ" میں تحریر فرمایا تھا،

"کوثر صاحب ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے پورے سترہ سال ہر طرح کے نرم گرم حالات میں جماعت کے ساتھ گزارے۔ ان کا ہفتہ وار اخبار "شہاب" جماعت کا نہایت سرگرم حامی رہا ہے اور ادھر ایک عرصے سے خود ان کا شمار بھی جماعت کے صفِ اوّل کے لیڈروں میں ہونا رہا۔ ہمیں امید ہے کہ قارئین میثاق ان تحریروں میں جماعت اسلامی کے باطن کا ایک عکس دیکھ سکیں گے اور اس سے ہمارے ان خیالات کی تصدیق ہو گی جو ہم نے اس جماعت سے متعلق میثاق کے پچھلے چند شماروں میں ظاہر کئے ہیں۔

اس بیان پر تبصرہ اور بعض دوسرے اہم مسائل کا تذکرہ تو انشاء اللہ ہم آئندہ کریں گے۔ اس وقت صرف اس گزارش پر اکتفا کرتے ہیں کہ کوثر صاحب کے اس بیان کے جس حصے سے ہمیں سب سے زیادہ خوشی ہوتی ہے۔ یہ اس کا وہ حصہ ہے جس میں انہوں نے خود اپنی کمزوری کا بھی نہایت واضح الفاظ میں اعتراف کیا ہے اور تاویل کے پردوں میں چھپنے کے بجائے سیدھے اعتراف کے ساتھ اپنے آپ کو اپنے خدا کے آگے

ڈال دیا ہے۔ ان کی اس اخلاقی وایمانی زندگی پر ہم ان کو صدق دل سے مبارک باد دیتے ہیں۔ ہم اُن کی اعلیٰ صلاحیتوں کے پہلے بھی قدر دان رہے ہیں۔ لیکن ان کی یہ صلاحیت پہلی بار ہمارے سامنے آئی ہے کہ وہ اپنی کمزوریوں پر بھی نگاہ رکھتے ہیں اس زمانے میں یہ وصف بڑا نایاب ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی اس خوبی کو اور بڑھائے اور اُن کی عمدہ صلاحیتوں سے دین وملت کو بیش از بیش فائدے پہنچیں (ص ۸)

(ایڈیٹر میثاق (مولانا) امین احسن اصلاحی)

بیان مولانا کوثر نیازی

(ص ۹ تا ۱۲)

"میں انتہائی غم واندوہ سخت قلبی اذیت اور الم ناک ذہنی کرب کے ساتھ یہ اعلان کر رہا ہوں کہ میں نے جماعتِ اسلامی کی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا ہے۔ اس جماعت کے ساتھ سترہ سال کی طویل مدت تک وابستہ رہنے کے بعد قطع تعلق کا یہ فیصلہ کیوں کرنا پڑا؟ اس سوال کا مختصر سا جواب تو یہ ہے کہ جس منزل تک پہنچنے کی جدوجہد جماعت اسلامی کا اصل نصب العین تھا، وہ منزل نہ صرف یہ کہ نظروں سے اوجھل ہوتی جارہی ہے بلکہ جماعت کی مرکزی قیادت اسے بدستور غلط راہوں پر چلائے لیے جانے کی کوشش کر رہی ہے

میں کچھ عرصہ سے جماعت اسلامی کے داخلی نظم کی خامیوں، اس کی تباہ کن سیاسی پالیسیوں اور بعض گمراہ کن افکار و نظریات کے بارے میں اپنی بے اطمینانی اور بے چینی کا اظہار جماعت اسلامی پاکستان کے امیر مولانا مودودی صاحب سے زبانی اور تحریری دونوں صورتوں میں کرتا رہا ہوں"۔ ....

حال ہی میں میں نے مولانا مودودی کے نام ایک مفصل مکتوب لکھا تھا جس میں بڑی دردمندی کے ساتھ ان اصولی اور عملی خرابیوں کی نشاندہی کی گئی تھی جو جماعت کے موجودہ طریق کار اور اس کی مرکزی قیادت کے طرزِ فکر وعمل سے رونما ہو رہی ہیں

....

مولانا مودودی نے اس مکتوب کے جواب میں جو طرز عمل اختیار کیا، وہ حد درجہ افسوسناک اور ان کے آمرانہ مزاج کا کھلا ہوا ثبوت ہے۔

. جماعت کی دینی اور جمہوری حالت اسوقت یہ ہے کہ صدارتی انتخاب کے موقع پر
پچھلے دنوں جماعت کی مجلس مشاورت نے جو قرارداد پاس کی تھی وہ جیل میں مولانا مودو
نے لکھی تھی۔ اور اسے لفظ بلفظ مجلس مشاورت کا فیصلہ قرار دیکر جمہوریت کا منہ
چڑایا گیا تھا۔ جماعت بنیادی جمہوریتوں پر تنقید اور بالغ رائے دہی کا مطالبہ کرتی ہے
مگر خود اس نے اپنے نظام میں اس طرح کی درجہ بندی کر رکھی ہے اور ہزاروں کارکنوں
میں سے صرف پندرہ سو ارکان کو ووٹ کا حق دیتی ہے۔ جماعت پر تنخواہ دار لیڈرشپ
مسلط ہے۔ اس کا ہر دسواں رکن تنخواہ دار ہے حد یہ ہے کہ اس کی ہیئت حاکمہ مجلس عاملہ
تک کے ارکان جن میں سب امرائے حلقہ شامل ہیں سب کے سب تنخواہ دار ہیں اور مولانا
مودودی انہیں شوریٰ میں سے نامزد کرتے ہیں . . . .

سیاسی بے تدبیریوں کا عالم یہ ہے کہ ایک طرف تو واضح اصولی اور بنیادی اختلافات
اور ارکان جماعت کی بے چینی کے باوجود جماعت متحدہ محاذ میں شامل ہو گئی — اور
دوسری طرف صرف ایک ٹکٹ نہ ملنے کی وجہ سے اس نے محاذ میں رہتے ہوئے محاذ
کے پارلیمانی بورڈ سے علیحدگی کا اعلان کر دیا۔

بدقسمتی سے نوبت اب یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ سیاسی مصلحتوں کے لیے واضح شرعی
حرمتوں کو سراسر غلط اور ناجائز طور پر "ابدی" اور "غیر ابدی" حرمتوں میں تقسیم کرنے
کی جسارت کی جا رہی ہے اور جماعت کے جبری نظام میں اس کے خلاف آواز اٹھانے
کی گنجائش بھی نہیں چھوڑی گئی۔

حقیقت یہ ہے کہ جماعت اسلامی جو ابتدائی دور میں ایک دینی جماعت کی صورت
میں سامنے آئی تھی، اب ایک دینی جماعت تو درکنار، ایک بااصول سیاسی پارٹی کے
مقام سے بھی گر چکی ہے۔ اور دینی و اصلاحی معاملات میں اس کی سرگرمیاں بالکل
برائے نام رہ گئی ہیں جماعت کے مخلص کارکنوں کی میرے دل میں اب بھی بے حد قدر
ہے . . . . اس بیان کے ساتھ میں اپنا مفصل مکتوب، اس کے جواب میں
مولانا مودودی کا خط اور اپنے استعفا کی نقول بھی پریس کے حوالے کر رہا ہوں، تاکہ اس
جماعت سے دلچسپی رکھنے والا باشعور طبقہ خود یہ فیصلہ کر سکے کہ ان حالات میں میرے لیے

اس کے سوا اور کیا چارہ کار باقی رہ گیا تھا، کہ میں جماعت سے مستعفی ہو جاؤں"۔
کوثر نیازی ۔ (۲۱ فروری ۱۹۶۵ء)

خط مولانا کوثر نیازی بنام امیر جماعت اسلامی پاکستان

قارئین کرام! یہ خط تفصیلی ہے۔ ہم یہاں اس کے اقتباسات پیش کرنے پر ہی اکتفا کریں گے۔ (مرتب)

ایک اقتباس :۔ متحدہ محاذ میں جماعت کی شمولیت پر میرے خیالات آپ سے اور رفقاء سے ڈھکے چھپے نہیں۔ جب ۱۹۶۲ء میں مسٹر سہروردی مرحوم سے آپ نے متحدہ محاذ کے سلسلے میں گفتگو کا آغاز کیا تو میں نے "شہاب" مورخہ ۲۱ اکتوبر ۱۹۶۲ء میں "مسٹر سہروردی سے چند سوالات" کے زیرِ عنوان ایک ادارتی شذرہ سپردِ قلم کیا تھا۔ مقصود یہی تھا کہ جو لوگ غیر اسلامی نظریات کے علمبردار اور ملک میں جمہوریت کے قائل ہیں، جماعت ان کی طرف دستِ تعاون بڑھانے سے باز رہے۔ اس پر آپ نے ایک ملاقات میں اس طرح کی تحریریں لکھنے سے منع کر دیا۔ کیونکہ آپ کے نزدیک اس سے جماعت کی پوزیشن خراب ہوتی تھی۔ میں نے آپ کے حکم کی تعمیل کی۔ مگر اس کے ساتھ برابر "شہاب" کے ذریعے ایک اسلامی محاذ کی تشکیل پر زور دیتا رہا۔

۱۹۶۴ء میں جماعت کو خلافِ قانون قرار دے دیا گیا اور اس زمانے میں مرکزی دفتر کے باقی ماندہ اصحاب نے محاذ کے قیام کے لیے دوسری پارٹیوں کے ساتھ پھر سے مذاکرات شروع کر دیے۔ میرا خیال تھا کہ جماعت موجود نہیں اور یہ اصحاب اپنی ذاتی حیثیت میں محاذ میں شریک ہو رہے ہیں۔ اس لیے میں نے ۱۶ فروری ۱۹۶۴ء کے "شہاب" میں ایک مرتبہ پھر تفصیل سے اپنے نقطۂ نظر کا اظہار کیا اور بدلائل واضح کیا کہ اس طرح کے متضاد اور متصادم عناصر کا اتحاد ملک و ملت، دینی اقدار اور خود جماعت کے لیے سخت تباہ کن ہوگا۔ اس مضمون کے چھپتے ہی اِن رفقاء نے میرے خلاف پروپیگنڈہ کی مہم تیز تر کر دی۔ کارکنوں کو یہ یقین دلایا گیا کہ انہوں نے یہ سب کچھ جیل سے آئی ہوئی ہدایات کے مطابق کیا ہے اور دوسری طرف یہ دھمکی دے کر میرا منہ بند کرنے کی کوشش کی گئی کہ اگر

میں اس طرح کے خیالات ظاہر کرنے سے باز نہ آیا تو خلافِ قانون قرار دیئے جانے کے باوجود جماعت کا جو ڈھانچہ اپنے طور پر انہوں نے قائم کر رکھا ہے وہ پورے ملک کے متعلقین کو جماعت سے میرے نکل جانے کی اطلاع کر دے گا۔

(میں نے جماعت اسلامی کیوں چھوڑی ؟ ص ۱۳، ۱۴، ۱۵)

دوسرا اقتباس :- "میں اس پر مسلسل غور و خوض کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اس سے جماعت ایک ایسے راستے پر ڈال دی گئی ہے جو دینی اعتبار سے سخت دوغلے پن بلکہ (مجھے اس سخت لفظ کے استعمال سے معاف فرمایئے) نفاق کا راستہ ہے اور سیاسی حیثیت سے فہم و فراست اور حکمت و دانش کے پہلو سے ہمارے دیوالیہ ہو جانے کا اعلانِ عام ہے۔"

(میں نے جماعت اسلامی کیوں چھوڑی ص ۱۷، ۱۶)

تیسرا اقتباس :- "محترم مولانا ! اس وقت ہماری حالت یہ ہے کہ دوسری بہت سی اصولی غلطیوں کے علاوہ ہم نے عورت کی صدارت کے مسئلہ میں جو روش اختیار کی اللہ تعالیٰ کے ہاں اسکی جو سزا ملے گی اس کا مسئلہ تو الگ ہے، اس دنیا میں بھی اندرون ملک ہماری دینی حیثیت ختم ہو چکی ہے۔

اگر ہمیں صدر ایوب کی مخالفت کرنی ہی تھی اور محترمہ فاطمہ جناح کا ساتھ دینا ہی تھا تو سیاسی اور جمہوری ضرورتوں کا اظہار کر کے اب کیا جا سکتا تھا۔ مگر اس کے لیے ہم نے غریب اسلام پر جو نوازش کی ہے اور حرمتوں کی ابدی اور غیر ابدی تقسیم کا جو نظریہ پیش کیا ہے اس کے بعد دینی حلقے تو ایک طرف رہے، دوسرے غیر جانبدار عناصر حتیٰ کہ اپوزیشن تک کے بعض نمایاں افراد ہمیں ابن الوقت اور سیاست کی خاطر دین میں ترمیم و تحریف کرنے والا گروہ تصور کرنے لگے ہیں۔

(میں نے جماعت اسلامی کیوں چھوڑی ص ۱۹)

چوتھا اقتباس "جماعت اسلامی ایک زمانے میں الیکشن کو حرام سمجھتی تھی۔ مگر جب قیامِ پاکستان کے بعد پہلی مرتبہ اس نے الیکشن میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا تو مودودی صاحب نے فتویٰ دیا کہ الیکشن میں امیدوار بن کر کھڑا ہونا حرام ہے جو ایسا کرتا ہے، وہ بد دیانت ہے۔ جماعت کے اہلِ علم نے اُن سے اختلاف کیا اور انہیں سمجھایا کہ اس طرح تو بڑے بڑے انبیاء و صلحاء بھی اس فتوے کی زد میں آجائیں گے۔ مثال کے طور پر حضرت

یوسف علیہ السلام نے عزیز مصر سے خود یہ مطالبہ کیا تھا کہ مجھے مصر کے مالی معاملات کا انچارج بنا دیجئے۔ میں امین ہوں۔"

اگلے الیکشنوں کی تیاری شروع ہوئی تو مودودی صاحب کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اہلِ حق کا طریقہ یہ ہے کہ ان پر اپنی غلطی واضح ہو جائے تو وہ کھلم کھلا اس سے رجوع کا اعلان کرتے ہیں۔ مگر "امیر الصالحین" نے یہ راستہ اختیار کرنے کے بجائے دین کے نام پر ایک اور خود ساختہ نظریہ ایجاد کر لیا جسے ان کی زبان میں "حکمتِ عملی کا نظریہ" کہتے ہیں۔ مودودی صاحب نے اس کی تشریح یہ فرمائی کہ ایک ہوتا ہے نظریہ ایک ہوتا ہے مصلحت اور حکمت کا تقاضا اسلامی تحریک کے قائد کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اصول اور حکمتِ عملی کے تصادم کی صورت میں اصول کو پس پشت ڈال دے۔ اور اس کی جگہ اس بات کو قبول کرے جو حکمت اور مصلحت کے تحت ضروری ہو۔ اس نظریے کی تائید میں دلیل اور سند کی بھی ضرورت تھی۔ اس مقصد کے لئے آپ نے خود سرکارِ رسالت مآب حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کو ملوث کر دیا۔ فرمایا اس طرح کا کام خود "پہلی اسلامی تحریک" کے قائد جناب رسولِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کیا ہے۔ اصول تو انہوں نے یہ دیا کہ مساوات ہونی چاہیئے۔ کسی عربی کو عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت حاصل نہیں۔ مگر جب خلافت کا مسئلہ سامنے آیا۔ تو آپ نے عصبیت کے پیش نظر جو ابھی تک قریش کے لوگوں میں موجود تھی۔ حکمت اور مصلحت کی خاطر یہ فرما دیا کہ — الائمۃ من القریش — امام (یعنی خلفاء) قریش میں سے ہوں گے۔ اسی طرح ہر چند کہ امیدواری اسلام میں حرام ہے لیکن حکمت اور مصلحت کے تحت ہم اسے اپنا سکتے ہیں۔" اسلامی تحریک کے قائد اول" نے ایسا کیا ہے تو آج کی اسلامی تحریک کا قائد ہونے کی حیثیت سے مجھے بھی اس کا حق حاصل ہے۔

اس نظریئے کے ذریعے سے قرآن و سنت میں جو تحریف کی گئی ہے۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن اقدس کو جس طرح داغدار کیا گیا ہے۔ غیر مسلموں کو آنحضورؐ کی ذات گرامی پر اتہامات تراشنے کا جو موقع دیا گیا ہے اور "الائمۃ من القریش" کی یہ غلط تشریح پیش کر کے دین سے ناواقفیت کا جو ثبوت دیا گیا ہے اس پر تو

ہم تفصیل سے اپنی زیرِ طبع کتاب "سیاسی مذہب" میں روشنی ڈالیں گے۔ سردست قارئین اتنا ہی اندازہ کر لیں۔ کہ جماعت اسلامی کے امیر المومنین اپنی غلطیوں کے جواز کے لیے کس طرح قرآن و حدیث کے ساتھ کھیلنے سے بھی نہیں چوکتے"

(میں نے جماعت اسلامی کیوں چھوڑی (ص ۲۱، ص ۲۲)

پانچواں اقتباس " مودودی صاحب کئی دفعہ لکھ چکے ہیں کہ اسلام میں عورت کا برسر اقتدار آنا تو ایک طرف رہا اسے ووٹ دینے کا بھی حق نہیں اس سلسلے میں جب انہیں حضرت عائشہ صدیقہؓ کی مثال دی گئی تو انہوں نے اُمّ المومنین پر بھی تنقید کرنے سے دریغ نہ کیا۔ لیکن چونکہ محترمہ فاطمہ جناح کی کامیابی کی قوی امید تھی۔ اس لیے مودودی صاحب نے بھی ان کی مدد کر کے نئی کابینہ میں شامل ہونے کا پروگرام بنایا۔ ۔

. . . .

آگے چلکر مولانا کوثر نیازی رقمطراز ہیں۔ " میرا نقطۂ نظر یہ تھا کہ اس صدارتی الیکشن کو کفر و اسلام کی جنگ نہ بنایا جائے۔ نہ ہمارا معاشرہ اسلامی ہے نہ حکومت — ہم اس وقت خلیفہ راشد کا چناؤ نہیں کر رہے بلکہ اپنے ماحول کے مطابق اپنے سیاسی اور جمہوری حقوق کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں اور اس مقصد کے لیے محترمہ فاطمہ جناح کی تائید کرنا ہمارا فرض ہے۔ میری خواہش تھی کہ جماعت بھی اسی نقطۂ نظر کی بنیاد پر محترمہ کی تائید کا اعلان کرے۔ مگر مودودی صاحب نے جیل کے اندر سے قرارداد کا جو مسوّدہ بھیجا، اُس نے پوری مجلسِ مشاورت کی آزادیٔ رائے کو سلب کر لیا مجھے اس اجلاس کے وقت کے بارے میں دانستہ طور پر غلط اطلاع دی گئی تاکہ میں اس قرارداد پر اعتراض نہ اٹھا سکوں۔ (ص ۲۴-۲۵)

یہ سیاسی دینِ مبین کی شرعِ شریف کی حکمتِ عملی کی پالیسی تھی جناب — ! جب بوقتِ ضرورت جھوٹ بولا جا سکتا ہے تو خدمتِ دین کے لیے آپ کو غلط اطلاع کیوں نہ دیتے۔ (مرتب)

خصوصی توجہ کا مستحق ۱۹۴۹ء کی انتخابی پالیسی سے لیکر عورت کے مسئلہ صدارت تک ہر متضاد بات کے لیے جس طرح نصوصِ قرآن و حدیث

پیش کیا ہے، اس کے بعد اس ملک میں کوئی ذی فہم آدمی ہماری پیش کردہ دینی اور اصلاحی دعوت پر اعتماد نہیں کر سکتا۔" صفحہ ۲۹

جناب مولانا کوثر نیازی صاحب "ذی فہم آدمی" تو مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم" پڑھ کر ہی اسی وقت ان کی دینی دعوت اور اصلاحی

کوشش سے واقف ہو گیا تھا، اور فرزندان ملت نے اسی زمانہ میں سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی اس دینی قلابازی پر اظہار حیرت و نفرت کیا تھا۔ آپ بات ۱۹۴۹ء سے شروع کر رہے ہیں۔ کیا عرض کیا جائے، کیا کہا جائے۔

؎ دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

اقتباس ملاحظہ فرمائیے:۔

" تضادات کا شکار ہوتے جانے کے سارے ادوار آپ سے بڑھ کر کس پر روشن ہوں گے۔ پہلے ہم نے امیدواری کو حرام قرار دیا۔ اس کے لیے صحابہؓ تک کی کسی جلیل القدر شخصیت میں امیدواری کا کوئی پہلو ہمارے سامنے پیش کیا گیا تو ہم نے اپنی اجتہادی رائے کو نص کا درجہ دے کر اس پر تنقید کرنے سے بھی دریغ نہ کیا۔ مگر اب ہم اپوزیشن کے ساتھ مل کر امیدواروں سے خود درخواستیں طلب کر رہے ہیں"۔ (ص ۲۹)

خطا معاف! ان سے بڑھ کر جناب غلام احمد پرویز پر ان کے تضادات اُن سے بھی زیادہ روشن ہیں جن کی یہ مخالفت اس لیے کرتے کرتے رہتے ہیں کہ وہ ان تضادات کو واضح کرتے رہتے ہیں۔ بلکہ یہ حضرت (مودودی صاحب) اسی نام کے دوسرے (مرزا) غلام احمد کے تتبع میں اپنی مطلب براری اور مقصد طلبی کے لیے خدا اور رسول و صحابہ کو پس پشت ڈال کر اپنے فائدے کے لیے ایسی تاویل و تشریح اور تصریح فرما لیتے ہیں جس سے آپ برہم، ناراض، اور جدا ہونے تک کے لیے تیار ہوئے۔ مرزا صاحب بھی یہی کہتے تھے کہ احادیث کے ذخیرے سے اپنے مطلب اور ڈھب کی روایات لے لیتا ہوں اور مودودی صاحب بھی یہی کچھ کر رہے ہیں۔ "مزاج شناس رسول" جو ٹھہرے (مرتب)

آگے چلیے

"ہم نوٹ پر قائد اعظم کی تصویر چھاپنے پر سخت برہم تھے صدارتی انتخاب میں ہمارے کارکنوں نے ان کی بہن کی تصویریں دو دو جگہ گلی گلی فروخت کیں۔" (میں نے جماعت اسلامی کیوں چھوڑی ص۲۹ و ۳۰)

وکلا صاحبان توجہ فرمائیں

ہم پہلے وکیلوں کو شیطانی برادری کا رکن سمجھتے تھے اب انہیں کو جمہوریت کا سرپرست کہتے ہیں ___

میں یہاں یہ عرض کرنا نہیں چاہتا کہ ہماری ان باتوں میں سے کون سی بات صحیح تھی اور کون سی غلط۔ یہ تو "مشتے نمونہ از خروارے" ہے (ص۳۱ میں نے جماعت اسلامی کیوں چھوڑی)

"ہر پندھرواں رکن تنخواہ دار اور ہمہ وقتی دسواں رکن ہے۔ جماعت کے پورے دروبست اور قیادت پر انہی ہمہ وقتی اصحاب کا قبضہ ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ان میں انتہائی مخلص لوگ شامل ہیں لیکن جیسا کہ آپ کی طرف سے قیم حلقہ ہونے کی بالاصرار دعوت پر میں نے عرض کیا تھا کہ ہمہ وقتی ہونے کے بعد تنخواہ اور معاوضہ کی شرح سے کام کی پیمائش ہوتی ہے اس کے لیے غریب کارکنوں کو اپنے دفاع میں بہت کارگزاری بیان کرنا پڑتی ہے معترض ارکان کا جواب دینے کے لیے حامی ارکان ڈھونڈنے پڑتے ہیں۔ اور نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بے لوث تنخواہ دار قیادت بھی سازشوں اور گروپ بندیوں کا شکار رہتی ہے ہمارے ہاں معیار بدقسمتی سے یہ نہیں کہ کون اہل ہے جسے اعزازی طور پر ہی سہی، جماعت کی قیادت سونپ دی جائے۔ معیار یہ ہے کہ کون فارغ یا معاشی پریشانیوں میں مبتلا ہے جسے ہمہ وقتی بنا کر قائد بنا دیا جائے۔ آپ ناراض نہ ہوں تو عرض کروں کہ آج جماعت کی ہیئتِ حاکمہ مجلسِ عاملہ تک میں ایک آدھ رکن کو چھوڑ کر باقی سب حضرات یہی تنخواہ پانے والے ہمہ وقتی رفقاء ہیں۔ اُن کی سپرٹ بہت بلند سہی مگر ظاہر ہے جماعت سے معاشی وابستگی کے بعد وہ پورے زور اور جرأت سے اختلاف رائے کا اظہار نہیں کر سکتے"

(میں نے جماعت اسلامی کیوں چھوڑی ص۳۲ و ۳۳)

ان اوصاف اور خوبیوں کے حامل۔ ایثار و قربانی کے مجسمے۔ پیکرِ اخلاص و وفا، خدامِ دین و شریعت اور ان رفیقانِ منزل میں سے ایک سترہ برس تک ہمقدم و ہمسفر کی یہ پختہ رائے، اگر اب بھی کوئی یہ یقین

ذکر ہے کہ یہ اقامتِ دین کے لیے اٹھے ہیں اور یہ اسلامی نظام کے قیام کے لیے ہی اپنے سے اختلاف رکھنے والے پر کیچڑ اچھالتے ہیں تو پھر ہمیں ہمارا کیا قصور ہے ؟

صاف اور سیدھی سی بات ہے کہ ہر دفتر کا ملازم اپنے دفتر کے افسر کی جا و بے جا تعریف کرتا اور اسکی توصیف میں مشغول و مصروف رہتا ہے ڈاکٹر نیازی صاحب! ان کو بھی دردِ مودودی کی تنخواہ ملتی ہے۔ آپ اس سیدھی سی بات سے رنجیدہ کیوں ہیں ؟ (مرتب)

" تیسری صورت یہ تھی کہ ہم سیاست اور اصلاح و تزکیہ دونوں اہم کاموں سے کشمکش اور رفاہِ عامہ کا منصوبہ بناتے اور خدمتِ خلق کے لیے کام شروع کر دیتے مگر سالہا سال غور و فکر اور مطالعہ و مشاہدے سے نظریہ آتا ہے کہ ہم اس میدان کے بھی مرد نہیں ہیں ہم اپنے کارکنوں کو (الا ماشاء اللہ) جو ذہن دیا ہے (وہ یہ ہے کہ خدمتِ خلق کا کام سیاسی نتائج حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہے اور بس۔ ہم نے ہمیشہ اپنے شفاخانوں اور خدمتِ خلق کے دوسرے کاموں کو جماعت کے اثر و رسوخ اور سیاسی مواقع کے حصول کے پیمانے سے ناپا ہے۔
اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کسی سیاسی اور ہنگامی مقصد کے بغیر ہم خدمتِ خلق کا کوئی بھی منصوبہ عمل میں نہیں لا سکتے۔" (میں نے جماعت اسلامی کیوں چھوڑی ص ۳۵)

ہمارا ناقص علم اس مقام پر اتنا رسا نہیں۔ مولانا یہ تو ضرور ان میں سے (یعنی آپ کے یارانِ قدیمی) میں سے کسی نے کہا ہو گا کہ بھولے پٹھان ہم تو دین کو بھی سیاست کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ کیا تجھے اتنی بھی خبر نہیں؟

(مرتب)

اک نظر ادھر بھی!

ہمارے راہنما تک افسوسناک کردار رکھتے ہیں۔ امانتیں مثلاً چرمہائے قربانی، عشر اور زکوٰۃ کی رقوم خالص سیاسی اور انتخابی مہمات اور ہمہ وقتی کارکنوں کی تنخواہوں پر صرف کی جا رہی ہیں۔ (کوثر نیازی ۲ فروری ۱۹۶۵ء میں نے جماعت اسلامی کیوں چھوڑی ص ۳۸) مولانا خفا کیوں ہو رہے ہیں۔؟ یہ حضرت مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی اجازت کے بغیر تو نہیں ہوتا جب قرار داد تک

جیل سے آتی ہے تو ہاں کے خرچ کے احکام بھی وہی صادر فرماتے ہوں گے
آپ کو تو علم ہو گا۔ ہم تو بیگانے ہیں۔ (مرتب)

جواب

امیر جماعت اسلامی پاکستان بنام مولانا کوثر نیازی

محترمی جناب کوثر نیازی ــــ السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ کا مفصل خط مجھے ملا۔ اس کو بغور پڑھنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ آپ
اب سے بہت پہلے جماعت سے الگ ہو جانا چاہیئے تھا۔ آپ نے غلطی کی کہ اتنی طویل مدت
سے یہ احساسات رکھنے کے باوجود آپ جماعت کے ساتھ چلتے رہے۔ بہر حال اب مناسب
یہی ہے کہ آپ مستعفی ہو جائیں۔ اس کے بعد آپ کا جو طرز عمل رہے گا۔ اس کو دیکھ کر
یہ رائے قائم کی جا سکے گی کہ آپ نے اس خط میں جو کچھ لکھا ہے وہ للہ فی اللہ اور
حقیقی بہی خواہی و ہمدردی کے جذبہ سے لکھا ہے یا نہیں" اگر خدانخواستہ اس کے
محرکات دوسرے بھی ہوئے .... آپ کی عنایات پر صبر کروں گا۔"

استعفیٰ مولانا کوثر نیازی بنام امیر جماعت اسلامی پاکستان

۹۔ فروری ۱۹۶۵ء　　محترم و مکرم جناب مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی
امیر جماعت اسلامی پاکستان

السلام علیکم ورحمۃ اللہ! آپ کی طرف سے میرے خط محررہ ۱۲ فروری ۱۹۶۵ء کا جواب
موصول ہوا۔ مجھے افسوس ہے کہ اپنے خط کے آخری حصے میں میں نے جس خدشے کا اظہار کیا
کہ کہیں ان دردمندانہ معروضات پر غور کرنے کے بجائے آپ غصّے میں نہ آجائیں۔
ہوا۔ اور آپ نے مختصر جواب میں وہ سب کچھ کہہ دیا جو غصّے کی حالت میں کہا جا سکتا ہے

....

اب اگر میں اپنے سترہ سالہ تجربات کی بناء پر اس آخری فیصلے پر پہنچ چکا ہوں
کہ جماعت فکری و عملی دونوں پہلوؤں سے صراط مستقیم سے بھٹک چکی ہے اور آپ

فیصلے کا اظہار میں ایسے لوگوں کے سامنے کروں کہ جن ہزاروں افراد کو میں نے جماعت سے متعارف کرایا کم از کم ان کے سامنے بری الذمہ ہو جاؤں تو میرا یہ طرزِ عمل کیوں للہ فی اللہ اور حقیقی بہی خواہی پر مبنی نہیں ہوگا ؟

مولانا محترم ! یہ عجیب بات ہے کہ ایک طرف تو آپ تجدید و احیائے دین کا کام کرنے کے لیے اولین ضرورت یہ محسوس فرماتے ہیں کہ صدیوں پہلے فوت ہونے والے ان نفوسِ قدسیہ پر شدید ترین تنقید کریں جو تقویٰ للہیت، اخلاص اور دین کے لیے ایثار کرنے میں ضرب المثل ہوں اور پھر اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے آپ مستقل تصانیف شائع فرمائیں، لیکن اگر کوئی شخص دیانتداری سے مسلسل تجربات و شواہد کے بعد آپ کے بارے میں یہ رائے قائم کرے کہ آپ کا طرزِ عمل غلط، دین کے خلاف یا مسلمانوں کے لیے گمراہ کن ہے اور وہ اپنی رائے کو باقاعدہ دلائل کے ساتھ پیش کرے تو اس شخص کے بارے میں یہ فتویٰ صادر فرما دیں کہ یہ اخلاص و للہیت سے محروم ہو چکا ہے اور بعض "دوسرے محرکات" کے تحت یہ کام کر رہا ہے۔

مولانا محترم ! آپ نے بین السطور کچھ "دوسرے محرکات" کا بھی ذکر فرما دیا ہے میں حیران ہوں اس کے بارے میں کیا عرض کروں۔ جماعت کے احوال و کوائف سے آگاہی رکھنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ ۱۹۴۱ء سے لیکر اب تک جس کسی شخص نے (خواہ وہ کتنا ہی متقی، خدا ترس اور دین کے لیے سرتاپا ایثار کیوں نہ ہو) جماعت سے اختلاف کیا۔ یا علیحدگی اختیار کی، آپ نے ہمیشہ اس کے بارے میں انہی "دوسرے محرکات" کا ذکر فرمایا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ اس اختلاف میں مخلص نہ تھا۔.....

کل تک جو شخص خود آپ کے نزدیک پورے حلقہ کے قیم سے لیکر امیر تک کے لیے انتہائی موزوں آدمی تھا۔ اس فیصلے کے بعد آپ اس کے "دوسرے محرکات" کو متعین فرمانے لگے ہیں جماعت میں میری شمولیت کے محرکات کیا تھے۔ اور اب اس فیصلے اور آپ کے اس طرزِ عمل کے خلاف اظہارِ رائے کے محرکات کیا ہیں ؟ ان کا بھید اس روز کھلے گا جس دن تمام چہروں سے نقاب اٹھ جائے گا۔ اور اس دن میں داورِ محشر کے حضور آپ سے ان دوسرے محرکات کو متعین کرنے کا سوال کروں گا۔"

مولانا کوثر نیازی صاحب! اس مقام پر بھی آپنے بھولے پن کا مظاہرہ فرما رہے ہیں۔ جناب سید ابوالاعلیٰ مودودی بھلا خدا سے کوئی ڈرتے ہیں۔ اگر حقیقت میں ایسا ہوتا تو خدا کے بندوں پر زبان دراز کیوں کرتے؟ خود "دوسرے محرکات" سے حرکت میں ہیں (اور یہ تو آپ کو علم ہوگا) تو پھر وہ ہر کسی کے بارے میں یہ کیوں نہ سمجھیں ان کی اس دیانت ذہنی اور خلوص دینی کی وجہ سے تو اتنے اکابرین جماعت الگ ہوئے تھے، ایک آپ بھی ہو گئے تو کیا سیلاب زر اپنے منزل کے دھاروں پر بڑے بڑوں کو بہائے لئے چلا جارہا ہے تو نہ ہی اور سہی والا معاملہ ہے۔

~ عضب ہیں یہ مرشدان خود بیں خدا تری قوم کو بچائے
بگاڑ کر تیرے مسلموں کو یہ اپنی عزت بنا رہے ہیں (اقبالؒ)

حکیم الامت حضرت اقبالؒ نے تو "مسلموں" کو کہا تھا۔ یہ اسلام کو بگاڑ کر صحابہ کبارؓ اور بزرگان دین پر زبان طعن دراز کر کے اپنی عزت بنا رہے ہیں۔ کیا ہوا۔ ایسی ہی دجل و فریب، مکر و ریا سے حاصل کردہ رفعتیں اور ابلیسانہ ہتھکنڈوں سے پائی جانیوالی عزتیں چشم فلک نے خاک میں ملتی دیکھی ہیں جس نے "والذین معہ" پر الزامات و اتہامات سے گریز نہیں کیا، یقیناً خاسر و نامراد ہوگا۔ (مرتب)

باب ۵

اقبال کے حضور میں نشستیں اور گفتگوئیں

جناب ڈاکٹر سید نذیر نیازی نے "اقبال کے حضور میں نشستیں اور گفتگوئیں" کے عنوان سے ایک بیاض یادداشت ترتیب دی ہے جس کا جزو اول یکم جنوری ۱۹۳۸ء اختتام ۲۱ مارچ ۱۹۳۸ء پر جزو دوم ۲۲ مارچ سے ۲۱ اپریل تک ہے۔ اس کتاب میں صفحہ ۳۶ پر دوشنبہ ۱۰ جنوری کے عنوان سے دہلی سے آنے والے اس قافلہ قلندران اقبال کا ذکر ہے جو مولانا اسلم جیراجپوری کی قیادت میں ۹ جنوری کو یوم اقبال کی تقریب میں شرکت کے لیے لاہور آیا تھا جو انٹر کالجیئٹ مسلم برادرہڈ نے منایا تھا جس میں جناب پرویز نے ایک نہایت خیال انگیز، فکر ریز اور احساس خیز تقریر دلنشیں انداز میں ارشاد فرمائی تھی۔ ہم بھی پڑھتے سنتے چلے آرہے تھے کہ حضرت حکیم الامت کی زندگی میں یہ پہلا یوم اقبال تھا، لیکن جناب ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے روزنامہ مشرق، لاہور بابت ۱۰ فروری ۱۹۷۶ء میں لکھا ہے۔

"لاہور۔ ۶ مارچ آج گیارہ بجے صبح وائی ایم سی اے ہال میں اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام نہایت دھوم دھام سے یوم اقبال منایا گیا۔ سات مقررین نے حضرت علامہ اقبال کی شاعری پر مختلف زاویہ نگاہ سے روشنی ڈالی۔ یہ تقریب دو اجلاسوں میں تقسیم کی گئی۔ پہلا اجلاس ۱۱ بجے صبح سے پونے دو بجے بعد دوپہر تک رہا۔ آنریبل جسٹس سید آغا حیدر صدر تھے۔ اس اجلاس میں صوفی غلام مصطفےٰ صاحب تبسم ایم اے پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور، حکیم احمد شجاع صاحب بی اے اسسٹنٹ سیکرٹری پنجاب لیجسلیٹو کونسل اور سید محمد عبداللہ صاحب ایم اے ریسرچ سکالر پنجاب یونیورسٹی نے مختلف موضوعات پر انگریزی زبان میں تقریریں کیں۔ جناب تبسم کے لیکچر کا موضوع "اقبال کی شاعری" تھا۔ حکیم احمد شجاع صاحب نے "اقبال ایک شارح تعلیم

اسلام کی حیثیت سے" موضوع پر تقریر کی۔ اور سید محمد عبداللہ صاحب ایم اے نے اقبال اور سیاست عالیہ" پر اظہارِ خیال فرمایا۔

دوسرا اجلاس پونے تین بجے شروع ہوا۔ ڈاکٹر ایس ایس بھٹنا گر ڈی ایس سی صدر تھے اس اجلاس میں شیخ اکبر علی ارسطو بی اے ایل ایل بی مولانا محمد دین تاثیر۔ اور مسٹر ایم اے مجید نے انگریزی زبان میں تقاریر فرمائی جناب ارسطو نے اقبال اور تصوف، مولانا تاثیر نے اقبال کے تخیل کا ارتقاء اور مسٹر ممتاز حسن نے اقبال اور مغربی تخیل کے موضوع پر فاضلانہ تقاریر کیں مسٹر مجید کا لیکچر پروگرام میں شامل نہ تھا۔ جملہ حضرات نے اپنی تقاریر تیار کرنے میں نہایت محنت اور جانفشانی سے کام لیا تھا۔ اور پروفیسر تبسم۔ پروفیسر تاثیر۔ جناب ارسطو اور مسٹر ممتاز حسن کی تقاریر خاص طور پر دلچسپ اور پُر از معلومات اور فاضلانہ تھیں آخر میں ڈاکٹر بھٹنا گر نے ایک مختصر تقریر کی اور جلسہ ختم ہوا۔ عوام نے جلسے کو نہایت صبر اور سکون سے سُنا اور اس شاندار کامیابی کا سہرا انسٹی ٹیوٹ کے اولوالعزم سیکرٹری خواجہ عبدالوحید کے سر ہے۔

لاھور، ۷ مارچ آج پانچ بجے لورینگ میں اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے یوم اقبال کے سلسلے میں حضرت علامہ کو دعوتِ چائے دی گئی۔ تقریباً ڈیڑھ سو معززین موجود تھے۔ مولانا سالک مدیر انقلاب نے ایک مختصر تقریر میں اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے حاضرین کا شکریہ ادا کیا اور حضرت علامہ سے استدعا کی کہ آپ انسٹی ٹیوٹ کے مخلص کارکنوں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے کچھ ارشاد فرمائیں۔ اس کے بعد حضرت علامہ نے ایک مختصر لیکن عالمانہ تقریر میں بعض شعبہ ہائے علم و تحقیق کی طرف انسٹی ٹیوٹ کے ارکان کی توجہ دلائی اور اس تحریک کی تحسین فرمائی جو مسلمان نوجوانوں میں اسلامی ادبیات اسلامی تاریخ اور اسلامی تمدن کی تحقیق اور بزرگ داشت کے لیے پیدا ہوئی ہے۔ اس کے بعد یہ پاکیزہ صحبت بخیر و خوبی انجام کو پہنچی۔ [۹]

ہمیں اس سے بحث نہیں کہ پہلا یوم اقبال ۷ مارچ ۱۹۳۲ء کو اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام منایا گیا یا ۹ جنوری ۱۹۳۸ء میں انٹر کالجیٹ مسلم برادر ہڈ نے۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ ان دونوں کی کارروائی پڑھنے سے یہ ضرور واضح ہو جاتا ہے کہ

فکرِ اقبال کی روشنی میں جو کچھ کہا گیا، اس لحاظ سے انٹر کالجیئٹ برادر ہڈ کے زیرِ اہتمام منایا جانے والا یومِ اقبال ایک نمایاں اور منفرد حیثیت رکھتا ہے جس میں مولانا اسلم مرحوم کے پر مغز خیالات اور جناب پرویز کے فکرِ اقبال سے اخذ کردہ قرآنی رموز و نکات کچھ اور ہی رنگ پیش کرتے ہیں یہ کچھ تو ہم نے اس اجمال کی حقیقت پیش کی ہے اب ہم اصل مقصد کی طرف آتے ہیں۔ دوشنبہ ۱۱ جنوری کو دہلی سے حاضرِ یومِ اقبالؒ ہونے والے حضرات حکیم الامت حضرت علامہ سے ملاقاتی ہونے کے لیے جاوید منزل آتے حضرتِ علامہ نے ان مشتاقانِ زیارت کو بخوشی فرمایا، ان کے لیے اجازت کی کونسی ضرورت ہے۔ نیازی صاحب! مولانا اور ان کے احباب شوق سے تشریف لائیں۔"

مولانا اسلم (مرحوم) کے علاوہ جناب پرویز، شیخ سراج الحق اور حضرت اسد ملتانی بھی اس تقریب میں شریک ہوئے تھے۔ (چودھری حبیب احمد)

سید نذیر نیازی رقمطراز ہیں:۔

"مولانا کمرے میں داخل ہوئے، سلام کے لیے ہاتھ اٹھایا اور پھر بکمالِ مودّت آگے بڑھ کر حضرت علامہ سے مصافحہ کیا حضرت علامہ بھی بڑے تپاک سے پیش آئے۔ مولانا کے سلام کا جواب اٹھ کر دیا۔ اور انہیں اپنے پاس بٹھانا چاہتے تھے کہ مولانا خود ہی پلنگ کے ساتھ رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئے۔ احباب دہلی آگے بڑھے ان کے ہمراہ ایک صاحب[1] اور بھی تھے۔ انہوں نے بھی سلام کرتے ہوئے حضرتِ علامہ سے مصافحہ کیا اور پلنگ کے ساتھ لگی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ گئے تو میں نے چند کلمات بطور تعارف کہے۔ مولانا نے بڑی دلسوزی سے حضرت علامہ کی خیریت مزاج دریافت کی۔ اس پر علاج معالجے کا ذکر چل نکلا حضرت علامہ مختصراً اپنی علالت، دوا اور غذا کا حال بیان کرتے رہے۔ فرمایا "علاج حکیم نابینا صاحب ہی کا ہے۔ مجھے جو بھی فائدہ ہوا انہیں کی دواؤں سے ہوا۔ لیکن اب کئی مہینوں سے صحت ایک خاص مرحلے سے آگے نہیں بڑھی۔ جسم کمزور ہو رہا ہے۔ گلا برابر بیٹھا ہوا۔ آواز میں کشائش نہیں ہوتی۔" مولانا نے کہا اللہ آپ کو شفا دے، ہماری تو شب و روز یہی دعا ہے۔

---

[1] قاضی محمد اشرف مرکزی حکومت کے ملازم۔ ان کا انتقال بھی ہو چکا ہے۔

حضرت علامہ نے حقے کے دو ایک کش لیے اور نے مولانا کی طرف پھیر دی۔ پرویز صاحب نے سفرِ حج کا ذکر چھیڑ دیا۔ کہنے لگے کیا حج کا ارادہ پختہ ہے؟ حضرت علامہ نے فرمایا "ارادہ تو ہے بشرطیکہ صحت اجازت دے، ورنہ اب کے نہیں تو اگلے سال ہی آگے جو اللہ کو منظور" پرویز صاحب نے کہا بے شک صحت شرط ہے۔ ہمیں تو بڑی تشویش تھی۔ آپ اس حالت میں سفر کر رہے ہیں۔ ایسا نہ ہو صحت کو گزند پہنچے۔"

"دنیا میں ہر کسی کی کوئی غرض ہوتی ہے' ہماری غرض آپ ہیں"

حضرت علامہ نے تبسم فرمایا اور پھر وہی الفاظ دہرائیے "جو اللہ کو منظور" ارشاد ہوا، "ایک طرح سے تو میں حج ہی کے راستے میں ہوں' چاہتا ہوں یہ راستہ جلد طے ہو جائے۔" پھر ذرا دم لیکر مگر بھرائی ہوئی آواز میں فرمایا۔ "یہ راستہ طے تو ہو جاتا ہے، لیکن مجھے اپنے آپ پر قابو نہیں رہتا۔ میں تو اب جو کچھ کہتا ہوں دہیں کے لیے کہتا ہوں۔" اور یہ کہتے کہتے دفعتہً رک گئے۔ جیسے شدت جذبات اظہارِ مدعا میں حارج ہو۔ بالآخر ارشاد فرمایا۔ "آستانہ قدس پر پہنچ جاؤں تو کچھ اور بھی عرض کر دوں"۔ یہ گویا اشارہ تھا ارمغانِ حجاز کی طرف جس کی ابتداء کب سے ہو چکی تھی لیکن جس کا نام ابھی تجویز نہیں ہوا تھا۔

ذرا آگے چلکر:۔ مگر احباب دہلی تو موقع کی تلاش میں تھے۔ حضرت علامہ نے بات ختم کی تو انہوں نے تبرک کی فرمائش کر دی۔ فرمایا "میں تو معذور ہوں، انہیں کچھ یاد ہو تو۔ اشارہ میری طرف تھا۔ سن لیجئے۔" اس پر احباب دہلی نے مستفسرانہ میری طرف دیکھا حضرت علامہ ایک طرح سے اجازت دے ہی چکے تھے۔ میں نے حافظے پر زور دیا تو گفتگو کی رعایت سے ایک رباعی ذہن میں آ گئی۔ میں نے مصرع اوّل پڑھا۔ دوسرا مصرع پڑھ رہا تھا، کہ حضرتِ علامہ پر رقت طاری ہو گئی۔ اور وہ بار بار اس کا تکرار کرنے لگے میں خاموش ہو گیا، تو اس پر انہوں نے تیسرا مصرع خود ہی ارشاد فرمایا، لیکن ابھی پورے طور پر ادا نہیں کر پائے تھے کہ آواز گلوگیر ہو گئی۔ اور وہ یوں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے کہ احباب دہلی پریشان ہو گئے رباعی یہ تھی۔

تنم وا ماندہ و جانم در تگ و پوست   سوئے شہرے کہ بطحا در رہ اوست

تو باش ایں جا و با خاصاں بیامیز   کہ من دارم ہوائے منزلِ دوست

مزید اقتباس حضرت علامہ ذرا سنبھل کر بیٹھ گئے اور پھر بڑے پُر یقین لہجے میں کہنے لگے: "مجھے تو یوں نظر آتا ہے کہ ہمیں میں سے کوئی صاحبِ ایمان اٹھ کھڑا ہوگا۔ اور اس کا خلوص اور دیانت ساری قوم کو ایک مرکز پر جمع کر دے گا۔" ارشاد ہوا "یہ محض خیال ہی خیال نہیں ہے، حقیقت ہے۔" ہم سب ہمہ تن گوش تھے۔ حضرت علامہ رک رک کر گفتگو فرما رہے تھے۔ کبھی کبھی اُن کی آواز گلوگیر ہو جاتی۔ ان کے یہ الفاظ، کہ یہ محض خیال ہی نہیں ہے، حقیقت ہے، ابھی ہمارے ذہن میں گھوم رہے تھے کہ انہوں نے فرمایا "ہمارے مسائل کا ایک ہی حل ہے اور وہ ہے اتحاد۔ مسلمان متحد ہو گئے تو ان کی جداگانہ قومیت تسلیم کر لی جائے گی۔ جداگانہ قومیت تسلیم کر لی گئی تو ہم آزادی سے اپنا مستقبل تعمیر کر سکیں گے۔"

کیا اسلامی ریاست قائم ہوگی

"کیوں نہیں؟ بشرطیکہ ہم اپنا اتحاد قائم رکھیں۔ اور اس دعوے سے دستبردار نہ ہوں کہ ہندوستان میں ایک نہیں کئی قومیں بستی ہیں۔ ہندوستان بھی محض ایک جغرافیائی اصطلاح ہے اور اس کا اتحاد بیرونی حملوں سے خطرے کا نتیجہ۔ اسلام بھی مذہب نہیں کہ اس کی تعبیر مذہب کے عام معنوں میں کی جائے۔ اس طرح اس کا تعلق صرف فرد کی ذات سے ہے۔ اسلام ایک نظامِ مدنیت بھی ہے جس کی نفی اسلام کی نفی ہے۔ ہم اس نظامِ مدنیت سے انحراف نہیں کر سکتے۔ یہی نظامِ مدنیت ہماری جداگانہ قومیت کا راز ہے۔ انگریز تو اس نکتے کو سمجھتا ہے۔ ہندو اسے سمجھنا نہیں چاہتے[۵]۔" احبابِ دہلی خاموش حضرت علامہ کے ارشادات سن رہے تھے۔ میں نے عرض کیا کہ کیا یہ امر کہ اسلام بجائے خود ایک نظامِ مدنیت ہے تو شاید مشکل

---

[۵] اور مسلمان بھی سمجھ نہیں رہے تھے، بالخصوص جب نیشنلسٹ مسلمان، احرار، اور کانگریس کی طرفدار جمیعت العلماء اس سے انکار کر رہی تھی۔ یا اسکی تعبیر اس رنگ میں کرتی کہ اس کے لیے کسی جداگانہ قومی تنظیم کی ضرورت نہیں، بجز اس کے کہ ہم ترقی پسند دنیا کا ساتھ دیں

سے سمجھ میں آتے مسلمانوں کو خود بھی اس کا پورا پورا شعور نہیں۔ لیکن اگر ہماری جداگانہ قومیت کا راز یہی نظامِ مدنیت ہے اور اسلامی ریاست سے مقصود بھی اسی کا نفاذ ــــ تو کیوں نہ کانگریس کے اس اعلان سے فائدہ اٹھایا جائے کہ حصولِ آزادی پر ہندوستان میں جو وفاق قائم ہوگا۔ اس میں صوبے اس امر کے مجاز ہوں گے کہ اگر چاہیں تو مرکز سے الگ ہو جائیں لہٰذا ہم کانگریس کی تحریک آزادی میں اس کا ساتھ دیں۔ اور اگر کانگریس عملی اکثریت کے صوبوں میں ہمیں اپنی مرضی کے مطابق حکومت نہ کرنے دے تو مرکز سے الگ ہو جائیں یہ بھی ایک صورت ہو سکتی ہے اسلامی ریاست کے قیام کی۔

اس پر حضرت علامہ نے کچھ تبسم فرمایا اور کہنے لگے "لیکن تم بھول تے ہو۔ اول تو کانگریس کا یہ اعلان بجائے خود وضاحت طلب ہے۔ کانگریس کا موقف تو یہ ہے کہ ہندوستان ایک جغرافیائی وحدت ہے لہٰذا اس میں بسنے والے ایک قوم۔ مذہب افراد کا ذاتی معاملہ ہے سیاست سے بے تعلق۔ کانگریس کیسے گوارا کرے گی کہ حصولِ آزادی کے بعد اس وحدت سے کنارہ کش ہو جائے جس پر آج اسے اصرار ہے۔ اور جس کی بنا پر وہ مسلمانوں کے جداگانہ ملّی وجود سے انکار کر رہی ہے پھر صوبوں سے کانگریس کا مطلب صوبے ہیں، نہ کہ باعتبارِ مذہب ان کی الگ الگ آبادی، کہ مذہب کی بنا پر اس کا ایک حصہ دوسرے سے الگ ہو جائے۔ یا کسی ایسے نظامِ مدنیت کے نفاذ کا مطالبہ کرے جس سے دوسرے کو اختلاف ہو۔" ارشاد ہوا "صوبے مرکز سے ملحق رہیں یا بے تعلق ہو جائیں ان کا مدارِ سیاست بہر حال وہی لادینی سیاست ہوگی۔ جو محض جغرافی قومیت کی قائل اور اسے بنائے اجتماع سمجھتی ہے۔ لہٰذا نہ غیر مسلم کسی ایسے مطالبے میں جس کی بنا اسلام پر ہے مسلمانوں کا ساتھ دیں گے، نہ ان کے لیے یہ ممکن ہوگا، کہ بحیثیت مسلمان اپنے آپ کو ہندوستان سے الگ کر سکیں اگر کانگریس فی الواقعہ سمجھتی ہے کہ حصولِ آزادی پر مسلمانوں کو حق حاصل ہوگا۔ کہ اگر چاہیں تو اپنے مخصوص نظامِ مدنیت کے پیشِ نظر مرکز سے الگ ہو جائیں تو اسے آج ہماری جداگانہ قومیت سے کیوں انکار ہے؟ کیوں نہ آج ہی یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں۔ اور اس لیے سیاسی سوجھ بوجھ کا تقاضا ہے کہ ان میں باہم کوئی سمجھوتہ ہو جائے"

حضرت علامہ گفتگو کرتے کرتے تھک گئے تھے۔ انہوں نے تھوڑا دیر ستایا، پھر

فرمایا "صوبوں میں اس قسم کی جماعت بندی ضرور ہو سکتی ہے جیسی آج یونانیٹ پارٹی نے قائم کر رکھی ہے لیکن اس کی ترکیب بھی وہی ہو گی، جو اس پارٹی کی ہے یعنی مفاد پسند عناصر کا اتحاد سیاسی معاشی بنیاد پر چنانچہ اس پارٹی کے سامنے صرف زمینداروں کا مفاد ہے" ارشاد ہوا۔ ذرا سوچئے تو بھی یہ پارٹی بظاہر مسلمانوں کی نمائندگی کر رہی ہے اس میں اکثریت بھی مسلمانوں کی ہے۔ لیکن اس کے مسلمان عناصر اسلام ہی کے نام پر اسلام کی نفی کر رہے ہیں مسلمانوں کو بحیثیت مسلمان، نہ اس سے کوئی فائدہ پہنچ رہا ہے نہ تقویت۔ ہاں فائدے ہیں تو چند اہلِ غرض اور ان کی کوشش بھی یہی ہے کہ اپنی جماعت مضبوط کرتے چلے جائیں۔"

گفتگو یونانسٹ پارٹی پر آ گئی۔ سوال پیدا ہوا کہ اس پارٹی کا زور کیسے ٹوٹے گا۔ اس کے پاس حکومت ہے اور حکومت کے زور پر وہ دوسروں کو خرید بھی سکتی ہے؟ چنانچہ واقعہ بھی یہی ہے کہ یہی دو چیزیں اس کی طاقت کا راز ہیں بڑے بڑے بہی خواہانِ قوم ذاتی لالچ میں آ کر اسی کی طرف کھنچے چلے جا رہے ہیں۔

ارشاد ہوا "اگر میرا خیال غلط نہیں تو حکومت اور روپیہ ہی وہ چیز ہے جو بالآخر اس کے زوال کا موجب ہو گا۔ جیسے جیسے یونانسٹ پارٹی کی گرفت بڑھتی جائے گی ویسے ہی عامۃ المسلمین اس سے بدظن ہوتے چلے جائیں گے۔ وہ محسوس کریں گے کہ اس پارٹی کا وجود ان کی عزت اور خودداری کے راستے میں حائل ہے۔ جیسے جیسے کانگریس متحدہ قومیت کی آڑ میں اپنا دستِ تغلب دراز کریگی مسلمان خود ہی ان جماعتوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے جن کا دانستہ یا نادانستہ خیال ہے کہ ہندو اور مسلمان باہم مل کر ایک قوم بن سکتے ہیں۔ فرمایا "قوموں کی زندگی کا راز اس جدوجہد میں مضمر ہے۔ کہ اپنا وجودِ ملی قائم رکھیں اور نہیں بھولیں کہ ان کا ایک اپنا نصب العین ہے۔ لہٰذا اس موقع پر جب یہ کوشش جاری ہے کہ ہماری جداگانہ قومیت کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے، ہمیں اپنے موقف کا اعلان دلیری سے کرنا چاہیئے۔"

لہ چنانچہ حضرت علامہ کی یہ پیش گوئی حرف بہ حرف پوری ہو گئی۔

حضرت علامہ نے پھر فرمایا "درصل ہماری مشکل یہ ہے کہ ہم اپنا ملّی نصب العین صحت کے ساتھ متعین نہیں کر سکے۔ ہماری نظر زیادہ تر اخلاقی اور مذہبی مسائل پر رہی اور ہم سمجھے کہ یہی بہ مقابلہ دوسروں کے ہمارا مابہ الامتیاز ہے۔ اس میں کچھ حالات کو بھی دخل ہے۔ کچھ ہمارے زوال اور تاریخی روایات کو[1]۔ یہی وجہ ہے کہ ہم وہ قیادت پیدا نہ کر سکے جس کی آج ہمیں ضرورت ہے[2]

ایک اور اقتباس

:۔ پرویز صاحب شاید اس وقت سے جب حضرت علامہ نے کانگریس کے طرفدار علماء کی کوتاہ نظری پر اظہار افسوس کیا تھا، موقعہ کے منتظر تھے۔ انہوں نے مولانا ابوالکلام کی تفسیر قرآن کا ذکر چھیڑ دیا اور ظاہر ہے کہ نیشنلسٹ مسلمانوں کے بارے میں گفتگو ہوتی تو مولانا کا ذکر ضرور آتا۔ ان کی تفسیر اگرچہ برسوں کے انتظار[1] کے بعد شائع ہوئی تھی لیکن اس کے باوجود وہ توقعات پوری نہ ہو سکیں جو مولانا کے علم و فضل سے وابستہ تھیں بالخصوص اس لیے کہ "الاسلام بمقابلہ اسلام اور "الدین" بہ مقابلہ دین کی اصطلاحیں وضع کرتے ہوئے انہوں نے اسلام کی تعبیر ایک ایسے رنگ میں کی جس سے بجائے ایک واضح، قطعی اور محکم دستورِ حیات کے دین کی حیثیت محض ایک عقیدے، ایک نظریئے، ایک مجرد فکر اور ایک احساس کی رہ گئی۔ مولانا کے نزدیک قرآن پاک کی دعوت یہ ہے کہ جملہ مذاہبِ عالم ایک دوسرے کی سچائی کا اعتراف کریں سب اپنے اپنے مذہب کی حقیقی تعلیمات پر کاربند رہیں تاکہ وہ سب گروہ بندیاں جو شرع و منہاج کے اختلاف نے پیدا کر رکھی ہیں کالعدم ہو جائیں اور دنیا سمجھ لے کہ "الدین" یا "الاسلام" کا حقیقی مقصد کیا ہے۔ یہ مقصد ہے خدا پرستی اور نیک عملی۔ اس لیے کہ نجات و سعادت کی اساس ہے حسنِ اعتقاد کے ساتھ ساتھ توحید باری تعالیٰ کا اقرار[1]

ص ۵۲ [1] تفسیر ترجمان القرآن، ص ۱۶۱، ۱۶۲ اور جا بجا

[1] اور اس انتظار کی کیفیت تاثیر مرحوم نے کیا خوب بیان کی تھی

مولانا ابوالکلام آزاد   وہ جن کے کلام میں ہے تاثیر
سنتے تھے کہ لکھ رہے ہیں تفسیر   سنتے ہیں کہ لکھ رہے ہیں تفسیر

پرویز صاحب نے کہا وحدتِ ادیان کا یہی غلط تصور ہے جو مولانا نے اس طرح قائم کیا ہے۔ قرآن مجید کی اس تفسیر کا جو مولانا نے فرمائی اور جس سے برہمو سماج کے نقطۂ نظر کی تائید ہوتی ہے مسلمانوں کی دینی عصبیت کو تو کوئی تقویت نہیں پہنچتی مولانا کے ارشادات کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اسلام اور غیر اسلام میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہتا۔ نہ عقیدۃً نہ عملاً معلوم ہوتا ہے، ان کی ساری کوشش یہ تھی کہ مذہباً کانگریس کی حمایت کا جواز پیدا کیا جائے تاکہ ہم اپنے اس دعوے سے کہ مسلمانوں کی ایک جداگانہ قومیت ہے دستبردار ہو جائیں۔ مولانا کے عقائد، مولانا کے خیالات اور مولانا کے نظریات میں یہ تبدیلی افسوسناک بھی ہے اور تعجب انگیز بھی ——

پرویز صاحب نے کہا مولانا گویا دبی زبان سے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مذہب فرد کا ذاتی معاملہ ہے۔ قوم کا معاملہ مذہب سے الگ ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ مولانا کی تفسیر شائع ہوئی تو رسالہ معارف میں ان کے قلم سے ایک طویل تبصرہ بھی شائع ہوا تھا[۲] (یعنی پرویز صاحب کے قلم سے (چودھری حبیب احمد)

حضرت علامہ نے فرمایا "مدیر معارف[۳]" نے بھی کیا اس سلسلے میں کوئی رائے ظاہر کی؟

پرویز صاحب نے کہا شروع میں تو سید صاحب نے اس تبصرے کی بڑی تعریف کی اور ان خیالات کا اقرار بھی کیا جن کی طرف ہمیں اشارہ کیا گیا تھا لیکن تبصرے کی دوسری قسط کا وقت آیا تو انہوں نے دفعتہً اپنی رائے بدل دی۔

کیوں؟

اس عذر میں کہ مولانا کی فضیلتِ علم اور بصیرت فی الدین مسلّم ہے۔ وہ بہت بڑے سیاسی اور دینی رہنما ہیں۔ ان کے خیالات پر گرفت کی گئی تو بہت ممکن ہے۔ اور زیادہ

---

[۱] ملاحظہ ہو کانگریس کے اجلاس رام گڑھ میں مولانا کا خطبۂ صدارت اور ان کی تصنیف "انڈیا ونس فریڈم" [۲] دار المصنفین اعظم گڑھ کا علمی مجلہ

[۳] سید سلیمان ندوی مرحوم و مغفور

غلط فہمیاں پیدا ہو جائیں مصلحت یہی ہے کہ سردست خاموشی اختیار کی جائے۔
مولانا کا شاید وہ مطلب بھی نہیں جو ہم سمجھتے ہیں۔[1]

ارشاد ہوا۔ "یہ امر بڑا افسوسناک ہے کہ کسی شخص کا علم و فضل یا احترام ذات بھی حق گوئی سے باز رکھے۔ اور وہ بھی ان مسائل میں جن کا تعلق اسلام کی بنیادی تعلیمات سے ہے۔"

چند منٹ خاموشی رہی۔ شاید مولانا کی تبدیلی خیالات پر دل افسردگی کے باعث[2]
پرویز صاحب نے پھر کہا بعض لوگ کہتے ہیں قرآن پاک نے سامی ذہن کی ترجمانی کی ہے۔ ان کے نزدیک سامی ذہن قانونی ذہن ہے۔ لیکن قانون کا انکشاف تو بتدریج ہو رہا ہے اس کا تعلق ہمارے علم سے ہے عقل اور تجربے سے۔ جیسے جیسے احوال میں تبدیلی رونما ہوتی ہے۔ قانون آپ سے آپ بدل جاتا ہے۔ چنانچہ کتنے حقائق ہیں جو زمانہ حال کے اشتراکی انقلاب سے منکشف ہوئے اور جن کے پیش نظر مخالفین اشتراکیت کو بھی بعض باتوں میں اپنا موقف بدلنا پڑا۔ یوں بھی خیال ہے کہ جیسے جیسے زمانہ آگے بڑھے گا، اور بھی کئی حقائق منکشف ہوں گے۔ اور ایسا ہوا تو قانون کے بارے میں ہمارا رویہ بدل جائے گا۔ اندریں صورت کیا کہیں۔ ہماری ضرورت کیا ہے، قانون یا تصورات؟

[1] صفحہ ۵۲ یہ غلط فہمیوں کا عذر تو خیر یونہی سی بات تھی اصل حقیقت یہ ہے کہ اس وقت "ہندی قومیت" (بر بنائے اشتراک وطن) کا تصور دلوں پر چھایا ہوا تھا۔ اور مدیر معارف کا رجحان بھی اسی طرف تھا۔ اس وقت کوئی نہیں سمجھتا تھا کہ اس تصور کے مضمرات و ملتزمات کیا ہیں۔ جذبات کی شدت تھی اور عقل و فکر جذبات سے دب رہے تھے۔ ادھر مولانا نہ صرف ہندی قومیت کے قائل اور اس کے بہت بڑے داعی و علمبردار تھے بلکہ بہت بڑے عالم دین اور مذہبی پیشوا بھی لہٰذا ان کے خیالات کو زیر بحث لایا جاتا تو سمیں دو خطرے تھے۔ مولانا کے علم و فضل کا استخفاف اور اس موقف کی کمزوری کہ ہندی قومیت کے تصور کو مذہب کی تائید حاصل ہے۔ ملاحظہ ہو اس سلسلے میں ترجمان القرآن۔

---

[2] بسبب فرقہ بندی کے۔ [3] حالانکہ عملاً نہ سہی، اصولاً علامہ مسلمانوں کی قیادت فرما رہے تھے۔

پرویز صاحب کا سوال اگرچہ واضح نہیں تھا۔ انہیں شائد خیال نہیں رہا۔ وہ لفظ قانون کن معنوں میں استعمال کر رہے ہیں۔ انہوں نے اس بنیادی فرق کو بھی نظر انداز کر دیا، جو حقائق کے تصور اور ان سے تمسک میں ہے اور جس سے ہمارا ذہن قانون کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ لہذا یہ بات اگرچہ صاف نہیں تھی کہ قانون سے ان کا مطلب کیا ہے اور تصورات سے کیا، پھر بھی حضرت علامہ ان کا مطلب سمجھ گئے[1] انہوں نے فرمایا "یہ قانون اور تصورات کی بات ذرا سمجھنے کی ہے۔ بہرحال ہم آپ کی زبان میں کہہ سکتے ہیں کہ قرآن میں قانون بھی ہے اور تصورات بھی۔" حضرت علامہ اتنا کہہ کر رک گئے جیسے ذرا سستانا چاہتے ہوں۔ اور گو انہوں نے اپنے ارشاد کی کہ "قرآن میں قانون بھی ہے اور تصورات بھی" وضاحت نہیں فرمائی، لیکن میری سمجھ میں جو بات آئی، یہ کہ

---

[1] زندگی کا تقاضا ہے کوئی مثبت طرزِ عمل، اسے اوامر و نواہی کی ضرورت ہے۔ اور اوامر و نواہی سرچشمہ ہیں، شرائع یعنی آئین و قوانین کا۔ تصورات تو محض عقلی ادراک ہے کسی حقیقت کا، لیکن عمل کے لیے بے نتیجہ۔ فرض کیجئے ہم سامی اور آریائی ذہن کی تفریق پر اصرار کرتے ہیں۔ اس تفریق کو مان لیجئے تو کہنا پڑے گا کہ آریائی ذہن نے تصورات تو قائم کیے، لیکن عمل کے لیے اسے کوئی راستہ نہ ملا، بلکہ سچ پوچھئے تو عمل کی اس کے نزدیک کوئی قدر و قیمت ہی نہیں۔ سامی ذہن نے قانون پر زور دیا یعنی تصورات کی عملی ترجمانی پر۔ اوامر و نواہی عبارت ہیں اس قانون (شرع) سے جس سے باصطلاح قرآن مجید، حدود اللہ حرام و حلال اور معروف و منکر کی بنا پر اعمال و افعال کا ایک واضح اور قطعی راستہ (شریعت) متعین ہو جاتا ہے۔ لہذا حضرت علامہ کا ارشاد کہ قرآن پاک میں قانون بھی ہے اور تصورات بھی۔

آج عالم انسانی اور تہذیب و تمدن کا افسوسناک پہلو یہی تصورات پر زور ہے یہ نہیں کہ عملاً ان کی تعبیر کا کوئی راستہ تلاش کیا جائے۔ خود مسلمان بھی اس پہلو سے شریعت کی قدر و قیمت سے بے خبر ہیں۔ حضرت علامہ کہتے ہیں۔

شکوہ سنجِ سختیِ آئیں مشو ‏ ‏ ‏ ‏ از حدودِ مصطفیٰ بیروں مشو

قرآن مجید میں وہ سب کچھ ہے جس سے بیک وقت ہماری رہنمائی قانون اور تصورات دونوں میں ہوتی ہے۔ بہرکیف انہوں نے قدرے توقف کے بعد فرمایا " اس معاملے میں قابل غور امر یہ ہے کہ قرآن پاک عین فطرت ہے[۲] لہٰذا فطرۃ اللہ کا انکشاف جس پر انسان کو پیدا کیا گیا ۔ قرآن ہی کے ذریعے ہوا۔

پھر یہ فطرت اس نظام حیات ہی میں مشہود ہوئی جس کو اس نے دین کہا ہے[۲] اور دین کا تقاضا ہے وہ اعمال و عقائد جو ہر پہلو سے زندگی کو سہارا دے رہے ہیں اور جن کو اصطلاحاً شریعت سے تعبیر کیا جاتا ہے[۳] لہٰذا ہم کہیں گے قرآن پاک میں قانون بھی ہے اور تصورات بھی۔ گو انسان کو تصورات کی اتنی ضرورت نہیں جتنی "قانون کی"۔

ارشاد ہوا" یہ انسان کی عقل، اس کا تجربہ اور مشاہدہ ہے جس میں قرآن مجید کا قانون

---

[۲] نیچر (NATURE) کے معنوں میں نہیں جو سائنس کا ایک خود ساختہ مفروضہ ہے۔ اور جس کے پیش نظر حامیان مذہب عالم کائنات کو صحیفۂ قدرت ٹھہراتے ہوئے اکثر اس سے استشہاد کیا کرتے ہیں چنانچہ کہا جاتا ہے اسلام "دین فطرت" ہے۔ ان معنوں میں کہ اس نے ہمیں فطرت کے مطابق زندگی گزارنے، یعنی عالم کائنات (فطرت) پر نظر رکھنے اور قوانین فطرت کے اتباع کا سبق دیا۔ ہمیں معلوم ہے سرسیّد نے اس طرز فکر پر بالخصوص زور دیا تھا، اور یہی وجہ ہے کہ ان کے مخالفین نے انہیں نیچری کہا۔ اور ان کے مذہبی غور و فکر کے لیے نیچریت کی اصطلاح وضع کی۔

[۱] فطرۃ اللہ التی فطرۃ الناس علیہا۔ ۳۰ (الروم) [۲] فاقم وجھک للدین حنیفا فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیہا ط لا تبدیل لخلق اللہ ط ذالک الدین القیم و اکثر الناس لا یعلمون۔ ۳۰ (الروم) : ۳۰ — [۳] شرع لکم من الدین ما وصی بہ نوحًا ..... ان اقیموا الدین ولا تتفرقوا فیہ ط ۔ ۴۲ (الشوریٰ) : ۱۳

[۵۶] [۱] ذالکم خیر لکم ان کنتم تعلمون ۲۹ (العنکبوت : ۱۶

[۲] و لقد خلقنا السمٰوٰت والارض وما بینہما فی ستۃ ایام وما مسنا من لغوب ۵۰ (ق) : ۳۸

حیات منکشف ہو رہا ہے اور ہوتا رہے گا ۵۔ لیکن وہ ہے تو اس میں تمام و کمال موجود ـــــ جب ہی تو قرآن پاک نے دعویٰ سے کہا " فاتو بسورۃ من مثلہ ؕ ۶ ، یہ دوسری بات ہے کہ نفسِ متناہیہ اُسے اپنے احوال اور استعداد ہی کے مطابق سمجھ سکتا ہے۔ فرمایا " فردکی صورت میں تو خطا و صواب کا امکان یکساں ہے۔ اس کا فہم غلطی بھی کر سکتا ہے، لیکن فرض کیجئے ذہنِ انسانی اس فطرت کا تمام و کمال احصار بھی کرے جو قانون اور تصورات دونوں کا سرچشمہ ہے۔ جب بھی ہمیں قرآن پاک سے ہی رجوع کرنا پڑے گا۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہمارے علم و عقل کو ان مصلحتوں کا اعتراف ہے جو احکام شریعت میں مضمر ہیں ۷

ارشاد ہوا " اس طرح کی گفتگو کہ ایک ذہن سامی ہے ایک غیر سامی، ایک دائرہ مذہب کا ہے ایک تہذیب و تمدن کا، بڑی غلط اور انتشارِ خیال کا باعث ہوتی ہے۔ نہ ذہن کسی سامی یا آریائی امتیاز کا پابند ہے، نہ یوں مسائل کو صحیح شکل میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ مگر لوگ ہیں کہ بغیر سوچے سمجھے جو جی میں آتا ہے کہتے چلے جاتے اور آخر الامر اپنے ہی خیالات کی تاریکیوں میں کھو جاتے ہیں۔" یہ کہکر حضرتِ علامہ نے تھوڑی دیر کے لیے سکوت فرمایا، پھر پرویز صاحب سے خطاب کرتے ہوئے کہا " قرآن پاک کا مطالعہ کیجئے تو اس کا مقابلہ دوسرے مذہبی صحائف سے بھی کرتے جائیے۔ یوں اس کا فہم زیادہ آسان ہو جائے گا۔" فرمایا عہد نامہ عتیق میں ہے " خداوند نے زمین و آسمان چھ دنوں میں پیدا کیا۔ ساتواں دن خداوند کے آرام کا تھا۔ اس کے مقابلے میں قرآن مجید کا ارشاد ہے کہ بے شک زمین و آسمان کی پیدائش چھ دن میں ہوئی مگر اللہ تعالیٰ کو آرام کی ضرورت پیش نہیں آتی ۲ ؎

---

۴ آدم کو ثبات کی طلب ہے۔ دستور حیات کی طلب ہے

۵ سنریہم آیاتنا فی الآفاق و فی انفسہم حتیٰ یتبیّن لہم انہ الحق ۵۳ (حم السجدہ) ۵۳

۶ ایسی کوئی سورۃ لاؤ ــــ ۲ (البقرہ) : ۲۴

۷ ہر کتاب کا ایک موضوع ہوگا۔ قرآن مجید کا بھی ایک موضوع ہے جس کا احاطہ اس نے ہر پہلو سے بہ حسن و خوبی کر دیا ہے مگر پھر لفظ کتاب کے اور بھی تو کئی معنی ہیں مثلاً فرض، حکم، قانون ان سب کا لحاظ رکھ لیجئے تو بطور ایک کتاب قرآن مجید کے اور بھی کئی لطیف پہلو سامنے آجائیں گے۔

فرمایا یہ لفظ خداوند بھی بڑا غور طلب ہے ۲؎ پھر فرمایا ایسے ہی ہندو اور بدھ دھرم کے نظ
ہیں۔ مثلاً مایا اور آنند ۳؎ قرآن مجید نے ان کے برعکس حقیقت اور فلاح پر زور دیا ہے۔

فٹ نوٹ

ص۵۶ ۳؎ اس لیے کہ خداوند اسم ذات نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسم ذات کی تلاش
میں اب عیسائیوں کے ایک فرقے نے یہواہ (JEHEYA) کا لفظ استعمال کرنا شروع
کر دیا ہے۔

۴؎ مایا بمعنی فریب، التباس، نمود۔ ویدانت فلسفہ کی اصطلاح میں عالم محسوسات
کی کثرت ایک فریب ہے جس نے اصل حقیقت پر پردہ ڈال رکھا ہے۔ اصل حقیقت ایک
ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ بسبب مایا (جہالت) ہمیں اس کا ادراک نہیں ہوتا۔ لیکن
اس پر ایک ہندو فلسفی یوں رائے زنی کرے گا کہ بے شک عالم کائنات "مایا" ہے۔
کیونکہ اس میں اصل حقیقت چھپ گئی ہے۔ لیکن جہاں تک اصل حقیقت کے اظہار
کا تعلق ہے مایا ہی حقیقت ہے کہ اس میں اس کا اظہار ہو رہا ہے۔ آنند۔ روحانی
کیف و سرور کی انتہائی کیفیت، جس میں شاہد و مشہود کا امتیاز ختم ہو جاتا ہے

میں نے عرض کیا فرض کیجیے، ہمیں صحائف مذہبی کے تقابلی مطالعے کا موقع نہیں
ملتا۔ اندریں صورت کیا ہم اس ہدایت سے محروم رہیں گے جو ہر اعتبار سے قرآن
پاک میں موجود ہے؟ ارشاد ہوا "ہرگز نہیں قرآن سرتاسر ہدایت ہے اور ہر حال
میں ہمارا رہنما۔ یہ کتاب اللہ ہے اور لفظ کتاب غور طلب ہے ۱؎" اس پر معلوم
نہیں کس نے کہا کہ اگر یہ ٹھیک ہے کہ علم اور تجربے کی روشنی میں بھی دی حقائق
آشکار ہو رہے ہیں جن کی طرف قرآن پاک نے اشارہ کیا تو کیا دہریت سے بھی
کچھ حقائق منکشف ہوئے؟ اشتراکی روس کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ فرمایا
کیوں نہیں، مگر ایک حد تک پھر یہ حقائق بھی کچھ ایسے نہیں جن کے متعلق کہا
جائے کہ ان کا انکشاف اس سے پہلے نہیں ہوا۔ ہماری اپنی تاریخ ہی سے اس کی
تصدیق ہو جائے گی"۔ ۲؎

فرمایا "بات اصل میں یہ ہے کہ قرآن مجید قلب کے راستے سے بھی شعور میں داخل ہوتا ہے اور دماغ کی راہ سے بھی سمجھ میں آتا ہے۔ دماغ کی راہ سے سمجھ میں آنے کا مطلب ہے حقائق کا ادراک علم اور فکر، تجربے اور مشاہدے کی روشنی میں" ارشاد ہوا "حقائق کا ادراک ہمیشہ سے جاری تھا کبھی ایک حقیقت سمجھ میں آئی کبھی دوسری، کبھی جزواً، کبھی تماماً۔ اب اگر انسان وہ تمام حقائق جو اُس نے اپنے علم اور تجربے کی روشنی میں حاصل کئے یا جن تک عقل اور فکر کے ذریعے اسکی رسائی ہوئی باہم فراہم کرے اور ایک مربوط و منظم شکل میں پیش کرے تو اُن سے قرآن پاک ہی کے ارشادات کی تصدیق اور ترجمانی ہو گی۔"

حضرت علامہ نے قدرے توقف فرمایا پھر ذرا سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ تکیوں کا سہارا لیا، حقے کے دو ایک کش لگائے اور کہنے لگے۔ "حقائق کا ادراک ہوتا رہا اور ہوتا رہے گا۔ قرآن مجید ان سب حقائق کا جامع ہے جو ہمارے ادراک میں آ چکے ہیں اور ان کا بھی جن کا ادراک باقی ہے خواہ یہ حقائق سنوسی کی زبان سے ادا ہوں، خواہ لینن کی۔[1] حقائق بہر حال حقائق ہیں ان کو سمجھنے کی جس طرح بھی کوشش کی جائے، اپنی جگہ پر ٹھیک ہے مقصد ہے ان کا سمجھنا اور قبول کرنا۔ لہٰذا انہیں جس طرح بھی سمجھیں یہ قرآن پاک ہی کا سمجھنا ہو گا۔ اسی تعلیم سے بہرہ ور ہونا۔"

فرمایا "قرآن پاک جس زمانے میں نازل ہوا اس کا خطاب اہلِ کتاب ہی سے ہو سکتا

---

[1] مثلاً روسی انقلاب ہے کہ حضرت علامہ نے جاوید نامہ میں اہل روس سے بزبانِ افغانی فرمایا:۔

چیست قرآں خواجہ را پیغامِ مرگ	دستگیرِ بندۂ بے ساز و برگ
ہیچ خیر از مردکِ زرکش مجو	لن تنالوا البر حتٰی تنفقوا
باسیہ فاماں یدِ بیضا کہ داد	مژدۂ لا قیصر و کسریٰ کہ داد
آب و نانِ ماست از یک مائدہ	دودۂ آدم کنفسٍ واحدہ

صفحہ ۵۹ [2] امم قدیمہ کا قاعدہ تھا کہ حقائق کو افسانوں کا جامہ پہنا دیتیں حتیٰ کہ فکر و فلسفہ کی دنیا میں بعض حقائق کی تشریح افسانوں کی شکل میں کی جاتی چنانچہ افلاطون کا یہ عام

تھا۔ دیکھ لیجئے اس نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے کس دعوے سے کہا مصدقاً لما معکم
یہ اس لیے کہ قرآن مجید نہ صرف حقائق کا جامع ہے بلکہ اس کی تصدیق کا بھی واحد ذریعہ ہے
فرمایا "کبھی ایک حقیقت زرتشت کو ملی، دوسری بدھ کو، ایسے ہی اور بھی حقائق
ہیں وہ انسان کے فہم وادراک میں آتے رہے، خواہ کسی راستے سے، لیکن پھر حقائق
کے ساتھ افسانے بھی شامل ہوتے گئے۔ اور یہ ایک قدرتی تقاضا تھا اس مرحلے کا جس
سے ذہن انسانی کا گزر ہو رہا تھا۔ لہذا جیسے جیسے کسی قوم نے کسی حقیقت مانا، ویسے ہی
کوئی افسانہ بھی قبول کر لیا۔ لیکن افسانوں کو تو افسانہ ہی سمجھنا چاہیئے۔ انہیں حقیقت پر
پر محمول کرنا غلطی ہے۔ افسانے ہمارے دل و دماغ کی اختراع ہیں۔ ان کو وضع کیا گیا
تو کسی مطلب کے لیے[2] یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک نے جہاں حقائق کی تصدیق کی، وہاں
افسانوں کو نظر انداز کر دیا۔ اور اگر نہیں بھی کیا تو اس حد تک ترمیم اور قطع و برید کے
ساتھ کہ ان سے جن حقائق کی ترجمانی مقصود ہے ان کی طرف واضح طور اشارہ ہو
جائے۔" ارشاد ہوا "مثال کے طور پر آدم وحوا کا افسانہ ہے۔ قرآن مجید نے اس کے
بیان میں ایک نیا انداز اختیار کیا[3]"

انداز تھا وہ کسی حقیقت کو بیان کرتے کرتے اس کا خاتمہ بالعموم کسی افسانے پر کرتا ہے لیکن یوں ہوتا یہ ہے
کہ حقیقت نظر انداز ہو جاتی، افسانہ باقی رہ جاتا[2] عارف رومؒ کا ارشاد ہے

اے برادر قصہ چوں پیمانہ ایست — واندرو معنی بہ شالِ دانہ ایست

[1] جو کہ تمہارے پاس ہے اس کا مصدق — ۲ (البقرہ) ۱ صفحہ ۵۹
[2] کہ ہم کوئی بھی اصول قائم کریں اس کی تصدیق قرآن پاک ہی کی بدولت ہوگی۔ یعنی
اس راستے پر چل کر جو اس کے حصول میں قرآن پاک نے ہمارے لیے تجویز کیا۔
ص۵۹[3] دیکھئے خطبات میں (خطبہ چہارم) اس قدیم بابلی اسرائیلی روایت کی تشریح حضرت علامہ
کے قلم سے[4] وما خلقنا السموٰت والارض وما بینہما لٰعبین — ۲۱ (الانبیاء) ۱۶
[5] — دام لیلا

ہم سب خاموشی سے حضرت علامہ کے ارشادات سن رہے تھے۔ انہوں نے پھر فرمایا "مگر لطف بات یہ ہے کہ قرآن کسی افسانے کا ذکر نہ بھی کرے جب بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا اشارہ کسی افسانے کی طرف ہے مثلاً قرآن میں ہے ہم نے کائنات کو کھیلتے ہوئے پیدا نہیں کیا۔ اسی سے ہمارا ذہن خود بخود اس افسانے کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جو ہندوؤں میں رائج ہے اور جس سے یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ دنیا کیا ہے؟ ایک کھیل جسے رام نے اپنی دل لگی کے لیے رچایا[۵]۔"

فرمایا "ہندوؤں کے یہاں ایک دیوتا ہے جس کا نام (نٹ راجن) یعنی کھلاڑیوں کا راجہ — وہ اسکی مورتی بھی تیار کرتے ہیں تو اس طرح جیسے یہ دیوتا راگ رنگ میں مشغول ہے[۵]۔" ارشاد ہوا "ایسے ہی صفاتِ باری تعالیٰ کے ذکر میں جب قرآن یہ کہتا ہے لا تاخذہ سنۃ ولا نوم[۱] صفحہ ۶۰ تو بے اختیار ہندوؤں کا یہ قول یاد آجاتا ہے کہ کائنات برہما کا خواب ہے۔ ادھر اس کی آنکھ کھلی اور ادھر یہ خواب پریشاں ہو گیا۔ فرمایا ہمارے ہاں بعض صوفیاء نے بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے"[۲]۔

ذرا آگے چلکر سلسلۂ کلام نبوت پر آگیا "نبوت سے مقصود ہے، فرد کی تربیت ذات اور فرد اور جماعت کی رہنمائی مدارجِ کمال کی طرف ارشاد ہوا۔" جہاں تک فرد کی ذات اور معاشرے کی تہذیب و ترقی یا دوسرے لفظوں میں معراجِ انسانیت کا تعلق ہے یہ مقصد حضور رسالت مآب صلعم کے اتباع ہی سے حاصل ہو گا[۱]۔ البتہ یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ کوئی بھی نصب العین ہو، اس کے لیے یقین کامل شرط ہے۔ یقین نہیں تو عمل بھی نہیں۔ نہ آرزو، نہ ولولہ، نہ جدوجہد۔ شعورِ نبوت کو تو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس میں زمانے کی ساری وسعتیں سمٹ کر ایک نقطے پر آجاتی ہیں۔ ماضی و حال اور مستقبل کا امتیاز قائم نہیں رہتا۔ لہٰذا ہمارے لئے جو بات آنیوالی ہوتی ہے شعورِ نبوت کو

---

[۱] صفحہ ۶۲ دیکھئے اس سلسلے میں رموزِ بے خودی کے ابواب رسالت تا ادب باادب محمدیہ۔ اور حفظِ روایاتِ ملیہ بالخصوص۔

[۵] ایک گول چکر میں ٹانگوں اور ہاتھوں کو یوں چکر دیکر پھیلاتے ہوئے جیسے مورتی حرکت کرتی ہے۔

کو پہلے ہی سے اس کا علم ہوتا ہے، اس طرح جیسے اس کا ظہور ہو رہا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ انبیا علیہم السلام ہر حقیقت اور ہر صداقت کو اپنے سامنے عیاں دیکھتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وحی الٰہی میں ان کے یقینِ کامل کی، لہٰذا جس علم کا سرچشمہ ہے وحی الٰہی اس میں یقین ہی ہوگا۔

اس کے برعکس عقل اور فکر کی دنیا ہے کہ ہم اس میں قدم بہ قدم آگے بڑھتے ہیں اس میں اثبات کے ساتھ نفی اور یقین کے ساتھ ظن کا پہلو قائم رہتا ہے۔ فلسفہ نام ہے انسان کی دماغی کاوشوں کا۔ لیکن یہ کاوشیں آخر انسانی ہیں۔ ان میں یقین کا رنگ پیدا نہیں ہو سکتا۔ بالخصوص وہ یقین جسے ہم علم الیقین، حق الیقین اور عین الیقین سے تعبیر کرتے ہیں۔ فکر میں یقین کا رنگ پیدا ہوگا تو وحی الٰہی کی بدولت کہ اس کی رہنمائی میں آگے بڑھے۔ ارشاد ہوا" یہ رہنمائی ازل سے ہماری فطرت میں ودیعت ہے[۱]۔

تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ حضرت علامہ کو آرام کی ضرورت تھی۔ انہوں نے پاؤں پھیلا کر تکیوں پر ٹیک لگائی۔ مولانا حضرت علامہ کی تائید میں کچھ کہہ رہے تھے کہ پرویز صاحب نے کہا قرآن کریم میں ہے ایک وقت آئے گا، جب لوگ اپنے رب کی طرف دوڑتے ہوئے جائیں گے[۲]۔ جب تیرا رب اور ملائکہ صف بہ صف آئیں گے[۳]۔ جیسے خدا زمین پر اتر آئے گا۔ جب زمین تیرے رب کے نور سے جگمگا اٹھے گی[۴]۔ ان آیات کا اشارہ کس حقیقت کی طرف ہے۔ کیا اس خاکدان میں ابھی کوئی اور کھیل کھیلا جائے گا؟ پرویز صاحب کے

---

[۱] صفحہ ۵۹، ۶: "اسے نیند آتی ہے نہ اونگھ" ۔۲ (البقرۃ) : ۲۵۵

[۲] گو صراحت نہیں فرمائی البتہ میرا ذہن مرمد کے اس شعر کی طرف منتقل ہو گیا ۔

شور شد و ز خواب عدم چشم کشودیم   دیدیم کہ باقیست شب فتنہ غنودیم

[۱] ربنا الذی اعطی کل شئ خلقہ ثم ھدی ۔ ۲۰ (طٰہٰ) : ۵۰ [۲] فاذا ھم من الاجداث الی ربھم ینسلون ۔ ۳۶ (یٰسین) : ۵۱ [۳] وجاء ربک والملک صفا صفا ۔ ۸۹ (الفجر) : ۲۲

صفحہ ۶۳ [۴] واشرقت الارض بنور ربھا ۔ ۳۹ (الزمر) : ۶۹

[۲] مثلاً یہ کہ عہد نبوت ختم ہو چکا ہے لہٰذا شریعت اسلامیہ منسوخ ہو گئی

[۳] یوم تبدل الارض غیر الارض والسموات ۔ ۱۴ (ابراہیم) : ۴۸

س سوال کو ہم نے بڑی دلچسپی سے سنا اور منتظر تھے کہ حضرت علامہ اس کے جواب میں کیا
رماتے ہیں ..... بالخصوص اس لیے کہ ہمیں معلوم ہے ملاحدہ کے علاوہ بعض فلاسفۂ اسلام نے
ی ان آیات کی تاویل بڑے غیر اسلامی رنگ میں کی ہے حتیٰ کہ بابیوں اور بہائیوں نے تو
یں عجیب و غریب معنی پہنائے ہیں کہ حضرت علامہ کوئی جواب دیتے نہیں پائے تھے کہ
ویز صاحب نے پھر کہا، قرآن پاک نے یہ بھی کہا ہے کہ جس روز یہ ارض و سما بدل کر کچھ اور ہو
ئیں گے۔ ہم ان آیات کا مطلب کیا سمجھیں؟

حضرت علامہ نے فرمایا "یہ ارض و سما، یہ بلندی و پستی، یہ جو کچھ بھی ہے ہم اس کا ادراک
نے شعور ہی کے ذریعے کرتے ہیں، ان کا تصور ہمارے شعور کے تابع ہے جس روز یہ شعور
لا ارض و سما بھی بدل جائیں گے۔ قرآن پاک کا خطاب ہمارے شعور ہی سے تو ہے
ہیں ہیں جن کو کوئی حقیقت سمجھائی جا رہی ہے۔" ارشاد ہوا "سردست ہم اپنے
تقا کی ایک منزل میں ہیں۔ اس سے آگے جو منزل ہے ہمیں قدم رکھا تو شعور کی تبدیلی
یہ ارض و سما بھی بدل جائیں گے معلوم نہیں اس وقت ارض کیا ہو اور سما کیا۔ جب ہی تو
مایا، جس روز یہ ارض و سما کچھ اور ہو جائیں گے

فرمایا "شعور میں بھی تو ارتقا جاری ہے اور ارتقاء کا تقاضا یہ ہے کہ زمان و
ان کے ابعاد ختم ہو جائیں۔" ارشاد ہوا "خواب میں یہ ابعاد اکثر ختم ہو جاتے ہیں
ل کا واقعہ ثانیوں میں رونما ہوتا ہے مسافتوں کا پتہ نہیں چلتا جیسے ان کا وجود
ی نہیں۔" فرمایا "میں یہ سب کچھ مثالاً کہہ رہا ہوں ورنہ کیا معلوم شعور کے ارتقا سے
اکیا تبدیلیاں مترتب ہوں" پھر فرمایا "ان آیات میں جن حقائق کی طرف اشارہ کیا گیا ہے
ن کا فہم تو آسان ہے لیکن غلطی یہ ہے کہ ہم ان کی تاویل شعور کے اس مرحلے کی رعایت سے

---

1 ابن حزم کی طرح حضرت علامہ بھی تاویل کے قائل نہیں تھے جیسا کہ اس کا عام مفہوم
ہ مولانا روم فرماتے ہیں سو کردۂ تاویل حرف بکر را خویش را تاویل کن نے ذکر را
تاویل کے معنی ہیں رجوع الی الاصل۔ جو تاویل اصل سے ہٹ گئی، وہ تاویل نہیں ہے۔
2 چنانچہ مولانا محمد علی ساحران دربارِ فرعون کی مثال پیش کرتے ہوئے شہنشاہیت پر
ڑا دلچسپ تبصرہ فرمایا کرتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے شہنشاہیت کی روحِ جبر و استبداد
ا اندازہ اس امر سے کیجیے کہ جب ساحروں نے کہا ہم موسیٰ اور ہارون کے رب پر ایمان لائے

کرتے ہیں جس سے سر دست ہمارا گزر ہو رہا ہے۔ حالانکہ تاویل سے مقصود کسی حقیقت کو سمج
اور اس کی تہ تک پہنچنا ہے۔" ارشاد ہوا "تاویل اور موضوعِ تاویل میں لازم و ملزوم ک
تعلق ہے۔ ایک منطقی، حقیقی اور واقعی رشتے کا تعلق، یہ نہیں کہ ہم اسے اپنے ہی خیالا
اور مزعومات کی تائید کا ذریعہ بنائیں۔"

جاوید نامہ کا ذکر آگیا۔ پرویز صاحب نے کہا دربارِ فرعون کے ساحر کیسے پختہ ایمان کے
فرعون کے جبر و استبداد کا جواب ان کی پختہ ایمانی سے بڑھ کر اور کیا ہو گا۔ آپ نے انہیں
جاوید نامہ میں کوئی جگہ نہیں دی۔

فرمایا "جاوید نامہ میں بہت سی باتوں کا ذکر رہ گیا۔ میرا تو جی چاہتا تھا سید احمد بریلوی
اور سید احمد دہلوی[۳] کی روحوں کو بھی ہمیں جمع کر دوں لیکن خیال نہ رہا۔ علاوہ اس کے
اور بھی کئی باتیں میرے ذہن میں ہیں بلکہ میں نے بطور یادداشت کہیں لکھ بھی رکھی ہے
ملا تو ان کا ذکر بھی کر دیا جائے گا۔"

نیٹشے اور برگسان کی باتیں ہونے لگیں۔ شاید اس لیے کہ کل کے جلسوں میں جو مقالے
پڑھے گئے ان میں نیٹشے اور برگساں کا ذکر آیا۔ ارشاد ہوا "میرے اور نیٹشے کے نقطہ نظر
میں بنیادی فرق ہے۔ نیٹشے کی طبیعت پر مادیت پسندی کا غلبہ تھا۔ اس نے ہستی باری تع
کا انکار کیا اور اس انکار سے خودی کا انکار لازم ٹھہرا۔ وہ خودی کا منکر ہے۔ خودی
کے نزدیک مابعد الطبیعاتی حقیقت نہیں۔ اس کا فوق البشر بھی قدیم یونانی سورماؤں کا نمو
ہے وہ ہمیشہ کسی آنے والے کا خواب دیکھتا ہے۔ یہ مجوسی خیالات کا اثر ہے۔ گو تعجب
ہے کہ مجوسیت سے اثر پذیری کے باوجود اس زمانے کی حقیقت سے کیوں انکار ہے۔ ہندو
اور یونانیوں کی طرح زمانے کی حرکت بھی اس کے نزدیک دوری ہے اور نتیجہ یہ کہ ہر چیز

بقیہ حاشیہ:- تو فرعون نے کہا تم بغیر میرے حکم کے کیسے ایمان لے آئے۔ تم اور یہ جرأت
۳۔ سر سید احمد خان ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ حضرت علامہ جو دواوین اشعار شائع کرتے خا
قطع و برید اور ترمیم و تنسیخ کے بعد ایسے ہی بعض نامکمل عنوانات حذف کر دیے۔ اس امید میں کہ آیندہ ترتیب
میں مکمل ہو جائیں گے۔

یاد آتی رہتی ہے [1]" فرمایا "نیٹشے کی ساری خوبی ذاتِ انسان کے لیے اس کے ذوق و شوق اس کے سوز و ساز اور جذب و گداز میں ہے [2] افسوس اسے کوئی مردِ کامل نہ ملا۔"

ارشاد ہوا، "تصوّف بھی اب چند رسمی باتوں میں محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ صوفیاء خود بھی نہیں جانتے انہیں ماضی سے کیا ورثہ ملا۔" فرمایا۔ تصوّف کیا ہم فکر و فرہنگ ادب اور فن سب سے بے خبر ہیں" اور حضرت علامہ کا یہ ارشاد تھا بھی ٹھیک اس لیے کہ نیٹشے اور برگساں کے سلسلے میں اُن کے افکار کی جو تنقید کی جاتی، اس کا انداز یا تو مناظرانہ ہوتا، یعنی محض بحث برائے بحث، یا مغرب سے مرعوبیت کے باعث تنقید نگار سمجھتا کہ افکارِ حاضرہ مغرب ہی کا اجارہ ہیں [3] یا پھر اسلامی علم و حکمت اور معارف سے بے خبری [4] کہ ہماری درسگاہوں میں تعلیم و تربیت کا انداز ہی یہ ہے کہ تعلیم یافتہ طبقے کے دل و دماغ یورپ کے خود ساختہ سانچے میں ڈھل جائیں وہ اس سے باہر کچھ سوچ ہی نہیں سکتے [5] ارشاد ہوا "خیال تو ایک ہی ہوتا ہے مگر زمانہ ہے کہ اپنے اپنے ذوقِ حیات اور احوال کے مطابق اسے مختلف شکلوں میں پیش کرتا ہے ہمیں اس نکتے کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔"

۱۔ اشارہ ہے نیٹشے کے عقیدہ رجعت ابدی کی طرف

۲ ؎ نہ جبریلے نہ فردوسے نہ حورے نے خداوندے   کفِ خاکے کہ می سوزد زجانِ آرزومندے

---

۳ ؎ چنانچہ ایک صاحب کاغذوں کا ایک طومار لیے پھرتے تاکہ وہ دکھا سکیں کہ اقبال کا اپنا تو کوئی خیال تھا نہیں لیکن اس کا ہر خیال اپنا ــــ عجمی تصوف کی مخالفت سے بھی اس خیال کو تحریک ہوئی کہ خودی کا سرچشمہ ہے مغرب کی مادیت پسندی۔ لہٰذا مستشرقین کی طرح مخالفین نے بھی محسوس کیا کہ اگر خودی اور زمانے کے تصوّرات کو نیٹشے اور برگساں کی خوشہ چینی کا نتیجہ قرار دیا جائے تو یہ نسخہ بڑا کارگر ثابت ہو سکتا ہے۔   یوں بھی قاعدہ ہے کہ دنیائے فکر و فرہنگ میں جب کسی قافلے کا ظہور ہوتا ہے تو اس کے خلاف ایک دنیا اٹھ کھڑی ہوتی ہے اور کوشش کی جاتی ہے کہ اس کے نبوغ و فطانت اور ندرتِ فکر سے انکار کیا جائے۔

پھر فرمایا "خودی ہے، یا نہیں ہے یہ ایک بنیادی مسئلہ ہے جسے ہر تہذیب اور ہر مذہب نے چھیڑا ہے۔ اثبات ہے تو اسکی کوئی شکل ہوگی۔ نفی ہے تو کوئی شکل۔ یہی معاملہ نِطشے کا ہے۔ اس نے کوئی نئی بات نہیں کہی۔"

برگسان کے متعلق فرمایا "یورپ کے لیے برگسان کا نظریہ نیا ہو، عالم اسلام کے زمانے کی بحث کوئی نیا مسئلہ نہیں اسلامی الٰہیات، حدیث و قرآن اور فلسفہ کا مطالعہ کیجیے تو میری بات کی تصدیق ہو جائے گی[۳]"

ارشاد ہوا "کیمبرج کے زمانۂ طالب علمی میں جب میں نے اس موضوع یعنی زمانے کی حقیقت پر ایک مقالہ لکھا تو میرے استاد ڈاکٹر میکٹیگرٹ نے اسے دیکھا، مگر اسقدر ناپسند کیا کہ میں نے دل برداشتہ ہو کر اسے تلف کر دیا لیکن تھوڑے ہی دنوں میں جب برگسان نے اس موضوع پر ویسے ہی اظہار خیال کیا اور اس کے نظریے کی اشاعت ہونے لگی تو میکٹیگرٹ کو بڑا دکھ ہوا۔ اس لیے کہ برگسان نے بھی کم و بیش وہی نظریہ قائم کیا تھا جسے پہلے میں اپنے مقالے میں پیش کر چکا تھا۔" فرمایا "میکٹیگرٹ نے مجھ سے کہا افسوس ہے میں نے اپنا فریضۂ استادی ادا نہیں کیا میں نے تم پر بڑا ظلم کیا کہ ایک بہت بڑے کارنامے سے محروم کر دیا۔ مجھے بھی رنج تھا کہ میں نے اپنا

---

[۲] ورنہ کیوں کہا جاتا کہ امام شافعی کے قول "الوقت سیف" کی فلسفیانہ تعبیر (دیکھیے اسرار خودی) کو ان کے زہد و ورع سے کیا تعلق؟ یہ کوئی بڑا ہی انوکھا زہد و ورع ہے کہ امام شافعی زمانے کے باب میں غور و فکر سے گریز کرتے۔ ثانیاً انہوں نے "الوقت سیف" کہا تو ہے اور اس سے ان کا کچھ مطلب بھی ہوگا۔ لہذا اس قول کی فلسفیانہ تعبیر سے اگر انکے زہد و ورع پر حرف آتا ہے تو اس قول کی وہ کیا تعبیر ہے جو ان کے زہد و ورع کے مطابق ہو؟

[۳] اور یہ وہ صورتِ حالات ہے جس میں اب تک کوئی نمایاں تغیر نہیں ہوا۔

مقالہ کیوں تلف کر دیا[1]

میکٹیگرٹ کے ذکر سے اس کی دہریت زیر بحث آگئی۔ پرویز صاحب نے کہا اتنا بڑا فلسفی اور دہریہ ۔ اس کی وجہ کیا تھی ۔۔۔؟

ارشاد ہوا " دہریت کی بھی ایک نہیں کئی شکلیں ہیں ویسے ہی اس کے الگ الگ باب ہیں۔ فرمایا، ایک اہل سائنس کی دہریت ہے اُن کی نظر مادے اور اس کے شیون سے آگے نہیں بڑھتی۔ ایک اہل فلسفہ کی کہ اپنے فکر کی نارسائیوں میں گم ہیں۔ ایک عام دنیادار کی۔ میکٹیگرٹ کا معاملہ ان سب سے مختلف تھا۔ اس نے ہستی باری تعالٰی سے انکار کیا تو اس لیے کہ اسے مسیحیت کا شخصی خدا[2] پسند تھا نہ فلسفہ کا واجب الوجود[3] وہ دونوں سے بیزار تھا۔

حضرت علامہ نے جب یہ فرمایا " وہ دونوں سے بیزار تھا، فلسفہ کے واجب الوجود اور مسیحیت کے شخصی خدا دونوں سے" تو معلوم نہیں کیسے میری زبان سے یہ الفاظ نکل گئے خدا خود ایسے خداؤں سے بیزار ہے۔ اس پر حضرت علامہ تو مسکرا دیے۔ پرویز صاحب نے البتہ قہقہہ لگایا اور کہا بہت خوب، لا الہ الا اللہ

---

[1] دیکھیے اس سلسلے میں راقم الحروف کی کتاب (NOTES ON NIETZSCHE) جو اقبال اکیڈمی کے زیر اہتمام شائع ہو رہی ہے

[1] یہ ایک ثبوت ہے حضرت علامہ کی آزادئ فکر کا [2] (PERSONAL GOD)

[3] NECESSARY BEING

[4] دیکھیے اس سلسلے میں حضرت علامہ کا مضمون میکٹیگرٹ پر جو ان کے مضامین اور تحریروں کے مختلف مجموعوں میں شائع ہو چکا ہے علیٰ ہذا خطبات، دوسرا خطبہ

میکٹیگرٹ دونوں سے بیزار تھا مسیحیت کے شخصی خدا سے اس لیے کہ خدا کو شخص کہنا تجسیم ہے اور تجسیم الوہیت کی نفی۔

ثانیاً مسیحیت نے اس پر بس نہیں کی کہ اُسے شخص ٹھہرایا۔ اس نے خدا کو شخص واحد مان کر اس شخص واحد کے تین شخص کر دیے۔ باپ، بیٹا، روح القدس: اقانیم ثلاثہ، لہذا

یہ ایک تاریخی اور علمی نشست تھی جس میں یہ تذکرہ اصحاب شریک مجلس تھے آپ دیکھ رہے ہیں کہ پرویز صاحب قرآن کے رموز و نکات سمجھنے کے لیے حضرت علامہ سے کسقدر دقیق استفسارات کر رہے ہیں اور حکیم الامت اپنے حکیمانہ، عالمانہ، اور استادانہ انداز میں اپنی قرآنی بصیرت کے مطابق کس حسن و خوبی سے جوابات ارشاد فرما رہے ہیں۔ آپ نے یہ بھی دیکھ لیا کہ علامہ کی صحبت میں جو حضرات باریاب ہیں، وہ، وہ ہیں جو ملائی حلقوں میں مطعون و مردود ٹھہرائے گئے ہیں لیکن حکیم الامت رح قرآن شناس اقبال رح انہیں کس عزت و احترام سے تشریف لانے کے لیے کہتے ہیں اور فرماتے ہیں انکو اجازت کی کیا ضرورت ہے۔

جناب سید نذیر نیازی کی یہ کتاب "اقبال کے حضور میں" درحقیقت نیازی صاحب کی بیس برس کی مدت کی ایک تاریخی، علمی یاد داشت ہے جس کو آپ نے ۷۸۴

اس کی شانِ خداوندی ہیں، اور بھی فرق آگیا۔ خدا، اب مطلقاً خدا نہ رہا شخص ثانی مسیح علیہ السلام نے عالمِ ناسوت سے عالمِ لاہوت میں قدم رکھا اور شخص اول خدا نے عالمِ لاہوت سے عالمِ ناسوت میں۔ یوں اسکی مطلقیت اضافیت سے بدل گئی۔ پھر اس توحید فی التثلیث یا تثلیث فی التوحید کا جواز جس طرح پیدا کیا گیا، اس میں کسی سعی خالصتاً منطقی فکر کی بجائے وثنی عقائد کا غلبہ تھا۔

یقیناً خدا کی یہ شان نہیں ہو سکتی جس پر مسیحیت کو اصرار ہے خواہ اسکی تعبیر کسی رنگ میں کی جائے۔ وہ فلسفہ کے واجب الوجود سے بھی بیزار تھا۔ اس لیے کہ واجب الوجود ایک منطقی برہان ہے۔ ایک استدلال، ایک نتیجہ۔ بالفاظِ دیگر ایک وہم اور خیال از روئے منطق ایک معنی CONCEPT جس کی بنا وجود و عدم اور وجوب و امکان کے پیش نظر ایک خاص قسم کے صغرا و کبرا یعنی قیاس منطقی پر رکھی گئی۔ اور جس سے ایک مخالفانہ مگر ویسی ہی صحیح منطق سے استدلال کرتے ہوئے انکار بھی کیا جا سکتا ہے۔ لہذا واجب الوجود ہمارے ذہن کی پیداوار ہے اور ہمارے ذہن ہی میں محدود، جس کی اس سے باہر

صفحہ کی ضخامت میں ترتیب دیا ہے اس سارے فسانے میں اگر علامہ سے ملاقات کا دعویٰ کرنے والے کسی شخص کا ذکر نہیں تو وہ جناب مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی ہیں۔ (چودھری حبیب احمد)

کوئی حقیقت نہیں، نہ وجود۔ واجب الوجود خدا کے مرتبے کو نہیں پہنچ سکتا۔ یوں ایک خاص قسم کے فکر اور منطق کا تقاضا تو پورا ہو جاتا ہے لیکن مذہب کا تقاضا پورا نہیں ہوتا۔ بالفرض اگر یہ کہا جائے کہ از روئے منطق یہ ہستی باری تعالیٰ کی ایک دلیل تو ہے تو اس کا جواب یہ ہوگا کہ دلیل نہیں بلکہ امکان ہے جسے دلیل ٹھہرانا منطق ہی کی اصطلاح میں مصادر علی المطلوب PETITIO PRINCIP کہا جائے گا، کیونکہ اس امکان کی صحت ہی تو ثبوت طلب ہے۔

وجود BEING اور واجب الوجود NECESSARY BEING کے بیش نظر میکٹیگرٹ نے وجودِ مسحوق (PULVERISED BEING) کا تصور قائم کیا اور وہ بھی شاید جواباً۔ وہ کہتا ہے کائنات مجموعۂ افراد (موجودات) ہے اور ہر وجود دوسرے سے الگ جس میں ابھی وحدت کی شان پیدا نہیں ہوئی۔ گویا وجود اگر ہے بھی بطور ایک وحدت) تو یہ وحدت قائم نہیں۔ وجود پس گیا ہے اور بشکل موجودات ہمارے سامنے جس کا ہم خود بھی ایک حصّہ ہیں۔ لہٰذا وحدۃ الوجود سے اس کا اختلاف کیونکہ وحدۃ الوجود سے موجودات کی نفی لازم آتی ہے۔ یاد رکھنا چاہیئے۔ وجود منطق کا ایک معقولہ ہے، مذہب کا مقولہ نہیں ہے۔ مذہب کو جس خدا پر اصرار ہے یا دوسرے لفظوں میں ہم جس خدا کو فی الواقعہ مان سکتے ہیں اس کا جواز نہ واجب الوجود سے پیدا ہوتا ہے، نہ مسیحیت کے شخصی خدا اور اقانیم ثلاثہ سے۔ لہٰذا میکٹیگرٹ کی دہریت اور ہستی باری تعالیٰ سے انکار۔ با ایں ہمہ اس کی دعوت کا اپنا ایک رنگ تھا جس پر محبت کا غلبہ تھا۔ اور جو شاید مسیحیت سے اسے ورثے میں ملا۔

باب ۶

دارالاسلام اور مودودی

"پانچ دریاؤں کی سرزمین نے پکارا" کے عنوان سے "ابوالآفاق" لکھتے ہیں

"مارچ ۳۸ء میں علامہ اقبال مرحوم کے کہنے پر سید صاحب دارالسلام آ گئے۔ پروفیسر محمد سرور صاحب لکھتے ہیں اس میں شک نہیں کہ ان دنوں اقبال مرحوم مولانا سے کافی متاثر تھے اور مرحوم کے ایک نیازمند سے جو آخری زمانے میں اکثر ان کی خدمت میں حاضر رہتا تھا، لوگوں نے مولانا مودودی کے متعلق علامہ مرحوم کا یہ جملہ سنا کہ یہ مولوی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلم سے ان کے دین کو پیش کر رہا ہے۔

بہرحال یہ روایت خواہ کتنی ہی صحت طلب کیوں نہ ہو لیکن یہ واقعہ ہے، کہ مولانا کو پنجاب بلوانے میں علامہ اقبالؒ کا بھی ہاتھ تھا۔" (صفحہ ۱۴۷ از سید ابوالاعلیٰ مودودی)

آگے بڑھیے یہ اقتباسات بھی ملاحظہ فرمایئے

"شورش کاشمیری صاحب کے ایک خط کے جواب میں سید صاحب نے ۳ مارچ ۱۹۵۱ء کو لکھا۔" ڈاکٹر اقبال مرحوم سے میرے تعلقات کوئی بہت زیادہ وسیع نہ تھے۔ البتہ قلبی حیثیت سے گہرے ضرور تھے، جب حیدرآباد سے رسالہ "ترجمان القرآن" نکالا کرتا تھا اس زمانے میں مجھے خبر تک نہ تھی کہ ڈاکٹر صاحب مجھ سے واقف ہیں، مگر بعد میں معلوم ہوا کہ وہ برابر اس رسالہ کو منگوا کر میرے مضامین دلچسپی کے ساتھ پڑھوا کر سنتے تھے۔ مجھے پہلی دفعہ انکی دلچسپی کا علم اس وقت ہوا جب ۱۹۳۶ء کے اواخر میں ان کا عنایت نامہ مجھے ملا جس میں انہوں نے اس خواہش کا اظہار فرمایا تھا کہ میں حیدرآباد چھوڑ کر پنجاب چلا آؤں اور لاہور میں رہ کر فقہ اسلامی کی تدوین جدید میں ان کے ساتھ تعاون کروں۔

اس کے بعد کچھ مراسلت شروع ہوئی اور ۳۷ء کے آخر میں لاہور آ کر دو تین مرتبہ ان سے ملا۔ ان ملاقاتوں میں ایسا محسوس ہوا کہ جیسے میری اور انکی بہت پرانی واقفیت ہے اور ہم ایک دوسرے کے دل سے بہت قریب ہیں یہاں میرے اور ان کے درمیان یہ

بات طے ہوگئی کہ میں پنجاب منتقل ہو جاؤں اور پٹھان کوٹ کے قریب اس وقف کی عمارات میں جس کا نام ہم نے بالاتفاق دارالسلام تجویز کیا تھا ایک ادارہ قائم کردوں جہاں دینی تحقیقات اور تربیت کا کام کیا جاتے۔ انہوں نے مجھ سے وعدہ فرمایا کہ میرے وہاں منتقل ہو جانے کے بعد وہ بھی ہر سال چند مہینے وہاں آکر قیام فرمایا کریں گے۔ چنانچہ اسی قرارداد کے مطابق میں نے حیدرآباد جا کر ہجرت کی تیاریاں شروع کر دیں [۱] "

آمدم برسرِ مطلب ـــــــ نذیر نیازی صاحب نے لکھا ہے لکھتے ہیں کہ حکیم الامت علامہ اقبالؒ کی رحلت سے کچھ عرصہ پہلے چوہدری نیاز علی صاحب جاوید منزل میں آئے۔ انہوں نے علامہ مرحوم کو بتلایا کہ انہوں نے جمال پور میں ایک وقف قائم کیا ہے۔ آپ مشورہ دیں کہ اس وقف سے کیا کام لینا چاہیئے۔ مرحوم نے مشورہ دیا کہ موجودہ زمانے میں سیاسی و اجتماعی مسائل نے ایک خاص شکل اختیار کر لی ہے۔ اس لئے ہم روز بروز اسلام سے ہٹ رہے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ علما ان مسائل کو سمجھیں اور حالات کو اسلامی شرائع کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کریں۔ اسلئے میرے نزدیک اس وقت مسلمانوں کی سب سے بڑی ضرورت فقہ اسلامی کی تشکیل ہے۔ حکیم الامت کے اس وقیع مشورے پر اتفاق ہو گیا تو اب سوال تھا کہ اس کام کیلئے علما کہاں سے آئیں؟ نیازی صاحب کے الفاظ ہیں :

" حضرت علامہ نے فرمایا آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ جہاں تک لوگوں کو جمع کرنیکا تعلق ہے۔ شاید میں کچھ نام تجویز کر سکوں۔ سردست ایک نام میرے ذہن میں آتا ہے۔ حیدرآباد سے ترجمان القرآن کے نام سے ایک بڑا اچھا رسالہ نکل رہا ہے، ابوالاعلیٰ مودودی صاحب اس کے ایڈیٹر ہیں۔ میں نے ان کے مضامین پڑھے ہیں، دین کے ساتھ ساتھ وہ مسائل حاضرہ پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ ان کی کتاب الجہاد فی الاسلام مجھے بہت پسند آئی ہے۔ آپ کیوں نہ انہیں دارالاسلام آنے کی دعوت دیں میرا خیال

---

[۱] ہفت روزہ "چٹان" ۱۶ اپریل ۱۹۵۱ء
[۲] مولانا مودودی کی تحریک اسلامی

ہے کہ وہ دعوت قبول کر لیں گے"۔ ۱

چنانچہ نذیر نیازی صاحب نے اس گفتگو کے حوالے سے علامہ مرحوم کی طرف سے سید مودودی کو حیدر آباد میں خط لکھا۔ ادھر چوہدری نیاز علی صاحب نے سید مودودی صاحب کے لئے دارالاسلام آنے کے جملہ انتظامات کر دیئے"۔

(از سید ابوالاعلیٰ مودودی صفحہ ۱۴۸ تا ۱۵۰ سوانح۔ افکار۔ تحریک)

ہفت روزہ "ایشیا" دوسری کتاب "اوراق گم گشتہ" کے نام سے رحیم بخش شاہین ایم اے ہفت روزہ "ایشیا" کے حوالے سے یہی کچھ درج کرتے ہیں۔ سید نذیر نیازی صاحب کا یہی حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں

"اس پر سوال پیدا ہوا کہ مودودی صاحب کو دارالاسلام آنے کی دعوت کون دے۔ طے پایا کہ اس پوری گفتگو کے حوالے سے میں ان کی خدمت میں علامہ کی طرف سے ایک مفصل خط لکھوں اور دریافت کروں کہ وہ دکن سے دارالاسلام آسکتے ہیں یا نہیں چنانچہ میں نے مودودی صاحب کی خدمت میں مفصل خط لکھا جس کے جواب میں انہوں نے دارالاسلام آنے پر آمادگی ظاہر فرمائی مگر اس کے ساتھ اپنی بعض مجبوریوں اور ذمہ داریوں کا ذکر بھی کیا جن کی تفصیل چودھری نیاز علی صاحب کو پہنچا دی گئی کچھ دنوں بعد چودھری صاحب پھر لاہور تشریف لائے تو معلوم ہوا کہ انہوں نے مودودی صاحب کے دارالاسلام آنے کیلئے جملہ انتظامات کر دیئے ہیں۔

حضرت علامہ نے فرمایا۔ یہ آپنے بہت اچھا کیا۔ کام کی ابتداء کر دیجئے جیسے جیسے کام بڑھے گا اور لوگ بھی شریک ہوتے جائیں گے۔

سید نذیر نیازی رقمطراز ہیں (بحوالہ ہفت روزہ ایشیا")

"مودودی صاحب کا خط چونکہ میرے نام تھا لہذا چودھری صاحب کے ارشادات کے مطابق پھر میں نے انہیں خط لکھا جس کے جواب میں انہوں نے فرمایا کہ میں رخت سفر باندھ چکا ہوں چند ایک معاملات ہیں ان کے تصفیئے کے بعد دارالاسلام آنے میں کوئی رکاوٹ نہیں رہے گی، میں ایک طرح سے مودودی صاحب کی آمد کا منتظر تھا، کیوں کہ میرا خیال تھا اور شاید انہوں

نے اپنے خط میں اشارہ بھی کیا تھا کہ وہ اوّل لاہور آئیں گے پھر دارالاسلام کا رُخ کریں گے لیکن ہوا یہ کہ مودودی صاحب حیدر آباد سے سیدھے دارالاسلام پہنچے، شاید ۱۸ یا ۱۹ اپریل کو ۲۱ اپریل کو حضرت علامہؒ کا انتقال ہو گیا اور مودودی صاحب کی یہ خواہش کہ ان سے مل کر پیش نظر کام کے بارے میں گفتگو کی جائے، پوری نہ ہو سکی چنانچہ اگلے روز جو انہوں نے ایک طرح سے تعزیتی خط لکھا اس میں اس امر پہ دلی افسوس کا اظہار بھی کیا۔ میرے خیال میں یہ سب باتیں مودودی صاحب کے ذہن میں ہوں گی، اور وہ ان کی تصدیق فرمائیں گے' میری زیر طبع کتاب 'اقبالؒ کے حضور میں' یہ تمام واقعات بہ تفصیل درج ہیں، نیز اس تاریخی خط و کتابت کا پورا ریکارڈ میرے پاس بحفاظت موجود ہے۔"

(از اوراق گم گشتہ، صفحہ ۸۲، ۸۳)

اسی ضمن میں **مولانا مودودی کا بیان، سیّارہ مئی ۱۹۶۳ء**

فرماتے ہیں مولانا "علامہ اقبال نے خواہش ظاہر کی تھی کہ میں پنجاب چلا آؤں، زیادہ تفصیل نہیں لکھی تھی، اس وقت تو میں نہیں سمجھ سکا کہ اسکی مصلحت کیا ہے۔ البتہ ۱۹۳۷ء کے وسط تک پہنچ کر مجھے خود یہ محسوس ہونے لگا کہ جنوبی ہند کو چھوڑ کر مجھے شمالی ہند کی طرف رُخ کرنا چاہیئے، اسی زمانے میں چودھری نیاز علی صاحب نے اصرار کیا کہ میں پنجاب کا سفر کروں اور کم از کم ان کے اس مقام کو دیکھ لوں جو انہوں نے ایک ادارہ قائم کرنے کیلئے وقف کیا تھا۔ میں خود بھی ضرورت محسوس کر رہا تھا کہ شمالی ہند کا سفر کر کے کسی جگہ کا انتخاب کر دوں جہاں اپنے عزائم کے مطابق مجھے کام کرنے کا موقع ملے، اسی خیال سے میں نے شاید اگست کا آخر تھا ۱۹۳۷ء میں پنجاب کا سفر کیا اور جالندھر اور لاہور سے ہوتا ہوا پٹھان کوٹ پہنچا۔ اس سفر میں علامہ اقبالؒ مرحوم سے تفصیلی گفتگو ہوئی اور انہوں نے مجھ سے فرمایا کہ چودھری نیاز علی صاحب نے جو جگہ وقف کی ہے، میں اسی کا انتخاب کروں اور وہ ادارہ قائم کر دوں جس کا خاکہ میں نے چودھری صاحب کے نام اپنے خط میں لکھا تھا۔"

(از اوراق گم گشتہ صفحہ نمبر ۸۵)

سہ ماہی فنون لاہور **ممتاز احمد** لکھتے ہیں۔ "اقبالؒ کی جذباتی اپیل سے قائد اعظمؒ نے اور ان کی فکری تحریک سے مولانا

ا۔ مولانا مودودی کی تحریک اسلامی۔ ہفت روزہ ایشیا ۲۵ اپریل ۱۹۶۹ء

سید ابوالاعلیٰ مودودی نے احیائے اسلام کے کام کو آگے بڑھایا۔"

میاں محمد شفیع (م ش) کے حوالے سے

"مولانا مودودی درحقیقت نیشلسٹ مسلمانوں کی ضد تھے اور میں پوری ذمہ داری سے عرض کرتا ہوں کہ میں نے حضرت علامہ اقبالؒ کی زبان سے کم و بیش اس قسم کے الفاظ سنے تھے، کہ "مودودی کانگریسی مسلمانوں کی خبر لیں گے۔"

جہاں علامہ اقبال بالکل واضح طور پر آزاد اور مدنی کے نقاد تھے، وہاں وہ مولانا مودودی کا ماہنامہ "ترجمان القرآن" جستہ جستہ مقامات سے پڑھوا کر سننے کے عادی تھے اور اس امر کے متعلق تو میں سو فیصد ذمہ داری سے یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ علامہ مرحوم نے مولانا مودودی کو ایک خط کے ذریعے حیدر آباد دکن کی بجائے پنجاب کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنانے کی دعوت دی تھی بلکہ وہ خط انہوں نے مجھ سے ہی لکھوایا تھا۔"

مسلم لیگ کیخلاف ایک لفظ نہیں لکھیں گے

"دراصل دارالاسلام پٹھان کوٹ کی زمین اور جائیداد چوہدری نیاز علی صاحب نے وقف کی تھی، وہ سید صاحب کے دینی خیالات سے بہت متاثر تھے، اس لئے انہوں نے سید صاحب کو یہاں بلایا تھا لیکن وہ سیاسی لحاظ سے مسلم لیگی تھے، وہ مسلم لیگ کے خلاف ایک لفظ بھی سننا نہیں چاہتے تھے اور سید صاحب ان دنوں مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش کے زوردار علمی و سیاسی مضامین لکھ کر کانگریس پر تنقید کر رہے تھے اور مسلم لیگ، خاکسار، احرار اور جمعیۃ العلماء سبھی کو اسلام کے اصل نصب العین کی طرف آنے کی دعوت دے رہے تھے، نیاز علی صاحب نے صاف کہہ دیا کہ اگر آپ یہاں رہیں گے تو مسلم لیگ کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں لکھیں گے۔

آج کے مسلم لیگیوں کے سیاسی کردار اور چوہدری صاحب کے احساسات و جذبات میں کتنا واضح فرق ہے (مرتب)

اسی صفحہ پر ـــــ جنوری ۱۹۳۹ء میں سید مودودی اور انکے دوسرے ساتھیوں کو اس چھوٹی سی نئی بستی کو چھوڑنا پڑا، سید صاحب حیدر آباد دکن سے ساری کشتیاں جلا کر اور گھر پھونک کر اس جنگل میں آئے تھے کہ خدا کے

لے ترجمان القرآن جلد ۱۳ عدد ۵

مقام کو برباد کرنے کیلئے خواہ کیسی ہی سختیاں سہنی پڑیں سہیں گے۔ لیکن عشق کے امتحانات تو ابھی شروع ہوئے تھے۔ اس گھر کو بھی خیر باد کہنا پڑا، چنانچہ ترجمان القرآن میں لکھا:۔

"آج کی اشاعت میں پہلے صفحہ پر ناظرین کو یہ اعلان دیکھ کر حیرت ہو گی کہ ادارۂ دارالاسلام کا مرکز اور ترجمان کا دفتر اس مقام سے جس کا نام ہی اس نصب العین کی رعایت سے دارالاسلام رکھا گیا ہے منتقل ہو رہا ہے (از سید ابوالاعلیٰ مودودی صفحہ ۱۷۴، ۱۷۵)

کیوں چھوڑنا پڑا؟ مودودی صاحب اور اُن کے شرکائے کار نے کیا اخلاقی مظاہرہ فرمایا تھا کہ چوہدری نیاز علی صاحب (مرحوم) کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ پرویز صاحب کو دہلی لکھیں کہ آپ نے جس بلا کو میرے کندھوں چڑھایا ہے اُسے آکر اتار دیں...... اگر سید ابوالاعلیٰ مودودی کے مرتب اس حقیقت کو بھی پیش کر دیتے تو بات صاف ہو جاتی۔ آخر جناب مودودی کا وہ کیا منصوبہ تھا کہ اُنہیں پرویز صاحب کو دارالاسلام بلانا پڑا۔ (مرتب)

سید صاحب کا طرزِ عمل:۔

سید صاحب کا طرزِ عمل ہمیشہ یہ رہا ہے کہ وہ افراد کی زیادتیوں، سختیوں اور بہتانوں تک کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ ترجمان کے اداریئے میں انہوں نے نیاز علی صاحب سے کوئی تعرض نہ کیا اور لکھا ——— "ہمارا مقصد پورے ہندوستان کو دارالاسلام بنانا ضرور ہے۔ سو اس مقصد کیلئے اس جزیرہ نما کے ہر خطے میں دارالاسلام قائم ہو سکتا ہے۔ رہا یہ مقام خاص تو اس کو میں نے بعض حضرات کی دعوت اور وعدۂ اعانت پر ایک ایسی نمونہ کی بستی کیلئے پسند کیا تھا۔ جہاں دارالاسلام کا نصب العین رکھنے والے ہر حصہ سے سمٹ کر مجتمع ہو سکیں اور اپنے مقصد کیلئے اجتماعی سعی و جہد کرنے کی قوت و قابلیت بہم پہنچا سکیں، اسی خیال کو سامنے رکھ کر میں حیدر آباد سے ڈیڑھ ہزار میل پر اپنا گھر بار اٹھا لایا تھا، اور اپنے نزدیک یہ سمجھ رہا تھا کہ شاید یہی مستقر بھی ہو گا اور مستودع بھی۔ لیکن جب ادارہ باقاعدہ قائم ہوا اور رفقائے کار جمع ہوئے تو تمام حالات کو سامنے رکھ کر بالاتفاق یہ رائے قائم کی گئی کہ جو مقاصد اور اصول ہمارے پیشِ نظر ہیں ان کے تتبع میں کام کرنے کا یہاں موقع نہیں مل سکتا، خود میرا اپنا دس مہینے کا تجربہ اس پر شاہد تھا۔ لہٰذا یہ طے ہوا کہ ادارہ کا مرکز یہاں سے کسی مناسب مقام پر منتقل کر دیا جائے،

اور اس کیلئے متعدد حیثیات سے لاہور کو پسند کیا گیا"[1]

(از سید ابوالاعلیٰ مودودی، سوانح۔ افکار۔ تحریک (صفحہ ۱۷۵، ۱۷۶)

(یہ تحریرات بھی مندرج ہیں، جو جناب سید نذیر نیازی مرحوم اور دیگر اصحاب کے حوالوں سے ہیں (مرتب)

اب ہم ان تلخ حقائق کی طرف بڑھ رہے ہیں جن کے متعلق بزرگوں نے فرمایا ہے کہ سچی بات ذرا تلخ ہوتی ہے، ہماری اس تحریر سے ایک عجب سا منظر سامنے آئیگا اور کئی ایک جبینیں شکن آلود، اور کئی ایک عقیدتمند خشمگیں چہرے لیئے ہمیں قہر آلود، غضب ناک قسم کی نگاہوں سے دیکھیں گی، اور ان صالحین و مقدسین کی طرف سے جنھیں بلندئ اخلاق اور پاکیزہ کردار کا دعویٰ ہے، اتہام تراشیاں الزام بازیاں کذب بیانیاں اور خدا جانے کیا کیا غلط باتیں ہماری طرف منسوب کی جائیں گی، لیکن جیسا کہ ظاہر ہے، کہ ہم اقبال؟ و جناح" سے متاثر، ان کے ادنیٰ طالب علم اور جاں نثار و جاں سپار سپاہی ہیں، مئے توحید کو صفت جام لیکر پھرنا ہمارا فریضۂ حیات ہے، حق گوئی و بے باکی ان بزرگوں کا عطیہ ہے اور رضا کی تاریکی جو ہمیں اب تک ڈرا نہ سکی، آگے بیچاری کیا ڈرائے گی، ہم یہ کچھ قطعاً نہ کرتے اور یہ صداقتیں نوک قلم پر نہ لاتے اگر اس خود بیں مرشد کے مرید اس حد تک حقائق کو مسخ کرنے کی سعی مذموم نہ کرتے کہ" پاکستان بنانے والی تین شخصیتوں میں ایک مودودی بھی ہیں"۔ اور یہ اقبال؟ کے ساتھ روابط ثابت کرنے کیلئے اس قدر چہرۂ تاریخ کو سیاہ نہ کرتے۔ یہ باطل سوز اور حقیقت فاش واقعات جو شاید ابھی تک دلوں میں تھے، زینت قلم نہیں بنے تھے، اور صفحۂ قرطاس پر نہیں آتے تھے ان مصلحین کی افسانہ نگاریوں نے مجبور کیا ہے، کہ یہ رخ بھی ملت پاکستانیہ کے سامنے آئے، یہ وہ زندہ حقائق، اور ناقابل انکار واقعات ہیں، کوئی باضمیر انسان ان کی تردید نہ کر پائے گا، اور کوئی صاحب ایمان انہیں جھٹلانے کی کوشش نہیں کرے گا، اب تو یوں ہوا ہے کہ ؎

---

[1] ترجمان القرآن جلد ۱۳ اعدد ۱ ۔ [1] یہ چودھری نیاز علی صاحب مرحوم و مغفور کی کشادہ قلب صفت عفو اور درگذر کی خوبی تھی کہ وہ مودودی کے پہلے کئے کرائے کو بھول گئے اور دوبارہ جب اسلامیہ کالج مولانا نے چھوڑا انہیں دار الاسلام لے گئے (مرتب)

بُو نے گُل لے گئی بیرونِ چمن رازِ چمن
کیا قیامت ہے کہ خود پھول ہیں غمازِ چمن
(اقبالؒ) (چودھری حبیب احمدؒ)

حقیقت یہ ہے، کہ مودودی صاحب دارالاسلام پرویز صاحب کی وجہ سے پہنچے،
ماہنامہ طلوعِ اسلام ۱۹۷۶ء رقمطراز ہے۔

"لیکن واتے برحال ما، کہ اقبالؒ کا یہ خواب خوابِ پریشان ہو کر رہ گیا، پاکستان، مسلمانوں کی ایک جداگانہ مملکت ہی بن سکا، اور اس میں اسلام، مذہب کی حیثیت ہی سے رائج رہا۔ یہ دین کے نظام کی جولانگاہ نہ بن سکا۔ اس کی وجوہات متعدد قرار دی جاسکتی ہیں، لیکن میرے نزدیک اس کی بنیادی وجہ اور اساسی سبب ایک ہی ہے، اور وہ ہے اس بدنصیب ملک میں جماعت اسلامی کا وجود۔ مجھے اس کا اچھی طرح سے احساس ہے، کہ میرے اس کہنے پر بہت سی بھویں تنیں گی، بہت سی پیشانیوں پر بل پڑیں گے، بہت سے چہرے خشمگیں اور بہت سے دہن کف آگیں ہوں گے، میرے خلاف پروپیگنڈے کے سمندر میں ایک نیا تلاطم برپا ہوگا، لیکن عزیزانِ من! میں جس بات کو حقیقت اور صداقت سمجھتا ہوں مخالفتوں کا ہجوم مجھے اس کے اظہار و اعلان سے باز نہیں رکھ سکتا۔ میں پچیس سال سے ان کے اس پروپیگنڈے کا ہدف بنتا چلا آرہا ہوں، میں جب اس طویل عرصے میں اس حقیقت کے اظہار سے رک نہیں سکا تو اب عمر کے اس آخری حصے میں، جبکہ میں جانتا ہوں، کہ خدا کی بازپرس کا دن قریب آرہا ہے، میں اظہارِ حقیقت سے کیوں باز رہوں۔

آگے چل کر ———— مشکل یہ ہے کہ ہماری قوم بڑی جذباتی واقع ہوئی ہے اس لئے وہ کسی تحریک پر اس کے آغاز میں ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی عادی نہیں رہی....

مرزا غلام احمد نے اپنا تعارف ایک مناظر کی حیثیت سے کرایا۔ اور بظاہر اسی مقصد کے لئے اپنی پہلی کتاب "براہین احمدیہ" شائع کی، قوم نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا، اور اس کی مدح و ستائش میں غلغلے بلند کر دیئے۔ اس نے بنظرِ غائر یہ دیکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی، کہ اس تحریک کا رُخ کس منزل کی طرف ہے، حالاں کہ مرزا صاحب نے بعد میں خود بھی اس امر کا اظہار کیا کہ اس کتاب میں ان کے بعد کے دعاوی بین السطور چھپے ہوئے تھے، اور یہ کہ

انہوں نے یہ انداز اس لئے اختیار کیا گیا، کہ یہاں کے علما اس پیچ میں پھنس جائیں (بحوالہ اربعین ۳ صفحہ ۲۱) مسلمانوں کو اس کا احساس اس وقت ہوا جب وہ تحریک اپنے برگ و بار لا چکی تھی، اس قوم (بالخصوص پنجابی مسلمانوں) کی یہی جذباتیت اور عجلت پسندی ہے جس کے متعلق علامہ اقبال نے کہا ہے کہ

مذہب میں بہت تازہ پسند اس کی طبیعت کر لے کہیں منزل تو گزرتا ہے بہت جلد
تحقیق کی بازی ہو تو شرکت نہیں کرتا ہو کھیل مریدی کا تو ہرتا ہے بہت جلد
تاویل کا پھندا کوئی صیاد لگا دے
یہ شاخِ نشیمن سے اترتا ہے بہت جلد

ہمارا اصل تحریر ملاحظہ فرمائیے — مودودی صاحب جب حیدر آباد (دکن) سے پنجاب آئے تو انہوں نے پنجابی مسلمان کی اس طبیعت کا خوب اندازہ لگایا۔ میرے ساتھ اس سے بہت پہلے سے مراسم تھے، لیکن اس وقت تک میرا ان سے تعارف صرف ان کی تحریروں کے ذریعے تھا (میرے مضامین بھی ان کے رسالہ "ترجمان القرآن" میں چھپا کرتے تھے۔

میں یہاں اتنا واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں اس قسم کی بحثوں میں ذاتیات کو درمیان میں نہیں لایا کرتا لہٰذا اس مقام پر صرف اتنا کہہ کر آگے بڑھ جانا چاہتا ہوں کہ حیدر آباد سے پنجاب جاتے وقت وہ اپنے مسکن دہلی میں کچھ دنوں کیلئے ٹھہرے تو انکی اکثر نشستیں میرے مکان (واقعہ نئی دہلی) پر ہوتی تھیں، اس وقت مجھے انہیں قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا تو میں نے انکی طبیعت میں اس قسم کے جراثیم محسوس کئے اور دبی زبان سے انہیں اس سے متنبہ بھی کیا، اس وقت تک وہ ماڈرن ٹائپ کے نوجوان صحافی تھے، دارالاسلام جا کر انہوں نے مذہبی لبادہ اوڑھا، اور اس کے بعد پنجاب کے مرکزی مقام لاہور میں اپنی علیحدہ جماعت کی بنیاد رکھی۔ ان کی جماعت کے پہلے اجتماع کی روئیداد ان کے رسالہ "ترجمان القرآن" کی جون جولائی اگست ۱۹۴۱ء کی مشترکہ اشاعت میں درج ہے، اور ہر صاحب بصیرت کو آج بھی دعوتِ غور و فکر دیتی ہے۔

اس اجتماع کی افتتاحی تقریر میں مودودی صاحب نے اس کی اہمیت کے سلسلے میں

فرمایا کہ ——— "اسلام بغیر جماعت کے نہیں ہے اور جماعت بغیر امارت کے نہیں، اس قاعدہ کلیہ کے مطابق ضروری ہے کہ جماعت بننے کے ساتھ ہی آپ اپنے لئے ایک امیر منتخب کر لیں۔"
(ترجمان القرآن صفحہ ۴۰)

حلقہ طلوع اسلام

حلقہ طلوع اسلام کے احباب سے اور اس دفعہ یوم اقبالؒ پر جناب پرویز صاحب تشریف لائے، تو براہ راست ان کی زبانی جو کچھ ہم نے سنا، وہ یہ ہے، کہ حضرت علامہؒ کی آرزو کی تکمیل کیلئے چودھری نیاز علی خاں صاحب (مرحوم و مغفور) نے (جمال پور) میں ایک ادارہ قائم کیا، زمین وقف کی، پکی عمارات تعمیر کیں، جیسا کہ کسی پچھلی تحریر میں آپ کی نظروں سے گزر چکا ہے، علامہ علیہ الرحمۃ کا اپنا خیال تھا کہ صحت یاب ہونے پر وہ بھی دارالاسلام میں تشریف لائیں گے، چوہدری صاحب کا تقاضا روز بروز شدت اختیار کرتا چلا گیا، جن لوگوں نے چوہدری صاحب مرحوم کو قریب سے دیکھا ہے، وہ جانتے ہیں، کہ وہ دُھن کے بہت پکے تھے،

چنانچہ جب چودھری نیاز علی خاں کے اصرار و تقاضا نے ڈاکٹر صاحب کو مجبور کر دیا تو لاچار انہوں نے پرویز صاحب کو دہلی لکھا کہ میں ابھی تک زیادہ بیمار ہوں، ناطاقتی سدِ راہ ہے آپ دارالاسلام چلے جائیں، صحت یابی پر انشاء اللہ میں بھی پہنچ جاؤں گا،

پرویز صاحب ہوم ڈیپارٹمنٹ میں ملازم تھے،

ہاں یہ بھی ایک تاریخی واقعہ ہے، کہ جب حضرت قائد اعظم علیہ الرحمۃ لاہور تشریف لائے، تو آپ نے علامہؒ سے فرمایا، کہ ہندو اور انگریز سے تو میں خوب نپٹتا ہوں لیکن نیشنلسٹ علماء کے محاذ پر آپ میری مدد کریں، علامہؒ ان دنوں نقاہت، بیماری کی شدت کا شکار تھے، آپ نے یہ فریضہ جناب پرویز کو سونپا۔ انہوں نے دہلی سے دوبارہ طلوع اسلام کا اجرا بھی کیا، اور ہر روز شام کو قائد اعظمؒ کی کوٹھی پر حاضری ہوتی تھی، اور یہ اُن کی ہدایات کی روشنی میں اپنی دینی فہم و فراست کے مطابق حضرت علامہ کے افکار کی مدد سے ان کے باطل پروپیگنڈہ کا جواب دیتے تھے (اس صداقت کی شہادت کیلئے طلوع اسلام کی فائلیں گواہ ہیں)

جب پرویز صاحب علامہ اقبالؒ کی طرف سے یہ حکمنامہ پہنچا تو انہوں نے شام کو اس کا تذکرہ قائد اعظمؒ سے کیا،

آپ نے فرمایا" NO "آپ نہیں جائیں گے۔ پرویز صاحب نے حکیم الامت حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمتہ کی ذاتِ اقدس میں عریضہ لکھا۔ مجھے تو کوئی عذر نہ تھا، نہ تامل لیکن قائدِ اعظمؒ کی طرف سے NO ہے، جیسا کہ ایک سابقہ اقتباس سے ظاہر ہے کہ پہلے پرویز اور مودودی قلمی لحاظ سے متعارف تھے۔ حیدرآباد میں نہ تو مودودی صاحب کے ترجمان القرآن کی حالت اچھی تھی اور نہ ہی عطاری کی دوکان کا حصہ اسقدر رقم دیتا تھا کہ متوازن زندگی گذر سکے، اس حقیقت کا اظہار مودودی صاحب نے اپنے خطوط میں بھی کیا تھا پرویز صاحب اور مودودی صاحب نیشنلسٹ علمأ کے بارے میں ہم آہنگ تھے، اور مولانا نے "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوئم" نہیں لکھا تھا۔

پرویز صاحب نے حضرت علامہؒ کو یہ بھی لکھ دیا کہ آپ نے مولانا مودودی صاحب کا "دو قومی نظریہ" تو پڑھا ہوگا ان کے متعلق کیا رائے ہے، اگر وہ دارالاسلام چلے جائیں تو بہتر نہ ہوگا؟ اس میں ایک مشورہ بھی پوشیدہ ہے، اور دوست نوازی بھی نہاں تھی، علامہؒ نے جواباً لکھوایا کہ ہاں ایسا ہو جائے، تو موزوں ہے۔ چنانچہ یہاں سے دارالاسلام کیلئے مولانا مودودی صاحب کے متعلق بات چلی۔ چودھری نیاز علی خاں صاحب سے بھی، سید نذیر نیازی صاحب سے بھی، پرویز صاحب کے گہرے مراسم تھے، خط و کتابت کے ذریعے بات طے ہوئی (نیازی صاحب نے جیسا کہ ان کے مندرج خط سے واضح ہے چودھری نیاز علی خاں کے کہنے پہ خط لکھا، علامہؒ کی طرف سے نہیں،)

مودودی صاحب کا دہلی سے الوداع

چنانچہ بات چیت طے پانے کے بعد جن لوگوں نے دہلی اسٹیشن سے جناب مولانا کو الوداع کہی، ان میں جناب شیخ سراج الحق اور پرویز صاحب بھی ہیں۔ مودودی صاحب کی غالباً وہ رات بھی پرویز صاحب کے ہاں ہی بسر ہوئی، مودودی صاحب کے افسانہ نگاروں نے بہت افسانہ طرازی اور رنگ آمیزی کی۔ لیکن یہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہیں۔ ہم نے عرض کر دی ہے، وہ جو پرویز صاحب نے لکھا ہے، کہ دہلی سے آتے وقت میں نے انہیں تنبیہ کی تھی، وہ یہ تھی کہ: ـــــ

"مودودی صاحب وہاں جا کر محتاط رہیئے گا۔ پنجاب کے لوگ نبی تک بنا دیا کرتے ہیں۔"

جناب مولانا دارالاسلام تشریف لے آئے محمد شاہ پیغام حق والے ۔ عبدالعزیز مشرقی کسی طرح کے ایک دو اور ان کے ساتھی تھے ۔

ٹرسٹ پر قبضہ چودھری صاحب سے مزاج اور طریق کار کا اختلاف تو تسلیم کیا گیا ہے ، ان حضرات نے مل جل کر قبضہ کر لیا ، چودھری صاحب نے پرویز صاحب کو دہلی لکھا کہ " جیہڑی بلا میرے منڈھیاں تے چاڑی آ ۔ آکے اینوں لاھی " ۔ چودھری صاحب نے یہ تمام افسوسناک واقعہ لکھا ۔

پرویز صاحب کی دارالاسلام میں آمد پرویز صاحب کہتے ہیں کہ میں دو ہفتہ کی چھٹی لیکر دارالاسلام پہنچا جب میں ادارہ میں داخل ہوا تو میں نے مودودی صاحب کو ادھر ادھر تلاش کرنا شروع کیا ایک کمرہ میں کیا دیکھتا ہوں ایک شخص داڑھی بڑھائے گاؤ تکیہ پر ٹیک لگائے دراز ہے ۔ جب میں کمرہ میں داخل ہوا تو مودودی صاحب نے باواز بلند کہا آجائیے ، تشریف لے آئیے جسے آپ تلاش کر رہے ہیں میں ہی ہوں ،

علیک سلیک کے بعد جناب پرویز نے اپنی آمد کا مقصد بتایا اور بات کو آگے بڑھایا مودودی صاحب چونکہ دہلی سے مسلمان افسران میں ان کے اثر و نفوذ اور ان کے لئے ادب و احترام سے واقف تھے ۔ اور یہ بھی جانتے تھے کہ قائد اعظمؒ کی کوٹھی پر ان کا ہر روز کا جانا آنا ہے ۔ اس کے باوجود پرویز صاحب اس الجھی ہوئی ڈور کو سلجھانے میں ڈیڑھ دو ہفتے میں کامیاب ہوئے اور چوہدری صاحب سے واپسی کی اجازت طلب کی ،

مسلم لیگ اور پاکستان کی مخالفت جب حضرت مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب پہلی بار اس طرح دارالاسلام سے لاہور آئے ، تو اسلامیہ کالج میں پروفیسری کی ، تحریک پاکستان کا زور بڑھ رہا تھا اور یہ اسلام کا داعی قیام پاکستان کی تائید و حمایت کیلئے تیار نہ تھا ، چنانچہ کالج سے الگ ہونا پڑا ، ان کے بعد استاذ مکرم جناب پروفیسر مرزا عبدالحمید (مرحوم) جو دی پنجاب مسلم سٹوڈنٹس کے صدر بھی تھے ۔ اسلامیات کے پروفیسر کی حیثیت سے اسلامیہ کالج لاہور ریلوے روڈ میں مقرر ہوئے اور تاریخ شاہد ہے ، کہ آپ نے کالج کے پرنسپل جناب ملک عمر حیات

خاں کی رفاقت میں سید محمد قاسم رضوی سابق کمشنر (مرحوم) ایسے ہونہار شاگردوں کے ذریعہ پیغام اقبالؒ و جناحؒ کو پنجاب کے گوشے گوشے میں پہنچا دیا، دارالاسلام سے متعلق مودودی صاحب کی تعریف و توصیف میں لکھی گئی کتاب میں مذکور ہے کہ چودھری صاحب مسلم لیگی تھے، اور وہ دارالاسلام میں مسلم لیگ کے خلاف کوئی لفظ سننا گوارا نہیں کرتے تھے، جناب محمد حسین قیس (مرحوم و مغفور) جو چودھری صاحب کے دست راست تھے جن کا ذکر بھی مودودی صاحب کے سیرت نگاروں نے دارالاسلام کے ضمن میں اسلئے نہیں کیا کہ وہ مودودی صاحب کو ناپسند کرتے تھے (مودودی صاحب کے متعلق ان کی رائے راقم الحروف نے اپنے کانوں سنی جب دو ہفتے کیلئے گرمیوں کی چھٹیوں میں پروفیسر مرزا عبد الحمید ایم اے کے ساتھ دارالاسلام جانیکا اتفاق ہوا تھا) ان کے صاحبزادوں پروفیسر افتخار چشتی اور اعجاز چشتی ایم اے ایل ایل بی ایڈووکیٹ کی زبانی یہ بات میں نے خود سنی، کہ جب تحریک زوروں پر تھی، تو چودھری صاحب نے مولانا سے کہا کہ آؤ ہم بھی ملت کے سپاہی بن کر جناحؒ کا ساتھ دیں۔ تو مولانا نے انکار کر دیا،

چودھری صاحب نے ملازم سے کہا کہ سفید گھوڑی پر زین ڈال دو، چنانچہ چودھری صاحب تقریباً پندرہ بیس روز علاقہ میں مسلم لیگ کی حمایت میں دورہ کرتے رہے بعض نے اس دوران میں کہا کہ آپ کچھ فرماتے ہیں، مودودی کچھ اور، تو آپ نے ہر جگہ واشگاف طور پر کہا کہ میں کسی مودودی کو نہیں جانتا، جناح کو جانتا ہوں آپ قیام پاکستان میں مسلم لیگ کی تائید و حمائت کریں،

یہاں یہ ذکر ضروری ہے کہ اسلامیہ کالج لاہور سے فراغت کے بعد چودھری صاحب کا دوبارہ مودودی صاحب کی پہلی خطاؤں کو معاف کر کے پھر دارالاسلام لے آنا۔ یہ چودھری صاحب مرحوم کی عالی ظرفی اور بلند حوصلگی کی دلیل ہے؟ یا مولانا کے کردار بلند کی، اس کا فیصلہ ہم آئندہ مورخ پر چھوڑتے ہیں،

ان دونوں ناقابل تردید واقعات سے یہ صاف واضح ہے کہ جناب مودودی پاکستان کے حق میں نہ تھے، ان کی روشن صاف، واضح اور انمٹ شہادتوں کے با وجود میاں طفیل مودودی کو پاکستان بنانے والوں میں تیسری شخصیت کہیں، تو کیا گوش آدم نے اتنا سفید جھوٹ آج تک سنا ہو گا؟

زندہ شہادت

جناب پروفیسر افتخار چشتی راقم کے مجلس اقبال لائلپور (فیصل آباد) کے ناطے سے دیرینہ احباب میں سے ہیں آپ نے میرے ایک مراسلہ کے جواب میں جو کچھ عنایت فرمایا نذر قارئین کیا جا رہا ہے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فرحت منزل فیصل آباد

۲۴ مارچ ۱۹۸۰ء

اخی المحترم جناب چوہدری صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، خط ملا شکریہ

تحریک پاکستان اور تدوین تاریخ تحریک پاکستان میں آپ کی خدمات قابل تعریف ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو عمر دراز عطا فرمائے۔ اور اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی توفیق عطا فرمائے۔ مورخ و محقق کا فرض ہے کہ وہ واقعات کی پوری تحقیق کرے، سچی بات کا کھوج نکالے اور سچی بات کو تاریخ میں درج کرے۔

چوہدری نیاز علی خاں صاحبؒ کے احسانات راقم پر اور راقم کے خاندان پر اتنے ہی ہیں جتنے ہمارے والد گرامی حضرت مولوی محمد حسین قیس چشتی سلیمانیؒ کے تھے۔ چوہدری صاحبؒ کے احسانات ملت اسلامیہ پر بھی ہیں اور تحریک پاکستان و قیام پاکستان میں ان کی عملی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔

جن دنوں قیام پاکستان سے قبل مولانا مودودی صاحب مرحوم دارالاسلام پٹھانکوٹ مشرقی پنجاب میں قیام پذیر تھے، راقم بھی وہیں موجود تھا۔ انتخابات کے دوران جب مسلم لیگ کے حق میں کام کرنے کا پروگرام بنا تو چوہدری صاحب قبلہ نے مولانا مودودی صاحب مرحوم سے کہا کہ حضرت آپ عالم ہیں، خطیب ہیں، داعیٔ اسلام ہیں آپ جمعہ کے خطبات اور دیگر اجتماعات میں مسلم لیگ کے اور تحریک پاکستان کے حق میں تقاریر کریں اور میرے ساتھ دیگر ساتھیوں کو لیکر باہر نکلیں تاکہ ہم گاؤں گاؤں جا کر لوگوں کو قائل کریں کہ قیام پاکستان کے لیے مسلم لیگ کی انتخابات میں کامیابی کیوں ضروری ہے۔ جناب مولانا مودودی صاحب نے فرمایا، میں یہ کام بالکل نہیں کر سکتا۔ نہ میں اس سے اتفاق رکھتا

ہوں۔ آپ جائیں میں تو یہیں دارالاسلام میں بیٹھا ہوں۔ پھر ہم نے دیکھا کہ وہ مردِ پیر و دانا چوہدری نیاز علی خاں صاحب اپنے چند رفقاء کے ساتھ کبھی پیدل کبھی گاڑی پر کبھی تانگہ پر، کبھی گھوڑی پر، قلعہ جمال پور سے نکل گیا۔ نہ دن دیکھا نہ رات، نہ راہ کی دشواری نے اور نہ پیری و نقاہت نے ان کا رستہ روکا۔ نہ اس پہاڑی علاقہ کے ندی نالوں نے، نہ مخالفینِ اسلام ان کی راہ میں حائل ہو سکے، اور نہ کانگریسی مولوی ان کی مومنانہ یلغار کے سامنے ٹھہر سکے۔ انہوں نے گھر گھر جا کر مسلم لیگ کا پیغام پہنچایا اور اپنے علاقہ میں مسلم لیگ کی کامیابی کا پورا سامان بہم پہنچایا، ایسے نازک دور میں جب ملتِ اسلامیہ اور قیامِ پاکستان کا فیصلہ ہونے والا تھا، مولانا مودودی صاحب مرحوم کا انکار ہم سب کے لیے حیران کن بھی تھا، اور افسوسناک بھی۔ پاکستان بن گیا۔ مولانا مودودی مرحوم اچھرہ پہنچ گئے اور پھر اللہ کے پاس پہنچ گئے۔ چوہدری صاحب قبلہ جوہر آباد پہنچے اور اب وہ بھی اللہ کے ہاں موجود ہیں۔ ہم بھی تیار بیٹھے ہیں مگر یہ ایک تاریخی حقیقت اپنی جگہ موجود ہے کہ اس وقت مولانا مودودی صاحب مرحوم نے انکار کر دیا تھا اور عملاً قطعاً کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔ اب یہ معاملہ آپ کی نذر ہے، آپ جانیں اور آپ کا کام۔ میرے لیے بھی دعا فرماتے رہا کریں۔

مخلص

افتخار احمد چشتی عفی عنہٗ

پرویز صاحب اور مودودی یہ تو مختصر سے واقعات ہیں، جو ہم نوکِ قلم پر لائے ہیں، ویسے پرویز صاحب کے پاس تو ان کے متعلق اس قدر معلومات ہیں کہ ؎

کسی بتکدے میں بیاں کریں تو کہے صنم بھی ہری ہری

جناب مودودی تو عالمِ بالا کے مکیں ہیں۔ مسلم لیگ والوں کی ذہنی تعلیم و تربیت کی کمی، بلکہ نہ ہونے پر اور ان کی سیاسی مصلحتوں نے، ان کو وہ بلند و بالا مقام عطا کر دیا ہے، جہاں سے اب یہ قیامِ پاکستان کے حامیوں پر پھبتیاں کس سکتے ہیں حق و

باطل میں آمیزش کرکے تحریکِ قیامِ پاکستان کے تاریخی حقائق کو مسخ کر سکتے ہیں ،

پرویز صاحب بھی خلوت پسند اور ان کی طبیعت کا تقاضا تخلیق ہے اور فکر کی تابانی میں مثلِ خورشید سحر، اپنے زمانے سے جدا معانی میں دقیق، حضرت اقبالؒ کے ان نمودات کے مصداق ہیں، میرے ایسے دیرینہ آدمی کو جسے وہ ذرائع و وسائل میسر نہیں جو انہیں ہیں ایسی جھڑپوں اور حملوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اور آتے دن ایسے لوگوں سے واسطہ رہتا ہے، بدیں وجہ چند دھندلکے صاف کرنے کیلئے ہمیں اس قدر اقتباسات دینے اور ان واقعات کو نوکِ قلم پر لانے کے لئے مجبور ہونا پڑا ہے ،

طلوعِ اسلام اگست ۱۹۳۹ء ـــــ دارالاسلام

"طلوعِ اسلام" اگست ۱۹۳۹ء میں دارالاسلام کے عنوان سے صفحہ ۱۸ سے ۴۸ تک ایک مضمون ہے، ہم اس کے چیدہ چیدہ اقتباسات اپنی کتاب میں دے رہے ہیں، آگے چل کر قارئینِ کرام کو معلوم ہوگا کہ ان کا اندراج ناگزیر تھا،

ملاحظہ فرمائیے ـــــ **پہلا اقتباس** اس تشتت و افتراق منزل کے عدم تعین ۔ جادۂ مستقیم سے ناواقفیت خضرِ راہ کی غلط شناخت کا نتیجہ یہ ہے کہ بیشتر قدم ایسے ہیں، جو اُٹھتے ہیں لیکن منزل قریب نہیں آتی ۔ کوششیں ہوتی ہیں، لیکن نتائج کچھ برآمد نہیں ہوتے، اعمال غارت ہو رہے ہیں، محنتیں اکارت جا رہی ہیں مساعی نامشکور ہو رہی ہے ۔ ڈور کو سلجھا رہے ہیں پر سرا ملتا نہیں

یہی تھی وہ تڑپ جس سے مجبور ہو کر آج سے کچھ سال پہلے پنجاب کے ایک غیر معروف گاؤں (جمال پور) کا ایک مخلص مسلمان زمیندار صاحب چودھری نیاز علی) اٹھا، دورِ حاضر کی سب سے بڑی ہستی حکیم الامت علامہ اقبالؒ کی خدمت میں پہنچا اور اپنی زندگی کا تمام حاصل اُن کے قدموں میں ڈھیر کر دیا کہ "یہ میری کل کائنات، اسے لیجئے اور ٹھکانے لگا دیجئے"

سپردم بتو مایۂ خویش را ؎ تو دانی حساب کم و بیش را

حضرت علامہؒ کے ذہن میں ایک عرصہ سے ایک ایسی اسکیم کا خاکہ متشکل ہو رہا تھا جس کی رو سے وہ چاہتے تھے، کہ ہندوستان کی اس دنیائے عجم میں کہیں کسی گوشہ میں ایک مختصر سی ایسی بستی بسائی جائے جو اسلامی ماحول کی آئینہ دار ہو، جہاں بہترین دل و دماغ کے چند منتخب نوجوان افرادِ ملت کو جمع کرکے ان کی صلاحیتوں کو صحیح

ایسی فولادی سیرت پیدا کر دی جائے، کہ وہ دُنیا میں ہر مخالف قوت کے مقابلہ میں "بنیان مرصوص" ثابت ہوں۔"

حضرت علامہؒ نے چودھری صاحب کے اس ارادہ کو مبارک سمجھا کیوں کہ اس میں انکی ایک پاکیزہ آرزو کی تکمیل کا ساماں تھا۔ اس ضمن میں آپ نے (مصر کے) شیخ علامہ المراغی کی خدمت میں ایک طویل مکتوب ارسال کیا۔ جس میں اپنی اسکیم ذکر کرتے ہوئے انہیں لکھا کہ وہ مصر سے کسی مصری عالم کو جو روشن خیال بھی اور انگریزی زبان پر قدرت بھی رکھتا ہو، علاوہ ازیں یہ شخص علوم شرعیہ اور تاریخ تمدن اسلام سے بھی واقف ہو، بھیج دیں۔ شیخ المراغی نے اپنے مکتوب میں معذرت لکھ بھیجی کہ ان صفات کا کوئی عالم سر دست ہندوستان نہیں بھیجا جا سکتا۔

المختصر اس بستی کا نام دارالاسلام رکھا گیا، ٹرسٹیز کا ایک بورڈ بنایا گیا جس کے سات ممبر تھے جن میں ایک مودودی صاحب بھی تھے (مرتب)

دوسرا اقتباس "کام شروع کرنے کیلئے مولانا ابوالاعلیٰ صاحب مودودیؒ[1] حیدرآباد سے تشریف لائے۔ ان کے ساتھ دو چار رفقائے کار بھی شامل ہو گئے، اسکیم کی جزئیات کی ترتیب آہستہ آہستہ عملی شکل اختیار کرنے لگیں، حضرت علامہؒ کا ارادہ تھا کہ ان کو مرض سے کچھ افاقہ ہو جائے گا، تو وہ بنفس نفیس دارالاسلام میں منتقل ہو جائیں گے، اور اس کے بعد پوری اسکیم حیطہ عمل میں آنی شروع ہو جائے گی، ادھر یہ تصورات وابستگان دارالاسلام کیلئے فردوس دماغ بن رہے تھے۔ اور ادھر کارکنان قضا و قدر ہنس رہے تھے۔ کہ کل کے علم سے بے خبر انسان کس طرح تمناؤں کے کھلونوں سے دل بہلاتا رہتا ہے، ابھی اس اسکیم کا پورا نقشہ بھی مرتب نہ ہونے پایا تھا کہ حضرت علامہؒ دُنیا سے تشریف لے گئے، اور دارالاسلام ایک جسد بے روح بن کر رہ گیا۔

تیسرا اقتباس

حادثہ جانکاہ

"دارالاسلام کے لئے یہی حادثہ کچھ کم جانکاہ نہ تھا کہ اس کے بعد ایک دوسرا حوصلہ شکن واقعہ رونما ہو گیا، مودودی صاحب

[1] ہماری تحقیق کے مطابق مودودی صاحب کس طرح، کس کے توسط اور کس ذریعہ سے دارالاسلام تک پہنچے، وہ وسیلہ پرویز تھا۔

حیدرآباد سے ایک اسکیم اپنے ذہن میں لاتے تھے، جب دونوں اسکیمیں علی لحاظ سے ایک دوسرے کے مقابل آئیں، تو معلوم ہوا کہ ان کی اسکیم دارالاسلام کی اسکیم سے کچھ مختلف تھی اور چونکہ وہ دارالاسلام کے موجودہ قالب میں نہیں ڈھل سکتی تھی اس لئے مولانا صاحب دارالاسلام چھوڑ کر لاہور تشریف لے گئے۔"

طلوع اسلام نومبر ۱۹۳۹ء **دارالاسلام کے تاثرات**

کے عنوان سے پرویز صاحب نے لکھا "شروع اکتوبر میں دارالاسلام کو بچشم خود دیکھنے کی دیرینہ آرزو پوری ہوئی، دامنِ کوہ، ایک بہت بڑی نہر کا کنارہ، ہر طرف سبزہ زار، فضا بہت پاکیزہ، ہوا صاف، ماحول میں تسکین بخش خاموشی ....

چودھری نیاز علی صاحب کے متعلق میں کچھ نہیں لکھنا چاہتا کہ وہ ذاتی تعلقات پر محمول کیا جا سکتا ہے، سردست مولوی محفوظ الرحمٰن صاحب جرانچ سے تشریف لا کر دارالاسلام میں اقامت پذیر ہیں ....

یہ سب کچھ ایک شخص کی ہمت کا نتیجہ ہے، اور اگرچہ اس نصب العین کے مقابلہ میں جو وابستگان تحریکِ دارالاسلام کے پیشِ نظر ہے، یہ کچھ حیثیت نہیں رکھتا لیکن جب اس حقیقت کو سامنے رکھا جائے، کہ یہ نتیجہ ہے، ایک مردِ مسلمان کے جذبۂ ایثار و اخلاص کا، تو اس کی قیمت بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے، ضرورت ہے ایسے دردمند مسلمانوں کی جو اس تحریک کے دست و بازو بنیں اور سب سے بڑی تلاش ہے، اس مردِ مومن کی جو اس کے قلب کی حیثیت اختیار کر سکے ؎

از دام و دولموم وانانم آرزوست! (پرویز)

اگر مودودی صاحب ٹرسٹ پر قبضہ نہ جماتے اور چودھری صاحب سے کشیدگی پیدا نہ کرتے اور دارالاسلام نہ چھوڑنا پڑتا، پہلی دفعہ تو اس وجہ سے دوسری دفعہ چودھری صاحب کی حوصلہ افزائی کیلئے پرویز صاحب، آ نکلے دارالاسلام

لہ آپ چودھری نیاز علی خاں (مرحوم و مغفور) کے خط کا ذکر پڑھ چکے ہیں جو آپنے مودودی صاحب اور ان کے شرکائے کار کے اخلاقِ حسنہ سے متاثر ہو کر جناب پرویز کو دہلی لکھا تھا۔ (مرتب)

دیکھنا پڑا، وگرنہ اتنا مصروف انسان جو ایک ایسے محاذ پر بھی رزم آراء ہو، جو جرنیٹ کے کانگریسی علماء کے خلاف تھا، اور اپنی دفتری مصروفیات میں بھی کوتاہی نہ کرتا ہو کیسے دارالاسلام دیکھتا؟ (مرتب)

سید ابوالاعلیٰ مودودی، سوانح حیات، افکار، تحریک" کے صفحہ نمبر ۴۹ پر ابوالآفاق ایم۔اے تحریر کرتے ہیں،

" علامہ مرحوم کی دعوت پر مولانا کا پنجاب میں تشریف لانا ایک امر واقعہ ہے۔ ہر چند یہ کوئی ایسا واقعہ نہیں جس سے ان کی عظمت میں کوئی غیر معمولی اضافہ ہو تاہم اس واقعہ کی تاریخی حیثیت ضرور ہے۔ ارباب بصیرت سے پوشیدہ نہیں کہ مولانا مودودی اور علامہ مرحوم کی تعلیمات میں غایت درجہ مطابقت پائی جاتی ہے (پائی جاتی تھی یہ ذکر آگے چل کر آئے گا ـــ مرتب) اس کی وجہ یہ ہے، کہ ان دونوں بزرگوں نے مسلمانوں کے روحانی اور سیاسی امراض کے علاج کے لئے جو نسخہ تجویز فرمایا وہ ایک ہی تھا، یعنی اسلام (موجودہ مسلمان اور سیاسی کشمکش حصہ دوم تک بعد میں جو مودودی صاحب نے اپنا مصلحتی اسلام پیش کیا ہے، اس کا افکار اقبال سے دور کا تعلق اور ادنیٰ سی نسبت بھی نہیں ہے (مرتب)

جناب عابد نظامی آپ نے لاہور کے ایک اشتراکی مجلہ کے جواب میں ہفت روزہ ایشیا" بابت ۱۹ اپریل ۱۹۷۰ء میں ایک مضمون لکھا جس کا ایک اقتباس درج ذیل ہے۔ جسے تحقیقی گفتگو کہا گیا ہے۔ اقتباس ملاحظہ فرمائیے

رقمطراز ہیں ـــ " یہ ۱۹۳۷ء کی بات ہے، مولانا مناظر احسن گیلانی نے دکن یونیورسٹی میں دینیات کی تدریس کیلئے مولانا مودودی کا نام پیش کیا، ان کا خیال تھا، کہ کالج کی نئی نسل کو مذہب کی تعلیم جس طرح مولانا مودودی دے سکتے ہیں، کوئی اور شخص نہیں دے سکتا، چنانچہ انہوں نے سر اکبر حیدری سے مشورت کے بعد مولانا مودودی کو پروفیسری قبول کرنے کی دعوت دی۔ لیکن انہوں نے انکار کر دیا، غالباً اسکی وجہ یہ ہوگی، کہ مولانا کی طبیعت ملازمت کی تنگنائیوں میں گھرنے اور تنخواہ دارانہ کردار ادا کرنے سے کچھ بُعد رکھتی ہے، ان کے سامنے جو کام تھا وہ ذہن وضمیر کی آزادی ہی کی

فضا میں کیا جا سکتا تھا،

یونیورسٹی کی طرف سے دوبارہ درخواست کی گئی کہ اگر آپ ہمہ وقت نہ پڑھا سکتے ہوں تو جز وقتی طور پر ہی یہ خدمت انجام دیں، مگر مولانا مودودی نے جز وقتی ملازمت بھی قبول نہ کی .... یہ وہ زمانہ تھا جب مولانا حیدر آباد سے ترجمان القرآن نکالتے تھے۔ ترجان کی مالی حالت اچھی نہ تھی۔ مولانا کو ہر پرچے کی اشاعت پر گرہ سے رقم لگانی پڑتی تھی۔ ایسے وقت میں یونیورسٹی کی پروفیسری کو ٹھکرا دینا بڑے دل گردے کا کام تھا، مولانا مودودی نے یہ قربانی عظیم تر ملی مفاد کی خاطر دی۔ ان دنوں وہ ترجمان القرآن کے ذریعے سیکولر جمہوری اسٹیٹ اور متحدہ قومیت وغیرہ نظریات کے خلاف جہاد کر رہے تھے، جس کو علامہ اقبال مرحوم خاص طور پر دلچسپی سے پڑھ رہے تھے، چنانچہ مولانا مودودی کی انہی تحریروں سے متاثر ہو کر علامہ اقبالؒ نے انہیں فقہ اسلامی پر لکھنے کی دعوت دی، مگر مولانا مودودی نے لکھا کہ وہ سرِدست جس کام میں مشغول ہیں، ادھر سے توجہ ہٹانا نہیں چاہتے۔

(بحوالہ مکتوب چودھری نیاز علی خاں بنام راقم، مورخہ ۴ جولائی ۱۹۶۹ء
از اوراقِ گم گشتہ صفحہ نمبر ۸۴)

آٹھ سو روپے ماہوار؟

دکھا دوں گا جہاں کو جو مری آنکھوں نے دیکھا ہے
تجھے بھی صورتِ آئینہ حیراں کر کے چھوڑوں گا! (اقبالؒ)

"ابوالخیر صاحب نے ایک دفعہ ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا" جب ابوالاعلیٰ نے حیدر آباد چھوڑ کر دارالاسلام کی بستی میں منتقل ہونے کا ارادہ کیا تو میں نے تفصیل سے سمجھانے کی کوشش کی یہ جو سارے جہاں کا درد تمہارے جگر میں ہے، اسی قسم کا قومی درد محمد علی جوہر کے دل میں بھی تھا، لیکن قوم نے انہیں کیا بدلہ دیا؟ حیدر آباد میں رہ کر عزت سے علمی کام کر سکتے ہو، ترجمان القرآن کے ذریعے اپنے پیغام کو پھیلا سکتے ہو، آپ مجھ سے پوچھتے ہیں، کہ مجھے ابوالاعلیٰ کی کس کتاب نے متاثر کیا ہے؟ مجھے اس کی کتابِ کردار نے متاثر کیا

لے ہفت روزہ ایشیا" ۱۲ مئی ۱۹۶۳ء

ہے کہ ـــــــــ اس نے حیدر آباد کی اس سستے زمانے کی ساڑھے آٹھ سو روپے ماہوار کی معقول تنخواہ کو اور اچھی زندگی ترک کر کے پردیس کے ایک گاؤں میں سو روپے ماہوار کی آمدن کو قبول کر لیا۔ صرف اس لئے کہ وہ اپنے مقصد حیات اور پیغام کی خدمت کر سکے۔

آپ غور تو کیجئے کہ ہم میں کتنے فی صد اور کتنے فی ہزار نہیں کتنے فی لاکھ لوگ یہ قربانی دے سکتے ہیں؟

ابوالاعلیٰ کا یہ ایثار آج بھی میرے دل پر نقش ہے[1]

(از سید ابوالاعلیٰ مودودی، سوانح۔ افکار، تحریک صفحہ ۱۵۷، ۱۵۸)

ملاحظہ فرمائیے

نگار (پاکستان)

نیاز نمبر نکالنے کیلئے مختلف ارباب قلم کو دعوت نگارش دی جنہیں کسی نہ کسی جہت سے جناب نیاز فتح پوری سے تعلق تھا۔ ان میں ابوالاعلیٰ مودودی اور ابوالخیر مودودی (صاحبان) کا نام سرفہرست آتا تھا، کیونکہ انہوں نے بقول مولانا ابوالخیر "قلم پکڑنا حضرت نیاز کی حاشیہ نشینی میں سیکھا تھا۔ ابوالاعلیٰ صاحب نے اس فرمائش کے جواب میں لکھا اور جناب نیاز نے اس پر کیا تبصرہ فرمایا، یہ ایک الگ داستان ہے، مولانا ابوالخیر صاحب سے کہا گیا تھا۔ کہ وہ نیاز صاحب کی بھوپال کی زندگی سے متعلق کچھ لکھیں انہوں نے اس کے جواب میں لکھا، ملاحظہ فرمائیے، انہوں نے لکھا ـــــــــ

"جی ہاں! نیاز اور بھوپال پر لکھنے والا ایک یہی نا فرجام رہ گیا ہے۔ کاش ......!

قمر کو مرحوم ہوئے ایک زمانہ بیت گیا۔ ابوالاعلیٰ "بعد از خدا بزرگ"[2] ہو گئے۔

یہ بھی ابوالخیر فرماتے ہیں، مودودی صاحب کی افتاد طبیعت اور ذہنیت پر بہترین تبصرہ ہے، صحیح اور درست تبصرہ ـــ (مرتب)

علامہ کی وفات میں

مئی ۱۹۳۸ء میں سید صاحب کو لکھنا پڑا۔ سب سے بڑا مادی سہارا جس سے مدد کی

---

[1] ہفت روزہ آئین، ۱۱ اکتوبر ۱۹۶۸ء [2] یہ حضور اقدس کی شان میں نعتیہ مصرعہ ہے، جس کا جواب نہیں۔

وقع تھی، اقبال کا سہارا تھا، سو وہ بھی یہاں پہنچتے ہی چھین لیا گیا (رحمتہ اللہ وطاب ثراہ)
مرف اپنا حضرت حکیم الامت علامہ اقبال علیہ الرحمتہ کی وفات پر لکھا ——————

کتاب میں مندرج چوہدری نیاز علی خاں صاحب کے خط سے کہ حیدرآباد میں مودودی صاحب
ی مالی حالت اچھی نہیں تھی، اور ان معلومات سے جو ہم نے حلقہ طلوع اسلام سے حاصل کی
ہیں اور جن میں مودودی صاحب کے ایک ایسے خط کا بھی ذکر آتا ہے، جو پرویز صاحب

و لکھا گیا کہ دن بھر میں دو کیلے اور ایک پانی کا گلاس میری گذر اوقات رہ گئی ہے
یہ بات کہ مولانا صاحب نے حیدرآباد (دکن) سے آٹھ سو ماہوار تنخواہ چھوڑ کر خدمت
اسلام کے لئے ایک سو روپیہ ماہوار تنخواہ ایک دور دراز غیر معروف بستی میں آ کر
قبول کر لی، اس کی صحت سے انکار و اختلاف کی پوری پوری گنجائش موجود ہے

(چودھری حبیب احمدؒ)

باب ۷

طلوعِ اسلام اور اقبالؒ

لمعات

اسلام کا عارف

ماہنامہ طلوعِ اسلام جون ۱۹۳۸ء میں لمعات کے عنوان سے۔

"کیا خبر تھی کہ "طلوعِ اسلام" جس اسلامی مفکر کے فلسفۂ حیات کا صور پھونکنے اور مسلمانوں کو صحیح اسلام سے روشناس کرانے کے لیے میدان میں نکلنے والا ہے وہ علم و عرفان کی دنیا کو یتیم اور غمزدہ چھوڑ کر خدائے کون و مکان کی لقاء کے لیے بےتاب بیٹھا ہے اور مادی قبا کو تنِ نورانی سے اتار پھینکنے پر تُلا ہوا ہے۔ سچ ہے علامہ محمد اقبال مرحوم و مغفور کو فان اجل اللہ لات کی لے اتنی پیاری لگی کہ پیاسی دنیا کو سیراب کرنے کا خیال ہی نہ رہا اور شیفتگی اور وارفتگی کے عالم میں تیز قدم اٹھاتے کہ علم و فکر کی آبادی اس نقیب زندگی کو دیکھتی کی دیکھتی ہی رہ گئی۔ مرحوم کو خیال نہ رہا کہ فطرت کی بخشائشیں کن امور کی منتظر ہیں اور علم و حکمت کو بھی ان کی کس قدر ضرورت ہے۔ حقیقت میں یہ عاشقِ رسولؐ، یہ حکیمِ اسلام، یہ علم و معرفت کا بحرِ قلزم اور اسلام کا یہ بے مثال فلسفی من کان یرجوا لقاء اللہ فان اجل اللہ لات کی صبر شکن صدا کو سُن کر کب تک صبر کرتا، اس نے غیب سے یہ صدا سُنی، لبیک کہا اور علم و حکمت کو روتا اور خود مسکراتا ہوا اپنے محبوب کے پاس چل دیا۔!!

مرحوم نے اپنے غریب خانہ پر ۲۱۔ اپریل ۱۹۳۸ء کی صبح کو ½ ۵ بجے انتقال فرمایا اور جس خوف سے ساری عمر مسلمانوں کو بےخوف کرتے رہے، اس سے یہ کہہ کر

"میں مسلمان ہوں اس لیے خوشی سے موت کا استقبال کرتا ہوں" بغلگیر ہو گئے اور اپنے آخری وقت میں بھی دنیا کو اسلام کی تفسیر بتادی۔!

آپ کی وفات سے نہ صرف مشرق کی تابندہ و پایندہ شاعری کو نقصان پہنچا ہے، نہ صرف علم و حکمت کی دنیا یتیم ہو گئی ہے۔ نہ صرف اجتماعی زندگی کی شمع گل ہوتی ہے بلکہ انسانی ضمیر کا وہ احساس گُم ہو گیا، جو وحدتِ انسانی کی بنیاد، رجائیت و عمل کی اساس اور فکر و حیات کا سرچشمہ تھا۔

رحوم و مغفور اقبال نہیں نہیں، عزائم و خودداری کے پیکرِ نورانی، اردو شاعری کے
ان کے خیالات و نظریات سے ان کے کمالاتِ علمی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اور
ہنے اپنی عمر کا بیشتر حصہ لاہور میں گزارا اور ہندوستان میں رہ کر ہندوستانی کہلاتے
قت میں وہ کسی ایک ملک کسی ایک قوم یا کسی ایک دور کی شخصیت اور ملکیت
بلکہ وہ دورِ حاضرہ کی انسانیت کی امانت تھے۔ وہ حکیم تھے ان کی تشخیص درست
ور بیماری کے اسباب کو اچھی طرح سمجھتے تھے اور انہوں نے انسان کی مصیبتوں
علاج تجویز کیا تھا، اس کی بنیاد بھی انسانیت اور ضمیر کی آواز تھی۔

قبال کا عقیدہ تھا، اور کون اسلام کا عارف اور حکیم ہے جو اس کا قائل نہ ہو، کہ
م میں اتنی وسعت، اتنی ہمہ گیری اور اتنی صلاحیت موجود ہے جو قوم اپنے نظام
ی کو قرآن کریم کے سپرد کر دے گی۔ قرآن زندگی کے قدم قدم پر اس کی رہنمائی
گا۔ اور قوم کا مزاجِ عقلی اس سے تقویم پاتا رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ مرحوم زندگی
سی نظام سے مطمئن نہ تھے اور دنیا کی کوئی غلط تحریک ان کے دماغ کو متاثر نہ کر
ان کے نزدیک زندگی کا مکمل نظام اور ضابطہ حیات صرف اسلام ہے۔ اور بلاشبہ
س بھی مرحوم کی سی گہری نظر رکھے گا۔ وہ ہزار ٹھوکریں کھانے کے بعد اس نتیجہ پر
ے گا۔ (ماہنامہ طلوع اسلام اقتباسات ص ۵ تا ۶)

۲۱- اپریل ۱۹۳۸ء

علامہ اقبالؒ کے "یوم وفات" پر تقریر

بیسویں صدی کا آغاز ہے، مشرق کی تہذیب و تمدن کے ٹمٹمانے والے آخری
رغ بھی گل ہو چکے ہیں۔ مغرب نے ایک نئے نظام تمدن کی طرح ڈالی ہے جس کی درخشندگی
و تابناکی نے بڑے بڑے دیدہ وروں کی نگاہوں میں خیرگی پیدا کر رکھی ہے۔ دنیا بھر
قومیں اس تہذیبِ جدید کی نقالی میں فخر و سعادت محسوس کر رہی ہیں۔ جلیل القدر
مایانِ روزگار اس نئے تمدن کو انسانیت کے مصائب و نوائب کے لیے مسیحا سمجھ رہے ہیں
ے سے بڑے مفکر انسانی دانش و بینش کے اس اوجِ کمال پر نازاں و فرحاں دکھائی
یتے ہیں۔ ہر طرف سے اس نئی روشنی کی مدح و ستائش میں قصائد لکھے جا رہے ہیں

چاروں سمت سے تحسین و تبریک کے غلغلے بلند ہو رہے ہیں۔ چھوٹے بڑے
نسخۂ کیمیا کی برکات کے معترف ہیں ایسا دکھائی دیتا ہے گویا انسان نے
فردوسِ گم گشتہ کو پھر سے پالیا جس کی تلاش میں اس نے ساری عمر دشت پیما
اور صحرا نوردیوں میں گزار دی تھی۔ نئے انداز کی سیاست، نئی وضع کی معاشرت، نئے
کے طور طریق نرالے تعلیم کے ڈھب انوکھے، تمام نظامہائے کہنہ کی بنیادیں تک اکھڑ
جا چکی ہیں اور نئے نقشے کے مطابق جدید بنیادوں پر اس تہذیب نو کے قصر فلک
ئی عمارت اوپر کو اٹھتی چلی جا رہی ہے جس کی رفعت و بلندی، نقش و نگار، آئینہ
حریر و اطلس کے نگاہ فریب پردے، بجلی کے قمقمے اور ان قمقموں کی عالمتاب روشنی
میں ایک رنگین دنیا، ہر دیکھنے والے کی نگاہ کو حیرت کدہ بنا رہی ہے کہ اتنے میں مشرق
کے تیرہ و تار ویرانوں کا ایک تیس سالہ نوجوان اس طلسم خانۂ ہوش ربا میں جا نکلتا
وہ تہذیب نو کے اس جہانِ رنگ و بو میں کھویا کھویا ادھر ادھر پھرتا ہے۔ ہر شے
ایک غائرانہ نگاہ ڈالتا ہے ہر چیز کو متجسسانہ نظر سے پرکھتا ہے۔ کہیں رکتا ہے
پہروں کسی گہری فکر میں ڈوبا ہوا خاک کے ذروں کو ٹکٹکی لگائے دیکھتا رہتا ہے
پھر اٹھتا ہے تو دیوانوں کی طرح اپنے آپ سے باتیں کرتا ہے ہونہار ایسا کہ بڑے بڑے
مفکرین اسے مستقبل کا ستارہ قرار دیتے ہیں لیکن اس کے اس کمال ہوش میں
ایسے غیر محسوس سے "جنوں" کی آمیزش ہے جو اسے دوسرے ہوش مندوں سے یکسر
الگ کئے ہوئے ہے۔ وہ فکر و نظر اور ہوش و جنوں کے اس نرالے امتزاج سے
تہذیب جدیدہ کے اس طلسم کدہ کے ایک ایک عنصر کو دیکھتا ہے اور عین اس وقت
جبکہ ساری فضا اس نظام تمدن کی توصیف و ستائش میں ڈوبی ہوئی ہے اس
لبوں پر خفیف سی ہنسی اور اس کی آنکھوں میں ہلکے سے تبسم کی موج کے ہلکورے
نظر آتے ہیں وہ اس پورے تماشے کو اپنی نگاہوں کے دامن میں سمیٹ کر لوٹتا
ہے اور لبِ ساحل ایک اونچی سی چٹان پر کھڑا ہو کر پیچھے دیکھتا ہے اور بلند آواز سے
پکارتا ہے کہ

دیارِ مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا

اور یاد رکھو کہ

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

یہ جناب پرویز کی تقریر کا ایک اقتباس ہے جو ہم نے ان کی کتاب ... اور قرآن کے صفحہ ۱۰۵ اور ۱۰۶ سے لیا ہے جس سے یہ واضح کرنا مقصود تھا کہ ... حضرت حکیم الامت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ سے کس قدر متاثر ہیں۔ ویسے تو علمی ذوق ... والے حضرات یہ خوب جانتے ہیں کہ ان کا کوئی مضمون اور کوئی خطاب ایسا نہیں جس ... حضرت علامہؒ کی فکر کی جھلک اور ان کے کسی فرمان کا حوالہ نہ ہو۔ (مرتب)

اقبال کا پیغام نوجوانانِ ملت کے نام

ایک اقتباس

"تاریخ کے اوراق کو ساڑھے ... ہزار سال آگے الٹیے اور قومِ بنی اسرائیل سے ہندی مسلمانوں تک آ پہنچئے۔ آپ ... دیکھیں گے کہ انیسویں صدی کے اخیر اور بیسویں صدی کے اوائل میں یہاں کے ... مسلمانوں کی حالت بعینہٖ وہی ہو چکی تھی جس کا نقشہ قرآن کریم نے داستانِ بنی ... اسرائیل کی شکل میں کھینچا ہے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب شجرِ ملت کی ہر شاخ پر افسردگی اور پژمردگی چھا چکی تھی۔ ... ت ہائے دراز کی غلامی اور محکومی سے ان کے حوصلے پست، ہمتیں کمزور، افکار جامد ... اعمال خامد، ارادے سقیم اور تمنائیں عقیم ہو چکی تھیں۔ ہر شعبۂ زندگی بساطِ بے نظام ... ہر فردِ کارواں ناقۂ بے زمام تھا۔ دماغ فکر سے عاری۔ دل سوز سے خالی، نگاہیں ... بے نور، قلب بے حضور، قوم کیا ایک راکھ کا ڈھیر تھی جسے مخالف ہوائیں جدھر ... چاہے اڑائے پھر رہی تھیں۔ یہ تھا وہ زمانہ جس میں مبداءِ فیض کی کرم گستری ... نے اس قوم کو اقبالؒ جیسا مردِ خود آگاہ و خدامست عطا کر دیا جس نے اپنی نفسِ گداز بیں ... سے اس مردوں کی بستی میں صورِ اسرافیل پھونک کر ان میں حیاتِ نو کے آثار پیدا کر دیئے"

(اقبال اور قرآن صد ۵۲ از پرویز)

اقبالؒ اور ملّت

۱۹۴۰ء کے یوم اقبال کی تقریر

"۱۹۳۸ء میں جب پہلا یوم اقبال منایا گیا تو میں نے م
برادر ٹڈ کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہو
کہا تھا کہ حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کی یاد میں مرجھ
آنکھوں میں آنسو ڈبڈبے یوم اقبال تو سینکڑوں منائے جائیں گے لیکن گلے میں پھولو
ہار ڈال کر زمزمۂ تہنیت وغلغلۂ تبریک سے سرمست یوم اقبال منانے کا سہرا تو ب
کے سر ہی رہے گا۔ نہ جانے کونسی قوت تھی جس نے میری زبان سے اس وقت یہ الف
کہلوا دیئے کہ دوسرے ہی سال ہمیں سر جھکائے آنکھوں میں آنسو ڈبڈبائے" یوم اق
منانا پڑا۔ بہر حال اس وقت اپنے بربط ہستی کے ان تاروں کو نہیں چھیڑنا چاہتا جن
یہ المیہ نغمات ہیں کہ ہمیں ایسے مواقع پر سکھایا گیا ہے کہ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ الَّ
اذا اصابتهم مصيبة قَالُوٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ

مقام اقبالؒ

صندل ہال شملہ کی ایک تقریر

(اقبال اور قرآن ص

" دنیائے اسلام عجیب پیچ وتاب میں تھی
کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کیا جائے کہ
میں مبدا فیض کی کرم گستری نے ان میں ایک ایسی گراں مایہ ہستی کو پیدا کر دیا جس
نگاہِ دوررس نے انسانی تخیلات کے تہ بر تہ پردوں کو قرآن کریم سے ہٹا کر عروس
حقیقت کو بے نقاب دیکھ لیا اور وہ اسلام جو مدت ہائے دراز سے عجمی افسانوں کی چیس
بن چکا تھا پھر سے اپنی اصلی حالت میں پہچانا گیا۔ خدائے ذوالمنن کی موہبت کبریٰ ۔
اس شخص کو دماغ ایسا عطا ہوا جو علم وحکمت کے بلند ترین مقام تک پہنچ چکا تھا
اور اس کے ساتھ ہی قرآن کی محبت نے اس کے سینے میں وہ قلب روشن رکھ دیا
صہبائے ایمان کا شفاف آبگینہ کہنا چاہیئے۔ ان دونوں کے امتزاج سے وہ نگا
ہوئی جو ہزار پردوں میں چھپی ہوئی حقیقت کو بھی بے نقاب دیکھ لے۔ اس نگا
حقیقت شناس کا نام تھا ___ اقبال"

(اقبال اور قرآن ص ۸۰)

اقبال کی کہانی خود اقبالؒ کی زبانی

ایک اقتباس

" انیسویں صدی کے آخر شب کے ستارے جھلملا رہے ہیں اور بیسویں صدی کی نازنینۂ سحر انگڑائیاں لے رہی ہے قلبِ زندہ دلانِ پنجاب یعنی لاہور کی کیف بار فضا ئیں شباب و شعر کی نکہتوں اور رنگ و تعطر کی نزہتوں سے دامانِ باغباں و کفِ گلفروش کا منظر پیش کر رہی ہیں گورنمنٹ کالج کی درس گاہ اپنے معیارِ تعلیم کی بلندی کے ساتھ ساتھ دولت مند خاندانوں کے عشرت پسند نونہالوں کی لاابالیوں کے لیے دور دور تک شہرت حاصل کر چکی ہے کہ اتنے میں سیالکوٹ کے ایک متوسط خاندان کا نہایت ذہین طالب العلم اس حیرت کدۂ علم و تماشا میں آنکلتا ہے۔ شروع شروع میں جہاں وہ نوجوان اس فضا کو اپنے لیے نامانوس پاتا ہے، وہاں خود وہ فضا بھی اس نووارد کو اجنبی سا محسوس کرتی ہے لیکن رفتہ رفتہ کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ وہ نووارد طالب العلم اپنی سحر طرازیوں سے اس پوری فضا پر چھا جاتا ہے اور جس محفل میں شریک ہو جاتا ہے اسے تبسم فشاں و قہقہہ بار بنا دیتا ہے علمی منازل میں اس کا یہ عالم ہے کہ اساتذہ اس کا معلّم کہلانے میں فخر محسوس کرتے ہیں دستوں کی مجلس میں یہ کیفیت کہ ہر شخص اس سے قریب تر ہونے میں ایک خاص نشاطِ روح محسوس کرتا ہے اس کی شرکت سے شعر و سخن کی محفلوں میں ایک تازہ حرارت پیدا ہو جاتی ہے۔"

(اقبال اور قرآن ص ۱۲۴)

بحضور ملت

ایک اقتباس

" ایک پرزہ دیکھا تو اس پر گویا آتشیں حروف میں چند شعر لکھے ہوئے ملے

بجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است

سرود بر سرِ منبر کہ ملت از وطن است چہ بے خبر ز مقامِ محمدِ عربی است

بمصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

پڑھنے والوں میں سے ایک نے کہا کہ جن صاحب کا نام لیا گیا ہے یہ تو سنا ہے

کسی دینی مکتب کے صدر مدرس تھے۔ ایک گوشے میں ایک سفید ریش بزرگ بیٹھے تھے
انہوں نے کہا کہ یہ تو واقعی صدر مدرس تھے لیکن اس فقیر دانا کو تم کیا سمجھتے ہو۔ اس
شکل و صورت اور وضع قطع پر نہ جاؤ۔ اس کے لگے کا کوئی عالم ہم نے تو اپنی زندگی میں
نہیں دیکھا۔ بستی والے یہ سب کچھ دیکھ اور سن رہے تھے اور بیٹھے سر پیٹ رہے تھے
کہ ہم نے اس دانائے راز کی کچھ قدر نہ کی۔ یہ تو بیٹھے ہی بیٹھے دنیا کو کچھ سے کچھ کر گیا
بستی والوں نے اس مرد بزرگ سے پوچھا کہ سائیں بابا! یہ تو بتاؤ کہ یہ مردِ دانا اس قسم
کی باتیں کہتا کس طرح سے تھا۔ یہ تو ہمیں کسی اور ہی دنیا کا انسان نظر آتا ہے۔ اس نے
کہا کہ لوگوں کو یہی تو بھول ہے۔ یہ مردِ دانا اسی دنیا کا انسان تھا۔ اس نے (معاذ اللہ) نبی
ہونے کا دعویٰ کیا، نہ مہدی کا، نہ وہ مجددیت کا مدعی ہوا نہ امامت کا۔ اس نے اپنے
کو سیدھا سادا مسلمان کہا اور بس۔ بستی والوں نے پوچھا کہ ہماری بات تو وہیں کی
وہیں رہی کہ جب اس نے کوئی دعوےٰ بھی نہیں کیا تو پھر وہ ایسی باتیں کس طرح کہتا تھا
مرد بزرگ نے کہا کہ میں نے خود اس سے یہ سوال کیا تھا جس کے جواب میں مرد دانا نے اپنے
مخصوص تبسم سے کہا تھا کہ اس میں "کرامات" کی کوئی بات نہیں۔ اپنی آنکھیں جن پر
کسی بیرونی اثر کا رنگین چشمہ نہ ہو، اور قرآن کریم کی روشنی ——— اس سے وہ فراست
پیدا ہو جاتی ہے جس سے ہر شے کی حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آجاتی ہے۔

میانِ آب و گِل خلوت گزیدم ز افلاطون و فارابی بریدم،
نکردم از کسے دریوزہ چشم، جہاں را جز بچشم خود ندیدم

اقبالؒ کی کہانی خود اقبالؒ کی زبانی

یہ کہانی سوانحعمری نہیں جسمیں ترتیب واقعات کو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ یہ
صرف اقبال کے قلب و دماغ کی مختلف کیفیتوں کا مطالعہ ہے جسے زمان و مکان کی قیود
سے الگ ہٹ کر پیش کیا گیا ہے لہذا اس کہانی کو اسی زاویۂ نگاہ سے دیکھا جائے۔

ایک اقتباس:۔ "دنیا بھر کے مسائل پر گفتگو ہوتی رہی۔ ایک صاحب نے
کہا کہ (مولانا حسین احمد مدنی نے آپ کے اشعار کے جواب میں جو بیان دیا ہے وہ آپ

کی نظروں سے گزرا۔ فرمایا کہ ہاں میں نے دیکھا ہے۔ آپ نے کہا مولوی صاحب نے قوم اور ملت کے متعلق جو لفظی بحث چھیڑی ہے آپ اس کا جواب دیں گے؟ فرمایا کہ ؎

قلندر جز دو حرفِ لا الٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا　فقیہہ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا
حدیثِ بادہ و مینا و جام آتی نہیں مجھ کو　نہ کر خارا شگافوں سے تقاضہ شیشہ بازی کا

مندرجہ بالا اقتباسات ہم نے محض اس لیے دیئے ہیں کہ قارئین کے سامنے یہ حقیقت صادقہ آجائے کہ پرویز صاحب (طلوعِ اسلام) پہلے دن سے ہی حضرت علامہؒ کے افکار و تخیلات اور قرآن شناسی کے جوہروں کو صحنِ ملت میں بکھیرتا چلا جا رہا ہے اور تا ہنوز پرویز صاحب برملا و اشگاف طور پر کھلے الفاظ میں اپنے درس و خطاب میں یہ اعتراف و اقرار کرتے ہیں کہ میں نے اقبالؒ کی جوتیاں سیدھی کی ہیں اور قرآن فہمی کا انداز و اسلوب انہی سے سیکھا۔ کیا علامہؒ کی وفات سے برسہا برس بعد مودودی صاحب کا حضرت حکیم الامت سے رشتہ خیالات استوار کرنے والے متذکرہ بالا تحریرات، ایسی تحریرات حضرت مولانا کی بھی پیش کر سکیں گے؟ اگر وہ ایسا کریں گے تو ہم ان کے شکر گزار ہوں گے۔

اب ہم اس باب کو یہاں بند کر کے آگے بڑھتے ہیں۔ آیئے آپ بھی — ہماری رفاقت میں وادیٔ علم و تحقیق میں آگے قدم بڑھائیں (مرتب)

باب ۸

طلوعِ اسلام اور مودودی صاحب

اتفاق اور اختلاف

ماہنامہ طلوعِ اسلام کا آغاز

مطالعۂ اقبالؒ کے پیدا کردہ شعورِ آتشیں نے تحقیق و جستجو کی یہ تڑپ پیدا کر دی کہ پتہ کروں کہ اس چشمۂ فیض سے کن کن تشنگانِ دین و دانش نے اپنے قلب و نظر کو سیراب کیا۔ اور وہ کون مستحقِ صد تحسین و آفریں ہیں جنہوں نے حضرت حکیم الامتؒ کے خیالِ عظیم اور فکرِ بلند کو عام کرنے کے لیے سعی و کاوش سے کام لیا۔ ۱۹۳۸ء میں اپنے ضلع ہوشیار پور کے ایک مردِ بزرگ محترم قاضی عبدالحق (مرحوم و مغفور) عرائض نویس، جن کے دو بیٹے قاضی دین الحق اور احسان الحق خاکسار تحریک کے ساتھ وابستہ تھے۔ ایک بستی دولت خاں اسلامیہ سکول کے ہیڈ ماسٹر (قاضی دین الحق) اور احسان الحق گورنمنٹ ملازمت کے سلسلہ میں دہلی میں ملازم تھے۔ اور جو اپنے والدِ محترم کو طلوعِ اسلام جو اس وقت دہلی سے شائع ہوتا تھا، بھیجتے تھے، ان کے ذریعے متعارف ہوا۔ قاضی صاحب ہمارے قصبہ بجواڑہ شریف کے ساتھ ملحقہ بستی الہ آباد کے باشندے تھے۔ نہایت ذہین و فہیم، زیرک و بیدار مغز، بزرگ اور دردِ اسلام سے آشنا۔ میرے برادرِ اکبر میاں رشید احمد مرحوم نے بی اے تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد ہوشیار پور میں بزازی کی ایک بڑی دکان کھول لی تھی۔ مجھے بھی جب کبھی میں چھٹیوں میں لاہور سے گھر آتا، تو دکان پر جانا ہوتا تھا۔ راستے میں بزرگ مذکور سے ملاقات ہو جاتی، وہ بھی ہر روز بستی سے شہر جایا کرتے تھے۔ میرے آسٹریلیا مسجد کے نمازی ہونے اور درس میں جناب استادِ مکرم پروفیسر مرزا عبدالحمید خطیب مسجد ہذا کے درس کے شاگرد ہونے کی حیثیت نے مجھے تحریکِ قیامِ پاکستان سے آشنا کر دیا تھا۔ ملاقات میں قاضی صاحب میرے ذوق و شوق، جذبہ و جنون اور تڑپ و خلش کو دیکھ کر حوصلہ

افزائی فرماتے رہتے اور میرے جذبۂ شوق کو تیز تر، اور میرے رہوارِ عمل کو درست سمت کی طرف گامزن کرنے کے لیے اپنی فہم و فراست کو کام میں لاتے رہتے۔
ایک دن راہ چلتے چلتے مجھے انہوں نے ایک گھنے درخت کی چھاؤں میں رک جانے کو کہا اور فرمانے لگے بیٹا کئی دنوں سے ایک ہدایت کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن روح میں تازگی اور خیالات و احساسات میں بالیدگی پیدا کر دی تھی، کچھ اس مردِ مومن کی ہدایت و تلقین نے میرے جذبہ و عمل کے لیے تازیانے کا کام کیا۔ میں نے قصبہ میں چند احباب سے مشاورت کے بعد ادارۂ اصلاح و تبلیغ قائم کیا اور ایک لائبریری بنائی جس میں "طلوعِ اسلام" "دارالاسلام" کے مزاج کے چند پرچے جاری کرائے اور اپنی بساط کے مطابق خود اور ادھر ادھر سے دوستوں۔ بزرگوں کی مدد و تعاون سے کتابوں کا معقول ذخیرہ جمع کیا اور ایک طرح سے مذکورہ ادارہ علاقہ میں تحریکِ قیام پاکستان کا مرکز بن گیا۔ اور میرے رفقاء حسب المقدور پیغامِ اقبالؒ اور ارشاداتِ قائدِ اعظمؒ کو مسلمانوں میں پھیلاتے رہے۔
قارئین کرام معاف فرمائیں یہ تمہیدی اور تفصیلی سطور جن کے طویل ہو جانے کا مجھے احساس ہے لکھنے پر راقم اس لیے مجبور ہوا کہ اس پس منظر سے میرے قارئین کو معلوم ہو جائے کہ میں [illegible]ع اسلام کا قاری کب اور کیسے بنا اور یہ عرض کر دینے میں مجھے کوئی باک نہیں کہ میں آج تک بزمِ طلوعِ اسلام کا ممبر نہیں ہوا۔
اب میں اس طرف آتا ہوں کہ میں ایک گنہگار، خطاکار اور عام قسم کا مسلمان ہوں۔ نہ دعوئ ہمہ دانی اور نہ نازِ مسلمانی، ہاں یہ ضرور کہوں گا، کہ مزاج میرا دینی ہے اور میں بچپن ہی سے انہی سانچوں میں ڈھلا ہوں اور فکرِ اقبالؒ سے متاثر جن لوگوں نے اسے عام کرنے کا کام کیا ہے ان کا مؤدب اور معترف ہوں جن جن بزرگوں نے تحریک قیامِ پاکستان میں اسلام کے دعویٰ کے ساتھ قیامِ پاکستان کی تائید و حمایت کی ہے ان کا ادب و احترام میرے دل میں ہے اور وہ جنہوں نے اسلام کے مقدس نام پر اس کے قیام، اس تحریک کے قائد کی شدید ترین مخالفت کی ہے، ان کی دین ناشناسی غلط کاری، غلط فہمی اور ان کی غلط بینی کی روشنی میں انہیں فہم و فراست اور دین

و دانش سے عاری قرار دیتا ہوں (خیر ایک جملہ معترضہ تھا جو اس ضمن میں آگیا) دہر میں عشق محمدؐ سے اُجالا کرنے کا تمنائی۔ اور امت محمدیہ کا ایک گنہگار مرد کہلانے میں فخر محسوس کرتا ہوں۔

قیامِ پاکستان کے بعد

قیامِ پاکستان کے بعد قسامِ ازل نے قدرت کے مقاصد کی نگہبانی یا یوں کہئے کہ احتساب مخالفین

اس خیال سے رُک جاتا ہوں کہ آپ کی فکر ابھی خام اور نارسا ہے اور آپ کے قصبہ کے تمام مسلمان خوش عقیدہ اہل سنت والجماعت ہیں، کہیں آپ کے احساسات و عقائد کے نازک آبگینوں کو ٹھیس نہ لگ جائے اور آپ مجھ سے ناراض و خفا نہ ہو جائیں لیکن میری روشن ضمیری اور وقت کے تقاضا نے آج مجھے مجبور کر دیا ہے کہ آخر جو کچھ دل میں ہے کہہ ڈالوں؟

میں نے عرض کیا بزرگ ابھرنے والی نسل کو راہِ ہدایت دکھاتے ہیں۔ آپ کوئی بری بات تو نہیں سمجھائیں گے اور نہ ہی کوئی ایسی ترغیب دیں گے جو دین و ملت کے مفاد کے خلاف ہو۔ میرے اس جواب پر مسکرائے اور فرمانے لگے۔ آپ نے میرا حوصلہ بڑھا دیا ہے اب گوشِ ہوش سے سُنیئے۔ یہ کہکر انہوں اپنے تھیلہ سے جو ہمیشہ وہ اپنی کھونٹی پر لٹکائے اپنے کندھے پر لیے مسافت طے کرتے تھے (جس میں ان کا وضو کا لوٹا وغیرہ ہوتا تھا) "طلوعِ اسلام" کا پرچہ نکالا اور اُس کی ایک تحریر جو قیامِ پاکستان کی تائید و حمایت میں تھی پڑھنا شروع کر دی، میں غور سے سنتا رہا۔ زبان میری اسوقت کی علمی قابلیت سے زیادہ مشکل اور ادق تھی لیکن کافی حد تک اُس کا مفہوم و مطلب میری سمجھ میں آتا گیا۔ انہوں نے رسالہ بند کیا اور فرمایا کہ آپ ایسے پرجوش دردمند اور تحریک سے وابستہ نوجوانوں کو خود بھی اسکا مطالعہ کرنا چاہیئے اور اپنے دوسرے رفقاء کو بھی اس سے روشناس کرانا چاہیئے۔ یہ رسالہ تحریک قیام پاکستان کا نقیب اور فکرِ اقبال کا علمبردار ہے۔ میں نے ان سے وعدہ کیا کہ میں تعمیل ارشاد کرونگا یہ کہکر ہم شہر کی طرف روانہ ہوئے۔ وہ راستہ میں فرمانے لگے کہ یہ آرگن اس جمود و تعطل کو بھی ختم کرنا چاہتا ہے آج مسلمان جس کا شکار ہے آپ اسے غور سے پڑھا کریں مجھے اعتراف ہے جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے اسوقت میں اس کی ٹکسالی زبان

کو پوری طرح سمجھنے کی اہلیت و قابلیت نہیں رکھتا تھا میری نگہہ بلند، پرسوز جاں اور عزم بلند نے مجھے ان سے قرآن کی عملی تفسیر کے لیے اکسایا۔ اس مرغ نغمہ پیرا نے مجھے بھی نغمہ پیرائی پر آمادہ کر دیا۔

کچھ تو آتش بیاں، آتش ریز خطیب جناب پروفیسر مرزا عبدالحمید کے خطابات نے قیام پاکستان میرے لیے مقدر کر دیا۔ آئینۂ عقل دوربین، اور فراست مومن، مجھے حقائق ابدی کی تلاش میں کہاں کہاں لے گئی۔ اور اس پیکار حق و باطل نے مجھے تحقیق و جستجو کے کن کن میدانوں میں گھمایا اور پھرایا، جب میں ان طے کردہ مسافتوں اور قطع کردہ راستوں کا تصور کرتا ہوں، تو بے قرارانہ زبان پر یہ حرف حمد و ثنا آجاتا ہے کہ اے رب محمدؐ، روح محمدؐ کے سرشار اس دیوانے کو، اور اس مقصد جلیل کے لیے دیوانہ وار کام کرنیوالے اس فرزانے کو یہ ہمت و حوصلہ تیرے ہی دربار کرم کا عطا کردہ ہے ورنہ کہاں یہ بے سروسامان مشت خاک اور کہاں وہ بحر بیکراں جس کی شناوری جو میں نے کی ہے۔

میرے گوش تجسس سے یہ صداقت انگیز بات ٹکرائی کہ ماہنامہ طلوع اسلام کا اجراء ۱۹۳۸ء میں ہوا جس کی ادارت جناب ڈاکٹر سید نذیر نیازی کے ہاتھ میں تھی۔ میں نے حسب عادت یہ کریدنا شروع کر دیا کہ یہ پرچے کہاں سے مل سکیں گے۔ نیازی صاحب کی طرف رجوع کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ سب کچھ دہلی میں رہ گیا۔ میرے ذوق تحقیق نے شکست نہ مانی۔ میری تپش و خلش نے مجھے مجبور کیا کہ اس ٹوہ میں رہوں لہذا بخت جنوں کام آہی گیا۔ سراغ ملا کہ لیہ میں چوہدری عبدالعزیز علیگ جو جالندھر سے مہاجر ہیں، ان کے پاس ہیں چنانچہ ایک دردمند نوجوان جناب اللہ دتہ صاحب (سراج منیر) جو ہوشیارپور سے مہاجر ہیں اور لیہ میں سرکاری دفتر میں ملازم تھے، ان کے توسط سے چوہدری صاحب سے بات شروع ہوئی۔ وہ صرف اتنا مانے کہ لیہ آ کر ان کے ہاں یا اللہ دتہ صاحب کے گھر ٹھہر کر وہ اقتباسات نقل کر لوں جو مطلوب ہیں۔ چنانچہ ایک دن میں نے رخت سفر باندھا اور لیہ پہنچ گیا۔ اللہ تعالیٰ مسبب الاسباب بھی ہیں۔ ابھی میں نے عزیزم سراج منیر صاحب

کی بیٹھک میں سامان کھولنا شروع ہی کیا تھا کہ جناب اسماعیل شہید جو محکمہ انہار میں ان دنوں ایس ای ہیں، اور اُن دنوں لیہ میں تھے، انہیں غائبانہ طور پر میری کسی کتاب کے قاری ہونے کی نسبت سے مجھ سے پیار، اور ان کے دل میں میرا احترام تھا۔ انہوں نے اللہ دتہ صاحب کو پیغام بھیجا۔ کہ مجھے پتہ چلا ہے کہ چودھری صاحب لیہ میں تشریف لائے ہیں اور تم اپنے ہاں ٹھہرا رہے ہو، میرے چھوٹے بھائی یہ نہ کرو۔ انہیں میرے ہاں لے آؤ۔ چنانچہ سراج منیر صاحب مجھے ان کی کوٹھی لے گئے۔ نمازِ عصر کا وقت تھا، شہید صاحب نے چائے تیار کروائی۔ پینے کے بعد نماز عصر ادا کی اور میں اللہ دتہ صاحب سے پرچے لے کر اقتباسات نقل کرنے میں مصروف ہو گیا شہید صاحب پاک سیرت۔ تہجد گزار قسم کے مسلمانوں میں سے ہیں مختصراً یہ کہ میں نمازِ عشا کے بعد کافی رات گئے تک اپنے کام میں مصروف رہا۔ وہ تڑکے نماز کے لیے بیدار ہوئے تو میں نوٹ لے رہا تھا۔ وہ صبح کے ناشتہ سے جو ہم نے اکٹھے ہی کیا تھا، فارغ ہوئے، دفتر چلے گئے، دوپہر کو واپس آئے تب بھی میں مصروف تحریر تھا۔ دوسرے دن عصر کے بعد کچھ وقت تبادلہ خیالات کے لیے بھی نکالا۔ عزیزم سراج منیر اور چند احباب اور بھی آ گئے۔ چائے کا دور بھی چلتا رہا۔ باتیں بھی ہوتی رہیں۔ اس کے بعد پھر وہی مشغولیت۔ پہلے ہی دن کی طرح دوسری صبح تک میں نے شہید صاحب کی درود و صلوٰۃ کا، اور انہوں نے میرا نمازوں سے فراغت کے بعد قلم کاری کا نظارا کیا۔ دوسرے دن انہوں نے نمازِ فجر کے بعد تلاوت قرآن مجید سے فارغ ہوتے ہی میرا لکھتا ہوا ہاتھ تھام لیا۔ اور کہا مزلے کیا کر رہے ہو۔ آپ کی بہت ضرورت ہے۔ میں نے مسکرا کر کہا کہ آپ کا پروگرام ہی کچھ ایسا ہے وہ فرمانے لگے کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں نے عرض کیا مجھے لالچ ہے کہ جلدی کام کر لوں۔ اسی اثنا میں انہوں نے اپنے اردلی کو آواز دی کہ سراج منیر کو بلا لاؤ۔ وہ سراج منیر صاحب کو لے آیا۔ شہید صاحب فرمانے لگے کہ جاؤ چوہدری عبدالعزیز صاحب سے کہو کہ میں بھی آخر آپ کے ہاں ایک ذمہ دار افسر ہوں وہ میری ضمانت پر انہیں یہ پرچے دے دیں۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ انہیں ضرور صحیح حالت میں واپس مل جائیں گے۔ ساتھ ہی انہوں نے مسکراتے چہرے سے میری طرف مخاطب ہو کر کہا جناب

یہ سب کچھ مشروط ہے۔ آپ کو میرے ہاں ایک دو دن قیام کرنا ہوگا تاکہ جی بھر کے باتیں کر سکیں۔ میں نے اپنی آنکھ اوپر اٹھائی اور کہا کہ جناب اگر آپ مجھے ہفتوں کے قیام سے نجات دلا دیں تو مجھے آپ کی اس ہلکی پھلکی شرط مان لینے میں کیا عذر ہو سکتا ہے۔ ان کا پیام بر چودھری عزیز صاحب سے رضامندی کی صورت میں جواب لایا۔ میں ایک دن کے لیے مزید لیہ ٹھہر گیا اور دوسرے روز خوب باتیں ہوئیں اور شہید صاحب نے لذیذ مچھلی سے سیراب کیا۔ دوسرے روز ان کی اجازت سے لائلپور چلا آیا۔

میرے قاری اس متذکرہ بات کو موضوع سے الگ نہ خیال فرمائیں یہ میری دو سال کی طلب و آرزو تھی جس طرح کامیاب ہوا اس سے آپ کو یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ فرد واحد کے لیے اس قدر عرق ریزی، تلاش و جستجو کے مراحل طے کرنا کس قدر مشکل اور کٹھن کام ہے

میں یہ عرض کئے بغیر آگے نہ بڑھوں گا۔ میری ان گذارشات میں ایک مقصدِ عظیم کے لیے حقیقت فاش اشارے ہیں آپ آگے چلکر مجھ سے اتفاق کریں گے کہ یہ کچھ لکھنا ناگزیر تھا۔ اب راقم عرضِ مطلب کی طرف آتا ہے۔

طلوع اسلام ۱۹۲۵ء تمہید کے عنوان سے جناب نذیر نیازی رقمطراز ہیں:۔ اس غیر معمولی شفقت اور ہمت افزائی کے لیے جس سے مجھے طلوع اسلام کی اشاعت کا حوصلہ ہوا میں اپنی اس ناچیز کوشش کو حضرت علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال مدظلہٗ کی خدمتِ بابرکت میں پیش کرتا ہوں۔ اس امید میں کہ حضرتِ ممدوح ازراہِ نوازش اسے شرفِ قبولیت بخشیں گے

ہمی شرم دارم کہ پائے ملخ را
سوئے بارگاہ سلیماں فرستم
ہمی ترسم از ریش خند یاعیں
کہ خار مغیلاں بہ بستاں فرستم

ارادت کیش:۔ نیازی

(طلوع اسلام صفحہ ا)

ہمارے معاصرین | (ہندوستانی تہذیب اور اسلام)

ماہنامہ طلوع اسلام کا مزاج معیار اور انداز و اسلوب کیا تھا "زمانہ" جولائی ۱۹۳۵ء میں مسٹر این سی مہتہ، آئی سی ایس کے خطبے کا ترجمہ جو انہوں نے ایک سال قبل پراونشل مسلم ایجوکیشنل کانفرنس مظفر نگر میں پڑھا تھا، شائع ہوا تھا، نیازی صاحب مہتہ صاحب کے مضمون کے بعض دلچسپ اقتباسات پیش کر رہے ہیں۔ یہ خیال انگیز فکر خیز تحریر آج کے نوجوان مسلمان کو دعوتِ غور و فکر دیتی ہے لہذا چشم مسلم کے پیش نظر ہے۔ (مرتب)

اقتباسات درج ذیل ہیں

۱۔ "....... اسلام کی قوت اس کی سادگی اور رحمدلی میں ہے سب سے زیادہ اس کی دعوت اس تنبیہہ میں مضمر تھی، کہ قول اور عمل کی مطابقت ضروری ہے اسلام ہمیشہ بت پرستی، باطل توہمات اور مذہب میں چھپی ہوئی بربریت کو گوارا کرنے کا منکر رہا۔ ..... اسلام کی سادہ تعلیم سے ..... قدیم تہذیبیں حیرت زدہ ہو گئیں ..... عورتوں کو حق وراثت دیا گیا۔ ..... ہندو عورت کو شکتی یعنی قوت کا مظہر سمجھتے ہیں ..... لیکن معاشرتی نظام میں اس کی جداگانہ حیثیت تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے ..... حالانکہ عورت کا مرد کے ساتھ حصّہ چاہنا ایسا ہے جس کے جائز ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ہندو ذہنیت ایک چاپلوس ذہنیت ہے۔ وہ یا تو آپ کا دعویٰ تسلیم کرنے کو طیار ہو جاتا ہے یا منطق کے آخری حدود تک استدلال کر سکتا ہے مگر اس حالت میں کہ قول اور عمل کی مطابقت کا مطالبہ نہ کیا جائے ..... "

۲۔ "وہ مسلمان آنکھوں سے دیکھ چکے تھے، کہ بت پرستی باطل عقائد اور روایات اصنام پر ایمان لانا کیسا خسرانِ عظیم ہے ..... وہ جانتے تھے، کہ عوام کا ذہن اندرونی حقیقت کا ادراک نہیں کر سکتا۔ اس کا نتیجہ جو ہونا تھا ہوا۔ ہندوستان کی دولت سے بھرے مندر مسلمانوں کو ظلمت کدے نظر آتے۔ ان کو مسمار کر دینا ..... جس بات کو ہندو مذہبی بے حرمتی سمجھتے تھے، مسلمانوں کے نزدیک تبلیغ کا ایک مفید اور بہتر طریقہ تھا ..... جس کی وجہ سے صدیوں کی گندگی آن واحد میں دور ہو جاتی ..... مسلمانوں

بت شکنی تو سب جانتے ہیں لیکن بہت کم لوگوں کو معلوم ہو گا کہ ایک متقی مسلمان
فرمانروا فیروز تغلق بڑے احترام اور احتیاط سے اشوک کے فرمان کا ستون میرٹھ
سے دہلی لایا ٹیپو سلطان کی نسبت طالب علمی میں جو رائے قائم کی تھی، اسکو مدنظر
رکھتے ہوئے مجھے بڑی حیرت اور خوشی ہوئی کہ میسور کے حیرت انگیز مندر انہی بت
شکن کے ہاتھوں محفوظ رہے ۔ ۔ ۔ ۔ ہز ایگزالٹڈ ہائی نس نظام حیدر آباد کی ان
اہم بالشان مساعی سے کون واقف نہیں جو اجنٹا اور ایلورا کے رہینی اور لودھی آثار
کے تحفظ میں کی گئیں ۔ ۔ ۔ ۔ ہمیں اس پر متعجب نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ اسلام نے ہندوستان
میں کوئی نئی قوم آباد نہیں کی۔ اسلام یہاں صرف ایک نورانی مشعل لایا تھا جس نے انسانی
زندگی کی چھائی ہوئی ظلمتوں کو پاک کر دیا۔"

۳۔ یہ خیال غلط ہے کہ اسلام نے اس ملک کو پردے سے روشناس کیا۔ عورتوں کی
پردہ نشینی کا رواج تمام قدیم ملتوں میں پایا جاتا ہے اور ہندو تہذیب کے عروج کے زمانے
میں بھی امراء کا طبقہ سختی کے ساتھ اس پر عامل تھا ۔ ۔ ۔ ۔ یہاں پر ہندو مسلمانوں کے باہمی
ازدواج کا ذکر بے جا نہ ہو گا۔ بادشاہوں کی بین الملتی شادیاں اتحاد کا باعث نہ ہوئیں
یہ صرف ہندوؤں کی پستی کی دلیل اور اس بات کا ثبوت تھیں کہ ان کی جماعتی تنظیم کا دائرہ
خود ہندوؤں پر تنگ ہو رہا۔ ہندو مذہب کا اصل جوہر مختلف طبقوں کا فرق مراتب
ہے ۔ ۔ ۔ ۔ یہ سچ ہے کبھی کبھی ہندو شاعر و مہاتما اور مصلحان قوم کی آواز ذلیل قوموں
کی حمایت میں بلند ہو جاتی تھی مگر خاندان کی پستی کی اس دنیا میں کوئی تلافی نہیں ہو سکتی
تھی ۔ ۔ ۔ ۔ اسلام کو مساوات پر اتنا اصرار تھا کہ اس میں سمجھوتے کی گنجائش ہی نہیں
تھی ۔ ۔ ۔ ۔ یہ بنیادی اصول ہندو تمدن کے لیے بالکل نئی چیز تھا لہٰذا اسمیں شبہ نہیں
ہو سکتا کہ اشاعت مذہب میں اسلام کی فتح یابی کا باعث پست اقوام کا اس میں بخوبی
داخل ہونا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ البیرونی نے لکھا ہے ہندو قوم مغرور اور تعصب پسند ہے ۔ ۔ ۔ ۔
وہ جب تک غیر قوموں سے مساویانہ سلوک نہ کریں گے اور کھانے پینے کے فرضی قیود کے پابند
رہیں گے ان میں باہمی اتحاد و اتفاق ناممکن ہے۔ ایک ہزار سال گزر چکے ہیں۔ مگر قدیم
پابندیاں اب بھی موجود ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ عہد وسطیٰ کے مسلمان کی وہی کیفیت تھی جو آج

لہ وطنی نظریہ کو مہتہ صاحب کس فریب ہوشربا سے پیش کر رہے ہیں (مرتب)

مغربی خیالات کے ہندوستانی کی ہے۔۔۔۔ وہ کبھی عملی مثال سے لوگوں کو متا
کرتا تھا، کبھی جبر سے۔۔۔ مگر تلوار سے کبھی اعتقاد نہیں بدلتا۔۔۔۔ یہی وجہ ہے
اسلام ہمیں اپنی برکات سے پوری طرح فیضیاب نہ کرسکا۔"

۴۔ آٹھویں صدی میں عربوں کی آمد سے لیکر سولھویں صدی تک جب مغلوں نے
ہندوستان میں قدم رکھا ہے، مختلف قسم کی مذہبی تحریکات نمایاں نظر آتی ہیں، ان کا
مقصد یہ تھا کہ عوام الناس کا درجہ بلند کیا جائے۔۔۔ بھگتی کا مذہب۔۔۔۔ اسلا
کے سبب ہر دلعزیز ہوا۔۔۔ کبیر۔ رامانند۔ داؤ دیال اور ملک داس عوام ہی سے
پیدا ہوئے اور توحید و مساوات کا پیغام سنانے لگے۔ جین مذہب والے بڑے
قدامت پسند ہیں مگر سترھویں صدی کے آخر میں منکاشاہ نے ایک نئے فرقے کی
بنیاد ڈالی جو استھانک وسی کہلاتا ہے اور جس نے مندر اور مورت دونوں کو خیر
کہہ دیا۔۔۔ مگر جو فرقے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں وہ رامانند، کبیر، اور نانک جیسے
جہاں گرد فقراء اور کلاونتوں کی بدولت جاری ہوئے۔۔۔۔ سکھوں کا وجود اسلام
کے غیر ارادی مگر مہتمم بالشان کارناموں میں سے ہے۔ وشنو پرستی کے اس عام پسند مذ
نے جس کے علمبردار بنگال میں چیتن اور متھرا میں ولبھ چاریہ تھے، غریب طبقے کی بڑ
حمایت کی۔۔۔۔ ہندوستان کے شاعر اعظم تلسی داس نے رام بھگتی کا جو مسلک قا
کیا وہ بدقسمتی سے بہت ہی فلسفیانہ اور عملاً دشوار تھا۔۔۔۔ کرشن بھگتی نسبتاً زیا
ہر دلعزیز اور لوگوں کی طبعی آرام پسندی کے مناسب حال ثابت ہوئی۔۔۔۔۔ اس سلسلے
میں آریہ سماج کا ذکر بھی ضروری ہے جس کا وجود ہندو قوم کے تنزل اور اسلام کی طب
قوت کا رہین ملت ہے۔۔۔۔۔"

۵۔ "اسلام کے آتے ہی قدیم ادبیات کا زوال شروع ہوگیا اور صوبجاتی زبانیں
۔۔۔۔ صف اول میں آگئیں۔ مسلم بادشاہ اکثر علم نواز ہوتے تھے۔۔۔۔ سنسکرت کے
چند مقبول شاہکار بالخصوص قصص عربوں ہی کی وساطت سے بیرونی دنیا تک پہنچے۔
۔۔۔ سیاسی اقتدار کے دوش بدوش عربوں کی زبان بھی کسب علوم کا بین الاقوامی ذریعہ بن گئی
۔۔۔۔ ہندوستان کے پاس جو سرمایۂ علم تھا وہ عربی مصنفوں کی کاوش سے مہذب دنیا کو

دستیاب ہوا۔ ہندی ادبیات اور علوم میں انہوں نے جو اضافہ کیا گویا ایک جداگانہ چیز ہے ... مسلمان بادشاہوں کے فیض ہی سے رامائن، مہابھارت اور پران عوام تک پہنچے ... امیر خسرو کو جدید ہندی کا بانی سمجھا جاتا ہے ... عبدالرحیم خان خاناں ہندی ادب کے چند مشاہیر اعظم میں سے ہیں۔ جاہل کسانوں کو بھی رحیم کے دوہے یاد ہیں رحیم کا کوئی ہمسر نظر آتا ہے تو غیر فانی، تلسی داس جو رحیم کا ہم عصر اور دوست ہے، کبیر کی نسبت آپ کیا کہیں گے۔ اس پر ہندو اور مسلمان دونوں کا دعویٰ ہے ... سری کرشن بھگت فرقے میں مسلمان بھی شامل تھے جن میں رس خاں سب سے زیادہ مشہور ہے۔ پھر عالم اور اس کی قابل بی بی شیخ رنگریزن بھی قابل ذکر ہے۔ یہ سب کے سب بہترین برج بھاشا لکھتے تھے۔

۶۔ مسلمانوں کی عملی ذہنیت نے ادبیات میں تاریخ اور سیرت نگاری کا اضافہ کیا ... جو مسلمانوں کی آمد سے پہلے تقریباً مفقود تھی ... بابر اور جہانگیر کی تزکیں دنیا کی بہترین سوانح عمریاں ہیں میری تمنا یہ ہے کہ کلیتہً نہیں تو جزواً ہی تاریخ ہند کسی طرح ایسی دلچسپ بن جاتی جیسے بابر، گلبدن بیگم اور جہانگیر کی دلآویز تحریریں ....

۷۔ "خوراک، لباس اور خانہ داری کے سامان بھی بدل گئے۔ چینی کے برتن، اور قالین استعمال ہونے لگے۔ مسلمانوں کو دنیاوی نعمتوں سے نفرت نہ تھی ..... اسلام جہاں پہنچتا تھا شوکت، شائستگی اور آسانی کے اسباب مہیا کرتا تھا کیونکہ مسلمان بالطبع مدنیت پسند ہوتے ہیں۔

مسلمانوں نے ہندوستانی موسیقی میں جو ترقیاں کیں ان میں بھی یہی زبردست عقل سلیم کارفرما نظر آتی ہے ... ہندوستان کی پیچیدہ بین کو دیکھ کر ایک آسان اور خوبصورت ساز ستار ایجاد کیا گیا۔ سرود اور دلربا عہد اسلام میں رائج ہوئے۔ ہندو کے استغراق اور محویت میں مسلمان کی طبعی خرمی اور لذائذ حیات سے لطف اندوزی اضافہ ہو گئی۔ خیال اور ٹھمری جیسے فرحت افزا راگ ایجاد ہوئے۔ کیونکہ گرد و پیش کے موجودہ حالات سے دلچسپی لینا اور ان کو اپنی مخصوص نوعیت کے مطابق نئی صورت دے دینا اسلام کا کمال ہے ....

۸- آخری اقتباس :- ابھی تک اسلام کے اثرات کا ذکر بحوالہ ما...
کیا گیا ہے- اب مستقبل کا سوال پیدا ہوتا ہے مجھے محسوس ہوتا ہے کہ وہ روحانی قوت
جس نے معمولی ہاتھ پاؤں کے انسان کو ہمت آفرین اور جانبازانہ بنا دیا تھا، عصر حاضر میں کارنا...
عظیم ظہور میں لا سکتی ہے اسلام کی تعلیم کسی مخصوص جماعت کی ملکیت نہیں، ساری
دنیا اسکی مشترکہ وارث ہے. ہندوستان میں اسلام کی کامیابیوں سے صرف مسلمانوں ہی کو
تعلق نہیں بلکہ ساری ہندوستانی[1] قوم کو اس پہ فخر ہو سکتا ہے."

ایک حقیقت بیں انسان اور نغار اشگاف نگاہ مندرجہ بالا اقتباسات میں اس وطنی
نظریہ کی کارفرما روح کو دیکھ سکتی ہے. کس قدر زیرکی و ہشیاری اور مدبرانہ انداز
سے ہندوستانی قومیت کے جواز کے لیے دلائل تراشے گئے اور ہمیں مسلمان کو ضم
کرنے اور مدغم ہونے کی ترغیب دی اور تلقین کی گئی ہے.

تاریخ تحریک قیام پاکستان سے تھوڑی بہت واقفیت رکھنے والا مسلمان
بھی یہ جانتا ہے کہ اسوقت معرکۂ دین و وطن بپا تھا. کفر و اسلام کی یہ جنگ زوروں پر
تھی بھی حضرت حکیم الامت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کو یہ احساس شدت سے بیتاب
کئے ہوئے تھا کہ کہیں عیار برہمن کی زیرکی و عیاری اور "امام الہند" اور "شیخ الہند"
کی مہاتما گاندھی سے رفاقت مسلمان کے جسد ملی کو تباہ و برباد کر کے نہ رکھ دے
وہ بصد حسرت مضطربانہ اور بے قرارانہ پکار رہے تھے کہ

بڑھ کے خیبر سے ہے معرکۂ دین و وطن
اس زمانے میں کوئی حیدر کرار بھی ہے؟

عزیزان ملت! ان حالات میں ان کی اس خواہش کی تکمیل کے لیے کہ سادہ دل
مسلمان کو "بولہبی" اور "مصطفوی" کا فرق سمجھایا جائے اور وہ کہیں زنار پوش علماء کے
برہمو سماجی اور سوراجی اسلام کے پھندے میں پھنس کر اپنی انفرادیت نہ کھو بیٹھے
یہ ماہنامہ شروع کیا گیا تھا.

---

[1] یہی نظریۂ وطنیت کا پرچار (مرتب)

اپنی معروضات کی تائید میں
ملاحظہ فرمایئے

بسم اللہ الرحمن الرحیم ط
نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

شذرات

ہندوستان کی جماعتی فضا

"یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم ہے کہ طلوع اسلام کی اشاعت کا جو تصوّر ہم نے قائم
تھا احباب نے اس کا خیر مقدم دلی شوق اور گرمجوشی سے کیا۔ اور اگر آج ہمیں اس بات
خوشی ہے کہ ہماری یہ دیرینہ آرزو بالآخر پوری ہوئی تو صرف ان کے ایثار اور التفات
توجہ کی بدولت انہوں نے جس محبت اور ہمدردی کے ساتھ طلوع اسلام کی کامیابی کو اپنی
میابی سمجھتے ہوئے ہر ممکن طریق پر دستِ اعانت بڑھایا۔ اس کا ہمارے دل پر خاص اثر
ہے۔ ادب مانع ہے کہ یہاں ہم ان شفقت آمیز الفاظ کا ذکر کریں جو بزرگوں نے ہمارے
ق میں استعمال کئے اور جنہوں نے امید سے بڑھ کر ہماری جرأت وہمت میں اضافہ کیا۔"

دُوسرا اقتباس "طلوع اسلام کے مقاصد اور اس کی روش و ترتیب کے متعلق ہم ایک مخصوص طرزِ عمل اور مستقل نظریہ رکھتے ہیں۔"

تیسرا اقتباس "بہتر ہوگا کہ اس وقت ہم ان کی توجہ بعض ایسے مسائل کی طرف منعطف کرائیں جو حال ہی میں چند افسوسناک واقعات سے مرتب ہوئے
اور جن کو ملّت کی آیندہ زندگی میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہوگی۔
کچھ دنوں سے ہندوستان کی جماعتی فضا مسلمانوں کے لیے خاص طور سے مکدّر ہو چلی ہے
غلامی بجائے خود ایک لعنت ہے اور اگر اس لعنت میں اغیار کی چیرہ دستیوں سے بڑھ کر
ہمیں اپنی ہی بے راہ روی کی شکایت کرنا پڑے تو ظاہر ہے اس کا نتیجہ کس قدر خوفناک ہوگا
مسجد شہید گنج کا انہدام ایک ایسا جگر خراش سانحہ ہے جس کو مسلمان مدّت دراز تک فراموش
نہیں کرسکیں گے۔ رنج یہ ہے کہ اسلامیانِ ہند کی دینی اور سیاسی عصبیّت کا یہ نشان خود
ان کی بے حمیتی سے مٹ گیا۔ ...... ہم نے اس المناک حادثے کی موجودہ صورتِ حالات سے
آگے چلکر بحث کی ہے۔ سردست ہمیں اس سلسلے میں دو باتوں کی طرف اشارہ کرنا ہے۔
آج سے چند ماہ پیشتر جب علامہ اقبال مدظلہٗ نے تحریک قادیان کے متعلق اپنا

معرکتہ الآرا بیان شائع کیا ہے تو اسمیں ایک لطیف نکتہ یہ بھی تھا کہ ملی اعتبار سے مسلمانانِ ہند کا وجود اتنا بھی مستحکم نہیں جتنا یہود کا اہلِ روما کے ماتحت۔ یہودی مجلس اپنے اندرونی معاملات کے متعلق جو فیصلہ کرتی تھی۔ رومی حکام پر اس کا احترام لازم تھا اور وہ بروئے آئین مجبور تھے کہ اِن مواقع پر حکومت کا قانون مجلس کا ساتھ دے۔ کسی ملّت کے استحکام کے لیے یہ امر جس قدر ضروری ہے اسکی تشریح محتاج بیان نہیں، مگر افسوس یہ ہے کہ اپنے زمانۂ حکومت میں دوسری اقوام کو اس قسم کی حفاظت عطا کرنے کے باوجود آج مسلمان خود اس سے محروم ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اندریں حالات ہماری دشواریوں کا حل کیا ہے؟ یہی کہ ہندوستان کی سیاسی اور معاشی جدوجہد میں حصّہ لینے کے باوجود۔ جو اس ملک میں اسلامی تعلیمات کی عملی ترجمانی کے لیے بجائے خود ناگزیر ہے۔ ہم استحکامِ ملت پر نظر رکھیں تاکہ بحیثیت ایک قوم کے ہمارا نشوونما قرآن وسنت کا پابند رہے۔ اسوقت ہمارے سیاسی ماحول کی جو کیفیت ہے وہ کسی طرح بھی اطمینان کے قابل نہیں۔ آئینی اعتبار سے یعنی جہاں تک ہندوستان کے آیندہ دستور کا تعلق ہے ہمارا وجود ملّی "تحفظات" کا مرہونِ منت ہوگا۔ اور اقوامِ ہند کی باہمی مفاہمت کے ضمن میں کانگریس نے، کہ اس کو سب سے بڑھکر ہندوستان کی نمائندگی کا دعویٰ ہے اس کے لیے کلچرل اٹانومی۔ آزادیٔ تمدن۔ کی دلفریب لیکن خالی از معنی اصطلاح وضع کی ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ جن کا نتیجہ مجالس وضعِ قوانین میں دو ایک نشستوں کے اضافے یا طریق انتخاب اور ملازمتوں میں جزوی رعایات کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتا۔ استحکامِ ملت میں کہاں تک مساعد ہوسکتے ہیں۔ علیٰ ہذا آزادیٔ تمدّن کا اصول بھی سراسر غلط اور گمراہ کن ہے۔ ہندوستان کی سیاسی وطنی کی بنا جدید عمرانی تصوّرات نیشنلزم (خواہ اسکی تعبیر میں کتنی ہی گنجائشیں رکھی جائیں) پر ہے۔ اور یہ عمرانی تصوّرات اسلام کے اجتماعی نصب العین سے یک قلم بیگانہ۔ لہٰذا اسلامی تعلیمات اور تحفظِ ذات دونوں کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمان اپنے گردوپیش کے سیاسی عوامل اور اجتماعی تغیّرات کا العبور جائزہ لیتے رہیں اور اپنے لیے جو مسلک بھی اختیار کریں اس میں ان کی نظر ملت کی شیرازہ بندی اور اس کے مخصوص مقاصد پر لگی ہے۔ ہمارے لیے

غرض کی کثرت ہے۔ ہم سمجھتے ہیں یہ الزام کلیتہً صحیح نہیں، ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ ہندوستان کی سیاسی فضا بہت زیادہ پیچیدہ اور مختلف الخیال ہے اور اس میں موثر قیادت کے امکانات نہایت کم۔ یہ بھی صحیح ہے کہ ایک غلط مذہبیت، انفرادیت پسند دینی زندگی اور ہیئت ملی کے چند مسخ شدہ ادارات نے جماعت کے اندر ربط وضبط کا کوئی موقع نہیں چھوڑا۔ تعلیم یافتہ اور روشن خیال طبقہ مغربی خیالات سے مرعوب ہے۔ اور ان کا بڑا حصہ محض عملی ضروریات سے مجبور ہو کر مسلمان رہ گیا ہے۔ وہ اپنے اندر ساری تدادِ ذہنی کو تحقیق، جستجو، وسعت، رواداری، آزادی، انسان دوستی، فن (آرٹ) علم اور معلوم نہیں کن کن چیزوں کا نام لیکر چھپاتے ہیں۔ یہ سب کچھ سہی لیکن کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ ہم اپنے مستقبل سے مایوس ہو جائیں۔"

ذرا آگے چلکر "اسوقت ملت میں رہنماؤں کی کمی نہیں، ان میں بفضلہ تعالیٰ جوشِ عمل بھی ہے اور متانتِ فکر بھی۔ اور انہیں اس امر کا احساس بھی ہوگا کہ اسلام کی قیادت ایک ملی فریضہ ہے۔ ایک امانت جس کے لئے وہ خود اپنی ضمیر اور اپنی ذات کے مقدس ترین ارادوں کے سامنے جواب دِہ ہیں۔ جن لوگوں کے احساسِ ذمہ داری کا یہ عالم ہو وہ کیونکر گوارا کر سکتے ہیں کہ ان کا قدم جادہ شریعت سے ایک انچ بھی ادھر ادھر ہونے پائے وہ قوم کے امین ہوں گے اور قوم انہیں اعتماد کی نظر سے دیکھے گی۔..... ان کی سیرت اور ان کا اخلاق دوسروں کے لیے نمونے کا کام دے گا۔ یہی لوگ حقیقتاً سفینۂ ملت کے ناخدا ہیں۔ کیا آٹھ کروڑ مسلمانوں میں قیادت ورہنمائی کا یہ جذبہ فی الواقعہ ناپید ہے؟

اس سلسلے میں ہم یہ عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ہندوستان کی آئندہ اصلاحات کے متعلق ہماری ایک جماعت نے جو روش اختیار کر رکھی ہے وہ نہایت ہی عجیب وغریب ہے۔ ایک زمانے میں مسلمانوں کو یہ سبق دیا گیا تھا کہ ان کی تمام تر توجہ حصولِ آزادی پر ہونی چاہیئے۔ اس لئے کہ آزادی وہ اسم اعظم ہے جس کی برکت سے ان کی تمام مشکلات دور ہو جائیں گی۔ ان کی آزادی دنیائے اسلام کی آزادی کا پیش خیمہ ہوگی خلافتِ اسلامیہ کی تجدید واستحکام کا دیباچہ اور مسلمانانِ عالم کے احیاء وارتقاء کی

تمہید - بے شک آزادی بڑی نعمت ہے اس لیے کہ یہ عبارت ہے اس قوت سے جس سے ماتحت قومیں اپنے ماحول کو جس طرح چاہیں بدل سکتی ہیں لیکن محض اس قوت کی تمنا کافی نہیں، اس کے ساتھ مستقبل کا ایک صحیح اور واضح تصور شرط ہے - یہ اسی تصور کے فقدان کا نتیجہ ہے کہ ہمارے علمبرداران حریت نے ایک ایسی راہ اختیار کر رکھی ہے جو قوم کے حقیقی مفاد کے لیے کسی طرح بھی موزوں نہیں - بلکہ اگر اس وقت الحاد اور بے دینی کی ایک عام رو نوجوانوں میں دوڑ گئی ہے تو اس کی ذمہ داری بھی ایک حد تک انہیں پر عائد ہوتی ہے - ان حضرات نے یہ خیال نہیں کیا کہ محض ایک سیاسی اقدام سے وہ نفسیاتی کیفیت کیونکر مرتب ہو سکتی ہے، جو مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا موجب ہو - اسلام کے تجدید و احیاء کے لیے اسلامی تربیت اور اسلامی روح ناگزیر ہے - قرآن مجید نے بھی تو استخلاف فی الارض کا وعدہ اسی حالت میں کیا ہے جب ایمان کے ساتھ اعمال صالح موجود ہوں -"

ماہنامہ طلوع اسلام
اکتوبر ۱۹۳۵ء صفحہ ۲ تا ۸)

مندرجہ بالا اقتباسات سے آپ نے بخوبی اندازہ فرمالیا ہوگا کہ طلوع اسلام کس انداز کا مواد پیش کر رہا ہے اور ان تحریرات کا رخ کس طرف ہے - اب ہم کچھ مزید اس ضمن میں سامنے لاتے ہیں -

ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش

مجموعہ خطبات خالدہ ادیب خانم کے عنوان سے طلوع اسلام رقمطراز ہے

" بالآخر مشہور ترکی خاتون خالدہ ادیب خانم کے ان خطبات کا اردو ترجمہ شائع ہو گیا جو انہوں نے اس سال جامعہ اسلامیہ کی دعوت پر ارشاد فرمائے - خاتون موصوف کے خطبات کی کل تعداد آٹھ ہے جن کے شروع میں ڈاکٹر مختار احمد صاحب امیر جامعہ کا ایک مختصر سا دیباچہ ہے کتاب کا موضوع "ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش" ہے لیکن اس سے بجز ایک سیاسی کشمکش کے اور کسی آویزش کا پتہ نہیں چلتا -"

ذرا آگے چل کر

" خالدہ ادیب خانم ایک ہوشیار مقررہ ہیں اور صحافت و خطابت کے داؤ پیچ کو خوب سمجھتی ہیں مگر اس کے باوجود انہیں اپنے

مقصد میں ناکامی ہوئی اور وہ نہیں سمجھ سکیں بطور ایک پیام اور اجتماعی تحریک کے اسلام کی کیا اہمیت ہے۔ دورانِ تقریر میں جب کبھی وہ ریاست اور مسجد کی علیحدگی کا ذکر کرتے ہوئے مسلمانانِ ہند کو مشورہ دیا کرتی تھیں کہ انہیں ہندوستانی قومیت "نیشن ہڈ" کی تعمیر میں سیاست کو مسجد سے الگ تصور کرنا چاہیئے یا یہ کہ نیشنلزم (وطنیت) اور چیز ہے اور "نیشن ہڈ" (قومیت) اور تو ہمیں اُن کے الفاظ پر حیرت ہوا کرتی تھی کہ وہ کس طرح تاریخی اور اصولی دونوں پہلوؤں سے اسلامی تہذیب کے مدعا و مقاصد سے ناواقف ہیں۔ اور پھر اس کے ساتھ ہی جب وہ ترکیب وامتزاج وائتلاف SYNTHESIS پر زور دیتی تھیں تو ان کے غیر واضح اور باہم متناقض خیالات پر تعجب ہوتا تھا۔ ائتلاف ہمارے لائق اور مکرم دوست ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب کے الفاظ میں جنہوں نے اس کتاب کا ترجمہ فرمایا ہے "ترکیب وامتزاج ایک اصولِ وحدت ہے جو کسی ذاتی مفاہمت یا دوئی کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اسلام خالصًا توحید ہے اور اس میں اس قسم کے افتراق و تقسیم کی مطلق گنجائش نہیں۔

اسلام مسجد بھی ہے اور ریاست بھی، اور مسلمانانِ ہند کسی ایسی قومیت کے محتاج نہیں جو مذہب سے بے نیاز ہو۔ اگر خالدہ ادیب خانم اِس نکتے کو سمجھ لیتیں تو کبھی مسلمانوں کو یہ مشورہ نہ دیتیں کہ اصلاحِ دیہات کے پروگرام میں مسلمانوں کو گاندھی جی کے ساتھ شریک ہو جانا چاہیئے۔ یا یہ کہ اچھوت سدھار میں اُن کی امداد کریں۔ ان کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اصلاحِ دیہات ہی کے ضمن میں مسلمانوں کی ملّی ضروریات بلکہ ان کی دینی روح گاندھی جی کی حکمت و معرفت سے قطعًا مختلف ہے اور کوئی سمجھدار مسلمان اچھوت سدھار کے فریب سے مطمئن نہیں ہو سکتا۔ علیٰ ہذا ان کا یہ ارشاد نہایت عجیب و غریب ہے کہ میری ناچیز رائے میں ان کی ذات (یعنی گاندھی جی) جدید اسلام کا ایک نمونہ ہے نعوذ باللہ من ذالک۔ جب ایک دفعہ انسان کے ہاتھ سے رشد و ہدایت کا دامن چھوٹ جاتا ہے تو وہ کیسی بہکی بہکی باتیں کرنے لگتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ خانم اسلام، اور اسلامی تعلیمات سے بالکل بے خبر ہیں۔ اور اس سلسلے میں جس تھوڑی بہت واقفیت کا اظہار انہوں نے کیا ہے وہ چند سُنی ہوئی اور لکھی ہوئی باتوں یا بعض مستشرقین کی فرسودہ معلومات تک محدود ہے۔ ان کا ذہن نبوّت کی عظمت و بلندی کا اندازہ کرنے سے قاصر رہا۔ نبوّت محض تقدس کا مرادف نہیں۔ اگر گاندھی جی نے رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کا اعتراف کر لیا تو گویا اس سے رسالتِ محمدیہ کی تصدیق ہو گئی۔ تصدیقِ رسالت کے لیے ضروری

ہے کہ ہم صاحب رسالت کے بتلائے ہوئے راستے یعنی احکام قرآنی پر چلیں۔ ظاہر ہے کہ گاندھی جی کا نہ کبھی یہ مقصود تھا۔ نبوت ایک سیاسی اور اجتماعی ادارہ بھی ہے جس سے ایک نئی اخلاقی فضا کی تخلیق ہوتی ہے۔ اور اس اخلاقی فضا میں پرورش حاصل کئے بغیر افراد کمالاتِ زندگی سے محروم رہتے ہیں، لہٰذا جو شخص نبوت کا انکار کرتا ہے وہ کافر ہے۔ اور گاندھی جی کو تو نہ صرف رسالتِ محمدیہ کا انکار بلکہ یہ دعویٰ بھی ہے کہ وہ ایک اخلاقی فضا کے موجد ہیں۔ تعجب ہے کہ امیر جامعہ نے خالدہ ادیب کو اس غلط فہمی پر کیوں متنبہ نہیں کیا۔"

(ماہنامہ طلوع اسلام ۱۹۳۵ء صہ ۹۸ تا ۔۔۔۔۔)

مسلمانوں کی انتہائی خوش بختی

طلوع اسلام سنہ ۱۹۳۶ء کے چند اقتباسات

"دورِ حاضر کے مسلمانوں کی انتہائی خوش بختی ہے کہ انہیں آج مسائل حیات کا حل قرآنی روشنی میں تلاش کرنے کے لیے کچھ زیادہ جگر کاوی کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس ڈوبتی ہوئی قوم میں ایک ایسی گراں قدر ہستی کو پیدا کیا ہے جس نے اپنے دل و دماغ کی بہترین متاع کو تمام عمر ان ہی مسائل کے حل میں صرف کر دیا۔ اور اس کے نتائج کا درخشندہ موتیوں کی طرح بلا مزد قوم کے سامنے انبار لگا دیا۔ یہ بیش بہا خزانہ آج "کلامِ اقبال" کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے [illegible] اس پرچہ کی خوش نصیبی ہے کہ پیامِ اقبال کی نشر و اشاعت اس کا مقصد ہوگا۔ آج ملتِ اسلامیہ کی زندگی کا راز اسی پیام کے اندر ہے کہ یہ پیام درِ اصل قرآن کریم کا پیام ہے۔ حضرت علامہ مدظلہ العالی کی باریک بیں اور دُوررس نگاہیں حقائقِ قرآنی کے سمجھنے میں جن بلندیوں تک پہنچ چکی ہیں ان سے کوئی دیدہ ور ناواقف نہیں۔ ملتِ اسلامیہ اللہ تعالیٰ کی اس موہبتِ عظمیٰ پر جس قدر بھی ناز کرے بجا ہے۔

سابقہ طلوع اسلام کا نام بھی حضرتِ علامہ کا ہی تجویز کردہ تھا۔ اور اس کا مسلک بھی یہی تھا۔ جن زہرہ گداز مشکلات کے ماتحت اس پرچہ کی اشاعت بند ہوئی ان کے تذکرہ کی یہاں ضرورت نہیں البتہ اس کے بند ہونے کی وجہ سے ملتِ اسلامیہ کو جو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا، اس کے احساس کا اظہار تو بجبورًا ہو جاتا ہے۔ گزشتہ "یومِ اقبال" کی ترتیب کے سلسلہ میں جب دہلی کا قافلہ حضرت علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہیں

بھی طلوعِ اسلام کے احیاء کے لیے متردد پایا۔"

ان حالات کے پیشِ نظر اس پرچہ کا نام بھی "طلوعِ اسلام" ہی رکھا گیا۔ اربابِ معنی کے نزدیک تو گویا یہ سابقہ طلوعِ اسلام کا ہی دورِ جدید ہے۔ حضرت نذیر نیازی (مدیر سابقہ طلوعِ اسلام) کا اس باب میں اعلان آپ دوسری جگہ ملاحظہ فرمائیں گے۔ ہماری خوش نصیبی ہے کہ ان کی عنایات و توجہات اسی طرح اس پرچہ کے شاملِ حال رہیں گی، جیسی اُن کے اپنے پرچہ کے ساتھ تھیں۔"

"پھر ہماری خوش بختی ہے کہ ہندوستان کے ممتاز اہل الرائے اور اہل قلم حضرات کی توجہات و عنایات ہمارے شاملِ حال ہیں اور ان میں سے اکثر حضرات کی نہ صرف قلمی اعانت ہی ہمیں رہینِ منت کرے گی بلکہ ان کی بالغ نظری اور بلند نگہی ہر مسئلہ میں ہمارے لیے شمعِ ہدایت ہو گی۔ اس ضمن میں منجملہ دیگر حضرات، جناب مولانا جیراجپوری مدظلہ شمس العلماء مولانا عبدالرحمٰن صاحب قبلہ، جناب چوہدری غلام احمد صاحب پرویز بی اے۔ جناب سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب (مدیر ترجمان القرآن)، ڈاکٹر تصدق حسین صاحب خالد ایم اے پی ایچ ڈی بارایٹ لاء، جناب محمد اسد خان صاحب اسد ملتانی۔ جناب تاجور حسن اختر پی سی ایس خاص طور پر شکریہ کے مستحق ہیں۔"

اعتذار و تشکر

طلوعِ اسلام کا پہلا پرچہ وسط اکتوبر ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا اس وقت اگرچہ اس کی اشاعت میں کسی تاخیر کا مطلق خیال نہ تھا۔ لیکن بعد میں کچھ کاروباری سہولتوں اور کچھ اس امر کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ طلوعِ اسلام کے اغراض و مقاصد اور اس کی روش و ترتیب کے متعلق قارئین و احباب اور ملت کی صحیح رائے معلوم ہو جائے اس کی اشاعت قصداً ملتوی کر دی گئی۔ یہ طریقِ عمل اردو صحافت کی عام روش سے الگ ضرور ہے لیکن ہم بوجوہ اس پر مجبور تھے۔ بہرکیف ہم ان تمام معاصرین کے شکرگزار ہیں جنہوں نے ازراہِ کرم طلوعِ اسلام کے متعلق اپنی صحیح رائے کا اظہار کیا۔ ہمیں امید ہے کہ ہمارے وہ معاصر بھی جنہوں نے کسی وجہ سے ابھی تک ہماری درخواست پر توجہ نہیں کی اپنی بے اعتنائی کا سلسلہ دیر تک قائم نہیں رکھ سکیں گے، دیکھ کر بے حد مسرت ہوتی ہے کہ طلوعِ اسلام کے مقاصد اور اس کی روش کو ملک میں ہر جگہ پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا۔"

دوسرا اقتباس

قدردانانِ طلوعِ اسلام کو ہم سے شکوہ ہے کہ رسالہ کی زبان اور طرزِ ادا بالعموم دشوار اور غیر مانوس الفاظ سے پُر ہے نہیں

یہ معلوم نہیں کہ ہمارے بعض دقت پسند اور علم دوست احباب کے نزدیک ابھی طلوع اسلام کا معیار نہایت پست ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ رسالے کی نئی ترتیب ان حضرات کو پسند آئیگی ہمارا مسلک اس قسم کی ہنگامہ آرائیوں سے بالکل الگ ہے۔ اختلاف خیال کو ہم بہرحال جائز سمجھتے ہیں اور یوں بھی ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اگر کوئی چیز اسلام اور مصالح اسلامی کے منافی ہو تو اس پر دیانتداری کے ساتھ گرفت کرے۔

قارئین اجازت دیں تو ایک بات ہم بھی ان سے عرض کریں انہیں خوب معلوم ہے کہ طلوع اسلام میں کوئی ایسی چیز نہیں جو مذاق عامہ کی تسکین و اطمینان کے لیے کافی ہو اور اگر اس کا کوئی مقصد ہے تو صرف یہ کہ مسلمانوں کی ان نہایت مقدس اور گہری آرزوؤں کا اظہار کرے جن کو کچھ اُن کی بے زبانی اور کچھ اہل غرض اہل سیاست نے دبا رکھا ہے۔ کیا ان حالات میں ان کا یہ فرض نہیں کہ وہ طلوع اسلام کی کامیابی کا ہمیشہ خیال رکھیں؟

(طلوع اسلام فروری ۱۹۳۶ء)

ماہنامہ طلوعِ اسلام فروری ۱۹۳۶ء (صفحہ ۲۸ تا ۳۹) تک مولانا راغب حسن صاحب ایم اے کلکتہ کا ایک خیال انگیز مضمون "مذاہب عمرانی اور ملت اسلامی" کے عنوان سے شائع ہوا۔ فروری ۱۹۳۶ء کے طلوعِ اسلام کا آخری اقتباس پیش کیا جا رہا ہے ...

فروری ۱۹۳۶ء کے پرچہ میں چوہدری غلام احمد پرویز بی اے کا مضمون "رب کے فکر ز د حدث انسانی" صفحہ ۴۰ سے لیکر ۵۰ تک شائع ہوا۔

قارئین کرام! ان طویل اقتباسات کے اندراج سے ہمارا مقصد یہ تھا کہ ہم اس حقیقت کو سامنے لاسکیں کہ مولانا مودودی اور جناب پرویز کا قلمی تعارف کب سے تھا ۱۹۳۸ء مئی کے ماہنامہ طلوع اسلام میں "اکل حلال" کے عنوان سے جناب سید ابو الاعلیٰ صاحب مودودی مدیر ترجمان القرآن کا ایک مضمون شائع ہوا۔ "پبلشر کنش" کی طرف سے اس میں تحریر ہے کہ:-

"ہم کمال عقیدت و نیازمندی کے ساتھ رسالہ "طلوع اسلام" کو ترجمان حکیم الامت حضرت علامہ اقبال مدظلہ العالی کی خدمت میں پیش کرنے کی جسارت کرتے ہوئے آرزو رکھتے ہیں کہ جس طرح نئی روشنی کی پیدا کردہ تاریکی میں ان کا جلوۂ فکر آفتاب اسلام کے نئے طلوع کا موجب ہوا ہے اسی طرح یہ رسالہ ان کے پرتو افکار سے حقیقی معنوں میں اسم

بامسمّیٰ ثابت ہوئے" طلوع اسلام" نہایت ادب سے اُن کے حضور میں متقاضی ہے کہ

مدار جلوہ در یغ از دلم کہ خرمن حسن
بہ خوشہ چینی آئینہ کم نمی گردد

("ادارہ" ص۲)

ایک ضروری گزارش
خریداران طلوع اسلام کی خدمت میں

کے عنوان سے سید نذیر نیازی صاحب کا یہ اعلان ص۶ پر شائع ہوا ہے۔

حضرات! السلام علیکم! میں دلی مسرت کے ساتھ اس امر کا اعلان کرتا ہوں کہ طلوع اسلام کی ترتیب و اشاعت اور نظم و نسق کے فرائض اب مستقلاً ایک ایسی جماعت کے ہاتھ میں ہیں جو اس کے اغراض و مقاصد یعنی ہندوستان کی سیاسی اور اجتماعی کشاکش میں "اسلامی رائے کی ترجمانی کو بفضلہ تعالیٰ راقم الحروف سے کہیں بہتر اور احسن طریق سے سرانجام دے گی۔ میں خوش ہوں کہ جو کام تنہا ایک فرد سے نہ ہو سکا وہ بالآخر احباب کی متفقہ کوششوں سے پورا ہو رہا ہے۔ مجھے یقین ہے قدردان طلوع اسلام بھی موجودہ ذمہ داریوں میں ہر طرح سے ان کا ہاتھ بٹائیں گے۔ اس کے ساتھ ہی مجھے اس امر کی معذرت کرنا ہے کہ پچھلے ڈھائی سال میں طلوع اسلام کی انتظامی دشواریاں اور مالی خسارہ اس کی باقاعدہ اشاعت میں بار بار التواء و انقطاع کا موجب ہوتا رہا۔ بہر کیف یہ ایک دور تھا جو گذر گیا۔ طلوع اسلام کے جدید انتظامات اب ایک مضبوط بنا پر قائم ہیں اور مجھے امید ہے کہ خریداران طلوع اسلام کی عملی ہمدردی اسے مضبوط تر کر دے گی۔ ان شاء اللہ

(سید نذیر نیازی مارچ ۱۹۳۸ء)

قابل توجہ مجلہ طلوع اسلام پر مولانا مودودی صاحب کا ترجمان القرآن تبصرہ نگار ہے۔ ترجمان القرآن۔ جلد ۱۲۔ عدد ۳ ماہ صفر ۵۷ھ مطابق اپریل ۳۸ء

طلوع اسلام۔ مرتبہ حکیم ذکی احمد خاں صاحب۔ ضخامت:۔ ۸۰ صفحات شرح چندہ سالانہ ۵ روپے ملنے کا پتہ:۔ رسالہ طلوع اسلام۔ دہلی

یہ رسالہ پہلے جناب سید نذیر نیازی صاحب کی ادارت میں نکلا تھا مگر بعض وجوہ سے بند ہو گیا تھا۔ اب از سر نو اسکی اشاعت شروع ہوئی ہے اور اس مرتبہ ایک شخص کے بجائے اسکی زمام ادارت ایک مستقل بیدار مغز جماعت کے ہاتھ میں ہے جو پورے عزم اور خلوص کے

ساتھ میدان میں آئی ہے۔ اس کے اغراض و مقاصد خود اُسی کے الفاظ میں یہ ہیں
"پیامِ اقبالؒ کی نشر و اشاعت اس کا مقصد ہوگا۔" یہ مجلہ ملت اسلامیہ کی ہیئتِ
اجتماعیہ کا نقیب ہوگا۔ اور اس کی ملی زندگی کے ہر مسئلہ کا حل قرآن کریم کی روشنی میں پیش
کریگا۔" اس دور میں جبکہ زندگی کے ہر شعبہ میں غیر اسلامی تصورات سرایت کر رہے ہیں،
اور ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ بغیر سوچے سمجھے ان سے متاثر بلکہ مسحور ہو رہا ہے، امتِ مرحومہ
کی اس سے بڑی اور کوئی خدمت نہیں ہوسکتی کہ اسلامی فکر و نظر کو زیادہ سے زیادہ اصلی
رنگ میں پیش کیا جائے تاکہ اوہام و ظنون کی وادیوں میں بھٹکنے والے اپنے ادر غیر مہذب
کے سب ہر مشکل کا صحیح حل پا سکیں۔ رسالہ اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب نظر آتا ہے
یہ اس کا پہلا نمبر ہے جس کے مضامین نہایت مفید اور بلند پایہ ہیں خصوصاً
"دینِ فطرت" "نظریۂ قومیت کتاب و سنت کی روشنی میں" اور "کانگریس، لیگ
اور مسلمان" کے عنوان سے جو سنجیدہ اور تحقیقی مقالے لکھے گئے ہیں بہت خوب ہیں۔ آخر
میں "رفتارِ زمانہ" کے تحت سیاسیاتِ عالم پر ایک مجمل لیکن پرمغز تبصرہ ہے۔

"طلوعِ اسلام" کے دورِ اول کا بھی ہم نے صمیمِ قلب کے ساتھ خیر مقدم کیا تھا اور اب
دورِ ثانی کا بھی اسی طرح خیر مقدم کرتے ہیں بلکہ اس کی حیاتِ نو ہمارے لیے پہلے سے بھی
کچھ زیادہ موجبِ مسرت ہے۔ اس لئے کہ اب ذرہ ہم کو ایک ایسا رفیقِ سفر نظر آتا ہے
جو ٹھیک اسی نصب العین کی طرف چل رہا ہے جس کی طرف ہم گامزن ہیں۔ جاہلیتِ
جدیدہ کے مقابلہ میں فکرِ اسلامی کی تبلیغ کرنے والے آج اسقدر کمیاب ہیں کہ جب
تاریکی میں کوئی مجاہد نمودار ہوتا ہے تو ہمیں اتنی ہی خوشی ہوتی ہے جتنی کسی کال کے مارے
ہوئے کسان کو آسمان پر لکۂ ابر دیکھ کر ہوا کرتی ہے۔"

عزیزانِ ملت! جتنے مذکرہ مضامین کی مودودی صاحب تعریف فرما کر
تحسین آفرین کلمات لکھ رہے ہیں جناب پرویز کے قلم و دماغ اور فراستِ
مومنانہ کا نتیجہ بھی ہیں۔ مندرجہ بالا تبصرہ کو رقم کرنے والا قلم اس حقیقت
کا غماز ہے کہ طلوعِ اسلام نبوی اسلام پیش کر رہا ہے۔ اسی طرح
طلوعِ اسلام اپریل ۱۹۳۹ء کے صفحہ ۸۱ پر
"مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ اول و دوم)

شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اس مسئلہ کے متعلق مولانا صاحب کا مسلک وہی ہے جس کی تائید کتاب و سنّت سے ہوتی ہے۔ اور جس کی اشاعت کی سعادت طلوع اسلام کو بھی حاصل ہے۔ ہماری دلی آرزو ہے کہ اس رسالہ کی اشاعت عام ہو کیونکہ یہی چیزیں ہیں جو اس سیلاب بلا کو روکنے کا ذریعہ بن سکتی ہیں۔ جن میں مسلمانانِ ہند کو بہانے جانے کی کوششیں ہو رہی ہیں اور جن کوششوں میں ہماری بدبختی سے خود ہمارے بھی چند بھائی شامل ہیں۔ رسالہ ترجمان القرآن کی تقطیع پر ۶۴ صفحات پر چھپا ہے۔ کتابت۔ طباعت کاغذ اور ٹائیٹل جناب مصنف کے ذوقِ حسن اور شائستگی مذاق کا ثبوت ہیں۔ دفتر رسالہ ترجمان القرآن ملتان روڈ لاہور سے قیمت ۵ مع محصولڈاک طلب فرمائیے۔"

اسی طرح اگست ۱۹۳۹ء کے طلوع اسلام میں ص ۹۴ پر مودودی صاحب کے رسالہ "دینیات" پر تبصرہ ہے جس کا آغاز یوں کیا گیا ہے۔

"ملقۂ طلوع اسلام میں مولانا مودودی صاحب مدظلہٗ کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ زیر نظر رسالہ انہی کی تالیف ہے۔ اور خصوصیت کے ساتھ ان نوجوانوں کے لیے لکھا گیا ہے جو ہائی سکولوں کی آخری جماعتوں یا کالج کی ابتدائی منزلوں میں تعلیم پاتے ہوں"۔.......

اسی طرح ص ۸۰ "تنقیحات" پر تبصرہ ہے ہم اس مقام پر اپنی تحریر کو سمیٹتے ہوئے یہ عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ طلوع اسلام، جس کشادہ ظرفی اور وسیع القلبی سے مولانا کو دادِ تحسین دے رہا ہے وہ آپ کے سامنے ہے۔ ان تحریروں سے اُس وقت کی یک زبانی ہم نظری ہم فکری اور خیالات میں ہم آہنگی کس طرح عیاں ہے ہم مضامین میں ایک دوسرے کی تائید و حمایت میں لکھی جانیوالی تحریرات کو بخوف طوالت سامنے نہیں لا رہے

طلوع اسلام دسمبر ۱۹۴۰ء

کے "لمعات" میں طلوع اسلام مولانا مودودی صاحب کے ان نظریات و خیالات میلانات و رجحانات اور جذبات و تحریرات سے اظہارِ اختلاف کرتا نظر آتا ہے۔ ممکن ہے اس سے پہلے بھی کہیں ایسا لکھا ہو لیکن ہمارے سامنے یہی تحریر ہے اور یہ ہے وہ مقام جہاں پہنچ کر مودودی صاحب نے "مسلم لیگ کے قائداعظم" سے لیکر پاکستان کے قیام تک کی مخالفت میں اپنا زورِ قلم و زبان صرف کر دیا۔ طلوع اسلام اپنے تاثرات یوں پیش کرتا ہے۔

اقتباسات ملاحظہ ہوں

"لیکن ہماری بدبختی کی داستان یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ اب مسلمانوں میں ایک اور گروہ پیدا ہو رہا ہے

جن کی سعی و عمل کی نوعیت اور تگ و دو کا دائرہ قومیت پرستوں سے الگ ہے۔ لیکن نتیجہ کے اعتبار سے ان سے بھی زیادہ خطرناک ہے جس زمانہ میں وہ متنازعہ فیہ مسائل معرض بحث میں تھے جن کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے تو یہ حضرات قومیت پرستوں کے مخالف تھے۔ انھوں نے اپنی پوری کوشش قومیت پرستوں...... کے دعاوی کی تردید میں صرف کی یہ ثابت کرنے کے لیے کہ ہندو اور مسلمان مل کر ایک متحدہ قوم نہیں بن سکتے۔ مغربی انداز جمہوریت مسلمانوں کے لیے قابل قبول نہیں مسلمان ایک جداگانہ تہذیب و تمدن کا حامل ہے اس کا مذہب سیاست سے الگ نہیں ہو سکتا۔ وغیرہ ذالک۔ ان حضرات کی آواز جمہور مسلمانوں کی آواز سے ہم آہنگ رہی۔ اور اس طرح انہیں ساتھ ساتھ مقبولیت بھی حاصل ہوتی چلی گئی۔ لیکن جب یہ دور ختم ہونے کو آیا تو غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ یہاں ایک الگ گروہ سازی کے آثار نمایاں ہو رہے ہیں اور اس کے لیے اس نظریہ کی تبلیغ ہو رہی ہے کہ جو کچھ قومیت پرست مسلمانوں کی طرف سے پیش ہو رہا ہے، وہ بھی غلط۔ اور جو کچھ جمہور مسلمان یا یوں کہیے کہ مسلم لیگ کی طرف سے کوشش ہو رہی ہے۔ وہ بھی باطل ؎

جُرم اُو از سجدۂ تعقیر ما ان دانۂ

نہ باآں بیچارہ می سازی۔ نہ باما ساختی

"ان حضرات کا نظریہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی طرف سے اتحاد۔ مرکزیت۔ اطاعت۔ حصول حکومت وغیرہ کی جتنی کوششیں ہو رہی ہیں سب غیر اسلامی ہیں۔ نہ یہ مسلمان مسلمان ہیں۔ نہ ان کی جدوجہد اسلامی یہ سب اس قابل ہیں کہ انہیں جہنم میں دھکیل دیا جائے۔ اور ان کی سعی و عمل ایسی کہ انہیں نذر آتش کر دیا جائے۔

کیا فرماتے ہیں مودودی صاحب

"پس اگر مسلمان ایک نسلی اور تاریخی قومیت کا نام ہے اور پیش نظر مقصد صرف اس کا بول بالا کرنا ہے تو اس کے لئے واقعی یہی سبیل ہے جو تجویز کی جا رہی ہے۔ اس کے نتیجہ میں ایک قومی حکومت بھی میسر آسکتی ہے اور بدرجہ اقل دلمی حکومت میں اچھا خاصا حصہ بھی مل سکتا ہے لیکن اسلامی انقلاب۔ اور اسلامی حکومت تک پہنچنے کے لیے یہ پہلا قدم بھی نہیں بلکہ الٹا قدم ہے۔ یہاں جس قوم کا نام مسلمان ہے۔ وہ ہر قسم کے رطب و یابس لوگوں سے بھری ہوئی ہے۔ کیرکٹر

اعتبار سے جتنے عیب کافر قوموں میں پائے جاتے ہیں اتنے ہی اس قوم میں بھی موجود ہیں؟

ہم نے اِن حضرات کی روش کو قومیت پرستوں کے مسلک سے زیادہ خطرناک اس لئے کہا ہے
قومیت پرستوں کے دعاوی کی کمزوری "بداہتہً" نظر آجاتی تھی اور تھوڑی سی کوشش سے
عوام کو ان کے دام فریب سے آگاہ کیا جاسکتا تھا۔ لیکن جو نصب العین یہ حضرات پیش کر
رہے ہیں۔ اس کے صحیح اور خالص اسلامی ہونے میں کسی کو کلام نہیں ہوسکتا۔ نہ ہی کی اس کی بنا پر
مخالفت کی جاسکتی ہے۔ اس لیے جوشیلے نوجوانوں کو بالعموم جذبات کی رَو میں بہ جانے کے
لیے تیار ہوتے ہیں ان کے ساتھ ہو جانا کچھ مستبعد نہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر یہ نصب العین
اسلامی ہے تو پھر اس سے خطرہ کیا ہے؟ یہ سوال جتنا اہم ہے اتنا ہی نازک بھی ہے اس لیے
اس کی اہمیت و نزاکت کا تقاضا ہے کہ اس پر بدقت نظر غور کیا جائے۔ ہم نے اس سوال کے
متعلق ضمناً سال گزشتہ[1] بھی کچھ لکھا تھا اور اس وقت جو کچھ گزارش کیا جائے گا، اسے
انہی اشارات کی اجمالی تفصیل سمجھئے۔ سب سے پہلے واضح اور غیر مبہم الفاظ میں یہ دیکھ لیجئے
کہ مسلمانوں کی سیاست کے متعلق ہمارا نظریہ کیا ہے۔ ہمارا نظریہ۔ نظریہ نہیں بلکہ ایمان یہ ہے کہ

۱۔ مسلمان دنیا میں اللہ کے سوا کسی کا محکوم نہیں ہوسکتا۔ حکومت اسکی اپنی ہونی چاہیے۔

۲۔ اسکی اپنی حکومت سے مراد ان انسانوں کی حکومت نہیں جو اپنا نام مسلمان رکھتے ہوں بلکہ
اس کے خدا کی حکومت ہے، یعنی خدا کے ضابطہ قوانین۔ قرآن حکیم کی تنفیذ و ترویج۔ اسی کے
مطابق امر و نہی۔

۳۔ اس حکومت کا قیام و بقا اِن لوگوں کے ہاتھوں سے ہوسکے گا۔ جنکی سیرت خالص اسلامی
سانچے میں ڈھلی ہو۔ غیر اسلامی فکر و نظر کے لیے اس میں کہیں کوئی گنجائش نہیں۔

ہمارا یہ ایمان آج کا نہیں بلکہ جس دن سے طلوع اسلام مطلع شہود پر
آیا ہے۔ ہم اپنے اس ایمان کا اعلان کرتے چلے آرہے ہیں۔ لہٰذا اس باب
میں ہمارا اور ہمارے پیش نظر حضرات کا کچھ اختلاف نہیں۔ اختلاف ہے تو اس نصب العین
تک پہنچنے کے وسائل و طرق کا۔ اختلاف منزل کا نہیں رہگذر کا ہے لیکن ہمارے نزدیک یہ اختلاف
اس لیے کہ ان حضرات کی روش فی الواقعہ خطرناک نتائج پیدا کرنے کی موجب ہوجائے گی۔
اس لئے ہم اس اختلافِ راہ کو اتنی اہمیت دے رہے ہیں یہ بھی واضح رہے کہ ہمیں ان حضرات

---

[1] اس سے اندازہ ہوا کہ ۱۹۳۹ء میں بھی طلوع اسلام نے اس ضمن میں لکھا ہے (مرتب)

کی حسن نیت کے متعلق کسی شبہ کی ضرورت نہیں لیکن سنکھیا خواہ دشمن کی حیثیت سے د[illegible]
دیا جائے خواہ دوست کی حیثیت سے نادانستہ اس کا نتیجہ تو ایک ہی ہوگا۔ اس لیے ہمارے
نزدیک ان حضرات کی "نادان دوستی" قوم کے حق میں ویسی ہی ہلاکت آفرین ہے جیسے مخالفین کی
"دانا دشمنی" قوموں کے عیوب و اسقام کو بالعموم دو شقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے بعض عیوب مفلسی،
کمزوری اور پراگندگی کی بنا پر ہوتے ہیں اور بعض دولت، حکومت اور جتھہ بندی کی وجہ سے۔ اس میں
شبہ نہیں کہ قوت و دولت کے پیدا کردہ عیوب عالم انسانیت میں وہ فساد برپا کر دیتے ہیں جس میں
آج یورپ اور اس کے وابستگان دامن بری طرح مبتلا ہیں لیکن کمزوری اور مفلسی سے پیداش[ده]
عیوب بھی اپنی نوعیت کے اعتبار سے کچھ کم انسانیت سوز نہیں ہوتے۔ ہندوستان کے
مسلمان جس دور انحطاط سے گزر رہے ہیں، ظاہر ہے کہ ان میں وہ تمام عیوب موجود
ہیں جو ایک کمزور اور گری ہوئی قوم میں ہونے چاہییں۔ اس وقت مصلحین ملت (یا یوں
سمجھیے کہ مسٹر جناح اور ان کے موئدین) کی تمام توجہات اس نقطہ پر مرکوز ہیں کہ قوم سے کمزو[ری]
اور پراگندگی کو دور کیا جائے۔ تاکہ ان سے پیداشدہ عیوب و نقائص دور ہو جائیں۔
...... ہمارے یہ معترضین حضرات جن کا ذکر اوپر آچکا ہے، یہ کہتے ہیں کہ نہیں، چونکہ
قوم کی جو اخلاقی حالت آج ہے، اس سے مترشح ہوتا ہے کہ قوت آجانے کے بعد ان میں
وہی خرابیاں پیدا ہو جائیں گی جو دوسری قوموں میں ہوتی ہیں۔ اس لیے ہر وہ کوشش جو ان میں
قوت تنظیم پیدا کرنے کے لیے صرف کی جا رہی ہے مردود و ملعون ہے۔ ہمیں تسلیم ہے کہ اگر
قوت کو ضابطہ الٰہی کے تحت نہ رکھا جائے تو اس سے فساد برپا ہو جاتا ہے لیکن اس خوف سے
قوت پیدا کرنے کے خیال کو باطل اور اس کی کوششوں کو مستحق نفرین قرار دے دینا کہاں
کی دانش اطواری ہے۔ کوشش یہ کیجئے کہ قوت آنے کے بعد ان میں خرابیاں نہ پیدا ہوں
اس قسم کی کوششوں سے آپ کو کون روکتا ہے۔ لیکن یہ کوشش قوم کے ساتھ رہ کر ایک
طبیب مشفق کی حیثیت سے بروئے کار آسکتی ہے۔ الگ کھڑے ہو کر قوم کو کوسنے
سے کچھ نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔ پھر ذرا اس چیز پر بھی غور کیجئے کہ قوم اس وقت ہندی سیاست
کی کس کشمکش میں مبتلا ہے۔ ہندوؤں کی پوری قوتیں اس امر کے لیے صرف ہو رہی ہیں کہ
مسلمانوں کی جداگانہ ہستی کو فنا کر دیا جائے اور جس طرح اور بیسیوں قومیں ہندوؤں میں جذب
ہو کر اپنی ہستی کو ہمیشہ کے لیے کھو چکی ہیں مسلمانوں سے بھی یہی کچھ کیا جائے۔ ہمارے ان

معترضین کا خیال ہے کہ اس سے مسلمانوں کا کچھ نہیں بگڑتا جب ہندوستان کے مسلمان، مسلمان ہی نہیں تو ان کے رہنے سے کیا فائدہ ہے جو ان کے مٹنے سے افسوس ہوگا۔ یعنی ان کا نظریہ یہ ہے کہ جس مریض کے قویٰ اس قابل نہ رہے ہوں کہ صحت یاب ہو کر میدانِ جنگ میں جاکر لڑ سکے اس کے علاج کی کوشش بیکار ہے بہتر ہے کہ اسے انجکشن دیکر ہلاک کر دیا جائے۔ اس کے برعکس ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس کی صحت یابی کے لیے کوشش کیجئے۔ میدانِ جنگ میں لڑنے کے قابل نہ بھی ہو سکے گا تو ایک کنبہ کی پرورش کا کفیل تو ہوگا۔ کیا عجب ہے کہ اس کے پرورش کردہ کنبہ میں سے وہ بچے پیدا ہو جائیں جو آگے جاکر سپاہی ہی نہیں بلکہ جرنیل بن جائیں۔

یہ حضرات خود اپنی حالت پر غور فرمائیں ہم مانے لیتے ہیں کہ ان حضرات کے معیار کے مطابق آج نہ مسٹر جناح مسلمان ہیں نہ ہندوستان کے باقی مسلمان۔ لیکن بہر حال یہ خود تو مسلمان ہونے کے مدعی ہیں۔ اب سوچیے کہ اگر آج سے پچاس سال پیشتر انہیں حضرات جیسے کچھ مسلمان پیدا ہو جاتے جن کا نظریہ یہ ہوتا، کہ مسلمان اگر مٹتے ہیں تو مٹنے دیجئے۔ اگر ہندو انہیں اپنے اندر جذب کرتے ہیں تو کرنے دیجئے۔ اس سے نقصان کیا پہنچتا ہے تو آج ہمارے معترضین حضرات دھوتی باندھے زنار پہنے ماتھے پر سیندور کا ٹریڈ مارک لگائے اجودھیا کے کنڈے پر مہادیو کی مورتی کو ڈنڈوت کرتے نظر آتے۔ وہ پچاس برس پہلے کے مسلمان ان کے معیار کے مطابق ہزار "نامسلمان" سہی، ان کے نام نہاد مسلمان رہنے سے اتنا فائدہ تو ہوا کہ ان کی اولاد سے آج یہ سچے مسلمان پیدا ہو گئے۔ وہ (خدا نکردہ) مٹ جاتے تو آج یہ کہاں پیدا ہوتے؟ ذرا سوچیئے اگر اسپین سے مسلمان حرفِ مکرر کی طرح مٹ گئے۔ وہاں آج مسلمانوں کے قبروں تک کے نشان باقی نہ رہے اور ہندوستان کے نام نہاد مسلمان باقی رہ گئے ہیں تو ان کے صدقے آج آپ جیسے بلند نظر مسلمان پیدا ہو گئے۔ اسی طرح اگر آج ہندوستان کے مسلمانوں کا اسپین کے مسلمانوں کا سا حشر ہو جائے تو کل کو آپ جیسے کہاں سے پیدا ہوں گے یعنی وہ لوگ جن کے متعلق آپ فرماتے ہیں، کہ "ایسے ہی لوگوں نے پہلے بھی اللہ کا حکم بلند کیا تھا، ایسے ہی آج بھی کریں گے۔" اللہ کا حکم بلند کرنے کے مدعی آج اس لیے موجود ہیں کہ پہلے نام نہاد "مسلمان" مٹے نہیں تھے۔ لہٰذا آج کے نام نہاد مسلمانوں کو مٹانے کی فکر نہ کیجیے سنبھالنے کی فکر کیجئے۔ مٹانے کی فکر کرنیوالے اور بہت ہیں ؎

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے   مزہ تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی

آگے ایک اقتباس ہے جو بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ ایک دفعہ غیر اسلامی ہی سہی مسلمانوں کا قومی اسٹیٹ قائم تو ہو جائے .... یہ کتاب میں کسی دوسری جگہ آپ پڑھ لیں گے (مرتب)

آگے بڑھیے

طلوع اسلام لکھتا ہے:- ان حضرات کی بنیادی شرط یہ ہے کہ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں تغیر واقع ہونا چاہیئے۔ اس کے بعد ان کی کوششیں بہتر نتائج کی مثمر ہوں گی۔ اس میں کسے کلام ہے لیکن سوال یہ ہے کہ جن نامساعد حالات سے قوم آج دوچار ہے کیا ان میں اس قسم کے اجتماعی انقلاب کی آپ کو اجازت بھی مل سکتی ہے؟ اس سوال کو چھوڑیئے۔ آپ کہہ دیں گے کہ ہمیں حکومت کی مزاحمت کے باوجود ایسا کرنا ہوگا۔ کیا آپ کے پاس اس قسم کے انقلاب کے لیے وسائل و ذرائع بھی ہیں؟ حالت آج یہ ہے کہ سر سے پاؤں تک آپ کا ایک ایک بال غیروں کی غلامی کے آہنی شکنجہ میں جکڑا ہوا ہے۔ ایک طرف انگریز حکومت کی قانونی غلامی ہے تو دوسری طرف ہندو کی اقتصادی غلامی۔ جو قوم اس قسم کی دوہری لعنت میں گرفتار ہو ان میں ایسے اجتماعی انقلاب کی توقع رکھنا کہ وہ ایک ہی چکر میں محمد رسول اللہ والذین معہ[1] کے قدوسی پیکر میں تبدیل ہو جائے گی بہت زیادہ خوش فہمی ہے۔ اور خوش فہمی ہی کیا، عجیب تضاد ہے۔ ایک طرف خود یہ حضرات قوم سے اس قدر مایوس ہیں کہ اس کے مٹ جانے کا انہیں ذرا بھی رنج نہیں ہوتا۔ اور دوسری طرف ایسے متفاؤل کہ ان سے محیر العقول انقلاب کی توقع۔ بہرحال آج قوم کی جو حالت ہے وہ ظاہر ہے اگر اسے اپنی حکومت نصیب ہو جائے تو آج سے تو حالت اچھی ہوگی۔ انگریز کی آہنی غلامی اور ہندو کی اقتصادی غلامی تو نہ ہوگی۔ آپ کہہ دیں گے کہ اس وقت خود اپنوں کا استبداد ایسا ہوگا کہ جو مشکل آج ہے وہی اس وقت ہوگی۔ سو اول تو یہ مفروضہ غلط ہے دوسروں کی غلامی کے مقابلے میں اپنی حکومت میں انقلاب کے لئے حالات کہیں سازگار ہوتے ہیں۔ ترکی اور ایران کے انقلاب کو دیکھئے اور اس کے مقابلہ میں مثلاً شام اور مراکش کے مسلمانوں کی حالت پر غور کیجئے۔ وہاں اپنی حکومت تھی تغیر نسبتاً آسانی سے پیدا ہو گیا (یہ الگ بات ہے کہ تغیر کیسا تھا) شام اور مراکش میں غیروں کی حکومت

---

[1] ان معترضین کو تو معاذ اللہ والذین معہ کے کریکٹر میں بھی جھول نظر آتی ہے ان قدسیوں کے جن کی تربیت حضور کے ہاتھوں ہوئی (مرتب)

ہے وہاں انقلاب ایسا آسان نہیں۔ علاوہ ازیں اس چیز کو بھی سامنے رکھئے کہ ابھی اپنوں کے استبداد کا "شکنجہ" وجود میں نہیں آیا۔ ابھی تو اپنی حکومت کے حصول کے لئے جدوجہد کی جارہی ہے۔ ادھر یہ جدوجہد جاری ہے اس کے ساتھ ساتھ آپ جہاں تک حالات سازگار ہوتے جائیں۔ اس اجتماعی انقلاب کی بھی کوشش کرتے جائیے جو آپ کے ذہن میں ہے۔ جب اپنی حکومت کے آثار نمایاں ہوں گے اس اجتماعی انقلاب کی بھی داغ بیل پڑچکی ہوگی۔ یہ ہے صحیح طریق کار!

اب آخر میں دیکھئے کہ ان حضرات کی اس تخریبی روش سے قوم کو کس قدر نقصان پہنچ رہا ہے۔ خدا خدا کر کے مسلمانوں کے سامنے یہ چیزیں آنے لگی تھیں کہ تشتت و افتراق کی زندگی لعنتی زندگی ہے۔ مفلسی ناداری، بےکسی، بےبسی، کمزوری کی زندگی انسانیت کی زندگی نہیں۔ انہیں اپنی تنظیم کرنی چاہیئے۔ اپنے اندر اطاعت شعاری اور قربانی کا مادہ پیدا کرنا چاہیئے۔ وغیرہ ذالک۔ لیکن ان حضرات نے ادھر سے یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ تمام کوششیں غیر اسلامی اور ان کے علمبردار جہنم میں دھکیل دینے کے قابل ہیں۔ نتیجہ یہ کہ قوم کا وہ فعال عنصر جسے ساتھ لے کر کچھ کام کرنا تھا۔ عضو معطل ہو کر بیٹھ گیا قوم کے نوجوان بجائے اس کے کہ کچھ کام کریں سر سے پاؤں تک تنقید بن گئے جس قسم کے "معیاری مسلمان" ہمارے نوجوان خود ہیں اس کا ہمیں بھی علم ہے اور ہمارے ان معترض حضرات کو بھی۔ لیکن ان نوجوانوں کی حالت یہ ہو چکی ہے کہ وہ قوم کے ہر فرد کو ذلیل اور اور قابل نفرت سمجھنے لگے ہیں انہیں جب دیکھئے۔ استحقار کی خفیف سی ہنسی ان کے لبوں پر اور نفرت کے شکن ان کی پیشانی پر ہوں گے۔ اور یہ سب کچھ اس لئے کہ کوئی شخص اس آئیڈیل (نظری نصب العین) پر پورا نہیں اترتا جو ان کے سامنے رکھ دیا گیا ہے۔ نوجوانوں کے سامنے صحیح اسلامی نصب العین رکھنا بیشک ضروری ہے لیکن اس کے ساتھ انہیں یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ "عہد جاھلیت" کے جس دور سے ہم آج گزر رہے ہیں۔ کام کرنے والوں کو اس کا الاونس ALLOWANCE دینا بھی ضروری ہے۔

ہمیں ایک مرتبہ ایک اسی قسم کے نظری نوجوان سے ملنے کا اتفاق ہوا وہ کچھ اس قسم کے "عالم بالا" کی باتیں کر رہا تھا۔ "اقبال" نے کیا کیا؟؟ ایک بے عمل فلسفی تھا اور

افسانوں کی دنیا میں رہنے والا شاعر! جناح! لاحول ولا۔ سر سے پاؤں تک افرنگ زدہ ٹوڈی اس سے کیا ہو سکے گا۔ اگر انقلاب برپا ہوگا تو اسی شمشیر کے زور سے ہوگا۔ اس کے ہاتھ میں تلوار تھی جس کے بوجھ سے خیر سے کمر میں تین بل پڑ رہے تھے دوسرے دن ہم نے دیکھا کہ ملتِ اسلامیہ کا یہ انقلاب آفریں مجاہد اس فکر میں تھے کہ تلوار کس کے حوالہ کریں کیونکہ انہیں پنجاب سے باہر ایک ایسی جگہ جانا تھا جہاں تلوار پر لائسنس تھا۔ یہ ہے وہ خرابی جو اس نظری تعلیم نے پیدا کر دی ہے۔ جس میں تخریب ہی تخریب ہے۔ تعمیر کی کوئی شکل سامنے نہیں اور اس کا ثبوت بالکل ظاہر ہے خود ان حضرات کو تسلیم ہے کہ متحدہ قومیت اور اس قبیل کے دوسرے شاخسانے جو قومیت پرست مسلمانوں نے پیدا کر رکھے ہیں۔ ملتِ اسلامیہ کے حق میں بڑے مہلک جراثیم کے حامل ہیں۔ اب گذشتہ دو تین سال کی سیاسی کشمکش کو دیکھئے مسٹر جناح نے جو ان حضرات کے نزدیک کسی صورت میں بھی مسلمان سمجھے جانے کے مستحق نہیں۔ اس دوران میں دن رات کی ان تھک محنت سے قومیت پرستوں کے اس جال کا ایک ایک حلقہ تارِ عنکبوت کی طرح توڑ کر رکھ دیا۔ اس کے برعکس یہ حضرات جنہیں یہ دعویٰ ہے کہ ایسے ہی لوگوں نے پہلے بھی اللہ کا کلمہ بلند کیا تھا۔ ایسے ہی لوگ آج بھی کریں گے اور یہ کام ایسے ہی لوگوں کے کئے سے ہو سکتا ہے۔ وہ ذرا اپنی جدوجہد کے نتائج پر بھی غور کریں۔ وہ آج تک چار مسلمان بھی اپنے ساتھ نہیں ملا سکے یا اپنی تعلیم و تربیت سے پیدا نہیں کر سکے جو ان کے معیارِ اسلامی پر پورے اترتے ہوں اگر وہ ایسا کر سکے ہیں تو براہِ کرم بتائیں کہ وہ کون لوگ ہیں جو انہوں نے تیار کئے ہیں تاکہ ان کے نمونے سے دوسرے لوگ بھی ویسا ہی بننے کی کوشش کریں۔ اور اگر وہ ایسا نہیں کر سکے تو وہ اپنی روش کا نفسیاتی تجزیہ کر کے دیکھیں کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ ان کا نفس دوسروں کی تنقیص میں اس لئے مصروف ہے تاکہ اپنی سہل انگاری ڈھکی رہے اور اسے، چھپانے کے لئے اس نے بلند نصب العین کو آڑ بنا رکھا ہو۔ فریب نفس سے اکثر ایسا ہوا کرتا ہے۔ ہم ان حضرات کی خدمت میں باادب گزارش کریں گے

کہ وہ زمانہ کے حالات کی روشنی میں اپنے مسلک پر نظر ثانی فرمائیں اور اگر ہو سکے تو کام کرنے والوں کے ساتھ مل کر کچھ کام کریں جہاں اصلاح کی ضرورت ہو۔ اصلاح کریں۔ جہاں احتیاط کی ضرورت ہو انہیں متنبہ کریں اور اگر وہ ایسا نہیں کر سکتے تو کم از کم اس قسم کے تخریبی مسلک سے تو احتراز فرمائیں یہ غریب مسلمانوں پر بڑا کرم ہوگا۔"

(ماہنامہ طلوع اسلام دسمبر ۱۹۴۰ء)

(صفحہ ۲ تا ۱۳)

محولہ بالا تحریرات سے ہمارے قارئین اس نتیجہ پر پہنچ گئے ہوں گے۔ کہ اس قدر تائید و حمایت اور ایک دوسرے کی تعریف و توصیف کے بعد "طلوع اسلام" اور مودودی صاحب میں اس قدر شدید اختلافات اور افتراق کی خلیج کیوں حائل ہوگئی ایک اہل نظر انصاف پسند اور صداقت پسند قاری کے لئے اب یہ پتہ لگا لینا چنداں مشکل نہیں کہ مودودی صاحب کی تمام قلمی نگارشات اور عملی تگ و تاز حصول اقتدار کے لئے ہے اور اس ہوس اقتدار کی مرض نے انہیں اس سے بھی باز نہ رکھا کہ حضرت قائد اعظم رح جو ملتِ پاکستانیہ کے ایک عظیم محسن اور خدمتِ ملت میں ایک نمایاں مقام پر فائز تھے انہیں بھی معاف نہ کیا۔

بھلا کرتے بھی کیسے۔ اس کے بعد تو انہیں "والذین معہٗ رضہ" اور مجددین و مجتہدین میں بھی کوئی بلند کردار نظر نہ آیا اور نہ ہی اپنے مرتبہ کا کوئی مجدد و مجتہد۔ ہم یہاں ایک تاریخی حقیقت کو پیش کرنے کے لئے اس قدر طویل اقتباسات پیش کرنے کے لئے مجبور ہوتے ہیں تاکہ نسل نو کے سامنے تاریخ کا ایک حقیقت فشاں کردار سامنے آجائے۔ (مرتب)

باب نواں

خطباتِ مودودی

دارالاسلام خاص نمبر طلوع اسلام کے صفحات پر تحریکِ دارالاسلام کا ذکر کئی مرتبہ آ چکا ہے۔ وہ تحریک جو آخری ایام میں حضرت علامہ اقبالؒ کے تصوّرات کی آماجگاہ تھی۔ اور جسے مجازی پیکر عطا کرنے کے لیے جناب چودھری نیاز علی خاں صاحب نے اسقدر ایثار فرمایا جیسا کہ بار بار دیکھا گیا۔ سب سے بڑی دقت یہ تھی کہ اس تحریک کے لیے کوئی ایسا آدمی نہیں ملتا تھا جو مرکز میں بیٹھ کر اسے آگے بڑھائے۔ دارالسلام کے زیرِ نظر پرچہ سے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ طالب علموں کے ..... جواں سال، جواں ہمت مولوی جناب مرزا عبدالمجید صاحب ایم۔اے نے اُس کام کو اپنے ذمہ لیا ہے۔ اس اشاعتِ خاص میں انہوں نے تحریک کے مقاصد وغیرہ کی وضاحت کے ساتھ ساتھ ان تمام خیالات و آراء کو یکجا جمع کر دیا ہے جو قرآن کریم کے بارے میں مختلف مواقع پر سامنے آتے رہے۔ ارباب ذوق اس رسالہ کو طلب فرمائیں اور مطالعہ کے بعد اس تحریک کے ذمہ دار حضرات کو اپنے مشوروں سے مستفید کریں کہ ایسے کام اسی طرح چلا کرتے ہیں۔

ہمیں خوشی ہوئی کہ بالآخر دارالاسلام کی سوئی ہوئی بستی میں حرکت کا کوئی نشان تو اُبھرا۔ دارالاسلام خود ہماری آرزوؤں کا مرکز ہے اس لیے اس کے ساتھ ہمارا قلبی تعلق ظاہر ہے۔ ہماری خدمات ہر وقت دارالاسلام کے لیے حاضر ہیں۔ خدا کرے یہ نیا اقدام استقامت پذیر ہو، اور عمدہ نتائج کا مثمر۔" (طلوع اسلام ستمبر ۱۹۴۱ء ص ۶۷)

شائد کسی اور جگہ تحریر کر چکا ہوں کہ راقم بھی جناب پروفیسر مرزا عبدالحمید صاحب کے نیاز مند درسی شاگردوں میں شامل ہے۔ میں بھی استادِ مکرم مرحوم کی معیت میں دارالاسلام پٹھانکوٹ گیا تھا اور ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ وہاں ٹھہرا رہا۔ اس وجہ سے دارالاسلام کے احوال و کوائف سے کافی حد تک واقف ہوں۔

میرے پاس دارالاسلام پرچہ کی مکمل فائیل تھی جو میری مجبوری کی وجہ سے کسی کتاب چور کے فن کی نذر ہوگئی۔ میں مہاجرت کے وقت زیادہ تر کتابیں ہی ساتھ لایا تھا اور اسوقت اس خوش فہمی میں مبتلا تھا کہ لاہور پہنچتے ہی تحریک پاکستان کا ادنیٰ کارکن ہونے کی حیثیت سے زندگی کے معقول، باعزت وسائل اہل پاکستان مہیا و فراہم کردیں گے لیکن ایسا نہ ہوا۔ چنانچہ مکان معقول نہ ملنے کی وجہ سے میں نے کتابیں ایک دو ایسے دوستوں اور بزرگوں کے پاس رکھیں کہ لوگ انہیں مطالعہ و تحقیق میں لائیں۔ اسی سبب سے کئی ایک کتب جو نایاب تھیں نذر کتاب چوراں ہوگئیں۔ میرے ذہن میں پوری طرح محفوظ ہے کہ جب مرزا صاحب سیرت نبوی کے اجلاس میں (بجواڑہ شریف ضلع ہوشیارپور) میرے قصبہ میں تشریف لے گئے تھے اور میں نے وہاں ادارہ اصلاح و تبلیغ کے نام سے ایک ملی مرکز قائم کیا ہوا تھا، جس کے ذریعے تحریک قیام پاکستان کی تبلیغ و اشاعت کا کام بھی کیا جاتا تھا۔ آپ نے اپنے خطاب سے واپسی پر ماہنامہ دارالاسلام میں سیرت نبوی کے اس اجلاس کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرمایا تھا، کہ عزیزم حبیب چوہدری کی حوصلہ افزائی کیلئے انہوں نے وہاں تقریر ارشاد فرمائی اور ہوشیارپور کا دورہ کیا۔ ہمیں یہ شرف بھی حاصل ہے کہ جناب خان عبدالستار خاں نیازی بھی قیام پاکستان سے قبل ہمارے ہاں تشریف لائے اور قصبہ میں خطاب فرمایا۔ (مرتب)

خطبات

" جس زمانہ میں جناب سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ مدیر ترجمان القرآن۔ کا قیام دارالاسلام (پٹھانکوٹ) میں تھا، وہ وہاں کی مسجد میں جمعہ کا خطبہ ارشاد فرمایا کرتے تھے۔ دارالاسلام پنجاب ایک دور افتادہ ضلع میں واقع ہے جہاں مسلمانوں میں جہالت عام ہے اس لیے ضرورۃً سید صاحب کو سلیس زبان میں عام فہم مسائل کو بیان کرنا ہوتا تھا۔ اب انہوں نے ان خطبات کو ایک مجموعہ کی صورت میں شائع کیا ہے اور ظاہر ہے کہ

یہ مجموعہ کام کی چیز بن گیا ہے۔ سید صاحب کی تحریر میں متانت اور طریق استدلال میں سنجیدگی ہوتی ہے۔ یہ خصوصیات ان خطبات میں بھی موجود ہیں جو اسلام کے مبادیات کے مختلف گوشوں پر مشتمل ہیں ان کے ساتھ کہیں کہیں وہ غلو اور تشدد بھی موجود ہے جو سید صاحب کے انداز کی ایک اور خصوصیت ہے خطبات ترجمان القرآن کی تقطیع کے ۲۴۸ صفحات پر پھیلے ہوتے ہیں۔ کتابت اور طباعت کاغذ نہایت عمدہ قیمت بے جلد ایک روپیہ چار آنہ

محصول ڈاک تین آنہ۔ ملنے کا پتہ (ترجمان القرآن لاہور)

یہ ریویو ستمبر ۱۹۴۱ء کے ماہنامہ طلوع اسلام کے صفحہ ۶۷ پر کیا گیا ہوا ہے جس میں "طلوع اسلام" نے نہایت نرم و نازک الفاظ میں مودودی صاحب کے غلو اور تشدد کی نشاندہی کی ہے۔ اس زمانہ میں مودودی صاحب اپنی ایک نازیبا حرکت کی بنا پر دارالاسلام چھوڑنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ یہ تو حوصلہ عفو و درگزر تھا جس نے (چوہدری صاحب مرحوم) کو نرم کر دیا۔ اور یہ حضرت پھر دارالاسلام پہنچ گئے۔ ہم اس حقیقت کو عام کرنے پر اب اس لیے مجبور ہوئے ہیں کہ مولانا کے حواریوں نے تاریخی زندہ صداقتوں کو جامۂ باطل پہنانا شروع کر دیا ہے۔

(مرتب)

دسواں باب

مولانا مودودی اور جماعت اسلامی

"مولانا مودودی اور جماعت اسلامی" اس کتاب میں جناب ممتاز علی عاصی نے ایک عام پاکستانی مسلمان کی نظر سے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور ان کی تحریک کا جائزہ لیا ہے۔

"حرف اول" کے عنوان سے صفحہ نمبر ۱۳' ۱۴ پر رقمطراز ہیں :۔

"میں کوئی عالم تو ہوں نہیں جو مولانا کے ارشادات کو اسلام کی روشنی میں جانچ سکوں، میں تو ایک عام پاکستانی مسلمان ہوں، اس کے علاوہ مجھے کوئی دعویٰ نہیں۔ اسی وجہ سے میری تحقیق کا دائرہ زیادہ وسیع نہ تھا۔ میں نے اسلامی مسائل پر مولانا کے نظریات پر توجہ نہ دی۔ صرف یہ جاننے کی کوشش کی کہ مولانا اور ان کی جماعت کا تحریک پاکستان کے متعلق کیا نظریہ تھا، قیام پاکستان کے بعد ان کا موقف کیا تھا۔ پاکستان کی مختلف سیاسی جماعتوں کے متعلق ان کی کیا رائے ہے۔ پاکستان کی مختلف شخصیتوں کے بارے میں ان کے کیا خیالات ہیں، ملک کی بہتری اور بہبود کے متعلق وہ کیا تجاویز پیش کرتے ہیں، ہمارے علمائے کرام کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مجھ جیسے عام پاکستانی لوگوں یعنی پاکستانی عوام کے متعلق وہ کیا سوچتے ہیں۔"

جناب ممتاز علی عاصی نے "حرف اول" ۱۲ر نومبر ۱۹۶۲ء کو لکھا۔ اس کتاب میں انہوں نے مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم اور آن کی دیگر کتابوں سے حوالہ جات پیش کر کے یہ بھی ثابت کیا ہے، کہ اُنکی تحریک پاکستان کے بارے میں کیا رائے تھی، اور اس تحریک کی مخالفت میں ان کے نوک قلم پر کیا کیا آیا۔ علماء کے بارے میں ان کے رشحات قلم کیا ہیں۔ قائد اعظمؒ کے متعلق ان کا خیال کیا تھا، اور مجددین، صحابہ کبارؓ، انبیاء کرامؑ کے بارے میں اُن کے خیالات کیا ہیں۔ انہوں نے مولانا مودودی کے مختصر حالات زندگی بھی درج کئے ہیں،

مختصر حالات زندگی کے عنوان سے صفحہ نمبر ۱۷ سے ۲۲ تک لکھتے ہیں :۔

"جناب سید ابوالاعلیٰ مودودی ۲۵ ستمبر ۱۹۰۳ء کو ریاست

حیدرآباد دکن میں بمقام اورنگ آباد پیدا ہوئے، والد ریاست میں ملازم تھے۔ اسلئے مولانا کا بچپن اورنگ آباد ہی گزرا۔ جب والد نے پنشن پائی تو کنبہ اپنے آبائی وطن دہلی میں جا مقیم ہوا۔ اس وقت مولانا کی عمر تیرہ چودہ سال کی تھی۔

مولانا کی ابتدائی تعلیم گھر ہی پر ہوئی، بعد میں مدرسہ فوقانیہ میں داخل ہوئے، رسمی تعلیم کا سلسلہ زیادہ دیر تک جاری نہ رہ سکا۔ والد کی وفات پر یہ سلسلہ ختم ہوگیا۔ اس کے بعد مولانا کی تعلیم غیر رسمی طور پر ہوئی، چھوٹی عمر میں ہی مولانا نے صحافت کا پیشہ اختیار کر لیا اور سیاست میں دلچسپی لینے لگے، مولانا کا اپنا بیان ہے :۔

۱۹۱۹ء میں جب خلافت اور ستیہ گرہ کی تحریک کا آغاز ہوا تو اس میں بھی حصہ لیا اس زمانے میں میں نے گاندھی جی کی سیرت پر بھی ایک کتاب لکھی مگر ابھی وہ زیر طبع ہی تھی، کہ میرے ایک عزیز نے پولیس سپرنٹنڈنٹ سے اسکی شکایت کی اور اسے ضبط کرا دیا۔

ہفتہ وار "تاج"

اس کے بعد مولانا سی۔ پی میں جبل پور کے ایک اخبار "تاج" کے ایڈیٹر ہوگئے اور "الجمعیت" جمعیت العلمآ ہند کا اخبار تھا۔ جو سیاست میں بڑی حد تک کانگرس کا ہم نوا تھا۔ اس دور میں مولانا کانگرس کے اصولوں کی حمایت کرتے رہے، ان کی ایک تحریر ملاحظہ ہو :۔

اب ملک کے لئے ۲ دو راہیں ہیں :۔

۱۔ ایک یہ کہ اپنے جذبات و حسیات کے مطابق کانگرس کے فیصلے کو نہ مانیں اور جس طرف قدم بڑھ رہے تھے، اسی طرف بڑھتے رہیں۔

۲۔ دوسری یہ کہ کانگرس کے فیصلے پر عمل کیا جائے، اور ایک لمحہ کے لئے بھی دل میں اسکی خلاف ورزی کا خیال نہ لایا جائے پہلی راہ اختیار کرنیکا نتیجہ ہمارے مقصد کے خلاف ہے دوسری راہ گو جذبات کے خلاف ہے اور اگرچہ اس کی ترکیب آرزوؤں کے خون اور توقعات کی پامالی سے ہوئی ہے، تاہم وہ جماعت اور ایکے کی راہ ہے۔ جماعت بہرحال فرقہ بندی سے بہتر ہے، ایکا بہرصورت پھوٹ کے مقابلے میں برتری رکھتا ہے اور یکجائی کو ہر حیثیت سے علیحدگی پر ترجیح ہے۔

۱۹۲۶ء میں سوامی شردھانند کو ایک مسلمان نے قتل کر دیا۔ اس بات پر غیر مسلموں نے

بہت شور مچایا۔ ان کا کہنا تھا کہ اسلامی تعلیم مسلمانوں کو متعصب اور خونخوار بناتی ہے۔
مولانا نے اس ضمن میں مضامین کا ایک سلسلہ لکھنا شروع کیا جو "الجمعیت" میں چھپتا رہا
کچھ دیر کے بعد "الجمعیت" میں اس کی اشاعت بند ہوگئی اور مولانا نے "الجہاد فی الاسلام"
کے عنوان سے پانچسو صفحات پر مشتمل ان مضامین کو کتاب کی صورت میں شائع کیا۔
اس کتاب کی وجہ سے مولانا پہلی مرتبہ علمی دنیا میں جانے گئے۔ ۱۹۲۹ء میں مولانا
الجمعیت سے علیحدہ ہو گئے، اور دہلی چھوڑ کر حیدر آباد چلے آئے جہاں ان کے
بھائی سید ابوالخیر دار الترجمہ سے وابستہ تھے، وہاں مولانا نے تاریخ حکومت آصفیہ لکھی
۱۹۳۲ء میں انہوں نے ترجمان القرآن کی ادارت شروع کی، ان دنوں یہ رسالہ
مولوی ابو محمد مصلح کی عالمگیر تحریک قرآنی کا ترجمان تھا۔ مولانا نے رسالے پر بہت
محنت کی، اور اسے ایک امتیازی شان عطا کر دی۔

مولانا حیدر آباد میں آٹھ سال مقیم رہے۔ رئیس احمد جعفری نے اپنی کتاب "دید و
شنید" میں مولانا کی قلمی تصویر پیش کی ہے .... ذرا آگے چل کر
انہی دنوں مولانا نیاز علی[1] نے پنجاب میں ضلع گورداسپور کی تحصیل پٹھان کوٹ کے قریب
دارالاسلام قائم کیا۔ مولانا کو وہاں بھی کام کرنے کی دعوت ملی ۱۹۳۸ء میں مولانا حیدر آباد
سے پٹھان کوٹ آ گئے، ابھی کچھ زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ مولانا کے نیاز علی سے اختلافات[2]
پیدا ہو گئے، لہذا مولانا پٹھانکوٹ چھوڑ کر لاہور آ گئے، اور اسلامیہ کالج لاہور میں دینیات
کے معلم بن گئے۔

ایک سال لاہور رہنے کے بعد مولانا پھر پٹھانکوٹ چلے گئے۔ ۱۹۴۱ء میں لاہور میں جماعت
اسلامی کی بنیاد ڈالی گئی اور مولانا اس کے امیر مقرر ہوتے، ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند
کے بعد مولانا اور ان کے ہم کار پناہ لینے کیلئے پٹھان کوٹ چھوڑ کر پاکستان آ گئے۔

---

[1] مولانا نہیں چودھری نیاز علی۔ چودھری صاحب (مرحوم) تحریک قیام پاکستان
کے حامی تھے، مودودی صاحب ان کی رفاقت میں حمایت کیلئے تیار نہ ہوئے

[2] اسلامیہ کالج کو بھی اسی سبب چھوڑنا پڑا۔ ان کی جگہ مرزا عبدالحمید دینیات کے پروفیسر
مقرر ہوئے، اور قیام پاکستان کی کھلی حمایت کی۔ (راقم)

جناب ممتاز علی عاصی صفحہ نمبر ۹ پر لکھتے ہیں۔

• علمائے کرام کہتے ہیں کہ مولانا مودودی کا اسلام قرآنی اسلام سے مختلف ہے اور وہ اسلام کو اپنے مقاصد کیلئے استعمال کر رہے ہیں ...... سیاسی لوگوں کا بیان ہے کہ مولانا ہمیشہ پاکستان کے مخالف رہے اور اس کے خلاف زہر اگلتے رہے۔ مولانا کا کوئی خصوصی مسلک نہیں مقصد صرف انتشار پیدا کرنا ہے تاکہ سیاسی اقتدار حاصل کیا جائے۔

صفحہ نمبر ۱۱ پر —— نواب ممدوٹ نے بیان دیا کہ جہاد کشمیر کے بارے میں فتویٰ دینے پر چودھری محمد علی نے مولانا مودودی کو گرفتاری سے بچایا تھا۔"

اب ہم" مولانا مودودی اور جماعت اسلامی" کے چیدہ چیدہ اقتباسات ہی پیش کر سکیں گے۔ تاکہ قارئین کو اندازہ ہو سکے کہ اُن کی نظر میں مولانا مودودی کیا ہیں اور اُن کے خیالات و نظریات اور میلانات و رجحانات کیا تھے اور کیا ہیں۔

مسلم لیگ اور مولانا مودودی کی رائے

ملاحظہ فرمائیے —— " اگر لیگ کے رہنماؤں میں اسلامی حس کا شائبہ بھی موجود ہوتا تو وہ اس موقع کو ہاتھ سے نہ دیتے اور اس کا جو گہرا اخلاقی اثر مرتب ہوتا ہے۔ اسکی قدر و قیمت میں مقابلے میں کوئی نقصان جو ایسا طرز عمل اختیار کرنے کی وجہ سے حاصل ہونے کی توقع ہے قطعاً کوئی وقعت نہ رکھتا —— مگر افسوس کہ لیگ کے قائد اعظم سے لیکر چھوٹے مقتدیوں تک ایک بھی ایسا نہیں جو اسلامی ذہنیت اور اسلامی طرز فکر رکھتا ہو اور معاملات کو اسلامی نقطہ نظر سے دیکھتا ہو۔ یہ لوگ مسلمان کے معنی و مفہوم اور اسکی مخصوص حیثیت کو بالکل نہیں جانتے۔ ان کی نگاہ میں مسلمان بھی ویسی ہی ایک قوم ہیں جیسی دُنیا میں دوسری قومیں ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہر ممکن سیاسی چال اور ہر مفید مطلب سیاسی تدبیر سے اس قوم کے مفاد کی حفاظت کر دینا ہی بس اسلامی سیاست" ہے۔ حالانکہ ایسی ادنیٰ درجہ کی سیاست کو اسلامی سیاست کہنا اسلام کے لئے ازالہ حیثیت عرفی سے کم نہیں!" (مسلمان اور موجودہ سیاسی کش مکش حصہ سوم صفحہ ۳۷)

مندرجہ بالا اقتباس کتاب میں کئی جگہ نظر آئے گا۔ یہ تکرار محض اس لئے ہے کہ ہماری اُبھرنے والی نسل کو معلوم ہو سکے کہ ان مقدسین و صالحین نے نئے ایڈیشنوں سے اس کو حذف کر دیا ہے۔ آج کے حالات میں بار بار یہ سوال ذہن میں اُبھرتا ہے

کہ قائداعظمؒ اور اُس مسلم لیگ والوں کے بارے میں تو مودودی صاحب کا یہ خیال تھا جس نے پاکستان حاصل کیا آج جو مسلم لیگی کہلاتے ہیں اور ایسے شخص کی عزت و قوت کا ذریعہ بن رہے ہیں، اُن کا اپنے بارے میں (اِس تحریر کی روشنی میں) کیا خیال ہے؟ کیا وہ اپنی مسلم لیگی حیثیت متعین کرنے میں دیانتدار ہیں؟ اور وہ یہ دعوے کرنے میں حق بجانب ہیں کہ اِسی مسلم لیگ نے پاکستان حاصل کیا تھا؟

(چودھری حبیب احمدؔ)

دوسرا اقتباس ـــــ ۔ ہمارے لیڈروں کو بٹھا کر اِسلام کے بنیادی اور ابتدائی مسائل کے متعلق اِمتحان لیجئے تو شاید کوئی صاحب دو فیصد سے زیادہ نمبر نہ لے سکیں، اِلّاماشاءاللہ

(صفحہ ۶۲، ۶۳ ۔ عنوان راہ رو پشت بمنزل، مسلمان اور موجودہ سیاسی کش مکش حصّہ سوئم، از مولانا مودودی اور جماعت اسلامی، صفحہ ۳۶، ۳۷)

تیسرا اقتباس ـــــ ۔ پہلی وجہ یہ تھی کہ اِس نئی حرکت کے دَور میں عامۃ المسلمین کی قیادت و رہنمائی ایک ایسے گروہ کے ہاتھ میں چلی گئی، جو دین کے علم سے بے بہرہ اور محض قوم پرستانہ جذبے کے تحت اپنی قوم کے دنیوی مفاد کیلئے کام کر رہا ہے، دین کا علم رکھنے والا عنصر اس گروہ میں اتنا بھی نہیں جتنا آٹے میں نمک ہوتا ہے اور اِس قدر قلیل کو بھی کوئی دخل رہنمائی میں نہیں ہے" صفحہ ۶ ـ ۷

(مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصّہ سوئم) (از مولانا مودودی اور جماعت اسلامی صفحہ ۴۲)

چوتھا اقتباس ـــــ مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرے لئے اِس مسئلہ میں کوئی دلچسپی نہیں ہے، کہ ہندوستان میں جہاں جہاں مسلمان کثیر التعداد ہیں، وہاں اُنکی حکومت قائم ہو جائے، میرے نزدیک جو سوال سب سے اقدم ہے، وہ یہ ہے کہ آپ کے اس پاکستان میں نظامِ حکومت کی اساس خُدا کی حاکمیت پر رکھی جائے یا مغربی نظریہ جمہوریت کے مطابق عوام کی حاکمیت پر، اگر پہلی صُورت ہے تو یقیناً یہ "پاکستان" ہوگا، ورنہ بصورتِ دیگر یہ ویسا ہی، "ناپاکستان" ہوگا، جیسا ملک کا وہ حصّہ ہوگا جہاں آپ کی اسکیم کے مطابق غیر مسلم حکومت کریں گے۔ بلکہ خُدا کی نگاہ میں یہ اُس سے زیادہ ناپاک، اس سے زیادہ مبغوض وملعون ہوگا۔ کیوں کہ یہاں اپنے آپکو مسلمان کہنے والے وہ کام کریں گے،

جو غیر مسلم کرتے ہیں ۔ (صفحہ ۷۶، عنوان: اسلام کی دعوت اور مسلمان کا نصب العین
(مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم از مولانا مودودی اور جماعت اسلامی صفحہ ۴۹، ۵۰)

ہم اس مقام پر مولانا سے براہ راست سوال کریں گے کہ جب اُن کے نزدیک مسلم لیگی قیادت جو پاکستان قائم کرنا چاہتی تھی، اور جو اُن کی بھرپور مخالفت کے باوجود خدا کے فضل و کرم اور احسان و عنایت سے صفحہ ارض پر قائم ہو کر رہا، خدا کی نگاہ میں یہ اس سے بھی زیادہ ناپاک ہوگا، جہاں ملک کے دوسرے حصہ میں غیر مسلم حکومت کریں گے، تو پھر ایسے لوگ جو یہ کچھ سمجھتے تھے، وہ کس قدر ناپاک و اخلاق باختہ ہوں گے جو ایسے پاکستان میں پناہ لینے کیلئے بھاگ دوڑے جبکہ وہ حصہ جس میں پہلے تھے اس سے بہتر تھا۔ (چودھری حبیب احمد)

پانچواں اقتباس ـــــ "اس موقع پر یہ بات قابل ذکر ہے کہ مسلم لیگ کے کسی ریزولیشن اور لیگ کے ذمہ دار لیڈروں میں سے کسی کی تقریر میں آج تک یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ ان کا آخری مطمح نظر پاکستان میں اسلامی نظام حکومت قائم کرنا ہے۔" (صفحہ ۱۰۶ (حاشیہ میں) مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوئم،
از مولانا مودودی اور جماعت اسلامی صفحہ ۵۴، ۵۵)

مولانا مودودی اور ان کے رفقاء کار پاکستان پر کس طرح اظہار خیال کرتے رہے اور قائد اعظمؒ کے بارے میں کیا کیا گستاخیاں۔ ملاحظہ فرمائیے،

عنوان:۔ ضرورت ہے ایک ہٹلر اور مسولینی کی
(از نصر اللہ خان عزیز ("کوثر" لاہور ۱۳ جنوری ۱۹۴۷ء)

پاکستان نہیں فاقستان ("کوثر" لاہور، ۱ جون ۱۹۴۷ء)

لنگڑا پاکستان ("کوثر" لاہور ۱۳ جون ۱۹۴۷ء)

"خدا کی نگاہ میں وہ کافروں کی حکومت سے زیادہ ناپاک ہوگا"

(از مولانا مودودی اور جماعت اسلامی ص ۵۷-۵۸)

چار دن کی چاندنی

دشمنان پاکستان اس امید پر تکیہ کئے بیٹھے تھے کہ پاکستان آج گرا کل گرا۔ لیکن ان کا یہ رویہ سمجھ میں آتا ہے ـــ یہ

لوگ پاکستان اور مسلمانوں کے بدخواہ تھے۔ لیکن مولانا تو مسلمانوں کے بدخواہ نہ تھے اگر وہ پہلے پاکستان کی تحریک کے مخالف تھے، تو وہ الگ بات تھی لیکن اب تو مولانا اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ پاکستان چاہے دارالاسلام تھا یا نہ تھا مسلمانوں کی جائے پناہ تو تھا اور وہ بھی صرف لیگی مسلمانوں کے لیے نہیں بلکہ کانگریسی مسلمانوں اور جماعت اسلامی کے لیے بھی آماجگاہ بن چکا تھا پھر وہ پاکستان میں بیٹھ کر ایسا رویہ کیوں اختیار کئے ہوئے تھے۔ کہ میاں ہم نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ یہ بات چلے گی نہیں، بس چار دن کی چاندنی ہے، نظارہ کر لو۔ (مولانا مودودی اور جماعت اسلامی صہ ۸۴-۸۵)

یہ تحریر جناب ممتاز علی عاصی کی ہے۔ ٹھیک ہے مولانا کو ایسا نہیں کہنا چاہیئے تھا کیونکہ آن کے لیے بھی پناہ گاہ پاکستان ہی بنا۔ لیکن اعترافِ صداقت تو کسی کسی کا کام ہوتا ہے یہ مولانا کے بس کی بات نہیں۔ (راقم)

عظیم تحریک کو آگے بڑھنے سے روکا جائے

"مودودیت اور موجودہ کشمکش" کے صفحہ ۶۸ و ۶۹ پر جناب محمد صفدر میر رقمطراز ہیں۔ "ہم دارالاسلام کے قائم ہونے اور اس کے اندرونی معاملات کے بارے میں کچھ زیادہ واقفیت نہیں رکھتے۔ اس بات کا جواب تو ہم چوہدری نیاز علی[1] ہی سے چاہتے ہیں کہ انہوں نے مسلم لیگ کے خلاف، قائداعظم کے خلاف، قائداعظم کے رفقاء کے خلاف اور تحریکِ پاکستان کے خلاف مودودی تحریک کو اپنے قائم کردہ وقف سے جاری کرنے اور جاری رہنے کو کیوں برداشت کیا۔؟ لیکن اتنا ہم جانتے ہیں کہ مودودی صاحب کے سفرِ پنجاب اور بعد میں قیام پنجاب کے مضمرات وہ نہیں ہیں جو وہ بیان کر رہے ہیں پنجاب کا صوبہ برطانوی ہند میں پاکستان کی تحریک کا سب سے اہم خطہ تھا، بلکہ اسے پاکستان کی تحریک کا مولد قرار دینے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرنی چاہیئے۔ اس اہم خطے میں مودودی صاحب کی آمد اور قیام محض اس غرض سے تھا کہ پاکستان کے مولد میں بیٹھ کر اسکی مخالفت کی جائے اور اس عظیم تحریک کو آگے بڑھنے

---

[1] چوہدری نیاز علی خاں مرحوم نے مودودی صاحب کو ایسی سرگرمیوں سے باز رہنے کو کہا۔ اسی وجہ سے وہ پہلی دفعہ دارالاسلام سے لاہور چلے آئے۔ یہ تذکرہ کسی اور مقام پر ملے گا۔ (چوہدری حبیب احمد)

سے رد کیا جائے۔ اور وہ بھی اسی علاقے میں جہاں یہ سب سے زیادہ کامیاب ہونے کی صلاحیت رکھتی ہے۔"

فیڈریشن یا کانفیڈریشن

جناب محمد صفدر میر تحریر فرماتے ہیں:۔ "اقبال کے ایک اور خط سے ہمارے موقف کی وضاحت ہو جائے گی۔ ہم آج جانتے ہیں کہ ہندوستان کی ایک فیڈریشن یا کانفیڈریشن کا شوشا کیوں چھوڑا جاتا ہے اور کون اس شوشے کو چھوڑنے کا ذمہ دار ہے۔ اور اس سے پاکستان کی آزادی اور خود مختاری پر کس طرح زد پڑتی ہے۔ اور بیرونی طاقتوں میں سے کون کون اس کی پشت پناہی کر رہی ہیں۔ لیکن نوجوانوں میں سے بہت کم لوگوں کو یہ علم ہے کہ یہ فیڈریشن یا کانفیڈریشن کا شوشہ نیا نہیں ہے۔ یہ پہلے اسی زمانے میں چھوڑا گیا تھا جب علامہ اقبال الہ آباد کے خطبے میں ایک الگ ریاست کا خیال ظاہر کر چکے تھے۔ اور یہ خیال ان کے دل میں ۱۹۳۷ء تک آتے آتے مسلمانوں کے مسائل کے "ایک ہی حل" کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ تین سال بعد یہی حل ایک مکمل طور پر آزاد اور خود مختار ریاست کے منصوبے کی شکل میں ہمارے سامنے لاہور کے اقبال پارک میں مسلم لیگ پاکستان ریزولیوشن کے طور پر آتا ہے اور پاکستان کا ایک الگ اور مکمل طور پر خود مختار ریاست بننے کا تصور ایک ناگزیر حقیقت بن جاتا ہے۔

مودودی جماعت کے لوگ اور ان کے ہم فکر ہم سے آج یہ کہتے ہیں کہ مودودی صاحب پاکستان کے مخالف نہیں تھے، بلکہ اس کے موسس تھے، اس مفروضے کی حمایت میں وہ "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" کے پہلے دو حصوں کو بار بار پیش کرتے ہیں۔ غالباً اسی لیے مودودی جماعت نے اس کتاب کو دوبارہ چھپوایا ہے۔ اور اس کے تیسرے حصے کو یعنی "جماعتِ اسلامی کے سنگِ بنیاد" کو چھپا کر رکھا ہوا ہے کہ کہیں نہ کہیں سے اس "ابتدائی گناہ" کا کفارہ ادا کرنے کی کوشش کی جائے۔ جو اس جماعت نے پاکستان کے مولد میں بیٹھ کر پاکستان کے خلاف روا رکھا تھا۔ یہ لوگ ہمیں چیلنج کرتے ہیں کہ ہم اس کتاب سے (یعنی اس کے پہلے دو حصوں سے) ثابت کریں کہ مودودی جماعت پاکستان کی حامی نہیں تھی ہم یہ چیلنج قبول کرتے ہیں۔ ....

علامہ اقبال قائد اعظم کو ۲۱ رجون ۱۹۳۷ء کو مندرجہ ذیل عبارت لکھتے ہیں۔

"آپ آج ہندوستان میں وہ واحد مسلمان ہیں جن کی طرف قوم کی امیدیں لگی ہوئی ہیں کہ آپ اس کو اس طوفان سے حفاظت کے ساتھ پار لگا سکیں گے جو شمال مغربی ہندوستان اور شاید تمام ہندوستان میں آرہا ہے۔ اور یہ ان کا حق ہے۔ میں آپ پر واضح کرنا چاہتا ہوں کہ ہم واقعی ایک خانہ جنگی کے دور سے گزر رہے ہیں۔ اگر پولیس اور فوج نہ ہو تو خانہ جنگی فوراً عام ہو سکتی ہے۔ میں نے ساری صورتِ حال کا احتیاط سے تجزیہ کیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ ان واقعات و فسادات کی اصل وجہ نہ مذہبی ہے اور نہ معاشی یہ خالصتاً سیاسی ہے یعنی سکھوں اور ہندوؤں کی خواہش کہ مسلمانوں کے اکثریت کے صوبوں میں بھی ان کو خوفزدہ کر دیا جائے۔ اور نیا آئین ایسا ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت کے صوبوں میں بھی مسلمان پورے طور پر غیر مسلموں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیئے گئے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے پورا یقین ہے کہ اس آئین کا مقصد ہندوستانی مسلمانوں کو شدید نقصان پہنچانا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ان حالات میں واضح ہے کہ ایک پُرامن ہندوستان کے حصول کا راستہ صرف ایک ہے وہ یہ کہ ملک کو نسلی، مذہبی اور لسانی رشتوں کی بنا پر تقسیم کر دیا جائے میری نظر میں ایک واحد ہندوستانی فیڈریشن کے تصور پر مبنی یہ نیا آئین بالکل فضول ہے۔ ہمارے لئے صرف ایک راستہ ہے جس سے ایک پُرامن ہندوستان حاصل ہو سکتا ہے اور مسلمانوں کو غیر مسلمانوں کے تسلط سے بچایا جا سکتا ہے اور وہ راستہ ہے مسلمانوں کے صوبوں کی ایک الگ فیڈریشن ان خطوط پر جن کا اوپر میں ذکر کر آیا ہوں۔ ایسا کیوں نہیں ہو سکتا کہ شمال مغربی ہندوستان اور بنگال کے مسلمانوں کو قوموں کا درجہ دیا جا سکے اور انہیں اسی طرح حق خود ارادیت کا حقدار سمجھا جائے جیسے ہندوستان کے باہر دوسری قومیں ہیں۔"

۲۱ رجون ۱۹۳۷ء کو لکھے گئے اس اقتباس سے واضح ہو گیا کہ اقبال کے ذہن میں ایک الگ قومی ملک کا تصور تھا جو مسلمانوں کے اکثریتی صوبوں میں رہنے والے مسلمانوں کو ایک قوم قرار دے کر انہی حقِ خود ارادیت کی بنیاد پر قائم کیا جائے اور آخر میں ایسا ہی ہوا۔ مودودی صاحب نے اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۹۳۸ء میں حیدر آباد سے پنجاب آنے

کے بعد جو تصور پیش کیا وہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ یہ وہی تصور ہے جو اس زمانے میں فیڈریشن یا کانفیڈریشن کی صورت میں مسلمانوں کو صراطِ مستقیم یعنی پاکستان کے الگ اور خود مختار ملک کی طرف بڑھنے سے روکنے کے لیے ایجاد کیا گیا تھا۔

یہ تصور ۱۹۳۸ء کے اواخر میں ترجمان القرآن میں پیش کیا گیا اور "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ اول و دوم" کے آخری باب کی حیثیت میں ہمارے سامنے ہے۔

"اس سلسلے میں ہمارے سامنے مستقبل ہند کی تعمیر کے لیے تین خاکے آتے ہیں، جنھیں ہم الگ الگ پیش کریں گے۔

۱۔ دو یا زائد قوموں کے ملک میں ایک جمہوری ریاست بنانے کی صحیح اور منصفانہ صورت یہ ہے۔ اوّلاً وہ بین الاقوامی وفاق کے اصول پر مبنی ہو، یا دوسرے الفاظ میں وہ ایک قوم کی ریاست نہیں بلکہ متوافق قوموں کی ایک ریاست ہو۔ ...... (۲) اگر بین الاقوامی وفاق کی یہ صورت قبول نہ کی جائے تو دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ مختلف قوموں کے الگ حدود اراضی مقرر کر دیے جائیں جہاں وہ اپنے جمہوری اسٹیٹ بنا سکیں ...... ہر اسٹیٹ کو زیادہ سے زیادہ اندرونی خود مختاری دی جائے۔ اور وفاقی مرکز کے اختیارات کم از کم رکھے جائیں۔ اس صورت میں ہم غیر مسلم ریاستوں کے ساتھ مل کر ایک وفاقی اسٹیٹ بنانے پر نہ صرف راضی ہو جائیں گے بلکہ اس کو ترجیح دیں گے۔ ...... (۳) اگر یہ صورت بھی منظور نہ ہو تو بطور آخر ہم یہ مطالبہ کریں گے کہ ہماری قومی ریاستیں الگ بنائی جائیں اور ان کا علیحدہ وفاق ہو۔ اس طرح ہندو ریاستوں کا بھی ایک جداگانہ وفاق ہو اور پھر ان دونوں نا وفاقی مملکتوں کے درمیان ایک طرف کا تحالف (کانفیڈریسی) ہو جائے جس میں مخصوص اغراض اور مواصلات اور تجارتی تعلقات کے لئے مقررہ شرائط پر تعاون ہو سکے۔"

(مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم صفحہ ۷۴، ۸۱، ۸۲)

اب اقبال تو ۱۹۳۷ء کے وسط میں قائد اعظم کو حق خود ارادیت کی بنا پر مکمل آزادی کی بات سمجھا رہے ہیں۔ اور مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ ملک تعمیر کرنا چاہتے ہیں اور اس کے ایک سال بعد یعنی علامہ اقبال کی وفات کے چھ مہینے کے اندر مودودی صاحب کی ہجرت کا اصل مقصد پاکستان کی ایک الگ خود مختار ریاست کے قیام اور اس کے مقصد کو روکنے

کے پاکستان کے مولد اور گڑھ یعنی پنجاب میں نیشنلیشن اور کانفیڈریشن کے خیالات کو پھیلاتا تھا اور اس طرح تقدیر الٰہی کی مخالفت کرتا تھا۔

ایک اور نتیجہ اس بات سے نکلتا ہے کہ مودودی صاحب نے اس کتاب کو نئی آب و تاب کے ساتھ انہیں دنوں میں دوبارہ شائع کیا ہے جن دنوں میں یعنی موجودہ زمانے میں پاکستان کے اندر فیڈریشن اور کانفیڈریشن کے خیالات اور تصورات کو بعض بیرونی طاقتوں کی سرپرستی حاصل ہو چکی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مودودی صاحب جس مقصد کے لیے ـــــ یعنی پاکستان کے تصور کو ختم کرنے کے لیے ۱۹۳۸، ۱۹۳۰ء، ۱۹۴۰ء میں کام کر رہے تھے، اسی مقصد کے لیے آج بھی کام کر رہے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اس زمانے میں فیڈریشن اور کانفیڈریشن کی سرپرستی ایک مخصوص غیر ملکی قوت (برطانیہ) کو حاصل تھی اور آج ایک دوسری ہی غیر ملکی قوت (امریکہ) کو حاصل ہے۔

(مودودیت اور موجودہ سیاسی کشمکش ص ۶۸ تا ۷۳)

ہم نے اپنی کتاب میں کسی دوسری جگہ لکھا ہے کہ جناب مودودی صاحب دارالسلام سے اور اسلامیہ کالج لاہور سے اس لیے چلے آئے تھے کہ وہ تحریک قیام پاکستان کی تائید و حمایت نہیں کرنا چاہتے تھے۔ مندرجہ بالا تحریر سے بھی آپ نے اندازہ فرمالیا ہوگا کہ اپنے خیالات سے اقبالؒ کو متفق کہنے والا مودودی حضرتِ علامہؒ کے نظریات سے کس قدر ہم آہنگ ہے؟ (راقم)

جماعتِ اسلامی عوامی عدالت میں

"یہ اقتباسات ہم نے ماہنامہ "الحبیب" لاہور جون ۱۹۷۰ء کے صفحہ ۴۶ سے لیے ہیں۔ انہیں ہم اس لیے نذرِ قارئین کرنا چاہتے ہیں کہ آپ اندازہ فرماسکیں کہ جماعت اسلامی اپنی کتابوں کے سابقہ ایڈیشنوں سے وہ مواد جو قیام پاکستان اور قائدِ اعظم کے خلاف تھا، حذف کر کے نئے ایڈیشن چھاپ رہی ہے۔ (چودھری حبیب احمد)

ملاحظہ فرمائیے:-

"وکیلِ استغاثہ نے کہا، مائی لارڈ شپ اس موقع پر مجھے جماعتِ اسلامی کے اس

راز کو بھی ظاہر کرنا ہے کہ جماعت اسلامی نے اب ان کتابوں سے یہ بیانات نکال کر نئے ایڈیشن چھپوائے ہیں، ویسے جون ۱۹۴۰ء کے ترجمان القرآن میں بھی مولانا نے انگریزی راج کے بارے میں لکھا۔ "میری نگاہ میں یہ سوال کوئی اہمیت نہیں رکھتا کہ ہندوستان ایک ملک رہے یا دس ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے اور میرے نزدیک یہ امر بھی کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتا کہ ہندوستان کو انگریزی امپریلزم سے آزاد کرایا جائے"

(شرم شرم کے نعرے)

وکیل صفائی نے پھر مداخلت کی تو وکیل استغاثہ کا بیان کہ یہ کتابیں غلام احمد پرویز صاحب کے پاس موجود ہیں اور اشرف رضا گواہ ہیں اور اشرف رضا نے حلفیہ بیان دیا۔

اس موقع پر جذباتی ہو کر شیخ محمد الیاس نے قرآن حکیم کو ہاتھ میں اٹھاتے ہوئے کہا کہ میں قسم کھاتا ہوں کہ میں نے مودودی صاحب کی کتابوں سے نقل کی ہیں۔ مزید یہ بھی بیان کیا گیا کہ کتابیں پرویز صاحب نے اس لیے نہیں دیں کیونکہ جماعت اسلامی والے ان کتابوں کو غائب کروا دیتے ہیں۔ (تالیاں اور شور)

لاہور کے ایک مقامی ہوٹل میں یوتھ کلچرل آرگنائزیشن کے زیر اہتمام ایک عوامی عدالت کا اہتمام کیا گیا تھا۔

(نمائندہ خصوصی ماہنامہ الحبیب لاہور)

ویٹو جائز، ویٹو ناجائز

"امیر مملکت شوریٰ کی اکثریت کے مقابلہ میں ویٹو استعمال کر سکے گا۔"

لیکن جب ۱۹۶۲ء کے آئین میں صدر مملکت کے لیے ویٹو کی شق رکھی گئی تو مودودی صاحب نے ایک سوال کے جواب میں

ترجمان القرآن نومبر ۱۹۶۳ء میں کہا:

"کچھ عرصے سے اخبارات کے ذریعہ سے تجاویز پیش کی جا رہی ہیں کہ صدر پاکستان کو خلیفۃ المسلمین یا امیر المومنین کے معزز خطاب سے آراستہ کیا جائے۔ اس تصور میں جان ڈالنے کے لیے یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ صدر کو حق تنسیخ ملنا چاہیئے کیونکہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جلیل القدر صحابہ رضی اللہ عنہم کے مقابلے میں ویٹو سے کام لیا اور منکرین زکوٰۃ و مدعیان نبوت کی سرکوبی کے لئے جہاد کا حکم دے کر صحابہ رضی اللہ عنہم کی رائے کو رد کر دیا۔

گویا اس دلیل سے شرعی حیثیت کے ساتھ ویٹو جیسے دھاندلی آمیز قانون کو مستحکم فرمایا جا رہا ہے۔"
یعنی پہلے ویٹو عین مطابقِ اسلام تھا پھر وہ "دھاندلی آمیز قانون" قرار پا گیا
(ط۔ا، اپریل ۱۹۷۰ء صفحہ ۱۹۷۰ء)

تو جو چاہے تو کرے ذرۂ صحرا کو حباب

جنابِ والا! مودودی صاحب کے مصلحتی اسلام اور مقصدی شریعت کو پورا پورا حق حاصل ہے کہ وہ اسلام کی حقیقی صورت کو مسخ کر کے جیسا چاہیں بنا دیں آپ کیوں اُن کے ہر اجتہاد پر معترض ہوتے اور بے نقاب کرتے ہیں۔ (مرتب)

مکر و دجل کے جاذب و دلکش تاروں کو دیکھ کر

روزنامہ امروز جمعہ ۳ ارجون ۱۹۶۳ء میں "جماعت اسلامی کا رخ کردار" کے عنوان سے جو ہماری اقساط شائع ہو رہی تھیں تو جماعتِ اسلامی کے مخالفین و موافقین کے خطوط بھی شائع ہو رہے تھے، اس ضمن میں ایک اچھی خاصی بحث جاری رہی۔ جمعہ ۴ اجون کی قسط کے چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیں جماعت اسلامی کی صفِ اول کے ایک معروف قلمکار اپنی انشا پردازی کی دھاک بٹھاتے ہوئے بار بار یہ لکھتے ہیں کہ "مولانا مودودی نے تحریکِ پاکستان سے نہیں مسلم لیگ سے اختلاف کیا تھا۔"
لکھا ہے کہ:۔ مولانا مودودی نے نہ کبھی جماعت اسلامی سے متاثر افراد کو مسلم لیگ کی مخالفت کے لیے حکم دیا اور نہ عام لوگوں کو اس میں شامل ہونے سے روکا۔"
حقیقت ہے کہ جماعت اسلامی کے اکابر و اصاغر نے قیام پاکستان کی سر توڑ مخالفت کی۔ یہ کہنا کہ مودودی صاحب نے مسلم لیگ (یعنی تحریکِ پاکستان) کی مخالفت کے لئے کوئی حکم نہیں دیا۔ چلو اگر حمایت میں کوئی کہیں ایک سطر بھی لکھی ہے تو سامنے لائیں۔ ہم چیلنج کرتے ہیں کہ وہ ایسا نہیں کر سکیں

گے جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں کہ ہم نے اپنے قارئین کی خدمت عالیہ میں اس الیشوع کے متعلق اتنا مواد پیش کر دیا ہے کہ اب یہ ضرورت محسوس نہیں کرتے کہ مودودی کی ان تحریروں کو دوبارہ سامنے لائیں۔ اس وقت ہم مندرجہ بالاسطور میں سے صرف اس تحریر کے متعلق جو ہمارے نزدیک دراصل ایک حیرت انگیز فریب کارانہ جسارت ہے۔ کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں فرمایا گیا ہے کہ مولانا مودودی امیر و امام جماعت اسلامی نے تحریک پاکستان سے نہیں مسلم لیگ سے اختلاف کیا تھا۔ پتہ نہیں اتنی واضح اور اٹل اور روشن حقیقتوں اور واقعات کے ہوتے ہوئے بھی کیوں واقعات و حقائق کو مسخ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے یہ فرمان بعینہٖ کچھ اس طرح کا ہے جیسے عرب کا کوئی ابوجہل اٹھ کر یہ کہہ دے کہ میں نے تو پیغمبرؐ کی مخالفت کی تھی، اسلام سے تو مجھے کوئی اختلاف نہ تھا۔"

(روزنامہ امروز ۱۴۔جون ۱۹۶۳ء)

یہ تھا قارئین کرام! وہ جواب جو ہمیں بامر مجبوری عرض کرنا پڑا تھا۔ پھر اس کے بعد کافی عرصہ کے لیے محاذ قلم پر جماعت اسلامی کی توپوں کی گھن گرج خاموش رہی۔

(چوہدری حبیب احمد)

بناؤ اور بگاڑ

۱۰ مئی ۱۹۴۷ء کو دارالاسلام پٹھانکوٹ کے جلسے میں مولانا نے ایک تقریر کی تھی جس میں انہوں نے خصوصی طور پر بناؤ اور بگاڑ پر اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔

مولانا کی اس تقریر سے چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیے:۔

"وہ کبھی اسے پسند نہ کرے گا کہ اس کی دنیا بگاڑی جائے، اجاڑی جائے اور اس کو بدنظمی سے گندگیوں سے اور ظلم و ستم سے خراب کر ڈالا جائے۔ انسانوں میں سے جو لوگ بھی دنیا کے انتظام کے امیدوار بن کر کھڑے ہوتے ہیں ان میں سے صرف وہ لوگ خدا کی نظر انتخاب میں مستحق ٹھہرتے ہیں جن کے اندر بنانے کی زیادہ سے زیادہ صلاحیت ہوتی ہے انہی کو وہ یہاں انتظام کے اختیارات سپرد کرتا ہے۔"

(بناؤ اور بگاڑ ص۳)

"لیکن اگر آپ بنائیں کچھ نہیں اور اس کے عظیم الشان باغ کو اجاڑنے اور بگاڑتے ہی

خواہ کیسی ہی زبردست من مانی بنیادوں
چلے جائیں، تو آپ نے اپنے دعوے اپنی دانست میں
پر قائم کر رکھے ہوں، وہ اپنے باغ پر آپ کے کسی حق کو تسلیم نہیں کریگا۔ اور کچھ تنبیہات
کر کے، سنبھلنے کے دو چار مواقع دیکر آخر آپ کو انتظام سے بے دخل ہی کر کے چھوڑے گا۔"
("بناؤ اور بگاڑ" ص ۶)

"مگر جب وہ کم بنانے اور زیادہ بگاڑنے لگتے ہیں تو خدا انہیں ہٹا کر پھینک دیتا
ہے اور دوسرے امیدواروں کو اسی لازمی شرط پر انتظام سونپ دیتا ہے (بناؤ اور بگاڑ ص ۲)
سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر مولانا اس حقیقت کا شعور رکھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ بناؤ
کو پسند کرتا ہے، بگاڑ کو نہیں، تو پھر وہ ایک بنے بنائے ملک کو جسے مسلمان مملکت خداداد
سمجھتے تھے، اجاڑنے کی کوشش میں کیوں لگے تھے۔ اگر ان کے خیال میں "اللہ تعالیٰ
انہی لوگوں کو انتظام کے اختیارات بخشتا ہے جنہیں وہ مستحق سمجھتا ہے" تو پھر
انہیں یہ تسلیم کر لینا چاہیئے تھا کہ مسلم لیگ اور تحریک پاکستان کے کارکنوں اور لیڈروں
کو اللہ نے مستحق سمجھا، اسی وجہ سے انہیں پاکستان سے نوازا تھا، وہ بھی نہ سمجھتے تو بھی
ان کے خلاف اسقدر زہر افشانی تو نہ کرتے۔ ان کے خلاف انتقام کی آگ جو انہوں نے
اپنے سینے میں بھڑکا رکھی تھی اسے ہوا دیکر دوسروں کے دامن تو نہ جلاتے۔"
(از مولانا مودودی اور جماعت اسلامی ص ۹۵، ۹۶)

"شعور مومن تو اس حقیقت کا اعتراف و اقرار کرتا ہے۔ مولانا کیا کریں۔ جیسا کہ
پہلے عرض کیا جا چکا ہے پاکستان مولانا کے عہد ماضی کی شکست، مولانا کے علم و شعور
کا امتحان اور مولانا صاحب کے تدبر و حکمت کی آزمائش کا نشان ہے۔ یہ تو شیوہ
ارباب وفا ہوتا ہے کہ صداقتوں پر ایمان لے آئیں بھلا حضرت مولانا ایسا کیوں کریں
(چوہدری حبیب احمد)

صاحبزادے اپنے اطوار ٹھیک کرو

یوں اس تحریک میں اسلام سے وہ
خدمت لی گئی جو بگڑے ہوئے
نوابزادے اپنے خاندان کے کسی پرانے جانثار ملازم سے لیا کرتے ہیں مشورہ — اور
— نصیحت اس کا کام نہیں ہوتا۔ میاں لوگ اپنی مرضی سے جو چاہیں کریں مگر آڑے وقت

ہیں بوڑھے خادم کو پکارا جاتا ہے کہ آؤ اور حق نمک ادا کرو۔ پھر اگر وہ غریب ان حرکات پر صبر نہیں کر سکتا جن کی وجہ سے بُرے دن آتے ہیں اور بے چین ہو کر کبھی کہہ بیٹھتا ہے کہ صاحبزادے اپنے اطوار ٹھیک کرو تو اسے ڈانٹ دیا جاتا ہے کہ "ایاز قدر خود بشناس" تو اپنے کام سے کام رکھ۔ تیری یہ حیثیت کب سے ہو گئی کہ ہمارے معاملات میں دخل دے۔

یہ تھیں وہ بنیادیں جن پر ہماری یہ قومی تحریک آوّل روز سے اٹھی اور آخر تک بڑھتی چلی گئی۔ اس کے اجزائے ترکیبی میں مومن اور منافق اور کھلے کھلے ملحد سب شامل تھے۔ بلکہ دین میں جتنا ہلکا تھا وہ اتنا ہی اوپر آیا۔ اس میں اخلاق کی سرے سے کوئی پوچھ نہ تھی۔ (ترجمان القرآن جولائی ۱۹۴۶ء صہ ۱۳۲)

تاریخِ تحریکِ قیامِ پاکستان اس حقیقت پر شاہد ہے کہ اس کے قائدین نے مسلمان کے تشخص کے لیے قرآنی دلائل و براہین پیش کیے مولانا شبیر احمد عثمانی رح اور پیر جماعت علی شاہ کے علاوہ دیگر بزرگانِ عظام اور علمائے کرام نے نیک نیتی سے مسلمانوں کو اسلام محمدی کا واسطہ دیا کہ قیام پاکستان کی تائید و حمایت کرو

لیکن چشم فلک نے بصد حیرت و استعجاب دیکھا کہ مودودی اسلام حصولِ اقتدار کے لیے اس انداز میں استعمال کیا جا رہا ہے کہ اس ہوس اختیار و اقتدار نے انہیں یہ حوصلہ بخشا ہے کہ آج ایک بات اسلام کی روشنی میں (ان کے اسلام میں) جائز اور ضروری اور کل حرام اور غیر ضروری ہوتا ہے۔ اگر انہیں یہ کہا جاتا ہے کہ سیدزادے اپنے اطوار ٹھیک کرو، اسلام کو زینہ ہوسِ اقتدار نہ بناؤ۔ نبوی اسلام کی شکل نہ بگاڑو۔ سب اکابرین اسلام کو ہدفِ تنقید بنا کر اسلام کا حلیہ نہ بگاڑو۔ تو گوارا نہیں کیا جاتا وہ مولانا جو تمام بزرگوں کی عزت و عظمت کی توہین کرتے، ان کے شرفِ بزرگی کی شکلیں بگاڑتے ہیں ان کے مریدین و معتقدین اور گستاخانِ صحابہ کبارؓ شور مچا دیتے ہیں کہ جناب مودودی کی شانِ بالا میں ہتک آمیز اور توہین انگیز جملے استعمال کیے گئے ہیں۔ کیا کہا جائے۔

ع۔ شرم تم کو مگر نہیں آتی

(چوہدری حبیب احمد)

مولانا مودودی کے متعلق رائے

جناب ممتاز علی عاصی اپنی کتاب "مولانا مودودی اور جماعت اسلامی" کے صفحہ ۱۹۲ پر رقمطراز ہیں۔

"جدید نفسیات کے مطابق یہ علامات ایک ایسے ذہنی مریض میں پائی جاتی ہیں جسے (GOD COMPLEX) "خدائی الجھاؤ" کا شکار کہا جاتا ہے"

صفحہ ۲۰۶ پر لکھتے ہیں۔

"چونکہ مولانا علمائے کرام، منتیان شرح متین، خطیب، پیر و مرشد اور دیگر روحانی رہبر سب کو غلط کار سمجھتے ہیں۔ ادھر علمائے کرام کا متفقہ فیصلہ ہے، کہ مولانا کا اسلام قرآنی اسلام سے قطعی مختلف ہے۔ اس لیے ظاہر ہے کہ سچا مسلمان صرف وہ شخص ہوگا جسے مولانا سچا مسلمان سمجھیں۔ لہٰذا یہ جج فیصلے کے لیے پنچوں کی رائے کا محتاج نہیں کسی ایسے قانون کا پابند نہیں جسے دوسرے علمائے کرام کی تائید حاصل ہو۔ اس لیے وہ ایک ڈکٹیٹر ہے اور اس کا ایمان ہے کہ مسلمان وہ ہے جسے وہ خود مسلمان سمجھے اور اسلامی حکومت وہ ہے جس کے متعلق وہ خود فتویٰ دے کہ ہاں یہ اسلامی حکومت ہے۔

اس کا مطلب ہوا کہ مولانا کا ایمان ہے کہ روئے زمین پر وہ اسلام کے واحد نمائندہ ہیں۔ اور اسلام سے متعلق جملہ امور کی اجارہ داری کے حامل ہیں۔ جدید نفسیات کی رو سے اس قسم کی ذہنیت کو خدائی الجھاؤ" GOD COMPLEX کہتے ہیں جو ایک ذہنی بیماری ہے اور جس کے مریض ہمارے ذہنی ہسپتالوں میں عام ہوتے ہیں۔

(از مولانا مودودی اور جماعت اسلامی ص ۲۰۶ - ۲۰۷)

صفحہ ۲۰۸ پر رقمطراز ہیں۔

"نفرت و حقارت کے اس شدید جذبے کے باوجود جیسا کہ مولانا کی باتوں سے صاف ظاہر ہے سیاسی اقتدار کے حصول کی خواہش ان کے سر پر بھوت کی طرح سوار ہے

لہ لیکن کئی ایک جگہوں سے پرانے الفاظ حذف کر کے۔ (راقم)

اور میں ہی کیا، ان کا جذبہ حقارت مجھ پر، آپ پر، ہم سب پر بلکہ سارے عالم پر نیلے آسمان کی طرح چھایا ہوا ہے۔ وہ کائنات کی عظیم ترین نعمت "جذبہ محبت سے قطعی محروم ہیں۔"

باب ۱۱

وکلاء کے بارے میں

پہلے امیر

"وکالت کو آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ یہ قانون الٰہی کے خلاف کھلی بغاوت ہے۔ اس کے مقابلہ میں اگر کسی دوسرے پیشے میں کچھ حرام کی آمیزش ہو بھی تو بہر حال وہ بغاوت سے تو کم درجہ ہی کا گناہ ہے۔ تجارت، زراعت، صنعت و حرفت، مزدوری، پرائیویٹ فرموں کی ملازمتیں اور اسی قسم کے دوسرے پیشوں میں ایسی صورتیں بہم پہنچ سکتی ہیں جن کے اندر کم سے کم ناگزیر معصیت کی حد پر آدمی قائم رہ سکتا ہے۔ اور جو کم از کم اس درجہ میں تو حرام نہیں جس درجہ کی یہ وکیلانہ بغاوت حرام ہے...... وکیل کے محرر کا کام بھی حرام ہے...... وکلاء کے ہاں کھانے میں بھی پرہیز اولیٰ ہے۔" (ترجمان القرآن جنوری فروری ۱۹۴۷ء)

قانونی موشگافیوں کے ماہر، نکتہ آفریں، مسئلہ کی پیچیدگیوں کی گہرائیوں میں ڈوب کر حرفِ مطلب نکالنے والے مودودی صاحب کے اس حرفِ ستائش سے جو ان کی شانِ بلند میں کہا ہے اس کے مفہوم و معنی سے آشنا تو ضرور ہوں گے۔ اور خصوصاً ہمارے ملک کے چوٹی کے قانون دان، "فلسفی" "محقق" جناب اے کے بروہی سے یہ نکتہ پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔

وکلا کے بارے میں دوسرے امیر

ساہیوال بار کونسل میں ۱۸ مارچ ۱۹۶۷ء کو جناب میاں طفیل محمد صاحب نے اپنی تقریر دلپذیر میں ارشاد فرمایا۔

"آپ کا تعلق ایک ایسے طبقے سے ہے جو ملک و قوم میں اپنی خدمات کے لحاظ سے ایک اونچا مقام رکھتا ہے۔ مسلمانوں کی لیڈر شپ ہمیشہ ماہرینِ قانون کے ہاتھوں میں رہی ہے۔ امام ابو حنیفہؒ، امام محمدؒ، امام یوسف رحمہم اللہ تعالیٰ اجمعین سب ماہر قانون ہی تو تھے۔ اور مسلم معاشرے کے بانی کی حیثیت سے ان کی راہنمائی پر کامل اعتماد کیا جاتا تھا۔ آج آپ بھی اسی مسند پر بیٹھے ہوئے قوم کو اپنی طرف بلا

رہے ہیں۔ آپ کے کاندھوں پر ایک ذمہ داری کا بوجھ ہے جسے انتھک لگن اور مسلسل کاوش سے ہی اٹھا سکتے ہیں۔"

قارئین کرام! اگر یہ مصلحتی اسلام نہیں تو اسے کیا نام دیا جائے۔ کیا مندرجہ بالا اور محولہ بالا دونوں اقتباسات اس حقیقت کا منہ بولتی تصویر نہیں ہیں کہ ہوسِ اقتدار انہیں کہاں کہاں لئے پھرتی ہے اور ان کا مصلحتی اسلام کیا کیا ستم نبوی اسلام پر ڈھا رہا ہے ان کے علم و فن کے سمندر میں ایسی ہی تضادات کی ہلاکت انگیز لہریں ہیں جو حقیقت و صداقت کو اپنے اغراض و مقاصد کی گہرائیوں میں ڈبو دینے کے لیے اپنی تندی و تیزی کے کرشمے دکھا رہی ہیں۔

ہمیں ان مقدسین و صالحین سے کوئی گلہ نہیں افسوس ان نکتہ آفرین، قانون دان طبقے پر آتا ہے کہ یہ ذہین و فہیم گروہ کیا اتنا بھی نہیں سمجھتا کہ جن کی ذات سے متاثر ہو کر میاں طفیل صاحب جماعت اسلامی میں آئے۔ وہ آپ کو کیا کہہ رہے ہیں اور میاں صاحب سیاسی غرض کے لیے آپکو کس مقدسانہ انداز سے ذہنی رشوت دے رہے ہیں ؟ جو مودودی صاحب فرماتے ہیں یہ بھی اسلام اور جو میاں صاحب وہ بھی اسلام، کیا آپ کی باریک بینی اس کھلے تضاد کو بھانپ کر یہ نتیجہ اخذ نہیں کر سکتی کہ یہ محض آپ کو اپنے سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرنا چاہتے ہیں ان دونوں اقتباسات کو دیکھ کر کیا یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مشرق و مغرب کے قلابے ملانا اسے کہتے ہیں اور اس فن تضاد میں ماہرین کو "جماعت اسلامی" کہتے ہیں میاں محمد طفیل صاحب بھی تو ایل ایل بی ہیں اور کچھ عرصہ تو پریکٹس بھی کی ہوگی۔ کیا ان کو بھی کبھی خیال ہوا کہ مودودی صاحب کے آئینہ تحریر میں اپنا چہرۂ مبارک دیکھیں۔ مودودی صاحب کا یہ فرمان بھی انہی کے استفسار پر تھا۔ (چودھری حبیب احمد)

حرام کو حلال طیب قرار دیدیا گیا

جماعت اسلامی کے نقیب "ایشیا" کی ۲۵ راکتوبر کی اشاعت میں یہ خبر شائع ہوتی ہے کہ لاہور کے ایک سو آٹھ وکیلوں نے اعلان کیا ہے کہ وہ جماعت اسلامی میں شمولیت اختیار کر رہے ہیں۔ اس تقریب پر مودودی صاحب نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ " پاکستان کے وکلاء نے ہمیشہ اپنے فرض کو پہچانا ہے اور ہر نازک مرحلے پر وہ ملک کو

بچانے کے لیے آگے بڑھے ہیں انہوں نے اس ملک میں قانون کی حکمرانی اور عدل و انصاف کا نظام قائم کرنے کے لیے اپنا کردار پوری طرح ادا کیا ہے میں ان وکلاء کو مبارکباد پیش کرتا ہوں جو اس موقع پر جماعت اسلامی میں شامل ہونے کا فیصلہ کر رہے ہیں۔

اور اسی اشاعت میں "ایشیا" نے اپنے مقالہ افتتاحیہ میں تحریر فرمایا ہے کہ :۔

"تحریک پاکستان کے محاذوں میں یہ وکلاء ہی تھے جنہوں نے آئینی اور قانونی جنگ لڑ کر پاکستان کے قیام کی راہ ہموار کی اور پاکستان بننے کے بعد اس کو ایک صحیح اسلامی مملکت بنانا یہاں کے عوام کو ان کے انسانی حقوق سے بہرہ مند کرنا، اس ملک کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے سے بچانا، اور مختلف فتنوں سے محفوظ کرنا بھی سب سے زیادہ وکلاء ہی پر منحصر ہے" ان کی حیثیت وہی ہے جو کسی زمانے میں حضرات علماء کی تھی۔

یہ الیکشن کے موسم کی بات ہے لیکن اس سے پہلے وکلاء ہی نہیں بلکہ خود پیشہ وکالت کے متعلق مودودی صاحب کے کیا ارشادات تھے، انہیں بغور سنیئے۔ انہوں نے ایک مستفسر کے سوال کے جواب میں فرمایا تھا۔

وکالت کو آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ یہ قانون الٰہی کے خلاف کھلی ہوئی بغاوت ہے اس کے مقابلہ میں کسی دوسرے پیشہ میں کچھ حرام کی آمیزش ہو تو وہ بہر حال بغاوت سے تو کچھ کم درجہ میں گناہ ہے۔ تجارت، زراعت، صنعت و حرفت، مزدوری، پرائیوٹ فرموں کی ملازمتیں اور اسی قسم کے دوسرے پیشوں میں ایسی صورتیں بہم پہنچ سکتی ہیں جن کے اندر کم از کم ناگزیر معصیت کی حد ہر آدمی قائم کر سکتا ہے۔ اور وہ کم از کم اس حد میں تو حرام نہیں جس درجہ کی یہ وکیلانہ بغاوت حرام ہے۔

(ترجمان القرآن فروری ۱۹۴۴ء)

اس کے ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ "وکیل کے محرر کا کام بھی حرام ہے" اور اس کے ہاں کھانے پینے سے بھی پرہیز کرنا چاہیئے۔"

مودودی صاحب نے وکلاء حضرات کو مبارکباد پیش کی ہے کہ وہ ان کی جماعت میں شامل ہو گئے۔ ان کی ہم نوائی میں ہم وکلاء حضرات کو مبارکباد پیش کرتے ہیں کہ وقتی طور پر ہی سہی، ان کی کمائی حرام سے حلال تو ہو گئی! اب الیکشن کے بعد دیکھیئے فتوی کا رخ کس طرف مڑتا ہے؟

مودودی صاحب نے اپنے ہی جواب میں "زنانِ بازاری" کے کسب کو بھی حرام قرار دیا تھا۔ لیکن ووٹ تو ان کے بھی ہیں! دیکھیے، ان کے لیے شریعتِ مودودی کی کتاب الحیل سے کیا برآمد ہوتا ہے۔ "پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ" (طارق دسمبر ۱۹۷۰ء ص ۶۰، ۶۱)

"زنانِ بازاری" اور "وکالت" کو ایک ہی درجہ دینے والے مودودی کی شریعت اب کیا گل کھلا گئی۔ اسے کہتے ہیں اسلامی اجتہادی خوبی۔ کوئی نہ مانے تو ہمارا کیا قصور ــــــ (مرتب)

"ایشیا" اور "طاہر ویکلی"

پانچسو وکلا کی جو کانفرنس جماعتِ اسلامی کے زیرِ اہتمام مئی ۱۹۷۶ء لاہور میں منعقد ہوئی جس میں مودودی صاحب نے کہا۔

"یہاں معاملہ یہ ہے کہ پاکستان حاصل کرنے کے لیے بڑی کوششیں کی گئیں۔ اور یہ حاصل اس لیے کیا گیا کہ ہم یہاں اسلامی حکومت نافذ کریں پاکستان کا مطلب لا الٰہ الا اللہ بیان کیا گیا۔ لاکھوں آدمیوں کی جانیں کٹوا دی گئیں۔ لاکھوں آدمیوں کی عزتیں گنوا دی گئیں اور لاکھوں جائیدادیں تباہ کرا دیں۔ یہ سب کچھ کرنے کے بعد جب ملک حاصل ہوا تو اس کام کو چھوڑ دیا گیا میں کہتا ہوں کہ اس سے بڑا فراڈ دنیا میں کوئی نہیں ہو سکتا جو کیا گیا اور اس سے زیادہ دھوکہ بازی کوئی نہیں ہو سکتی کہ ملک حاصل کرتے وقت تو نام اسلام کا لیا جائے مگر پھر ارادہ کر لیا جائے کہ یہاں اسلام کو نافذ نہیں ہونے دیا جائیگا۔
(ایشیا ۹ مئی ۱۹۷۶ء)

"یہاں معاملہ برعکس تھا۔ لڑے اسلام کے نام پر۔ پاکستان کا مطلب کیا لا الٰہ الا اللہ کے نام کے لیے جانیں، عزتیں اور جائیدادیں گنوا دیں، لیکن جب موقعہ ملا۔ اس کام کو چھوڑ دیا جس کے لیے ملک حاصل کیا تھا۔ اس سے بڑا فراڈ اور دھوکہ بازی کوئی نہیں ہو سکتی کہ مطلوبہ سرزمین قائم ہونے کے فوراً ہی بعد یہ ارادہ کر لیا جائے کہ یہاں اسلام قائم نہیں ہو گا۔" (طاہر ویکلی ۱۹۷۶ء)

مولانا مودودی نے یہ گستاخی کا مظاہرہ پانچسو وکلاء کی کانفرنس میں

جن کے خلاف کیا ان میں قائد اعظم محمد علی جناح رح سرِ فہرست اور مودودی کے اولین ہدف خود قائد اعظم رح تھے۔ (مرتب)

طلوعِ اسلام جولائی ۱۹۷۶ء رقمطراز ہے۔

"مودودی صاحب سے متعلق تو ہم ذرا بعد میں عرض کریں گے پہلے ہم ان پانچسو وکلاء حضرات کو مخاطب کرنا چاہتے ہیں جو کانفرنس میں شریک تھے۔ قائد اعظم رح کو اگر کیفیت یہی ہے تو پھر اس قوم کا بھی خدا حافظ اور اس کے ساتھ اس مملکت کا بھی۔

اب رہے مودودی صاحب تو ان کا مسئلہ واضح ہے علم النفس (سائیکالوجی) کی تحقیق و تجربہ اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ آمرانہ مزاج رکھنے والے لوگ اگر ہوسِ اقتدار کی تسکین میں ناکام رہیں تو انجام کار یا تو وہ پاگل ہو جاتے ہیں یا خودکشی کر لیتے ہیں۔ مودودی صاحب کے آمرانہ مزاج کے متعلق دو آراء نہیں ہو سکتیں۔ اسکی شہادت خود ان کا سارا ماضی ہے جہانتک ان کی ہوسِ اقتدار کا تعلق ہے ان کی اپنی تحریریں اور جماعتِ اسلامی کی تاریخ اس کا زندہ ثبوت ہے اور اس باب میں جہاں تک ان کی مایوسی کا تعلق ہے، وہ بھی ڈھکی چھپی نہیں۔ ۱۹۷۰ء کے الیکشن سے ایک دن قبل انہوں نے فرمایا تھا کہ کل الیکشن کے نتائج خود بتا دیں گے کہ اقتدار کس جماعت کے ہاتھ میں ہوگا۔ اور اس میں انہیں جس قدر ناکامی اور نامرادی ہوئی اس کی مثال بھی شاید کہیں اور ملے اور اس سے ان کا دماغی توازن جس حد تک بگڑا تھا، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ انہوں نے کہا تھا کہ اگر ہمیں ایسی شکست ہو گئی ہے تو یہ کونسی غیر معمولی بات ہے۔ ایسے انبیاء گزرے ہیں جو ساری عمر جدوجہد کرتے رہے لیکن انہیں (معاذ اللہ) ایک بھی متبع نہ مل سکا۔ علم النفس کے کسی ماہر سے پوچھئے وہ اسے اگر پاگل پن نہیں تو اور کیا قرار دے گا؟"

جس قائد اعظم کو یہ مکار اور فریب کار قرار دے رہے ہیں ان کے مخالفین تک نے ان کے خلاف اور تو جو کچھ جی چاہے کہا ہو لیکن انہیں فریب کار کہنے کی جرأت کسی کو نہیں ہو سکی تھی۔ یہانتک کہ قائد اعظم رح نے ہندوستان کے سب سے بڑے لیڈر (جسے وہاں کے عوام اوتار مانتے تھے) کے متعلق کہا کہ یہ شخص (گاندھی) گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا رہتا ہے۔ اس پر اس ملک میں طوفان برپا ہو گیا لیکن کسی ایک شخص نے پلٹ

بحریہ نہیں کہا کہ تم بھی منافق اور مکار ہو۔ اس شخص کی وفات پر دنیا کے عظیم ترین اخبار
"لنڈن ٹائمز"... نے لکھا:۔

قائد اعظمؒ نے اپنی ذات کو ایک بہترین نمونہ پیش کر کے اپنے اس دعوے کو
ثابت کر دیا کہ مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں ان میں وہ ذہنی لچک نہیں جو انگریز کے
نزدیک ہندوستانیوں کا خاصہ ہے۔ ان کے تمام خیالات ہیرے کی طرح قیمتی مگر سخت

"بابائے قوم" یا " فادر آف دی نیشن" (قوم کا باپ) کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قوم
میں یہ پانچسو وکلاء حضرات بھی شامل ہیں۔ ہم ان پانچسو حضرات سے یہ پوچھنا
چاہتے ہیں کہ :۔

۱۔ کیا آپ قائد اعظمؒ کو "بابائے قوم" (قوم کا باپ) اور اس اعتبار سے خود اپنا
باپ سمجھتے ہیں یا نہیں؟ اگر ایسا نہیں سمجھتے تو ذرا جرأت کر کے اس کا اعلان فرما
دیجئے تاکہ قوم آپ کے متعلق کسی دھوکے میں نہ رہے۔ اور

۲۔ اگر آپ پوری قوم کی ہمنوائی میں قائد اعظمؒ کو اپنا باپ سمجھتے ہیں تو یہ فرمائیے
کہ آپ کے سامنے ایک شخص آپ کے باپ کو سب سے بڑا فراڈ یا دھوکہ باز کہتا ہے۔ اور
آپ (اگر تالیاں بجا کر نہیں تو کم از کم) نہایت خاموشی سے اسے سُن لیتے ہیں ہم آپ سے
پوچھنا یہ چاہتے ہیں کہ آپ میں اتنی سی غیرت بھی باقی نہیں رہی کہ ایک شخص آپ کے منہ پر
آپ کے باپ کو ایسی گالیاں دے اور آپ "اس بندۂ گستاخ کا منہ بند نہ کریں" (اقبالؒ)
آپکی غیرت وحمیت کا یہی عالم ہے تو آپ خود سوچ لیجئے کہ دنیائے انسانیت میں آپ کا
مقام کیا ہے؟ ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی۔

(واضح رہے کہ اس کانفرنس کی جو روئیداد "ایشیا" میں شائع ہوئی ہے اس میں کہیں یہ
نہیں کہا گیا کہ سامعین میں سے کسی ایک شخص نے بھی اس زبان درازی کے خلاف صدائے
احتجاج بلند کی ہو۔)

اس کے بعد ہم قوم کے صحافیوں سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا آپ بھی اس مقام پر
پہنچ چکے ہیں کہ آپ کے سامنے بابائے قوم کو فریبی اور مکار کہا جائے اور آپ اس
کا کوئی نوٹس نہ لیں؟ (جہانتک ہماری نگاہ یاوری کرتی ہے ایک آدھ اخبار کے

سوا کسی نے اس کے خلاف کچھ نہیں لکھا اور جو نہیں ... کچھ لکھا ہے وہ بھی اس انداز سے ___ منہ موڑ کر ادھر کو ادھر کو بڑھا گئے ہیں۔ حالانکہ ان اخبارات کی کیفیت یہ ہے کہ ان کے کسی کالم نگار کے خلاف کوئی دوسرا اخبار بے ادبی کے دو لفظ کہہ دیتا ہے تو اس کے خلاف مہینوں چیخ اور پکار ہوتی رہتی ہے) اور اس کے بعد ہم اپنی قوم سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا خدانہ کردہ آپ اس مقام پر پہنچ گئے ہیں، جس نے شدید احساسات سے متاثر ہو کر اقبالؒ نے کہا تھا۔ حیت نام ہے جس کا گئی تیمور کے گھر سے

رافع اور شفاف ہوتے تھے۔ ان کے دلائل میں ہندو لیڈروں جیسی حیلہ سازی نہیں تھی بلکہ وہ جس نکتۂ نظر کو اپنا ہدف بناتے تھے اس پر براہ راست نشانہ باندھ کر وار کرتے تھے۔ وہ ایک ناقابل تسخیر حریف تھے۔ اور اس زمانہ کے مملکت ایران کے سفیر آقائے علی اصغر حکمت نے ان کی بارگاہ میں ان الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کیا "ایسے عظیم الشان انسان آسمان کے ان ستاروں کی طرح ہیں جن کی روشنی ہم تک بعید از قیاس فاصلے طے کر کے پہنچتی ہے اور اگرچہ وہ انسانوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں لیکن اُن کے نور سے ہمیشہ کسب فیض حاصل کیا جا سکتا ہے۔ قائد اعظمؒ کی شخصیت آئندہ نسلوں کے لیے مینارۂ نور کا کام دے گی۔ ایسے بلند کردار کے حامل انسان کے متعلق یہ شخص یہ کہنے کی جرأت کر رہا ہے کہ وہ مکار اور فریب کار تھا۔ یہ شخص انہیں یہ کہہ کر مطعون کر رہا ہے کہ حصولِ مملکت سے ایک دن پہلے تک وہ اسلام اسلام پکارتے رہے لیکن اس مملکت کے مل جانے کے بعد انہوں نے فوراً اپنا ارادہ بدل دیا۔

چونکہ مودودی صاحب کے عقیدہ کی رو سے زندگی کی بعض ضرورتوں کے لیے جھوٹ بولنا از روئے شریعت واجب ہو جاتا ہے۔ اس لیے ہم انہیں دین اور شریعت کے نام پر تو کچھ نہیں کہنا چاہتے۔ کہنا صرف یہ چاہتے ہیں کہ آپ تاریخ کی صداقتوں کو کس طرح جھٹلا سکیں گے۔؟ آپ کا الزام یہ ہے کہ انہوں نے حصولِ مملکت کے بعد اسلام کے متعلق اپنا ارادہ بدل لیا تھا۔ آپ دیکھئے کہ تاریخ کیا کہتی ہے۔ قائد اعظمؒ نے اکتوبر ۱۹۴۷ء میں گورنر جنرل کی حیثیت سے خالق دینا ہال کراچی میں پاکستان

کے افسروں سے اپنے پہلے خطاب میں فرمایا تھا:۔

"پاکستان کا قیام، جس کے لیے ہم گزشتہ دس سال سے مسلسل کوشش کر رہے تھے، اب خدا کے فضل سے حقیقتِ ثابتہ بن کر سامنے آچکا ہے لیکن ہمارے لیے اس آزاد مملکت کا قیام مقصود بالذات نہیں تھا، بلکہ ایک عظیم مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا۔ ہمارا مقصد یہ تھا کہ ہمیں ایک ایسی مملکت چاہیے جس میں ہم آزاد انسانوں کی طرح

"پاکستان کانسٹی ٹیوٹ اسمبلی نے ابھی پاکستان کا آئین مرتب کرنا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ آئین کی آخری شکل کیا ہو گی لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ اسلام کے بنیادی اصولوں کا آئینہ دار، جمہوری انداز کا ہو گا۔ اسلام کے یہ اصول آج بھی اسی طرح عملی زندگی پر منطبق ہو سکتے ہیں جس طرح وہ تیرہ سو سال پہلے ہو سکتے تھے۔"

یہ تھے وہ قائد اعظم رح جن کے متعلق یہ شخص کہہ رہا ہے کہ حصولِ مملکت کے فوراً بعد انہوں نے ارادہ کر لیا تھا کہ یہاں اسلامی آئین نافذ نہیں کئے جائیں گے۔ (ضمناً) مودودی صاحب کی طرف سے قائد اعظم رح کو جو صلاحیاں سنائی جا رہی ہیں تو اس کی وجہ وہ نہیں جو بیان کی جا رہی ہے۔ اس کی وجہ اسی براڈ کاسٹ میں ان کا وہ اگلا فقرہ ہے جو نشتر کی طرح مودودی صاحب کے کلیجے سے پار اتر گیا اور جس زخم کو وہ آج تک سہلا رہے ہیں لیکن وہ مندمل ہونے کے بجائے سرطان بنتا جا رہا ہے۔ انہوں نے فرمایا تھا۔

آئینِ پاکستان کے مرتب کرنے کے سلسلے میں جو ذمہ داریاں اور فرائض ہم پر عائد ہوتے ہیں ان کا پورا پورا احساس رکھتے ہیں پھر بھی یہ مسلّمہ بات ہے کہ پاکستان میں کسی صورت میں بھی تھیاکریسی رائج نہیں ہو گی۔ جس میں حکومت مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں دے دی جاتی ہے کہ وہ (بزعم خویش) خدائی مشن کو پورا کریں۔

یہ تھا قائد اعظم کا وہ اعلان، جس نے مودودی صاحب کی تمام امیدوں پر پانی پھیر

دیا تھا۔ اور جس کی وجہ سے وہ آج تک تڑپتے، تلملاتے مصروف فساد انگیزی رہتے ہیں
مودودی صاحب نے یہاں پہنچتے ہی یہ شور شروع کر دیا کہ یہاں اسلامی قوانین
نافذ کر دیے جائیں۔ بظاہر یہ نعرہ بڑا معصوم بلکہ مقدس نظر آتا ہے اور اس وجہ سے
عوام ان کے دامِ فریب کا شکار ہو گئے ہم نے اِسے "فریب" جواب آں غزل کے طور پر
تعبیر نہیں کیا، ہم یہ کہتے چلے آرہے ہیں کہ مودودی صاحب، پاکستان کے خلاف،
بہت بڑی سازش لئے ہوئے یہاں آئے تھے یا بھیجے گئے تھے اس سازش کی تفصیلات
تو اپنے وقت پر پیش کی جائیں گی سرِ دست آپ مودودی صاحب کی سابقہ زندگی کے صرف
سیاسی پہلو کے متعلق دو ایک نکات ملاحظہ کیجئے۔

(۱) صحافتی زندگی میں ان کا سب سے پہلا تعارف جبل پور کے اخبار "تاج" کی ایڈیٹر
کی حیثیت سے ہوا، یہ اخبار کٹر کانگریسی تھا، اس کے ایک مقالہ پر اس کے پرنٹر اور پبلشر
گرفتار ہوئے تو مودودی صاحب گرفتاری سے بچنے کے لئے دہلی پہنچ گئے۔

(۲) دہلی میں وہ جمعیت العلمائے ہند کے ترجمان "الجمعیت" سے وابستہ ہو گئے یہ
نیشنلسٹ علماء کی جماعت کا ترجمان تھا اور کانگریس کا سب سے بڑا موئید اور حمایتی
اس میں وہ پانچ چھ سال تک کام کرتے رہے

(۳) اس دوران میں انہوں نے مہاتما گاندھی کی سوانح عمری بھی مرتب کی

(۴) تحریکِ پاکستان کے دوران کانگریس کیساتھ ان کے روابط کا اندازہ اس سے لگائیے کہ جب
۲۵، ۲۶ اپریل ۱۹۴۷ء کو یعنی تقسیم ہند کے اعلان کے قریب ایک ماہ پہلے، اسلامی جماعت کا
پٹنہ میں ایک اجلاس ہوا تو اس میں مہاتما گاندھی کو بھی مدعو کیا گیا اور وہ اپنی پرارتھنا کی تقریر
کو ملتوی کر کے اسمیں شریک ہوئے تھے۔

۵۔ مودودی صاحب نے مسلمانوں کی علیحدہ مملکت کے خلاف اسکیم یہ پیش کی تھی کہ مسلم
اکثریت آبادی کے صوبوں کی حکومت قائم کر کے انڈیا کے ساتھ اس کی فیڈریشن قائم
کر دی جائے اور یوں مسلمانوں کو دینی اور ملی حیثیت سے ختم کر دیا جائے۔
کہہ دیا جائیگا کہ پاکستان میں ہزارہا ایسے افراد موجود ہیں جو کھلے کانگریسی تھے۔
لہذا اگر مودودی صاحب بھی کبھی کانگریسی تھے، تو یہ کون سی قابل اعتراض بات ہے۔
یہ بات قابل اعتراض اسلیے ہے کہ ان لوگوں نے کھلے بندوں اعتراف کیا کہ انہوں نے تحریک

پاکستان کی مخالفت کی تھی۔ لیکن انہوں نے پاکستان میں آکر کوئی فتنہ کھڑا نہیں کیا۔ جنہوں نے ایسا کچھ کیا ان سے مواخذہ کیا گیا۔ لیکن مودودی صاحب ہمیشہ یہ پکارتے چلے آرہے ہیں کہ انہوں نے تحریک پاکستان کی کبھی مخالفت نہیں کی (بلکہ اب تو انہیں نظریۂ پاکستان کا خالق بھی بتایا جا رہا ہے) اور پاکستان آکر وہ ایک دن چین سے نہیں بیٹھے۔ کوئی نہ کوئی فتنہ جگاتے چلے آرہے ہیں۔ اس کا نام سازش ہے۔

...... لیکن مودودی صاحب کو معلوم ہونا چاہیئے کہ انہیں اس سے بھی حصول اقتدار میں کامیابی نہیں ہو سکے گی۔ اس لیے کہ میکیاولی سیاست عارضی ہی سہی کامیاب ہو جاتی ہے لیکن مذہب کے نقاب میں سیاست کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ خواہ اس کے لیے کتنا ہی سرمایہ سیلاب کی طرح نہ بہا دیا جائے۔ اور وکلاء کانفرنس کی قسم کے کتنے ہی نمائشی اسٹال کیوں نہ ایستادہ کر دیے جائیں۔ لوگ اب ان کی حقیقت سے واقف ہو چکے ہیں جیسا کہ ۱۹۷۰ء کے الیکشن میں دیکھا جا چکا ہے۔ یُخٰدِعُوْنَ اللّٰہَ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَمَا یَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَھُمْ (طلوع اسلام جولائی ۱۹۷۶ء ص ۳ تا ۱۱)

موجودہ مسلمان اور سیاسی کشمکش حصہ سوم لکھنا۔ پاکستانی قیادت پر کیچڑ اچھالنا، قائد اعظمؒ کے خلاف ہرزہ سرائی، کذب و افتراء یہ باتیں اس کی غماز ہیں کہ مودودی صاحب کے ارادے پاکستان کے متعلق نیک نہیں ہیں۔ پاکستان کا وجود ان کی شکست ماضی کا اعلان ہے اور اب تو یہ حقیقت نکھرتی ابھرتی اور فضائے سیاست میں پھیلتی صاف نظر آرہی ہے کہ مودودی صاحب ”بڑی سازش لیے ہوئے یہاں آئے تھے۔ ان کی آئے دن کی تخریبی سرگرمیاں بھی اس صداقت پر شاہد ہیں اور ان کا پاکستان میں تاریخی کردار اس کا بڑا ثبوت کہ انہوں نے کسی بھی حکومت کو سکون و تسلی سے تعمیر کے لیے کچھ کرنے نہیں دیا۔ یہ جماعت اور اس کے امیر و امام اس میں کیڑے ہی ڈالتے رہے۔ (مرتب)

باب ۱۲

نیرنگیٔ سیاست دوراں تو دیکھئے

جناح کے نام اقبالؒ کے خطوط کے دیباچے میں قائداعظم تحریر فرماتے ہیں

"ان کے (یعنی اقبال کے) خیالات اساسی طور پر میرے خیالات سے ہم آہنگ تھے اور میں ہندوستان میں آئینی مسائل کے محتاط مطالعے اور تجزیے کے بعد انہی نتائج پر پہنچا جن پر وہ پہنچ چکے تھے۔ اور بعد میں مسلمانان ہند کے متحدہ عزم کی صورت میں نودار ہوئے۔ اس متحدہ عزم نے آل انڈیا مسلم لیگ کے لاہور ریزولیشن کی شکل اختیار کر لی جسے عرف عام میں "پاکستان ریزولیشن" کا نام دیا جاتا ہے اور جو ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو پاس کیا گیا۔"

اب مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ وہ بھی اقبال کے قریب رہے بلکہ ان کے حواری تو یہ کہتے ہیں کہ اقبال اُن کے بہت قریب رہے۔ اس قربت کا اظہار مودودی صاحب نے اپنی بعض تحریروں میں کیا ہے۔ مثلاً آغا شورش کاشمیری کے نام ایک خط میں (۳۰ مارچ ۱۹۵۱ء) لکھتے ہیں:۔

"مجھے پہلی مرتبہ ان کی دلچسپی کا علم اس وقت ہوا، جب ۱۹۳۷ء کے آغاز میں ان کا عنایت نامہ مجھے ملا جس میں انہوں نے اس خواہش کا اظہار فرمایا تھا کہ میں حیدرآباد چھوڑ کر پنجاب چلا آؤں اور لاہور میں رہ کر فقہ اسلامی کی تدوین جدید میں ان کے ساتھ تعاون کروں۔ اس کے بعد کچھ مراسلت شروع ہوئی اور ۱۹۳۷ء کے آخر میں میں لاہور آکر دو تین مرتبہ ان سے ملا۔"

لیکن ہفت روزہ ایشیا (۷ اپریل ۱۹۶۹ء) میں غلام حسین اظہر کے ساتھ ایک انٹرویو میں مودودی صاحب اس قربت کے سلسلے میں اپنی رائے ذرا تبدیل کر دیتے ہیں۔ اس موقع پر علامہ کی طرف سے خط تقریباً ۱۹۳۶ء میں آتا ہے ——

غلام حسین اظہر کے سوال "علامہ صاحب نے آپ کو پنجاب آجانے کے لیے کوئی خاص وجہ بھی لکھی تھی؟" کے جواب میں فرماتے ہیں :۔

"بس یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ میں پنجاب چلا آؤں۔ زیادہ تفصیل نہیں لکھی تھی۔ اس وقت تو میں نہیں سمجھ سکا تھا کہ اس کی مصلحت کیا ہے۔ البتہ ۱۹۳۷ء کے وسط تک پہنچ کر مجھے یہ خود محسوس ہونے لگا تھا کہ جنوبی ہند چھوڑ کر مجھے شمالی ہند کی طرف رخ کرنا چاہیئے۔"

سوال :۔ آپ کی اور علامہ اقبال مرحوم کی جو تفصیلی گفتگو ہوئی اس میں کون سے مسائل زیادہ زیر بحث رہے؟"

"اس وقت جو گفتگو ہوئی وہ یہی تھی کہ مسلمانوں کے لیے کس نوعیت کے تعمیری کام کی ضرورت ہے۔ اس معاملے میں میرے اور علامہ مرحوم کے خیالات قریب قریب یکساں تھے۔ اور کام کا وہی خاکہ ان کے پیش نظر تھا جو میں نے پیش کیا تھا۔ اسی کو عملی جامہ پہنانے کی تدابیر ہی ہم اس گفتگو میں قدرے سوچتے رہے۔ تفصیلات مجھے یاد نہیں رہیں۔"

عجیب بات یہ نہیں کہ ان دو بیانات میں واقعاتی اختلاف ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ ایسے عظیم انسان کے ساتھ ملاقات کے بعد مودودی صاحب کو ایک "تفصیلی گفتگو" میں سے صرف یہ نکتہ یاد رہا کہ علامہ کے خیالات ان کے خیالات کا پرتو تھے۔

۱۹۳۷ء کے وسط اور اواخر کا زمانہ وہی ہے جن دنوں اقبال جناح کے نام اپنے خطوط لکھوا رہے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اسی "اپنی زندگی کے آخری سال میں) فقہ اسلامی پر اپنی تصنیف کا ڈول ڈال رہے تھے جس کا خاکہ انہی کے ہاتھ کا لکھا ہوا کراچی میوزیم میں (غالباً) ملتا ہے۔ مودودی صاحب نے آغا شورش کشمیری کے نام اس موضوع پر اپنے خط میں یہ بھی لکھا تھا کہ "آپ کا یہ سوال کہ ان کا آخری پیغام کیا ہے؟ میرے نزدیک کچھ عجیب سا ہے۔ اگر پیغام دینے والا خود بھی ظاہر نہ کر سکا ہو کہ اس کا پیغام کیا ہے تو اس کے

معنی یہ ہیں کہ اس نے کچھ بھی نہیں کہا۔ میرے نزدیک تو ان کا پیغام ان کے آخری زمانے کے کلام میں بالکل واضح ہے"۔ ساتھ ہی مودودی صاحب یہ بھی فرماتے ہیں کہ :۔

"مجھے جس حد تک معلوم ہوا ہے مرحوم میرے خیالات سے بڑی حد تک متفق تھے"۔
کیا یہ صحیح ہے؟ آج مودودی پسند اور مودودی نواز حضرات یہی ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ یہ صحیح ہے۔ اور اقبال کے معانی و مفاہیم بھی وہی ہیں جو مودودی صاحب اپنی تصانیف میں ہمارے سامنے پیش کرتے چلے آئے ہیں اور پیش کر رہے ہیں :۔

جناب محمد صفدر میر "مودودیت اور موجودہ سیاسی کشمکش" کے ص ۶۱ پر مودودیت اور اقبال" کے عنوان سے رقمطراز ہیں :۔

"مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوئم" کے اقتباسات سے ظاہر ہے کہ مودودی صاحب مسلم لیگ، اس کے سیاسی عزائم اور اس کے رہنماؤں اور اس میں شامل ہونے والے مسلمانوں کو یکسر دائرہ اسلام سے باہر تصور کرتے تھے......
جس زمانے کے متعلق مودودی صاحب یہ تاثر دینے کی کوشش کر رہے ہیں کہ ان میں اور اقبال میں اتفاق رائے اور اشتراک عمل کی بنیاد پر ایک دینی تحریک کا آغاز ہونے والا تھا اور اس تحریک کو چلانے کے لیے اقبال ؒ ہی نے حیدر آباد سے پنجاب آنے کی انہیں دعوت دی تھی۔ اور یہ وہی تحریک ہے جو اقبالؒ کے انتقال کے بعد مودودی صاحب نے چلائی۔ اب یہ وہی زمانہ ہے یعنی ۱۹۳۷ء کا وسط جس میں بقول میاں محمد شفیع علامہ اقبالؒ نفقہ اسلام پہ وہ نوٹ لکھے ہیں جن کا اوپر ذکر آچکا ہے اور جس میں مرحوم اسلام کی بنیادی معاشرتی اقدار کو اس طرح پیش کرتے ہیں" خدا پر ایمان، انسانیت میں نسلی اختلاف کا خاتمہ، اور معاشی مساوات موخر الذکر کے سلسلے میں علامہ "قل العفو" والی مشہور آیت کا جو اپنے اشعار میں بھی انہوں نے انہی معنوں میں استعمال کیا ہے، درج کرتے ہیں۔
پھر یہی وہ زمانہ بھی ہے جس میں علامہ اقبال قائد اعظم کے نام اپنے خطوط میں

پاکستان کے تصور اور ضرورت اور پاکستان کے معاشی اور معاشرتی اصولوں پر بڑی وضاحت سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔

آگے چل کر محمد صفدر میر تحریر فرماتے ہیں :۔

" اور باتوں کو تو فی الحال چھوڑیے۔ صرف علامہ کے پاکستان کے بارے میں موقف کی بات کیجئے۔ اگر علامہ اور مودودی صاحب میں اتنا زبردست اتفاق رائے موجود تھا کہ علامہ نے انہیں حیدر آباد سے پنجاب آکر یہاں بس جانے کی نہ صرف ترغیب دی بلکہ ان کے لیے اپنے ایک نیاز مند کے وسیلے سے دارالاسلام پٹھانکوٹ جیسے تعلیمی اور اشاعتی ادارے کا بھی بندوبست کر دیا تو پھر مودودی صاحب نے چھوٹتے ہی مسلم لیگ اور مسلم لیگ کے پروگرام کی مخالفت میں وہ طوفان کیوں برپا کر دیا جس کے چند نمونے ہم پچھلے مضمون میں پیش کر چکے ہیں؟ کیا اس کا یہ مطلب سمجھ لیا جائے کہ مودودی جب لاہور آکر علامہ سے دو تین بار ملے تھے تو انہوں نے مودودی صاحب سے یہ کہا تھا کہ دارالاسلام میں سکونت پذیر ہوتے ہی مسلم لیگ اور مسلم لیگ کی تحریک کی جڑ کاٹنے میں مصروف ہو جانا؟ کیا علامہ اپنے آخری ایام میں مسلم لیگ کے بارے میں اپنے خیالات تبدیل کر چکے تھے؟ اس سوال کے جواب کے لیے ہم علامہ ہی کی تحریروں کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ ان کے آخری زمانے میں اُن کا سیاسی موقف کیا تھا۔ اس کے لیے " خطوط بنام جناح " ہماری ہدایت کے لیے کافی ہیں۔

۲۸ رمئی ۱۹۳۷ء کے خط میں علامہ قائد اعظم سے یوں خطاب کرتے ہیں :۔

" میں یہ جان کر خوش ہوا ہوں کہ آپ ان باتوں کو پیش نظر رکھیں گے جو میں نے آپ کو لیگ کے آئین اور پروگرام کے بارے میں لکھی تھیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ حالات کی سنگینی سے پوری طرح واقف ہیں جہاں تک اُن کی زد مسلم انڈیا پر پڑتی ہے لیگ کو بالآخر اس امر کا فیصلہ کرنا پڑے گا کہ آیا وہ ہندوستانی مسلمانوں کے اوپر کے طبقوں کی نمائندہ ہے یا مسلمان عوام کی جماعت ہے جنہوں نے ابھی تک معقول وجوہ کی بنا پر اس میں کوئی دلچسپی نہیں لی ہے۔ ذاتی طور پر میرا ایمان ہے

کہ کوئی ایسی سیاسی تنظیم جو عام مسلمانوں کی قسمت کو بہتر بنانے کا وعدہ نہیں کرتی ہمارے عوام کو اپنی طرف نہیں کھینچ سکتی۔"

اس کے علاوہ جواہر لال کی سوشلزم کا ہندو ازم کی ہیئت سیاسی میں نفوذ اس بات کا متقاضی ہوگا کہ ہندوؤں میں بھی بہت سا خون خرابہ ہو۔ سوشل ڈیموکریسی (سوشلزم) اور برہمن ازم میں جو نزاع ہے وہ اس سے مختلف نہیں جو برہمن ازم اور بدھ ازم میں تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ سوشلزم کا بھی ہندوستان میں ویسا ہی حشر ہوگا جیسا کہ بدھ ازم کا ہوا تھا۔ لیکن ایک بات میرے ذہن میں صاف ہے وہ یہ کہ اگر ہندو ازم سوشل ڈیموکریسی کو قبول کرے تو یہ لازماً ہندو ازم نہیں رہ سکتا۔ اسلام کے لیے سوشل ڈیموکریسی کو کسی موزوں شکل میں اور اسلام کے قانونی اصولوں کی مطابقت میں قبول کر لینا کوئی انقلاب نہیں بلکہ اسلام کی اصل پاکیزگی کی طرف رجوع کرنا ہے۔ اس لیے جدید مسائل کا حل کرنا مسلمانوں کے لیے ہندوؤں کی بہ نسبت بہت آسان ہے۔" (مودودیت اور موجودہ سیاسی کشمکش ص۶۵ تا ۶۶)

قارئین کرام! "مودودیت اور موجودہ سیاسی کشمکش" کے محولہ بالا اقتباسات ہم نے محض اس لیے نقل کئے ہیں کہ اس حقیقت کو نمایاں اور آشکار کیا جائے کہ جب ۱۹۳۷ء میں حضرت حکیم الامتؒ، قائد اعظمؒ کے سامنے وضاحتی پروگرام پیش کر رہے ہیں اور اپنی رائے کو بھی واشگاف الفاظ میں قائد اعظمؒ کے سامنے رکھ رہے ہیں تو اس دور میں اگر حقیقتاً وہ مودودی صاحب کو بھی صاحب الرائے سمجھتے ہوتے یا انہیں کوئی خط لکھتے تو وہ ضرور یہ کچھ ان کو بھی لکھتے۔ ہمارا موقف یہ ہے کہ حضرت علامہؒ نے مودودی صاحب کو کوئی خط لکھا ہی نہیں نہ لکھوایا۔ جس خط کو مصلحتی اسلام غلط رنگ دے رہا ہے یہ خط سید نذیر نیازی صاحب نے چوہدری نیاز علی خاں مرحوم کے کہنے پر مودودی صاحب کو لکھا تھا جس کا تفصیلی ذکر ہماری کتاب میں کسی دوسری جگہ درج ہے۔ رہی فقہ کی بات۔ تو یہ بات بھی کوئی بات نہیں اور اس بات میں بھی کوئی صداقت نظر نہیں آتی۔ وہ اقبالؒ جو متواتر دس سال تک جناحؒ سے خط و کتابت کرتا رہا اور اپنا نقطۂ نظر سمجھانے

کے لیے کئی ایک خطوط لکھے۔ کیا یہ صاحبِ نظر اتنی استعداد نہ رکھتا تھا کہ مودودی صاحب کی ذہنی قلابازیوں کا اندازہ کر سکتا۔ اور پھر ایسا مودودی، جسے اقبالؒ یہ اہمیت دیتے ہوں (جیسا کہ ظاہر کیا جا رہا ہے) کیسے ممکن ہو سکتا تھا کہ وہ اقبالؒ کے انتخاب جناحؒ کے بارے میں ایسی سوقیانہ تحریروں سے اپنی کتاب "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوئم" مزین کرتے بلکہ ۱۹۴۸ء تک اس قسم کے رکیک حملے اس شخصیت پر کرتے جو اقبالؒ کی انتخاب ہو؟ اس قسم کی تحریرات جو مدّاحین مودودی حکیم الامتؒ کیساتھ روابط اور ملاقاتوں کے بارے میں پیش کر رہے ہیں ان کا حرف حرف، لفظ لفظ اور سطر سطر منہ بولتی صداقت ہے کہ یہ واقعہ نہیں افسانہ طرازی اور مصلحت کوشی ہے۔ آپ اس کتاب کے کسی صفحہ پر دیکھیں گے کہ جناب پرویز یہ اقبالؒ جرم کرتے ہیں کہ مودودی صاحب ان کے ذریعے دارالاسلام آتے۔

(چودھری حبیب احمدؒ)

مودودی ادب

"مودودیت اور موجودہ سیاسی کشمکش" کے صفحہ ۵۶ پر جناب محمد صفدر میر رقمطراز ہیں:-

"مودودیت کی جانب سے کُلّی کردار کُشی کے ہدف کوئی چھوٹے موٹے مسلم لیگی یا پاکستانی رہنما نہ تھے، بلکہ "بڑے لیڈروں سے لیکر چھوٹے مقتدیوں تک" ہر ایک تھا۔ اس طائفے کے سرخیل" اور سارے لیڈر" اس استہزاء کی زد پر تھے جس کو مودودی ادب کہا جاتا ہے اور جو بھٹیار خانے کی زبان کا ایک ترقی یافتہ ایڈیشن ہے۔ مودودی صاحب ۱۹۳۹ء سے لیکر ۱۹۴۷ء تک اور اس کے بعد بھی قائداعظم اور ان کے رفقاء کے بارے میں اسی طرح کے جذبات اور خیالات کا اظہار کرتے رہے۔"

علامہ اقبالؒ کے خیالات سے ہم آہنگی

ملاحظہ فرمایئے جناب والا! حکیم الامت حضرت علامہ

ؔ جیسا کہ آپ دیکھ چکے ہیں کہ پہلے ایڈیشن میں "لیگ کے قائداعظم" کے الفاظ درج ہیں بعد کے ایڈیشنوں میں مصلحتی اسلام کے علمبرداروں نے "بڑے لیڈروں" کر دیا ہے (مرتب)

اقبالؒ ۲۱ جون ۱۹۳۷ء کو قائداعظمؒ کو خط تحریر فرماتے ہیں:-

"آپ آج ہندوستان میں واحد مسلمان ہیں جن کی طرف قوم کی امیدیں لگی ہوئی ہیں کہ آپ اس کو اس طوفان سے حفاظت کے ساتھ پار لگا سکیں گے جو شمال مغربی ہندوستان اور شاید تمام ہندوستان میں آرہا ہے۔ اور یہ اُن کا حق ہے میں آپ پر واضح کرنا چاہتا ہوں کہ ہم واقعی ایک خانہ جنگی کے دور میں سے گزر رہے ہیں۔ اگر پولیس اور فوج نہ ہو تو یہ خانہ جنگی فوراً عام ہو سکتی ہے میں نے ساری صورت حال کا احتیاط سے تجزیہ کیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ ان واقعات (فسادات) کی اصل وجہ نہ مذہبی ہے اور نہ معاشی۔ یہ خالصتاً سیاسی ہے یعنی سکھوں اور ہندوؤں کی خواہش کہ مسلمانوں کی اکثریت کے صوبوں میں بھی ان کو خوفزدہ کر دیا جائے اور نیا آئین ایسا ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت کے صوبوں میں بھی مسلمان پورے طور پر غیر مسلموں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیئے گئے ہیں .... مجھے پورا یقین ہے کہ اس آئین کا مقصد ہندوستانی مسلمانوں کو شدید نقصان پہنچانا ہے.... ان حالات میں واضح ہے کہ ایک پرامن ہندوستان کے حصول کا راستہ صرف ایک ہے کہ وہ یہ کہ ملک کو نسلی، مذہبی اور لسانی رشتوں کی بنا پر تقسیم کر دیا جائے میری نظر میں ایک واحد ہندوستانی فیڈریشن کے تصور پر مبنی یہ نیا آئین بالکل فضول ہے۔"

یہ تو نگاہِ انتخاب ہے علامہ اقبالؒ کی کہ وہ حضرت قائداعظمؒ کو ہندوستان کا ایسا واحد مسلمان قرار دے رہے ہیں جو مسلمانانِ ہند کی شکستہ وخستہ کشتی کو اس خطرناک طوفان سے بچا کر ساحل مراد تک لے جا سکتے ہیں لیکن دوسری طرف اقبالؒ کے خیالات، احساسات اور میلانات ونظریات سے ہم آہنگ ہونے کا دعویدار مودودی کیا ارشاد فرماتے ہیں

"افسوس کہ لیگ کے قائداعظم سے لیکر چھوٹے مقتدیوں تک ایک بھی ایسا نہیں جو اسلامی ذہنیت اور اسلامی طرز فکر رکھتا ہو اور معاملات کو اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہو۔" (مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم ص ۳۲)

دوسرا اقتباس: "ایسے لوگوں کو محض اس لیے مسلمانوں کی قیادت کا
قرار دینا کہ مغربی سیاست کے ماہر یا مغربی طرز تنظیم کے استادِ فن ہیں اور اپنی قوم کے عشق
میں ڈوبے ہوئے ہیں سراسر اسلام سے جہالت اور غیر اسلامی ذہنیت ہے۔"

(مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش جلد سوم)

یہ ریمارک حضرت علامہؒ پر بھی موزوں نظر آتا ہے۔ کیا جناب والا تبار
حضرت مودودی کا کوئی ناقد اب بھی سید صاحب کے اس فرمان کی تردید
کہ وہ قائد اعظمؒ کا احترام کرتے تھے اور اس ارشاد پر تنقید کی جرأت کرے گا
کہ وہ خیالات میں اقبالؒ سے ہم آہنگ تھے؟ ضمیر زندہ ہی ان حقائق
کو تسلیم کر سکتا ہے۔ کہ مودودی صاحب کا مصلحتی اسلام اور ان کا
اپنا معیاری سیاسی اخلاق یہ تقاضا کرتا ہے کہ وہ اس قسم کی پہلو دار اور
دو رخی تحریرات سامنے لا کر نشانۂ تنقید و تردید بنیں مردہ ضمیر لوگ
اتنے واضح بیّن، کھلے اور صاف و شفاف، روشن ثبوت کے بعد بھی
یہی کہیں گے کہ ہمارے امیر و امام قائد اعظم کا احترام کرتے ہیں اور علامہ اقبال
سے خیالات کی ہم آہنگی، احساسات کی یک رنگی اور مسافتِ منزل کی ہمقدمی
میں یکتا ہیں، یگانہ اور گوہر یک دانہ ہیں۔ آپ ہی دانا نہیں، بینا نہیں سچ
فرمایا ہے مردِ حق اقبالؒ نے ؎

بانگِ اسرافیل ان کو زندہ کر سکتی نہیں
روح سے تھا زندگی میں بھی تہی جن کا جسد (اقبال)

اور ع مر کے جی اٹھنا فقط آزاد مردوں کا ہے کام

بندگانِ محکوم۔ تنخواہ دار ملازم۔ تاریک تر تاریکیوں میں گم رہنے کو
زندگی قرار دے کر فریبِ نفس کا شکار ہو جاتے ہیں۔

اے خدائے کائنات۔ یہ تو قدرت تو ہی رکھتا ہے کہ مردہ دلوں، مردہ
ضمیروں کو حیاتِ باحیا عطا کرے اور انہیں سمجھا سکے کہ حیاتِ بے شرف
اور مرگِ باشرف میں کتنا فرق ہے۔ وہ قلم گستاخ جس سے قائد اعظمؒ

سے لے کر مجددین، علماء اسلام اور صحابہ کبار رضہ تک نہ بچے۔ اے بارِ الٰہا! تو ہی طاقت رکھتا ہے کہ اس اسلام سوز قلم کی سوزناکیوں سے بھٹکے ہوئے گمراہوں کو ہدایت کی راہ پر لگا دے۔ ہم ناتوانوں میں یہ ہمت و قدرت کہاں۔ ہم صرف ترے دربارِ عالی میں التجا و درخواست ہی کر سکتے ہیں۔

(چودھری حبیب احمد)

باب ۱۳

اصُولی موقف؟

" تقسیم ہند کے بعد مولانا مودُودی صاحب نے (مرکزی شوریٰ اس سے بری ہے) جو موقف اختیار کیا اس نے بتدریج جماعت کو اس عالمی انقلاب برپا کرنیوالی جماعت کے بجائے " ایک مسلم سیاسی پارٹی " کے مقام پر پہنچا دیا اور جماعت نے پاکستان کے " نسلی مسلمانوں " کے مسائل کو اسی انداز سے حل کرنے کی کوشش شروع کر دی جس کا ان دلوں رواج تھا۔

تیسرے مرحلہ پر جماعت اسلامی ایک درجہ اور نیچے اتری اور اس نے ایک " قومی مسلم جماعت " کی حیثیت اختیار کرلی اور اس نے یہ موقف اختیار کیا کہ یہ مسلمان جو آٹھ دس سال پہلے " نسلی مسلمان " تھے اور صحیح اسلام سے کوئی واسطہ نہیں تھا اب اس مقام پر فائز ہو چکے ہیں کہ وہ اسلام کو اپنانے اور اسے اپنی زندگیوں اور اپنے ملک کا دین ماننے کے لئے بے چین ہیں نہ ان کے خلوص میں شبہ ہے اور نہ ان کی اسلامی تڑپ کسی درجہ میں مخدوش ہے۔

البتہ جو قیادت ان مسلمانوں پر مسلط ہوگئی ہے وہ اسلام سے منحرف اور اسلام دشمن ہے اور اس میں بھی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کا موقف یہ تھا اور ہے کہ جو لوگ آج برسر اقتدار ہیں وہ اسلام دشمن ہیں۔ اس لئے انہیں محروم اقتدار کرنا اقامتِ دین کا سب سے پہلا اور بڑا کام ہے۔ لیکن جونہی یہ لوگ اپنی اکھاڑ پچھاڑ سے از خود محروم اقتدار ہو جائیں تو ان سے مصالحت مصلحتِ دین ہے اور جو لوگ فی الوقت برسر اقتدار ہوں تو ان کو شکست دینے کے لئے ان کے ساتھ مشورے، تعاون، پیکٹ اور معاہدے کئے جا سکتے ہیں۔

جماعت کے موقف میں یہ عظیم تبدیلی تھی اور دیانت کا تقاضا یہ تھا کہ جماعت کے سربراہ کار اپنے موقف کی تبدیلی کا اعتراف کرتے بلکہ ان کا یہ بھی فرض تھا کہ جس طرح انہوں نے آغازِ کار میں اس نوع کے طرز عمل اختیار کرنیوالی پارٹیوں کو غلط اور ان کے مسلک کو خلافِ اسلام قرار دیا تھا۔ اب یا تو وہ یہ اعلان کرتے کہ ان کا یہ فکر غلط تھا اور اب انہوں نے دلائل کی بنا پر انہی لوگوں کا مسلک اختیار کر لیا ہے اور یا پھر وہ اعتراف کرتے کہ اوائل زمانہ میں ان کا پیش کردہ فکر

تھا تو درست۔ لیکن اسے اختیار کرنے میں جو مشکلات سامنے آئیں اور جن صبر آزما مراحل سے گزرنا ناگزیر تھا وہ اس کے متحمل نہیں ہو سکے اس لئے انہوں نے جماعت کو "انقلابی اسلامی پارٹی" کے مقام سے گرا کر "قومی مسلم پارٹی" کے درجے تک پہنچا دیا ہے۔

لیکن ان دونوں صحیح راستوں کو چھوڑ کر جو راستہ جماعت کے قائدین اور ان کے مخصوص حامیوں نے اختیار کیا وہ یہ تھا کہ ان کا موجودہ موقف جماعت کا دوسرا دور یا تحریک کا دوسرا اور تیسرا مرحلہ ہے۔ اور پھر ان حضرات نے اپنے اس فکر کی کمزوریوں کو چھپانے کے لئے براہ راست اسلام کے بارے میں یہ کہنا شروع کر دیا کہ اس کے مختلف ادوار میں تضاد و اختلاف کی گنجائش ہے اور یہ تضاد و اختلاف دراصل "حکمتِ دین" اور حکمتِ عملی (PRACTICAL WISDOM) ہے جسے کم نظر لوگ نہ پہچان کر "اپراتے" اور پہلے اصولی موقف پر بے جا اصرار کرتے ہیں۔

(ہفت روزہ المنبر لائل پور ۲۰ اگست ۱۹۵۸ء) صفحہ ۴ تا ۵

مولانا اشرف کس قدر سادے اور بھولے ہیں۔ جناب! انہوں نے تو ہوسِ اقتدار میں صحابہ کبار رضی اللہ عنہم کو رفعت و عظمت کے آسمانِ بلند سے اتار کر اپنے گھناؤنے کردار کی سطح پر لا کھڑا کیا کہ لوگ یہ کہیں اگر مودودی صاحب اور ان کی جماعت بے اصولیوں کی پوٹ ہے تو ان سادہ دل مسلمانوں کو یہ بتا دیا جائے کہ ہمارے اسلاف (دست پروردگانِ رسالت ﷺ) (معاذ اللہ معاذ اللہ) بھی اسی سطح کے لوگ تھے۔ ان کی "انقلابی اسلامی پارٹی" کی ابتدا یہی تھی جس کی انتہا پر آپ اظہارِ تاسف کر رہے ہیں۔ (مرتب)

علامہ موسیٰ جار اللہ (مرحوم)

آپ نے جماعتِ اسلامی والوں کو علمائے ہند کے بارے میں ایک مراسلہ بھیجا جو "ترجمان القرآن" میں چھپا۔ اس مراسلے کے نیچے مودودی صاحب کی طرف سے یہ نوٹ دیا گیا تھا۔

"علامہ نے ان سطور میں علمائے ہند کی نسبت جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے اس کا حرف بحرف صحیح ہے بلکہ اس سے زیادہ ملامت و تحقیر کے وہ سزاوار ہیں۔ لیکن نہایت ادب کے ساتھ ہم یہ گزارش ضرور کریں گے کہ ان جرائم کے مجرم تنہا ہندوستان ہی کے علماء نہیں ہیں بلکہ اس باب میں تمام عالمِ اسلامی کے علماء کا حال یکساں ہے ہر جگہ کے مدارس میں قرآن متروک و مہجور ہے ہر جگہ اس گروہ میں انانیت، کبر، خود پرستی کی وہی بیماریاں ہیں جو علامہ کو یہاں کے علماء میں نظر آ رہی

ہیں علم و تحقیق کی خواہش اور اس کی قدر و حق شناسی بھی ہر جگہ مفقود و معدوم ہے اور تبادلۂ افکار اور تعاون آراء کے ذریعے رفع نزاع اور تحقیق کی تمنا جو علامہ نے ظاہر فرمائی ہے اس کا بھی کہیں سراغ نہیں لگتا اور شائد یہی وجہ ہے کہ ہر جگہ کے علماء اپنے انجام کو پہنچ گئے اور قدرت کی طرف سے ان جرائم کی جو سزا مقرر تھی وہ ان کو مل چکی۔

(ترجمان القرآن جنوری فروری ۱۹۴۵ء، صفحہ ۷)

صدیوں کے جمود کا نقصان

علماء کے جمود کی وجہ سے اُمت کو جو نقصان اٹھانا پڑا، اسکی نشاندہی ان الفاظ میں فرماتے ہیں

" آج تمام دنیائے اسلام اسی خوفناک انقلاب کے دور سے گزر رہی ہے درحقیقت یہ علماء کا کام تھا کہ جب اس انقلاب کی ابتداء ہو رہی تھی اس وقت وہ بیدار ہوتے۔ آنے والی تہذیب کے اصول و مبادی سمجھتے۔ مغربی ممالک کا سفر کر کے ان علوم کا مطالعہ کرتے جن کی بنیاد پر یہ (مغربی) تہذیب اٹھی ہے۔ اجتہاد کی قوت سے کام لے کر ان کار آمد علمی اکتشافات اور عملی طریقوں کو اخذ کر لیتے۔ جن کے بل پر مغربی قوموں نے ترقی کی ہے اور ان نئے کل پرزوں کو اصولِ اسلام کے ماتحت مسلمانوں کے تعلیمی نظام اور ان کی تمدنی زندگی کی مشین پر اس طرح نصب کر دیتے کہ صدیوں کے جمود سے جو نقصان پہنچا تھا۔ اس کی تلافی ہو جاتی اور اسلام کی گاڑی پھر سے زمانہ کی رفتار کے ساتھ چلنے لگتی۔ مگر افسوس کہ علماء (الا ماشاء اللہ) خود اسلام کی حقیقی رُوح سے خالی ہو چکے تھے۔ ان میں اجتہاد کی قوت نہ تھی ان میں تفقہ نہ تھا۔ ان میں حکمت نہ تھی۔ ان میں عمل کی طاقت نہ تھی۔ ان میں صلاحیت ہی نہ تھی کہ خدا کی کتاب اور رسولِ خدا کی علمی و عملی ہدایت سے اسلام کے دائمی اور لچکدار اصول اخذ کرتے۔ اور زمانہ کے متغیر حالات میں ان سے کام لیتے۔ ان پر تو اسلاف کی اندھی اور جامد تقلید کا مرض پوری طرح مسلط ہو چکا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ ہر چیز کو ان کتابوں[1] میں تلاش کرتے تھے۔ جو خدا کی کتابیں نہ تھیں کہ زمانہ کی قیود سے بالاتر ہوتیں۔ وہ ہر معاملہ میں ان انسانوں[2] کی طرف رجوع کرتے جو خدا کے نبی نہ تھے کہ ان کی بصیرت اوقات و حالات کی بندشوں سے بالکل آزاد ہوتی"

(تنقیحات۔ از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب) (صفحہ ۲۷)

[1] مراد حنفی فقہ کی کتابیں ہیں۔ [2] مراد حنفی ائمہ ہیں۔

پروفیسر مولانا عبدالستار خیری

واضح رہے کہ ان سطور کی تحریر کے زمانے میں مودودی صاحب زیادہ نہیں تو کسی حد تک پروفیسر عبدالستار خیری کے ان خیالات سے متاثر تھے جن کا انہوں نے جرمنی میں تکمیلِ تعلیم کے بعد ہندوستان میں آکر اظہار کیا تھا۔ انہوں نے جرمنی سے واپسی کے بعد اپنے بھائیوں کے ساتھ مل کر جو خیری برادرس کے نام سے مشہور تھے، دہلی میں "جماعتِ اسلامی" کی بنیاد ڈالی تھی۔ مولانا سید سلیمان ندوی (مرحوم) نے مولانا مسعود عالم ندوی (مرحوم) کی کسی کتاب (غالباً) "ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک پر ایک نظر" کے دیباچہ میں یہ انکشافات فرمائے تھے کہ پروفیسر عبدالستار خیری جرمنی میں سوشلزم کی تحریک سے متاثر ہو کر آئے تھے بہرحال انہوں نے جس "جماعتِ اسلامی" کی بنیاد ڈالی تھی۔ مودودی صاحب اس میں شریک تھے۔ لیکن موجودہ جماعتِ اسلامی والوں کا کہنا ہے کہ مودودی صاحب ان کے نظریہ "وحدت آمریت" سے اتفاق نہ کر سکے۔ اس لئے جلد ہی علیحدہ ہو گئے۔ اور بعد میں مناسب وقت پر اپنی "جماعتِ اسلامی" کی بنیاد ڈالی۔ تاہم ایک تو انہوں نے نام بھی وہی رہنے دیا۔ اور دوسرے کہا جاتا ہے کہ جماعت کا تنظیمی ڈھانچہ بھی انہی اصولوں پر مرتب کیا۔ جہاں تک ہمیں یاد پڑتا ہے۔ پاکستان بننے کے بعد کسی نے اعتراض کیا تھا کہ جماعت سے متعلقین کے جو تین درجے یعنی رکن، ہمدرد اور متفق بنائے گئے ہیں۔ یہ کمیونزم کے تنظیمی ڈھانچے سے لئے گئے ہیں۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ پھر تیسرا درجہ یعنی "متفقین" کو ختم کر دیا گیا۔

(طلوعِ اسلام مئی ۱۹۶۹ء، صفحہ ۵۱ تا ۵۲)

کوئی اعتراف و اقرار کرے یا نہ کرے۔ اہل بصیرت دیکھ رہے ہیں کہ جماعت کی تنظیم کا ڈھانچہ قریباً قریباً انہی نقوش و خطوط پر اٹھایا گیا ہے اور "جماعتِ اسلامی" نام بھی خیری برادرس سے ہی لیا گیا ہے۔ (مرتب)

اسلامی سوشلزم

"مودودی اور اسلام" کے مرتب جناب محمد اکرام بصیرپوری صفحہ ۲۰، ۲۱ پر لکھتے ہیں:-

"یہ حقیقت کسی سے مخفی نہیں کہ سابقہ انتخابات میں جناب مودودی صاحب نے ایوب خاں کے مقابلے میں محترمہ فاطمہ جناح کی مکمل حمایت کی تھی۔ حالانکہ محترمہ فاطمہ جناح نے اسلامی سوشلزم کے نفاذ کی وضاحت کر دی تھی۔ چنانچہ انہوں نے ۲۰ دسمبر ۱۹۶۴ء کو بی ڈی

ممبروں کے نام ایک سرکلر لیٹر ارسال کیا جس میں انہوں نے ممبران سے تعاون طلب کرتے ہوئے لکھا کہ "مجھے امید ہے کہ آپ موجودہ صدارتی انتخاب میں تمام ذاتی مفادات اور ہر قسم کی جانبداری سے بالاتر ہو کر بلا خوف و خطر اپنے قیمتی ووٹ کا استعمال کریں گے تاکہ وطن عزیز اور ہمارے عوام اس کھوئی ہوئی آزادی اور جمہوری حقوق دوبارہ حاصل کر سکیں اور ہماری آئندہ نسلیں اپنی زندگی اسلامی سوشلزم اور ان اصول و نظریات کے مطابق گزار سکیں جن کی بنیاد پر ہماری عظیم مملکت پاکستان وجود میں آئی ہے۔"

ذہنوں پر چھاپہ

علامہ ارشد القادری سکریٹری جنرل دی ورلڈ اسلامک مشن انگلینڈ اپنی کتاب "جماعت اسلامی" کے صفحہ ۱۲ پر رقمطراز ہیں :-

"جماعت اسلامی کس رخ پر مسلمانوں کو لے جانا چاہتی ہے۔ اسے سمجھنے کے لئے پہلے اس کا فکری مزاج اور انداز تربیت سمجھنا ہوگا۔ ردّ و انکار کی عام راہوں سے ہٹ کر طویل عرصے تک جماعت کے لٹریچر، طریقہ تربیت اور ذہنی تبدیلیوں کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ جماعت اسلامی پُر اسرار کمیونسٹوں کی طرح نہایت چالاکی۔ اور خموشی کے ساتھ ذہنوں پر چھاپہ مارتی ہے۔

سب سے پہلے پرکشش اور خوشنما لٹریچر کے ذریعے جسے جماعت کا گشتی دار المطالعہ مفت سپلائی کرتا ہے وہ اپنا زہر اجنبی دماغوں میں اتارتی ہے اور جب ذہن مسحور ہو جاتا ہے تو اسے ایک نہایت مہلک اور خطرناک قسم کی جماعتی نخوت فکر میں مبتلا کر دیتی ہے۔

جماعت اسلامی از علامہ ارشد القادری صفحہ ۱۲

الحاد کا دروازہ کھولنا

"خود ہی فتنۂ الحاد کا دروازہ کھولنا، اور خود ہی اسے بند کرنے کے لئے تحریک چلانا جماعت اسلامی کا اتنا بڑا تجارتی فن ہے۔ جسے سمجھنے کے لئے گہرائی میں اترنے کی ضرورت ہے۔ ع

— خود کوزہ، و خود کوزہ گر، و خود گلِ کوزہ

(جماعت اسلامی از علامہ ارشد القادری صفحہ ۱)

یہ سنسنی خیز تفصیلات معلوم کرنے کے لئے ورق الٹیے :-

جماعت اسلامی از — علامہ ارشد القادری جمشید پور دیہار) ۱۰ جولائی ۱۹۶۵ء

اقتباس ملاحظہ فرمائیں

جُدائی ڈالنا "جاہلیت" کی نئی اصطلاح ان مسلمانوں پر بولی جاتی ہے جو جماعت سے باہر ہیں یا جماعت کے زہریلے جراثیم سے اپنے حلقۂ اثر کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں بالکل ایک مذہبی فرقے کی طرح جماعتی تعلق کو خاندانی رشتوں پر ترجیح دی جاتی ہے بلکہ ہر ممبر کو جماعتی سرگرمیوں کی راہ میں حائل ہونے والے خاندان اور مناشرہ سے کٹ کر ایک باغی کی طرح زندگی بسر کرنے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ مولانا مودودی جو اس جماعت کے بانی اور فکری طور پر مرکز قیادت ہیں ایک خط کے جواب میں لکھتے ہیں:۔

"جہاں خاندان کے لوگ جاہلیت میں مبتلا ہوں اور راہِ راست پر چلنے میں اپنے بھائی بندوں کی مزاحمت کرتے ہوں۔ وہاں تو فی الواقع جدائی ڈالنا ہی ہمارا کام ہے۔ ایسے اعزہ و اقارب اور دوستوں سے اہل ایمان کو ملانا نہیں بلکہ توڑنا اور کاٹنا ہی ہمارے پیشِ نظر ہے۔ (رسائل و مسائل ج ۱ ص ۲۸۷)

علامہ ارشد القادری لکھتے ہیں:۔

"اتنا ہی نہیں بلکہ اس ماحول میں پہنچ کر جماعت کا ہر ممبر جماعت کی فکری اور عملی برتری کی نخوت میں اتنا خود رفتہ بنا دیا جاتا ہے کہ تمام بزرگانِ اُمت اور سلفِ صالحین پر حرف گیری و نکتہ چینی اس کا جماعتی عقیدہ بن جاتا ہے ــــ اور اسی غلط جذبے میں ملتِ اسلام کی تمام برگزیدہ ہستیوں سے اپنے ذہن و فکر کا رابطہ توڑ کر وہ صرف اپنی جماعت کے رہنماؤں کی فکری اور عملی برتری پر عقیدہ رکھنے لگتا ہے۔

واضح رہے کہ ذہن کی یہ انقلابی کیفیت اچانک رونما نہیں ہو جاتی بلکہ رفتہ رفتہ یہ زہر دماغوں میں سرایت کرتا ہے جس کے لئے لٹریچر میں خاص طور پر ایسے مواد فراہم کئے جاتے ہیں جن کے مطالعہ کے بعد از خود ذہن کا رشتہ ماضی کی شخصیتوں سے کٹ جاتا ہے"

مولانا مودودی "میں نے دین کو حال یا ماضی کے اشخاص سے سمجھنے کے بجائے ہمیشہ قرآن و سنت ہی سے سمجھنے کی کوشش کی ہے اس لئے یہ معلوم کرنے کے لئے کہ خدا کا دین مجھ سے اور ہر مومن سے کیا چاہتا ہے یہ دیکھنے کی کوشش نہیں کرتا کہ فلاں اور فلاں بزرگ کیا کہتے اور کیا کرتے ہیں" (جماعتِ اسلامی) روداد اجتماع جلد ۳ ص ۲ ص ۳ تا ۱)

قادری صاحب تحریر فرماتے ہیں :۔

"یہ صحیح ہے کہ قرآن و سنت ہی دین کا اصل ماخذ ہے۔ لیکن بحث الفاظ و عبارت میں نہیں ان کے مفہوم و معنی میں ہے اور ظاہر ہے کہ مفہوم کے تعین میں فہم ہی کو دخل ہے اور جب اکابر اُمت کا فہم مولانا مودودی کے نزدیک قابل اعتماد نہیں ہے۔ تو خود ان کے فہم پر کوئی کیسے اعتماد کر سکتا ہے۔ لہٰذا بتایا جائے کہ قرآن و سنت سے براہ راست دین کے سمجھنے کی کیا صورت ہو گی۔ مولانا مودودی اور ان کے رفقاء چونکہ اپنے آپ کو اجتہاد کی مسند پر فائز سمجھتے ہیں۔ اس لئے اگر وہ ملت کے اماموں اور ماضی کے اشخاص سے مستغنی ہو جائیں تو اس دورِ الحاد میں کون ان کی کلائی تھامنے والا ہے۔

جیسا کہ بھرپور جذبۂ تعلّی کے ساتھ مولانا نے خود ایک جگہ اس کا اظہار فرمایا ہے :۔

"میں نہ مسلک اہلِ حدیث کو اس کی تمام تفصیلات کے ساتھ صحیح سمجھتا ہوں۔ اور نہ حنفیت یا شافعیت ہی کا پابند ہوں" (رسائل و مسائل جلد ۱ ص ۱۸۵)

(جماعتِ اسلامی از علامہ ارشد القادری) (صفحہ ۱ تا ۱۹)

فنِ حدیث کے نظامِ عمل کو یوں مسخ کرتے ہیں

"آپ کے نزدیک ہر اس روایت کو حدیثِ رسول مان لینا ضروری ہے جسے محدثین سند کے اعتبار سے صحیح قرار دیدیں، لیکن ہمارے نزدیک یہ ضروری نہیں ہے ہم سند کی صحت کو حدیث کے صحیح ہونے کی لازمی دلیل نہیں سمجھتے۔

(رسائل و مسائل جلد ۱ ص ۲۲۹) جماعتِ اسلامی۔ (صفحہ ۴۴)

امیر المومنین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر نکتہ چینی

خلافتِ راشدہ پر جاہلیت کا حملہ کس طرح ہوا۔ اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے مولانا مودودی خلیفۂ سوم پر ان الفاظ میں نکتہ چینی کرتے ہیں :۔

"ایک طرف حکومتِ اسلامی کی تیز رفتار وسعت کی وجہ سے کام روز بروز سخت ہوتا جا رہا تھا۔ اور دوسری طرف حضرت عثمان جن پر اس کارِ عظیم کا بار رکھا تھا ان خصوصیات کے حامل نہ تھے۔ جو

ملا :۔ تنخواہ لینے کے بعد (مرتب)

ان کے جلیل القدر پیش روؤں کو عطا ہوئی تھی۔ اس لئے جاہلیت کو اسلامی نظامِ اجتماعی میں گھس آنے کا راستہ مل گیا۔ (تجدید و احیائے دین صد ۴۳) "جماعت اسلامی" صفحہ ۳۴

عام صحابہؓ رسولؐ پر نکتہ چینی

انبیائے کرام کے بعد دنیا کا وہ کامل ترین طبقہ جس کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ میرے صحابہ ستاروں کی طرح ہیں۔ ان میں سے جس کسی بھی پیروی کی جائے ہدایت یاب ہونے کے لئے کافی ہے۔ اسلامی کائنات کی ان واجب الاحترام ہستیوں پر نکتہ چینی کرتے ہوئے مولانا مودودی ایک جگہ لکھتے ہیں :-

"برسوں کی تعلیم و تربیت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کو میدانِ جنگ میں لائے اور باوجودیکہ ان کی ذہنیت میں انقلاب عظیم رونما ہوچکا تھا مگر پھر بھی اسلام کی ابتدائی لڑائیوں میں صحابہؓ کرام جہاد فی سبیل اللہ کی اصلی اسپرٹ کو سمجھنے میں بار بار غلطیاں کر جاتے تھے۔

(ترجمان القرآن ربیع الثانی ۵۷ھ)"

اس مقام پر اتنا اور ذہن میں رکھ لیا جائے کہ مشاہیر صحابہؓ کرام کو چھوڑ کر عام صحابہ کو مولانا مودودی "معیاری مسلمان" (پکے مسلمان) نہیں سمجھتے۔ واضح رہے کہ مولانا کے نزدیک چونکہ صحابہؓ کا قول و فعل دینی احکام کے لئے حجت نہیں۔ اس لئے "معیاری مسلمان" سے ان کی مراد کامل مسلمان ہے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں :-

"حقیقت یہ ہے کہ عامی لوگ نہ کبھی عہدِ نبویؐ میں معیاری مسلمان تھے اور نہ اس کے بعد ان کو معیاری مسلمان ہونے کا فخر حاصل ہوا۔ (تفہیمات صد ۳۱) "جماعت اسلامی" (صفحہ ۳۰ و ۳۱)

معلمِ انسانیت، میر کاروانِ انسانیت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی برسوں کی تربیت مودودی صاحب کے نزدیک (معاذ اللہ معاذ اللہ) ان کو حقیقی اسلام نہ سمجھا سکی اور وہ غلطیاں کرتے رہے۔ اب مودودی صاحب کی حکمتِ عملی کے فلسفہ کے حامل اسلام اور ان کی مصلحتی تعلیم و تربیت بوقت ضرورت جھوٹ پر جھوٹ بولنے والے نقاب پوش صالحین کو اچھے نمونہ کے مسلمان بنائے گی ؟ سچ کہا ہے کہ اُمت سے لے کر پیغمبر تک سبھی مودودی کے قلم کے نشانے پر ہیں (مرتب)

(۱) **تبصرہ** :- یہ صورتِ حال قابلِ صد مبارک باد ہے کہ سترہ سال تک ذہنی الحاد اور جماعتی فریب کی تاریکیوں میں اسیر رہنے کے بعد نیازی صاحب کو سلامتی کے ٹھنڈے اجالوں کی طرف

واپس آنے کی توفیق میسر ہوئی۔ .... بہرحال کچھ بھی ہو کوثر نیازی صاحب کے اس قابل رشک اقدام نے جماعت اسلامی کے بناوٹی ماحول سے حقائق کی طرف پلٹنے کے لئے ہر ذہن میں تلاش حق کی ایک نئی تحریک پیدا کر دی ہے کچھ عجب نہیں کہ مستقبل قریب میں پھر کوئی کوثر نیازی پیدا ہو اور اس "طلسم فریب" کے کچھ نئے اسرار اور منظر عام پر آئیں۔

"جماعت اسلامی" از علامہ ارشد القادری صفحہ ۵۸)

(۲)۔ تبصرہ :۔ نیازی صاحب کا طویل مراسلہ اتنا واضح ہے کہ اس کے اہم گوشوں پر نہ بھی روشنی ڈالی جائے جب بھی جماعت اسلامی کی "پراسرار دعوت" اور فکری مصنوعات کی سجی ہوئی دوکان کے پیچھے جو "شرمناک حقائق" ہیں وہ پورے طور پر بے نقاب ہو گئے ہیں۔ اس آئینے میں جماعت کی تنظیمی، دینی، اخلاقی، سیاسی اور فکری حادثوں کی جو تصویر نظر آتی ہے اسے دیکھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ "جماعت اسلامی" دینی جرائم کی تاریخ کا ایک خوبصورت ٹائیٹل ہے۔

(جماعت اسلامی، صفحہ ۵۴)

مولانا مودودی کے ہاتھ میں تکفیر کی نئی تلوار

اور پھر جس طرح داخلہ کے لئے اور مسلمان سمجھنے کے لئے۔ جماعت اسلامی کے اپنے وضع کردہ شرائط ہیں۔ اسی طرح اخراج کے لئے اور کافر مرتد قرار دینے کے لئے بھی اس جماعت کے اپنے ضوابط ہیں چنانچہ جماعت کے بانی مولانا مودودی ایک جگہ اس کا اظہار یوں فرماتے ہیں

"جو لوگ تعلیم و تربیت اور اجتماعی ماحول کے تاثرات کے باوجود ناکارہ نکلیں تکفیر کے ذریعے (کفر کا فتویٰ صادر کر کے) ان کو جماعت سے خارج کر دیا جائے اور اس طرح جماعت کو غیر مناسب عناصر سے پاک کیا جاتا رہے۔ (سیاسی کشمکش حصہ سوئم ص ۲۱)

جماعت اسلامی اگر کوئی نیا دین نہیں بلکہ اسلام ہی اس کی تمام تر فکری سرگرمیوں کا مرکز ہے تو میں جماعت کے تمام ذمہ وار افراد سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ قرآن و حدیث میں اس کی سند کہاں موجود ہے کہ جو مسلمان تعلیم و تربیت کے باوجود ناکارہ نکل جائیں ان پر کفر کا فتویٰ صادر کر کے انہیں اسلام سے خارج کر دیا جائے۔ (جماعت اسلامی از علامہ ارشد القادری صفحہ ۷۰، ۷۱)

لٹریچر :۔ "جماعت اسلامی کے ظاہری محاسن کے سلسلہ میں عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے دلنشین لٹریچر کے ذریعے مغرب زدہ ذہنوں کو اسلام کی طرف واپس

لانے کی مؤثر کوشش کر رہی ہے۔ جماعت کی یہ اتنی عظیم خدمت ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

میں عرض کروں گا کہ جہاں تک مغرب زدہ ذہنوں کو اسلام سے قریب لانے کا سوال ہے اس خدمت کے لائقِ تحسین ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ لیکن اس سلسلہ میں بحث کا سب سے اہم گوشہ یہ ہے کہ پہلے اسلام کا مفہوم اور اس کی تشریح کا رُخ متعین کیا جائے۔

گذشتہ اوراق میں ثابت کر چکا ہوں کہ جماعتِ اسلامی جس اسلام کی طرف مغرب زدہ حضرات کو بلا رہی ہے وہ خود اس کا اپنا تشریحی اسلام ہے اس کی پشت پر نہ چودہ سو برس کی روایات کا تسلسل ہے نہ حاملانِ اسلام کے اس مقدس گروہ سے کوئی فکری رابطہ ہے جس سے مربوط ہوئے بغیر اسلام کو سمجھنا دشوار ہی نہیں ناممکن ہے۔

کاروانِ اسلام کی عام گزرگاہ سے ہٹ کر تنہا اپنی فکر کی بنیاد پر وہ ایک نیا راستہ ہموار کرنا چاہتی ہے اور یہ یقین دلانے کے لئے کہ یہی اسلام کا اصل راستہ ہے اس کے پیچھے دیدہ زیب لٹریچر کا انبار جمع کر دیا ہے۔ اس لئے ہمیں یہ باور کرنے میں قطعاً کوئی تامل نہیں کہ جماعتِ اسلامی کا لٹریچر اس سے زیادہ کوئی خدمت انجام نہیں دے رہا کہ مغرب زدہ ذہنوں کو ایک گمراہی سے نکال کر دوسری گمراہی میں مبتلا کر دیتا ہے۔

فرق اتنا ہے کہ پہلے اسلام کے خلاف گمراہی تھی۔ اب اسلام کے نام پر گمراہی ہے پہلی گمراہی سے پلٹنا آسان تھا۔ دوسری گمراہی سے نجات پانا بہت مشکل ہے۔

گمراہیوں کا تبادلہ بھی اگر تحسین و پذیرائی کے قابل ہے تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ جماعتِ اسلامی کے محاسن کی فہرست میں اسے ضرور شامل کر لیا جائے پھر فکر و اعتقاد کے مفاسد کے باوجود اگر کسی جماعت کی صرف اتنی سی خدمت اس کی حمایت کے لئے وجہِ جواز ہو سکتی ہے تو مجھے یہ کہنے کی اجازت دی جائے کہ اس سلسلہ میں احمدی جماعت (قادیانی جماعت) کی خدمات اس سے بھی زیادہ نمایاں ہیں :۔

جماعتِ اسلامی جن لوگوں کو اسلام سے قریب کرتی ہے وہ ہزار بگڑنے کے باوجود کسی نہ کسی نہج سے اسلام کے ساتھ بہرحال کوئی تعلق رکھتے ہیں، لیکن قادیانی جماعت کا لٹریچر مغرب کے ان عیسائیوں کو جو اندر سے لے کر باہر تک اسلام کے غالی دشمن اور حریف ہیں انہیں اسلام سے قریب ہی نہیں کرتا اپنے طور پر اسلام کا کلمہ پڑھواتا ہے۔

آگے چل کر، جماعتِ اسلامی کے سارے ذمہ دار افراد سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ

اپنے تعارف میں قادیانی جماعت کے ان خوبصورت الفاظ بے غبار اندازِ بیان، اور اپنے مذہب کی حسین ترجمانی پر وہ کہیں بھی انگشتِ اعتراض رکھنے کی جگہ بتائیں ؟ کہیں بھی اسلام کی بغاوت اور عقیدے کے فساد کا سراغ ملتا ہو تو اس کی نشاندہی کریں ؟ بلکہ تعارف کے یہ الفاظ کہ۔

" وہ تمام امور جن پر سلف صالح کا اعتقادی اور عملی طور پر اجماع تھا اور وہ اہلِ سنت کی اجماعی رائے سے اسلام کہلاتے ہیں ان سب کا ماننا فرض ہے " جماعتِ اسلامی کو ننگ، عار کر دینے کے لئے کافی ہے جبکہ سلف صالح کے اعتقاد و عمل اور اہلِ سنت کی اجماعی رائے سے مکمل انحراف و بے زاری منجملہ ان مقاصد کے ایک اہم مقصد ہے جسے جماعتِ اسلامی اپنے پیشِ نظر رکھتی ہے .... پھر گہرائی میں اترنے کے بعد سوا اس کے اور کیا وجہ دریافت کی جا سکتی ہے کہ لٹریچر، تنظیم اور نعرہ ہی سب کچھ ہے۔ اس کے پیچھے قادیانی تحریک کا ایک خوفناک مقصد بھی ہے اور وہ ہے اسلام کے نام پر اسلام کو منہدم کرنے کی خطرناک سازش ! ! ! ! ....

.... پھر پچھلے صفحات میں جو حقائق سپردِ قلم کئے گئے ہیں بالخصوص نیازی صاحب کے مراسلہ اور استعفا نامہ کے ذریعہ جماعتِ اسلامی کے جو سنسنی خیز حالات منظرِ عام پر آئے ہیں کیا وہ اس امر کی واضح نشاندہی نہیں کرتے کہ جماعتِ اسلامی بھی سنگین ارادوں سے مسلح ہو کر اجتماعی تحریک کے پردے میں ایک نئے مذہب فکر کے لئے زمین ہموار کر رہی ہے ؟ اور یہاں بھی اسلام کے نام پر اسلام کے خلاف عقل و ذہانت کی ایک خوفناک سازش بتدریج پروان چڑھ رہی ہے۔ آثار و واقعات کی شہادت مسترد نہیں کی جا سکتی ....

حرفِ آخر یہ ہے کہ خود جماعتِ اسلامی کے نزدیک بھی ان باطل تحریکوں کا نمائشی اسلام اور تبلیغی لٹریچر اگر عقیدے کے فساد سے صرفِ نظر کرنے کی دلیل نہیں بن سکتا تو کوئی وجہ نہیں کہ ایک ہی کیس کا فیصلہ جماعتِ اسلامی کے حق میں صرف اس لئے بدل دیا جائے کہ اس کا نام خاکسار، قادیانی اور اہلِ قرآن نہیں بلکہ " جماعتِ اسلامی " ہے۔

(جماعتِ اسلامی از ارشد القادری صفحہ ۱۰۱ تا ۱۱۲)

زبان کے نعروں اور دل کے ارادوں میں فرق

آج بے سروسامانی کے عالم میں جب جماعتِ اسلامی کا یہ کردار ہے کہ تاریخِ اسلام کا کوئی مقتدر طبقہ ان کے نشترِ قلم اور نوکِ زبان سے محفوظ نہیں

ہے تو جس دن اقتدار کی ننگی تلوار ان کے ہاتھ میں دے دی جائے گی۔ اس دن اسلام کی
چہاردہ صد سالہ روایات کا کیا حشر ہوگا۔ ہزار بدبختیوں کے باوجود آج کا دن غنیمت ہے کہ ہم
اپنے مذہبی حقوق میں مداخلت کے خلاف احتجاج بھی کر لیتے ہیں لیکن جس دن اسلام کی
نمائندگی کے منصب سے اسلام کی حرمتوں کا قتل عام ہوگا۔ اس دن ہمارے احتجاج کا حق بھی
سلب کر لیا جائے گا۔۔۔۔۔۔

(جماعتِ اسلامی از قادری صاحب صفحہ ۱۲۳)

ایک ضروری نوٹ :- کتاب کے خاتمے پر اتنی بات واضح کر دینا ضروری سمجھتا
ہوں کہ پچھلے اوراق میں جماعتِ اسلامی کے خلاف جو کچھ بھی میں نے کہا ہے کہ اس کا تعلق جماعت
کے صرف ان ذمہ دار لوگوں سے ہے جو مرکزی، صوبائی یا علاقائی سطح پر جماعت کی پالیسی کو
کنٹرول کرتے ہیں۔ باقی رہ گئے وہ سادہ لوح عوام جو صرف ظاہری محاسن کو دیکھ کر ان کیساتھ
ہو گئے ہیں۔ ہمارا روئے سخن ان کی طرف ہرگز نہیں ہے انہیں ہم قطعاً معذور سمجھتے ہیں۔

(جماعتِ اسلامی از ارشد القادری صفحہ ۱۲۷، ۱۲۸)

باب ۱۴

جماعتِ اسلامی کے ذیلی ادارے

گیارھواں رُکن ــــ تنخواہ دار

وہی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

اگست ۱۹۶۹ء کے طلوعِ اسلام میں "شاہد عادل" کے قلم سے "جماعتِ اسلامی کے ذیلی اداروں" کے عنوان کے تحت ایک مقالہ شائع ہوا تھا۔ اس میں انہوں نے "ادارۂ مطالعہ و تحقیق لاہور" کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرمایا تھا کہ تحقیق و جستجو کے باوجود، اس کے کارناموں کی بابت کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ اس سلسلہ میں ایک صاحب کی طرف سے ہمیں کچھ پمفلٹ موصول ہوئے ہیں جو سوشلزم کے خلاف شائع کئے گئے ہیں ان کا نام ہے "اسلامی اقتصادیات میں انفرادیت اور اجتماعیت"، "ہنگری پر کیا گزری" اور "فارموسا پر کیا گزری"۔

اوّل الذکر کے شروع میں تحریر ہے:

پیش کش ادارۂ مطالعہ و تحقیق

اور اس کے نیچے ہے: ناشر۔ دار الفکر۔ لاہور۔ اور دار الفکر کا پتہ یوں لکھا ہے۔ معرفت دفتر سیارہ، اچھرہ لاہور۔ اور سیارہ کے مدیر ہیں، نعیم صدیقی صاحب جو جماعتِ اسلامی کے پبلسٹی کے شعبہ کے انچارج ہیں۔ ان پمفلٹوں پر ربڑ کی مہر میں تحریر ہے؛ "ہدیۂ خلوص، منجانب ڈیموکریٹک یوتھ فورس (پاکستان)"

اس کے بعد بس اتنا معلوم کرنا باقی رہ جاتا ہے کہ اس علاقے میں بنک کون سا ہے؟

طلوعِ اسلام اپریل ۱۹۷۰ء (صفحہ ۷۹-۸۰)

شاہد عادل

جماعتِ اسلامی کے ذیلی ادارے

ہندو رام لیلا کے تہوار پر راون کی مورتی بنایا کرتے تھے۔ بہت بڑا، دیو قامت لحیم و شحیم مجسمہ جس کا سر تو ایک ہی ہوتا تھا لیکن چہرے دس۔ چہرے ایک دوسرے سے مختلف ہوتے تھے لیکن بات ہر ایک وہی کرتا تھا۔ جو سر سے نکلتی

تھی۔ وہ لیلائیں یہاں سے چلی گئیں لیکن راون کا مجسمہ یہاں موجود ہے۔ اسے عرفِ عام میں جماعتِ اسلامی کہا جاتا ہے۔ اس کا سر تو ایک ہے لیکن اس کے متعدد چہرے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں اور اس طرح نقاب پوش کہ سطحی نگاہیں بھانپ تک نہیں سکتیں کہ یہ اسی مجسمہ کے مختلف روپ ہیں۔ اس کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے کہ جب سر سے نکلی ہوئی آواز، ان لاؤڈ اسپیکروں سے ساری فضا میں گونج اٹھتی ہے آج کی نشست میں ہم ان مختلف چہروں کی نقاب کشائی کرنا چاہتے ہیں تاکہ عوام کو جس فریب میں رکھا جا رہا ہے اس کی پردہ دری ہو سکے۔

لیکن اس نقاب کشائی تک پہنچنے سے پہلے ہم تمہیداً دو ایک باتیں کرنا ضروری سمجھتے ہیں اس سے چہروں سے پہلے خود اس سر کی ایک حد تک نقاب کشائی ہو جائے گی۔

برصغیر پاک و ہند میں تحریکِ آزادی زوروں پر تھی۔ ہندو اپنی جماعت کانگرس کا دامن تھامے اکھنڈ بھارت کے لئے کوشاں تھے اور مسلمان مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع ہو کر مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ خطۂ زمین یعنی پاکستان کا مطالبہ کر رہے تھے۔ اسی دوران ایک اور جماعت، اسلام کا نعرہ لگاتی ہوئی منصۂ شہود پر آئی اس کا نام جماعتِ اسلامی تھا اور اس کے بانی مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب تھے حالانکہ اس وقت کی سیاسی صورتِ حال کو سامنے رکھتے ہوئے غیر جانبدار سیاستدانوں تک نے اس خدشہ کا اظہار کیا تھا کہ اس نازک وقت میں جبکہ تمام مسلمان مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع ہو رہے ہیں مسلمانوں کی کسی نئی جماعت کی تشکیل ان کے مقاصد کے لئے نقصان دہ اور ہندوؤں کے مفاد میں ہوگی۔ علاوہ بریں، خود مودودی صاحب اس سے کچھ ہی عرصہ پہلے یہ اعلان فرما چکے تھے کہ مسلمانوں میں کسی الگ پارٹی کی تشکیل قطعاً اسلام کے خلاف ہے کیونکہ پوری امتِ مسلمہ، غیر مسلموں کے مقابلہ میں خود ایک پارٹی ہے لیکن اس کے باوجود جماعتِ اسلامی کا قیام عمل میں آگیا اور اپنے علیحدہ وجود کا جواز پیش کرنے لئے اس نے اپنا مقصد یہ بیان کیا کہ وہ برصغیر میں اسلامی نظامِ حکومت قائم کرے گی۔

ملّی زندگی کا نازک دور

ہم پھر دہرا دیں کہ یہ دور مسلمانانِ ہند کے لئے بڑا ہی نازک تھا۔ ہندو انگریزوں کے ساتھ مل کر دن رات اس کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ پاکستان کسی طرح بھی وجود میں نہ آسکے۔ جماعتِ اسلامی کی تشکیل کو ابھی تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ مسلمانوں کے اس نازک دور کا نازک ترین لمحہ آن پہنچا۔ یہ نازک ترین لمحہ ۱۹۴۶ء کے انتخابات تھے جو پاکستان

کے قیام کے لئے فیصلہ کن حیثیت رکھتے تھے۔ انتخابات کا ماٹو یہ تھا کہ مسلمان پاکستان بنانا چاہتے ہیں یا نہیں۔ نیشنلسٹ علماء اور دیگر سیاستدان پہلے ہی اس مطالبہ کی مخالفت کر رہے تھے۔ اگر اس وقت مسلمانوں کی صفوں میں انتشار پیدا ہو جاتا۔ اور ایک مزید طبقہ اس مطالبہ کے خلاف ووٹ دیتا۔ یا غیر جانبدار بن کر بیٹھ جاتا تو اس کا نتیجہ کیا ہوتا؟ ہم سب ہندوؤں کے غلام ہوتے۔ وقت کی یہی نزاکت اور معاملہ کی اہمیت تھی۔ جس کے پیش نظر بانی پاکستان کی طرف سے تمام مخالف و موافق مسلمانوں سے اپیل کی گئی کہ وہ تشکیلِ پاکستان کے حق میں ووٹ دیں۔ لیکن جہاں مسلمانوں کی اکثریت نے عملی تعاون کا مظاہرہ کیا۔ وہاں مودودی صاحب امیرِ جماعتِ اسلامی ہند نے یہ روکھا سا جواب دیا۔

"۔۔۔۔۔۔۔۔ ووٹ اور الیکشن کے معاملے میں ہماری پوزیشن کو صاف صاف ذہن نشین کر لیجئے۔ پیش آمدہ انتخابات یا آئندہ آنیوالے انتخابات کی اہمیت جو کچھ بھی ہو اور ان کا جیسا کچھ بھی اثر ہماری قوم یا ہمارے ملک پر پڑتا ہو۔ بہرحال ایک بااصول جماعت ہونے کی حیثیت سے ہمارے لئے یہ ناممکن ہے کہ وقتی مصلحت کی بناء پر ہم ان اصولوں کی قربانی گوارا کر لیں جن پر ہم ایمان لائے ہیں۔

(ترجمان القرآن۔ جلد ۲۷ عدد ۳، ۴ بابت ستمبر و اکتوبر ۱۹۴۵ء صفحہ ۱۸۹، ۱۹۲)

لیکن جب ان حضرات کی مشؤم تمناؤں اور مذموم کوششوں کے علی الرغم پاکستان وجود میں آگیا تو مودودی صاحب اپنے لاؤ لشکر سمیت پہلے ہی قافلوں کے ساتھ پاکستان تشریف لے آئے۔

(طلوع اسلام اگست ۱۹۶۹ء صفحہ ۲۵، ۲۶)

دوسرا اقتباس

عبرت آمیز مرقع

"جماعتِ اسلامی کی ساری تاریخ اس کی اسی پالیسی کا عبرت آمیز مرقع ہے وہ انتہائی نازک وقت میں پاکستان کی پشت میں خنجر گھونپتی ہے اور اس کے بعد، لہو بھرا دستانہ اتار کر وہی ہاتھ مصافحہ کے لئے آگے بڑھاتی ہے اور جب ہاتھ آگے بڑھاتی ہے تو راون کے دسوں چہرے اسی سُر اور لَے میں الاپ شروع کر دیتے ہیں۔ دنیا سمجھتی ہے کہ اس جماعت کی تائید ملک کے مختلف گوشوں سے ہو رہی ہے۔ حالانکہ مائیک پر مقرر ایک ہی ہوتا ہے جس کی آواز لاؤڈ اسپیکروں سے فضاء میں شور برپا کر دیتی ہے یہ لاؤڈ اسپیکر اس جماعت کے ذیلی ادارے ہیں جن کے نام مختلف رکھے گئے ہیں یہ ادارے ہیں "اسلامک پبلیکیشنز" آپ دیکھتے ہیں کہ نام کی زبان بھی قومی نہیں

مرکز ہے۔ دوسرا ادارہ دارالعروبہ۔ تیسرا "اسلامی جمعیتِ طلبہ" اس طرح "ادارہ معیشتِ اسلامی" اور جمعیت اتحاد العلماء وغیرہ وغیرہ۔ پھر "مجلسِ تحقیقاتِ علمی لاہور"۔ "ادارہ مطالعہ و تحقیق لاہور"۔ "ادارہ معارفِ اسلامی کراچی"۔ "عوامی اسلامی محاذِ پاکستان" (صفحہ ۲۸ تا ۳۵)

یہاں ہم نے طلوعِ اسلام کی پیش کردہ تفصیل نہیں لکھی (مرتب)

ظالم باپ

۱۹۵۷ء کی معرکۃ الآراء شوریٰ جماعتِ اسلامی کے جناب مودودی کے قول اور عمل کے تضاد کو ملحوظ رکھتے ہوئے بہت سے اعلیٰ اراکین مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کی معیت میں جماعتِ اسلامی سے الگ ہوئے تھے۔ ارکانِ جماعت کی طرف سے مولانا مودودی صاحب پر یہ الزام بھی ارکانِ جماعت نے لگایا تھا کہ آپ نے فرمایا تھا کہ موجودہ تعلیم گاہیں قتل گاہیں ہیں۔ اس لئے ان میں اپنے بچوں کو داخل کرانا انہیں قتل کر دینے کے مترادف ہے اور ہم نے آپ کی ہدایت کے مطابق اپنی اولادوں کو موجودہ تعلیم گاہوں سے اٹھوا لیا یا انہیں داخل نہیں کرایا اور آپ نے اپنی بچیوں کو بھی کالجوں میں داخل کرا دیا ہے۔ اس کے جواب میں مودودی صاحب نے فرمایا تھا کہ "میرے سامنے دو راستے تھے ایک ظالم باپ بننے اور ایک داعی کی حیثیت سے اپنی اولاد کو تعلیم سے محروم رکھنے کا، اور دوسرا راستہ اپنی اولاد کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنے کا۔ اگر میں اپنی اولاد کو تعلیم سے محروم رکھتا تو خود میری اولاد مجھے "ظالم باپ" کہتی۔ اس صورت میں، میں بعض لوگوں کے تصور کے مطابق داعی کی حیثیت سے اپنی بات پر عمل پیرا تو ہو جاتا مگر "ظالم باپ" ضرور بنتا اور اپنی اولاد کو پست معیار اختیار کرنے پر مجبور کر دیتا۔ دوسرا راستہ یہ تھا کہ میں اپنی اولاد کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرتا اور جہاں تک بس چلتا اس کی اخلاقی تربیت کا اہتمام کرتا۔ سو میں نے اسی کو ترجیح دی"۔

مندرجہ بالا روئداد مولانا عبدالرحیم صاحب اشرف کے اخبار (ہفت روزہ) المنبر کی ۷ اور ۱۴ اکتوبر ۱۹۶۶ء کی مشترکہ اشاعت میں شائع ہوئی۔ مولانا مذکور بھی مودودی صاحب کی دینی قلابازیوں سے دل برداشتہ ہو کر مولانا اصلاحی صاحب کی رفاقت میں جماعتِ اسلامی سے الگ ہوئے تھے۔

گیارہواں رکن تنخواہ دار

ایک صاحبِ ایمان نے کہا کہ حضرت مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کے اس اخلاق افروز جواب پر اراکین کا ردِ عمل کیا تھا؟ وہ مولانا پر تحسین و آفرین کے پھول برسانے کے لئے، مطلب یہ

ہے کہ اس جواب کے خلاف اُٹھ کر کھڑے کیوں نہ ہوئے اور ان کی اس وعدہ شکنی اور
سوزی پر احتساب کیوں نہ کیا ؟

سُنیے ! اس کے جواب میں حکیم مولانا عبدالرحیم اشرف صاحب نے جو مودودی صاحب
جماعتِ اسلامی سے اٹھارہ سالہ رفاقت اور اطاعت قطع کر رہے تھے اس کے جواب میں کیا فرمایا
" یہ حضرات مودودی صاحب کی مخالفت کس طرح کر سکتے تھے اس وقت اراکین جماعت
کل تعداد تیرہ سو تھی اور ان میں ایک سو بیس ارکان مودودی صاحب کے تنخواہ دار ملازم تھے؛
ہر گیارہواں رکن جماعت سے تنخواہ پاتا تھا۔ یہ تو اس دور کی بات ہے جبکہ سیلاب زر ا
قدر بہتات اور کثرت سے نہیں آ رہا تھا، اب کیا حال ہوگا خدا جانتا ہے۔ یہ بلندیوں د
جانیں۔ اہل زمین تو قیافے اور اندازے ہی لگا سکتے ہیں رطلوعِ اسلام لکھتا ہے کہ ایک
ایک مائیک پر نکلی ہوئی آواز بہت سے لاؤڈ اسپیکر فضا میں ادھر ادھر پھیلا دیتے ہیں
طلوعِ اسلام لگائے زدر ایسا ہی ہوگا۔ جس کا کھائیں گے اسی کا گائیں گے۔ یہ کون
حیرانگی اور تعجب کی بات ہے۔ ہر تنخواہ دار ملازم اپنے ادارے کی پالیسی پر گامزن ہوتا
مولانا مودودی کی اس دماغی اُپج ترغیب و تحریص اور پیدا کردہ سیاسی تگوں سے بہت
کا بھلا تو ہوتا ہے۔ پیٹ تو پلتا ہے۔

جب حشر کا دن آئے گا اس وقت دکھیا جائے گا   (حفیظ جالندھری)

باقی رہا کہ مودودی صاحب کیوں اپنی بچیوں کو کالج میں تعلیم نہ دلواتے۔ آخر وہ کیوں
ظالم باپ بنتے ؟ کیا نظام اسلامی کے برپا کرنے کے لئے جماعتِ اسلامی یا تحریکِ اسلامی کا
داعی بننے کا مطلب یہ تھوڑا ہے کہ حضرت سید ابوالاعلیٰ اپنی بچیوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ نہ
کریں۔ ظالم باپ بننے کے لئے دوسرے نادان تھوڑے ہیں۔

جو بنے اور مودودی صاحب نے خوب بنائے۔

(چودھری حبیب احمد)

باب ۱۵

محاسبۂ مودودی

"محاسبۂ مودودی" قاری عبدالعزیز صاحب جلالی خطیب جامعہ فاروقیہ ریلوے لاہور "محاسب" اس پمفلٹ جسکو حزب الاسلام پاکستان نے شائع کیا ہے کے صفحہ ۲ پر

علمائے اسلام اور زعمائے ملک کے حضور میں

کے عنوان سے لکھتے ہیں :- "کتاب" انکشاف" سے ناقابلِ تردید انداز میں مسلمہ طور پر ثابت ہو چکا ہے کہ مودودی صاحب نہ صرف اسلام کے لیے آستین کا سانپ ہیں، بلکہ غدارِ ملک و ملت اور مخربِ اسلام اور مفسدِ دین بھی ہیں اس لیے "محاسبۂ مودودی" میں "انکشافات" کے ایسے تمام پیش کردہ ماخوذ اقتباسات کی بالاختصار معہ تبصرہ و تاثر اور مفصل پیش کیا گیا ہے جن سے فی الواقعہ و فی الحقیقت مودودی صاحب کی انتشار انگیز تضاد بیانیاں اور اسلام پرستی کا ڈھونگ کھل کر ایسے ناقابلِ تردید اور مسکت انداز میں واضح ہو چکا ہے کہ اب مودودی صاحب کو سوائے قوم سے معافیاں مانگنے اور اللہ تعالیٰ کے حضور میں یہ اعلان توبہ کرنے کے کوئی دوسرا رستہ قومی محاسبے سے ہرگز ہرگز نجات نہیں دلا سکتا ....

خادم ملک و ملت اور خادم اسلام

محاسب (قاری عبدالعزیز جلالی خطیب مسجد خلیفہ فاروقیہ)

۲۲ ۱۱/۸۹ م (ماخوذ از انکشافات مطبوعہ ۶۲ء) ریلوے روڈ — لاہور

ناظرین کرام : اب مودودی کی تصنیفات و تالیفات اور اس کے بعض غیر شعوری اور ذی بیانات اور اس کی منظم اور خفیہ تخریبی سرگرمیوں سے ثابت ہو چکا ہے کہ مودودی اور اس کی جماعت کے خصوصی افراد نہ اسلام اور ملت اسلامیہ کے لئے بلکہ مملکت پاکستان کے لیے بھی چھپے ہوئے اور خطرناک دشمن ہیں، اور اب یہ حقیقت ناقابل تردید صورت میں واضح ہو چکی ہے کہ مودودی اور مودودی کی ماڈرن ٹائپ جماعت کے خصوصی افراد بنی دجل کردہ خفیہ طاقت اور ملحدانہ پرفریب طرز تنظیم اور اسلام ...

تصنیفات کے ذریعہ مریکی اور فرنگی ساختہ ماڈرن اسلام پھیلا کر نہ صرف ملت اسلامیہ کے قلوب سے روحِ اسلام ہی نکال دینا چاہتے ہیں بلکہ لفظ اسلام اور جمہوریہ اسلامی اقدار کے خوشنما لفظوں کے سہارے مملکتِ اسلامیہ پاکستان کی جڑوں پر بھی درپردہ کلہاڑے چلا رہے ہیں۔ اس لئے تمام علماء پاکستان کا فرض ہے کہ وہ فوراً ہی شریعتِ محمدیہ کا پوسٹ مارٹم کرنیوالے تجدید و احیائے دین اور اقامت کے دعویدار مودودی کے گمراہ کن عقائد اور اس کی اسلام کش تخریبی سرگرمیوں کو منظم اور متحد ہو کر عوام میں بے نقاب کر دیں تاکہ ناواقف اور سادہ لوح عوام باخبر ہو کر مودودی کی بدعقیدگی اور ضلالت و بے راہ روی سے نہ صرف خود محفوظ ہو سکیں بلکہ حکومت سے اسکی تمام گمراہ کن مطبوعات بھی ضبط و تلف کرائیں اور دیگر ممالک اسلامیہ کے عزائم کو بھی مودودی کی اسلام کش تنظیم اور خفیہ سازش سے باخبر کرا سکیں۔ مقامِ حیرت اور افسوس ہے کہ بعض ذی اثر اور مقتدر علماء حق تو اپنے کثرتِ مشاغل اور انہماکِ درس و تدریس کے باعث مودودی کی تصنیفات و تالیفات کے مطالعہ کرنے سے قاصر رہے اور بعض دیگر زمانہ سازی سے بے نیاز سادہ صوفی منش علماءِ حق نے مودودی کی تصنیفات و تالیفات کے مطالعہ کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔

اور بعض زمانہ ساز اور حق گوئی سے محروم علماءِ عصر مودودی کی ذاتی دجل و ٹیپ ٹاپ اور کروفر اور اسکی پرفریب و خوشنما ادارت سے مرعوب و متاثر ہو کر اس کے خلاف قلم اٹھانے کی جرأت نہ کر سکے اور بعض علماء نے کسی خاص خوش گمانی اور مدارس عربیہ کے لیے عرب کے شاہی خزانوں سے دلائی ہوئی لاحاصل امدادی امیدوں کے باعث اس کے خطرناک معائب و عزائم سے آگاہ ہونے کے باوجود نہ صرف بے نقاب کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ ان بعض بیدار مغز مجاہد اور ہوشمند علمائے حق کے قلم و سخن کو بھی رد کرنے کی تدبیریں کیں جنھوں نے مودودی کی بدعقیدگی، کفریات و ضلالت اور اس کی بے راہ روی کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کر کے اسکی ماڈرن مجددیت اور جدید اسلام کی بہروپ بٹ مجددیت کو تاڑا اور بھانپا اور منظرِ عام پر لانے کی

ناکامیاب کوششیں کیں۔ اور معقول انداز میں خفیہ سرمائے سے بے نیاز رہتے کے باوجود حسب استطاعت کتابیں لکھیں اور شائع کرائیں۔

میں انتہائی سنجیدگی اور دعوے سے کہتا ہوں کہ مودودی جماعت کے چند وظیفے خوار، ہمدرد، ہمنوا ایمان فروش اور عقل و ایمان سے کور محض نام نہاد علمائے متفقین کے سوا تمام عالم اسلام کے اکابر علماء کرام و مفتیان عظام میں کوئی عالم اور مفتی دین ایسا نہیں جو مودودی کی خصوصی تصنیفات و تالیفات کے کفریہ اور گمراہ کن اقتباسات کا مطالعہ کر لینے کے بعد باخبر ہو کر بھی مودودی یا اسکی جماعت کے خصوصی افراد کو مسلمان یا راہنمائے اسلام کہنے کی جرأت اور جسارت کر سکے۔ مودودی کی تصنیفات و تالیفات اور اس کے بعض جرائد کے اقتباسات اور غیر شعوری متضاد اخباری بیانات نہ صرف کفریہ ہی ہیں بلکہ اسقدر ذلیل اور رکیک، لغو، لایعنی بھی ہیں کہ جن کو پڑھنے کے بعد ہر پڑھا لکھا، سمجھدار اور حق پرست انسان مودودی کو بے ساختہ 'فاترالعقل' اور پاگل کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے بعض علماء کرام نے مودودی پر فاترالعقل اور پاگل ہونے کے شبہے میں کفر کا حکم لگانے سے گریز کیا ہو کیونکہ مودودی نے خود بھی اپنی کتاب "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم" میں اپنے پاگل ہونے کا پختہ یقین دلانے کے لیے ایک ایسا ناقابل تردید گر بتلادیا ہے کہ جس کو پڑھ لینے کے بعد مجال نہیں کہ دنیا کا بڑے سے بڑا ڈاکٹر یا بیرسٹر یا بڑی سے بڑی ہائی اتھارٹی بین الاقوامی عدالت کا کوئی بڑے سے بڑا چیف جسٹس بھی مودودی کے پاگل اور فتوری ہونے میں شک پیدا کر سکے۔[1]

---

[1] لیکن مودودی صاحب کے بتلائے ہوئے گر سے بے نیاز ہو کر اگر حقیقت اور واقعیت پر غور کیا جائے تو مودودی کو فاترالعقل اور پاگل سمجھنے اور کہنے کے بجائے فی الحقیقت و فی المعنی و فی الواقعہ مخرب اسلام، مفسد دین، فتینِ اعظم، علمائے حق کا دشمن، بے عمل مکار، ملک و ملت کا خطرناک دشمن، ہوسِ اقتدار میں عقل و شعور، دین و ایمان کھو بیٹھنے اور ہار دینے والا ناکام سیاسی شاطر، گرے ہوئے درجے کا تخریبی لیڈر یا مغربی ممالک کا خود [illegible] سمجھا اور کہا جا

بعنوان "راہِ روِ پشتِ منزل"

آپ کو میرے فتورِ عقل میں اس وقت بھی شبہ نہ ہونا چاہیئے جب آپ دیکھیں کہ میں اسلامی تہذیب کو زندہ کرنے اور فاروقی حکومت کے نصب العین تک پہنچنے کے لیے ان لوگوں کے پیچھے چلا جا رہا ہوں جن کی عملی زندگی میں، اور جن کے خیالات، نظریات، طرزِ سیاست اور رنگِ قیادت میں خوردبین لگا کر بھی اسلامیت کی کوئی چھینٹ نہیں دیکھی جا سکتی۔ جن کا حال یہ ہے کہ چھوٹے سے چھوٹے مسائل سے لیکر بڑے سے بڑے مسائل تک کسی معاملہ میں بھی انہیں قرآن کا نقطہ نظر نہ تو معلوم ہی ہے نہ وہ اسے تلاش کرنے کی ضرورت ہی محسوس کرتے ہیں۔ (مودودی)۔

جناب مودودی کی کتاب "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم"

سکتا ہے لیکن بعض لوگ جو ایمان اور اسلامی حمیت سے بیگانہ اور حبِ رسول سے عاری اور محض ریاکارانہ سنجیدگی کو ہی ایمان کا حاصل سمجھتے ہیں وہ مودودی کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے خلاف قلم کی شہ زوری، صحابہ کرام پر تنقید، تابعین تبع تابعین مجتہدین، محدثین اور فقہائے امت کی بے جا اور بے باکانہ تنقیص اور علمائے متقدمین و متاخرین اور صلحائے امت اور مجددین زمانہ کی ناجائز تضحیک و توہین کو جزو لاینفک خدمتِ دین اور اقامتِ دین کا ذریعہ تصور کرتے ہیں (لعنت ہو اللہ کی ایسی آزاد اور ذلیل ذہنیت اور گمراہ کن شریر جماعت پر) لیکن اگر مودودی کے خلاف جائز اور مفردی تنقید کی جائے یا ان کے مراتب اور صحیح استحقاق کے مطابق ناقابل تردید اور حقیقی خطابات سے تخاطب کیا جائے تو فوراً ہی چیں بہ جبیں اور سیخ پا ہو جاتے ہیں اور نہ صرف کھمبے ہی نوچتے پھرتے ہیں بلکہ در و دیوار سے اشتہارات اور پوسٹر بھی پھاڑتے پھڑواتے، اور نوچتے نچواتے پھرتے ہیں اور بعض کج فہم لوگ جو محض ریاکارانہ سنجیدگی یا صرف مودودی کے احترام ہی کو ایمان کا حاصل اور اسلام کا مل تصور کرتے ہیں وہ مراسلے اور اداریے لکھ لکھ کر چیخنا اور چلانا اور واویلا کرنا شروع کر دیتے ہیں کہ دیکھو جی یہ دقیانوسی پرانی روش والے لکیر کے فقیر مولوی حضرت مولانا قبلہ کی شان میں کیسی کیسی گستاخیاں اور ناروا حملے کرتے ہیں

اقتباس جس کیطرف قاری صاحب نے اشارہ کیا آپ نے ملاحظہ فرما لیا۔ اب آگے بڑھیئے۔ (مرتب)

مولانا احمد سعید ناظم جمعیۃ العلماءِ ہند مرحوم دہلی کے خصوصی اور مشفقانہ جان اور التفات سے مستفیض ہو ہو کر کچھ عربی زبان سیکھ لینے سے مودودی کو ہی مستند عالم یا ماہر عربی دان نہیں سمجھا جا سکتا اور رابطہ عالم اسلامی (مکہ معظمہ) کی مجلس تاسیس کی ممبری کے پراپیگنڈہ کرتے رہنے سے بھی مودودی کو مستند عالم یا ماہر عربی دان نہیں سمجھا جا سکتا۔ مودودی صاحب کی عربی دانی، اور ان کے عالمانہ رنگ وروپ کا پول تو ان کی لغو، لایعنی اور گمراہ کن تفسیر پارہ تفسیر تفہیم القرآن سے کھل چکا تھا۔ اور عرب جا جا کر ہمیشہ اردو زبان میں ہی تقریریں کرتے رہنے اور عربی زبان کا مترجم ساتھ رکھنے سے مودودی صاحب کی عربی دانی کا رہا سہا بھانڈا بھی پھوٹ گیا۔ اب تو یہ بات ایک معمولی پڑھا لکھا انسان بھی اچھی طرح سمجھ چکا ہے کہ جبکہ مودودی صاحب نہ عربی زبان بول سکتے ہیں اور نہ عربی زبان میں تقریر ہی کر سکتے ہیں اور نہ عربی زبان میں لکھی ہوئی کوئی تقریر ہی معقولیت کے ساتھ صحتِ لفظی سے پڑھنے کی صلاحیت اور استعداد رکھتے ہیں تو پھر ان سے قرآن کریم کے ترجمے اور ان کی تفسیر تفہیم القرآن کیسے صحیح سمجھا جا سکتا ہے؟ جبکہ قرآن کریم کا ترجمہ اور تفسیر لکھنے کے لیے نہ صرف عربی زبان کے بولنے اور لکھنے پر ہی قادر ہونا ضروری ہے.........

.....اس لیے مودودی صاحب کا کیا ہوا قرآن کریم کا بے روح و بے جان بھونڈا اور کثیر الاغلاط ولایعنی ترجمہ اور ان کی گمراہ کن تفسیر یقیناً نذرِ آتش ہی کی نذر کر دیے جانے کے قابل سمجھی جا سکتی ہے۔ (صفحہ ۴ تا ۱۰)

مودودی کی دریدہ دہنی اور تذلیل کعبہ

خطبات حصہ چہارم ص ۵۱،۱۵۰ بعنوان "حج کا عالمگیر اجتماع" "وہ سرزمین جہاں سے کبھی اسلام کا نور تمام عالم میں پھیلا تھا، آج اس جاہلیت کے قریب پہنچ چکی ہے جس میں وہ اسلام سے پہلے مبتلا تھی۔ اب نہ وہاں اسلام کا علم ہے، نہ اسلامی اخلاق ہیں، نہ اسلامی

زندگی ہے۔ لوگ دور دور سے بڑی عقیدتیں لیے ہوئے حرم پاک کا سفر کرتے ہیں مگر اس علاقے میں پہنچ کر جب ہر طرف ان کو جہالت، گندگی طمع، بے حیائی دنیا پرستی، بداخلاقی، بدانتظامی اور عام باشندوں کی طرح گری ہوئی حالت نظر آتی ہے تو ان کی توقعات کا سارا طلسم پاش پاش ہو کر رہ جاتا ہے حتیٰ کہ بہت سے لوگ، حج کرکے اپنا ایمان بڑھانے کے بجائے اور الٹا کچھ کھو آتے ہیں وہی پرانی مہنت گری جو حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کے بعد جاہلیت کے زمانے میں کعبے پر مسلط ہو گئی تھی اور جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آکر ختم کیا تھا، اب پھر تازہ ہو گئی ہے حرم کعبہ کے منتظم پھر اسی طرح مہنت بن کر بیٹھ گئے۔ خدا کا گھر ان کے لیے جائیداد اور حج ان کے لیے تجارت بن گیا۔ حج کرنے والوں کو وہ اپنی آسامی سمجھتے ہیں مختلف ملکوں میں بڑی بڑی تنخواہیں پانے والے ایجنٹ مقرر ہیں تاکہ اسامیوں کو گھیر گھیر کر بھیجیں ہر سال اجمیر کے خادموں کی طرح ایک لشکر کا لشکر دلالوں اور سفری ایجنٹوں کا مکہ سے نکلتا ہے تاکہ دنیا بھر کے ملکوں سے اسامیوں کو گھیر کر لائے۔ قرآن کی آیتیں اور حدیث کے احکام لوگوں کو سنا سنا کر حج پر آمادہ کیا جاتا ہے نہ اس لیے کہ انہیں خدا کا عائد کیا ہوا فرض یاد دلایا جائے بلکہ صرف اس لیے کہ ان احکام کو سن کر یہ لوگ حج کو نکلیں تو آمدنی کا دروازہ کھلے۔ گویا اللہ اور اس کے رسول نے یہ سارا کاروبار اپنی مہنتوں اور ان کے دلالوں کی پرورش کے لیے پھیلایا تھا۔ پھر جب اس فرض کو ادا کرنے کیلئے آدمی گھر سے نکلتا ہے تو سفر شروع کرنے سے لیکر واپسی تک ہر جگہ اسکو مذہبی مزدوروں اور دینی تاجروں سے سابقہ پیش آتا ہے۔ معلم، مطوف، وکیل مطوف، کلید بردار کعبہ اور خود حکومت، سب اس تجارت میں حصہ دار ہیں حج کے سارے مناسک معاوضہ لیکر ادا کرائے جاتے ہیں ایک مسلمان کیلئے خانہ کعبہ کا دروازہ تک فیس کے بغیر نہیں کھل سکتا۔ نعوذ باللہ من ذالک۔ یہ بنارس اور ہردوار کے پنڈتوں کی سی حالت اس دین کے نام نہاد خدمت گزاروں اور مرکزی عبادت گاہ کے مجاوروں نے اختیار کر رکھی ہے جس نے

مہنت گری کے کاروبار کی جڑ کاٹ دی تھی۔

بھلا جہاں عبادت کرانے کا کام مزدوری اور تجارت بن گیا ہو۔ جہاں عبادت گاہوں کو ذریعۂ آمدنی بنالیا گیا ہو جہاں احکام الٰہی کو اس غرض کیلئے استعمال کیا جاتا ہو کہ خدا کا حکم سن کر لوگ فرض بجالانے کیلئے مجبور ہوں اور طاقت کے بل پر ان کی جیبوں سے روپیہ گھسیٹا جائے۔ جہاں آدمی کو عبادت کا ہر رکن ادا کرنے کیلئے معاوضہ دینا پڑتا ہو، اور دینی سعادت ایک طرح سے خرید وفروخت کی جنس بن گئی ہو۔ ایسی جگہ عبادت کی روح باقی کہاں رہ سکتی ہے؟ کس طرح آپ امید کرسکتے ہیں کہ حج کرنے والوں اور حج کرانے والوں کو اس عبادت کے حقیقی و روحانی فائدے حاصل ہوں گے جبکہ یہ سارا کام سوداگری اور دوسری طرف خریداری کی ذہنیت سے ہو رہا ہو۔ (مودودی) (محاسبہ مودودی صفحہ ۲۶ تا ۲۸)

جب سے سعودی حکومت نے حضرت جناب سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کو شریک زر بنالیا ہے اب تو وہاں خدا کے فضل وکرم سے ہر بات ٹھیک ٹھاک ہے۔ اسلام کا علم بھی ہے اسلامی اخلاق اور اسلامی زندگی بھی وہاں کی نا تدبیر اور نافہم حکومت نے جب سے مولانا مودودی کی تدبیر پر عمل کر کے مہنتوں میں ایک مہنت کا اضافہ کرلیا ہے اور وہ ادافہم ہوگئی اب وہاں کوئی خرابی نہیں۔ نہ جہالت نہ گندگی۔ نہ طمع نہ بے حیائی۔ نہ دنیا پرستی اور بداخلاقی اور خدا نہ کرے نہ ہی کوئی بدانتظامی اور نہ عام باشندوں کی گری ہوئی حالت، اب اخلاق بلند۔ ایمان تازہ پنجابی محاورے کے مطابق "ستے ایں خیراں"، ہم تو اقبال رح کی زبان میں صرف یہی عرض کریں گے۔

؎ شانۂ روزگار پر بارِ گراں ہے تو کہ میں؟

انصاف سے کہیے کہ اب سعودی حکومت میں یا طرزِ حج وطواف میں کونسا تغیر واقع ہوا ہے کہ مودودی صاحب اب اس کی تعریف میں رطب اللسان ہیں یہی ہو سکتا ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے۔

ارشاداتِ گرامی اَن پڑھ عوام ہوں یا دستار بند علمائے یا خرقہ پوش مشائخ یا کالجوں اور یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ حضرات اِن سب کے خیالات اور طور طریقے ایک دوسرے سے بدرجہا مختلف ہیں مگر اسلام کی حقیقت اور اس کی روح سے ناواقف ہونے میں یہ سب یکساں ہیں (محاسبہ مودودی صہ ۱۹)

(مودودی از تفہیمات جلد اول صہ ۲۸ بعنوان "اسلام ایک علمی اور عقلی مذہب")

مندرجہ بالا اقتباس" اگلے ہی صفحہ پر "ابوالشاستر" صاحب مودودی مزید گویا ہوتے ہیں" اس تحریر سے قاری صاحب نے پیش کیا ہے (مرتب)

بعنوان ہمارے نظام تعلیم کا بنیادی نقص "ہر چیز از سر نو بنانی ہو گی قرآن اور سنت کی تعلیم سب پر مقدم ہے مگر تفسیر و حدیث کے پرانے ذخیروں سے نہیں"۔ (تنقیحات صہ ۲۰۵)

سیاسی مسائل جمہوری نظریے کو قبول کرنا گویا عقیدہ توحید سے منحرف ہو جانا ہے۔ اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ جو اسمبلیاں یا پارلیمنٹیں موجودہ زمانے کے جمہوری اصول پر مبنی ہیں، ان کی رکنیت حرام ہے اور ان کے لیے ووٹ دینا بھی حرام ہے، کیونکہ ووٹ دینے کے معنی یہ ہیں کہ ہم اپنی رائے سے کسی ایسے شخص کو منتخب کرتے ہیں جس کا کام موجودہ دستور کے تحت وہ قانون سازی کرنا ہے جو عقیدہ توحید کے سراسر منافی ہے۔ اگر علمائے کرام میں سے کوئی صاحب اس چیز کو حلال اور جائز سمجھتے ہیں تو اُن سے اس کی دلیل دریافت کیجئے۔

(رسائل و مسائل حصہ اول صہ ۲۷۵ بعنوان سیاسی مسائل)

ہم صرف اس مودودی مولانا سے پوچھتے ہیں کہ جب پہلے ووٹ دینا حرام، عقیدہ توحید کے سراسر منافی تھا، اب جب مودودی نے انتخاب جائز قرار دے دیا، اور اسکی جماعت کے امیدواروں نے الیکشن بھی لڑے تو یہ پیکر تضادات، مجموعۂ اضداد اور مریضِ ہوسِ اقتدار اسلام کو اپنی آرزوؤں اور موہوم حسرتوں کی تکمیل کی آرزو میں استعمال کرنے والا یہ مودودی کون ہے؟ رہا مستفسر، تو

تو کفِ خاک و بے بصر! میں کفِ خاک و خود نگر
کشتِ وجود کے لیے آبِ رواں ہے تو کہ میں

(چودھری حبیب احمد)

صدرِ مملکت

صدرِ مملکت مرد ہونا چاہیئے۔ چونکہ قرآن کہتا ہے،
اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَی النِّسَاءِ (سورۃ النساء ۳۴)
ترجمہ :۔ مرد عورتوں پر قوام ہیں۔ (ترجمان القرآن بابت جنوری ۵۳ء ص ۲۷)
(ترجمان القرآن ستمبر ۱۹۵۲ء ص ۱۰)

"کیا اللہ تعالیٰ کے متعلق آپ کا یہ گمان ہے کہ وہ ایک گھر میں تو عورت کو قوام نہ بنائے گا، مگر کئی لاکھ گھروں کے مجموعے پر اسے قوام بنا دیگا۔"

معاملات اور عورت

وہ قوم کبھی فلاح نہیں پا سکتی جس نے اپنے معاملات ایک عورت کے سپرد کئے ہوں۔
(ترجمان القرآن بابت ستمبر ۱۹۵۲ء ص ۱۱)

حضرت! اللہ تعالیٰ تو اپنی سنّت تبدیل نہیں کرتا۔ البتہ جناب کے متعلق یہ "حسن ظن" ہے کہ آپ کا قلم اسلام کو کیا سے کیا بنا چکا ہے۔ اس کا خمیازہ مسلمانوں کو شائد کتنا عرصہ بھگتنا پڑے اور معترضین اسلام کے اعتراضات و الزامات کی صفائی میں کتنی سر دردی اور دماغ سوزی کرنی پڑے جناب مفسرِ قرآن صاحب کیا ایوب خاں مرحوم سے انتقام لینے کے لیے عورت کو صدرِ مملکت بنانے کا جواز آپ ہی نے پیدا نہیں کیا تھا۔ (مرتب)

اعزازات و خطابات

"محاسبۂ مودودی" لکھنے والے "محاسب" جناب قاری عبدالعزیز صاحب جلالی خطیب جامعہ حنفیہ فاروقیہ ریلوے روڈ لاہور کے انداز و بیان اور زبان و تحریر کا نمونہ آپنے ملاحظہ فرمایا۔ احتساب ذرا سخت سا ہے۔ انہوں نے بہت سے اعزازات و خطابات بھی جناب مودودی صاحب کو عنایت فرمائے ہیں۔ وہ اسقدر ہیں کہ انکی فہرست مرتب کرنا ضروری ہو گیا ہے (مرتب)

شمار فرمائیے

۱۔ ابوالمجدّد ۲۔ ابوالتشاستر (۳) مجدد اعظم، مہدیٔ مغرب ۴۔ ابوالافساد، ۵۔ ابوالاندلیشہ ۶۔ ابوالفہم ماڈرن مجدّد اعظم ۱۰۔ ابوالحکمت ۱۱۔ نیوسٹائل مغربی مہدی اور ماڈرن مجدّد اعظم،

۱۲۔ ابوالنقّاد ۱۳۔ ابوالمتضاد ۱۴۔ ابوالتنقید ۱۵۔ ابوالمعیار ۱۶ مجدّد اعظم مغربی مہدی ۱۷۔ ابوالکیریکٹر ۱۸۔ ابوالفراموش ۱۹۔ ابوالحمقار۔ ۲۰۔ ابوالفتور ۲۱ ابوالجمہور ۲۲ ابوالعقائد ۲۳۔ ابوالایمان ۲۴۔ ابوالعصر ۲۵۔ مفسدِ دین وایمان۔ ۲۶۔ فتین اعظم۔ ۲۷۔ مخربِ اسلام ۲۸۔ منکرِ حدیث ۲۹۔ دشمنِ اسلام ۳۰۔ دریدہ دہن بدلگام وغیرہ، وغیرہ، وغیرہ۔

باب سولھواں ۱۶

شخصیت کی سحر آفرینیاں

الیکشن میں شکست معتقدین کے لیے طفل تسلیاں

اسلام، نظریہ پاکستان اور ملک کی سالمیت کے لیے جماعت اسلامی ایک مرتبہ پھر آپ کے مالی ایثار کی طلبگار ہے

" جماعت اسلامی نے پاکستان کو اسلام اور نظریہ پاکستان پر قائم اور تعمیر کرنے اور اس کو مضبوطی کے ساتھ اپنے نظریے سے وابستہ رکھنے کے لیے اب تک جو کام کیا ہے وہ ملک کے حالات سے باخبر کسی شخص کی نظروں سے مخفی نہیں ہے۔ ملک کے اندر اور باہر کی اسلام دشمن اور پاکستان دشمن طاقتوں نے جماعت اسلامی کے اسی قصور کی بنا پر اسے ملک کی سیاسی زندگی سے خارج کرنے کے لئے جس طرح سے کوششیں کی ہیں اُن سے بھی دیدۂ بینا رکھنے والے اہل وطن ناواقف نہیں ہیں گذشتہ ماہ مارچ میں جو بغاوت مشرقی پاکستان میں رونما ہوئی اور جس کا ابھی تک پوری طرح خاتمہ نہیں ہوا ہے اسکو فرو کرنے میں جماعت اسلامی سے وابستہ لوگوں نے جس طرح سر ہتھیلی پر رکھ کر افواج پاکستان کا ساتھ دیا اور جان و مال کی قربانیاں پیش کیں وہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ اب وہاں ضمنی انتخابات کا مرحلہ درپیش ہے۔ جماعت اسلامی نے پوری کوشش کی ہے کہ ہمخیال جماعتوں میں مفاہمت ہو جائے اور وہ ایک دوسرے کا مقابلہ نہ کریں چنانچہ ہمخیال جماعتوں کے فیصلے کے مطابق جماعت نے قومی اسمبلی کی صرف ۱۹ - اور صوبائی اسمبلی کی صرف ۲۸ نشستوں کے لیے جماعت کے نامزد کردہ امیدواروں کو انتخاب لڑنا ہوگا۔ سب کو معلوم ہے کہ جماعت اسلامی غریبوں اور زیادہ سے زیادہ متوسط درجہ کے لوگوں پر مشتمل ہے۔ جماعت کے عام اور معمول کے اخراجات تو اس کے کارکن پیٹ کاٹ کر چلا لیتے ہیں لیکن ہنگامی اور بسیط اخراجات کے طالب کاموں میں امداد کے لیے ہمیں اپنی قوم کے آگے دست سوال دراز کرنا پڑتا

لے خبریہ ہے کہ صدر یحییٰ خاں نے پانچ لاکھ روپے کی رقم دی (اخبار وطن لندن) مرتب

ہے۔ اگرچہ جماعت کے کارکن انتہائی کفایت شعاری کے ساتھ خرچ کرتے ہیں تاہم اگر کم سے کم خرچ کیا جائے تو پھر بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ قومی اور صوبائی اسمبلی کی ۵۷ نشستوں پر انتخاب لڑنے کے لیے کتنا خرچ ہوگا۔ اس لیے میں اپنی قوم کے ان تمام حضرات سے جو ملکی اور ملّی معاملات کو صحیح رُخ پر رکھنے کے لیے قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں جماعت کے نمائندوں کی موجودگی ضروری سمجھتے ہیں، اپیل کرتا ہوں کہ وہ اس کام میں جماعت کا ہاتھ بٹائیں۔ جن حضرات کے پاس جماعت کے کارکن نہ پہنچ سکیں وہ خود تکلیف اٹھا کر اپنی اعانت جماعت کے مقامی کارکنوں تک پہنچا دیں یا • ناظمِ مالیات جماعتِ اسلامی پاکستان ۵۔ اے ذیلدار پارک اچھرہ لاہور۔
یا • پروفیسر غلام اعظم صاحب امیر جماعت اسلامی مشرقی پاکستان۔ ناکھل پاڑہ۔ ڈھاکہ کے پتے پر ارسال کر دیں۔ جو حضرات مغربی پاکستان سے اپنی رقمیں براہ راست مشرقی پاکستان بھیجیں وہ اگر مرکز جماعت اسلامی لاہور کو بھی اس کی اطلاع دے دیں تو بہتر ہے تاکہ مرکز کو یہ معلوم ہوتا رہے کہ مجموعی طور پر کتنی رقم وہاں پہنچ چکی ہے۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی امیر جماعتِ اسلامی پاکستان ایشیا اسم اکتوبر

یہ اپیل بڑی معنی خیز ہے اور اکثر لوگوں کو اس نے ورطۂ حیرت میں گم کر دیا ہے۔ عزیزوں کو اس جماعت نے گزشتہ بیس بائیس سال میں جس طرح روپیہ سیلاب کی طرح بہایا ہے وہ کوئی رازِ مستور نہیں پھر سال گزشتہ انہوں نے ۱۰۸ نشستوں پر انتخاب لڑا۔ اس قسم کی اپیل کی ضرورت اس وقت بھی لاحق نہ ہوئی۔ اس لیے کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اب ۵۷ نشستوں کے انتخاب کے لئے اس قدر افلاس کیوں در آیا۔ بالخصوص جب مشرقی پاکستان میں ان کے لاکھوں مسلح رضاکار موجود ہیں۔ ان کی موجودگی میں انتخابات پر پیسہ خرچ کرنے کی ضرورت ہی کب لاحق ہو گی

(ط۔ ۱۰ دسمبر ۱۹۷۱ء ص ۶۳۔۶۴)

مشائخ عظام کی طرف سے جماعت اسلامی کی حمایت کا اعلان

ہم خاک پایانِ اولیاء کرام و خادمان مشائخ عظام مملکتِ خداداد پاکستان میں سوشلسٹوں کی تشدد آمیز کارروائیوں، گندے اور بزرگ کی دھمکیوں اور گھیراؤ جلاؤ کے نعروں کو تشویش کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

ہم اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ نورِ فراست سے یہ بات بھی دیکھ رہے ہیں کہ ہماری موجودہ نسل میں سے چند ایک نوجوانوں کو پیٹ اور بھوک کے مسئلہ پر گمراہ کیا جا رہا ہے اور سادہ لوح

دیہاتی عزیزوں کو زمین کا لالچ دیکر آمادۂ فساد کیا جا رہا ہے اور بعض کارخانہ داروں کی غلط روش کو بنیاد بنا کر مزدوروں کو اسلام اور آقائے نامدار عربی تاجدار حضرت محمد مصطفےٰ احمد مجتبےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے قائم کئے ہوئے اسلامی نظام عدل و معیشت سے ہٹا کر یہودی کارل مارکس اور لینن وغیرہ کے پیروکار بنانے کی منظم کوشش کی جا رہی ہے۔

ہم یہ بات بھی بتا دینا اپنا روحانی فرض سمجھتے ہیں کہ جہاں جہاں بھی کمیونسٹوں اور سوشلسٹوں نے دھوکہ دہی سے حکومتوں پر قبضہ کیا ہے وہاں کی عبادت گاہیں مساجد و خانقاہیں برباد کر دی گئی ہیں اور بے دینی کا ایسا ماحول بنا دیا گیا ہے کہ شعائر اسلامی تک ادا نہیں کئے جا سکتے۔ اسکی واضح مثالیں روسی ترکستان کے علاقہ تاجکستان، ازبکستان ماوراء النہر، بخارا شریف، تاشقند اور سمرقند، مصر، عراق اور شام میں دیکھی جا سکتی ہیں

لہٰذا اندریں حالات ہم اپنے تمام مریدین معتقدین اور متوسلین کو ہدایت کرتے ہیں کہ :- ۱- سوشلزم جیسے کافرانہ نظام کے مضر اثرات لوگوں پر واضح کئے جائیں - اور کسی بھی سوشلسٹ کو کہیں بھی کامیاب نہ ہونے دیا جائے۔

(۲) اس نازک مرحلہ پر جماعت اسلامی پاکستان کے پروگرام اور طریق کار سے اتفاق کرتے ہوئے ہدایت کرتے ہیں کہ اس کی امداد و اعانت کی جائے کیونکہ یہ جماعت ہی ایک ایسی جماعت ہے جو سوشلسٹوں اور تشدد پسندوں کے سامنے سینہ سپر ہے اور سیسہ پلائی ہوئی دیوار بنی ہوئی ہے۔

(۳) ذکر اللہ اور میلاد کی مجالس قائم کی جائیں اور ان میں پاکستان کے استحکام و سالمیت کے لیے اور نظریۂ پاکستان کے نفاذ کے لیے جد و جہد کرنے والوں کی کامیابی کے لیے دعائیں مانگی جائیں تاکہ وطن عزیز دشمنان دین کی دست برد سے محفوظ رکھا جا سکے۔ اور حضور پاک سید لولاک شفیع المذنبین رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے اس ملک کو حضرات اولیاء کرام اور خواجگان عظام کے نقش قدم پر چلایا جا سکے۔

اللھم انصر من نصر دین سیدنا و مولانا محمد صلی اللہ علیہ وسلم واجعلنا منھم اللھم اخذل من خذل دین سیدنا و مولانا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ولا تجعلنا منھم

(یہاں بہت سے اولیاء کرام اور مشائخ عظام کے دستخط ثبت ہیں)

(روزنامہ مشرق بابت ۳- دسمبر ۱۹۶۹ء [illegible] ۶۱-۶۲)

سات دسمبر

سات دسمبر کو انتخابات ہونے والے تھے۔ اس سے ایک دن پہلے یعنی ۶ دسمبر کو مودودی صاحب نے حسب ذیل پیش گوئی فرمائی۔

"انتخابات میں شکست سوشلسٹوں کا مقدر بن چکی ہے۔ جماعت اسلامی کے نمائندے انتخابات میں بڑی تعداد میں کامیاب ہوں گے۔ ماضی قریب میں جماعت اسلامی کی اہمیت و مرکزیت میں روز بروز تیزی سے اضافہ ہوا ہے۔ اس لیے میں کہہ سکتا ہوں کہ ان حالات میں جماعت کے ہارنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور ۷ دسمبر کو انہیں جسقدر ذلت آمیز شکست ہوئی۔ اس کی سینہ کوبی کی دردناک صدائیں آج تک فضاء کو ماتم کدہ بنائے ہوئے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے مشائخ عظام کی دعاؤں کو شرف اجابت عطا فرمایا۔ انہوں نے بحضور رب العزت عرض کیا تھا کہ:۔ اللھم اخذل من خذل دین محمد ﷺ

اے اللہ! جو دین محمد ﷺ کو رسوا کرے، تو اُسے رسوا کردے

؏ خوار ہوا کس قدر آدم یزداں صفات (اقبالؒ)

یہ اسی دعا کی باریابی کا نتیجہ تھا کہ اس جماعت کو جس نے دین نبی اکرم ﷺ کو بازیچہ اطفال اور مضحکہ خیز بنانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی؛ ایسی رسوا کن شکست نصیب ہوئی۔

اگر کسی کے دل میں غیرت و حمیت کی ذرا سی بھی رمق ہوتی تو وہ اس ذلت کے بعد ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سیاست سے توبہ کر لیتا۔ اور منہ چھپا کر جنگل میں جا بیٹھتا لیکن یہ کسی اور دنیا کی باتیں ہیں۔ یہ حضرات ایسی کچی مٹی کے بنے ہوئے نہیں ہیں۔ اس شکست پر ان کا ردعمل یا مرید فریبی کیا تھی۔ جب ایک پوچھنے والے نے مودودی صاحب سے پوچھا کہ جب ہم حق پر تھے تو پھر ناکام کیوں رہ گئے۔ تو آپ نے پوری دیدہ دلیری سے فرمایا، اگر ہم ناکام رہ گئے تو کیا ہوا؟ بعض انبیاء ایسے گزرے ہیں جنہوں نے ساری عمر دین کی طرف دعوت دینے میں کھپا دی اور ایک آدمی بھی ایمان نہ لایا۔ (ایشیاء ۳ جنوری ۱۹۷۱ء)

(ان کے برعکس جماعت اسلامی کو گزشتہ ایک سال کی جدوجہد میں کئی لاکھ تنے حامی مل گئے" (ترجمان القرآن جنوری ۱۹۷۱ء)

دیکھیں جناب الیکشنی ضرور بات کہ اب میلاد والے صندل چڑھانے۔ فاتحہ۔ زیارت والے کیا سمجھے جاتے ہیں۔ ایسے اولیاء کرام اور مشائخ عظام جو جماعت اسلامی کے ہمنوا ہوتے جن کے متعلق مودودی صاحب کی رائے واضح ہے) خوشامد و چاپلوسی یا شاہانہ درجہ لالچ ہو

اس لئے ان کی دعائیں اس قدر موثر یعنی پُر تاثیر ثابت ہوئیں ظاہر ہے کہ مشائخ عظام جو اپنی نسبتوں سے خاک پایان اولیاء کرام کہلانے میں فخر محسوس کرتے ہیں میلادِ پاک ان کی روح کی غذا ہے لیکن جناب مودودی کی جماعت اسلامی اپنی "رودیداد جماعت اسلامی حصہ پنجم" میں کیا فرماتی ہے ۔ "میلاد خوانی جو اس وقت رائج ہے ساری کی ساری جاہلانہ اور مشرکانہ رسوم پر مشتمل ہے ۔ اگر حضور یا صحابہ کرام کے زمانے میں ہوتی تو اسے بند کر دیا جاتا ۔ جس طرح حضور کی پیدائش کو ان محفلوں میں بیان کیا جاتا ہے اس طرح اپنی پیدائش کے ذکر کو کوئی شخص پسند نہیں کر سکتا ۔" (رودیداد جماعت اسلامی حصہ پنجم)

میں ہوں اپنی شکست کی آواز

کسی زمانے میں ہمارے ہاں مناظروں کا بہت زور ہوا کرتا تھا اور ان سے اس ہنگامہ پسند قوم میں بڑی گہما گہمی رہا کرتی تھی لیکن جب سے مولوی صاحبان نے سیاست میں حصہ لینا شروع کیا ہے مناظروں کی شکل بدل گئی ہے ۔ بایں ہمہ کبھی کبھی ان کی صدائے بازگشت اب بھی سنائی دے جاتی ہے ۔ مناظرہ کا اسی قسم کا ایک منظر ترجمان القرآن کی فروری ۱۹۷۱ء کی اشاعت میں ہمارے سامنے آتا ہے ۔ بات یوں ہوئی کہ حالیہ انتخابات میں جماعت اسلامی کی شکست کے سلسلہ میں قادیانی جماعت کے نقیب "الفضل" کے مدیر روشن دین تنویر صاحب نے (مدیر ترجمان القرآن) کے نام ایک خط میں لکھا جس میں یہ کہا کہ جماعت اسلامی نے ۱۹۵۳ء میں "احمدیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا مطالبہ کیا تو مودودی صاحب کو پھانسی کی سزا ملی ۔ اور اب پھر اس جماعت نے انہیں غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا مطالبہ کیا تو انہیں انتخابات میں شکستِ فاش ہوئی ۔ یہ دونوں واقعات احمدیہ جماعت کی صداقت کے نشانات ہیں ۔ (یہ حضرات ہمیشہ اس قسم کے دلائل دیا کرتے ہیں) ترجمان القرآن نے تنویر صاحب کا یہ خط شائع کر کے اس کا جواب دیا ہے جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ جماعتِ اسلامی کی اس ناکامی کا باعث خود یہ جماعت نہیں بلکہ اس کے اسباب خارجی تھے جن پر جماعت کا کوئی کنٹرول نہیں تھا ۔ یہ جواب ویسا ہی رکیک اور مضحکہ انگیز ہے جیسا تنویر صاحب کا دعویٰ ۔

مناظروں میں یہی ہوا کرتا ہے ۔ آیئے کچھ وقت کے لیے آپ بھی اس جواب سے لطف اندوز ہو جیئے کہ زندگی میں تفریح کے لیے کچھ لمحات ہونے چاہیئں ۔"

ترجمان القرآن لکھتا ہے ۔

"جماعت اسلامی کی ناکامی کی سب سے بڑی وجہ جسے ہمارے اکثر و بیشتر خیرخواہ نظرانداز کر رہے ہیں وہ بین الاقوامی حالات کی ناسازگاری ہے۔ وہ خارجی قوت جو ہر وقت اسلام اور خصوصاً احیاءِ اسلام کی ہر ابھرنے والی تحریک کے خلاف دنیا بھر میں کارفرما ہیں۔ ان کی وسعت اور اثر آفرینی کا ٹھیک طور پر اندازہ نہیں کیا جاتا۔ پوری دنیا اگرچہ اس وقت دو کیمپوں میں بٹی ہوئی ہے مگر عملاً ان دونوں کیمپوں میں ایک ہی نظام کا تسلط اور حفظ و بقاء کے لیے سپاہ تیار کی جا رہی ہے اور وہ ہے نظام مادیت۔ اس نظام کے افکار و نظریات کی فنی پیچیدگیوں کو چھوڑ دیا جائے تو اسے مختصر طور پر یوں کہا جا سکتا ہے کہ نظام مادیت ایک ایسا ہمہ گیر نظام حیات ہے جس میں عمل کے محرکات خوب و ناخوب کے پیمانوں اور مقصد و منہاج کا تعین سراسر دنیوی اور مادی سود و زیاں کے مطابق کیا جاتا ہے۔ اس نظام میں جو چیز یا نظریہ اس بنیاد سے بے تعلق ہے وہ بالکل غیر ضروری اور بے اثر ہے۔ یہ لازمی نہیں کہ اس نظام کے ماننے والے منکر خدا، دہریے اور کافر ہوں مگر یہ بات ضروری ہے کہ وہ اجتماعی زندگی پر ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کی پرچھائیں تک پڑنے نہیں دیتے۔ اگر ان پر ایمانیات کا کوئی معمولی اثر ہوتا بھی ہے تو وہ ان کے دل کے کسی گوشے میں ہوتا ہے۔ ان کی پوری اجتماعی دینی اور مذہبی اثرات سے یکسر خالی رہتی ہے۔

اس کے بعد انہی بین الاقوامی حالات میں "ترجمان القرآن" نے سرمایہ دارانہ جمہوریت یا اجتماعیت پسندانہ سرمایہ داری کا ذکر کیا ہے، جو اس کے نزدیک اشتراکیت کا دوسرا نام ہے۔ ان حالات کے تذکرہ کے بعد وہ لکھتا ہے

اب جو تحریکیں اس سیلاب کو روکنے کے لیے کام کر رہی ہیں ان کی بے بسی ملاحظہ فرمائیں ایک طرف تو انہیں وقت کے غالب افکار و رجحانات اور تصورات کے خلاف جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ دوسری طرف اس جدوجہد کے لیے انہیں جس قدر وسائل درکار ہوتے ہیں ان کا عشر عشیر تو کیا، ان کا کروڑواں حصہ بھی فراہم نہیں ہوتا پھر ان کے تسلط کی وجہ سے لوگوں کے ذہنوں میں جو مرعوبیت بلکہ مغلوبیت پائی جاتی ہے اس سے بھی انہیں طرح طرح کی دشواریاں پیش آتی ہیں اس پر مزید یہ کہ اس باطل نظام نے اپنی عملداری کے لیے زیرِ زمین بھی اور بالائے زمین بھی سازشوں کا ایک وسیع اور پیچیدہ نظم قائم کر رکھا ہے جس کے لیے ملک کے اندر بھی بہت سی طاقتیں کام کر

...تی ہیں اور ملک کے باہر سے عالمی طاقتیں بھی ان کو تقویت پہنچا رہی ہیں۔ یہ تحریکات تعداد میں اس قدر زیادہ اور اپنے پروگراموں کے اعتبار سے اس قدر وسیع اور طریقہ ہائے کار کے لحاظ سے اتنی متنوع اور اثرات کے اعتبار سے اتنی ہمہ گیر ہیں کہ اسلامی تحریکوں کے لیے ان کا مقابلہ عالم اسباب میں جوئے شیر لانے سے کچھ کم دشوار نہیں ہے۔ جونہی کوئی دینی تحریک معرض وجود میں آتی ہے اسی وقت تمام اسلام دشمن تحریکیں اسے برباد کرنے کے لئے اپنے اپنے پروگرام لیکر میدان میں آجاتی ہیں اور ہر طرف سے اس پر یلغار کرتی ہیں۔ آپ سوچئے کہ مصر میں اخوان المسلمین کا جو حشر ہوا ہے اور اس کے خلاف دنیا میں حقارت و نفرت کے جو جذبات پھیلے ہیں اور اس کی بربادی پر دنیا کے مختلف ممالک اور طبقوں میں خوشی کے جو شادیانے بجے ہیں کیا وہ محض مصر کے چند حکمرانوں کی کوششوں کے نتائج ہیں؟

اس کے بعد لکھتے ہیں:-

اسی پس منظر میں ذرا جماعت اسلامی کی مشکلات کا بھی اندازہ لگائیے۔ ڈھائی ہزار ارکان پر مشتمل ایک چھوٹی سی جماعت جس کے ہمدردوں کی تعداد چند لاکھ نفوس سے زیادہ نہیں ہے جس کے وسائل انتہائی قلیل ہیں اور جس کی مادی قوت نہایت ہی کم ہے اس کے پیچھے ایک دنیا ہاتھ دھو کر پڑی ہوئی ہے۔ اس کے بعد کہا گیا ہے کہ ملک میں جس قدر حکومتیں قائم ہوئیں انہوں نے بھی جماعت اسلامی کو دبانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا ان تمام مخالف عناصر کا ذکر کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ:

اتنے ہمہ گیر طوفان کا مقابلہ ایک کمزور سی جماعت کہاں تک کر سکتی تھی۔

آپ نے ترجمان القرآن کے پیش کردہ اسباب ناکامی ملاحظہ فرمائے۔ آپ نے دیکھا کہ اس میں کہیں یہ نہیں کیا گیا کہ اس باب میں امیر جماعت کی کسی قسم کی غلطی کو کوئی دخل تھا یا جماعت کی پالیسی کا کوئی واسطہ۔ تمام اسباب خارجی تھے جن پر جماعت کو کوئی اختیار نہیں تھا۔

بہت اچھا۔ لیکن اس سلسلہ میں ایک سوال ابھرتا ہے جس پر آپ غور فرمائیے۔ وہ سوال یہ ہے کہ کیا یہ اسباب ایسے تھے، کہ یہ ۶ر دسمبر کی شام اور ۷ دسمبر (انتخابات کے دن) کی صبح کے درمیان اچانک نمودار ہو گئے تھے۔ اگر صورت ایسی ہوتی کہ (مثلاً) آپ نے کھلے میدان میں جلسہ کا انتظام کیا تھا۔ اس کے لیے شامیانے لگ گئے، بجلی کے قمقمے نصب کرائے۔ بیکن

عین جلسے کے وقت بالکل غیر متوقع طور پر باد و باراں کا طوفان اٹھا اور سارا انتظام درہم برہم ہو گیا۔ اس وقت اس قسم کی مدافعت قابل پذیرائی ہو سکتی ہے۔ لیکن یہاں صورت یہ ہے کہ جن اسباب کا تذکرہ کیا جا رہا ہے وہ برسوں سے آپ کے سامنے موجود تھے۔ آپ ان کا مشاہدہ فرما رہے تھے۔ آپ کے امیر کی "مفکرانہ نگاہیں" ان کا بغور مطالعہ کر رہی تھیں ان کی انگلیاں نبضِ زمانہ پر تھیں لیکن اس سب کے باوجود، وہ چھ دسمبر کو پورے حتم و یقین کے ساتھ ببانگِ دہل فرماتے تھے کہ جماعت اسلامی کے شکست کھا جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیا اس دن تک آپ کے امیر یا دیگر اربابِ جماعت کو وہ عناصر نظر نہیں آتے تھے جنھیں آپ اب اپنی ناکامی کے اسباب قرار دے رہے ہیں! یہ ہوتا ہے شخصیت پرستی کا نتیجہ جس میں کوئی شئے اپنی اصلی ہیئت میں سامنے آنے ہی نہیں پاتی۔ اور یہ ہم نے محض قیاساً ہی نہیں لکھ دیا۔ جس مقصد کے لیے ترجمان القرآن میں یہ کچھ لکھا گیا ہے۔ اسے اس نے آگے چل کر خود ہی افشا کر دیا ہے۔ تحریر ہے۔

بعض بہی خواہوں کی طرف سے جماعت کو زیادہ سرگرم اور عوامی بنانے کے لیے یہ تجویز پیش کی جا رہی ہے کہ اس کی امارت کا بار کسی دوسرے زیادہ سرگرم قائد کے کندھوں پر ڈال دیا جائے۔ اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کو جماعت کی سرپرستی کا کام سپرد کر دیا جائے۔ اس کے بعد ترجمان القرآن کا کرب و اضطراب قابلِ دید ہے۔ اس نے جو کچھ کہا ہے اس کا ملخص یہ ہے کہ توبہ کیجئے ہزار بار توبہ کیجئے۔ ایسا خیال بھولے سے بھی دل میں نہ لائیے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی ذات گرامی منفرد ہے۔ ان کا کوئی بدل نہیں ہو سکتا۔ اگر ان کی جگہ قیادت کسی اور کے سپرد کر دی جائے۔ تو سمجھئے جماعت ختم ہو جائیگی اور ظاہر ہے کہ جب جماعت ختم ہو جائے گی تو اسلام ہی ختم ہو جائیگا۔ "خدا انہیں تا دیر سلامت رکھے۔" ص ۱۹

آپ نے غور فرمایا کہ جماعتِ اسلامی کی اس ذلت آمیز شکست کے اسباب کی تلاش میں معتقدین کی نگاہوں کا رخ خارجی عناصر کی طرف منتقل کرانے کا مقصد کیا ہے؟ یہی کہ شخصیت پرستی کے اس بُت کو کوئی گزند نہ پہنچے۔ اور مودودی صاحب نے تو اپنی تقریر بتاریخ جنوری ۱۹۷۱ء میں (جو انہوں نے کارکنانِ جماعت سے لاہور میں کی تھی) اپنے معتقدین کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ جو شخص اس شکست کو شکست کہتا ہے وہ حالات

سے بے خبر ہے۔ یہ ہماری شکست نہیں کامیابی ہے۔ اس کا صغریٰ کبریٰ یوں ہوتا ہے۔
۱۔ ہم نے اپنی دعوت کو تعلیم یافتہ طبقہ تک محدود رکھا تھا۔
۲۔ اس ملک کی ۸۵ فیصدی آبادی ناخواندہ ہے۔ خواندگی کا اوسط تقریباً پندرہ فیصد ہے اور ان میں بھی جس حصے کو پڑھا لکھا کہا جا سکتا ہے وہ زیادہ سے زیادہ سات آٹھ فیصد ہے۔ ہم نے ملک کے آدھے حصے میں جو ووٹ حاصل کئے ہیں وہ کل استعمال شدہ ووٹوں میں ۴ اور ۵ فیصد کے درمیان ہیں۔
۳۔ ان انتخابات میں جماعت نے تمام نشستوں پر نہیں بلکہ آدھی سے کم نشستوں پر آدمی کھڑے کئے تھے۔ ان میں ہمارے براہ راست کھڑے ہوئے آدمیوں اور ہماری تائید سے کھڑے ہونے والوں کو مجموعی طور پر ۲۵ لاکھ ووٹ ملے ہیں (ایشیا ۲۲ جنوری ۱۹۷۱ء)
فرمایئے! یہ ہماری شکست ہے یا کامیابی! اسے شکست قرار دینے اور ایسا سمجھنے والا جاہل نہیں تو اور کیا ہے؟
امیر جماعت نے یہ فرمایا اور حلقہ مریدین نے سبحان اللہ کے نعرے بلند کئے۔
ترجمان القرآن کی مذکورہ بالا اشاعت میں اس سے بھی زیادہ دلچسپ ایک "حقیقت" بیان ہوئی ہے۔ انتخابات کے بعد ملک میں جو ہنگامے برپا ہو رہے ہیں، ان کے متعلق ایک سطحی نگاہ رکھنے والا انسان بھی جانتا ہے کہ جو جماعتیں انتخابات میں ناکام رہ گئی ہیں، ان کا آخری حربہ یہ ہے کہ ملک میں امن و امان کی فضا قائم نہ ہونے پائے تاکہ کامیاب جماعتیں اپنی حکومت قائم نہ کر سکیں اور ظاہر ہے کہ ان میں جماعت اسلامی کا نام سرفہرست آتا ہے۔ اب دیکھئے کہ یہ حضرت اس باب میں کیا فرماتے ہیں
ارشاد ہے:۔ یہاں کے دو صوبوں میں ایک ایسی پارٹی کو واضح اکثریت حاصل ہوئی ہے جو اپنے آپ کو اشتراکیت کی حامی کہتی ہے۔ جمہوریت کا تقاضا ہے کہ ملک میں امن وامان کی فضا قائم ہو اور اس پارٹی کے ارکان مسند اقتدار سنبھالنے کے بعد جمہوری روایات اور طریقوں کے مطابق اپنے ان منصوبوں پر عمل کریں جو ان کے پیش نظر ہیں اور جن کا وعدہ کر کے انہوں نے عوام سے ووٹ حاصل کئے ہیں اب اس پارٹی کے ہر چھوٹے بڑے کارکن کا انداز فکر و عمل سراسر تعمیری ہونا چاہیئے اور اسے اس امر کی کوشش کرنی چاہئے کہ ملک تعمیری راستے پر گامزن ہو مگر یہاں عملاً جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب کے سامنے ہے۔ ایک

طرف تو اس پارٹی کا ہر چھوٹا بڑا لیڈر خلاف کرنے والوں پر برس رہا ہے اور انہیں المناک عذاب کی وعید سنا رہا ہے۔ دوسری طرف اس کے کارکن ملک کے اندر افراتفری فضا قائم کرنے میں مصروف ہیں اور ہڑتالیں کروا رہے ہیں۔ ان حرکتوں کا مقصد یہی ہے کہ ملک کی سیاسی گاڑی جو خوش قسمتی سے جمہوریت کی پٹڑی پر کسی طرح چڑھ رہی ہے اسے پھر پٹڑی سے اتار دیا جائے اور ملک میں آمریت، تشدد اور لاقانونیت کی فضا قائم ہو۔"

یعنی جن پارٹیوں کو کامیابی حاصل ہوئی ہے اور مغربی پاکستان کے دو بڑے صوبوں میں جن کی حکومت کے امکانات مسلّم ہیں، ان کی یہ کوشش ہے کہ ملک میں ہنگامے برپا کرائے جائیں تاکہ ان کی حکومت قائم نہ ہو سکے۔ !!!

آپ سوچئے کہ اس قسم کی لچر پوچ باتوں کو عقیدت مندی کے جادو کے سوا اور کس طرح منوایا جا سکتا ہے!

اس پر اس جماعت کا دعویٰ یہ ہے کہ ان کا مخاطب ملک کا تعلیم یافتہ طبقہ ہے۔ اگر ان کے ہاں کے تعلیم یافتہ طبقہ کی فکر و بصیرت کا یہ عالم ہے تو ان کے اَن پڑھ دائیں بازو والوں کی جو کیفیت ہوگی وہ ظاہر ہے۔ سچ ہے

اگرچہ پیر ہے آدم، جواں ہیں لات و منات

یا ایں ہمہ معلوم ہوتا ہے کہ جماعت اسلامی کے اندر کچھ لوگوں میں محاسبۂ خویش کا احساس بیدار ہو رہا ہے اور انہوں نے سوچنا شروع کر دیا ہے۔ ڈاکٹر نذیر احمد[1] جماعت اسلامی ضلع ڈیرہ غازی خاں کے امیر ہیں جو قومی اسمبلی کی رکنیت کے لیے منتخب ہوئے تھے۔ ان کا انٹرویو ۲۸ جنوری ۱۹۷۱ء کے روزنامہ کوہستان میں شائع ہوا ہے۔ جس میں انہوں نے اپنی جماعت کی اس ناکامی کے اسباب کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا ہے۔

۱۔ جماعت اسلامی نے تعلیم یافتہ افراد تک اپنے کام کو محدود رکھا۔ اس کا پس منظر یہ تھا کہ یہی پڑھے لکھے افراد عوامی قیادت سنبھال لیں گے۔ ادھر عوام نے جماعت کے اس اندازے کو غلط ثابت کر دکھایا اور اپنی قیادت کی ذمہ داری دوسروں پر ڈال دی۔ ہمیں

---

[1] جنہیں کسی شقی القلب نے شہید کر دیا۔ (مرتب)

سمجھ لینا چاہیئے کہ عوامی قیادت کا بوجھ اٹھانے کیلئے صرف پڑھا لکھا ہونا ہی ضروری نہیں بلکہ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر عوام کی جگہ کھڑے ہو کر مار کھانی چاہیئے تاکہ عوام اطمینان کیساتھ اعتماد کر سکیں۔ مان لیجیئے کہ جماعت اسلامی کے اکثر ارکان خود کو عوامی قیادت کے اس معیار کا اہل ثابت نہیں کر سکے۔

۲۔ معاشی پروگرام کے سلسلہ میں بد قسمتی سے جماعت کا اندازہ صحیح ثابت نہیں ہوا۔ یہ سوچ کی ایک غلطی تھی مگر اس سوچ میں نیت کا فتور شامل نہیں تھا۔

۳۔ جماعت کا ایک غلط طرز فکر (یہ بھی) تھا جو اس نے کچلے اور دبے ہوئے عوامی طبقات کے سلسلہ میں اختیار کیا اور انہیں استحصال پسندوں کے چنگل سے نکالنے کے لیے وہ مؤثر کردار ادا نہیں کیا جس کی جماعت اسلامی جیسی منظم نظریاتی انقلابی قوت سے توقع ہو سکتی تھی۔

۴۔ یہ بات تسلیم کی جا سکتی ہے کہ مولانا مودودی کو اپنے معیار کے بہت کم ساتھی ملے ہیں

۵۔ اس سوال کے جواب میں کہ "جماعت کے اسٹیج پر ایسے افراد نمودار ہو گئے جو عوام میں بدترین شہرت کے حامل تھے۔ انہوں نے کہا کہ درست ہے لیکن جماعت نے انہیں کبھی ذہنی طور پر قبول نہیں کیا۔ اور نہ ہی وہ انہیں کوئی اونچا درجہ دیتی ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ اس جماعت کی تاریخ میں غالباً یہ پہلا موقعہ ہے کہ جماعت کے اندر سے کسی نے اس قسم کی تنقیدی آواز اٹھائی ہو اور اسے جماعت سے خارج نہ کیا گیا ہو، ورنہ اس سے پہلے یہی ہوتا رہا کہ جس شخص نے محاسبۂ خویش کا احساس دلایا، اسے جماعت سے نکال باہر کیا گیا۔ (مولانا امین احسن اصلاحی اور ان کے رفقا کے گروہ کا جرم اتنا ہی تھا) ہمیں امید ہے کہ اگر یہ احساس پرورش پاتا رہا تو اس جماعت کے سوچنے والے ذہن بہت جلد اس حقیقت کو پا لیں گے کہ ان کی جماعت کی ناکامی اور عدم مقبولیت کا حقیقی سبب اُن کے امیر کی وہ دورخی پالیسی ہے جس کی بنا پر وہ ہیں کچھ اور، اور بنتے کچھ اور ہیں۔ ان کے دل میں کچھ اور ہوتا ہے اور زبان سے کہتے کچھ اور ہیں۔ ان کے مقاصد کچھ اور ہیں۔ اور انہیں دکھاتے کچھ اور بنا رہے ہیں جب تک یہ ملمع قائم رہا، جماعت کی ساکھ قائم رہی۔ اب یہ اترنا شروع ہو گیا ہے

اس لیے حقیقت لوگوں کے سامنے عریاں ہوکر آ رہی ہے ہر فریب کا انجام ایسا ہی ہوتا ہے
(طلوع اسلام مارچ ۱۹۷۱ء ص ۱۱ تا ۱۷)

ہم نے یہ جائزہ جو ایک قادیانی سے مناظرہ کی صورت میں سامنے آیا اور طلوعِ اسلام نے تجزیہ وتحلیل اور تبصرہ وتنقید کرتے ہوئے شخصیت پرستی کے روگ اور اس کی ساحرانہ گرفت کو سامنے رکھا، اور مردِ حق (جسے کسی بدبخت نے شہید کردیا) ان کی حق گوئی اور جرأت وبے باکی کی بھی تعریف کی ہے ہم نے "میں ہوں اپنی شکست کی آواز" کے مضمون کو من وعن نذرِ قارئین کردیا ہے۔ حقیقت شناسی آپ کا انصاف طلبی ہمارا کام ہے۔ (مرتب)

باب ۱۷

ذِلّت کی حقیقی وجہ

اور

ریڈیو سے مولانا مودودی کی تقریریں

پس منظر جماعت اسلامی کے اجتماع میں (جو گزشتہ مارچ کو لاہور میں منعقد ہوا تھا) جماعت کی ۳۳ سالہ رُوئداد کے ضمن میں (۱۹۴۸ء کے واقعات پر تبصرہ کرتے ہوئے) کہا گیا

بانیٔ پاکستان قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ کی حیات تک جماعت اسلامی اور حکومت کے درمیان تعاون کا رشتہ قائم تھا۔ امیر جماعت اسلامی سید ابوالاعلیٰ مودودی کو ریڈیو پاکستان سے تقریروں کی دعوت دی جا رہی تھی۔ اور مولانا محترم کے افکار سرکاری ابلاغ عامہ کے ذریعہ سے پورے ملک میں پھیل رہے تھے۔ مولانا محترم نے جنوری سے جولائی تک سات ماہ کے عرصہ میں ریڈیو پاکستان سے دس تقریریں کیں۔ (ایشیا۔ ۳۱ مارچ ۱۹۷۳ء)

امیرِ جماعت، میاں طفیل محمد صاحب نے اپنی تقریر میں فرمایا :۔

کمیونسٹ، سوشلسٹ اور لادین عناصر اگرچہ جماعتِ اسلامی کے خلاف قیامِ پاکستان کے فوراً بعد ہی اکٹھے ہو گئے تھے لیکن انہیں قائد اعظمؒ کی زندگی میں جماعت کے خلاف کوئی قدم اٹھانے کی جرأت نہ ہوئی۔ بلکہ اسلامی نظام کے بارے میں جماعت کے امیر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تقریریں ریڈیو سے نشر ہوتی رہیں لیکن قائد اعظمؒ کی آنکھ بند ہونے کی دیر تھی کہ جماعت کے خلاف کارروائی شروع ہو گئی اور مولانا مودودی اور ان کے ساتھیوں کو گرفتار کر کے جیل میں ڈالا گیا۔ (ایشیا۔ ۷ اپریل ۱۹۷۳ء)

ایشیا کے اداریہ میں، میاں صاحب کی اس تقریر کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا گیا :

اُنہوں نے (میاں صاحب نے) بتایا کہ قائدِ اعظمؒ نے تشکیلِ پاکستان کے بعد تحریکِ پاکستان کے دوران کے تمام اختلافات کو بالائے طاق رکھ دیا اور جن لوگوں کو مسلم لیگ کے طریق کار سے کچھ بھی اختلاف تھا انہیں وسعتِ قلب کے ساتھ اپنے سینے سے لگا لیا۔

مولانا مودودی کو سرکاری طور پر دعوت دی گئی کہ وہ ریڈیو پر اسلامی نظامِ حیات

کی تشریح کریں ۔

(ایشیا ۷ اپریل ۱۹۷۲ء)

ان اقتباسات سے واضح ہے کہ قائداعظمؒ نے انتہائی کشادہ ظرفی سے کام لیتے ہوئے اس مخالفت کو بالائے طاق رکھ دیا جو مودودی صاحب مسلسل سات آٹھ سال سے کرتے چلے آرہے تھے اور نہ صرف یہ کہ ان واقعات کو رفت گزشت کردیا بلکہ مودودی صاحب کو دعوتِ تعاون دی اور مخالفین کے مقابلہ میں ان کے لئے سینہ سپر بنے رہے ۔

اس کے بعد یہ دیکھئے کہ مودودی صاحب نے اس احسان کا جواب کس طرح دیا۔ پاکستان آنے کے بعد ، ان کے ماہنامہ ترجمان القرآن کی پہلی اشاعت جون ۱۹۴۸ء میں ہوئی (اس میں انہوں نے اپنی ان ریڈیائی تقاریر کو بھی شائع کیا۔ جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے) اس رسالہ کے افتتاحیہ (اشارات) میں انہوں نے گذشتہ تحریکِ پاکستان پر بھرپور تبصرہ کیا۔ اور اس کے بعد فرمایا کہ :۔

" یہ بحث ان سب لوگوں کا منہ کالا کر دینے والی ہے۔ جنہوں نے پچھلی ربع صدی میں ہمارے ملک کی سیاسی تحریکوں کی قیادت فرمائی "

(ترجمان القرآن ۔ جون ۱۹۴۸ء)

اس کے بعد ہندوستان اور پاکستان دونوں مملکتوں کے باشندوں کو مخاطب کرتے ہو کہا :۔

اگر اب بھی ان کی لیڈر شپ تبدیل نہ ہوئی اور اگر اس نئے دور میں بھی ان کے معاملات اسی اندھی اور گندی قوم پرستی اور اسی مادہ پرستانہ اخلاق پر چلتے رہے .... تو (ایضاً)

اور اس کے بعد کہا کہ :۔

" اگر ان مملکتوں میں ، شریف، معقول اور خداترس انسانوں کا کوئی عنصر موجود ہے تو وہ منظم ہو کر اٹھے ، اپنی اپنی قوم کی ذہنیت بدلنے کی کوشش کرے اور موجودہ قیادت کو بدل کر ایسے طریقے پر دونوں ملکوں کے معاملات چلائے جس سے ..... (ایضاً)

یہ کچھ ترجمان القرآن کی پاکستان میں سب سے پہلی اشاعت میں لکھا گیا :۔

پھر اس رسالہ کی اگلی اشاعت دابت جولائی ۱۹۴۸ء کے اشارات میں اُسی سلسلہ کو جاری رکھتے ہوئے لکھا :-

(اس تحریک میں، عام کارکنوں سے لے کر بڑے بڑے ذمہ دار لیڈروں تک میں انتہائی ناقابلِ اعتماد سیرت کے لوگ موجود تھے۔

اور آخر میں پھر اسی قیادت کا رونا رویا جس سے محرومی اس تمام مخالفت اور شعلہ نوائی کا جذبۂ محرکہ تھی۔

فرمایا :" اس حیثیت سے اس پر بحث کرنا ضروری ہے کہ جو مسائل اب ہمیں درپیش ہیں کیا ان کے حل کے لئے بھی وہی قیادت موزوں ہے جو اس سے پہلے ہمارے قومی مسئلہ کو اس طرح حل کر چکی ہے کیا اس کا اب تک کا کارنامہ ہمیں مطمئن کرتا ہے کہ اب جو بڑے بڑے اور نازک مسائل ہمارے سر پر آپڑے ہیں جن کا بیشتر حصہ خود اسی قیادت کی کارفرمائیوں کے نتیجہ میں پیدا ہوا ہے "

اس کے بعد اگست ۱۹۴۸ء کے اشارات میں تقسیمِ ہند کے عواقب پر بحث کرتے ہوئے لکھا :-

(یہ) ساری جماعت بازی گروں سے پٹی پڑی تھی جنہوں نے عجیب عجیب قلابازیاں کھا کر دنیا کو بودی سیرت اور کھلے اخلاق کا تماشا دکھایا اور اس قوم کی رہی سہی عزت بھی خاک میں ملا دی جس کے وہ نمائندے بنے ہوئے تھے۔

اس (اگست ۱۹۴۸ء) کے بعد قائدِ اعظمؒ وفات پا گئے تو مودودی صاحب کے سینے میں حسد اور انتقام کے بھڑکنے والے شعلے ٹھنڈے پڑے۔

ہم نے اس مقام پر اس نہایت تلخ داستان کو یہ بتانے کے لئے دہرایا ہے کہ ان حضرات کو خود اس کا اعتراف ہے کہ تشکیلِ پاکستان کے بعد قائدِ اعظمؒ نے اسلامی جماعت اور اس کے امیر کے ساتھ اس قدر کشادہ ظرفی اور حسنِ سلوک کا ثبوت دیا اور ان صاحب نے اس کا جواب اس طرح دیا! ان دونوں کے کردار کا مقابلہ آپ خود کر لیجئے !!

جنابِ والا! مولانا مودودی تو تحریکِ قیامِ پاکستان اور قائدینِ تحریک کے کھلے مخالف اور واضح ملفوف ملاحیاں سنانے والوں میں سے ہیں مخالفینِ تحریک

قیام پاکستان کے متاثرین، مریدین اور معتقدین جن کی ہندوستان میں ایک کوڑی (دو پیسہ) کی حیثیت نہ تھی پاکستان نے انہیں کروڑوں کے مالک اور لاکھ پتی بنایا وہ آج تک اس محسن عظیم کا نام ادب و احترام سے نہیں لیتے اگر کسی نے ایک شریف آدمی کی آڑے وقت میں ایک روپیہ سے ہی مدد کی ہو تو وہ اس کا احسان نہیں بھلاتا۔ صاف بات ہے کہ پاکستان کا قیام وجود ان کی ماضی کی شکست کی آواز ہے۔ رہا ان کے کردار کا مقابلہ تو جس طرح آپ نے جناب پروفیسر محمد منور مرزا کی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ انہوں نے جوش ؔ اور اقبالؒ کا موازنہ کر کے حکیم الامت علیہ الرحمہ کی توہین کی ہے آپ کی یہ تحریر بھی ایسی ہی غمازی سی کرتی ہے ادب و احترام مانع ہے۔ ورنہ عرض کیا جاتا کہ آپ بھی اپنے گناہ کی تلافی کے لئے جناب سید ابوالاعلیٰ مودودی امام صالحین و مقدسین کو مزید بے نقاب کریں تاکہ یہ کام آپ کے گناہ کا کفارہ ثابت ہو سکے کیونکہ آپ کی بے تحقیق و تفتیش " حمایت و حوصلہ افزائی نے حضرت مودودی کو پنجاب و دارالسلام " سے متعارف کرایا۔

نوٹ :۔ تحریر بالا طلوع اسلام سے ماخذ ہے جس پر راقم نے خیال آرائی کی ہے۔

(چوہدری حبیب احمد)

ذلت کی حقیقی وجہ حقائق و عبر کے عنوان سے طلوع اسلام رقمطراز ہے :۔ گذشتہ انتخابات میں جماعت اسلامی کو جو اس قدر ذلت آمیز شکست ہوئی تو اس کی مختلف توجیہات پیش کی گئیں —— توجیہات تو پیش کرنی تھیں۔ اس لئے کہ ایک تو امیر جماعت مودودی صاحب کی انانیت اسقدر شدید ہے کہ وہ اپنی غلطی کو تسلیم کرنا سخت توہین سمجھتے ہیں اور دوسرے اس لئے کہ انہوں نے بہر حال، بھان متی کے اس کنبے کو برقرار رکھنا اور خود اس کا امیر رہنا ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں کسی کی نگاہ اس ذلت کی بنیادی وجہ تک نہیں پہنچتی مودودی صاحب، حضرات انبیاء کرامؑ کی شان میں بالعموم، اور حضور رسالت مآبؐ کی بارگاہ اقدس و اعظم میں بالخصوص (معاذ اللہ) ایسی گستاخیاں کرتے چلے آرہے ہیں جنہیں خدا کا قانون مکافات کبھی معاف نہیں کرتا۔ (مثلاً) انہوں نے اپنی میکاولی سیاست کی تائید میں یہ فتویٰ صادر فرمایا کہ زندگی کی اہم ضروریات کے لئے جھوٹ بولنا

نہ صرف جائز بلکہ واجب ہو جاتا ہے جب اس پر اعتراض کیا گیا تو انہوں نے نہایت دیدہ دلیری سے کہہ دیا کہ (معاذاللہ معاذاللہ) ایسا خود حضورؐ نے کیا تھا جب آپؐ نے بعض صحابہؓ کو کعب بن اشرف کے قتل کے لئے مامور کیا تو انہیں اجازت دے دی کہ وہ (پناہ بخدا) عندالضرورت جھوٹ اور فریب سے کام لے سکتے ہیں۔

(یا) جب ان کی جماعت کے بعض حضرات نے ان پر اعتراض کیا کہ آپ نے اپنی دعوت کے ابتدائی ایام میں جن اصولوں کو پیش کیا کرتے تھے، اب عملاً خود ہی ان کی تردید اور تکذیب کر رہے ہیں اس لئے ہم آپ کا ساتھ نہیں دے سکتے تو انہوں نے کمال ڈھٹائی سے کہہ دیا کہ اگر میں ایسا کرتا ہوں تو کون سی قیامت آگئی (استغفراللہ استغفراللہ) خود رسولؐ اللہ نے بھی تو ایسا ہی کیا تھا آپؐ اپنی دعوت کے ابتدائی ایام میں مساوات انسانیہ کی تبلیغ کرتے رہے لیکن جب مدینہ میں اپنی مملکت قائم کرلی تو فرما دیا کہ خلافت میرے قبیلہ۔ قریش۔ میں محدود رہے گی۔ آپؐ کا یہ فیصلہ اصول مساوات انسانیہ کے یکسر خلاف تھا۔

ہم ان کی طرف سے اس قسم کے ھفوات و شطحیات سنا کرتے تھے اور کانپ اٹھتے تھے کہ اس شخص کی جرأتیں کس قدر بے باک ہیں کہ نہ خدا کا خوف ہے نہ رسولؐ کی شرم اور نہ ہی اس کا احساس کہ ۔ اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيدٌ ۔ تیرے خدا کی گرفت بڑی سخت ہوتی ہے۔

خدا کی یہ گرفت اس عبرت آمیز ذلت کی شکل میں سامنے آئی جو گذشتہ انتخابات میں ان کے لئے وجۂ روسیاہی بنی۔ اتنی لمبی مہلت کے بعد جو عذاب آیا کرتا ہے۔ قرآن کریم نے اسے عَذَابٌ مُّهِينٌ (۲۲/۵۷) رسواکن عذاب کہا ہے۔ اس عذاب کے مہین (ذلت آمیز) ہونے کا اندازہ ان کے ان دعاوی سے لگایئے جو یہ، الیکشن کے ایک دن پہلے تک اس شد و مد سے کیا کرتے تھے۔

لیکن انہوں نے اس سے بھی عبرت نہیں پکڑی اور اپنی اس روش کہن سے باز نہ آئے ان سے ایک پوچھنے والے نے پوچھا کہ جب ہم حق پر تھے تو پھر کیوں ناکام رہ گئے۔ اس کے جواب میں انہوں نے کیا فرمایا، اسے ذرا کلیجہ تھام کر سنئے! کہا کہ اگر ہم ناکام رہ گئے تو کیا ہوا۔

بعض انبیاء ایسے گزرے ہیں جنہوں نے ساری عمر دین کی طرف دعوت دینے میں کھپا دی اور ایک آدمی بھی ان پر ایمان نہ لایا[۱] (ایشیا ۳ جنوری ۱۹۷۱ء)

اور ان کے مقابلہ میں

(جماعت اسلامی کو) گذشتہ ایک سال کی جدوجہد میں کئی لاکھ نئے حامی مل گئے ہیں۔ ترجمان القرآن بابت جنوری ۱۹۷۱ء (صفحہ ۶۴)

بعض بعض انبیاء کرام ؑ تو ایسے گزرے کہ انہوں نے ساری عمر دین کی طرف دعوت دینے میں کھپا دی اور ایک آدمی بھی ان پر ایمان نہ لایا اور جماعت اسلامی کی تبلیغ سے ایک سال میں کئی لاکھ نئے حامی مل گئے۔ استغفراللہ،

سوچیئے کہ ایسا کہنے والے کو خدا کی غیرت کا بھی کچھ خوف ہے؟ حضرات انبیاء کرام ؑ کے متعلق خدا کا ارشاد ہے کہ:۔

كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَ رُسُلِيْ ۔ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ (۵۸/۲۱)

خدا نے یہ لکھ رکھا ہے کہ ہم اور ہمارے رسول یقیناً غالب رہیں گے یہ حقیقت ہے کہ خدا بڑی قوتوں کا مالک اور غلبہ والا ہے۔

ربّ الاعلیٰ کا تو یہ ارشاد ہے کہ ہمارا حتمی فیصلہ ہے، اٹل قانون ہے کہ ہم اور ہمارے رسول ہمیشہ غالب رہیں گے۔ اور یہ حضرت۔ یہ ابوالاعلےٰ صاحب۔ اپنی شکست کو چھپانے کے لئے فرماتے ہیں کہ بعض انبیاء ایسے بھی گزرے ہیں جنہوں نے ساری عمر تبلیغ حق میں کھپا دی اور انہیں ایک بھی حامی نصیب نہ ہوا۔ استغفراللہ!

حضرات انبیاء کرام ؑ کا مقام تو بہت بلند ہے۔ خدا نے تو جماعت مومنین کے متعلق بھی یہ فرما دیا ہے کہ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ (۳۰/۴۷) مومنین کی مدد کرنا ہم پر واجب ہے۔ (حَقًّا عَلَيْنَا۔ ہم پر فرض ہے۔ وَعْدَ اللّٰهِ یہ اللہ کا وعدہ ہے

---

[۱] واضح رہے کہ مودودی صاحب اس قسم کی توجیہات کی تائید میں وضعی روایات پیش کر دینے کے عادی ہیں چنانچہ اس بیان کے سلسلے میں بھی انہوں نے کہا ہے کہ "احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ" "احادیث" سے ان کی مراد ہے وضعی روایات۔" (طلوع اسلام)

لَا یُخْلِفُ اللّٰہُ وَعْدَہٗ (پ۲۱) اور خدا وعدہ خلافی کبھی نہیں کرتا۔ اور اسی لئے اس نے کہہ دیا ہے کہ وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ (۳/۱۳۹) اگر تم مومن ہو تو تم یقیناً غالب رہو گے "ابو الاعلیٰ" (الاعلیٰ کا باپ) نام رکھ لینا آسان ہے۔ لیکن "اعلیٰ" (غالب) ہونے کے لئے مومن ہونا بنیادی شرط ہے۔

بہرحال، یہ ہے وہ غیرت سوز اور انتہائی شرمناک توجیہہ جو ان صاحب نے اپنی شکست پر پردہ ڈالنے کے لئے ارشاد فرمائی ہے اور اس سے ان کے دل میں قطعاً لرزش پیدا نہیں ہوئی کہ میں خدا اور اس کے انبیاء کرام کے باب میں کس قدر گستاخی کر رہا ہوں۔ انہوں نے جو موجودہ ذلت سے بھی عبرت حاصل نہیں کی تو معلوم ہوتا ہے کہ انہیں ابھی اس سے بھی زیادہ ذلت آمیز عذاب کا انتظار ہے۔

فَمَآ اَصْبَرَھُمْ عَلَی النَّارِ (۲/۱۷۵) حیرت ہے کہ یہ لوگ عذاب جہنم کے لئے کس قدر دلیر ہوتے جاتے ہیں۔

واضح رہے کہ ہم یہاں شکست و فتح کے اصولوں کے متعلق بحث نہیں کر رہے۔ ہم صرف یہ کہہ رہے ہیں کہ مودودی صاحب نے اپنی شکست چھپانے کے لئے جو توجیہہ بیان فرمائی ہے وہ ارشادات باری تعالیٰ کے صریح خلاف اور خدا اور اس کے رسولوں کی جناب میں انتہائی گستاخی ہے۔ نبی تو خدا کے انقلابی پروگرام کی آخری کڑی ہوتا ہے (یعنی ہوتا تھا۔ کیونکہ حضورؐ ختمی مرتبت کے ساتھ سلسلۂ نبوت ختم ہو گیا) اگر خدائی پروگرام کی آخری کڑی کی بھی یہ حالت ہے کہ ایک نبی ساری عمر دعوت حق میں اپنا سر کھپا دے اور ایک آدمی بھی اس پر ایمان نہ لائے تو (معاذ اللہ، معاذ اللہ) خدائی پروگرام کی اس سے زیادہ ناکامی اور کیا ہو گی؟ یہ مودودی صاحب جیسے دیدہ دلیروں کی ہفوات کا نتیجہ تھا جو، جوش ملیح آبادی جیسوں کو یہاں تک کہنے کی جرأت ہو گئی کہ

عظیم الشان پیمبروں کی حسرتناک تاریخیں اور ان کی پاک زندگی کے حوصلہ شکن حالات ہمارے سامنے ہیں۔ (کلیم۔ بابت نومبر ۱۹۳۷ء)

اور اس حد تک دریدہ دہنی کی جسارت کہ (توبہ، توبہ، نقل کفر، کفر نہ باشد) جس خدا کی "ضرب آخر" بھی اُچٹ کر رہ گئی!

اگر حضرات انبیاء کرام ؑ کی بھی بقول مودودی صاحب، یہ حالت تھی کہ ساری عمر کی دعوت کے بعد ایک شخص بھی اُن کا ہمنوا نہ ہو سکا، تو منصب خداوندی کے اچٹ کر رہ جانے کی اس سے زیادہ واضح شہادت اور کیا ہوگی! (استغفراللہ)

یہ دونوں ایک ہی قدح سے بہکے ہیں۔ (طلوع اسلام فروری ۱۹۷۱ء) صفحہ ۷۰ تا ۸۰

اور یہ ہے وہ مشک آمیز افیون جو حضرت سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب اپنے معتقدین متفقین اور قارئین کو پیمانۂ اسلام میں دے رہے ہیں جس کے سبب آہن عصب اور کفر شکن فرزندان اسلام کے یقین و ایمان کو متزلزل کیا اور دین خداوندی کو غیر یقینی سا بنایا جا رہا ہے۔ یہ گردش تقدیر ہے کہ جن لوگوں نے اس اسلامی مملکت کے حصول و بقا کے لئے فکر اقبال ؒ کو عام کیا۔ اسلامیان دنیا کی کم نگہی اور بے نیازی نے انہیں گوشۂ گمنامی اور عالم بدنامی میں پھینک دینے کی کوشش کی اور اس حسن بن صباحِ اسلام کو (حمید نظامی مرحوم و مغفور کے الفاظ میں)، یہاں برومند کرنے کے لئے ہوسِ سیم و زر کا شکار ہو کر اسے کے حمایتی بن بیٹھے۔ یہ ہے مذہبی آمر کی ساحری جس سے ہمارے رفقائے تحریکِ قیام پاکستان میں کئی ایک مسحور اور بے چارے کئی ایک مجبور ہوئے۔

(چوہدری حبیب احمد)

مودودی اور قرآن

"مودودی اور قرآن" کے عنوان سے جناب محمد عبدالوہاب خاں قادری رضوی نے مکتبہ رضویہ۔ گجرات سے ایک پمفلٹ شائع فرمایا ہے صفحہ ۱۲ پر رقمطراز ہیں۔

مودودی صاحب کی آتشِ قہر نے مسلمانوں کو اور ان کی قلم کی مار نے بزرگانِ دین کو نشانہ بنایا جس کی تفصیل کے لئے دفتر درکار ہیں۔ یہاں بطور نمونہ مشتے از خروارے سپردِ قلم کیا جاتا ہے۔ اپنی کتاب "تجدید و احیائے دین" میں لکھتے ہیں۔

"جاہلیتِ مشرکانہ نے عوام پر حملہ کیا اور توحید کے راستے سے ہٹا کر ان کو ضلالت کی بے شمار راہوں میں بھٹکا دیا۔ ایک صریح بُت پرستی تو نہ ہو سکی باقی کوئی قسم شرک کی ایسی نہ رہی جس نے مسلمانوں میں رواج نہ پایا ہو"۔ (مطبوعہ لاہور، ص ۳۹)

سب جانتے ہیں کہ ایمان کا دارومدار "توحید و رسالت" پر ہے جو توحید سے

بٹ گیا وہ کافر ہو گیا۔ مودودی صاحب ایک مرتبہ بُت پرستی کے سوا شرک کی تمام اقسام مسلمانوں میں بتاتے ہیں جس سے واضح ہوا کہ عام مسلمان کافر و مشرک ہیں اور صرف یہ آج ہی کے مسلمان مشرک کیوں ہیں ؟ مودودی صاحب صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم کو بھی معیاری مسلمان نہیں سمجھتے۔ ماوشما تو کجا۔ فرماتے ہیں :۔

" حقیقت یہ ہے کہ عامی لوگ نہ کبھی عہد نبوی ؐ میں معیاری مسلمان تھے اور نہ اس کے بعد ان کو معیاری مسلمان ہونے کا فخر حاصل ہوا "

(تفہیمات حصہ اوّل صفحہ ۳۷۹)

ظاہر ہے کہ عہد نبوی ؐ میں جو بھی مسلمان ہوئے صحابی کہلائے، مگر مودودی صاحب کی عیب جو نگاہ ان کو بھی معیاری مسلمان نہیں دیکھتی، بزرگان دین کے بارے میں ان کے فتوے ان کی کتابوں میں کثرت سے ہیں۔ مثلاً حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ، کے بارے میں فرماتے ہیں :۔

" پہلی چیز مجھ کو حضرت مجدد الف ثانی کے وقت سے شاہ صاحب (شاہ ولی اللہ) اور ان کے خلفاء تک کے تجدیدی کام میں کھٹکتی ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے تصوف کے بارے میں مسلمانوں کی بیماری کا پورا اندازہ بھی نہیں لگایا اور نادانستہ ان کو پھر وہی غذا دیدی جس سے مکمل پرہیز کی ضرورت تھی۔

(تجدید و احیائے دین صفحہ ۱۱۹)

اس عبارت میں حضرت مجدد الف ثانی ہی نہیں بلکہ شاہ ولی اللہ صاحب اور ان کے خلفاء شاہ عبدالعزیز صاحب وغیرہ ہم دین کے سب سمجھنے والوں کو نشانہ بنایا۔ جن حضرات نے مسلمانوں کو دین اس کی اصل کے مطابق پہنچایا، دین کی تجدید کی ذمہ داری سنبھالی۔ خدا و رسول خدا کے احکام و ارشادات کو اہل اسلام کے قلوب و اذہان پر راسخ کیا۔ مودودی صاحب ان کے خلاف فتویٰ بازی کا نیا ریکارڈ قائم کر رہے ہیں۔

حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی عظمت اور جلالت علمی سے مسلمان خوب واقف ہیں۔ ان کے بارے میں لکھتے ہیں :۔

" امام غزالی کے تجدیدی کام میں علمی اور فکری حیثیت سے چند نقائص بھی تھے

اور وہ تین عنوان پر تقسیم کئے جا سکتے ہیں۔ ایک قسم اُن نقائص کی جو حدیث کے علم میں کمزوری ہونے کی وجہ سے ان کے کام میں پیدا ہوئے۔ دُوسری قسم ان نقائص کی جو ان کے ذہن پر عقلیات کے غلبہ کی وجہ سے تھے اور تیسری قسم ان نقائص کی جو تصوّف کی طرف ضرورت سے زیادہ مائل ہونے کی وجہ سے تھے۔" (الفیاء ص ۷۲ - ۷۳)

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ مسلمانوں کے مسلّم امام اور ولی کامل تھے۔ ان کی جلالتِ علمی کا آفتاب آج بھی چمک رہا ہے مگر مودودی صاحب کو ان میں نقائص ہی نقائص نظر آتے ہیں۔ ؎

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم ۔ چشمۂ آفتاب راچہ گناہ!

ان کی عظمت، شان اور تبحرِ علمی دیکھ کر مودودی صاحب کے سینہ میں آتش حسد بھڑکی اور سیاہی کی شکل میں یہ کلمات ظاہر ہوئے یعنی ایک ذرّے نے آفتاب کے منہ آنے کی کوشش کی، لکھتے ہیں:۔

" امام غزالی کے نام ہی سے لوگ مرعوب ہیں۔ وہ چاہیں انہیں جو کچھ بنا دیں وہ فلسفہ یونان کے چکر سے آخر تک نہ نکل سکے۔ انہوں نے حقیقتِ نبوّت کو سمجھنے میں غلطی کی۔" (جماعت اسلامی، صفحہ ۲۰ مطبوعہ سکھر۔ بحوالہ ترجمان القرآن جلد ۸، صفحہ ۳۴۴) صفحہ ۱۲ تا ۱۴۔ از مودودی اور قرآن :۔

کوئی ایسا نہیں جس کو مودُودی کے قلم نے زخمی نہ کیا ہو!

جناب محمد عبدالوہاب خاں قادری رضوی "مودُودی اور قرآن" کے صفحہ ۱۶ پر تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

اللہ تعالیٰ نے تمام صحابہ سے راضی ہونے کی بشارتِ جلیلہ دے رہا ہے۔ ان کی عظیم کامیابی کی خبر سنا رہا ہے مگر مودُودی صاحب کا نشترِ قلم کسی اللہ کے پیارے کو نہیں چھوڑتا۔ خدا جنہیں نبوّت و رسالت سے نواز چکا ہے یا جن سے راضی ہو گیا یا جن کا دوست بن گیا ان میں سے کوئی ایسا نہیں جس کو مودودی کے قلم نے زخمی نہ کیا ہو۔ انبیاء و مرسلین بھی ان کے قلم کی زد سے محفوظ نہ رہتے۔ اگر وہ عام و خاص کی تفریق کی بناء پر عوام صحابہ کو معیاری مسلمان نہ ہونے کا حکم جاری فرماتے ہیں تو جن کو

ی چھ کر اس وقت بچایا تھا، ان کی عظمت کو مجروح کئے بغیر نہ چھوڑا۔ خالد بن ولید
اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں لکھتے ہیں :۔

" اسلام کی عاقلانہ ذہنیت کسی ضعیف سے ضعیف غیر اسلامی جذبہ کی شرکت
گوارا نہیں کر سکتی اور اس معاملہ میں اس قدر نفس کے میلانات سے متنفر ہے
ضرت خالد جیسے صاحب فہم انسان کو اس کی تمیز مشکل ہو گئی۔

(ترجمان القرآن۔ ربیع الثانی ۱۳۵۷ھ)

یہ وہ خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں جن کو " سیف اللہ" کا خطاب
ان کے بارے میں مودودی صاحب کی عبارت ایک رندانہ جسارت ہے۔

(مودودی اور قرآن صفحہ ۱۶)

انبیا و مرسلین کے بارے میں بدتہذیبیاں

انبیاء علیہم السلام وحی آنے سے پہلے جو علم رکھتے تھے اس کی نوعیت عام
ی علوم سے کچھ مختلف نہ ہوتی تھی۔ (رسائل و مسائل حصہ اوّل صفحہ ۲۵)
سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں مودودی صاحب رقمطراز ہیں :۔

" نبی ہونے سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بھی ایک بہت بڑا
ہو گیا تھا" (ایضاً صفحہ ۲۸) جبکہ انبیاء علیہم السلام کا معصوم ہونا قبل از
ایمانی و ایقانی مسئلہ ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ ۝ (پارہ سورۃ البقرہ)
میرا عہد ظالموں کو نہیں پہنچتا" بقول مودودی صاحب، اگر وہ ظالم (یعنی
گار) تھے تو نبوت کیسے مل گئی۔

مندرجہ بالا عبارت میں مودودی صاحب نے موسیٰ علیہ اسلام کو بہت بڑا
کرنے والا کہا۔ ایک دوسری جگہ تحریر کرتے ہیں :۔

" یہ کیا بات ہوئی کہ ایک ملنگ ہاتھ میں لاٹھی لئے آ کھڑا ہوا۔ اور
کہ میں رب العالمین کا رسول ہوں (ترجمان القرآن مئی ۱۹۶۵ء صفحہ ۳۴)
جگہ لکھتے ہیں :۔ " پھر اس اسرائیلی چرواہے کو دیکھئے" (تفہیمات

حصہ اوّل، صفحہ ۲۹۴)

مودودی صاحب حضرت موسیٰ علیہ السّلام کو ملنگ، بڑا گناہ کرنے والا اور اسرائیلی چرواہا لکھیں اور اللہ عزوجل موسیٰ علیہ السلام کی شان میں فرماتا ہے:
" یاایھا الذین امنوا لا تکونوا کالذین اٰذوا موسیٰ فبرّاہ اللہ مما قالوا ط وکان عند اللہ وجیھا ہ (پارہ ۲۲، سورۃ احزاب)

یعنی اے ایمان والو! ان جیسے نہ ہو جانا جنہوں نے موسیٰ کو ستایا۔ تو اللہ نے اسے بری فرما دیا۔ اس بات سے جو انہوں نے کہی اور موسیٰ اللہ کے ہاں آبرو والا ہے" وہاں وہ لوگ موسیٰ علیہ السّلام کے ستانے والے تھے جن کا ذکر اللہ نے فرمایا۔ یہاں مودودی صاحب موسیٰ علیہ السلام کی شان اقدس میں طرح طرح کی گستاخیاں کر کے ان کو ستا رہے ہیں۔ بلکہ یہ ان کی یہ لڑائی تو خداوند کریم و قدوس سے معلوم ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ عزوجل ان کو آبرو والا بتائے اور یہ "گناہ گار" "ملنگ" اور "اسرائیلی چرواہا" لکھیں۔

حضور اقدس و اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں

حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں مودودی صاحب تحریر فرماتے ہیں: " اس اَن پڑھ صحرانشین نے حکمت اور دانائی کی باتیں کہنا شروع کر دیں " (ایضاً صفحہ ۲۴۴)

اور لکھا

" جو ایک اَن پڑھ بدوی کو ایک ملک کا نہیں تمام دنیا کا ایک زمانہ کا نہیں تمام زمانوں کا لیڈر بنا دے " (ایضاً صفحہ ۲۴۱)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

" غور کیجئے کہ چودہ سو برس پہلے کی تاریک دنیا میں عرب جیسے تاریک تر ملک کے ایک گوشہ میں ایک گلہ بان اور سوداگری کرنے والے اَن پڑھ بادیہ نشین کے اندر یکایک اتنا علم اتنی روشنی اتنی طاقت اتنے کمالات اتنی زبردست تربیت یافتہ قوتیں پیدا ہو جانے کا کون سا ذریعہ تھا۔؟ (ایضاً صفحہ ۲۵۴)

ایک اور مقام پر مودودی صاحب لکھتے ہیں :
" یہ قانون جو ریگستان عرب کے ایک ان پڑھ چرواہے نے دنیا کے سامنے
پیش کیا ہے" (کتاب پردہ صفحہ ۱۵۰)
مودودی صاحب کی بدتہذیبی اور گستاخی ملاحظہ ہو کہ صاحب محبوب و مفخر
موجودات، سید الانس والجان کے بارے میں کہیں " ان پڑھ بدوی"، کہیں
ان پڑھ چرواہا تحریر کر رہے ہیں اور برابر شائع کرا رہے ہیں اور کچھ لوگ
انہیں " مفکر اسلام"، کہتے ہیں۔ یہ اسلام ہے کہ اس شخصیت کی تضحیک میں
زبان و قلم کو بگٹٹ چھوڑ دیا جائے۔ جس کی ثناء و مدحت کا نام قرآن پاک ہے
جس کا مداح خود خالق و مالک حقیقی ہے۔
یہ مودودی صاحب کے دل کا روگ، حسد، بغض اور عداوت کی دلیل ہے
کہ ایسے اللہ کے محبوب، دونوں عالم کے تاجدار، مالک رقاب الامم، شفیع المذنبین
و رحمتہ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم جن کی نعت اللہ عزوجل قرآن میں فرمائے اور
طرح طرح کے خطابات سے خطاب فرمائے، کہیں یٰسین، کہیں مزمل، کہیں
مدثر، کہیں یا ایھا النبی، کہیں یا ایھا الرسول، کہیں رحمت للعلمین، کہیں بالمومنین
روف الرحیم فرمائے اور مسلمانوں کو حکم فرمائے۔
لَا تَجْعَلُوْا دُعَاءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَاءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا (سورۃ النور)
یعنی رسول کے پکارنے کو آپس میں ایسا نہ ٹھہرالو جیسا تم ایک دوسرے
کو پکارتا ہے۔ اللہ جو احکم الحاکمین ہے اس کو بھی یہ گوارا نہیں کہ آدمی جس
طرح ایک دوسرے کو پکارتا ہے۔ اس طرح اس کے پیارے رسول کو پکارا
جائے مگر مودودی صاحب کو اللہ جل مجدہٗ کے احکام سے کد ہے اس کے
محبوب سے دشمنی ہے کہ وہ توہین آمیز الفاظ سے سرکار کا ذکر کرتے ہیں۔
آگے چل کر جناب عبدالوہاب خاں رضوی تحریر فرماتے ہیں :۔
اگر کوئی مودودی صاحب کو جاہل، گنوار، نالائق، بدتمیز و ناہنجار کہہ
دے تو ان کے آگ لگ جائے۔ اگر جل کر راکھ نہ ہوئے تو کوئلہ ضرور بن
جائیں گے۔ مگر انبیائے مرسلین کی شان میں ایسے کلمات لکھتے ہوئے انہیں شرم

نہیں آتی۔ رسول دشمنی کی وجہ سے خدا کے حکم کی اتنی منہ زور مخالفت ایسے سے زیادہ اور
ہوگی۔

گوتم بدھ، کرشن، رام چندر، کنفیوشس زردشت کو اچھا کہا

اب سوال یہ ہے کہ مودودی صاحب نے ایک مسلمان سے لے کر انبیاء مرسلین تک
اللہ کے پیاروں کی جناب میں گستاخیاں کیں۔ ان کی برائیاں لکھیں تو کسی کو اچھا بھی کہا
لیکن عرض کروں گا کہ ہاں مودودی صاحب نے اچھا بھی کہا ہے مگر اپنوں کو مثلاً گوتم بدھ
کرشن، رام چندر، کنفیوشس زردشت وغیرہ کو اچھا کہا۔ مودودی صاحب گوتم بدھ کے بارے
میں لکھتے ہیں۔

"بدھ مذہب کے گہرے مطالعہ سے صرف اتنا اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس اولوالعزم
انسان نے برہمنیت کے بہت سے نقائص کی اصلاح کی تھی"

(تفہیمات حصہ دوم صفحہ ۱۱)

جائے غور ہے کہ سرکار دوعالم و ہادیٔ اعظم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو ان پڑھ چرواہا
کہا اور گوتم بدھ کو اولوالعزم انسان بنایا جارہا ہے۔ رام چندر کے بارے میں لکھتے ہیں:

"رامائن کے مطالعہ سے صاف مترشح ہوتا ہے کہ رام چندر جی محض ایک انسان تھے
نیک دلی، انصاف، شجاعت، فیاضی، تواضع، حلم اور ایثار میں کمال کا مرتبہ تو انہیں
ضرور حاصل تھا۔ مگر الوہیت کا شائبہ تک ان میں نہ تھا" (ایضاً صفحہ ۱۱-۱۲)

یہاں رام چندر جی کی صرف الوہیت (یعنی خدا ماننے کا) انکار کیا۔ باقی صفات
مذکورہ ان کے مرتبۂ کمال کا خطبہ دیا۔ کرشن کے بارے میں لکھتے ہیں:

"سری کرشن اس معاملہ میں ان دونوں سے زیادہ مظلوم ہیں۔ بھگوت گیتا تحریف و
تنسیخ کے کئی عملوں سے نکل کر جس شکل میں ہم تک پہنچی ہے اس کے عمیق مطالعہ سے
کم از کم معلوم ہوتا ہے، کرشن جی ایک موحد تھے" (ایضاً صفحہ ۱۲)

قرآن و حدیث میں تو کرشن و رام چندر کا ذکر صراحتہً نہیں ہے البتہ امام ربانی
مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کا ذکر کیا ہے ملاحظہ ہو مکتوبات
امام ربانی جلد اول، مکتوب صد شصت و ہفتم۔

"رام و کرشن دیانند آنہا کہ الٰہیہ ہنود اند از کمینہ مخلوقات و لے اند واز مادر و پدر

زائیدہ اندرام پسر جسرت و برادر لچھمن و شوہر سیتارام زوجہ خود را نگاہ نتواند داشت غیرے را چہ مدد نماید۔

ترجمہ ۔ یعنی رام وکرشن اور ان کے سوا ہندوؤں کے جو اور دیوتا ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ذلیل ترین مخلوق میں سے ہیں اور ماں باپ سے جنے ہوئے ہیں رام جسرت کا بیٹا اور لچھمن کا بھائی اور سیتا کا شوہر ہے جبکہ رام خود اپنی بیوی کو نہیں بچا سکا تو کسی دوسرے کی مدد کیا کرے گا۔ پھر اسی مکتوب میں فرماتے ہیں :۔

اٰلہیہ ہنود خلق رالعبادت خود تلقین کردہ اند خود را آلہ دانستہ ہرچند پروردگار قائل اند ما او را در خود حلول و اتحاد اثبات کردہ اند واز یں جہت خلق رالعبادت خود می خوانند وخود را الہ گویانیدہ اند در محرمات بے تحاشی افتادہ بزعم آنکہ الہٰ از ہیچ چیز ممنوع نیست او خلق خود ہر تعرفے کہ خواہد بکند اقسام ایں تخیلات فاسدہ بسیار دارند ضلوا فاضلوا۔

" یعنی ہندوؤں کے ان دیوتاؤں نے مخلوقات کو خود اپنی عبادت کرنے کی ترغیب دلائی ہے اور اپنے آپ کو انہوں نے معبود سمجھا ہے اگرچہ پروردگار کے قائل ہیں لیکن انہوں نے اپنی ذات میں اس کا حلول واتحاد ثابت کیا ہے اور اسی وجہ سے وہ مخلوقات کو اپنی عبادت کی طرف بلاتے ہیں اور اپنے آپ انہوں نے معبود کہلوایا ہے اور حرام کاریوں میں بے تحاشا مبتلا ہوئے ہیں۔ اس گمان پر کہ معبود کو کوئی چیز ناجائز نہیں ہے۔ اپنی مخلوقات میں جو تصرف چاہے کرے۔ وہ خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی انہوں نے گمراہ کیا۔

(مودودی اور قرآن صفحہ ۴۲ تک)

ہم نے مودودی اور قرآن کے اقتباسات نذرِ قارئین کئے۔ یہ کتابچہ سگِ درگاہِ رضویت محمد عبدالوہاب خاں نے مکتبہ رضویہ گجرات سے شائع کیا۔ اس کتاب میں جو پیشِ ملت کی جارہی ہے۔ اس ضمن میں ناظرین کرام کو بہت کچھ مواد ملے گا۔ جناب سید ابوالاعلیٰ مودودی (مفکرِ اسلام) نے تو مسلمانوں کے دشمن دانا گاندھی کی سیرت بھی لکھی تھی۔ جو بوجوہ شرمندۂ اشاعت نہ ہو سکی مودودی صاحب کے گستاخ قلم نے جگہ جگہ عظمتِ رسول ؐ کو داغدار کیا ہے۔ ان کی گستاخیاں بدتہذیبیاں اور بدتمیزیاں ان کے لٹریچر میں ہر طرف بکھری

ہوئی نظر آئیں گی۔ یہ تو شپرہ چشم ہیں جنہیں ان کی رفقائے رسولؐ۔ مردانِ خدا اور خود انبیائے کرام علیہم السلام کی عیب جوئیاں دکھائی نہیں دیتیں اور اندھی عقیدت انہیں صداقت سوزی کے جہنم کی طرف گھسیٹے لے جا رہے ہیں۔

رضوی صاحب! "آپ تو کہہ رہے ہیں کہ اگر کوئی مودودی صاحب کو جاہل گنوار، نالائق، بدتمیز و ناہنجار کہہ دے تو ان کے آگ لگ جائے"؛ کیا بتائیں۔

شیطان کو رجیم کہہ دیا تھا اک دن
اک دھوم مچی ہے کہ خلافِ تہذیب ہے یہ

مودودی صاحب کے حلقۂ اثر کا یہ تاثر ہے کہ انہیں سب کو سب کچھ کہنے دو۔ یہ چاہیں تو انبیائے کرام کی رفعت و عظمت کو گھٹائیں۔ رفقائے رسول (والذین معہ) کے اعلیٰ کردار اور پاکیزہ کیریکٹر میں کیڑے ڈالیں۔ مردانِ خدا کو اپنے گستاخانہ کلمات سے نوازیں لیکن اس سب کہہ ڈالنے والے کو کچھ نہ کہا جائے۔ انہیں حضرت قائد اعظمؒ اور ان کے رفقاء میں سے کسی کی اسلامی ذہنیت اور ان میں اسلام کی چھینٹ تک نظر نہ آئے پھر بھی ان کو یہ حق دیا جائے کہ ان کی تمام مخالفت کے علی الرغم حاصل کردہ پاکستان میں ان کی چھاپ کے اسلام کو نافذ کرنے کی انہیں اجازت دی جائے۔

(چودھری حبیب احمد)

مودودی صاحب نے اَب تک ریڈیو سے تین مختلف ادوار میں تقریریں نشر کی ہیں:-

(۱) آل انڈیا ریڈیو سے انگریز کے زمانے میں
(۲) پاکستان ریڈیو سے قائد اعظم کے عہد حکومت میں
(۳) پاکستان ریڈیو سے صدر ایوب کے زمانے میں

گیارہ تقریریں مودودی صاحب نے آل انڈیا ریڈیو سے نشر فرمائیں جو ترجمان القرآن اگست ۱۹۵۱ء میں شائع ہوئی ہیں اور سات تقریریں قائد اعظم کے عہدِ حکومت میں، جن میں سے پانچ ان کی کتاب "اسلام کا نظام حیات" میں شامل ہیں اور دو ترجمان القرآن کے اسی مذکورہ بالا شمارہ میں اس کے علاوہ تین یا چار

تقریریں آپ نے صدر ایوب کے زمانہ میں نشر کی ہیں۔
اب اگر ریڈیو سے مذہبی تقاریر کا نشر ہونا اس دور کے سربراہ مملکت سے تعلقات کی دلیل ہے تو سب سے زیادہ مستحکم تعلقات تو موصوف کے انگریز بہادر سے ثابت ہوتے ہیں جن کے زمانہ میں وہ تین چار مرتبہ ریڈیو پر تشریف لائے۔ ہم مودودی صاحب اور ان کے پرستاروں سے دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ کیا وہ اپنی منطق کے نتیجہ میں پیدا ہونیوالے اس نقشۂ احوال کو قبول کرنے کے لئے تیار ہیں؟
اصل میں بات صرف اتنی ہے کہ پاکستان ریڈیو کی طرف سے پروگراموں کے لئے جو کنٹریکٹ فارم بھیجا جاتا ہے خواہ وہ کسی مغنیہ کو بھیجا جائے یا کسی قوال اور کسی عالم کو اس پر یہ الفاظ چھپے ہوتے ہیں کہ "یہ معاہدہ ریڈیو کا ڈائریکٹر جنرل ڈائریکٹر پریزیڈنٹ آف پاکستان کی طرف سے کر رہا ہے"۔ جب قائد اعظم گورنر جنرل تھے تو اس زمانے میں ڈائریکٹر صاحب یہ معاہدہ گورنر جنرل آف پاکستان کی طرف کیا کرتے تھے بس اتنی سی بات ہے میاں طفیل محمد صاحب نے یہ سمجھ لیا کہ ہمارے مولانا سے یہ تقریریں براہ راست قائد اعظم مرحوم کے احکام سے کرائی جارہی ہیں
مودودی صاحب[1] نے قائد اعظم کے زمانہ میں ریڈیو پاکستان سے آخری مرتبہ ۱۹۴۸ء میں اپنی گفتگو فرمائی۔ اس گفتگو میں انہوں نے پاکستان کے لئے ایک مذہبی ریاست کا خود ساختہ نقشہ پیش فرمایا۔ وہ سراسر ناقابل عمل اور تھیاکریسی کا ایک جدید چربہ تھا۔ اس پر مودودی کا داخلہ ریڈیو پاکستان میں بند ہو گیا اور اس کے بعد آپ کو قائد اعظم کی زندگی کے بقیہ چار پانچ مہینوں میں کبھی ریڈیو پر زحمت نہیں دی گئی۔

("مودودیت عوامی عدالت میں" صفحہ ۹۸ تا ۱۰۰۔ از مولانا کوثر نیازی)

---

[1] جماعت اسلامی کو قائد اعظم کی شخصیت کے ساتھ جو غیر معمولی تعلق ہے اس کا مجھے ذاتی تجربہ بھی ہے۔ "قیم" جماعت اسلامی حلقہ لاہور ہونے کے زمانے میں ایک مرتبہ میں یوم قائد اعظم کے ایک جلسہ میں تقریر کر بیٹھا اس پر مودودی صاحب کی ہدایات کے مطابق امیر حلقہ لاہور ملک نصر اللہ خاں عزیز نے مجھ سے باقاعدہ جواب طلبی کی اتفاق سے انہی دنوں میں ملک صاحب خود یوم (عبدالمجید) سالک پر تقریر کر چکے

تھے۔ میں نے کہا ملک صاحب اگر یوم سالک پر تقریر کرنا جائز ہے تو یوم قائداعظم پر تقریر
کرنا کیسے ناجائز ہو گیا لیکن ملک صاحب کا کہنا یہی تھا کہ دوسری شخصیتوں کے یوم منا
لو کوئی ایسی بات نہیں لیکن قائداعظم کا یوم یقیناً غلط ہے اس موقع پر مجلس شوریٰ کے ایک
رکن بھی موجود تھے اور مجھے یقین ہے کہ اگر ملک صاحب نے اس واقعہ کی تردید کی تو وہ
صاحب جماعت میں ہونے کے باوجود اس واقعہ کی تصدیق کریں گے۔ (ک۔ ن)

ظاہر ہے کہ ملک نصراللہ خاں عزیز نے اپنی حیاتِ مستعار میں اس واقعہ کی تردید
نہیں کی۔ اب وہ اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ (مرتب)

باب ۱۸

تفہیم القرآن پر تنقیدات

ضیائے کنز الایمان "ضیائے کنز الایمان" جسے حضرت مولانا غلام رسول سعیدی نے مرتب کیا اور جو مرکزی مجلس رضا لاہور نے شائع کی، اس کے پیش لفظ میں جناب مولانا عنایت اللہ چشتی رقمطراز ہیں:۔ "میرا قلم تو بارہا حرکت میں آیا ہے لیکن آج ایک ایسے موضوع پر جنبش میں آیا ہے کہ :۔

ع میرے نطق نے بوسے میری زباں کے لیے

والا معاملہ ہے۔ میرا پیش نظر موضوع محاسن کنز الایمان ہے اور میں محسوس کر رہا ہوں کہ فی الواقع آج تک یہ موضوع تشنۂ تحقیق رہا ہے۔ کنز الایمان اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خاں بریلوی نور اللہ مرقدہٗ کا ترجمہ قرآن ہے۔ یہ ترجمہ ۱۹۱۱ء میں طبع ہوا۔ مولانا محمود حسن اور مولانا اشرف علی تھانوی کے تراجم اس کے بہت بعد منظر عام پر آئے لیکن مقام افسوس ہے کہ اعلیٰ حضرت بریلوی کے تراجم آج تک علمی دنیا کے سامنے پیش نہیں کیے گئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ اعلیٰ حضرت کے محبین کا تساہل اور تغافل ہے۔ کہ آج اردو خواں طبقہ اس بات سے بھی آشنا نہیں کہ ترجمۂ قرآن کے سلسلے میں اعلیٰ حضرت نے بھی قابل قدر خدمات سرانجام دی ہیں۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ انہوں نے کنز الایمان کے نام سے قرآن حکیم کے حقائق و معارف کو حسین ترین اردو میں منتقل کیا تھا۔ تاج کمپنی قابل تحسین ہے کہ اس نے اس ایمان افروز ترجمہ کو شائع کرکے اہل ایمان پاکستان کو اس سے روشناس کرایا۔ خوش قسمت ہے کالا باغ کی سرزمین جس نے ملک شیر محمد خان جیسا انسان پیدا کیا اور انتہائی خوش ہے وہ گھرانہ جس کے حصہ میں کنز الایمان کے محاسن بیان کرنے کی سعادت آئی۔

ملک صاحب دنیائے علم و ادب میں ایک معروف شخصیت ہیں۔ ان کی بہت سی محاسن تصانیف منظر عام پر آکر اہل علم و تحقیق سے خراج تحسین وصول کر

چکی ہیں لیکن میرے نزدیک اُن کی تصنیف محاسن کنز الایمان ان کا عظیم ترین شاہکار ہے۔ اور انشاء اللہ العزیز یہی تصنیف ان کی آخرت کی فیروز مندی کا باعث ہوگی۔
اعلیٰ حضرت پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لکھنے والوں میں بلند پایہ علماء بھی ہیں اور ادباء بھی لیکن کنز الایمان کے محاسن پر کسی کو قلم اٹھانے کی توفیق نہیں ہوئی۔ اگر اس موضوع پر کسی نے کچھ لکھا بھی تو وہ اتنا وقیع نہیں ہے غرض یہ موضوع آجتک منتظر تحقیق رہا۔ ملک صاحب نے اس موضوع پر ایسے انداز سے قلم اٹھایا ہے کہ فی الواقع موضوع کا حق ادا کر دیا ہے۔ تراجم کا تقابلی مطالعہ نہتاتی دقیق اور کٹھن کام ہے۔ اس کے لیے برسوں کی محنت شاقہ اور سعی عمیق درکار ہے۔
ملک صاحب کے اس کارنامے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ پورے قرآن مجید اور اس کے اردو تراجم پر بیک وقت گہری نظر رکھتے ہیں۔

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ،

آگے چلکر

جناب ماہر القادری صاحب نے اپنے ماہنامہ فاران بابت مارچ ۱۹۷۶ء میں ملک صاحب کی متذکرہ تالیف محاسنِ کنز الایمان پر ایک طویل تبصرہ کیا ہے۔ میں نے پوری غیر جانبداری سے ان کے تبصرہ کا مطالعہ کیا ہے۔ اور اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ انہوں نے کاغذ اور سیاہی کا بڑا ذخیرہ انتہائی بے دردی سے ضائع کرنے کے بعد اپنے لیے کوئی توشۂ آخرت تیار نہیں کیا۔ بلکہ اپنی گمراہی فکر و نظر، اور کجروئ عقیدہ کا بھونڈا مظاہرہ کیا ہے۔ ان کی ایک ایک سطر ان کی علمی و فکری بے مائیگی اور گردہی تعصب کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ سوال تو یہ ہے کہ ماہر القادری صاحب اس موضوع پر قلم اٹھانے کی اہلیت بھی رکھتے ہیں یا نہیں۔ ان کا منبع علم کیا ہے؟ چھوٹا منہ بڑی بات والا معاملہ ہے۔ کیونکہ ماہر القادری صاحب کسی دینی مدرسہ سے فارغ التحصیل نہیں شعر و شاعری کی وادیوں میں بھٹکتے ہوئے فلمی گیت لکھتے ہوئے اور فلمی نگار خانوں کے چکر کاٹتے ہوئے یکایک محدث اور مفسر بن بیٹھے ہیں۔ شاہ عبدالحق محدث امام ربانی مجدد الف ثانی سرہندی اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی جیسے جلیل القدر عارفان و عالمانِ اسلام کے

تصانیف پر دھڑلے سے تنقید کرنا ان کا معمول بن چکا ہے۔ ان کو یہ "فیض" مولانا مودودی کی تصانیف سے حاصل ہوا ہے۔

جو اولیائے امت اور صلحائے ملت پر تنقید کرتے کرتے اسقدر آگے نکل چکے ہیں کہ ان کے گستاخ قلم نے انبیائے عظام اور صحابہ کرام کے مقدس دامنوں پر بھی چھینٹے اڑانے کی ناپاک کوشش کی ہے۔ ان کی اس مجرمانہ جسارت کے خلاف تمام مکاتب فکر کے علمائے کرام کے احتجاج کی صدائے بازگشت برصغیر پاک و ہند کے کونے کونے سے سنائی دے رہی ہے۔ ان کے "فیض یافتہ" ماہر القادری بھی ان کے نقوش قدم پر چل رہے ہیں اور ان کے قلم کے وار سے متقدمین و متاخرین میں سے کوئی شخصیت نہیں بچ سکی۔ ہاں ان کی تنقید کے تیروں سے اگر کوئی محفوظ ہے تو ان کے پیشوا مودودی صاحب کی "ذاتِ بابرکات" کیونکہ انہیں ان سے اندھی عقیدت ہے۔ اس لیے انہیں مودودی صاحب کے عیب بھی ہنر معلوم ہوتے ہیں۔ اس کا زندہ ثبوت یہ ہے کہ مودودی صاحب کی رسوائے عالم کتاب "خلافت و ملوکیت" کے خلاف تمام مکاتب فکر کے علمائے کرام نے قلمی اور لسانی جہاد شروع کر رکھا ہے۔ مگر ماہر القادری صاحب کو اس میں کوئی خامی نظر نہیں آتی۔ جو لوگ اس کتاب کی تردید میں کتابیں لکھتے ہیں ـــــ ماہر القادری صاحب ان کتابوں کی تردید میں فاران کے صفحات میں اپنا سارا زور قلم صرف کر دیتے ہیں۔ خدا برا کرے اندھی عقیدت اور کورانہ ارادت مندی کا کہ انہیں جناب ذوالنورین خلیفہ راشد حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی ذات پر مودودی صاحب کے جاہلانہ ایرادات اور سراسر پر خطاکاری کے گستاخانہ الزامات تو منظور ہیں مگر یہ منظور نہیں کہ مودودی صاحب کی غلطیوں کا اعتراف کیا جائے۔ شخصیت پرستی کے ایسے اندھے مریضوں کے لیے کیا علاج کارگر ہو سکتا ہے۔ ان چیزوں کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ماہر القادری صاحب مودودی صاحب کی عصمت کے قائل ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ عصمت انبیاء کی مسلمہ تعریف کے قائل نہیں۔ اور اس عقیدہ کی اس طرح خود ساختہ تعریف کے قائل ہیں جس طرح قادیانی خاتم النبیین کی خود ساختہ تعریف کے قائل ہیں۔ علماء سواد اعظم قادیانیوں اور ماہر القادری صاحب دونوں کی خود ساختہ تعریف کو مردود سمجھتے ہیں۔

قابل توجہ مودودی صاحب کی تفسیر تفہیم القرآن کو متعدد تعبیرات و تشریحات سے علمائے سوادِ اعظم کو بیّن اختلافات ہیں۔ لیکن ماہر القادری صاحب کے نزدیک یہ بہت بڑا شاہکار[1] ہے۔ ماہر القادری صاحب نام تو کتاب و سنت کا لیتے ہیں مگر ان کے نزدیک معیارِ ردّ و قبول مودودی صاحب کا مسلک ہے کیونکہ وہ اور ان کے ساتھی یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ مودودی صاحب "مزاج شناسِ رسول" ہیں اور جس روایت کو وہ صحیح قرار دیں وہی صحیح ہے اور جس کو وہ غلط قرار دیں وہ غلط ہوگی (معاذ اللہ)

یہ مسلک وہابیت اور نیچریت کا عجیب سا ملغوبہ ہے۔

ایک اور اقتباس "جہانتک دینی کتابوں پر ماہر القادری صاحب کی تنقید کا تعلق ہے وہ اپنے نظریۂ وہابیت کی عینک سے ہر کتاب کو دیکھتے ہیں اور جو چیز ان کے نظریہ کے خلاف ہو اس پر جھٹ کتاب و سنت سے خلاف ہونے کا فتویٰ جڑ دیتے ہیں، وہ اس معاملہ میں انتہائی متعصّب واقع ہوئے ہیں۔ انہیں اپنے مخالف میں کوئی خوبی نظر نہیں آتی۔ چونکہ انہوں نے اپنی آنکھوں پر تعصّب کی سیاہ عینک چڑھا رکھی ہے اس لیے انہیں آفتاب بھی سیاہ گیند نظر آتا ہے...... انہیں معلوم نہیں کہ سوادِ اعظم کا نظریۂ توحید و رسالت وہابیت کے نظریہ سے بالکل مختلف ہے۔ اور اس نظریہ کی تائید میں اکابر علماء امّت کی ایک طویل فہرست موجود ہے...... ماہر القادری صاحب نے محاسن کنز الایمان پر جو جاہلانہ تبصرہ کیا ہے اس کا جواب فخر اہل سنت حضرت علامہ غلام رسول صاحب سعیدی نے عالمانہ انداز میں تحریر فرمایا[2] ہے۔

---

[1] ایسے ہی مودودی اللہ کا شاہکار ہے۔
اللہ کا شاہکار مودودی۔ خدائے محمد کا شاہکار تو مودودی نہیں ہو سکتا۔ (چوہدری حبیب احمد)

[2] فاضل محترم علامہ سعیدی صاحب مدظلہٗ نے یہ جواب قلم برداشتہ لکھا ہے "عارفان" ان کی خدمت میں روانہ کیا گیا تو تیسرے دن انہوں نے جواب لکھ کر دفتر مرکزی مجلس رضا میں بھیج دیا۔

مودودی صاحب کی تفسیر تفہیم القرآن کے بارے میں آپ نے جناب مولانا عنایت اللہ چشتی صاحب کی رائے ملاحظہ فرمالی۔ ہم اس سلسلہ میں جناب کے جو تنقید مودودی صاحب کی تفسیر پر کی ہے اس کے اقتباسات ملاحظہ قارئین کریں گے۔

تفہیم القرآن جلد اول مولانا مودودی کا پر ایک نظر

مجموعۂ تضادات

جناب شاہد عادل نے مولانا مودودی صاحب کی تفسیر قرآن تفہیم القرآن پر ایک خیال انگیز اور احساس خیز تنقید کی ہے۔ ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ مولانا صاحب کی علمی و دینی کاوش وکاہش اور ان کی قرآن فہمی کا یہ گوشہ بھی قارئین کرام کے سامنے لایا جائے۔ عقیدت تو اندھی ہوتی ہے لیکن وہ سعید روحیں جو ان کے پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر اس تضادات کے شاہکار کے سحر طلسم انگیز قلم کا شکار ہو چکی ہیں وہ سوچیں کہ مودودی صاحب کی تفسیر ان کے اذہان و قلوب کے رخ کو جو قرآن کریم کی حقیقی و اصلی روح کی طرف ہونا چاہیئے اس کو کس طرف پھیر رہی ہے۔ ہمیں کلام نہیں کہ مولانا پروپیگنڈہ کے فن کے ماہر اور علم الکلام کے قادر ہیں۔ اور وہ کافی حد تک عوامی ذہنوں کو متاثر کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں لیکن قدرت نے جن ارباب علم و بصیرت کو نظر میں گہرائی اور گیرائی بخشی ہے وہ بآسانی یہ نتیجہ نکال سکیں گے کہ جناب مولانا کہانتک قرآن فہم اور دین شناس ہیں۔ راقم نے اپنی کتاب کا نام "تضادات مودودی" رکھا تھا۔ کاتب صاحب کو جس رسید پر معاوضہ کتابت ادا کیا، ہمیں یہی درج ہے یہ تو بعد میں جناب صفدر سلیمی مرحوم، استاذ مکرم کے ارشادات کے مطابق کہ "امروز" نے میری اقساط پر "جماعت اسلامی کا رخ کردار" کی سرخی جاری کی تھی مجھے ان کے فرمان کی تعمیل کرنا ضروری تھی۔ اس لیے نام تبدیل کرنا پڑا۔ بہرحال اس موقع پر صرف اسی عرض پر اکتفا کیا جاتا ہے کہ آپ تفہیم القرآن کے آئینے میں مولانا کے تضادات اور قرآن کے متعلق فہم و ادراک دیکھتے چلے جائیے۔

(چوہدری حبیب احمد)

شاھد عادل رقمطراز ہیں | عرب شاعروں کا یہ دستور تھا کہ جب وہ کسی کی شان میں قصیدہ کہتے تھے۔ اور اس کی ابتدا اپنی معشوق یا حسین عورتوں کی تعریف سے کرتے تھے۔ ان عاشقانہ اشعار میں شدتِ عشق و فراق کی شکایت کرنے کے بعد ان حسین عورتوں کے ایسے ایسے اوصاف بیان کئے جاتے کہ ہر آنے جانے والا سب کچھ چھوڑ چھاڑ پوری طرح ان کی طرف متوجہ ہو جاتا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ عاشقانہ اشعار سے سب کو دلچسپی ہوتی ہے اور کوئی لاکھ چھپائے ہر سلیم الفطرت انسان کو عورت سے محبت ہوتی ہے چاہیئے یہ محبت جائز طریقے پر یا ناجائز طریقے پر۔ چنانچہ ان عاشقانہ اشعار کے ذریعے جب بہت بڑا مجمع اکٹھا ہو جاتا تو پھر شاعر اپنے ممدوح کی تعریف شروع کر دیتا اور اس کی شان اپنی معشوقہ سے بھی اونچی ثابت کر دکھاتا۔ قارئین سوچتے ہونگے کہ اس تمہید کا قرآنِ مجید کی تفسیر سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ لیکن وہ یہ سن کر حیران ہوں گے۔ کہ آج کل جماعت اسلامی والے ٹھیک اسی اصول پر عمل پیرا ہو رہے ہیں۔ اس اجمال کی تفصیل یوں ہے کہ جماعت کے آدمی بیٹھے بیٹھے ملک کے مشہور قانون دان مسٹر اے۔ کے بروہی کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملانے شروع کر دیں گے۔ کہ صاحب موصوف پاکستان کے نہ صرف سب سے اونچے قانون دان ہیں بلکہ وہ ایک عظیم مفکر اور فلسفی بھی ہیں پاکستانی دستور پر انکی کتاب دنیا کی بہترین کتابوں میں شمار ہوتی ہے وہ پاکستان کے وزیر قانون بھی رہ چکے ہیں۔ اور اقوام متحدہ میں بھی ان کی فکر کی گونج سنائی دیتی رہی ہے وغیرہ وغیرہ۔ اور اس کے بعد فوراً اپنے مطلب کی طرف آجائیں گے۔ کہ ان جیسی بین الاقوامی ہستی نے مودودی صاحب کی تفسیر تفہیم القرآن کے شان میں فرمایا ہے کہ صدیوں سے ایسی شاندار تفسیر نہیں لکھی گئی۔ اب مودودی صاحب کی تفسیر راقم کی نظر سے گزر چکی تھی اور اس میں جو کچھ ہے اس کی بناء پر راقم نے یہ دعویٰ کر دیا کہ مسٹر اے۔ کے بروہی نے تفہیم القرآن کا بالکل مطالعہ نہیں فرمایا کیونکہ اس کے مطالعہ کے بعد کوئی سلیم الفطرت آدمی اس کی تعریف نہیں کر سکتا

چہ جائیکہ پاکستان کا سب سے اعلیٰ قانونی دماغ ہو۔ چنانچہ راقم نے جن بنیادوں پر یہ دعویٰ کیا تھا انہیں قارئین کے سامنے پیش کرتا ہے۔

نئی تفسیر کی گنجائش قرآن مجید کی ہزاروں تفاسیر لکھی جا چکی ہیں اور اگر کوئی صاحبِ علم کسی زمانے میں اس پر مزید اضافہ کرنا چاہتا ہے۔ تو اس کی ضرورت اس لئے ہوتی ہے۔ کہ اس دور کے تقاضے کچھ بدل جاتے ہیں جس کی وجہ سے نئے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں وہ ان کا حل قرآن مجید کی روشنی میں پیش کرتا ہے۔ عقائد مثلاً توحید باری تعالیٰ رسالت اور معاد یعنی قیامت پر ایمان وغیرہ تو ایسے عنوانات ہیں کہ قرآن مجید کی تفاسیر ان کی تفصیلات سے بھری ہوئی ہیں اور مودودی صاحب کی تفہیم القرآن سے بھی زیادہ عمدہ طریقے پر اور زیادہ مفصّل بیان ہو چکے ہیں۔ اب ان کی تفسیر کی وجہِ جواز صرف یہ رہ جاتی ہے کہ وہ موجودہ معاشرے کو درپیش مسائل کا حل کس طرح پیش فرماتے ہیں اس لئے اختصار کو مدّنظر رکھتے ہوئے ہم بھی صرف انہی اہم مسائل کو سامنے رکھیں گے۔ جن سے ہمارے معاشرے کی خرابیوں کو دور کرنے میں مدد ملنے یا ملنے کی توقع ہو۔

نذر ماننا عام جہالت کی وجہ سے ہمارے عوام میں یہ چیز ایک دینی رسم اختیار کر چکی ہے یہ نذر اللہ تعالیٰ کے نام پر بھی مانی جاتی ہے تاہم ضعیف الاعتقاد لوگوں نے اس اجازت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے غیر اللہ کی نذر بھی ماننی شروع کر دی جو سراسر خلافِ اسلام تھی۔ چنانچہ علماء نے اس کے خلاف آواز اٹھائی وہ زیادہ تر نذر کی اسی دوسری قسم سے متعلق تھی۔ مودودی صاحب اس سلسلے میں اپنی تفسیر تفہیم القرآن جلد اوّل طبع سوم کے صفحہ نمبر ۲۰۸ پر فرماتے ہیں

"نذر یہ ہے کہ آدمی اپنی کسی مراد کے بر آنے پر کسی ایسے خرچ یا کسی ایسی خدمت کو اپنے اوپر لازم کرے جو اس کے ذمّے فرض نہ ہو۔ اگر یہ مراد کسی حلال و جائز امر کی ہو اور اللہ سے مانگی گئی ہو اور اس کے بر آنے پر جو عمل کرنے کا عہد آدمی نے کیا ہے وہ اللہ ہی کے لئے ہو

تو ایسی نذر اللہ کی اطاعت ہے اور اس کا پورا کرنا اجر وثواب کا موجب ہے"

طلوعِ اسلام کو گالی دینے کی وجہ سے مودودی صاحب کے اپنے حلقہ کے لوگوں نے انہیں (مودودی صاحب کو) عاشقِ سنت کا خطاب دے رکھا ہے لیکن یہ عاشقِ سنت جس طرح سنت سے سلوک کرتا ہے اس کا اندازہ اسی امر سے لگائیں کہ جس چیز سے رسول صلعم منع فرماتے ہیں مودودی صاحب اسے اجر وثواب کا موجب قرار دیتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت ہے :

عن ابن عمر قال نہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن النذر وقال انہ لا یرد شیئاً وانما یستخرج بہ من البخیل رواہ الجماعۃ الا الترمذی وللجماعۃ الا اباداؤد مثل معناہ من روایۃ ابی ھریرۃ (نیل الاوطار۔ علامہ شوکانی جلد ۸ صفحہ ۲۴۹)

ترجمہ :۔ حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ حضور (صلعم) نے ہر قسم کی نذر ماننے سے منع کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ کسی چیز کو لوٹاتی نہیں صرف بخیل آدمی سے کچھ رقم نکالنے کا سبب ضرور ہے۔

اس حدیث کی حیثیت کا اندازہ اس سے لگائیں کہ یہ حدیث کی مشہور چھ صحیح کتابوں (صحاح ستہ) میں سے ترمذی کے سوا سب نے اسے روایت کیا ہے۔ اور امام ابوداؤد نے اس کی تائید میں حضرت ابوہریرہ رض سے اسی مضمون کی ایک دوسری حدیث بھی نقل کی ہے۔ مودودی صاحب دعوے تو یہ فرماتے ہیں کہ سنت قرآن کی تفسیر کرتی ہے لیکن جس چیز سے حضور صلعم منع فرماتے ہیں اسے وہ اجر وثواب کا موجب قرار دیتے ہیں۔ اسے کہتے ہیں سنت سے عشق۔

قرآن وحدیث کے مطابق طلاق کا صحیح طریقہ

طلاق کے ناجائز استعمال نے جس طرح ہمارے معاشرہ کو خراب کیا ہے خود مودودی صاحب کو اس کا احساس ہے کہ

اس غلط استعمال نے ہمارے ۷۵ فیصد گھروں کو دوزخ کا نمونہ بنا دیا ہے۔
(بحوالہ حقوق الزوجین طبع ششم صفحہ ۹) چنانچہ وہ اپنی تفسیر میں قرآن وحدیث کی تعلیمات کی روشنی میں اس کا صحیح طریقہ ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں :۔

طلاق کا صحیح طریقہ جو قرآن وحدیث سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ عورت کو حالتِ طہر میں ایک مرتبہ طلاق دی جائے۔ اگر جھگڑا ایسے زمانے میں ہو جبکہ عورت ایامِ ماہواری میں ہو تو اسی وقت طلاق دے بیٹھنا درست نہیں۔ بلکہ ایام سے اس کے فارغ ہونے کا انتظار کرنا چاہیئے۔ پھر ایک طلاق دینے کے بعد اگر چاہیئے تو دوسرے طہر میں دوبارہ ایک طلاق اور دیدے ورنہ بہتر یہی ہے۔ کہ پہلی ہی طلاق پر اکتفا کرے۔ اس صورت میں شوہر کو یہ حق حاصل رہتا کہ عدت گذرنے سے پہلے جب چاہیئے رجوع کرنے اور اگر عدت گزر بھی جائے تو دونوں کے لئے موقع باقی رہتا ہے کہ پھر باہمی رضامندی سے دوبارہ نکاح کرلیں لیکن تیسرے طہر میں تیسری بار طلاق دینے کے بعد نہ تو شوہر کو رجوع کا حق باقی رہتا ہے اور نہ اس کا ہی کوئی موقع رہتا ہے کہ دونوں کا پھر نکاح ہو سکے۔ رہی یہ صورت کہ ایک ہی وقت میں تین طلاقیں دے ڈالی جائیں جیسا کہ آجکل جہلا کا عام طریقہ ہے۔ تو یہ شریعت کی رو سے سخت گناہ ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بڑی مذمت فرمائی ہے اور حضرت عمرؓ سے یہاں تک ثابت ہے۔ کہ جو شخص بیک وقت اپنی بیوی کو تین بار طلاقیں دیتا تھا آپ اس کو دُرّے لگاتے تھے۔ (صفحہ ۱۷۴)

آپ سے دریافت کیا گیا کہ آپ نے قرآن وحدیث کے مطابق طلاق کا صحیح طریقہ تو بیان فرما دیا لیکن ہمارے ہاں جو غلط طریقہ رواج پا گیا ہے۔ اسے کیسے ختم کیا جا سکتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ان خرابیوں کا سدِّباب کرنے کیلئے ضروری ہے کہ ایک ہی وقت میں تین طلاقیں دے کر عورت کو جُدا کر دینے پر ایسی پابندیاں عائد کر دی جائیں جن کی وجہ سے لوگ اس فعل کا ارتکاب نہ کر سکیں۔

(بحوالہ حقوق الزوجین۔ صفحہ ۱۵۵)

قیام پاکستان کے بعد حکومت کیلئے ممکن ہو گیا کہ وہ اس قسم کی پابندیاں لگائے لیکن جونہی یہ پابندیاں نافذ کی گئیں اور طلاق ثلاثہ بیک مجلس کو خلاف قانون قرار

دیدیا گیا۔ تو مودودی صاحب کی سیاسی مجبوریوں نے انہیں مخالفت پر مجبور کر دیا، اور قارئین حیران ہونگے کہ اپنی تفسیر تفہیم القرآن میں طلاق کے جس طریقے کو قرآن وحدیث کے مطابق قرار دیا تھا۔ یکایک اس کی مخالفت کرنے لگے اور اب قرآن وحدیث اور اپنی تفسیر کو نظر انداز کرتے ہوئے اسی صحیح طریقہ کو حنفی فقہ کے خلاف قرار دیدیا۔ انہی کی زبانی سنیئے۔ فرماتے ہیں۔

قرآن وحدیث کے مطابق طلاق کا صحیح طریقہ حنفی مذہب کے خلاف ہے

"بلاشبہ یہ چیز بعض فقہی مذاہب کے نزدیک درست ہے لیکن حنفی مذہب کے خلاف ہے۔ حنفی مذہب میں اگر تین طلاق بیک وقت دیئے گئے ہوں تو اس سے طلاق مغلّظ واقع ہو جاتی ہے اور مطلقہ عورت سے اس کا سابقہ شوہر نہ تو مدتِ عدّت کے اندر رجوع کر سکتا ہے اور نہ عدّت گزر جانے کے بعد اس کے ساتھ پھر نکاح کر سکتا ہے جب تک کہ اس کی تحلیل نہ ہو جائے ان حنفی باشندوں کو جو اعتماد امام ابوحنیفہؒ اور مذہب حنفی کے آئمہ وفقہا کے علم وتقویٰ پر ہے وہ اعتماد آجکل کے قانون سازوں پر نہیں ہے۔

(بحوالہ عائلی قوانین پر علماء کے اعتراضات۔ صفحہ ۱۸ و ۱۹)

قارئین سوچتے ہوں گے۔ کہ جس وقت مودودی صاحب نے تفہیم القرآن لکھی تھی اس وقت شاید ملک کے باشندوں کی عظیم اکثریت حنفی نہیں ہوگی کہ انہوں نے قرآن وحدیث کے مطابق طلاق کا صحیح طریقہ اپنی تفسیر میں بیان کر دیا تھا۔ نہیں یہ غلط فہمی بالکل نہیں ہونی چاہیئے اس وقت بھی ملک کے باشندوں کی عظیم اکثریت حنفی تھی۔ اور انہوں نے مودودی صاحب کی اس تفسیر پر اعتراض بھی کیا تھا۔ خیال رہے کہ مودودی صاحب کی تفہیم القرآن پہلے قسط وار ان کے رسالے ترجمان القرآن میں شائع ہوتی رہی تھی۔ لیکن مودودی صاحب نے حنفی فقہ کی تضحیک کرتے ہوئے ان حنفی علماء کو جو ڈانٹ پلائی تھی وہ خود انہی کی زبانی سنیئے :۔

حنفی فقہ کی کتابوں کی تضحیک

"قیامت کے روز حق تعالیٰ کے سامنے ان گناہگاروں کے ساتھ ساتھ ان کے دینی پیشوا بھی پکڑے ہوئے آئیں گے اور اللہ تعالیٰ ان سے پوچھے گا کہ کیا ہم نے تم کو علم و عقل سے اس لیے سرفراز کیا تھا کہ تم اس سے کام نہ لو؟ کیا ہماری کتاب اور ہمارے نبی کی سنت تمہارے پاس اس لیے تھی کہ تم اس کو لیے بیٹھے رہو اور مسلمان گمراہی میں مبتلا ہوتے رہیں۔ ہم نے اپنے دین کو آسان بنایا تھا تم کو کیا حق تھا کہ اسے مشکل بنا دو؟ ہم نے تم کو قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کا حکم دیا تھا تم پر یہ کس نے فرض کیا تھا کہ ان دونوں سے بڑھ کر اپنے اسلاف کی پیروی کرو ہم نے ہر مشکل کا علاج قرآن میں لکھا تھا۔ تم سے یہ کس نے کہا کہ قرآن کو ہاتھ نہ لگاؤ اور اپنے لیے انسانوں کی لکھی ہوئی کتابوں کو کافی سمجھو۔ اس باز پرس کے جواب میں امید نہیں کہ کسی عالم دین کو کنز الدقائق اور ہدایہ اور عالمگیری کے مصنفوں کے دامن میں پناہ مل سکے گی۔" (حقوق الزوجین ص ۹۸)

لیکن سیاست بازی نے انہیں یہ دن دکھایا کہ وہ خود یہ نعرے لگانے لگے کہ قرآن و حدیث کے مطابق طلاق کے صحیح طریقہ کو ہاتھ نہ لگاؤ۔ کیونکہ یہ حنفی فقہ کے خلاف ہے اور ساتھ ہی حنفی فقہ کی کتابوں کے مصنفوں کے دامن میں پناہ بھی لے لی۔ جن کی کسی زمانے میں وہ تضحیک کر چکے تھے۔

تحلیل یا حلالہ

طلاق ثلاثہ بیک مجلس کا حنفی فقہ کے مطابق جواز تلاش کرتے ہوئے لفظ تحلیل کا بھی ذکر تھا جس کے متعلق ہم نے اشارہ کیا تھا کہ حنفی فقہ کے مطابق اس کی تفصیل آگے آتی ہے یہ اسی "حلالہ" کا معصوم نام ہے جو طلاق ثلاثہ بیک مجلس کا فطری نتیجہ ہے۔ ہمارے معاشرے میں اس پر جس گھناؤنے طریقے سے عمل ہوتا رہا ہے، اکثر قارئین کو اس کا اندازہ ہوگا۔ یہ کوئی جاہل مولویوں کی کارروائی نہیں ہوتی تھی، بلکہ حنفی مذہب کے جن فقہا کے علم و تقویٰ کا واسطہ دے کر مودودی صاحب طلاق ثلاثہ بیک مجلس کا جواز پیش کرتے ہیں انہی کتابوں میں اس کا جواز ان الفاظ میں موجود ہے۔

وَاِذَا تَزَوَّجَهَا بِشَرْطِ التَّحْلِيْلِ فَالنِّكَاحُ مَكْرُوْهٌ لِقَوْلِهٖ عَلَيْهِ

السلام لعن الله المحلل والمحلل له وهذا هو محمله فان طلقها بعد وطيها حلت للاول لوجود الدخول فی نکاح صحیح" (هدایہ اولین مجیدی صفحہ ۳۷۶)

ترجمہ۔ یعنی اگر حلالہ کی شرط سے کسی عورت سے نکاح کیا تو یہ ایک مکروہ فعل ہے کیونکہ صلعم نے حلالہ کرنے اور کرانے والوں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت بھیجی ہے اور اس سے مراد یہی حلالہ ہے۔ تاہم اگر اس (حلالہ کے نکاح) کے بعد کوئی شخص عورت سے مباشرت کے بعد اسے طلاق دیدے۔ تو وہ پہلے طلاق دینے والے شخص کیلئے حلال ہو جائے گی کیونکہ دخول نکاح صحیح میں ہوا ہے

اب تفہیم القرآن کے مصنف حنفی فقہائے کے علم و تقویٰ کا واسطہ دیتے ہوئے اور ان کی کتابوں کے دامن میں پناہ لیتے ہوئے اسے جائز قرار دے رہے ہیں اور بے چارے یہ بھول گئے کہ کسی زمانے میں وہ اپنی تفسیر میں اس بارے میں یہ بھی لکھ چکے ہیں:۔

"احادیث صحیحہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص محض اپنی مطلقہ بیوی کو اپنے حلال کرنے کی خاطر کسی سے سازش کے طور پر اس کا نکاح کرائے اور پہلے سے یہ طے کرے کہ وہ نکاح کے بعد اسے طلاق دیدے گا تو یہ سراسر ایک ناجائز فعل ہے۔ ایسا نکاح، نکاح نہ ہوگا بلکہ محض ایک بدکاری ہوگی۔ اور ایسے سازشی نکاح وطلاق سے عورت ہرگز اپنے شوہر کیلئے حلال نہ ہوگی۔ حضرت علیؓ اور ابن مسعود، اور ابو ہریرہ اور عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہم کی متفقہ روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طریقہ سے حلالہ کرنے اور حلالہ کرانے پر لعنت فرمائی ہے" (تفہیم القرآن جلد اوّل طبع سوم صفحہ ۱۷۶، ۱۷۷)

اس مقام پر راقم کا مقصود و مطلوب یہ نہیں کہ فقہ حنفی خلاف قرآن وحدیث ہے یہاں صرف یہ دکھانا ضروری سمجھا گیا ہے کہ آپ مولانا مودودی کے حسب ضرورت تبدیل ہونے والے لاسٹک کے لچکدار اسلام کی ایک جھلک اس سنجیدہ اور اہم معاملہ میں بھی دیکھ لیں اور ان کی ہوس اقتدار ان سے کیا کیا گل کھلواتی ہے یہ نظارہ بھی کرلیں۔

(چوہدری حبیب احمد)

سمیٹتے ہوئے

"مودودی صاحب کی تفسیر "تفہیم القرآن" پر تبصرہ کیلئے یوں تو ہمیں ایک عرصہ سے قارئین کی طرف سے فرمائشیں بلکہ اصرار موصول ہو رہے تھے، لیکن جب اس تفسیر کی تکمیل کے بعد سے زیادہ سے زیادہ فروخت کرنے کے لئے جماعت اسلامی نے اس کے پراپیگنڈا کیلئے اپنے مخصوص حربے استعمال کرنے شروع کئے تو اس اصرار کی شدت اور بھی بڑھ گئی۔ لیکن اس کے باوجود ہم نے اس پر قلم اٹھانے کی ضرورت نہ سمجھی۔ اس کی بڑی وجہ ایک تھی۔ ہماری تفاسیر کے متعلق عام شکایت چلی آ رہی ہے کہ ان میں اسرائیلیات کی خرافات اور دیگر ہر قسم کا رطب و یابس بھرا ہوتا ہے یہی کیفیت مودودی صاحب کی تفسیر کی بھی ہے فرق صرف اتنا ہے کہ انہوں نے اس میں زبان اس جرنلزم کی استعمال کی ہے جس فن کے وہ ماہر ہیں لہذا اس تفسیر پر کما حقہ، تبصرہ کرنے کیلئے ضروری ہے کہ ان تمام مقامات کو سامنے لایا جائے جو ان خرافات کے حامل ہیں اور ایسا کرنے کے لئے ظاہر ہے کہ ایک مستقل کتاب لکھنے کی ضرورت ہو گی۔ اور اس قسم کے طویل کام کیلئے ہمارے پاس وقت کہاں؟ ان خرافات کی ایک مثال ملاحظہ فرمایئے سورۃ بقرۃ میں ہاروت و ماروت کا ذکر آتا ہے۔ اس کی تفسیر میں مودودی صاحب لکھتے ہیں:-

"اس کی تاویل میں مختلف اقوال ہیں مگر جو کچھ میں نے سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ جس زمانے میں بنی اسرائیل کی پوری قوم بابل میں قیدی اور غلام بنی ہوئی تھی اللہ تعالیٰ نے دو فرشتوں کو انسانی شکل میں ان کی آزمائش کے لئے بھیجا ہو گا جس طرح قوم لوط کے پاس فرشتے خوبصورت لڑکوں کی شکل میں گئے تھے۔ اسی طرح بنی اسرائیل کے پاس وہ پیروں اور فقیروں کی شکل میں گئے ہوں گے۔ وہاں ایک طرف انہوں نے بازار ساحری میں اپنی دوکان لگائی ہو گی اور دوسری طرف وہ اتمام حجت کیلئے ہر ایک کو خبردار بھی کر دیتے ہوں گے کہ دیکھو ہم تمہاری آزمائش کی حیثیت رکھتے ہیں، تم اپنی عاقبت خراب نہ کرو۔ مگر اس کے باوجود لوگ ان کے پیش کردہ عملیات

اور نقوش اور تعویذات پر ٹوٹے پڑتے ہوں گے۔

فرشتوں کا انسانی شکل میں آکر کام کرنے پر کسی کو حیرت نہ ہو۔ وہ سلطنت الٰہی کے کارپرداز ہیں۔ اپنے فرائض منصبی کے سلسلہ میں جس وقت جو صورت اختیار کرنے کی ضرورت ہوتی ہے وہ اسے اختیار کر سکتے ہیں ہمیں کیا خبر کہ اس وقت بھی ہمارے گرد و پیش کتنے فرشتے انسانی شکل میں آکر کام کر جاتے ہوں گے۔ رہا فرشتوں کا ایک ایسی چیز سکھانا جو بجائے خود بری تھی، تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے پولیس کے بے وردی سپاہی کسی رشوت خوار حاکم کو نشان زدہ سکے اور نوٹ لے جا کر دیتے ہیں تاکہ اسے عین حالت ارتکاب جرم میں پکڑیں اور اس کے لیے بے گناہی کے عذر کی گنجائش باقی نہ رہنے۔ (تفہیم القرآن جلد اول طبع اول ص ۹۸)

فرمائیے! جس "تفسیر" کی کیفیت یہ ہو اس پر تبصرہ تضیع اوقات نہیں تو اور کیا ہے۔ باقی رہا اس مفسر قرآن کا قرآنی علم، سو اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ آپ کہہ رہے ہیں کہ فرشتے جب اور جہاں جی چاہے انسانی شکل اختیار کر کے لوگوں کے سامنے آسکتے ہیں اور قرآن کریم میں ان ملائکہ کے متعلق جو میدان جہاد میں نبی اکرمؐ اور جماعت مومنین کی مدد کے لیے نازل ہوئے تھے، اللہ تعالیٰ نے بصراحت فرمایا کہ لَمْ تَرَوْهَا ۹/۲۶ "تم انہیں دیکھ نہیں سکتے تھے۔ اللہ تعالیٰ فرشتوں کے متعلق یہ فرماتے ہیں اور مودودی صاحب کا ارشاد ہے کہ وہ جب جی چاہے انسانی شکل میں سامنے آسکتے ہیں۔ پھر ان سے یہ پوچھئے کہ قرآن میں یہ کہاں لکھا ہے کہ قوم لوط کے پاس فرشتے انسانی شکل میں آئے تھے ؟

۲۔ شاہد عادل نے اس تفسیر پر تبصرہ ایک خاص نقطۂ نگاہ سے کیا ہے یعنی انہوں نے بتایا ہے کہ یہ تفسیر کس قدر تضادات کا مجموعہ ہے اور ان تضادات کو بھی انہوں نے بعض احکام تک محدود رکھا ہے۔ اگر اسے احکام سے آگے بڑھ کر حقائق تک لے جایا جاتے تو تضادات کے ایسے ایسے نمونے سامنے آئیں کہ آپ محو حیرت رہ جائیں

۳۔ ضمناً غلام اور لونڈیوں کے سلسلہ میں مودودی صاحب نے یہ بھی لکھا ہے، کہ جب جنگ میں گرفتار شدہ عورتیں سپاہیوں میں تقسیم کر دی جائیں تو ان سپاہیوں

کو اُن پر حقِ ملکیت حاصل ہو جاتا ہے اور ملکیت کے تمام دوسرے حقوق کی طرح وہ مالکانہ حقوق بھی قابلِ انتقال ہیں جو کسی شخص کو از روئے قانون کسی اسیرِ جنگ پر حکومت نے عطا کئے ہوں (تفہیم القرآن حصہ اول طبع اول صہ ۳۴۰)

آپ سمجھے کہ "حقِ ملکیت کے انتقال" سے عملاً کیا مفہوم ہے؟ یہ کہ وہ سپاہی ان عورتوں کو جنسی تصرف میں لانے کے بعد جب جی چاہے اپنے کسی دوست کو تحفۃً دے سکتا ہے۔ فروخت کرنے کے سلسلہ میں وہ کسی دوسری جگہ لکھتے ہیں :-

"اس قسم کے لونڈی غلاموں کو بیچنے کی اجازت دراصل اس معنی میں ہے، کہ ایک شخص کو ان سے فدیہ وصول کرنے اور فدیہ وصول نہ ہونے تک اُن سے خدمت لینے کا جو حق حاصل ہے اسکو وہ معاوضہ لیکر دوسرے شخص کی طرف منتقل کر دیتا ہے"

(تفہیمات حصہ دوم صہ ۳۲۳)

جیسا کہ تبصرہ نگار نے لکھا ہے غنیمت ہے کہ مودودی صاحب کی یہ خرافات، دوسری زبان میں ترجمہ نہیں ہوئیں، ورنہ آپ سوچئے کہ اگر یہ "اسلامی احکام" خدانخواستہ، ہندوؤں کے ہاتھ لگ جائیں تو جو ہماری عفت مآب خواتین آج ہزاروں کی تعداد میں انکی قید میں ہیں، ان کا کیا حشر ہو۔ اور آپ اس کے خلاف ایک لفظ تک نہ کہہ سکیں گے، جب وہ کہیں گے کہ یہ تو ہم خود آپ کے اسلام کے مطابق کر رہے ہیں یہ ہے بہر حال نمونہ اس تفسیر کا جس کے متعلق آج اسقدر ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے اور کہا جا رہا ہے کہ

"قرآن مجید کی تفاسیر سینکڑوں نہیں ہزاروں موجود ہیں لیکن جب تک ایک شخص ان تفاسیر کا مطالعہ کرتا ہے تو وہ قرآن کے بارے میں شکوک و شبہات میں مبتلا ہو جاتا ہے کیونکہ اسے ان تفاسیر میں آج کل کے مسائل کا کوئی تشفی بخش جواب نہیں ملتا۔ ایسے دور میں ضرورت اس بات کی تھی کہ اسلام کو موجودہ زمانے کے حالات اور مسائل کی روشنی میں پیش کیا جائے اور قرآن پاک کو آج کل کی عام فہم زبان میں پیش کیا جائے کہ اس کے مطالعہ سے انسان کے اندر پیدا ہونے والے تمام شکوک و شبہات دور ہو جائیں اور اس کا سینہ اسلام کی روشنی سے منور ہو جائے اس ضرورت کو مولانا نے محترم کی اس تفسیر تفہیم القرآن نے بحسن و خوبی پورا کیا ہے"

(جنگ کراچی ۷ر نومبر ۱۹۶۷ء)

ہم نے اوپر اِس تفسیر سے جو دو مثالیں پیش کی ہیں، اُن میں سے پہلی مثال قرآن مجید کے اُس مقام سے متعلق جس کا صحیح مفہوم سامنے نہ ہونے سے، دل میں عجیب وغریب شکوک وشبہات دور ہو جاتے ہیں یا (معاذاللہ معاذاللہ) قرآن اضحوکہ بن جاتا ہے۔ دوسرا مقام ایک ایسے مسئلہ سے تعلق رکھتا ہے جس نے ہمارے زمانے میں خاص اہمیت حاصل کر رکھی ہے۔ یعنی جنگی قیدیوں کے ساتھ برتاؤ کا مسئلہ۔ آپ غور فرمائیے کہ اس کا جو حل مودودی صاحب نے بتایا ہے اسے آپ دنیا کے سامنے فخر کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں، یا آپ کی نگاہیں زمین میں گڑ جاتی ہیں؟

یہ ہے سطح اس تفسیر کی، اور وہ ہے ایک جھلک اس پروپیگنڈہ کی جو اُس کے متعلق کیا جا رہا ہے (اقبالؒ کے الفاظ میں) کس قدر (معاذاللہ) مظلوم ہے بیچارہ قرآن بھی، جسے اس قسم کے مفسر ملتے ہیں اور اُن کے مدّاحوں سے متعلق کیا کہا جائے۔"

(طلوع اسلام دسمبر ۶۲ء صفحہ ۴۹ تا ۶۴)

تفہیم القرآن جلد دوم مودودی صاحب پر ایک نظر

قارئین تفہیم القرآن جلد اوّل پر تبصرہ پچھلے شمارے میں ملاحظہ فرما چکے ہیں اب دوسری جلد پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے۔ واضح رہے کہ راقم اختصار کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے صرف انہی مقامات کو سامنے لا رہا ہے جن میں مودودی صاحب کی تضاد بیانی سنگین نوعیت کی ہے ورنہ اس کے لیے تو ایک پوری کتاب کی ضرورت ہے۔

داعیِ حق کی صفات اس تبصرے کی ابتداء ہم ایسے عنوان سے کر رہے ہیں کہ جس کا دعویٰ مودودی صاحب خود اپنے لیے بھی کرتے ہیں اور اپنے آپ کو ہمیشہ ایک داعیِ حق کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔ ایک داعیِ حق میں کون سی صفات ہونی چاہیں، اس کے متعلق اپنی تفسیر تفہیم القرآن جلد دوم طبع دوم کے صفحہ ۱۱۱ پر فرماتے ہیں :-

داعی حق کے لئے جو صفات سب سے زیادہ ضروری ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ اسے نرم خو، متحمل، اور عالی ظرف ہونا چاہیئے۔ اس کو اپنے ساتھیوں کیلئے شفیق، عامۃ الناس کے لئے رحیم اور اپنے مخالفوں کیلئے حلیم ہونا چاہیئے۔ اس کو اپنے رفقا کی کمزوریوں کو بھی برداشت کرنا چاہیئے اور اپنے مخالفین کی سختیوں کو بھی۔ اسے شدید سے شدید اشتعال انگیز مواقع پر بھی اپنے مزاج کو ٹھنڈا کرنا چاہیئے۔ نہایت ناگوار باتوں کو بھی عالی ظرفی کے ساتھ ٹال دینا چاہیئے۔ مخالفوں کی طرف سے کیسی ہی سخت کلامی بہتان تراشی۔ ایذا رسانی اور شریرانہ مزاحمت کا اظہار ہو، اس کو درگذری سے کام لینا چاہیئے"

جماعت اسلامی والے ہمیشہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ مودودی صاحب میں یہ صفات بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں لیکن قارئین اسی تفسیر کی جلد اوّل کے تبصرے میں ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ بہتان تراشی، ایذا رسانی اور شریرانہ مزاحمت تو کجا اپنے سے ہلکا سا علمی اختلاف رکھنے والوں کو وہ تفسیر جیسی سنجیدہ کتاب میں بار بار "شیطان" کے شاگردوں کے لقب سے نوازتے ہیں۔ ہم نے اسے ہلکا سا علمی اختلاف اس لئے کہا ہے کہ (مثلاً عورتوں کو مردانہ عہدے دلانے وغیرہ پر دوسروں کو مطعون کرتے رہے لیکن بعد میں جب اپنے آپکو ضرورت پیش آئی تو اس کا شرعی جواز ڈھونڈ نکالا، مخالفوں کو "شیطان کے شاگرد" قرار دینے میں جو کسر باقی رہ گئی تھی۔ اس کی تلافی وہ اس وقت کے تمام پاکستانی حکمرانوں کو "جھوٹے، بے ایمان اور بے حیاء" کی گالی دیکر کرتے ہیں"

زائد مسجد بنانا احمقانہ مذہبیت ہے

تفسیر زیر تبصرہ میں "ضرورت سے زائد مساجد" کی تعمیر کے بارے میں فرماتے ہیں:۔

" مدینہ میں اس وقت دو مسجدیں تھیں۔ ایک مسجد قبا جو شہر کے مضافات میں تھی۔ دوسری مسجد نبوی جو شہر کے اندر تھی۔ ان دو مسجدوں کی موجودگی میں ایک تیسری مسجد بنانے کی ضرورت تھی اور وہ زمانہ ایسی احمقانہ مذہبیت کا نہ تھا کہ مسجد کے نام سے ایک عمارت بنا دینا بجائے خود کار ثواب ہو۔ قطع نظر اس سے کہ اسکی ضرورت ہو یا نہ ہو۔ بلکہ اس کے برعکس ایک نئی مسجد بنانے کے معنی یہ تھے کہ مسلمانوں کی جماعت میں

خواہ مخواہ تفریق رونما ہو، جسے ایک صالح اسلامی نظام کسی طرح گوارا نہیں کر سکتا (ص ۲۴۳)

اللہ کی شان ہے کہ مودودی صاحب نے جن کاموں پر دوسروں پر لعن طعن کیا، بعد میں خود ان کے مرتکب ہوئے۔ عورتوں کو مردوں کے مساوی عہدے دلانے والوں کو "شیطان کے شاگرد" کہا اور پھر ایک عورت کو ملک کا سب سے اعلیٰ انتظامی اور سیاسی عہدہ دلانے کے لیے تن من دھن سے کام کیا۔ زائد از ضرورت مسجد بنانے کو احمقانہ مذہبیت قرار دیا۔ لیکن اس احمقانہ مذہبیت کے خود مرتکب ہو رہے ہیں اور عوام سے اپیل کی جا رہی ہے کہ جماعت اسلامی کی مسجد کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے پانچ لاکھ روپے چندہ دیں حالانکہ اس وقت لاہور کی ہزاروں مساجد نمازیوں کی عدم موجودگی یا کمی کی مرثیہ خواں ہیں۔ خود مرکز جماعت اسلامی کے قریب ترین مسجد (یعنی جامع مسجد محلہ رسولپورہ کو گلہ ہے کہ جماعت کے مرکز کے قریب تر ہونے کے باوجود جماعت اسلامی سے متعلق کوئی صاحب وہاں نماز پڑھنے نہیں آتے۔ اور اس مسجد کی غیر آبادی کا اندازہ اس سے لگائیے کہ وہ موجودہ حاضری سے پچاس گنا نمازیوں کے لیے کافی ہے (راقم عام طور پر اسی مسجد میں نماز ادا کرتا ہے) سوچئے کہ جس معیار کے مطابق وہ مدینہ منورہ کی تیسری مسجد کی تعمیر غیر ضروری سمجھتے ہیں کیا لاہور کی ہزاروں غیر آباد مساجد کی موجودگی میں ان کا پانچ لاکھ روپے کی لاگت سے ایک نئی مسجد بنانا، احمقانہ مذہبیت شمار نہیں ہو گا۔؟

مصر کا سیفٹی ایکٹ

اپنی تفسیر کے صفحہ ۳۹۹ پر مودودی صاحب جس طرز پر حضرت یوسف علیہ السلام کی قید کا ذکر کرتے ہیں۔ انڈکس میں اس کے لیے عنوان "مصر کا سیفٹی ایکٹ تجویز کرتے ہیں۔ اس کے تحت لکھتے ہیں۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی شخص کو شرائط انصاف کے مطابق عدالت میں مجرم ثابت کیے بغیر بس یونہی پکڑ کر جیل بھیج دینا بے ایمان حکمرانوں کی پرانی سنت ہے۔ اس معاملہ میں بھی آج کے شیاطین چار ہزار برس پہلے کے اشرار سے کچھ مختلف نہیں ہیں، فرق اگر ہے تو بس یہ کہ وہ جمہوریت کا نام نہیں لیتے۔ اور یہ اپنے ان کرتوتوں کے ساتھ یہ نام بھی لیتے ہیں۔ وہ قانون کے بغیر اپنی غیر قانونی حرکتیں کیا کرتے تھے اور یہ ہر نارواز یادتی کے لیے پہلے ایک "قانون" بنا لیتے ہیں۔ وہ صاف صاف اپنی

اغراض کے لیے لوگوں پر دست درازی کرتے تھے۔ اور جس پر ہاتھ ڈالتے ہیں اس کے متعلق دنیا کو یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اس سے ان کو نہیں ملک اور قوم کو خطرہ تھا۔ غرض وہ ظالم تھے اس کے ساتھ جھوٹے اور بے حیا بھی ہیں (م ۳۹۹، ۴۰۰)

قرآن مجید کے الفاظ کے مطابق عزیز مصر کی بیوی نے حضرت یوسف علیہ السلام سے ناجائز مطالبہ کیا اور ساتھ ہی دھمکی بھی دی کہ اگر اس کی خواہش پوری نہ کی گئی تو وہ اسے جیل بھجوا دے گی۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے اس برائی کے بجائے خوشی خوشی جیل جانا منظور فرما لیا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مودودی صاحب اسے آج کل کے سیفٹی ایکٹ پر کیسے اور کیوں منطبق فرما رہے ہیں۔ اس کی حقیقت اس وقت کھلتی ہے جب آپ کی تفسیر کی جلد اوّل کے مقدمے پر نظر ڈالی جائے جس میں آپ فرماتے ہیں کہ اکتوبر ۱۹۴۸ء میں یکایک مجھے پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت جیل بھیج دیا گیا

اپنی قید کو انبیاء کی آزمائش کے ہم پلہ قرار دینا

چنانچہ مذکورہ بالا تفسیر کے ذریعہ اپنی قید کو حضرت یوسف علیہ السلام کی آزمائش کے ہم پلہ قرار دینے کے لیے آپ انہیں بھی مصر کے سیفٹی ایکٹ کے تحت جیل بھجواتے ہیں یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا مودودی صاحب کو بھی کسی اونچے خاندان کی عورت نے اپنی خواہشات کا کھلونا بنانا چاہا تھا۔ کہ جس کے انکار پر انہیں جیل بھجوا دیا گیا تھا؟ اگر یہ بات نہیں تھی تو انہیں اپنے آپ کو ایک اولوالعزم نبی کے ہم پایہ قرار دینے کے لیے کچھ تامل کرنا چاہیے تھا۔ آخر خود ستائی اور انانیت کی کوئی حد ہونی چاہیے۔ مودودی صاحب کو جس سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار کیا گیا تھا، وہ بانی پاکستان قائد اعظم کے زمانہ حیات میں بنایا گیا تھا، اور جس پر قائد ملت لیاقت علی خاں کے زمانے میں عمل ہوتا رہا۔ اور انہی کے زمانے میں انہیں گرفتار کیا گیا۔ خود مودودی صاحب کو بھی اچھی طرح معلوم تھا کہ ان کا جرم کیا ہے اور عامۃ الناس کو بھی۔ یہ تھا مسئلہ کشمیر کے متعلق ان کا وہ فتویٰ جس نے عین اس وقت جب ملک کو اس باب میں متفق الرائے ہونے کی اشد ضرورت تھی (اور ملک متفق الرائے تھا) بحث

و نزاع کا دروازہ کھول دیا۔ اور جو لوگ کشمیر کی آزادی کے لیے ہر طرح کی قربانی کے لیے سربکف کھڑے تھے، ان کے دلوں کو تذبذب کی آماجگاہ بنا دیا۔

اس سے ملک کی سلامتی کو جو نقصان پہنچا اس کے حساس سے خود جماعت اسلامی کو ایک حد تک اپنے اس فتوے سے لاتعلقی کا اظہار کرنا پڑا۔

(ترجمان القرآن بابت ستمبر ۴۸ء، ص ۲۲۸)

مودودی صاحب کو قید کرنیوالے حکمران بے ایمان شیطان، ظالم، جھوٹے اور بے حیا ہیں،

ایک نوزائیدہ مملکت میں اتنی بڑی کھلبلی پیدا کرنے کے باوجود اپنی قید کو تقدس کا جامہ پہنانے کے لیے پہلے اس کا ذکر اپنی تفسیر کے مقدمے میں کرتے ہیں اور پھر جن پاکستانی حکمرانوں نے سیفٹی ایکٹ کے تحت انہیں قید کیا، انہیں اور اس قانون کے بنانے والے پاکستانی حکمرانوں کو تفسیر جیسی سنجیدہ کتاب میں "بے ایمان، شیطان، ظالم، جھوٹے اور بے حیا"، جیسی مغلظات سے نوازتے ہیں۔ قارئین نے یہ چیز بڑے دکھ کے ساتھ محسوس کی ہو گی کہ ان کی دشنام طرازی کی زد کس طرح قائد اعظم اور قائد ملت پر پڑ رہی ہے

ایک کپکپا دینے والا مقام

اب ہم اس تفسیر کے اس گوشے کی طرف آتے ہیں جسے دیکھ کر ہمارا سر چکرا گیا اور جس کے نتائج کے احساس سے ہماری روح پر کپکپی چھا گئی۔ اس گوشے تک پہنچنے سے پہلے ایک تمہیدی وضاحت ضروری ہے۔

مودودی صاحب مطالبۂ پاکستان کی مخالفت میں اس حد تک متشدد تھے، کہ انہوں نے برملا کہہ دیا کہ اس جدوجہد کے نتیجے میں جو کچھ حاصل ہوگا وہ مسلمانوں کی "کافرانہ" ریاست ہو گی، بلکہ اس سے بھی بدتر۔ ان کی اس مخالفت کے علی الرغم پاکستان وجود میں آگیا وہ نہایت بے حیثی سے ہندوستان سے بھاگ کر اسی کافرانہ ریاست میں پناہ لینے کے لیے آگئے۔ کچھ ایسا نظر آتا ہے جیسے وہ اس مملکت کو تباہ کرنے کے لیے مامور کیے گئے تھے۔ ورنہ ان کا ان حالات میں پاکستان کی طرف رخ کرنا کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

یہاں آنے کے بعد انہوں نے سب سے پہلے حکومت کے ملازمین کے دل میں حکومت کے خلاف بغاوت کے جراثیم بیدار کیے۔ جب گورنمنٹ پنجاب نے اپنے ملازمین سے مملکت کی وفاداری کا حلف لینے کو کہا تو اس جماعت سے متاثرین نے اس سے انکار کر دیا۔ پھر انہوں نے یہ بھی فتویٰ دیا کہ فوج کی ملازمت بھی ناجائز ہے۔ اس مقام پر بعض لوگوں نے یہ اعتراض کیا کہ حضرت یوسفؑ جیسے اولوالعزم رسول نے فرعون جیسے کافر کی حکومت میں منصب قبول کر لیا تھا۔ یہاں کی حکومت نہ تو فرعون سے زیادہ کافر ہے اور نہ ہم لوگ حضرت یوسفؑ سے زیادہ بلند مرتبت، تو پھر اس حکومت کی ملازمت کس طرح ناجائز قرار دی جا سکتی ہے۔ اعتراض بڑا وزنی تھا، لیکن مودودی صاحب تو ان میں سے ہیں جنہوں نے کبھی اپنی غلطی کا اعتراف نہیں کیا۔ انہوں نے اپنے دعویٰ کے جواز میں ثبوت اور دلائل پیش کرنے کے لیے دامنِ حضرت یوسفؑ کو چاک کرنے میں کوئی باک محسوس نہ کیا۔ یہ ہے اس تفسیر کا وہ مقام جس سے ہماری رُوح پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔ انہوں نے سب سے پہلے تو یہ کہا کہ یہ دعویٰ ہی غلط ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے فرعون کی حکومت میں کوئی منصب قبول کر لیا تھا۔ تفسیر کے الفاظ ملاحظہ فرمائیے

"حقیقت یہ ہے کہ اس مقام کی تفسیر میں دورِ انحطاط کے مسلمانوں نے کچھ اس ذہنیت کا اظہار کیا ہے جو کبھی یہودیوں کی خصوصیت تھی۔ یہ یہودیوں کا حال تھا کہ جب وہ ذہنی و اخلاقی پستی میں مبتلا ہوئے تو پچھلی تاریخ اور جن جن بزرگوں کی سیرتیں ان کو بلندی پر چڑھنے کا سبق دیتی تھیں، ان سب کو وہ نیچے گرا کر اپنے مرتبہ پر اتار لائے تاکہ اپنے لیے اور نیچے گرنے کا بہانہ پیدا کریں۔ افسوس ایسی کچھ مسلمانوں نے کیا۔ انہیں کافر حکومتوں کی چاکری کرنی تھی۔ مگر اس پستی میں گرتے ہوئے اسلام اور اس کے علمبرداروں کی بلندی دیکھ کر انہیں شرم آتی لہٰذا اس شرم کو مٹانے اور اپنے ضمیر کو راضی کرنے کے لیے یہ اپنے ساتھ اس جلیل القدر پیغمبر کو بھی خدمتِ کفر کی گہرائی میں لے گرے جس کی زندگی در اصل انہیں یہ سبق دے رہی تھی کہ اگر کسی ملک میں ایک اور صرف

ملے واضح رہے کہ اس جرم کے مجرم اس زمانے کے مسلمان ہی نہیں، آئمہ متقدمین نے بھی اپنی تفاسیر میں یہی لکھا ہے کہ حضرت یوسفؑ نے حکومتِ فرعون میں منصب [illegible]

ایک مردِ مومن بھی خالص اسلامی اخلاق اور ایمانی فراست و حکمت کا حامل ہو تو وہ تن تنہا مجرد اپنے اخلاق اور اپنی حکمت کے زور سے اسلامی انقلاب برپا کرسکتا ہے۔" (ص۴۱۳)

آگے بڑھنے سے پہلے ذرا یہ دیکھنے جائیے کہ جسے یہ مفسر خدمتِ کفر قرار دے رہا ہے، خود خدا اس کے متعلق کیا کیا کہتا ہے۔ قرآنِ کریم میں ہے کہ حضرت یوسفؑ نے خود فرعونِ مصر سے یہ کہا تھا کہ مملکت کے مالیات یا اراضیات کے نظم و نسق کا شعبہ میرے سپرد کر دیا جائے۔ میں اس کا ایسا انتظام کرسکتا ہوں کہ جس سے قحط کی یہ انسانیت سوز مصیبت ٹل جائے گی (۱۲/۵۵)، اللہ تعالیٰ نے اس منصب کو اپنی "رحمت" قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ محسنین کا اجر ضائع نہیں کیا کرتے (۱۲/۵۶) یہ ہے خدا کی نگاہوں میں اس منصب کی پوزیشن جسے مودودی صاحب خدمتِ کفر قرار دیتے ہیں۔

لیکن مودودی صاحب کا مقصد تو اس سے بھی حاصل نہ ہوا۔ یہ خدمتِ کفر تھی یا رحمتِ خداوندی، بہرحال ایک کافر بادشاہ کی حکومت میں ملازمت تو ضرور تھی اس خود ساختہ پھندے سے نکلنے کے لیے مودودی صاحب نے فرمایا کہ حضرت یوسفؑ "ہرچند بادشاہِ مصر کے ہاں بہت بڑے منصب پر فائز تھے لیکن وہ مصر کے شاہی قانون پر عمل نہیں کرتے تھے۔" (ص۴۳۰)

یعنی انہوں نے اس حکومت کا منصب تو قبول کر رکھا تھا، لیکن عمل اس حکومت کے قوانین کے خلاف کرتے۔" آپ نے غور فرمایا کہ مودودی صاحب کس طرح اپنی سیرت و کردار کو پیراہن یوسفی پہنا رہے ہیں!

اس سے یہ سوال پیدا ہوا کہ اس کا کیا ثبوت ہے کہ حضرت یوسفؑ حکومتِ فرعون کے قوانین کی خلاف ورزی کیا کرتے تھے۔ اس کے ثبوت کے لیے پھر ایک وضاحتی پس منظر کی ضرورت پیش آگئی۔ جب حضرت یوسفؑ کے بھائی دوسرے بھائیوں کے ساتھ مصر میں آ لیتے ہیں تو حضرت یوسفؑ کا جی چاہتا تھا کہ انہیں اپنے پاس رکھ لیں لیکن مملکت کا قانون یہ تھا، کہ کسی غیر ملکی کو کسی جرم کے بغیر روکا نہیں جا سکتا (۱۲/۷۶) اس مشکل کے حل کے لیے مودودی صاحب کے الفاظ میں حضرت یوسفؑ نے ایک اسکیم تیار کی کس طرح اپنے بھائی کو مجرم ٹھہرا کر اسے روک لیا جائے۔ اس سلسلے

ہیں وہ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں۔

"دونوں بھائیوں میں مشورہ ہوا ہوگا (یعنی بن یامین کو چور بنانے کا کام کہ اُسے روکنے کی تدبیر کی جائے۔ اگرچہ تھوڑی دیر کے لیے اس میں بھائی کی سُبکی تھی کہ اس پر چوری کا دھبہ لگتا تھا لیکن بعد میں دھبہ اس طرح آسانی سے دُھل سکتا تھا، کہ دونوں بھائی اصل معاملہ کو دنیا پر ظاہر کر دیں۔ (ص ۴۱۹)

چنانچہ اس اسکیم کے مطابق مودودی صاحب کی تفسیر کی رُو سے حضرت یوسف علیہ نے بن یامین کے تھیلے میں اپنا شاہی کٹورہ رکھ دیا پھر اسے پکڑوا دیا۔ اور اس طرح چوری کے جرم میں اپنے بھائی کو اپنے پاس روک لیا۔ ملاحظہ فرما رہے ہیں آپ خدا کے ایک اولوالعزم پیغمبر کی سیرت کا نمونہ مودودی صاحب کے آئینہ میں ——— (استغفر اللہ، استغفر اللہ) (ضمناً) ان سے کون پوچھے کہ اگر حضرت یوسف ؑ مملکت کے قانون کی خلاف ورزی کیا کرتے تھے، تو وہ کس کا قانون تھا جس کی رو سے انہوں نے چوری کے جرم میں بن یامین کو روک لیا تھا۔؟

بہرحال یہ ہے نمونہ اس تفسیر کا جسے ہزار سالہ اسلامی لٹریچر میں فقید المثال قرار دیا جا رہا ہے اور جس کے مصنف کو امام احمد بن حنبل ؒ اور امام ابن تیمیہ ؒ کا ہمسر بتایا جاتا ہے اس تفسیر کی تکمیل پر تقاریب جشن منانے والوں سے تو ہمیں کوئی گلہ نہیں کیونکہ وہ مودودی صاحب کے تنخواہ دار ملازم یا خوشامدی مصاحب ہیں ہم پوچھنا چاہتے ہیں اُن "دانشوران قوم" سے جنہوں نے ان تقاریب میں اس تفسیر کی مدح و ستائش میں اس قدر بلند آہنگ قصیدہ خوانی کی ہے کہ کیا انہوں نے اسے پڑھنے کے بعد ایسا کہا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان تفصیلی نکات میں مودودی صاحب کے ہمنوا ہیں اور اسے ان کی خدمت جلیلہ تصور کرتے ہیں تو ہم ان کے متعلق بھی کچھ نہیں کہنا چاہتے مصنف کے ساتھ ان کا محاسبہ بھی ان کے خدا کے ہاں ہوگا اور اگر انہوں نے اس تفسیر کو پڑھا ہی نہیں یا پڑھنے کے بعد محض چند مزعومہ مصالح کے پیش نظر مداہنت برتی ہے تو کیا انہوں نے سوچا بھی ہے کہ اس سے انہوں نے جس قدر عوام کو گمراہ کیا ہے اس کا ان کے پاس کیا جواب ہے۔ خدا، اس کے برگزیدہ انبیاء اور اس کی کتاب عظیم کے ساتھ اس قسم کی بے باکانہ

گستاخی کون سی عدالت میں قابل عفو قرار پائے گی۔ (ط۔ا جنوری ۱۹۶۳ء)

تفہیم القرآن مودودی صاحب جلد سوم پر ایک نظر

زیر تبصرہ پہلی دو جلدوں کا تعارف قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا چکا ہے اب ہم حسب وعدہ جلد سوم کی ایک جھلک دکھاتے ہیں جیسا کہ پہلے تبصروں میں واضح کیا جا چکا ہے ہم مودودی صاحب کی تفسیر کے صرف ان اہم نکات کو سامنے لا رہے ہیں جن کا عامۃ الناس کی زندگی سے گہرا تعلق ہے۔ ورنہ ہر جلد کا مفصل تبصرہ ایک پوری کتاب کا تقاضا کرتا ہے۔

قبور صالحین پر مسجدیں بنانے کی ممانعت

اسلام میں قبر پرستی کی شدید ممانعت کے بارے میں ہم نے جلد دوم سے بھی ایک اقتباس نقل کیا تھا۔ اب ایک اقتباس اسی جلد سے بھی ملاحظہ ہو۔

سورۃ الکہف کی آیت نمبر ۲۱) قَالَ الَّذِيْنَ غَلَبُوْا عَلٰٓى اَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِمْ مَّسْجِدًا (مگر جو لوگ ان کے معاملات پر غالب تھے۔ انہوں نے کہا "ہم تو ان پر ایک عبادت گاہ بنائیں گے") کی تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

مسلمانوں میں سے بعض لوگوں نے قرآن مجید کی اس آیت کا بالکل الٹا مفہوم لیا ہے۔ وہ اسے دلیل ٹھہرا کر مقابر صلحاء پر عمارتیں اور مسجدیں بنانے کو جائز قرار دیتے ہیں حالانکہ یہاں قرآن ان کی اس گمراہی کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ جو نشانی ان ظالموں کو بعث بعد الموت اور امکان آخرت کا یقین دلانے کے لیے دکھائی گئی تھی، اسے انہوں نے ارتکاب شرک کے لیے ایک خداداد موقع سمجھا اور خیال کیا کہ چلو کچھ اور ولی پوجا پاٹ کے ہاتھ آ گئے۔ پھر آخر اس آیت سے قبور صالحین پر مسجدیں بنانے کے لیے کیسے استدلال کیا جا سکتا ہے جبکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ ارشادات اس کی نہی میں موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے لعنت فرمائی ہے قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر اور قبروں پر مسجدیں بنانے اور ان پر چراغ کرنے والوں پر.....

.... وغیرہ (۱۸۳ طبع اول)

لیکن چونکہ ایسی تحریروں کو لکھنے والے خود اپنی تحریروں کا احترام نہیں
کرتے۔ اس لیے دن بدن ان بدعات میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ کاش مودودی
صاحب جسلیس فرماتے کہ انہوں نے خانہ کعبہ کے فرضی غلاف کا طواف کر کے ان بدعات
کی کتنی حوصلہ افزائی کی ہے۔

جھوٹ بولنا حرام ہے ہمارے مذہبی حلقوں میں بوقت ضرورت جھوٹ
بولنے کو جائز سمجھا جاتا ہے۔ اور اس کے لئے وہ ایک
حدیث سے استناد کرتے ہیں کہ جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف تین جھوٹ منسوب
کیے جاتے ہیں۔ مودودی صاحب جھوٹ بولنے کو حرام قرار دیتے ہیں اور سورۃ الحج کی آیت
۳۰ واجتنبوا قول الزور (اور جھوٹی باتوں سے پرہیز کرو) سے استدلال کرتے ہوئے
مذکورہ بالا حدیث کو اسلامی تعلیمات کے خلاف ثابت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"اگرچہ الفاظ عام ہیں اور ان سے ہر جھوٹی شہادت کی حرمت ثابت ہوتی ہے .... اس
کے ساتھ جھوٹی قسم اور جھوٹی شہادت بھی اسی حکم کے تحت آتی ہے جیسا کہ صحیح احادیث میں
نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا
جھوٹی گواہی شرک باللہ کے برابر رکھی گئی ہے۔ اور پھر آپ نے ثبوت میں یہی آیت پیش فرمائی۔
اسلامی قانون میں یہ جرم مستلزم تعزیر ہے۔ امام ابویوسف اور امام محمد کا فتوےٰ یہ ہے کہ جو
شخص عدالت میں جھوٹا گواہ ثابت ہو جائے اس کی تشہیر کی جائے اور لمبی قید کی سزا
دی جائے۔ یہی حضرت عمرؓ کا قول اور فعل بھی ہے۔ (صفحہ ۲۲۳)

جھوٹ کو شرک قرار دینے کے بعد آپ حضرت ابراہیمؑ کی جانب جھوٹ منسوب کرنے والی
حدیث کا یوں تجزیہ فرماتے ہیں:۔

یہ حدیث جس میں حضرت ابراہیمؑ کے تین "جھوٹ" بیان کیے گئے ہیں، صرف اسی وجہ
سے قابل اعتراض نہیں ہے کہ یہ ایک نبی کو جھوٹا قرار دے رہی ہے بلکہ اس بنا پر بھی غلط
ہے کہ اس میں جن تین واقعات کا ذکر کیا گیا ہے وہ تینوں ہی محل نظر ہیں۔ ان میں سے ایک
"جھوٹ" کا حال ابھی آپ دیکھ چکے ہیں کہ کوئی معمولی عقل و خرد کا آدمی بھی اس سیاق و سباق
میں حضرت ابراہیمؑ کے اس قول پر "جھوٹ" کا اطلاق نہیں کر سکتا کجا کہ ہم نبی صلی اللہ
علیہ وسلم سے معاذ اللہ اس سخن ناشناسی کی توقع کریں۔ انی سقیم والا واقعہ تو اس

کا جھوٹ ہونا ثابت نہیں ہو سکتا جب تک کہ یہ ثابت نہ ہو جائے کہ حضرت ابراہیمؑ فی الواقعہ اس وقت بالکل صحیح و تندرست تھے اور کوئی ادنیٰ سی شکایت بھی ان کو نہ تھی ...... اب رہ جاتا ہے بیوی کو بہن قرار دینے کا واقعہ تو وہ بجائے خود ایسا مہمل ہے کہ ایک شخص اسکو سنتے ہی یہ کہہ دیگا کہ یہ ہرگز واقعہ نہیں ہو سکتا۔ (صفحہ ۱۶۷، ۱۶۸)

جھوٹ بولنا جائز ہی نہیں بلکہ واجب ہے

لیکن مودودی صاحب نے جھوٹ کی یہ حرمت اسوقت بیان فرمائی تھی جب انہوں نے اپنے لیے حکمت عملی کی پالیسی وضع نہیں فرمائی تھی حکمت عملی کی پالیسی وضع کرنے کے بعد انہیں بھی قدم قدم پر اس کی ضرورت پیش آئی تو انہوں نے بغیر کسی جھجک کے یہ اعلان فرما دیا۔

"راستبازی اور صداقت شعاری اسلام کے اہم ترین اصولوں میں سے ہے اور جھوٹ اسکی نگاہ میں ایک بدترین برائی، لیکن عملی زندگی کی بعض ضرورتیں ایسی ہیں جن کی خاطر جھوٹ کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ بعض حالات میں اس کے وجوب تک کا فتوےٰ دیا گیا ہے۔"

(ماہنامہ ترجمان القرآن بابت مئی ۱۹۵۸ء)

احادیث کی صحت جانچنے کے نئے اصول

احادیث کو صحیح یا ضعیف قرار دینے کے لیے ائمہ حدیث نے بڑے تفصیلی اصول مرتب کئے ہیں لیکن مودودی صاحب ایسی تمام صحیح احادیث کو جو ان کے مفید مطلب نہ ہوں، رد کر دیتے ہیں اور ان کے مقابلے میں ضعیف اور جھوٹی احادیث قبول کر لیتے ہیں، جس کے لیے وہ خود نئے اصول مقرر کرتے ہیں، چنانچہ اپنی دوسری کتابوں کی طرح اس تفسیر میں بھی ائمہ حدیث کے مقرر کردہ اصولوں پر خط تنسیخ پھیلاتے ہوئے مندرجہ ذیل نئے اصول پیش کرتے ہیں، مفسرین نے سورۃ انبیاء کی آیت نمبر ۶۲ قَالُوٓا ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا یٰٓاِبْرٰهِیْمُ ۔ قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ كَبِیْرُهُمْ هٰذَا فَسْـَٔلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا یَنْطِقُوْنَ ۝ (ترجمہ) انہوں نے پوچھا کیوں ابراہیم تو نے ہمارے خداؤں کے ساتھ یہ حرکت کی ہے۔ آپ نے جواب دیا یہ سب! ان کے اس سردار نے کیا ہے۔ ان ہی سے پوچھ لو اگر یہ بولتے ہوں) کی تفسیر کے ذیل میں ایک حدیث بیان کی ہے جس میں

حضرت ابراہیم کی طرف تین مرتبہ جھوٹ بولنا منسوب کیا گیا ہے۔ مودودی صاحب اس حدیث کو ناقابل اعتماد قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں :۔

" فنِ حدیث کے نقطۂ نظر سے کسی روایت کا مضبوط ہونا اس بات کو مستلزم ہے کہ اس کا متن خواہ کتنا ہی قابلِ اعتراض ہو مگر اسے ضرور آنکھیں بند کر کے مان لیا جائے سند کے قوی اور قابل اعتماد ہونے کے باوجود بہت سے اسباب ایسے ہو سکتے ہیں جن کی وجہ سے ایک متن غلط صورت میں نقل ہو جاتا ہے اور ایسے مضامین پر مشتمل ہوتا ہے جن کی قباحت خود پکار رہی ہوتی ہے کہ یہ باتیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمائی ہوئی نہیں ہو سکتیں اس لئے سند کے ساتھ ساتھ متن کو بھی دیکھنا ضروری ہے اور اگر متن میں واقعی کوئی قباحت ہو تو پھر خواہ مخواہ اسکی صحت پر اصرار کرنا صحیح نہیں ہے۔ (صفحہ ۱۶۷)

صفحہ ۲۰۰ پر صحیح احادیث کو رد کرتے ہوئے اور ایک ضعیف حدیث [illegible]دل کرتے ہوئے فرماتے ہیں :۔

" اگرچہ اسکی سند ضعیف ہے مگر قرآن سے مطابقت اس کے ضعف کو دور کر دیتی ہے اور یہ دوسری روایات سنداً قوی تر ہیں لیکن قرآن کے ظاہر بیان سے عدم مطابقت ان کو ضعیف تر کر دیتی ہے۔"

پھر صحیح احادیث کو رد کرنے کا ایک اور اصول پیش کرتے ہیں ۔

" ہم اس سے پہلے بھی بارہا کہہ چکے ہیں اور یہاں پھر اس کا اعادہ کرتے ہیں کہ کوئی روایت خواہ اسکی سند آفتاب سے بھی زیادہ روشن ہو ایسی صورت میں قابلِ قبول نہیں جب کہ اس کا متن اس کے غلط ہونے کی کھلی کھلی شہادت دے رہا ہو۔ اور قرآن کے الفاظ، سیاق و سباق، ترتیب ہر چیز اسے قبول کرنے سے انکار کر رہی ہو۔ یہ دلائل تو ایک متشکک اور بے لاگ محقق کو بھی مطمئن کر دیں گے کہ یہ قصہ قطعی غلط ہے رہا مومن تو وہ اسے ہرگز نہیں مان سکتا جب کہ وہ علانیہ یہ دیکھ رہا ہو کہ یہ روایت قرآن کی ایک نہیں بیسیوں آیتوں سے ٹکراتی ہے۔ ایک مسلمان کے لیے یہ مان لینا بہت آسان ہے کہ خود اس روایت کے راویوں کو شیطان نے بہکا دیا (صـ ۲۴۳)

منکرِ حدیث کون ہے؟ مودودی صاحب نے صحتِ احادیث کے بارے میں ائمہ حدیث کے اصولوں کو بیکار کر دینے کے بعد جو نئے اصول پیش کئے ہیں ان کے اقتباس تو قارئین نے ملاحظہ فرمالیے انہیں پوری تفصیل سے اپنی کتاب تفہیمات میں پیش فرمایا ہے۔ آپ بھی سنیے:

"جو شخص اسلام کے مزاج کو سمجھتا ہے اور جس نے کثرت کے ساتھ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کا گہرا مطالعہ کیا ہوتا ہے وہ نبی اکرم کا ایسا مزاج شناس ہو جاتا ہے کہ روایات کو دیکھ کر خود بخود اسکی بصیرت اسے بتا دیتی ہے کہ ان میں سے کون سا قول یا کون سا فعل میرے سرکار کا ہو سکتا ہے اور کونسی چیز سنّت نبوی سے اقرب ہے۔ یہی نہیں بلکہ جن مسائل میں اسکو قرآن وسنت سے کوئی چیز نہیں ملتی ان میں بھی وہ کہہ سکتا ہے کہ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے فلاں مسئلہ پیش آتا تو آپ اس کا فیصلہ یوں فرماتے۔ یہ اس لیے کہ اسکی روح، روحِ محمدیؐ میں گم اور اسکی نظر بصیرت نبوی کے ساتھ متحد ہو جاتی ہے۔ اس کا دماغ اسلام کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے اور وہ اس طرح دیکھتا اور سوچتا ہے جس طرح اسلام چاہتا ہے کہ دیکھا جائے اور سوچا جائے۔ اس مقام پر پہنچ جانے کے بعد انسان اسناد کا بہت زیادہ محتاج نہیں رہتا۔" (صـ۲۹۶ جلد اوّل)

کیا انکارِ حدیث کی اس سے بھی کوئی سنگین صورت ہو سکتی ہے؟ کہ محدثین جس حدیث کو صحیح قرار دیں مودودی صاحب اسے رد کر دیں اور جن احادیث کو محدثین رد کر دیں، مودودی صاحب کو ان میں موتی نظر آئیں اور معیار اس کا "مزاج شناسئ رسولؐ" قرار دیں لیکن ان کی ڈھٹائی کا کمال ملاحظہ ہو کہ صحیح احادیث کا انکار تو خود کرتے ہیں اور عامۃ الناس کو "طلوعِ اسلام" کے پیچھے لگا دیتے ہیں۔

مکہ معظمہ کے مکانوں کے کرایہ کی حرمت سورہ الحج کی آیت ۲۵ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ الَّذِی جَعَلْنٰهُ لِلنَّاسِ سَوَآءَ ﹰالْعَاكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ (اور اس مسجد حرام کی زیارت میں

سلہ یہی بات دوسرا کہے تو منکر حدیث؟ ملحد۔ زندیق اور خدا جانے کیا کیا بنا دیتے ہیں۔

مانع ہیں جسے ہم نے سب لوگوں کے لیے بنایا ہے جس میں مقامی باشندوں اور باہر سے آنیوالے کے حقوق برابر ہیں) کی تفسیر بیان کرتے ہوئے مودودی صاحب بہت سی روایات کو نقل کرتے ہیں جن سے مکہ شریف کے مکانوں کے کرائے کی حرمت ثابت ہوتی ہے ان مختلف روایات کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں :-

ان روایات کی بنا پر بکثرت تابعین اس طرف گئے ہیں اور فقہا میں سے امام مالکؒ امام ابو حنیفہؒ سفیان ثوری، امام احمد بن حنبلؒ اور اسحاق بن راہویہ کی بھی یہی رائے ہے کہ اراضی مکہ کی بیع اور کم از کم موسم حج میں مکہ کے مکانوں کا کرایہ جائز نہیں البتہ بیش تر فقہا نے مکہ کے مکانات پر لوگوں کی ملکیت تسلیم کی ہے اور ان کی بحیثیت عمارت نہ کہ بحیثیت زمین کو بھی جائز قرار دیا ہے۔

یہی مسلک کتاب اللہ وسنت رسول اللہ اور سنت خلفاء راشدین سے قریب تر معلوم ہوتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تمام دنیا کے مسلمانوں پر حج اس لیے فرض نہیں کیا ہے کہ یہ اہل مکہ کے لیے آمدنی کا ذریعہ بنے اور جو مسلمان احساس فرض سے مجبور ہو کر وہاں جائیں انہیں وہاں کے مالکان مکانات خوب کرائے وصول کر کے لوٹیں۔ وہ ایک وقف عام ہے۔ تمام اہل ایمان کے لیے، اسکی زمین کسی کی ملکیت نہیں ہے ہر زائر کو حق ہے کہ جہاں جگہ پائے ٹھہر جائے۔ (ص ۲۱۶، ۲۱۷)

اگرچہ مودودی صاحب نے اس موضوع پر اکثر روایات جمع کر دی ہیں لیکن معلوم نہیں ان میں جو روایت سخت تر تھی، اس کا انہوں نے کیوں ذکر نہیں فرمایا۔ یہ وہ حدیث ہے جس میں حضور صلعم مکہ شریف کے مکانوں کے کرائے کو سود قرار دیتے ہیں۔ من اکل کراء الارض مکۃ فکانما اکل الربوٰا (ترجمہ) جس نے مکہ معظمہ کے مکانوں کا کرایہ کھایا، اس نے گویا سود کھایا (ہدایہ مطبوعہ دہلی ص ۴۵۷)

مودودی صاحب کی تشریح کے مطابق اس وقت کے درجنوں اسلامی ممالک میں سے صرف سعودی عرب کی حکومت اسلامی ہے لیکن اس حکومت کے دور میں مکہ شریف کے مکانوں کے جو کرائے حجاج سے وصول کیے جاتے ہیں ان کی شرح ساری دنیا سے

زیادہ ہے۔ لیکن مودودی صاحب نے رابطۃ العالم الاسلامی کا رکن ہونے کے باوجود کبھی اس سنگین سودی کاروبار کو ختم کرنے کے لئے متعلقہ "اسلامی حکومت" کی توجہ نہیں دلائی۔ حالانکہ اگر کوئی دوسرا مسلمان حکمران مودودی صاحب کے مزاج کے خلاف کوئی بات کہہ دے تو اسے سخت قسم کے مغلظات سنائے جاتے ہیں۔ ان مغلظات کی جھلک پچھلی قسط میں دکھائی جا چکی ہے

(ط - ا مارچ ۱۹۷۳ء)

تفہیم القرآن مودودی صاحب جلد چہارم پر ایک نظر

تفہیم القرآن کی جلد زیر تبصرہ کی ابتدا سورت لقمان سے ہوتی ہے جنہیں اگرچہ ہمارے بعض مفسرین نے انبیاء کرام میں شمار کیا ہے لیکن عام طور پر انہیں دنیا کا عظیم دانا سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ اسی نسبت سے مودودی صاحب نے اس جلد میں کچھ دانائی کی باتیں کی ہیں یہ علیحدہ بات ہے کہ جس طرح جلد دوم میں اسلامی قانون میں اپنی مہارت دکھاتے دکھاتے انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ایک برگزیدہ نبی حضرت یوسف علیہ السلام کی (معاذاللہ) توہین کر ڈالی تھی۔ اسی طرح اس جلد میں ان کی دانائی کی زد میں ایک اور برگزیدہ نبی حضرت داؤد علیہ السلام آجاتے ہیں۔ اگر کوئی صاحب ضرورت محسوس کریں تو وہ طلوع اسلام کے متعلقہ شمارے دیکھ لیں۔

موسیقی کے شرعی احکام

سورہ لقمان کی چھٹی آیت وَمِنَ النَّاسِ مَن يَشْتَرِي لَهْوَ الْحَدِيثِ ..... الخ (اور انسانوں ہی میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو کلامِ دلفریب خرید کر لاتا ہے) کی تفسیر بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

لہو الحدیث کی یہی تفسیر بکثرت صحابہ و تابعین سے منقول ہے۔ عبداللہ بن مسعودؓ سے پوچھا گیا، اس آیت میں لہو الحدیث سے کیا مراد ہے؟ انہوں نے تین مرتبہ زور دیکر فرمایا ھو اللہ الغناء خدا کی قسم! اس سے مراد گانا ہے۔ (ابن جریر، ابن ابی شیبہ حاکم، بیہقی) اس سے ملتے جلتے اقوال حضرات عبداللہ ابن عباسؓ، جابرؓ بن عبداللہؓ، مجاہد عکرمہ، سعید بن جبیرؒ، حسن بصریؒ اور مکحول سے مروی ہیں۔ ابن جریر، ابن ابی حاتم اور ترمذی نے حضرت ابوامامہؓ باہلی کی یہ روایت نقل کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
لا یحل بیع المغنیات ولا شراؤھن ولا التجارۃ فیھن ولا اثمانھن
مغنیہ عورتوں کا بیچنا اور خریدنا اور ان کی تجارت کرنا حلال نہیں ہے۔ اور نہ ان کی قیمت لینا حلال ہے (ص۹)

جہانتک اس آیت کے ترجمے کا تعلق ہے وہ تو مودودی صاحب نے ٹھیک کیا ہے لیکن تفسیر میں چونکہ ایک دوسرے موضوع کی طرف نکل کر اس سے موسیقی کی حرمت مراد لیتے ہیں اس لیے ہم اس کے متعلق کچھ عرض کریں گے۔

اس بارے میں جیسا کہ مندرجہ بالا اقتباس سے معلوم ہوتا ہے مودودی صاحب نے زیادہ تر احادیث سے استدلال کیا ہے۔ اس لیے پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ ان احادیث کی حیثیت کیا ہے۔ قارئین حیران ہوں گے کہ جن احادیث کا سہارا لیکر مودودی صاحب ایک جائز چیز کو حرام قرار دے رہے ہیں ائمہ حدیث کے نزدیک وہ تمام کی تمام ناقابل اعتبار ہیں۔ امام ابن حزم فرماتے ہیں :- قال ابن حزم انہ لا یصح فی الباب حدیث ابدًا وکل ما فیہ موضوع" (نیل الاوطار جلد ۸ ص۱۰۰)
امام ابن حزم فرماتے ہیں کہ موسیقی کی حرمت کے بارے میں ایک حدیث بھی صحیح نہیں۔ اور اس بارے میں جتنی احادیث پیش کی جاتی ہیں وہ سب جھوٹی ہیں۔

یہ صرف امام ابن حزم کا مسلک ہی نہیں بلکہ دیگر آئمہ حدیث کی بھی یہی رائے ہے شیخ عبدالحق محدث دہلوی اپنی کتاب مدارج النبوۃ جلد اول ص۲۴۵ پر فرماتے ہیں :
ایک مسلک تو فقہا کا ہے جو غنا اور مزامیر کے سخت منکر ہیں۔ اور اس معاملے

میں تعصب اور عناد کا انداز اختیار کرتے ہیں بلکہ اس فعل کو گناہِ کبیرہ اور اس کے جواز کے عقیدہ کو کفر و زندقہ اور الحاد سمجھتے ہیں۔ فقہا کا یہ طرزِ عمل زیادتی ہے۔ اور اعتدال اور انصاف کے مسلک سے باہر ہے۔ دوسرا مسلک محدثین کا ہے جو کہتے ہیں کہ تحریم غنا کے متعلق کوئی صحیح حدیث یا نصِ صریح موجود نہیں اور جو کچھ ہے تو وہ یا موضوع ہے یا ضعیف "

علامہ شوکانی کی تحقیق

مودودی امام شوکانی کی تحقیق کے بڑے گرویدہ ہیں۔ انہوں نے موسیقی کے شرعی جواز کے بارے میں ایک مستقل کتاب تصنیف فرمائی ہے جس کا نام "ابطال دعوی الاجماع فی تحریم مطلق السماع" ہے۔ اس کتاب کے صد ۱۲، ۱۴ پر انہوں نے اپنی تحقیق کا جو نتیجہ پیش کیا ہے اس کا اردو ترجمہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔

"سماع اور مزامیر کی حرمت کے متعلق بہت سی روایات ہیں جنہیں بعض علماء مثلاً ابن حزم، ابن طاہر، ابن ابی الدنیا، ابن حمدان اور امام ذہبی وغیرہم نے اپنی کتابوں میں یکجا کیا ہے۔ ان میں زیادہ تر روایات وہ ہیں جو موسیقی کی ممانعت سے متعلق ہیں ان تمام احادیث کا جواب ان علماء نے دیا ہے جو اسے جائز سمجھتے ہیں چنانچہ کمال الدین ادفوی اپنی کتاب الامتاع میں لکھتے ہیں کہ ظاہریہ، مالکیہ، حنابلہ، شافعیہ ہر ایک میں سے ایک جماعت نے ان تمام احادیث کو ضعیف قرار دیا ہے جو موسیقی کی حرمت کے بارے میں وارد ہوئی ہیں۔ ان روایات کو ائمہ اربعہ، داؤد، ظاہری اور سفیان ثوری میں سے کسی نے حجت تسلیم نہیں کیا۔ حالانکہ یہ لوگ مجتہدین کے رئیس ہیں۔ اور ان کے مذاہب کے بیشمار پیروکار موجود ہیں۔ ابوبکر ابن العربی نے بھی اپنی کتاب "احکام الاحادیث" میں ان روایات کا ذکر کرکے انہیں ضعیف قرار دیا ہے۔ اور کہتے ہیں کہ موسیقی اور مزامیر کی حرمت کے متعلق جسقدر روایات ہیں ان میں سے ایک بھی صحیح نہیں۔"

ابن طاہر تو یہاں تک لکھتے ہیں کہ ان روایات کا ایک لفظ تک صحیح نہیں۔

علاؤالدین اپنی شرح تصوّف میں ابن حزم کا یہ قول نقل کرتے کہ اس بارے میں کوئی حدیث بھی صحیح نہیں۔ اگر کوئی حدیث صحیح ہوتی تو سب سے پہلے ہم اُسے مانتے۔ لیکن حالت یہ ہے کہ اس بارے میں جتنی احادیث موجود ہیں وہ سب کی سب موضوع ہیں پھر ابن حزم نے اس بات پر قسم کھائی۔

ان تفصیلات کے سامنے لانے سے ہمارا مقصد یہ بتانا ہے کہ جو ضعیف، اور جھوٹی احادیث مودودی صاحب کے مفیدِ مطلب ہوں تو وہ اُن پر بلا جھجک اپنی تحقیق کی بنیادیں اٹھاتے چلے جاتے ہیں اور چاہے سارے ائمہ حدیث ان احادیث کو ضعیف ہی کیوں نہ قرار دیں وہ انہیں خاطر میں نہیں لاتے لیکن جب انہی ائمہ حدیث کا کوئی ذرا سا قول بھی انہیں مفید مطلب مل جائے تو پھر انہیں ائمہ حدیث کے گن گائے جاتے ہیں۔

طلاق کا اختیار

سورۃ الاحزاب کی آیت ۴۹ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ .... (اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، جب تم مومن عورتوں سے نکاح کرو اور پھر انہیں ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق دے دو) کی تفسیر کے ذیل میں جو نکات بیان کئے گئے ہیں، ان میں سے اہم ترین نکتہ طلاق کے اختیار کے متعلق ہے، اس بارے میں صاحب تفہیم القرآن یوں فرماتے ہیں۔

"قرآن کے اس ارشاد سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ طلاق کے نفاذ کو کسی پنچایت یا عدالت کی اجازت کے ساتھ معلّق کرنا خدائی تشریع کی حکمت و مصلحت کے بالکل خلاف ہے کیونکہ اس صورت میں "بھلے طریقے سے رخصت کرنے" کا کوئی امکان نہیں رہتا، بلکہ مرد نہ بھی چاہے تو تھکا فضیحتی اور بدنامی، اور رسوائی ہو کر رہتی ہے۔ علاوہ بریں آیت کے الفاظ میں اس امر کی کوئی گنجائش بھی نہیں ہے کہ مرد کا اختیار طلاق کسی پنچایت یا عدالت کی اجازت کے ساتھ مشروط ہو آیت بالکل صراحت کے ساتھ ناکح کو طلاق کا اختیار دے رہی ہے اور اسی پر یہ

ذمہ داری ڈال رہی ہے کہ اگر وہ ہاتھ لگانے سے پہلے عورت کو چھوڑنا چاہے تو لازماً نصف مہر دے کر یا اپنی حیثیت کے مطابق کچھ مال دے کر چھوڑے۔ اس سے آیت کا مقصود صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ طلاق کو کھیل بننے سے روکنے کے لیے مرد پر مالی ذمہ داری کا ایک بوجھ ڈال دیا جائے۔ تاکہ وہ خود ہی اپنے اختیار طلاق کو سوچ سمجھ کر استعمال کرے اور دو خاندانوں کے اندرونی معاملے میں کسی بیرونی مداخلت کی نوبت نہ آنے پائے۔ بلکہ شوہر سرے سے کسی کو یہ بتانے پر مجبور ہی نہ ہو کہ وہ بیوی کو کیوں چھوڑ رہا ہے۔ (ص ۱۱۱)

اس طرح جناب مفسر صاحب اس آیت میں "جمع کے صیغے" کو گول کر گئے ہیں کہ جس میں خطاب مسلمانوں یعنی ان کی ہیئت حاکمہ سے ہے اور بڑی آسانی سے ایک اجتماعی مسئلہ کو انفرادی مسئلہ بنا دیا۔ شاید ہم پر یہ اعتراض ہو کہ ہمیں جو جمع کا صیغہ نظر آ رہا ہے کیا وہ پاکستان کے اتنے بڑے مفسر کو نظر نہیں آ سکتا تھا؟ تو اس بارے میں عرض ہے کہ انہیں بھی "جمع کا صیغہ" اچھی طرح نظر آتا تھا، لیکن عائلی قوانین کے نفاذ سے پہلے، بلکہ اس وقت تو انہوں نے اس موضوع پر ایک مستقل کتاب "حقوق الزوجین" تصنیف فرمائی تھی جس کا شمار ان کی معرکۃ الآرا تصانیف میں ہوتا ہے۔ اس میں انہوں نے مرد کے طلاق کے اختیار کو انفرادی کی بجائے اولی الامر کا معاملہ قرار دیا تھا۔ ملاحظہ فرمائیے:-

" اگر اس کی (یعنی عورت کی) شکایت جائز ثابت ہوگی تو قانون کے نافذ کرنے والوں یعنی اولی الامر کو حق ہوگا کہ شوہر کو اس کے اختیار سے محروم کر کے بطور خود اس اختیار کو استعمال کریں۔ قاضی کو فسخ اور تفریق اور تطلیق کے جو اختیارات شرع میں دیئے گئے ہیں وہ اسی اصول پر مبنی ہیں۔ فقہا کی ایک جماعت نے بیدہ عقدۃ النکاح سے یہ استدلال کیا ہے کہ طلاق کا جو اختیار مرد کو دیا گیا ہے وہ کسی شرط کے ساتھ مشروط نہیں اور اس قاعدہ میں کوئی استثنا نہیں۔ اور اگر مرد طلاق دینے پر راضی نہ ہو تو کسی حال میں قاضی کو یہ اقتدار نہیں کہ اس اختیار کو خود اپنے ہاتھ میں لے کر استعمال کریں لیکن

قرآن مجید اس استدلال کی تائید نہیں کرتا۔ (حقوق الزوجین۔ طبع ششم ص ۱۰۸)
اپنی اسی کتاب میں مودودی صاحب نے عائلی قوانین میں اصلاح کرنے کا مطالبہ کرتے ہوئے مصری عائلی قوانین کی طرز پر سفارشات پیش کی تھیں ۱۹۶۱ء میں کم و بیش انہی خطوط پر عائلی قوانین کا نفاذ عمل میں آیا۔ لیکن نامعلوم وجوہات کی بنا پر مودودی صاحب نے ان کی مخالفت کی اور ان کی تفسیر کی۔ زیر تبصرہ جلد اسی دوران شائع ہوئی چنانچہ عائلی قوانین کے نفاذ سے پہلے قرآن مجید جس استدلال کی تائید نہیں کرتا تھا، اب وہی استدلال نہ صرف یہ کہ عین قرآنی ہو گیا۔ بلکہ اگر کوئی صاحب غلطی سے ان کے "حقوق الزوجین" والے استدلال کی طرف اشارہ کر دے تو انہیں ڈانٹ دیا جاتا کہ یہ خدائی تشریح کی حکمت و مصلحت کے خلاف ہے (ص ۱۱۱)
آپ نے غور فرمایا کہ قرآن پاک کا مفہوم کس طرح مصلحتوں کے ماتحت بدلا جاتا ہے

حضرت داؤد علیہ السلام پر بہتان

سورہ ص میں حضرت داؤد علیہ السلام کا جو قصہ بیان ہوا ہے، مفسرین نے اس کے ضمن میں ایسی ایسی اسرائیلی روایات نقل کر دی ہیں جو اللہ تعالیٰ کے کسی نبی کے شایان شان ہرگز ہرگز نہیں۔ مودودی صاحب نے بجا طور پر ان اسرائیلی روایات پر کڑی تنقید کی ہے اور پھر اپنی طرف سے اس واقعہ کی بڑی عیمانہ تاویل کرتے ہیں جو ان کے الفاظ میں یہ ہے۔
"اصل واقعہ جو قرآن مجید کے مذکورہ بالا بیان سے صاف سمجھ میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے اُوریاہ (یا جو کچھ بھی اس شخص کا نام رہا ہو) سے محض یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دے۔ اور چونکہ یہ خواہش ایک عام آدمی کی طرف سے نہیں بلکہ ایک جلیل القدر فرماں روا اور ایک زبردست دینی عظمت رکھنے والی شخصیت کی طرف سے رعایا کے ایک فرد کے سامنے ظاہر کی گئی تھی اس لیے وہ شخص کسی ظاہری جبر کے بغیر بھی اپنے آپ کو اسے قبول کرنے پر مجبور پا رہا تھا۔ اس موقع پر قبل اس کے کہ وہ حضرت داؤد کی فرمائش کی تعمیل کرتا۔ قوم کے دو نیک آدمی اچانک حضرت داؤد کے پاس پہنچ گئے اور انہوں نے ایک فرضی مقدمے

کی صورت میں یہ معاملہ ان کے سامنے پیش کر دیا۔ حضرت داؤدؑ ابتدا میں تو یہ سمجھے کہ یہ واقعی کوئی مقدمہ ہے۔ چنانچہ انہوں نے اسے سن کر اپنے فیصلے کو سنا دیا۔ لیکن زبان سے فیصلے کے الفاظ نکلتے ہی ان کے ضمیر نے تنبیہہ کی۔ یہ تمثیل پوری طرح اُن کے اور اس شخص کے معاملہ پر چسپاں ہوتی ہے اور جس فعل کو وہ ظلم قرار دے رہے ہیں اس کا صدور خود اُن سے اس شخص کے معاملہ میں ہو رہا ہے۔ یہ احساس دل میں پیدا ہوتے ہی وہ سجدہ میں گر گئے اور توبہ کی اور اپنے اس فعل سے رجوع فرمالیا (ص ۳۲۸)

مودودی صاحب کی اس تفسیر سے چند ایک اہم سوال ذہن میں ابھرتے ہیں۔ جو غور طلب ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:۔ کہ

۱۔ اصل واقعہ جو قرآن مجید کے اندر مذکورہ بالا بیان سے صاف سمجھ میں آتا ہے یہ ہے کہ حضرت داؤدؑ نے ایک شخص سے کہا کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دیدے کیونکہ آپ اس سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ قرآن مجید کی وہ کون سی آیات ہیں جن سے یہ "اصل واقعہ صاف سمجھ میں آتا ہے" کیا قرآن مجید میں کہیں بھی یہ مذکور ہے کہ حضرت داؤدؑ نے (معاذ اللہ) کسی شخص سے ایسی بات کہی تھی؟ اور اگر قرآن مجید میں کہیں بھی مذکور نہیں (جیسا کہ واضح ہے کہ اس میں کہیں اس کا ذکر نہیں آیا) تو کیا مودودی صاحب کو اس کا قطعاً خیال نہیں آیا کہ اس قسم کی بیہودہ بات کو پہلے خدا کے ایک اولوالعزم پیغمبرؑ اور پھر قرآن مجید کی طرف منسوب کرنا کتنا بڑا جرم ہے؟

۲۔ انہوں نے کہا ہے کہ مفسرین نے اس واقعہ کے ضمن میں ایسی ایسی اسرائیلی روایات نقل کر دی ہیں جو اللہ کے کسی نبی کے شایانِ شان نہیں۔ سوال یہ ہے کہ جو بات خود انہوں نے خدا کے اس جلیل القدر نبی کی طرف منسوب کی ہے، کیا وہ ایک نبی کے شایانِ شان ہے؟ خدا کا رسول تو ایک طرف، کیا کسی عام انسان کا بھی کسی دوسرے انسان سے یہ کہنا کہ میں تمہاری بیوی سے شادی کرنا چاہتا ہوں اس لیے تم اسے طلاق دے دو، قرینِ شرافت قرار دیا جائے گا؟ کیا اس بات کی سند (جو انہوں نے حضرت داؤدؑ کی طرف منسوب کی ہے) اسرائیلی روایت نہیں؟

۳۔ جو کچھ مودودی صاحب نے لکھا ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت داؤدؑ

ی حکومت میں رعایا کا یہ حال تھا کہ وہ جس شخص سے (معاذاللہ) کہہ دیتے تھے، کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دے تاکہ یہ اس سے شادی کر سکیں، اسے جرأت نہیں تھی کہ وہ ان کے اس مطالبے سے انکار کر سکے۔ اس کے لئے یہ تدبیر اختیار کی کہ دوسرے لوگوں کو حضرت داؤدؑ کی طرف بھیجا۔

پھر ان لوگوں کو بھی براہ راست یہ کہنے کی جرأت نہ ہوئی کہ وہ اس باب میں زیادتی کر رہے ہیں۔ انہوں نے بھی اسے اشارۃً کنایۃً ہی کہا۔ سوال یہ ہے کہ کیا ایک رسول کی حکومت کا بھی یہی انداز ہوتا ہے کہ لوگ ظلم کو ظلم نہ کہہ سکیں۔؟

۴۔ اگلا سوال یہ سامنے آتا ہے کہ حضرت داؤد (معاذاللہ) شدتِ جذبات سے اس قدر مغلوب ہو گئے تھے کہ ایک ایسی بات جسے دوسرے لوگ اتنی آسانی سے سمجھ گئے تھے ان کی سمجھ میں نہ آسکی؟ انہیں اس کا احساس ان لوگوں کے اشاروں اور کنایوں ہی سے ہوا۔ کیا خدا کے رسولوں کی فہم و فراست، اور احساسِ جرم کی یہی کیفیت ہوتی ہے؟ اس سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ اگر یہ لوگ انہیں اس سے باز رکھنے کی اس طرح کوشش نہ کرتے تو انہیں اس کا احساس تک بھی نہ ہوتا کہ وہ کوئی جرم کر رہے ہیں!

۵۔ وہ فرماتے ہیں کہ دو "نیک" آدمی حضرت داؤدؑ کے پاس پہنچ گئے۔ یعنی دو نیک آدمی حضرت داؤد کو متنبہ کرنے کے لیے گئے۔ وہ "نیک" تھے۔ حضرت داؤد کو ان کی اس (معاذاللہ) زیادتی سے روکنے والوں کا شمار تو نیکوں میں ہو گیا۔ کیا مودودی صاحب فرمائیں گے کہ پھر حضرت داؤد کا شمار کن لوگوں میں ہوا۔

۶۔ مثال میں حضرت داؤدؑ کی ننانویں دنبیاں بتائی گئی ہیں جس سے (مودودی صاحب کی تفسیر کی رو سے) بیویاں مراد لیا جائے گا۔ کیا حضرت داؤد کی ننانویں بیویاں تھیں اور اس پر بھی وہ مطمئن اور قانع نہیں تھے جو اپنی رعایا کے ایک شخص کی بیوی کو اس طرح حاصل کرنا چاہتے تھے۔ (توبہ۔ توبہ۔ استغفراللہ)

یہ ہے وہ تفسیر جو ہمارے دور کے یہ مفسرِ اعظم پیش فرما رہے ہیں اور جسے ہمارے ہاں کے بڑے بڑے دانشورانِ قوم، اسلام کی عظیم خدمت قرار دے کر اس تفسیر

کو ساری دنیا میں عام کرنے کا مشورہ دے رہے ہیں اکیا ان میں سے کسی نے سوچا کہ اگر یہ تفسیر غیر مسلموں کے سامنے چلی گئی تو وہ خدا، اس کی کتاب، اور اس کتاب کے لانے والے رسول کے متعلق کیا رائے قائم کریں گے۔ باقی رہے مودودی صاحب سو ان کے نادک تنقید و تنقیص سے کون بچا ہے۔ وہ تو (معاذاللہ، معاذاللہ) حضور نبی اکرم کے مقدس دامن کو بھی داغدار کرنے سے نہیں چوکتے۔

ضمناً مودودی صاحب نے لکھا ہے کہ دو آدمی حضرت داؤد کے پاس پہنچ گئے لیکن متعلقہ آیت میں تمام صیغے جمع کے ہیں جس سے واضح ہے کہ وہ دو نہیں تھے بلکہ زیادہ آدمی تھے، ان میں فریقین مقدمہ دو تھے۔

آگے چلئے :۔

اسلام میں شوریٰ کا مقام

سورۃ الشوریٰ کی مشہور آیت وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰی بَیْنَهُمْ (اپنے معاملات آپس کے مشورے سے چلاتے ہیں) کی تفسیر بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

"پنجم یہ کہ اہل شوریٰ کے اجماع (اتفاق رائے) سے دیا جائے یا جسے اُن کے جمہور (اکثریت) کی تائید حاصل ہو اسے تسلیم کیا جائے۔ کیونکہ اگر ایک شخص یا ایک ٹولہ سب کی سننے کے بعد اپنی من مانی کرنے کا مختار ہو تو مشاورت بالکل بے معنی ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ نہیں فرما رہا کہ ان کے معاملات میں اُن سے مشورہ لیا جاتا ہے"

"بلکہ یہ فرما رہا ہے کہ" اُن کے معاملات آپس کے مشورے سے چلتے ہیں"۔ اس ارشاد کی تعمیل محض مشورہ لے لینے سے نہیں ہو جاتی بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ مشاورت میں اجماع یا اکثریت کے ساتھ جو بات طے ہو اسی کے مطابق معاملات چلیں" ص ۵۱۰

لیکن یہ دانت تو صرف دکھانے کے ہیں کھانے کے دوسرے ہیں جس پر کم از کم بیس برس جماعت کے شورائی نظام پر عمل ہوتا رہا۔ انہی کی زبانی سنیے :۔

" جب امیر کو چن لیا جائے گا تو اس کو سیاہ و سپید کے اختیارات ہوں گے اور کو مشورہ کے ساتھ کام کرنا ہو گا۔ عموماً مجلس کے فیصلے کثرت رائے سے ہوں گے

"اسلام تعداد کی کثرت کو حق کا معیار تسلیم نہیں کرتا۔ اسلام کے نزدیک یہ ممکن ہے کہ ایک اکیلے شخص کی رائے پوری مجلس کے مقابلے میں برحق ہو اور ایسا ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ حق کو اس لیے چھوڑ دیا جائے کہ اسکی تائید میں ایک جم غفیر نہیں ہے۔ لہٰذا امیر کو حق ہے کثرت کے ساتھ اتفاق کرے یا اقلیت کے ساتھ، اور امیر کو یہ بھی حق حاصل ہے کہ پوری مجلس سے اختلاف کر کے اپنی رائے پر فیصلہ کرے۔"

(اسلام کا سیاسی نظریہ صہ ۴۵-۴۶)

حتیٰ کہ انہوں نے شروع میں جو مسودۂ آئین مرتب کیا تھا، اسکی دفعہ ۲۷ میں کہا گیا تھا کہ امیر (یعنی صدر) کو مجلسِ شوریٰ کی اکثریت کے مقابلہ میں ویٹو کا حق حاصل ہوگا۔

(دو دستوری خاکے صہ ۲۸)

اب اگر آپ یہ کہیں کہ پھر مودودی صاحب نے اپنی تفسیر میں یہ کیوں کہا ہے کہ امیر مجلس اکثرت رائے کا پابند ہوگا تو اس کا جواب خود مودودی صاحب سے پوچھئے۔ ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ یہ صاحب جس جرأت اور دیدہ دلیری سے دین کے ساتھ کھیل کھیل رہے ہیں اسکی مثال تاریخ میں کہیں نہیں ملے گی۔

اللہ کی آیات میں الحاد

اِنَّ الَّذِیۡنَ یُلۡحِدُوۡنَ فِیۡۤ اٰیٰتِنَا (حٰم السجدہ ۴۰)
جو لوگ ہماری آیات کو الٹے معنی پہناتے ہیں،

اس آیت کی تفسیر کے تحت فرماتے ہیں "اللہ کی آیات میں الحاد کا مطلب یہ ہے کہ آدمی سیدھی بات میں سے ٹیڑھ نکالنے کی کوشش کرے۔ آیاتِ الٰہی کا ایک صحیح اور صاف مطلب تو نہ لے باقی ہر طرح کے غلط معنی پہنا کر خود بھی گمراہ ہو اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتا رہے" (صہ ۴۶۲)

مودودی صاحب کی ساری سیاسی زندگی اسی الحاد کی عملی تفسیر ہے۔ وہ آج ایک بات کے حق میں فیصلہ دیتے ہیں اور اسے عین مطابق قرآن وسنت قرار دیتے ہیں دوسرے وقت اس کے بالکل برعکس کہتے ہیں اور اسے بھی مطابق قرآن وسنت

ٹھہراتے ہیں (اسکی مثال تو آپ نے ابھی ابھی اوپر دیکھی ہے) امیر کا مجلس شوریٰ (پارلیمنٹ یا کابینہ) کی کثرت رائے کا پابند ہونا بھی مطابق قرآن وسنت، اور اسے ویٹو کا حق حاصل ہونا بھی مطابق قرآن وسنت، ۱۹۵۶ء کا ذکر ہے کہ ان کی جماعت کے چند اہم حضرات نے اُن کی اس روش پیہم سے تنگ آکر جماعت سے کنارہ کشی اختیار کرلی اور مودودی صاحب پر اس قسم کے الحاد کا الزام عائد کیا تو انہوں نے ان کے جواب میں فرمایا کہ یہ الحاد نہیں بلکہ کچھ اور ہے۔ وہ "کچھ اور" کیا ہے؟ اسے خود انہی کی زبان سے سنیئے۔ انہوں نے لکھا۔

"آئیڈیلزم کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی اپنے نصب العین کی منزل سے کم کسی چیز کو آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے اور جن اصولوں کو پیش کرتا ہے اس پر سختی سے جما رہے مگر واقعات کی دنیا میں یہ بات جُوں کی توں نہیں چل سکتی۔ یہاں نصب العین تک پہنچنے کا انحصار ایک طرف اُن ذرائع پر ہے جو کام کرنیوالے کو بہم پہنچیں، دوسری طرف ان مواقع پر ہے جو اسے کام کرنے کے لیے حاصل ہوں۔ اور تیسری طرف موافق اور ناموافق حالات کے اس گھٹتے بڑھتے تناسب پر ہے جس سے مختلف مراحل میں اسے سابقہ پیش آئے۔ یہ تینوں چیزیں مشکل ہی سے کسی کو بالکل سازگار ملتی ہیں۔ کم از کم اہلِ حق کو تو یہ کبھی سازگار نہیں ملی ہیں۔ اور نہ آج ملنے کے کوئی آثار ہیں۔ اس صورت میں جو شخص یہ چاہے کہ قدم آخری منزل پر ہی رکھوں گا اور پھر دورانِ سعی میں کسی مصلحت وضرورت کی خاطر اپنے اصولوں میں کسی استثنا اور لچک کی گنجائش بھی نہیں رکھوں گا وہ عملاً اس مقصد کے لیے کام نہیں کرسکتا۔ یہاں آئیڈیلزم کے ساتھ برابر کے تناسب سے حکمت عملی کا ملنا ضروری ہے۔ وہی یہ طے کرتی ہے کہ منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے راستے کی کن چیزوں کو راستے کی پیش قدمی کا ذریعہ بنانا چاہیئے۔ کن کن مواقع سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ کن کن موانع کے ہٹانے کو مقصدی اہمیت دینی چاہیئے۔ اور اپنے اصولوں میں سے کن میں لچک ہونا اور کن میں اہم تر مصالح کی خاطر حسب ضرورت لچک کی گنجائش نکالنا چاہیئے۔"

(ترجمان القرآن بابت دسمبر ۱۹۵۶ء بحوالہ ہفت روزہ المنبر بابت ۱۸ ربیع الثانی

حرفِ آخر یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس جلد کا تبصرہ، دانائی کی باتوں سے شروع ہوا، اور الحاد کی تشریح پر ختم، دکھ کی بات یہ ہے کہ ان حضرات کے دانائی کو اپنے پلڑے میں ڈال لیا جاتا ہے اور الحاد کو دوسروں کے سر تھوپ دیا جاتا اور اگر اپنا الحاد روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جائے تو اسے حکمتِ عملی کا نام دے دیا جاتا ہے فریب دہی یا فریب خوردگی کی بات اور ہے۔ ورنہ محض اصطلاح کے بدل دینے سے تو الحاد الہام نہیں ہو جاتا ـــــ (طلوعِ اسلام اپریل ۱۹۷۳ء)

تفہیم القرآن مودودی صاحب جلد پنجم پر ایک نظر

کفر و اسلام کی جنگ میں مومن کا رویہ

سورۂ محمدؐ کی آیت ۲۶ ذَالِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوا لِلَّذِينَ كَرِهُوا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ سَنُطِيعُكُمْ فِي بَعْضِ الْاَمْرِ ۚ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِسْرَارَهُمْ (اس لیے انہوں نے اللہ کے لیے نازل کردہ دین کو ناپسند کرنیوالوں سے کہہ دیا کہ بعض معاملات میں ہم تمہاری مانیں گے۔ اللہ ان کی یہ خفیہ باتیں خوب جانتا ہے) کی تفسیر بیان کرتے ہوئے آخر میں فرماتے ہیں۔

"یہ آیات اس معاملہ میں بالکل ناطق ہیں کہ کفر و اسلام کی جنگ میں جس شخص کی ہمدردیاں اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ نہ ہوں یا کفر اور کفار کے ساتھ ہوں، اس کا ایمان ہی سرے سے معتبر نہیں ہے کجا کہ اس کا عمل خدا کے ہاں مقبول ہو (ص ۲۹)

ہمارے علماءِ اسلام کی جو تعلیمات عامۃ الناس کے سامنے پیش کرتے ہیں، اگر وہ خود بھی اس پر عمل کرتے تو دنیا جنت بن جاتی (مثلاً اسی سب سے اہم مسئلے یعنی کفر و اسلام کی جنگ میں خود مودودی صاحب کا کردار ملاحظہ ہو۔

جس وقت تحریکِ پاکستان پورے عروج پر تھی، علماء کی طرف سے اس کی مخالفت ہو رہی تھی لیکن اسوقت علماء ہی کی ایک قابلِ صد احترام ہستی علامہ شبیر احمد عثمانی نے یہ

فتویٰ دیا کہ اسوقت مسلمانوں کے علیحدہ وطن کے لیے جو کوششیں ہو رہی ہیں وہ ایک قسم کی کفر و اسلام کی جنگ ہے۔ تاہم وہ بڑے حقیقت پسند عالم دین تھے۔ اس لیے اس کے ساتھ انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ پاکستان کا نام سن کر کسی شخص کو یہ غلط فہمی یا خوش فہمی نہیں ہونی چاہیئے کہ اس خطہ میں بلا تاخیر فوراً خلافت راشدہ یا خالص قرآنی اور اسلامی حکومت قائم ہو جائے گی۔ ضرورت سے زیادہ امیدیں دلانا یا توقعات باندھنا کسی عاقبت اندیش حقیقت پسند کے لیے زیبا نہیں ہاں یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ پاکستان ایک ایسا ابتدائی قدم ہے جو انجام کار قرآنی اصول کے مطابق احکم الحاکمین کی حکومت عادل قائم ہونے پر کسی وقت منتہی ہو سکتا ہے (روزنامہ منشور دہلی بابت ۱۲ نومبر ۱۹۴۵ء)

چنانچہ اسوقت جو اس مقصد کیلیے ووٹ ہو رہے تھے، انہیں پاکستان کے حق میں دلوانے کے لیے انہوں نے ملک گیر دورہ کیا اور اس کے خاطر خواہ نتائج قیام پاکستان کے حق میں نکلے

مودودی صاحب جس طرح قیام پاکستان کے مخالف تھے اسکی تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں۔ ہم یہاں صرف یہ دکھاتے ہیں کہ علامہ صاحب کی کوششوں سے بعض ایسے لوگ بھی متاثر ہو گئے جن کا تعلق جماعت اسلامی سے تھا لیکن پاکستان کے حق میں ووٹ دینے سے پہلے انہوں نے ایک دفعہ پھر اپنے امیر جناب مودودی سے پوچھ لینا مناسب سمجھا۔ اس کے جواب میں انہوں نے کفر و اسلام کی جنگ میں جو مومنانہ رویہ اختیار کیا، اسے ان ہی کی زبانی سنیئے:۔

"ووٹ اور الیکشن کے معاملے میں ہماری پوزیشن کو صاف صاف ذہن نشین کر لیجیے۔ پیش آمدہ انتخابات یا آئندہ آنیوالے اسی طرح کے انتخابات کی اہمیت جو کچھ ہو اور ان کا جیسا کچھ بھی اثر ہماری قوم یا ہمارے ملک پر پڑتا ہو بہر حال ایک با اصول جماعت ہونے کی حیثیت سے ہمارے لیے یہ ناممکن ہے کہ کسی وقت مصلحت کی بنا پر ہم ان اصولوں کی قربانی گوارا کر لیں جن پر ہم ایمان لائے ہیں (رسائل و مسائل مطبوعہ لاہور حصہ اول صـ۲۳۳)

ہو سکتا ہے کہ قیام پاکستان سے پہلے، قیام پاکستان کی جنگ کو کفر و اسلام کی جنگ قرار دینے کے بارے میں مودودی صاحب کو کوئی شبہ ہو لیکن قیام پاکستان کے بعد

تو وہ اٹھتے بیٹھتے اس کا اعلان کرتے رہتے ہیں انہی کے الفاظ میں :-

" اس ملک کے مستقبل اور اس کی آفرینش کا انحصار ایک ہی چیز پر ہے کہ اللہ تعالیٰ سے جو وعدہ تحریک پاکستان کے دوران میں کیا گیا تھا اُسے ایمانداری سے پورا کیا جائے۔ وعدہ یہ تھا کہ اس سرزمین کو اسلام کا گہوارہ بنایا جائے گا۔ اس میں اسلام کا قانون نافذ کیا جائے گا" (ہفت روزہ "ایشیا" لاہور بابت ۴ فروری ۱۹۷۳ء)

اپنے اس فیصلے کی روشنی میں وہ خود ہی فرمادیں کہ کفر و اسلام کی جنگ میں اُن کا رویہ کس قسم کا تھا۔؟ مومنانہ یا کافرانہ ؟ــــ اور ان کی ہمدردیاں کس گروہ کے ساتھ تھیں۔

سچ ہے کہ مکتب مودودی سے مولانا کوثر نیازی یہی کہتے ہوئے الگ اور اس اسلام سوز ریکارڈ رکھنے والی جماعت سے جدا ہوتے ــــ

کہ مکتب نیست جز سحر و فسونے (اقبالؒ)

اور یہ سمجھ کر کہ :- ملاّ کی نظر نورِ فراست سے ہے خالی (اقبالؒ)

یہاں الجھاؤ ہی الجھاؤ ہے۔ بناؤ نہیں، تعمیر ملت کے احساسات نہیں بگاڑ ہی بگاڑ ہے۔ (چودھری حبیب احمد)

تفہیم القرآن (مودودی صاحب جلد ششم) پر ایک نظر

اب ہم اپنے سفر کی آخری منزل تک پہنچ گئے ہیں اور مودودی صاحب کی تفسیر، تفہیم القرآن کی چھٹی اور آخری جلد تبصرے کے لیے پیش نظر ہے۔ اس جلد کی ابتدا سورۃ التحریم سے ہوتی ہے جس میں شریعت اسلامیہ کے ایک بنیادی مسئلہ پر بحث ہے۔ وہ مسئلہ یہ ہے کہ حلال و حرام کی حدود مقرر کرنے کا اختیار کسے حاصل ہے؟ اس سلسلے میں جناب مفسّر سورۃ کے دیباچے میں فرماتے ہیں۔

حلال و حرام کی حدود مقرر کرنیکا اختیار

" ایک یہ کہ حلال و حرام اور جائز و ناجائز کے حدود مقرر کرنے کے

اختیارات قطعی طور پر اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں اور عام انسان تو درکنار خود اللہ کے نبی کی طرف بھی ان کا کوئی حصہ منتقل نہیں کیا گیا ہے۔ نبی بحیثیت نبی اگر کسی چیز کو حرام یا حلال قرار دے سکتا ہے تو صرف اس صورت میں جبکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اشارہ ہو، قطع نظر اس سے کہ وہ اشارہ قرآن مجید میں نازل ہوا ہو۔ یا وحی خفی کے طور کیا گیا ہو۔ لیکن بطور خود اللہ کی مباح کی ہوئی چیز کو حرام کر لینے کا مجاز نبی بھی نہیں ہے۔ کجا کہ کوئی اور شخص ہو سکے۔" (ص۱)

پھر سورت کی پہلی آیت یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَۚ (اے نبی کیوں اس چیز کو حرام کرتے ہو جو اللہ نے تمہارے لیے حلال کی ہے" کی تفسیر کے ذیل میں لکھتے ہیں:۔

"یہ دراصل استفہام نہیں ہے بلکہ ناپسندیدگی کا اظہار ہے یعنی مقصود نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دریافت کرنا نہیں ہے کہ آپ نے یہ کام کیوں کیا۔ بلکہ آپ کو اس بات پر متنبہ کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حلال کی ہوئی چیز کو اپنے اوپر حرام کر لینے کا جو فعل آپ سے صادر ہوا ہے وہ اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے۔ اس سے خود بخود یہ مضمون مترشح ہوتا ہے کہ اللہ نے جس چیز کو حلال کیا ہے اسے حرام کرنے کا اختیار کسی کو بھی نہیں ہے، حتیٰ کہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی یہ اختیار نہیں ہے۔ (ص۱۵)

بڑی خوشی کی بات ہے کہ مودودی صاحب نے شریعت اسلامیہ کے اس بنیادی اصول کو تسلیم کر لیا ہے کہ حلال و حرام کی حدود مقرر کرنے کا اختیار صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے کسی دوسرے شخص یہانتک کہ انسانوں تک اللہ تعالیٰ کی شریعت پہنچانے والے انبیاء کو بھی یہ اختیار عطا نہیں کیا گیا لیکن وہ وحی خفی کی آڑ میں اس بنیادی اصول کی تنسیخ اس انداز سے کر جاتے ہیں کہ انبیاء تو گویا خود اپنے لیے بھی حلال و حرام کی حدود مقرر کرنے کا اختیار حاصل کر لیتے ہیں، پھر بات صرف اصول تک ہی نہیں رہتی بلکہ عملاً ان چیزوں کو حلال قرار دیتے ہیں جنہیں اللہ اور اس کے رسول صلعم واضح الفاظ میں حرام قرار دیتے ہیں

حرام کو حلال قرار دینے کی عملی مثال

ہو سکتا ہے کہ قارئین ہمارے اس دعویٰ کو شک کی نظروں سے دیکھیں اور کہیں کہ اتنا بڑا مفسرِ قرآن شریعتِ اسلامیہ کے ایک بنیادی اصول کو تسلیم کر لینے کے بعد اس کی خلاف ورزی کر سکتا ہے؟ تو لیجئے ہم ان کے اطمینان کی خاطر ایک ایسی مثال پیش کیے دیتے ہیں جس کا تعلق کروڑوں انسانوں سے ہے اس بارے میں شاید کسی اہل علم کو اختلاف نہیں کہ شریعت اسلامیہ میں سود سب سے بڑی لعنت ہے اور قرآن حکیم نے اسے انسانیت کے لیے سب سے زیادہ سنگین جرم قرار دیا ہے۔ یہانتک کہ سودی معاملات کو اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ عداوت قرار دیا ہے۔ اس کی اس سنگینی کو مدِّنظر رکھتے ہوئے حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا سود کے احکامات چونکہ آخر میں نازل ہوئے تھے، اور حضور صلعم انہیں ہمارے لیے پوری طرح واضح نہ کر سکتے تھے، اسلیئے سود اور جن چیزوں میں سود کا شبہ ہو، وہ سب ترک کر دو۔ (احکام القرآن للجصاص جلد اول ص ۵۵۱)

اب سود جیسی حرام چیز کو حلال قرار دینا کوئی آسان بات نہیں۔ اس لیے بظاہر تو مودودی صاحب بھی اسے حرام قرار دیتے ہیں بلکہ شرعی احکامات کی تائید میں لمبے چوڑے عقلی دلائل بھی دیتے ہیں ایسے کچھ دلائل ان ہی کی زبانی سُن لیجئے۔

"تجارت، صنعت و حرفت اور زراعت میں انسان محنت اور ذہانت صرف کرتا ہے اور اس کا فائدہ لیتا ہے۔ مگر سودی کاروبار میں وہ محض اپنی ضروریات سے زائد مال دے کر بلا کسی محنت و مشقت اور صرف کمال کے، دوسروں کی کمائی میں شریک غالب بن جاتا ہے اس کی حیثیت اصطلاحی شریک کی نہیں ہوتی جو نفع و نقصان دونوں میں شریک ہوتا ہے اور بلا لحاظ نفع و نقصان اور بلا لحاظ مناسب نفع اپنے مقرر اور مشروط منافع کا دعویدار رہتا ہے۔ (سود حصہ اول ص ۳۷)

سود کی اس واضح حرمت کو تسلیم کر لینے کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے کون کون سے معاملات سود کی تعریف میں آتے ہیں۔ عام طور پر ہمارے اکثر اہلِ علم اور عامۃ الناس یہ سمجھتے ہیں کہ سود وہ ہے جو بنکوں میں لیا دیا جاتا ہے اور بس۔

حالانکہ حضور صلعم کے زمانے میں اِن بنکوں کا رواج تک نہ تھا۔ اور یہ بڑی حیران کن حقیقت ہے کہ جن معاملات کو آپ واضح طور پر سود قرار دے گئے تھے، انہیں ہماری مفاد پرستیوں نے حلال و طیّب قرار دے دیا۔ اختصار کو مدّنظر رکھتے ہوئے ہم صرف ایک ایسے معاملے کی مثال پیش کرتے ہیں اور یہ معاملہ زمین کی بٹائی کا ہے جیسا کہ قارئین جانتے ہوں گے۔ اس معاملے سے مراد یہ ہے کہ زمین کا مالک کوئی اور ہو اور اس زمین پر کام کرنیوالا کوئی دُوسرا شخص ہو اور فصل کے تیار ہونے پر کام کرنے والا شخص جسے اصطلاح میں مزارعہ کہتے ہیں فصل کا تقریباً نصف مالکِ زمین کے حوالے کر دے۔ حضور صلعم بٹائی کے اس معاملے کو واضح الفاظ میں سود قرار دیتے ہیں۔ حدیث کی مشہور کتاب سنن ابن داؤد میں کتاب البیوع کی حدیث نمبر ۳۴۰۲ میں حضور صلعم کا یہ ارشاد موجود ہے اور یہی نہیں بلکہ حدیث کے راوی حضرت رافع بن خدیج کو جنہوں نے ایسا معاملہ کر رکھا تھا، یہ سودی معاملہ ختم کرنے کا فوری حکم دیا، بلکہ اس سے اگلی حدیث نمبر ۳۴۰۶ میں تو آپ نے بٹائی کی حرمت کے لیے وہی سخت الفاظ استعمال کیے ہیں جو قرآن مجید میں سود کی حرمت کے لیے آئے ہیں ملاحظہ ہو:

مَن لم یذر المخابرۃ فلیاذن بحربٍ مِّنَ اللہ وَرسولہٖ۔ جو بٹائی کے معاملے کو ترک کرنے پر آمادہ نہیں وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے ساتھ جنگ کے لیے تیار ہو جائے۔"

امام ابوداؤدؒ نے ان دونوں احادیث کو صحیح قرار دیا ہے۔ ان صحیح ارشادات نبوی سے قطعِ نظر سود کی حرمت کے بارے میں خود مودودی صاحب کی مذکورہ بالا عقلی تشریح کو سامنے رکھیئے تو بھی بٹائی کا معاملہ سودی قرار پاتا ہے یعنی ایک شخص اپنی ضرورت سے زائد سرمایہ کو بنک میں رکھ کر بلا کسی محنت و مشقت کے اس کا فائدہ اٹھاتا ہے یعنی معمولی شرح سود حاصل کرتا ہے تو وُہ بالاتفاق حرام ہے۔ لیکن اگر وُہ اسی زائد سرمائے کو بنک میں رکھنے کی بجائے زمین کی شکل میں کسی غریب مزارع کو دے دے اور بغیر کسی محنت و مشقت اور صرفِ کمال کے اسکی سالانہ

بھر کی محنت کا نصف بٹائی کی صورت میں وصول کر لے تو وہ کیسے اس سود کی تعریف سے خارج ہو جائے گا۔

اب چاہیئے تو یہ تھا کہ حضرت عمرؓ کی تصریح کو سامنے رکھتے ہوئے سود تو کیا شبعہ سود والی چیزوں سے بھی ہم اپنے آپ کو بچاتے لیکن مودودی صاحب قرآن مجید کے واضح احکام اور حضور صلعم کی واضح ترین تشریحات کو پس پشت ڈالتے ہوئے ڈنکے کی چوٹ، بٹائی کے سودی معاملے کو جائز قرار دیتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اسے سودی قرار دینے والوں کا منہ بند کرنے کے لیے اس کے جواز کے بارے میں ایک پوری کتاب "مسئلہ ملکیت زمین" تصنیف فرما دیتے ہیں اور اس طرح سے حلال و حرام کی حدود متقرر کرنے کے خدائی اختیارات جو اُن کی اپنی تحقیق کے مطابق حضور صلعم تک کو نہیں دیے جا سکتے تھے۔ خود اپنے لیے حاصل کر کے اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیز کو حلال قرار دے دیتے ہیں

قرآن حکیم میں سرمایہ داروں کی مذمت

سورۃ الھمزہ میں سرمایہ داروں کی جو سخت الفاظ میں مذمت فرمائی گئی ہے وہ کسی تشریح کی محتاج نہیں، جہاں تک ان آیات کے ترجمے کا تعلق ہے، مودودی صاحب سرمایہ داری کے جواز کے قائل ہونے کے باوجود اس میں کوئی ڈنڈی نہیں مارتے۔ فرماتے ہیں "تباہی ہے ہر اس شخص کے لیے جو لوگوں پر طعن اور برائیاں کرنے کا خوگر ہے جس نے مال جمع کیا اور اسے گن گن کر رکھا، وہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال ہمیشہ اس کے پاس رہے گا۔ ہرگز نہیں، وہ شخص تو چکنا چور کر دینے والی جگہ اللہ کی آگ خوب بھڑکائی ہوئی جو دلوں تک پہنچے گی، وہ اُن پر ڈھانک کر بند کر دی جائے گی۔ اس حالت میں وہ اونچے اونچے ستونوں میں گھرے ہوئے ہوں گے (ص ۵۸۴)

سرمایہ داروں اور سرمایہ داری کی مذمت میں قرآن مجید کے ان سخت وعیدوں کو پڑھنے کے بعد کوئی ہوشمند انسان سرمایہ داری کا نام لینے کی بھی جرأت نہیں کرے گا۔ لیکن مودودی صاحب کی مصیبت یہ ہے کہ وہ اس صورت کی تفسیر لکھنے سے پہلے سرمایہ داری کے جواز کے بارے میں ایک مستقل کتاب "مسئلہ ملکیت زمین" لکھ چکے ہیں جس

میں وہ سرمایہ داری کو ڈنکے کی چوٹ جائز قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں :-

"اسلام جس چیز کا آدمی کو پابند کرتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کے پاس جو کچھ مال آئے، جائز راستے سے آئے، جائز طریقے پر استعمال ہو، جائز راستوں میں جائے۔ اور خدا اور بندوں کے جو حقوق اس پر عائد کئے گئے ہیں وہ اس میں سے ادا کر دیئے جائیں اس کے بعد جس طرح وہ ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنا روپیہ اتنے مکان، اتنا تجارتی کاروبار، اتنا صنعتی کاروبار، اتنے مویشی، اتنی موٹریں اتنی کشتیاں اتنی فلاں چیز، اور اتنی فلاں چیز رکھ سکتے ہو، اسی طرح ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان آیات کا صحیح صحیح ترجمہ کرنے کے بعد صاحب مفسر کو یاد آگیا کہ انہوں نے کہیں سرمایہ داری کو جائز قرار دیا ہے۔ اس لیے وہ ترجمہ کی تشریح میں ہاتھ کی ایسی صفائی دکھاتے ہیں کہ انہی سرمایہ داری کی حرمت والی آیات سے اس کا جواز نکال لیتے ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے "مال جمع کرنے کے لیے جَمَعَ مَالًا کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جن سے مال کی کثرت کا مفہوم نکلتا ہے پھر گن گن کر رکھنے کے الفاظ سے اس شخص کے بخل اور زرپرستی نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے۔ ص ۴۵۹

یعنی مال جمع کرنا فی نفسہٖ بُرا نہیں صرف زیادہ مال جمع کرنے سے منع فرمایا گیا اور پھر سرمایہ داری کی مذمت اسکے سرمایہ کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کے بخل اور زرپرستی کی وجہ سے ہے تاہم انہوں نے عربی زبان کا وہ قاعدہ نہیں بتایا جس کے مطابق وہ جَمَعَ مَالًا (کہ جس کا سادہ ترجمہ "مال جمع کیا" ہے) سے مال کی کثرت کا مفہوم نکال رہے ہیں۔"

(طلوع اسلام جولائی ۱۹۷۳ء)

ہم نے جناب شیخ عادل ایم اے بی ٹی کی طرف سے مودودی صاحب کی تفسیر تفہیم القرآن پر کی گئی تنقید کے چند ایک اقتباسات پیش کر دیے ہیں، مزید کے لیے کتاب ہذا میں گنجائش نہ تھی جب وہ خود اسے کتابی شکل میں لائیں گے، تو مودودی صاحب کی تضاد بیانیوں کا ایک ڈھیر آپکے سامنے ہوگا۔ اور بہ حقیقت اہل علم وفہم پر روز روشن کی طرح واضح ہو جائے گی۔ کہ جس تفسیر کی خوبیوں کے ڈونگرے

برسائے جارہے ہیں، یہ کس قدر اسلام سوز، اور اغیار کے لیے اسلام کیخلاف مواد فراہم کرنے کا ایک قابلِ افسوس ذریعہ ثابت ہورہی ہے۔ شاہد عادل اس حوصلہ اور احساسِ فرض کے لیے قابلِ صد مبارکباد ہیں کہ انہوں نے اس سحر انگیز طلسم کے تار و پود بکھیرنے کے لیے فراستِ مومنانہ، اور جرأتِ قلندرانہ سے کام لیا ہے اور جماعتِ اسلامی کے امیر کی ذہنی قلابازیوں اور خلافِ اسلام، خلافِ قرآن جسارتوں کو طشت از بام کیا ہے ہمیں تفہیم القرآن پر یہی تنقید ملی ہے جسے اس غرض سے درجِ کتاب بھی کیا گیا ہے کہ دیگر صاحبانِ علم و دین بھی اپنا فرض پہچانیں (چودھری حبیب احمد)

باب ۱۹

خلافت و ملوکیت پر تنقیدات

مولوی مودودی کی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شان میں گستاخی

مولانا یہ آپ کی تحریر ہے ؎ شوخیٔ باطل ببیں اندر کمین حق نشست (اقبالؒ)

"حضرت عثمان رضؓ نے اپنی حکومت کے آخری ۴ سالوں میں اپنے رشتہ داروں اور خاندان کے لوگوں کو حکومت کے عہدے دیئے۔ کے لیے مصر کا خمس (یعنی افریقہ کے اموالِ غنیمت کا خمس جو مصر کے ... کی طرف سے آیا تھا) لکھ دیا۔ اپنے رشتہ داروں کو مالی عطیے دیئے۔ اور اس معاملہ میں تاویل کی کہ یہ صلہ رحمی ہے جس کا اللہ نے حکم دیا ہے۔ انہوں نے بیت المال سے روپیہ بھی لیا اور قرض بھی اور کہا کہ ابوبکرؓ و عمرؓ نے اس مال میں سے اپنا حق چھوڑ دیا تھا اور میں نے اسے لے کر اپنے اقربا میں تقسیم کیا۔ (خلافت و ملوکیت صـ۳۲۶) نقلاً عن طبری ج ۳ صـ۳۱۴)

اور واللہ یہ بھی طبری میں ہے

طبری روایت کرتے ہیں حضرت عثمان منبر کے قریب بیٹھے ہیں۔ اصحابِ رسول اللہ نے ان کو گھیر رکھا ہے۔ سیدنا عثمان حمد و ثنا کے بعد معترضین کا جواب دیتے ہیں اور فرمایا

واما اعطاؤ ھم فانی ما اعطیھم من مالی ولا امستحل اموال الناس لنفسی ولا لاحد من الناس و قال الملحدون ما قالوا۔

ترجمہ: جو کچھ میں نے رشتہ داروں کو مال دیا ہے تو وہ ان کو اپنے مال سے دیا ہے میں بیت المال کا مال اپنے لیے اور نہ کسی اور کے لیے استعمال کرنا جائز سمجھتا ہوں۔ اور ملحدوں نے جو کچھ چاہا میری نسبت کر دیا۔ حضرت عثمان رضؓ کا یہ جواب سنکر تمام صحابہ مطمئن ہو جاتے ہیں اور عرض کرتے ہیں کہ اے خلیفۃ المسلمین ہمیں اجازت دیں کہ ہم ان کو قتل کر دیں لیکن حضرت عثمان رضؓ نے اپ حکم نہ دیا۔ (طبری ج صـ۳۸۵)

اس سے پہلے کہ میں مکتوبہ بالا دو حوالوں پر کچھ عرض کروں مودودی صاحب کی یہ عبارت بھی پڑھ لیں۔

مولانا مودودی صاحب سیّدنا علیؓ کی شان بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-

جب دونوں طرح کی روایات موجود ہیں اور سند کے ساتھ بیان ہوئی ہیں ۔ تو آخر ہم کیوں ان روایات کو ترجیح نہ دیں جو ان کے مجموعی طرزِ عمل سے مناسبت رکھتی ہیں اور خواہ مخواہ وہی روایات کیوں قبول کریں جو اسکی ضد نظر آتی ہیں ۔

(خلافت وملوکیت ص۳۴۷ ، ۳۴۸)

تو اب غور طلب بات یہ ہے کہ طبری میں اور اسی طرح کی دوسری تاریخ کی کتابوں میں ہر طرح کی روایات موجود ہیں ۔ وہ بھی جس میں سیّدنا حضرت عثمانؓ کی لغزشات بیان کی گئی ہیں اور وہ بھی جن سے ان کی شان اور عظمت معلوم ہوتی ہے اور پھر راویوں کے حالات کے دیکھنے سے یہ بھی خوب واضح ہو جاتا ہے کہ وہ روایات جن سے سیّدنا عثمان کی برات اور عظمت معلوم ہوتی ہے وہ زیادہ معتبر اور قوی ہیں اور یہی روایات ان کے مجموعی طرزِ عمل سے مناسب رکھتی ہیں ۔

تو پھر حیرت یہ ہے کہ مولانا مودودی سیّدنا علی کے متعلق تو یہی فیصلہ کرتے ہیں کہ ان کے متعلق جو روایات ایسی ہیں جن میں اُن کی کچھ لغزشات ہیں وہ تو چھوڑ دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اس قسم کی روایات ان کے مجموعی طرزِ عمل سے مناسبت نہیں رکھتیں ان کو چھوڑ دینا چاہیئے ۔

لیکن جناب مودودی کے سامنے جب سیّدنا عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ذاتِ گرامی کا معاملہ پیش ہوتا ہے تو وُہ ہر کمزور روائت کو نقل کرتے اور قبول کرتے چلے جاتے ہیں جن سے کچھ سیّدنا عثمان کی کمزوری معلوم ہوتی ہے ۔ اور ان روایات کو خواہ وہ کتنی ہی مستند اور قوی کیوں نہ ہوں چھوڑتے جاتے ہیں جن سے سیدنا عثمان رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی برات اور عظمتِ شان معلوم ہوتی ہے ۔

کیا یہ کہیں بغضِ عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا دل میں روگ تو نہیں ہے ؟ اور اگر ایسا ہے اور حالات سے کچھ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے تو مودودی صاحب اپنی عاقبت کی خیر منائیں اور سُن لیں کہ سیدنا عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جن سبائیوں نے مختلف الزامات سے متہم

کیا تھا۔ سیدنا عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کو جواب دیتے ہوئے ملحدین کے لفظ سے یاد
تھا اور حضور علیہ السلام نے ایک شخص کا جنازہ محض اس لئے نہ پڑھا (انہ یبغض عثمان)
کہ وہ دل سیدنا عثمان سے بغض رکھتا تھا۔

ہر ایک بات کی آخر کچھ انتہا بھی ہے ؎ ترا غرور مرا عجز تا کجا ظالم

مندرجہ بالا تحریر جناب مولوی غلام محمد صاحب راجن پور کی ہے جسے ہم نے "الحدید" اگست
لاہور صفحہ ۳۳ و ۳۴ سے نقل کیا ہے۔ (مرتب)

ماہنامہ البلاغ کراچی

ماہنامہ البلاغ دارالعلوم کراچی کا ترجمان جس کے سرپرست مولانا مفتی محمد شفیع صاحب اور مدیر اعلیٰ محمد تقی عثمانی
ہیں اسکے شمارہ ۱۰ جلد ۲، اپریل ۱۹۶۹ء میں جناب محمد تقی عثمانی نے مودودی
صاحب کی کتاب "خلافت و ملوکیت" پر تنقید کا آغاز کیا ہے جو متواتر، اور
مسلسل آٹھ شماروں تک پہنچی ہے۔ اس میں عثمانی صاحب نے زیادہ تر کوشش ان
اعتراضات اور تحریرات کے جوابات دینے کی فرمائی ہے جو مودودی صاحب کی
تحریر سے حضرت امیر معاویہؓ پر وارد ہوئے ہیں۔ انہوں نے تو کافی تفصیل سے مولانا
مودودی کے الزامات کو غلط اور بے بنیاد ثابت کیا ہے لیکن ہم یہاں جستہ جستہ
اقتباسات پیش کر رہے ہیں۔

ملاحظہ فرمائیے:۔

آپ حضرت معاویہؓ اور خلافت و ملوکیت کے عنوان سے اپنی تحریر کا یوں آغاز کرتے ہیں
"چند سال پہلے جناب مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی جو کتاب "خلافت و ملوکیت"
کے نام سے شائع ہوئی اسکے بارے میں البلاغ کے اجراء کے وقت سے ہمارے پاس خطوط کا تانتا
بندھا رہا ہے۔ ملک اور بیرون ملک سے مختلف حضرات اس کتاب کے بارے میں ہمارا موقف
پوچھتے رہتے ہیں۔ اب تک ہم نے اس موضوع پر دو وجہ سے کچھ شائع کرنے سے گریز
کیا ہے۔ ایک وجہ تو یہ ہے کہ البلاغ کا بنیادی مقصد اس قسم کی بحثوں سے میل نہیں کھاتا۔
ہماری کوشش روز اول سے یہ رہی ہے اور انشاء اللہ آئندہ بھی یہی رہے گی کہ البلاغ کی تمام تر توجہ
ان بنیادی مسائل کی طرف رکھی جائے جو بحیثیت مجموعی پوری امت مسلمہ کو درپیش ہیں۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ "خلافت وملوکیت" کا جو حصہ اسوقت سوالات اور اعتراضات کا محور بنا ہوا ہے، وہ ایک ایسے مسئلے سے متعلق ہے جسے بحث وتمحیص کا موضوع بنانا بہ حالاتِ موجودہ ہم کسی کے لیے بھی مناسب نہیں سمجھتے تھے۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین انبیاء کے بعد زیادہ مقدس اور پاکیزہ ہیں کہ زمین و آسمان کی نگاہوں نے انبیاء علیہم السلام کے بعد ان سے زیادہ مقدس اور پاکیزہ انسان نہیں دیکھے۔ حق وصداقت کے اس مقدس قافلے کا ہر فرد اتنا بلند کردار اور نفسانیت سے اسقدر دور تھا کہ انسانیت کی تاریخ اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے۔ اور اگر کسی سے کبھی کوئی لغزش ہوئی بھی ہوئی ہے تو اللہ تعالیٰ نے اسے معاف فرما کر ان کے جنتی ہونے کا اعلان فرما دیا ہے۔"

صفحہ نمبر ۲۱ پر رقمطراز ہیں

"پوری کتاب پر کماحقہ تبصرہ کرنا تو چند در چند وجوہ کی بنا پر ہمارے لیے ممکن نہیں، ہم یہاں صرف ان اعتراضات کو زیر بحث لائیں گے جو مودودی صاحب نے حضرت معاویہؓ پر وارد کئے ہیں حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں مولانا مودودی صاحب نے جو کچھ لکھا ہے وہ بھی کئی مقامات پر اپنے اسلوب بیان اور کئی جگہوں پر اپنے مواد کے لحاظ سے کچھ کم افسوسناک نہیں ہے لیکن حضرت معاویہؓ کے بارے میں تو وہ انتہائی خطرناک حد تک پہنچ گئے ہیں اور ہماری پر خلوص دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں اس سے واپس لوٹنے کی توفیق عطا فرمائے۔

بدعت کا الزام "قانون کی بالاتری کا خاتمہ" کے عنوان کے تحت مولانا لکھتے ہیں :-

"ان بادشاہوں کی سیاست دین کے تابع نہ تھی۔ اس کے تقاضے وہ ہر جائز و ناجائز طریقے سے پورے کرتے تھے اور اس معاملے میں حلال وحرام کی تمیز روا نہ رکھتے تھے، مختلف خلفائے بنی امیہ کے عہد میں قانون کی پابندی کا

کیا حال رہا، اسے ہم آگے کی سطور میں بیان کرتے ہیں۔

حضرت معاویہ کے عہد میں

"یہ پالیسی حضرت معاویہؓ کے عہد میں شروع ہو گئی تھی۔" (البلاغ ص ۲۲)

مالِ غنیمت میں خیانت

ایک ایسی قسم کا اعتراض مولانا مودودی صاحب نے یہ کیا ہے کہ:۔

"مالِ غنیمت کی تقسیم کے معاملے میں بھی حضرت معاویہؓ نے کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ کے صریح احکام کی خلاف ورزی کی۔ کتاب و سنت کی رو سے پورے مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ بیت المال میں داخل ہونا چاہیئے اور باقی چار حصے اس فوج میں تقسیم ہونے چاہئیں۔ جو لڑائی میں شریک ہوئی ہو۔ لیکن حضرت معاویہؓ نے حکم دیا کہ مالِ غنیمت میں سے چاندی سونا ان کے لیے الگ نکال دیا جائے پھر باقی مال شرعی قاعدے کے مطابق تقسیم کیا جائے۔" (ص: ۱۷۴)

اس اعتراض کی سند میں مولانا نے پانچ کتابوں کے حوالے دیئے ہیں جن میں سے ایک البدایۃ والنہایۃ ص۲۹ جلد ۸ کا حوالہ بھی ہے۔ ہم یہاں اس کی اصل عبارت نقل کرتے ہیں:۔

"وفی هذه السنة غزا الحكم بن عمرو نائب زياد على خراسان جبل الأسل عن امر زياد فقتل منهم خلقا كثيرا وغنيم اموالا جمة فكتب اليه زياد ان امير المؤمنين قد جاء كتابه ان يصطفى له كل صفراء و بيضاء يعنى الذهب والفضة يجمع كله من هذا الغنيمة لبيت المال فكتب الحكم بن عمرو ان كتاب الله مقدم على كتاب امير المؤمنين وانه والله لو كانت السماوات والارض على عبد فاتقى الله يجعل له مخرجا، ثم نادى الناس ان اغدوا على قسم غنيمتكم فقسمها بينهم وخالف زيادا فيما كتب اليه عن معاوية وعزل الخمس كما امر

سنہ ۴۵ھ

اسی سال خراسان میں زیاد کے نائب حضرت حکم بن عمرو رض نے زیاد کے حکم سے
الاسل کے مقام پر جہاد کیا۔ بہت سے آدمیوں کو قتل کیا اور بہت سامانِ غنیمت
حاصل کیا۔ تو زیاد نے انہیں لکھا کہ امیرالمؤمنین کا خط آیا کہ سونا چاندی ان کے
الگ کر لیا جائے۔ اور اس مالِ غنیمت کا سارا سونا چاندی بیت المال کے لیے

جمع کیا جائے۔ حکم بن عمرو رض نے جواب میں لکھا کہ اللہ کی کتاب امیرالمؤمنین کے خط پر
مقدم ہے اور خدا کی قسم اگر آسمان و زمین کسی کے دشمن ہو جائیں اور وہ اللہ سے ڈرے
اللہ اس کے لیے کوئی نہ کوئی راہ نکال لیتا ہے۔ پھر انہوں نے لوگوں میں اعلان کیا کہ
نے اپنے مالِ غنیمت کو لوگوں میں تقسیم کر دیا۔ اور زیاد نے حضرت معاویہ رض کی طرف
منسوب کر کے جو کچھ انہیں لکھا تھا۔ اس کی مخالفت کی اور مالِ غنیمت کا پانچواں
حصہ اللہ اور اس کے رسول کے حکم کے مطابق بیت المال الگ کیا۔"

اس عبارت کا مولانا مودودی صاحب کی عبارت کے ساتھ مقابلہ فرمائیے تو
مندرجہ ذیل فرق واضح طور پر نظر آئیں گے۔

(۱) البدایۃ والنہایۃ کی اس عبارت میں صاف تصریح ہے کہ اس حکم کی رو سے
حضرت معاویہ رض کی ذات کے لیے سونا چاندی نکالنے کا ارادہ نہیں تھا۔ بلکہ بیت المال
کے لیے نکالنا پیشِ نظر تھا۔ حافظ ابن کثیر رح کے حکم کے الفاظ صاف لکھ رہے ہیں:

"یجمع کلہ من ھذہ الغنیمۃ لبیت المال"

"اس مالِ غنیمت میں سے سارا سونا چاندی بیت المال کے لیے جمع کیا جائے"

مگر مولانا مودودی اسی عبارت کے حوالے سے یہ تحریر فرماتے ہیں۔

حضرت معاویہ رض نے حکم دیا کہ مالِ غنیمت میں سے چاندی سونا ان کے لیے الگ نکال
لیا جائے۔" (ص: ۱۷۴)

سلہ البدایۃ والنہایۃ ص۲۹ ج ۸ - سلہ اسی وجہ سے حافظ ابن کثیر رح نے بھی یہ
الفاظ لکھے ہیں کہ "خالف زیاداً فیما کتب الیہ من معاویہ۔ اور لخالف معاویہ
نہیں فرمایا۔

ہمارا ناطقہ قطعی طور پر سر بگریبان ہے کہ اس تفاوت کی کیا تاویل کیا توجیہ [illegible]

۲۔ مولانا مودودی کی عبارت کو پڑھ کر ہر پڑھنے والا یہ تاثر لے گا کہ جن [illegible] کا مولانا نے حوالہ دیا ہے ان میں صراحت کے ساتھ حضرت معاویہؓ کا یہ حکم براہ راست منقول ہوگا۔ اسی تسلسل کو دیکھ کر مولانا نے یہ عبارت لکھی ہے لیکن آپ نے ملاحظہ [illegible] کہ البدایہ والنہایہ میں اور اسی طرح باقی تمام تواریخ میں حضرت معاویہؓ کا براہ راست کوئی حکم منقول نہیں بلکہ زیاد نے ان کی طرف منسوب کر کے اپنے ایک نائب کو یہ حکم دیا تھا اور یہ بات کسی تاریخ سے ثابت نہیں ہے کہ حضرت معاویہؓ نے واقعتاً زیاد کو ایسا لکھا تھا یا زیاد نے خواہ مخواہ ان کی طرف یہ غلط بات منسوب کر دی [illegible]

آخر میں محمد تقی عثمانی لکھتے ہیں:۔

"غرض اس مجمل واقعے کی بہت سی توجیہات ممکن ہیں اب یہ بات عقل اور دیانت کے قطعی خلاف ہوگی کہ ہم ان قوی احتمالات کو قطعی طور پر رد کر دیں جن سے حضرت معاویہؓ کی مکمل برأت واضح ہوتی ہو، اور جو ضعیف احتمالات ان کی ذات والا صفات کو مجروح کرتے ہوں انہیں اختیار کر کے بلا تأمل یہ حکم لگا دیں کہ "حضرت معاویہؓ نے مال غنیمت کی تقسیم کے معاملے میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے صریح احکام کی خلاف ورزی کی" خلاصہ یہ ہے کہ مولانا مودودی صاحب نے حضرت معاویہؓ کی طرف بات تو بالکل غلط منسوب کی ہے کہ انہوں نے مال غنیمت کا سونا چاندی اپنے لئے نکالنے کا حکم دیا تھا، ہاں زیاد کے ایک خط سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ انہوں نے سونا چاندی بیت المال کیلئے نکالنے کا حکم دیا تھا مگر اول تو زیاد کا واسطہ مخدوش ہے دوسرے ان کا یہ عمل شریعت کے خلاف نہیں تھا لہٰذا یہ اعتراض کسی طرح درست نہیں

جناب مودودی کے علم و عرفان کے کیا کہنے ہیں قارئین کرام سے عرض [illegible] لیکن [illegible] مودودی کے تمام طریقے ساحرانہ ہیں ان کی تحریریں [illegible] فریبی کا واضح مجموعہ ہیں، ان کے نوک قلم سے [illegible] اس عظمت سوز پاکان امت

کے مداحین! تو گلہ ہے مجھکو زمانے کی کورذوقی سے (اقبال) چوہدری حبیب احمد

حضرت علی پر سب و شتم

مولانا مودودی صاحب نے "قانون کی بالاتری کا خاتمہ" کے عنوان کے تحت حضرت معاویہ رض پر چوتھا اعتراض یہ کیا ہے کہ :-

"ایک اور نہایت مکروہ بدعت حضرت معاویہ رض کے عہد میں یہ شروع ہوئی کہ وہ خود اور ان کے حکم سے ان کے تمام گورنر، خطبوں میں برسرِ منبر حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سب و شتم کی بوچھاڑ کرتے تھے، حتیٰ کہ مسجد نبوی میں منبرِ رسول ؐ پر عین روضۂ نبوی کے سامنے حضور کے محبوب ترین عزیز کو گالیاں دی جاتی تھیں اور حضرت علی رض کی اولاد اور ان کے قریب ترین رشتہ دار اپنے کانوں سے یہ گالیاں سنتے تھے کسی کے مرنیکے بعد اس کو گالیاں دینا شریعت تو درکنار انسانی اخلاق کے بھی خلاف تھا اور خاص طور پر جمعہ کے خطبہ کو اس گندگی سے آلودہ کرنا تو دین و اخلاق کے لحاظ سے سخت گھناؤنا فعل تھا حضرت عمر بن عبدالعزیز نے آکر اپنے خاندان کی دوسری غلط روایات کی طرح اس روایت کو بھی بدلا اور خطبہ جمعہ میں سب علی رض کی جگہ پر آیت پڑھنی شروع کر دی : اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ ! الخ (ص ۱۷۴)

مولانا نے اس عبارت میں تین دعوے کئے ہیں، ایک یہ کہ حضرت معاویہ رض حضرت علی رض پر خود سب و شتم کی بوچھاڑ کرتے تھے دوسرے یہ کہ ان کے تمام گورنر یہ حرکت کرتے تھے، تیسرے یہ کہ یہ گورنر حضرت معاویہ رض کے حکم سے ایسا کرتے تھے اب تینوں دعوؤں کا ان کے اصل ماخذ میں مطالعہ کیجئے جہاں تک پہلے دعوے کا تعلق ہے سو حضرت معاویہ رض کی طرف اس مکروہ بدعت" کو منسوب کرنیکے لئے انہوں نے تین کتابوں کے پانچ حوالے پیش کئے ہیں ،

(طبری جلد ۴ ص ۱۸۸) ابن الاثیر ج ۳ ص ۲۳۴ ج ۴ ص ۱۵۴، البدایہ ج ۸ ص ۲۵۹، ج ۸ ص ۲۵۹، ج ۹ ص ۸۰) ہم نے ان میں سے ایک ایک حوالہ کو صرف مذکورہ ضمانت ہی پر نہیں، بلکہ اللہ کے آس پاس بھی بنظر غائر دیکھا ہمیں کسی بھی کتاب میں یہ کہیں نہیں ملا کہ حضرت معاویہ رض خود حضرت علی رض پر برسر منبر سب و شتم کی بوچھاڑ کرتے تھے لیکن چونکہ مولانا نے تصریح کے ساتھ کہا ہے کہ وہ خود (معاذ اللہ) اس انسانی اخلاق کے خلاف، فعل

کا ارتکاب کرتے تھے اس لئے ہم نے سوچا کہ شاید مولانا نے ایسی کوئی روایت کسی اور مقام پر دیکھ لی ہو اور اس کا حوالہ دینا بھول گئے ہوں، چنانچہ ہم نے مذکورہ تمام کتابوں کے متوقع مقامات پر دیر تک جستجو کی کہ شاید کوئی گری ہوئی روایت ایسی مل جائے لیکن یقین فرمایئے کہ ایسی کوئی بات ہمیں کسی کتاب میں نہیں ملی، پھر بعض اُن تواریخ کی طرف بھی رجوع کیا جن کے بارے میں مولانا کو اعتراف ہے کہ ان کے مصنف شیعہ تھے مثلاً مسعودی کی مروج الذہب لیکن اس میں ایسی کوئی بات نہیں ملی اس کے برعکس اس جستجو کے دوران ایسی متعدد روایات ہمیں ملیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت معاویہؓ حضرت علیؓ سے اختلاف کے باوجود ان کا کسقدر احترام کرتے تھے؟ حافظ ابن عبدالبرؒ لکھتے ہیں کہ حضرت معاویہ رضؓ مختلف فقہی مسائل میں حضرت علی رضؓ سے خط وکتابت کے ذریعہ معلومات حاصل کیا کرتے تھے چنانچہ جب ان کی وفات کی خبر پہنچی تو حضرت معاویہ نے فرمایا کہ

ذھب الفقہ والعلم بموت ابن ابی طالب رضؓ

ابن ابی طالب رضؓ کی موت سے فقہ اور علم رخصت ہو گئے ۱

غرض اس جستجو کے دوران ہمیں اس قسم کی تو کئی روایتیں ملیں، لیکن کوئی ایک روایت بھی ایسی نہ مل سکی جس سے یہ پتہ چلتا ہو کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ (معاذ اللہ) خطبوں میں حضرت رضؓ پر سب وشتم کی بوچھاڑ کیا کرتے تھے، خدا ہی جانتا ہے کہ مولانا مودودی صاحب نے حضرت معاویہ رضؓ پر یہ الزام کس بنیاد پر کس دل سے عائد کیا ہے؟ پھر دوسرا دعویٰ مولانا نے یہ کیا ہے کہ ان کے حکم سے ان کے تمام گورنر خطبوں میں برسر منبر حضرت علی رضؓ پر سبّ وشتم کی بوچھاڑ کرتے تھے

ظاہر ہے کہ مولانا کا یہ دعویٰ اس وقت تو ثابت ہو سکتا ہے جب وہ حضرت معاویہؓ کے تمام گورنروں کی ایک فہرست جمع فرما کر ہر ایک گورنر کے بارے میں یہ ثابت فرمائیں کہ ان میں سے ہر ایک نے انفرادی یا اجتماعی طور پر (معاذ اللہ) حضرت علیؓ کو گالیاں دی تھیں، نیز اس بات کا بھی ثبوت ان کے پاس ہو کہ ان میں سے ہر ایک کو انفرادی یا

الاستیعاب تحت الاصابہ ص ۴۵ ج ۳، ذکر سیدنا علی رضؓ بن ابی طالب

اجتماعی طور پر حضرت معاویہ رضؓ نے یہ حکم دیا تھا کہ حضرت علی رضؓ پر "سب و شتم" کی بوچھاڑ کیا کرو۔ لیکن اپنے اس الزام کی تائید میں جو حوالے مولانا پیش کئے ہیں ہم نے ان کی طرف رجوع کیا تو ان میں سے ایک بات بھی صحیح ثابت نہیں ہو سکی۔ (البلاغ مئی ۱۹۶۹ء تا ۱۳)

حضرت معاویہؓ اور خلافت و ملوکیت

گورنروں کو کھلی چھٹی

حضرت معاویہ رضؓ پر چھٹا اعتراض مولانا مودودی صاحب نے یہ کیا ہے کہ :- حضرت معاویہ رضؓ نے اپنے گورنروں کو قانون سے بالاتر قرار دیا اور ان کی زیادتیوں پر شرعی احکام کے مطابق کارروائی کرنے سے صاف انکار کر دیا (ص ۱۷۵) حضرت معاویہ رضؓ کے بارے میں اس "کلیہ" کا استنباط مولانا نے چھ واقعات سے کیا ہے "پہلا واقعہ وہ یوں نقل فرماتے ہیں، ان کا گورنر عبداللہ بن عمرو بن غیلان ایک مرتبہ بصرے میں منبر پر خطبہ دے رہا تھا ایک شخص نے دوران خطبہ میں اس کو کنکر مار دیا، اس پر عبداللہ نے اس شخص کو گرفتار کرایا اور اس کا ہاتھ کٹوا دیا حالانکہ شرعی قانون کی رو سے یہ جرم ایسا نہ تھا جس پر کسی کا ہاتھ کاٹ دیا جائے، حضرت معاویہ رضؓ کے پاس استغاثہ کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ میں ہاتھ کی دیت تو بیت المال سے ادا کر دوں گا، مگر میرے عمال سے قصاص لینے کی سبیل نہیں (ص ۱۷۵، ۱۷۶) مولانا نے یہاں بھی واقعے کے انتہائی اہم جزو کو حذف کر کے قصہ اس طرح بیان کیا ہے جس سے حضرت معاویہ رضؓ کے بارے میں نہایت غلط اور خلافِ واقعہ تاثر قائم ہوتا ہے مولانا نے اس واقعے کے لیے ابن کثیرؒ (ص ۱۷، ج ۸) اور ابنِ اثیرؒ کا حوالہ دیا ہے یہاں ہم ابنِ کثیرؒ کی پوری عبارت نقل کر دیتے ہیں، مولانا کی عبارت کا اس سے مقابلہ کر لیا جائے، اسی سال میں حضرت معاویہ رضؓ نے عبداللہ بن غیلان کو بصرہ سے معزول کر کے اس کی جگہ عبیداللہ بن زیاد کو مقرر کیا اور حضرت معاویہ رضؓ نے ابن غیلان کو جو معزول فرمایا، اس کا سبب یہ تھا کہ ایک مرتبہ وہ خطبہ دے رہا تھا کہ بنوضبہ کے کسی شخص نے اس کو کنکر مار دیا، اس نے اس شخص کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دے دیا اس کے بعد اس شخص کی قوم کے لوگ ابن غیلان کے پاس آئے اور اس سے کہا کہ اگر امیر المومنین کو یہ معلوم ہو گیا کہ تم نے اس کا ہاتھ اس وجہ سے

کاٹا تھا تو وہ اس کے اور اس قوم کے ساتھ وہی سلوک کریں گے جو حجر ابن عدی کے ساتھ کیا تھا اس لئے تم ہمیں ایک تحریر لکھ دو جس میں یہ تحریر ہو کہ تم نے ہمارے آدمی کا ہاتھ شبہ کی بنا پر کاٹا تھا، ابن غیلان نے ان کو یہ تحریر لکھ دی، ان لوگوں نے کچھ عرصہ تک یہ تحریر اپنے پاس رکھی پھر حضرت معاویہ رضؓ کے پاس پہنچے اور شکایت کی کہ آپ کے گورنر نے ہمارے آدمی کا ہاتھ شبہ کی وجہ سے کاٹ دیا ہے لہذا اس سے ہمیں قصاص دلوایئے، حضرت معاویہ رضؓ نے فرمایا کہ میرے گورنروں سے قصاص کی تو کوئی سبیل نہیں لیکن دیت دے لو چنانچہ انہیں حضرت معاویہ رضؓ نے دیت دلوائی اور ابن غیلان کو معزول کر دیا، الفاظ کے معمولی اختلاف کے ساتھ بالکل یہی واقعہ ابن اثیر جزری نے بھی نقل کیا ہے ہماری سمجھ سے بالکل باہر ہے کہ جو شخص قصاص اور دیت کے شرعی قوانین سے واقف ہو وہ اس واقعہ کو پڑھ کر حضرت معاویہؓ کے اس فیصلہ پر کوئی ادنیٰ اعتراض کس طرح کر سکتا ہے! ذرا آگے چل کر اس پر حیرت کا اظہار کیجئے یا افسوس کا، کہ ابن اثیرؒ اور ابن کثیرؒ جن کے حوالے سے مولانا مودودی صاحب نے یہ واقعہ نقل کیا ہے دونوں نے واقعہ کی ابتدا ہی معزولی کے بیان سے کی ہے اور غیر مبہم الفاظ میں بتلایا ہے کہ حضرت معاویہ رضؓ کے سامنے ملزم کے اقرار کے ساتھ مقدمہ کس طرح پیش ہوا تھا؟ مگر مولانا نہ تو معزولی کا ذکر کرتے ہیں اور نہ پیش ہونے والے مقدمے کی صحیح نوعیت کا، اور صرف حضرت معاویہ رضؓ کا یہ جملہ نقل کر دیتے ہیں کہ :-

"میرے عمّال سے قصاص لینے کی کوئی سبیل نہیں" اور اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ "۔۔۔ حضرت معاویہ رضؓ نے اپنے گورنروں کو قانون سے بالا قرار دے دیا اور ان کی زیادتیوں پر شرعی احکام کے مطابق کاروائی کرنے سے صاف انکار کر دیا،

البلاغ صفحہ ۲۰ پر

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں مولانا مودودی صاحب نے ایک بڑا زریں اصول یہ لکھا ہے کہ :- جب دونوں طرح کی روایات موجود ہیں اور سند کے ساتھ

ہوتی ہیں تو آخر ہم اُن روایات کو کیوں نہ ترجیح دیں جو ان کے مجموعی طرز عمل سے
مطابقت رکھتی ہیں اور خواہ مخواہ وہی روایات کیوں قبول کریں جو اس کی ضد نظر آتی ہیں
(خلافت و ملوکیت ص ۳۴۸) سوال یہ ہے کہ کیا اس اصول کا اطلاق حضرت معاویہ رضی
اللہ تعالیٰ عنہ پر نہیں ہوتا؟ ان حالات میں مولانا مودودی صاحب کا یہ استنباط بڑا ہی
سطحی اور جذباتی استنباط ہے کہ، یہ ساری کاروائیاں گویا اس بات کا عملاً اعلان تھیں
کہ گورنروں اور سپہ سالاروں کو ظلم کی کھلی چھٹی ہے اور سیاسی معاملات میں شریعت
کی حد کے وہ پابندی نہیں ہیں (ص ۱۷۰)

خلافت و ملوکیت اور حجر بن عدیؓ کا قتل

یہ تو اعتراضات تھے جو مولانا مودودی نے قانون کی بالاتری کا خاتمہ" کے عنوان کے تحت
حضرت معاویہ رضی پر عائد کئے تھے۔ اس کے علاوہ ایک اعتراض مولانا نے "آزادی اظہار
رائے کا خاتمہ" کے عنوان کے تحت اس طرح کیا ہے "دور ملوکیت میں ضمیروں پر قفل
چڑھا دیئے گئے اور زبانیں بند کر دی گئیں اب قاعدہ یہ ہو گیا کہ منہ کھولو تو تعریف کے لئے
کھولو، ورنہ چپ رہو، اور اگر تمہارا ضمیر ایسا ہی زوردار ہے کہ تم حق گوئی سے باز نہیں
رہ سکتے تو قید اور قتل اور کوڑوں کی مار کے لئے تیار ہو جاؤ، چنانچہ جو لوگ بھی اس دور میں
حق بولنے اور غلط کاریوں پر ٹوکنے سے باز نہ آئے ان کو بدترین سزائیں دی گئیں تاکہ پوری قوم
دہشت زدہ ہو جائے، اس نئی پالیسی کی ابتدا حضرت معاویہ رضی کے زمانہ میں حضرت حجر بن عدیؓ
کے قتل ۵۱ھ سے ہوئی جو ایک زاہد و عابد صحابی اور علمائے امت میں ایک اونچے مرتبے کے
شخص تھے، حضرت معاویہ رضی کے زمانہ میں جب منبروں پر خطبوں میں علانیہ حضرت علیؓ
پر لعنت اور سب و شتم کا سلسلہ شروع ہوا تو عام مسلمانوں کے دل ہر جگہ ہی اس سے
زخمی ہو رہے تھے، کوفہ میں حجر بن عدیؓ سے صبر نہ ہو سکا اور انہوں نے جواب میں
حضرت علیؓ کی تعریف اور حضرت معاویہ رضی کی مذمت شروع کر دی، حضرت مغیرہ
جب تک کوفہ کے گورنر رہے اور ان کے ساتھ رعایت برتتے رہے ان کے بعد جب زیاد
کی گورنری میں بصرہ کے ساتھ کوفہ بھی شامل ہو گیا تو اس کے اور ان کے درمیان کشمکش برپا

ہو گئی وہ خطبے میں حضرت علیؓ کو گالیاں دیتا تھا اور یہ اُٹھ کر اس کا جواب دینے لگتے
اُسی دوران میں ایک مرتبہ انہوں نے نمازِ جمعہ میں تاخیر پر بھی اس کو ٹوکا آخر کار اس
انہیں اور ان کے بارہ ساتھیوں کو گرفتار کر لیا اور ان کے خلاف بہت سے لوگوں کی
شہادتیں اس فردِ جرم پر لیں کہ "انہوں نے ایک جتھا بنا لیا ہے، خلیفہ کو علانیہ گالیاں دیتے
ہیں، امیر المومنین کے خلاف لڑنے کی دعوت دیتے ہیں، ان کا دعویٰ یہ ہے کہ خلافت
آلِ ابی طالب کے سوا کسی کے لئے درست نہیں ہے انہوں نے شہر میں فساد برپا
کیا اور امیر المومنین کے عامل کو نکال باہر کیا یہ ابوتراب (حضرت علیؓ) کی حمایت کرتے ہیں
ان پر رحمت بھیجتے ہیں اور ان کے مخالفین سے اظہارِ برأت کرتے ہیں ان گواہیوں میں
سے ایک گواہی قاضی شریح کی بھی ثبت کی گئی مگر انہوں نے ایک الگ خط میں حضرت معاویہؓ
کو لکھ بھیجا کہ "میں نے سنا ہے کہ آپ کے پاس حجرؓ بن عدی کے خلاف جو شہادتیں بھیجی
گئی ہیں ان میں سے ایک میری شہادت بھی ہے میری اصل شہادت حجرؓ کے متعلق یہ ہے
کہ وہ ان لوگوں میں سے ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں زکواۃ دیتے ہیں دائماً حج اور عمرہ کرتے
رہتے ہیں نیکی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے ہیں ان کا خون اور مال حرام ہے آپ
چاہیں تو انہیں قتل کر دیں ورنہ معاف کر دیں، اس طرح یہ ملزم حضرت معاویہؓ کے
پاس بھیجے گئے اور ان کے قتل کا حکم دے دیا، قتل سے پہلے جلّادوں نے ان کے سامنے
جو بات پیش کی وہ یہ تھی کہ "ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ اگر تم علیؓ سے برأت کا اظہار کرو اور
ان پر لعنت بھیجو تو تمہیں چھوڑ دیا جائے ان لوگوں نے یہ بات ماننے سے انکار کر دیا
اور حجرؓ نے کہا میں زبان سے وہ بات نہیں نکال سکتا، جو ربّ کو ناراض کرے آخر وہ اور
ان کے سات ساتھی قتل کر دیئے گئے ان میں سے ایک صاحب عبدالرحمٰن بن حسّانؓ کو
حضرت معاویہؓ نے زیاد کے پاس واپس بھیج دیا اور اس کو لکھا کہ انہیں بدترین طریقے
سے قتل کرو، چنانچہ اس نے انہیں زندہ دفن کرا دیا، اس واقعہ نے امت کے تمام
صلحاء کا دل ہلا دیا، حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت عائشہؓ کو یہ خبر سن کر سخت
رنج ہوا، حضرت عائشہؓ نے حضرت معاویہؓ کو اس فعل سے باز رکھنے کے
لئے پہلے ہی خط لکھا تھا، بعد میں جب ایک مرتبہ حضرت معاویہؓ ان سے

آئے تو انہوں نے فرمایا، اے معاویہ رضؓ تجھے حجر کو قتل کرتے ہوئے خدا کا خوف نہ ہوا، حضرت معاویہ رضؓ کے گورنر خراسان ربیع ابن زیاد الحارثی نے جب خبر سنی تو کہا کہ "خدایا اگر تیرے علم میں میرے اندر کچھ خیر باقی ہے تو مجھے دنیا سے اٹھالے"

(خلافت و ملوکیت، ص ۱۶۳ تا ۱۹۵) اس واقع میں بھی مولانا مودودی صاحب نے اوّل تو چند باتیں ایسی کہی ہیں جن کا ثبوت کسی بھی تاریخ میں یہاں تک کہ ان کے دیئے ہوئے حوالوں میں بھی نہیں ہے دوسرے یہاں بھی مولانا نے واقع کے ضروری اجزاء کو سرے سے حذف کر کے بڑا ہی خلافِ واقعہ تاثر قائم کیا ہے مولانا مودودی صاحب کی پوری عبارت ہم نے من وعن نقل کر دی ہے، اب اصل واقعہ سنیئے:۔

سب سے پہلے تو یہ سمجھ لیجئے کہ حضرت حجر بن عدی رحؒ کون تھے؟ مولانا نے انہیں علی الاطلاق زاہد و عابد صحابی رضؓ کہہ دیا ہے حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ ان کا صحابی ہونا مختلف فیہ ہے اگرچہ بعض حضرات مثلاً ابن سعد رضؓ اور مصعب زبیری رحؒ کا کہنا تو یہی ہے کہ یہ صحابی تھے لیکن امام بخاری رحؒ، ابن ابی حاتم رحؒ، ابو حاتم، خلیفہ بن خیاط رحؒ، اور ابن حبان رحمہم اللہ نے انہیں تابعین میں شمار کیا ہے، علامہ ابن سعد نے بھی ان کو ایک مقام پر صحابہ میں اور ایک مقام پر تابعین میں شمار کیا ہے اور ابو عسکری فرماتے ہیں، "اکثر المحدثین لا یصحّحون لہ صحبۃ"[1] اکثر محدثین ان کا صحابی ہونا صحیح نہیں قرار دیتے ہیں۔ یہ خود شعیان علی رضؓ میں سے تھے اور بلاشبہ تمام تاریخی روایات ان کی بزرگی اور عبادت و زہد پر متفق ہیں لیکن ان کے ساتھ غالی اور فتنہ پرداز قسم کے روافض لگ گئے تھے جو ان کی بزرگی سے ناجائز فائدہ اٹھا کر امتِ مسلمہ میں . . . برپا کرنا چاہتے تھے،

حافظ ابن کثیر رحؒ لکھتے ہیں:۔ وقد التف علی حجر جماعات شیعۃ

---

[1] الاصابہ ص ۳۱۳ ج اوّل المکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ القاہرہ ۱۳۵۸ھ [2] طبقات ابن سعد [3] البدایۃ والنہایۃ ص ۵۰ ج مطبعۃ السعادۃ [4] الاخبار الطوال للدینوری رحؒ ص ۲۲۳ القاہرہ ۱۹۶۰ء

علیٰ یتولون امرہ ویشدون علیٰ یدہ ویسبون معاویۃ ویتبرأون منہ "حضرت حجر" کو شیعیان علیؓ کی کچھ جماعتیں لپٹ گئی تھیں جو ان کے تمام امور کی دیکھ بھال کرتی تھیں اور حضرت معاویہؓ کو گالیاں دیتی تھیں [1]

آخر میں محمد تقی عثمانی رقمطراز ہیں ۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ روایت بھی ابو مخنف کی ہے (ملاحظہ ہو طبری) اور یہ بلاشبہ حضرت حسن بصریؒ پر اس کا بہتان و افتراء ہے جسے کسی حال درست تسلیم نہیں کیا جا سکتا وہ روایت یہ ہے "حضرت معاویہؓ کے چار افعال ایسے ہیں کہ اگر کوئی شخص ان میں سے کسی ایک کا بھی ارتکاب کرے تو وہ اس کے حق میں مہلک ہو۔ ایک ان کا اس امت پر تلوار سونت لینا اور مشورے کے بغیر حکومت پر قبضہ کر لینا ۔ ۔ ۔ ۔ دوسرے ان کا اپنے بیٹے کو جانشین بنانا ۔ ۔ ۔ تیسرے ان کا زیاد کو اپنے خاندان میں شامل کرنا ۔ ۔ ۔ ۔ چوتھے ان کا حجر اور ان کے ساتھیوں کو قتل کر دینا" (خلافت و ملوکیت ص ۱۶۵-۱۶۴)

(ماہنامہ" البلاغ جولائی ۱۹۶۹ء ص ۱۳ تا ۳۲)

"عبداللہ بن عمیر فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے حضرت معاویہؓ کو بہت دیر تک سخت سست کہا حضرت معاویہؓ خاموش رہے تو لوگوں نے کہا "کیا آپ اس پر بھی بردباری کا مظاہرہ فرمائیں گے؟ حضرت معاویہؓ نے فرمایا کہ "میں لوگوں اور ان کی زبانوں کے درمیان حائل نہیں ہونا چاہتا، الا یہ کہ وہ ہماری حکومت کے درمیان حائل ہونے لگیں گے" یعنی بغاوت پر آمادہ ہو جائیں ،

" طبرانیؒ اور حافظ ابن عساکرؒ نقل فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت معاویہؓ جمعہ کا خطبہ دے رہے تھے، خطبے میں" فرار من الطاعون" کی حدیث ذکر فرمائی، اس میں کوئی فروگذاشت ہو گئی تو حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ نے خطبہ کے بیچ ہی میں کھڑے ہو کر فرمایا :- تمہاری ماں ہندہ تم سے زیادہ عالم تھی ،

" حضرت معاویہؓ نے نماز کے بعد حضرت عبادہؓ کو بلا کر اس طرز کلام پر تو زبانی تنبیہ فرمائی مگر جب ان سے تحقیق ہو گئی کہ حدیث اسی طرح ہے جس طرح عبادہؓ

بھی تھے۔ میری تربیت میرے چچا صاحب کی زیر نگرانی ہوئی۔ پھر کالج کے زمانہ میں علامہ اقبال مرحوم و مغفور کی روز مرّہ کی مجالس میں بیٹھنے کے کافی مواقع ملتے رہے اور ان کے خیالات سے استفادہ کیا۔ وہ بھی نہایت شفقت سے ہر معاملہ کو سمجھاتے تھے اور میرے ذاتی رجحانات کی بنا پر انہوں نے ایک مرتبہ یہ تجویز کیا کہ میں ملازمت سے مستعفی ہو کر جامعہ ازہر میں چند سال تعلیم حاصل کروں اور پھر علامہ صاحب اور میں مل کر اسلامی فقہ پر ایک مکمل کتاب مرتب کریں مگر افسوس کہ اس تجویز کو عملی جامہ نہ پہنایا جا سکا۔ غالباً اس بات کا بھی آپ کو علم ہے۔

(۲) باوجود اس قدر خیالات میں ہم آہنگی کے مجھے دو امور میں آپ سے اختلاف تھا۔ گو میں نے کبھی اس امر کا ذکر آپ سے یا دوسرے دوستوں سے نہیں کیا۔ ایک اختلافی نقطہ طلوع اسلام کے ہر پرچہ میں مولانا مودودی صاحب کے بیانات پر شدّت سے نقطہ چینی سے متعلق تھا میں سمجھتا تھا کہ قومی مفاد کے پیش نظر ایسے اختلافی معاملات کو اتنی زیادہ اہمیت دینا مناسب نہیں۔ آجکل چونکہ ہائیکورٹ اور سپریم کورٹ تعطیلات کی وجہ سے بند ہیں اور مجھے پیشہ وارانہ مصروفیت کم ہے۔ اس لیے میں نے جون، جولائی اور اگست ۱۹۷۰ء کے طلوع اسلام کے پرچوں کا مطالعہ بالتفصیل کیا تو مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اور میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ آپ نے جو روّیہ اس معاملہ میں اختیار کیا ہوا ہے وہ بالکل درست اور مناسب نہیں بلکہ اشد ضروری ہے تا کہ قوم کسی غلط فہمی کی وجہ سے کوئی غلط اقدام نہ کر بیٹھے۔ چونکہ میں نے گذشتہ چند سالوں میں آپ کے اس جذبہ کی نسبت جو آپ کی ان تحریرات کا محرک ہے، غلط رائے قائم کی تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرے لیے یہ لازمی ہو گیا کہ میں اس غلطی کا اعتراف کر دوں یعنی اس معاملہ میں سجدہ سہو کر دوں۔

(۳) میں اب آپ سے بالکل متفق ہوں کہ مولانا موصوف خود یا ان کی جماعت کے دوسرے احباب جو توضیحات مولانا کے سابقہ روّیہ کی نسبت پاکستان کے بارے میں کر رہے ہیں وہ نہ صرف غلط ہیں بلکہ گمراہ کن ہیں اور ان کی تردید ہر بہی خواہ قوم و ملک کے لیے لازمی ہے۔ مولانا اور ان کے رفقاء کار خاصے پڑھے لکھے مسلمان ہیں اس لیے انہیں اپنی غلطی کے اعتراف میں تامّل نہ ہونا چاہیئے۔ انگریزی زبان کا مشہور مقولہ ہے۔

TO IS ERR HUMAN, BUT TO ADMIT ONE'S MISTAKE IS ANGELIC.

(غلطی کرنا بشری کمزوری ہے لیکن اپنی غلطی کا اعتراف کرنا شیوۂ ملکوتی ہے) طلوعِ اسلام)
اسلامی تعلیم اور روایات کی عین عکاسی کرتا ہے۔ کاش اس پر ہمارے لیڈر ان پر خود عمل
یں اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین کریں۔
(۴) میری دلی دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ (راقم عبدالحق)

طلوعِ اسلام غلطی کا اعتراف و اعلان درحقیقت شیوۂ ملکوتی ہے جس کے لیے بڑی وسعتِ قلب اور اخلاقی جرأت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہم
محترم شیخ صاحب کی خدمت میں ان کے اس اعتراف و اعلان پر دلی ہدیۂ تبریک پیش کرتے
ہیں۔ اے کاش! اس ہمت اور حوصلہ کا دائرہ ذرا وسیع ہو جائے ورنہ ہمارے ہاں کے اچھے
چھے خواص کی یہ کیفیت ہے کہ وہ کمرے کے اندر پرویز صاحب کی تعریف و تحسین میں رطب اللسان
ہوں گے اور باہر نکل کر ان کی مخالفت میں پیش پیش۔ قوم کو اسی منافقت نے تباہ کر دیا ہے۔
(طلوعِ اسلام اکتوبر ۱۹۷۶ء صفحہ ۵۳ تا ۵۵)

باب ۲۲

مختلف مکاتب فکر کے علماء کی آراء

مختلف نظریات رکھنے والے ہزار ہا علماء کرام اس پر متفق ہیں کہ مودودی صاحب کے عقائد جمہور مسلمانوں سے قطعاً مختلف ہیں اس لیے ان کی جماعت میں شامل ہونا اور ان عقائد باطلہ کو قبول کرنا اپنے دین و مذہب کو سخت خطرے میں ڈالنا ہے۔ ان ہزاروں علماء سے چند علماء کے بیانات یہاں درج کئے جاتے ہیں تاکہ قارئین پر اصل حقیقت واضح ہو جائے۔ (چوہدری حبیب احمد)

علماء اہل سنت و جماعت

مودودی ازم کیخلاف ۹۹۹ علماء کا فتویٰ

کل پاکستان اسلامی انقلابی کونسل کے چیئرمین شیخ عبید اللہ بن سعد جلال آبادی مشرقی پاکستان نے ایک بیان میں کہا ہے کہ مودودی کے حامی اماموں کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ ہے

ا۔ مولانا جلال آبادی نے کہا کہ جماعت اسلامی کے حامی اماموں کے پیچھے نماز مکروہ تحریمی ہے جس کا لوٹانا واجب ہے اور بعض مرتبہ تو بالکل ناجائز قرار دی جا سکتی ہے۔ انہوں نے دعویٰ کیا ہے کہ ملک کے ۹۹۹ ممتاز علماء نے جماعت اسلامی کے حامی اماموں کے پیچھے نماز نہ پڑھنے کا فتویٰ دیا ہے یہ فتویٰ ان کے پاس موجود ہے (بحوالہ اخبار جنگ کراچی ۱۵ فروری ۱۹۷۰ء)

مرکزی جمعیت العلماء پاکستان لاہور

مرکزی جمعیت العلماء پاکستان کے اس ہنگامی اجلاس میں جو بتاریخ ۲۶ نومبر ۱۹۵۰ء بوقت ۳ بجے دن دفتر مرکزی جمعیت العلماء پاکستان زیر صدارت غازی کشمیر حضرت علامہ مولانا ابوالحسنات قادری منعقد ہوا مندرجہ ذیل قراردادیں باتفاق آراء پاس

ا۔ مرکزی جمعیت العلماء پاکستان کا یہ اجلاس طے کرتا ہے کہ مولانا مودودی نے چونکہ ایک نئے مذہب فکر کی بنیاد ڈالی ہے۔ امت مسلمہ کو ایک ایسی مستقل قوت اجتہاد دیہ

کی طرف دعوت دی ہے جن کے دامن میں جمہور مسلمانوں کے دین و مذہب کے لیے پناہ کی کوئی جگہ نہیں اس لیے جمعیت ان کے ساتھ تعاون کرنے کو مسلمانانِ پاکستان بلکہ تمام عالم اسلام ایک خوفناک اقدام قرار دیتی ہے۔

۲۔ صرف یہی نہیں کہ مودودی جمہور مسلمانوں سے مختلف المذہب ہیں بلکہ ان کی واضح عبارات اس امر کی روشن دلیل ہیں کہ وہ اس کوشش میں ہیں کہ قوم انہیں مجدّد اعظم اور امام مہدی سمجھ لے۔ اگر خدانخواستہ وہ اپنے مشن میں کامیاب ہو گئے تو وہ وقت دور نہیں کہ کھلے لفظوں میں اپنے مہدی ہونے کا اعلان کر دیں اور امت مسلمہ کے سامنے دہریت، مرزائیت اشتمالیت اور اشتراکیت کی طرح مودودیت بھی ایک خوفناک فتنہ کی شکل میں نمودار ہو جائے۔ لہٰذا باتفاق قرار پایا کہ عامۃ المسلمین کو آنے والے خطرہ سے بچانے کے لیے مولانا مودودی اور مولانا کاظمی کی معنی خیز گفتگو شائع کر دیں (بحوالہ مکالمہ کاظمی مدظلہ اور مودودی صفحہ ۵-۴)

۳۔ حضرت العلامہ مولانا سید احمد سعید شاہ صاحب کاظمی مدظلہ کے مودودی کے ساتھ مکالمے کے بعد رفیق مکالمہ شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ بہاولپور

علماء نے جو خلاصہ شائع کیا، وہ ملاحظہ فرمایئے

۱۔ مودودی صاحب جمہور مسلمانوں سے مذہباً مختلف ہیں۔

۲۔ مودودی صاحب نے جمہور مفسرین، محدثین کے خلاف کتاب وسنت کے غلط معنی لے کر ایک نئے مذہب کی بنیاد قائم کی ہے جس کے پیرو جماعتِ اسلامی کے پردے میں چھپے ہوئے ہیں۔

۳۔ مودودی صاحب اپنے آپ کو ایک مجدّد کامل اور مہدی تصور کرتے ہیں۔ مگر کسی مصلحت کے ماتحت وہ ابھی اس کا اعلان نہیں کرتے ہو سکتا ہے کہ وہ کسی خاص وقت میں اس کا اعلان کر کے امتِ مسلمہ کے لیے ایک نئے عظیم الشان فتنے کا دروازہ کھول دیں اس لیے ان کی تحریک میں شامل ہونا یا ان سے تعاون کرنا اپنے دین مذہب کو خطرے میں ڈالنا ہے۔ (بحوالہ کاظمی مودودی صفحہ ۱۲)

اس خلاصہ پر مندرجہ ذیل علماء کے دستخط ہیں۔

۱۔ حضرت مولانا ارشد صاحب پناہوی ناظم جمعیت ۲۔ ملک ممتاز صاحب نیجنگ ایڈیٹر

نیوز پریس آف پاکستان لاہور، ۳۔ حضرت مولانا سید محمود احمد صاحب رضوی ایڈیٹر ماہنامہ رضوان، لاہور ۴۔ حضرت مولانا سید عبدالاحد صاحب ناظم نشریات ۵۔ حضرت مولانا غلام محمد صاحب ترنم صدر جمعیت (سابق صوبہ پنجاب ۶۔ محدث اعظم پاکستان حضرت مولانا سردار احمد صاحب

مرزا قادیانی اور مشرقی خاکسار کی طرح مودودی بھی گمراہی اور بے دینی پھیلا رہا ہے۔ مودودی کا مسلک اس کی کتابوں سے ظاہر ہے۔ امام الوہابیہ اسمٰعیل دہلوی کی تحریک وہابیت کو زندہ کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ مودودی نے اپنے رسالہ "تجدید واحیائے دین" میں وہابیوں کے امام اسمٰعیل دہلوی کو مجدد دین کی فہرست میں بطور تتمہ شمار کیا ہے۔ اور دہلوی کی کتاب تقویۃ الایمان و منصب امامت وغیرہ کی تعریف کی ہے۔ مودودی اور اسماعیل دہلوی کے عقیدے ایک ہیں مودودی نہایت ہی دریدہ دہن و گستاخ ہے (اپنی مختلف تصانیف میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان رفیع میں ایلچی۔ ان پڑھ، بدوی عرب بچے، صحرانشین۔ تماشائی۔ چرواہے ملٹری لیڈر وغیرہ الفاظ استعمال کرتا ہے۔ والعیاذ باللہ تعالیٰ۔ الغرض مودودی بڑا ہی گمراہ، بے دین ہے، جس نے اس کے رسالہ ترجمان کا مطالعہ کیا ہو، وہ اس کی گمراہیوں سے خوب واقف ہے اس کا فتنہ بہت بڑا فتنہ ہے مسلمانوں پر فرض ہے کہ اس کے فتنہ تحریکات سے علیحدہ رہیں ..... زیادہ افسوس ان "رسمی مولویوں" سے ہے جو وسیع علم کے مدعی ہو کر ایسے گمراہ بے دین کی تحریک میں آنکھیں بند کر کے داخل ہو جائیں، عوام کے لیے گمراہی کا ذریعہ بنیں اور سنیت کے پردہ میں وہابیت کی تبلیغ و اشاعت کریں۔ مولا عزوجل ہدایت عطا فرمائے آمین

(بحوالہ رضائے مصطفیٰ صفر المظفر ۱۳۹۰ھ)

۵۔ حضرت مولانا صاحبزادہ فیض علی فیضی مدظلہ، خطیب اعظم مرکزی جامع مسجد راولپنڈی

"رسول پاک کے توسط سے جو اسلام پھیلا ہے وہ مودودی صاحب کے اسلام سے قطعاً مختلف ہے۔ مودودی صاحب کا اسلام جاگیرداری کا محافظ اور زرعی اصلاحات کے خلاف ہے۔ آج ہمارے اقتصادی مسائل کا حل اسلام کے ذریعہ ہی ممکن ہے (مودودی ازم کے پاس ان مسائل کا کوئی علاج نہیں۔ پاکستان کے محب وطن شہریوں کو مودودی کے ناپاک عزائم سے ہوشیار رہنا چاہیئے۔ (بحوالہ ہفت روزہ شہاب ۳ مئی ۱۹۷۰ء)

۶۔ جامع المعقول حضرت مولانا پیر غلام جہانیاں صاحب مدظلہ خطیب مرکزی جامع مسجد ڈیرہ غازی خاں

جناب مودودی صاحب اور اُن کی موجودہ طرزِ عمل مملکت خدادا پاکستان میں تفریق بین المسلمین کا ایک عظیم فتنہ ہے۔ آپ نے فرمایا کہ مودودی صاحب کی مولفات کے مطالعہ کرنے سے یہ امر ثابت ہو چکا ہے کہ جناب مودودی کے عقائد متعلقہ شانِ رسالت، ولایت امامت عقائدِ حقّہ جمہور مسلمانوں اور علمائے اکابرین و عارفین کے بالکل متضاد ہے۔

(بحوالہ محاسبہ مودودی ص۱۱ ہفت روزہ شہاب ۶ مئی ۱۹۷۰ء)

۷۔ حضرت مولانا شیخ القرآن پیر محمد عبدالغفور صاحب ہزاروی مدظلہ۔ یہ جماعت اسلام کا نام اپنے ذاتی اغراض کے لیے استعمال کر رہی ہے (بحوالہ محاسبہ مودودی) دوسری جگہ لائل پور میں سوشلزم کی مخالفت کرتے ہوئے ساتھ ہی مودودی ازم کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ ہم مودودی کا اسلامی نظام کبھی نہیں چاہتے۔ اگر ملک میں مودودی کا پیش کردہ اسلامی نظام جس کے ساتھ کوئی ازم چسپاں ہو نافذ ہو جائے تو پاکستان کا جواز ہی باقی نہیں رہتا۔" جماعت اسلامی" کے سربراہ امریکی نظام سے متاثر اسلامی نظام نافذ کرنا چاہتے ہیں۔

جو اسلام وہ پیش کر رہے ہیں وہ علمائے حق کے نزدیک اسلام کے خلاف سازش ہے۔ ہم مودودی کے نام نہاد اسلام کے نام پر اپنے ایمان اور عقائد کو ہرگز قربان کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ (بحوالہ روزنامہ مشرق ۲۴ فروری، امروز ۲۵ فروری ۱۹۷۰ء لاہور)

مولانا غلام اللہ خاں صاحب راولپنڈی

مودودی کے نظریات کو ماننے والوں کے خلاف بیان کرنا ضروری ہے۔ اور ان کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہِ تحریمی ہے۔ (ہفت روزہ شہاب ۹ جنوری ۱۹۷۰ء)

حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی ٹنڈو الہ یار

مودودی کے فاسد نظریات ہیں جن کی وجہ سے ہم انہیں گمراہ کہتے ہیں

(ہفت روزہ شہاب ۹ جنوری ۱۹۷۰ء)

۱۔ نبوی اسلام نبی الصفوۃ والاسلام جسکی رُو سے ربّ العالمین اور ربّ الناس کے نام پر قائم کردہ نظام ہر ذی روح کے رزق کی ذمہ داری اپنے اوپر لیتا ہے (چوہدری حبیب احمد)

مودودی صاحب کے خیالات و عقائد و مضامین غلط ہیں اور ان کا مذہب اہلسنت والجماعت سے کوئی تعلق نہیں۔ (ترجمان اسلام لاہور ۲۹ دسمبر ۱۹۶۳ء) (مولانا سید محمد یوسف بنوری کراچی)

شیخ التفسیر مولانا احمد علی لاہوری

برادران اسلام! جو مودودی صاحب کی تحریک کو بہ نظر غور دیکھا جائے تو ان کی کتابوں سے جو چیز ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ مودودی ایک نیا اسلام مسلمانوں کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں اور نیا اسلام لوگ تب ہی قبول کریں گے جب پرانے اسلام کے درو دیوار منہدم کر کے دکھا دیئے جائیں اور مسلمانوں کو اس امر کا یقین دلایا جائے کہ ساڑھے تیرہ سو سال کا اسلام جو تم لئے پھرتے ہو۔ وہ ناقابل قبول، ناقابل عمل ہو گیا ہے۔ اس لیے اس نئے اسلام کو مانو، اور اسی پر عمل کرو جو مودودی صاحب پیش فرما رہے ہیں اے میرے اللہ! میرے دل کی دعا قبول فرما۔ مودودی کو ہدایت فرما اور اس کے متبعین کو بھی اس جدید اسلام سے توبہ کی توفیق عطا فرما۔ انہیں اپنا محمدی اسلام پھر نصیب فرما۔

(کتاب حق پرست علما کی مودودیت سے ناراضگی کے اسباب ص۲۳)

"مودودی صاحب محمدی اسلام کا ایک ایک ستون گرا رہے ہیں خانہ کعبہ کی توہین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین اللہ جل شانہ کی توہین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی توہین حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کی توہین تمام محدثین رحمہم اللہ کی توہین تمام مفسرین رحمہم اللہ کی توہین۔ تمام مجددین رحمہم اللہ کی توہین، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تجویز کردہ سارے دین کی توہین مسلمان اس فتنہ مودودیت میں مبتلا ہونے سے بچ جائیں۔"

(احقر الانام احمد علی شیرانوالہ دروازہ لاہور)

مولانا علامہ شمس الحق افغانی شیخ التفسیر جامعہ اسلامیہ بہاولپور

مودودی صاحب کی تحریرات پر نگاہ ڈالی گئی۔ موصوف کے متعلق احقر کا تاثر یہ ہے کہ آپ نبی کریم کے لائے ہوئے اسلام سے مطمئن نہیں اس لیے اس کو اپنے ڈھب پر لانا چاہتے ہیں جس کے لیے اصلی اسلام میں ترمیم ناگزیر ہے لیکن اس کو چھپانا بھی ضروری ہے وہ اپنی اس ترمیم کے تخریبی عمل کو انشا پردازی اقامت دین کے نعروں۔ یورپی طرز کے

پیگنڈہ کے پردوں میں چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس تخریبی عمل کے محرکات دو ہیں
نفسیاتی تعلّی اور فقدان خشیتہ اللہ" اور عوام میں بھی ان دونوں بیماریوں کی کمی بیشی یہی
ذہنی ہم رنگی دائرہ تحریک کی توسیع کی اصل وجہ ہے (۵ محرم الحرام ۱۳۸۴ھ)

مولانا خیر محمد جالندھری خیر المدارس ملتان مودودی اور ان کے متبعین کے بعض مسائل خلاف اہلسنت
والجماعت کے ہیں سلف صالحین کے اتباع کے منکر ہیں۔ لہٰذا بندہ انہیں ملحد سمجھتا ہے
(از محاسبہ مودودی ص ۵۹)

مولانا نصیر الدین شیخ الحدیث غورغشتوی مودودی ضال اور مضل ہے (یعنی گمراہ اور گمراہ کرنے والا)

علماء اہل حدیث

۱۔ حافظ الحدیث مولانا عبدالوہاب صدر آل انڈیا اہلحدیث کانفرنس

...میں برادران اہل حدیث سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ خاص وبائی امراض سے اپنے آپ
بچائیں ورنہ یہ بیماری ان کو ہی نہیں بلکہ پوری جماعت (اہلحدیث) کو ہلاک اور تباہ و برباد کر دے
محض زور سے آمین کہہ دینا اور رفع یدین کر لینا اہلحدیثیت نہیں جبتک کہ اپنے عقائد
درست نہیں کر لیں گے۔ اور سلف صالحین کے طریقے کو اختیار نہیں کریں گے، دین و نجات
نا مشکل ہے۔ پس اس جدید جماعت اسلامی کے فتنے کا ڈٹ کر مقابلہ کریں اور اس کے
رکو ہر جگہ ختم کریں ——— ہے وہ بھی غلط انداز سے کہا گیا ہے۔ مسلک اعتدال میں دماغ
کیا خانہ نے خیالات اس بے اعتدالی سے اگل دیئے ہیں کہ اگر کوئی منکر حدیث بھی لکھتا
یہی کچھ لکھتا۔ (جماعت اسلامی اور نظریۂ حدیث ص ۱۵ از مولانا سلفی)

مولانا محمد صاحب گوندلوی امیر جمعیت اہلحدیث مرکزیہ فرماتے ہیں،

مودودی صاحب لکھتے ہیں جہاں تک قرآن مجید کا تعلق ہے حیات مسیح و رفع الی

السماء قطعی طور پر ثابت نہیں۔ قرآن مجید کی مختلف آیات سے یقین نہیں ہوتا۔

(تفسیر مودودی برادران اچھرہ لاہور ۲۸ مارچ ۱۹۵۱ء)

اس پر مولانا محمد صاحب فرماتے ہیں کہ مودودی صاحب کا یہ خیال اہل سنت کے خلاف ہے اور ... کے رفع کو اس معنی میں محمل خیال کرنا کہ قرآن نے رفع کے دو پہلوؤں سے ایک روحانی اور جسمانی رفع کی تصریح نہیں کی بالکل غلط اور بے بنیاد امر ہے۔ مودودی صاحب کے نزدیک عیسیٰ علیہ السلام کا آسمانوں پر اٹھایا جانا یقینی نہیں جو تمام اہل سنت کے اجماعی عقیدہ کے خلاف ہے

مولانا محمد داؤد صاحب از ناظم اعلیٰ جماعت اہلحدیث ہند بمبئی

جس جماعت (جماعت اسلامی) کا بانی صحیح بخاری شریف کے متعلق یہ عقیدہ رکھے کہ اس کی ساری حدیثوں کو صحیح جاننا کسی شریف آدمی کا کام نہیں، جماعت اہلحدیث کا اس جماعت سے تصادم بالکل قدرتی امر ہے۔

آغا شورش لکھتے ہیں

مولانا مودودی یا ان کے متبعین نے اسلام کو اپنی میراث بنا رکھا ہے۔ وہ بزعم خویش اس وہم میں مبتلا ہیں کہ اسلام کو جس طرح وہ سمجھتے ہیں اور کوئی نہیں سمجھتا۔ گویا باقی سب کے لیے اسلامیات کے باب میں فہم و تدبر کے دروازے بند ہو چکے ہیں۔ (ہفت روزہ چٹان ۴ جنوری ۱۹۶۵ء)

یہ بھی ملاحظہ فرمائیے گا

جماعت اسلامی کے متعلق تو ہماری ایماندارانہ رائے یہ ہے کہ اس وقت اسلام کے لیے اس ملک میں اس سے زیادہ مضر جماعت کوئی نہیں ہے۔" (نوائے وقت ۲/۶۵ ۲۴)

مولانا احتشام الحق کا فتویٰ

مولانا مودودی اور ان کے متبعین اپنی زبان اور تحریر سے اجمالی طور پر انہیں عقائد کا مقصد ظاہر کرتے ہیں جو اہل سنت والجماعت کے ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ مودودی صاحب نے اپنی تصنیفات و مضامین و مقالات میں متعدد غلطیاں ایسی کی ہیں جو اہل سنت والجماعت کے عقیدوں اور تصریحات کے بالکل خلاف ہیں انہوں نے ایسی باتیں کہی ہیں جو اجتماعی عقائد کے بالکل منافی ہیں۔ اسی طرح صحابہ کرام علمائے سلف اور بزرگان دین کے لیے انہوں نے

ہت گستاخانہ الفاظ استعمال کئے ہیں ان پر بے وجہ تبصرے اور تنقیدیں کی ہیں۔ اس لیے ان کے متبعین کے گمراہ اور فاسد العقیدہ ہونے میں کوئی شبہ نہیں اور ان تصریحات و تشریحات کے ہوتے ہوئے ان کے اجمالی اعتراف کی کوئی حقیقت باقی نہیں رہتی کہ انہیں فاسد العقیدہ مثل معتزلہ و خوارج کے نہ قرار دیا جائے۔ لہذا باختیار کسی مودودی شخص کو امام بنانا جائز نہیں ہے (بحوالہ جماعت اسلامی سے مخالفت کیوں؟ شائع کردہ دارالاشاعت اہل سنت والجماعت ڈھاکہ)

مولانا لال حسین اختر مودودی صاحب اسلامی عقائد کو بدلنے کی کوشش میں منہمک ہیں انہوں نے امریکن اور یورپین طرز پر ایک نئے مذہب کی بنیاد رکھی ہے۔ محمدی اسلام اور مودودی صاحب کے امریکی طرز کے ماڈرن اسلام میں بعد المشرقین ہے جس طرح رات اور دن آنِ واحد میں جمع نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح محمدی اسلام اور مودودی اسلام ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے۔ مودودی صاحب نے اسلام کے نام پر ایک نئے گمراہ فرقہ کی بنیاد رکھی ہے۔ آیئن اسلام کے نام پر مسلمانوں کو مودودیت کا زہر دیا جا رہا ہے جو لوگ مودودی مذہب کو نہ جاننے کی وجہ سے ان کے جال میں پھنس گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں ہدایت فرمائے۔" (رسالہ مودودیت سے ناراضگی کے اسباب)

مولوی شرف الدین "جماعت اسلامی بے دین جماعت ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ جو قرآن شریف کا ترجمہ اپنی طبیعت کے موافق کرے جو بخاری شریف کی حدیثوں کی صحت کا انکار کرے جو معجزات و کرامات کا انکار کرے۔ کیا وہ بھی دین پسندوں میں سے ہے؟ اور کیا مذہباً ایسی جماعتوں کا ساتھ دینا جائز ہے۔

(اخبار اہلحدیث دہلی ص۹ کالم ۲ یکم اکتوبر ۱۹۵۵ء)

مولوی عبداللہ روپڑی مودودی علم حدیث کی جڑیں کھوکھلی کر رہا ہے جو دین اسلام کی بنیادی چیز ہے اور اہلحدیث کا اس سے خصوصی تعلق ہے۔ غیرت مند اہلحدیث تو ایک لمحہ بھر کے لیے ایسے شخص سے تعلق قائم نہیں رکھ سکتا۔ خدا جانے شامل شدہ افراد کی رگ حمیت کٹ گئی ہے یا کسی گناہ کی شامت کا نتیجہ ہے۔ خدا نہ کرے کہیں سوءِ خاتمہ پر خاتمہ ہو جائے۔"

"مودودی صاحب یہاں تو منکرین حدیث سے بھی آگے بڑھ گئے ہیں منکرین حدیث حدیث کو تاریخی حیثیت سے مانتے ہیں وحی قرار نہیں دیتے۔ مودودی صاحب نے نہ صرف وحی بلکہ تاریخی حیثیت سے بھی انکار کر دیا ہے۔"

(مودودیت اور احادیث نبویہ ص۱۰۵، ص ۱۳۱)

مولانا ابوالکلام آزاد

ان کے فیصلہ کی وجہ سے مالیر کوٹلہ کی مسجد و مدرسہ اہلحدیث سے مولوی محمد امین صاحب اثری۔ مبارکپوری کو مدرسی و امامت سے اس لیے علیحدہ کیا گیا کہ یہ مودودی ہیں اور جماعت اسلامی کے خاص کارکن ہیں

(اہلحدیث دہلی ص۱۰ کالم ۳ یکم جنوری ۱۹۵۶ء)

مولوی محمد اسماعیل

مودودی کے نظریات تمام ائمہ حدیث کے خلاف ہیں ... جماعت اہلحدیث کا ایک فرد بھی اُن کے ساتھ نہیں ہے ان کے قلم سے منکرین حدیث کا کیس مضبوط ہو گیا" (اہلحدیث دہلی ۱۵/۱/۵۵ جماعت اسلامی نظریہ حدیث)

تبدیلیٔ خیالات

یہ بھی اصلاحی —— وہ بھی اصلاحی

پہلا مخلصانہ اور عقیدتمندانہ خیال

"مولانا مودودی کا علم و مطالعہ مدرسی اور خانقاہی حلقوں (بحوالہ ترجمان القرآن) میں اکثر زیر بحث رہا ہے۔ میں نے ہمیشہ محسوس کیا ہے کہ اس مطالعہ میں لوگوں کا غرورِ علم اکثر اعترافِ حق پر غالب آیا ہے میں یہ تو نہیں جانتا کہ مودودی صاحب نے کہاں پڑھا ہے۔ لیکن میں اس بات کو اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ نہایت ذہین آدمی ہیں۔ نہایت قابل آدمی ہیں اور نہایت وسیع النظر عالم ہیں۔ ان کا مرتبہ صرف اس پہلو ہی سے اونچا نہیں کہ وہ جدید علوم و افکار پر نہایت وسیع نگاہ رکھتے ہیں، اور ایک بلند پایہ انشا پرداز ہیں، بلکہ اُن کی اصل خوبی یہ ہے کہ وہ کتاب و سنت پر گہری اور وسیع نظر رکھتے ہیں قرآن کا انہوں نے ایک اسکالر کی طرح مطالعہ کیا ہے وہ برابر اس پر تدبر کرتے رہتے ہیں صرف بیضاوی اور جلالین بقدر نصاب پڑھ کر مفسر نہیں بن بیٹھے ہیں انہوں نے حدیث کی تمام مستند کتابوں کو حرف بحرف غور کے ساتھ پڑھا ہے۔ صرف ان کے دورہ پر اکتفا نہیں فرمایا ہے۔"

آگے چلکر فرماتے ہیں:-

"اگر ایک ایسے شخص پر بھی کتاب و سنت کے بارے میں ہم اعتماد نہیں کر سکتے تو پھر میں نہیں سمجھتا کہ کتاب و سنت کے بارے میں اس ملک میں کس شخص پر اعتماد کیا جائے"۔

(سہ روزہ انصاف مورخہ ۱۱ جون ۱۹۵۱ء)

دوسرا عملی تجربہ "آپ اپنے آپ کو نہ صرف جماعت اسلامی کا قائم مقام سمجھنے لگے ہیں۔ آپ کے نزدیک اگر آپ کی کسی حرکت پر کسی کو اعتراض ہو تو وہ جماعت پر اعتراض ہے اس طرح آپ اپنا یہ ذہن بنائے بیٹھے ہیں کہ آپ کی ذات اگر کبھی زیر بحث آئی تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس ملک میں اقامتِ دین کا سارا کام درہم برہم ہو جائے گا۔ اور لادینی طاقتیں غالب ہو جائیں گی۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ سوچنے کے اس انداز کو بدلیں۔ خدا نے اسلام کو نہ آپ کے ساتھ باندھا ہے نہ جماعت اسلامی کے ساتھ اور نہ کسی اور کے ساتھ۔ اگر آپ اسلام کا کام کرنے اٹھے ہیں تو خدا را اس کی یہ قیمت نہ مانگیے کہ اگر آپ اسلام پر بھی ہاتھ صاف کرنے لگ جائیں تو بھی لوگ اس کو جاننے کے باوجود چپ رہیں کیونکہ اس سے اقامتِ دین کے جہاد کو نقصان پہنچ جائے گا۔

شق ۵ "ان سارے تجربات کے بعد اب میں کس مقصد کے لیے جماعت میں پڑا رہتا۔ میں نہ تو انقلابِ قیادت کو اسلامی انقلاب کا ذریعہ سمجھتا ہوں اور نہ ووٹ حاصل کرنے کی بھاگ دوڑ کو اصلاحِ معاشرہ کا واسطہ۔ جماعت کا موجودہ دستور نہ شورائی ہے اور نہ جمہوری، پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مجھے امیر جماعت کے نہ عدل پر بھروسہ ہے نہ ان کی تنہا بصیرت پر، نہ دستورِ جماعت کے ساتھ ان کی وفاداری پر۔"

(میں نے جماعت اسلامی کیوں چھوڑی از مولانا کوثر نیازی)

حکیم الامت نے خوب فرمایا تھا،

ع ملّا کی نظر نورِ فراست سے ہے خالی

ہم اور ہمارے ہمخیال شروع سے یہی تو عرض کرتے چلے آرہے ہیں
تو مولانا آپ فرماتے ہیں کہ "مودودی" اسلام نہیں ہیں، اسلام کی اپنی

ایک ٹھوس حیثیت ہے اور یہ لازوال صداقت ہے۔ خدارا اسلام کو مولانا مودودی ایسے قلاباز کے پلے باندھ کر رسوا نہ کرو جو مصلحتوں کے تابع دن رات بدلتا رہتا ہے۔ یہ بھی اللہ کا شکر کیجئے کہ آپ کو سترہ سالہ رفاقت کے بعد حضرت صاحب کی خوبیوں اور صلاحیتوں کا پتہ چلا۔ راقم ایسے لوگوں نے تو انہیں پہچاننے میں اٹھارہ لمحے بھی ضائع نہیں کئے ہمیں افسوس تو ان لوگوں پر ہے جنہیں دانا و بینا کہا جاتا ہے اور وہ اس فریب آمیز جال میں پھنسے ہوئے ہیں۔ نسل نو تو بیچاری کو ان کا چہرۂ افکار اور رخ کردار دکھانے کے لیے کوئی منظم و مربوط کوشش ہی نہیں کی گئی صرف ہنگامی بگولے ہی رقصاں رہے۔ اور جو دکھا رہے ہیں ان سے بدظن کرنے کی مذموم کوششیں جاری ہیں۔ (چوہدری حبیب احمد)

جماعت اسلامی کا شیش محل

"جماعت اسلامی کا شیش محل" کے مرتب جناب مولانا اشتاق احمد نظامی اس کتاب کے پیش لفظ" کے عنوان سے صہ ۱۵/۱۰ پر رقمطراز ہیں:۔

"بس جس طرح خوارج اور معتزلہ اپنی تحریک کی کامیابی میں جن جن چیزوں کو سد راہ سمجھتے گئے یا ان سے کھلنے بے اعتنائی برتی یا اپنی مصلحت کے تحت اس کے استخفاف پر اتر آئے تاکہ عوام اور خواص، ورنہ کم از کم ان کے متبعین کی نظر میں ان چیزوں کا وزن ہلکا ہو جائے بعینہ وہی انداز فکر و طرز استدلال جماعت اسلامی کا بھی ہے جو مودودی صاحب کا ایک اختراعی نظریہ ہے۔ یا خوارج و معتزلہ سے مستعار ہے جسے مجموعی طور پر پوری جماعت نے اپنا لیا ہے حتیٰ کہ سلامیات سے بے بہرہ حدیث فقہ اور اصول فقہ جیسی مہمات دین سے بے خبر و نا آشنا محض اردو کی چند کتابیں یا اردو ادب تک ان کی معلومات کا سرمایہ لیکن جماعت اسلامی سے متعلق ہوتے ہی فقہی مسائل کا مذاق، علماء کی تنگ نظری کا چرچا اور اپنے روشن خیالی اور اسلامی فلاسفی کا خطبہ ان کی مشغل زندگی بن جاتا ہے۔ واضح رہے یہ ذہن از خود نہیں بنتا بلکہ مودودی لٹریچر کا ہی پس منظر ہے کہ صحابہ کو تنقید سے

بالاتر نہ سمجھو لیکن اُردو کی چند کتابوں کا مطالعہ اور سوجھ بوجھ کے بعد شاہ ولی اللہؒ
مجدد الف ثانی، امام اعظم ابوحنیفہ، امام شافعی جیسے عمائد اکابر پر کھلے بند تنقید کرو
البتہ اگر تنقید کا دروازہ کہیں بند ہے تو وہ مولانا مودودی کی عرش نشیں بارگاہ ہے
جس کی بلندی ان کی اپنی نظر میں انسانی ذہن کے نشانۂ تنقید سے بالاتر ہے۔ چنانچہ
یہ ایک علم تجربہ ہے کہ جماعت اسلامی کے وہی افراد جو اسلاف و اکابر پر بے محابہ
تنقید کا اپنے کو مجاز و مختار سمجھتے ہیں اور خدارسیدہ قدسی صفات بزرگوں کی شان
میں گھٹیا سے گھٹیا درجے کی گفتگو میں وہ اُردو ادب کا پورا سرمایہ خرچ کر دیتے ہیں
لیکن وہ مودودی صاحب پر کسی حق بجانب تنقید کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے
پندار و غرور کا یہی وہ صنم اکبر ہے جس کی پرستش دیوجا میں جماعت کی جماعت سرخمیدہ
ہے...... اگر صحیح معنوں میں جماعت اسلامی اپنے اس دعوے میں سچی اور انصاف
پسند واقع ہے کہ رسول خدا کے بعد کسی کو تنقید سے بالاتر نہ سمجھو، پھر اسی اصول کے
تحت وہ حق مجھے بھی ملنا چاہیئے۔ چونکہ میں جماعت اسلامی کے لیڈر مودودی صاحب
(جنہیں خود بھی اپنے لیے مولانا نہیں بلکہ لیڈر کا ہی لفظ پسندیدہ ہے۔ حتیٰ کہ مودودی
شریعت کے حضرت مہدی بھی نئی صدی کے، نئے طرز کے لیڈر ہوں گے۔ وہ ملا ٹائپ
کے آثار قدیمہ نہ ہوں گے) کو خدا یا نبی نہیں سمجھتا کہ میں انہیں تنقید سے بالاتر سمجھ
کر اُن پر ایمان لانے کیلئے خاموش ہو جاؤں........................

ابتدائی مرحلے میں اس بات کا اظہار بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ جب ارکانِ جماعت سے مسکت
سوالات کئے جاتے ہیں تو جواب نہ بننے کی صورت میں راہِ فرار کا ایک طریقہ یہ بھی اختیار کیا جاتا
ہے کہ اسلامیات پر مولانا مودودی کی جس قدر تصنیفات و تالیفات ہیں کسی اور کی بھی ہیں!
لیکن اہل دانش و حقیقت پسند عناصر پر یہ بات مخفی نہیں کہ کسی بھی جماعت کے امیر و قائد پر
سوالات کے جوابات کی یہ شکل فی الواقع جواز ہے یا فرار کی ایک بھونڈی اور بھدی شکل۔

آگے چلکر صفحہ ۱۸ پر جناب مشتاق احمد نظامی تحریر فرماتے ہیں:۔

اگر صحابہؓ، خلفاء راشدینؓ، امام ابوحنیفہؒ، امام بخاریؒ، غوث الاعظمؒ، خواجہ غریب

نواز، مجدد الف ثانی جیسے اکابرِ مذہب و ملت پیغمبر اور معصوم عن الخطاء نہ تھے، تو چو
صدی کے مولانا ابوالاعلیٰ صاحب نہ پیغمبر ہیں اور نہ ہی معصوم عن الخطاء بشری تقاضوں
کے تحت ہر ہر قدم پر خطا کا امکان ہے اور خطائیں واقع ہوتی ہیں۔

اطاعتِ امیر

ماہنامہ ترجمان القرآن بابت مئی ۱۹۴۶ء جلد ۲۸، عدد ۶
صفحہ ۴۲ بعنوان "اطاعتِ امیر" امیرِ جماعت (مولانا مودودی)
یا اپنے مقامی "امیر جماعت اسلامی) کے احکام و منشا سے بے اعتنائی برتنا ویسا ہی گناہ ہے جیسے
جیسے کہ خدا اور رسول کے احکام و منشا سے بے اعتنائی برتنے کا گناہ ہوتا ہے۔"

(روئداد اجتماع جماعت اسلامی ص ۱۴۹-۱۵۰)

(تبصرہ انکشافات ص ۱۴۹-۱۵۰)

میں مودودی جماعت کے ان کذاب اور دشمنِ دین و ایمان، وظیفہ خوار اور دجال قسم کے کور ایمان لوگوں سے پوچھتا ہوں، جو عموماً قابلِ گرفت اور ناقابلِ تردید اعتراضات کے جوابات میں جب لاجواب ہو جاتے ہیں تو فوراً عزت بچانے کے لیے شاطرانہ طریقے سے کہا کرتے ہیں کہ چھوڑیئے مولانا مودودی کو، آپ جماعت کی بات کریں ہم مولانا مودودی کے مقلد نہیں ہیں۔ ہمارا تعلق جماعت اسلامی سے ہے۔ مولانا مودودی کی ذات سے نہیں۔ کیا وہ لوگ اس قسم کے پُر دجل جوابات سے خدا اور خدا کے نیک دیندار بندوں کو دھوکا نہیں دیتے جب کہ یہ عقیدہ ان کی جماعت کے بنیاد عقائد میں شامل ہے اور کیا سادہ لوح عوام کو یہ کہہ کر دھوکا نہیں دیا جاتا ہے کہ حدیث شریف میں اطاعتِ امیر کی بھی تعریف بیان کی گئی ہے؟ حالانکہ حدیث شریف میں جس امیر کی اطاعت کی یہ تعریف کی گئی ہے وہ اس امیر کی اطاعت کا حکم ہے جو صاحب اقتدار اور صاحب عدالت ہو اور کافروں کے مقابلے کے لیے فوج اور اس کے تمام متعلقہ انتظامات بھی رکھتا ہو اور اللہ کے دین کی حقیقی معنوں میں سربلندی چاہتا ہو، نہ کہ مودودی کی طرح در پردہ انہدام دین میں مصروف و سرگرداں ہو اور رات و دن نہ صرف حاملانِ دین یعنی اولیائے کرام، محدثین فقہائے امت، صحابۂ کبار اور انبیاء عظام کے خلاف نقائص ہی تلاش اور بیان کرنے میں

مصروف و منہمک رہتا ہو، بلکہ قرآن کریم کے معانی اور مفہوم میں تحریف و تغیر اور حدود اللہ کی تردید و تنسیخ کرنے میں بھی جھجک نہ محسوس کرتا ہو، اور جس کو نہ صرف حصول اعزاز و اکرام ہی کی بدہضمی ہو گئی ہو بلکہ دین و دنیا کے ہر دور، ہر زمانے، ہر طبقے، ہر گروہ، ہر شعبے، ہر مذہب اور ہر مسلک کی بڑی سے بڑی شخصیتوں کی عیب جوئی کا ہیضہ بھی ہو! حدیث شریف میں تو ایسے باطل امیروں کی بیخ کنی کرنے اور ان سے بچنے بچانے کا حکم ہے۔"

مندرجہ بالا اقتباس "جماعت اسلامی کا شیش محل" کے مرتب جناب مولانا مشتاق احمد نظامی نے اپنی کتاب کے صفحہ ۷۶، ۷۷ پر دیا ہے۔ (راقم)

مودودیت پر ایک نظر کے عنوان سے خطیب مشرق مولانا مشتاق احمد نظامی رقمطراز ہیں:-

"انسان کی زندگی میں ایک متعین مقام ہوتا ہے جہاں وہ کر وہ صرف اپنی شخصیت ہی کو ترقی دے سکتا ہے اور سماج کی بھی خدمت کر سکتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی بدنصیبی یہ ہوتی ہے کہ وہ قدرت کے اس عطیہ کو ٹھکرا کر دوسرے کاموں میں اپنی صلاحیتوں اور توانائیوں کو صرف کرے اور اس طرح خود کو "دھوبی کا کتا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا" بنا لے مودودی صاحب کو قدرت نے صحافت کے لیے پیدا کیا تھا۔ قدرت کلام، عوامی نفسیات کی نبض شناسی ایک صحافی کے روشن مستقبل کی ضمانت ہیں اور قدرت نے ان میں سے ہر ایک سے بہرہ وافر عطا کیا تھا، مگر انہوں نے قدرت کے اس گرانمایہ عطیہ کو ٹھکرا دیا اور صحافت کے بجائے سیاست کے پچھلے دروازے سے داخل ہونے کی کوشش کی۔ ان کے معتقدین کے وقتی تاثر نے ان کا ذہنی توازن معطل کر دیا۔ اور وہ بھی "من ہم ہستم" کا خواب دیکھنے لگے

ایک صحافی کی زندگی میں سب سے خطرناک وہ مقام ہوتا ہے جبکہ اس کے عقیدت مند قارئین اس کی آتش نوائی کو اس کے ذاتی خلوص اور اس کے بلند آہنگ زور خطابت کو اس کی پختگی کردار، اس کے بظاہر معقول استدلال، اس کی اصابت رائے، صلاحیت قیادت، اور اس کی سطحی مگر متنوع معلومات کو اس کی ہمہ دانی اور تبحر علمی کا نتیجہ سمجھ کر کبھی اسے سیاسی لیڈر

اور کبھی جامع العلوم ہمہ دان، علامۂ وقت سمجھ کر آسمان پر چڑھانے کی کوشش کرتے
یہ وقت بڑا نازک ہوتا اور یہیں سے بالعموم اکثر صحافیوں کی صحافیانہ زندگی میں رجعت قہقری
شروع ہوتی ہے عقلمند صحافی ایسے موقعہ پر "من آنم کہ من دانم" کے اصول پر عمل کر کے اپنے
حدود سے تجاوز نہیں کرتا۔ اور اپنے عقیدت مند قارئین کی اس طرح مدح سرائی سے فریب نہیں
لیکن مودودی صاحب کے ساتھ دقت یہ ہے کہ ہمیشہ ہی سے اپنے علم و فضل کے متعلق بے بہت
خوش اعتمادی رہی ہے اور وہ ابتدائے عمر سے لیڈر بننے اور پسماندہ قوم مسلم کی خدمت کرنے
تہیہ کر چکے ہیں۔ سن ۱۹۴۰ء کے سیاسی بحران کے زمانے میں مودودی صاحب نے "مسلمان اور موجو
سیاسی کشمکش" کتاب لکھی۔ یہ ایک سلسلہ پُر زور خطابت کی بنا پر عوام میں بہت مقبول ہوا
اگرچہ[1] جو بیش از حرکت طفلانہ" نہ سمجھا مگر عامۃ الناس کی وقتی مقبولیت سے مودودی
صاحب کا ذہنی توازن درہم برہم ہو گیا اور انہیں اپنے متعلق ایک سیاسی مدبر ہونے کی خوش
فہمی پیدا ہو گئی۔ اس سے پہلے وہ محض مذہبی مسائل پر قلم فرسائی فرما چکے تھے۔ جن کا بلند آہنگ
اسلوب بیاں عوام کو مسحور کر چکا تھا۔ حالانکہ ان کی سطحیت اور نامعقولیت کی بنا پر اہل
قلم نے کبھی انہیں درخور اعتناء نہیں سمجھا۔ ان سب چیزوں کا مجموعی نتیجہ یہ ہوا کہ وہ
مجتہد، مجدد اور مہدیٔ موعود بننے کے خواب دیکھنے لگے۔ طبقہ علماء نے اسے بھی مجذوب کی
بڑ سمجھا چنانچہ مولوی اشرف علی تھانوی نے اس جماعت کے متعلق کہا تھا۔ "میرا دل اس تحریک
کو قبول نہیں کرتا"[2]

مولوی عبدالماجد دریا آبادی نے ان کے تاثرات کو بدیں طور پر نقل کیا ہے۔

۱؎ اگرچہ جو علمی تجویز اس میں پیش کی گئی تھی وہ حقیقت پسندی سے خالی تھی کہ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے اسے بیش از حرکت طفلانہ نہ سمجھا۔

۲؎ اٹھائیس برس قبل جب جبل پور میں مولانا مودودی کے ایک مقالہ پر "تاج" کے پرنٹر و پبلشر گرفتار ہوئے تو مودودی صاحب تاج کے ایڈیٹر تھے۔ گرفتاری سے بچنے کے لیے یکایک دہلی روانہ ہو گئے۔ (ہلال نو بمبئی ۱۰ اکتوبر ۱۹۴۸ء)

"حضرت کا ذوقِ سلیم اس زمانے میں اس جماعت کی طرف سے کھٹک گیا تھا اور حضرت کی فراستِ دینی اسی وقت امیرِ جماعت کی طرف سے بدگمان ہو گئی تھی حالانکہ اس وقت تک جماعت کی طرف سے ان مفاسد کا ظہور نہیں ہونے پایا تھا جو بعد کو ہوا۔" (جماعت اسلامی کا شیش محل، ص ۲۰ تا ۲۱)

ڈاکٹر عبدالودود کی رائے

مولانا مشتاق احمد نظامی صفحہ ۲۷، ۲۸ پر ڈاکٹر عبدالودود کی رائے نقل کرتے ہیں۔

"ترجمان القرآن جلد ۵۶، عدد ۶ منصب رسالت نمبر ص ۱۲۹"

"آخر وہ کون سا بت ہے جس کے آگے جھکنے کے لیے کہا گیا تھا؟ اور کس شخصیت پرستی کی آپ کو دعوت دی گئی تھی۔" (ترجمان القرآن دسمبر ۱۹۶۱ء صفحہ ۱۷۶)

"اس بت کی تلاش میں آپ کو کسی مندر میں جانے کی ضرورت نہیں۔ وہ بت آپ خود ہی ہیں۔ آپ کی زبان اور آپ کے قلم سے جو کچھ نکل جائے اسے آپ خدا اور رسول ؐ کا فرمان قرار دیتے ہیں اس کے سامنے جھکنا حق کے سامنے جھکنا ہے اور آپ کے نزدیک اس سے انحراف خدا اور رسول ؐ سے انحراف کے مترادف ہے۔ جو آپ سے اختلاف کرے اس کے خلاف آپ کے حاشیہ بردار جو کچھ کرتے ہیں ایک دنیا اس کی شاہد ہے۔ حتیٰ کہ جو لوگ برسوں تک آپ کے معتقد رہے اور اس کے بعد ان بے چاروں نے آپ کی کسی بات سے اختلاف کیا تو آپ حضرات نے جو کچھ ان کے خلاف کیا وہ بھی سب پر عیاں ہے۔ یہی وہ آپ کا بت ہے جس کے سامنے جھکنے کے لیے آپ مجھ سے کہہ رہے ہیں اور میرے نہ جھکنے پر مجھے خدا اور رسول ؐ سے منحرف ہو جانے کے جرمِ عظیم کا مرتکب قرار دے رہے ہیں۔ اے کاش! آپ کو یہ معلوم ہو سکتا کہ آپ کی اس روش نے سنجیدہ طبقے کی نگاہوں میں آپ کا وقار کس قدر کھو دیا ہے۔ آپ نے میرے خطوط میں سے بعض کتابت کی غلطیوں کو اچھال کر یہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ میں قرآنی آیات کا صحیح املاء تک نہیں جانتا۔ مجھے اپنی علمی حدود کا صحیح طریقے سے علم ہے۔ میرے خطوط کی کتابت کسی اور صاحب نے کی تھی۔ کتابت میں عام طور پر غلطیاں رہ جاتی ہیں۔ اس کا کسے علم نہیں۔ مجھے اگر آپ کی اس ذہنیت کا علم ہوتا تو میں ان آیات کو خود چیک کر لیتا۔ اس کا تو آپ کو بھی تجربہ

ہوگا کہ آپ کی اتنی علمیت اور احتیاط کے باوجود آپ کی کتابوں میں کتابت کی کتنی غلطیاں رہ جاتی ہیں۔ کیا ان غلطیوں کی بنا پر آپ کو جاہل قرار دے دیا جائے۔

مجھے افسوس یہ ہے کہ مجھے تمہید میں یہ کچھ لکھنا پڑا۔ لیکن اس سے میرا مقصد یہ ہے کہ شائد اس سے آپ اپنی اصلاح فرما سکیں اپنے عقیدت مندوں کے حلقے میں رہنے والوں کی کیفیت یہی ہوتی ہے کہ ان میں سے انہیں کوئی بھی یہ بتانے کی جرأت نہیں کرتا

ع کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا۔ اس لیے ضرورت ہوتی ہے کہ کوئی غیر جانبدار آگے بڑھ کر، ان کے سامنے آئینہ رکھ دے جس میں انہیں اپنے حقیقی خدوخال نظر آجائیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اس حبشی کی طرح جس نے آئینے میں اپنے بھیانک خدوخال دیکھ کر آئینہ کو پتھر دے مارا تھا۔ اس انکشافِ حقیقت سے گالیوں پر اتر آئیں (ڈاکٹر عبدالودود)

آئینہ مودودیت

یہ حضرت مولانا سید احمد سعید کاظمی امروہوی کی تالیف ہے جس میں آپ مولانا مودودی کے چہرۂ افکار سے پردہ کشا ہونے کا شرف حاصل کیے ہوئے ہیں۔ آپ نے اس کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ جس آئینہ میں مودودی صاحب نے دوسروں کو دیکھا ہے کاش اس آئینے میں وہ اپنی صورت بھی دیکھیں تاکہ انہیں اپنے چہرہ کے صحیح خدوخال نظر آجائیں۔ کیونکہ آئینہ دیکھ لینے کے بعد اپنے چہرے کا کوئی بدنما دھبہ اور داغ نظر سے پوشیدہ نہیں رہتا۔ اس کتابچے میں درحقیقت جناب مولانا نے مودودی صاحب کے ہاتھ میں آئینہ دیا ہے لیکن آئینہ دیکھ کر اپنا سا منہ لے کے رہ گئے، والی بات نہیں ہے۔ قسامِ ازل نے مودودی صاحب کے لیے جو کچھ مقدر کر دیا ہے وہ وہی کام کر رہے ہیں۔ انکی جھوٹی انا انہیں اس مقام سے ادھر ادھر ہونے نہیں دیتی جہاں بیٹھے وہ قلم طراز ہیں اور اپنی گستاخی تحریر کے نمونے پیش کرتے چلے جا رہے ہیں۔ مقام شکر ہے کہ ہم ابتدا ہی سے یہ سمجھ چکے تھے۔

ع کہ در ریگِ حجاز شش زمزمے نیست

انہیں دین کی حفاظت کا درد تو بہت ہے، لیکن جس طرح دینِ نبوی ان کے ہاتھوں رسوا ہو رہا ہے۔ اہلِ بصیرت اور اربابِ دین و دانش سے یہ حقیقت مخفی نہیں ہے کہ

کہ ان کی سیاسی مصلحتیں ہی اسلام بن کر رہ گیا ہے اور اس کو مولانا کاظمی صاحب فاش کر رہے ہیں۔ (چودھری حبیب احمد)

مولانا تحریر فرماتے ہیں :۔

"مودودی صاحب نے جس آئینہ میں اسلام اور مسلمین کو دیکھا ہے، کاش وہ اس میں کبھی اپنی شکل و صورت بھی ملاحظہ فرماتے، تو ان پر حقیقت حال منکشف ہو جاتی۔

مودودی صاحب کی نگاہ بصیرت کے عنوان سے لکھتے ہیں :۔

مودودی صاحب کی نگاہ بصیرت کا کمال یہ ہے کہ جدھر اٹھتی ہے اور جس پر پڑتی ہے اسے کمزوریاں ہی کمزوریاں نظر آتی ہیں انہوں نے اسلام پر غور کیا تو جاہلیت ہی جاہلیت نظر آئی مسلمانوں کو دیکھا تو سب نسلی ہی دکھائی دیتے اصلی ایک بھی نظر نہ آیا۔ صوفیاء و مشائخ کو ملاحظہ فرمایا تو سب جاہلیت کے مسئلے پر سربسجود ملے۔ مجتہدین کو پرکھا تو ایک بھی اس قابل نہ نکلا کہ ان کے علوم و مناہج کی پابندی اختیار کی جائے۔ مجددین کو ٹٹولا تو ان میں بھی کوئی کامل نظر نہ آیا۔ سب ناقص و ناکمل ہی ثابت ہوئے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر نظر ڈالی تو ان میں بھی لغزشیں اور غلطیاں موجود پائیں۔ بعض خلفاء راشدین پر نگاہ پڑی تو وہ بھی نااہل اور فرمان خدا و رسول کے مخالف نظر آئے۔ کچھ انبیاء کرام علیہم السلام کو دیکھا تو انہیں بھی بڑے بڑے گناہوں کا مرتکب پایا۔

قابلِ توجہ

ایک اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات باقی ہے جس تک ان کی نگاہ عیب جو کی رسائی محال نظر آتی ہے۔ اس لیے کہ وہ اسے دیکھ نہیں سکتے۔ اور اگر بالفرض محال دیکھ پائیں تو غالباً بے تحاشا بول اٹھیں کہ خدایا تیرا نظام حکومت زرین انبیاء سے لیکر عوام تک ساری خدائی کی حالت بگڑی ہوئی ہے اور تو عرش پر بیٹھا دیکھ رہا ہے (مولانا ان کی نگہ عیب جو سے خدا بھی کہاں بچا ہے اس کے بارے میں راقم عرض خدمت کریگا) مختصر یہ کہ جس آئینہ پر ان کی نظر جمی ہوئی ہے اس میں انہیں کوئی بے داغ و بے عیب نظر نہیں آتا۔ اب ہم وہی آئینہ ان کے آگے رکھ کر ان سے درخواست کرتے ہیں کہ اسی آئینہ میں ذرا اپنی صورت بھی ملاحظہ فرمایئے۔ آپکے اسلامی نظام اور حکومت الہیہ کے لغروں صاحب اور اجتہادی بصیرت کے غلغلوں اور معرفت نفس و تزکیۂ باطن کے دعاوی کی اصلی صورت آپ کو نظر آجائے گی۔

اتنی نہ بڑھا پاکیٔ داماں کی حکایت
دامن کو ذرا دیکھ ذرا بندِ قبا دیکھ

مولانا کاظمی صہ پر فرماتے ہیں:۔ مجددین و مجتہدین حتیٰ کہ صحابۂ کرام اور خلفاء راشدین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین پر انہوں نے جو کڑی نکتہ چینی کی ہے اس نے اس حقیقت کو اور بھی واضح کر دیا، کہ وہ اپنا مقام امتِ محمدیہ میں سب سے بلند سمجھتے ہیں کیونکہ ایک شخص دوسرے کی اصولی غلطی اسی وقت نکال سکتا ہے جبکہ اس کی قوتِ علمیہ اس بارہ میں اس دوسرے سے قوی اور بالا تر ہو۔

اس کے آگے صفحہ ۶ پر رقمطراز ہیں:۔

ان حالات میں تحریکِ مودودیت میرے نزدیک امتِ مسلمہ کے لیے ایک خوفناک فتنہ ہے جس کے فساد کا ہر پہلو اصلاح کے خوبصورت پردہ میں چھپا ہوا ہے۔ اس لیے ایک ادنیٰ ترین خادمِ دین ہونے کی حیثیت سے میں نے اپنا فرض سمجھ کر یہ کتاب لکھی۔ اس موضوع پر اگر پوری وضاحت سے اظہارِ خیال کیا جائے تو غالباً کئی ضخیم جلدیں تیار ہو جائیں گی۔ لیکن اپنی انتہائی عدیم الفرصتی کے باعث میں نے اختصار سے کام لیا ہے۔ اس کے باوجود بھی مضمون اتنا طویل ہو گیا ہے کہ ناظرین کی سہولت کو مدنظر رکھتے ہوئے مجھے اس کے دو حصے کرنے پڑے۔

میں نے اپنی کتاب (آئینۂ مودودیت) میں جو کچھ لکھا ہے بفضلہ تعالیٰ وہ حق و صداقت پر مبنی ہے جس کا کوئی معقول جواب (سوائے رجوع کے انشاء اللہ مودودیوں سے نہ ہو سکے گا۔

غور فرمایئے

"اُن کے پاس ہمارے ہر اعتراض کا صرف ایک جواب ہے۔ اور وہ یہ کہ" یہ لوگ حکومت کے آلۂ کار اور ذاتی مفاد کے پرستار ہیں"۔ اس کے متعلق میں صرف اتنا کہوں گا کہ" لعنۃ اللہ علی الکاذبین" (اس بحث میں ہم بھی مولانا کے شریک و ہمنوا ہیں (مرتب)) جھوٹوں پر خدا کی لعنت ہو۔ ہم اپنے ربِّ کریم کو حاضر و ناظر اور گواہ کر کے کہتے ہیں کہ نہ ہم حکومت کے آلۂ کار ہیں اور نہ ارکانِ حکومت سے ہمارا کوئی تعلق اور لگاؤ ہے۔ نہ اس اشاعت سے ہمارا کوئی ذاتی یا دنیوی مفاد وابستہ ہے بلکہ اس سلسلہ میں ہم مالی نقصانات سے جسقدر زیر بار ہو چکے ہیں

وہ ہماری قوت سے کہیں زیادہ ہے۔

میری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی جبکہ ایسے لوگوں کی طرف سے اس قسم کے ذلیل جھوٹے اور بے بنیاد الزامات سنتا ہوں جو پاکیزگیٔ اخلاق اور تزکیہ نفس کے ساتھ صالحیت کے نعرے لگاتے ہیں ان لوگوں کے دل میں اگر ذرہ برابر بھی خوف خدا ہوتا تو یہ ایسی دروغ بافی اور کذب بیانی سے کام نہ لیتے پھر یہی نہیں کہ مودودی جماعت کے افراد ہی اس اکذب الحدیث میں مبتلا ہیں بلکہ ان کے امیر الصالحین مولانا مودودی صاحب بذاتِ خود بھی ہم پر یہی الزام تھوپ رہے ہیں۔

مندرجہ بالا تاثرات "مکالمہ کاظمی و مودودی" کے بعد جناب مولانا سید احمد سعید کاظمی نے پیش کیے ہیں۔ بس سے اس طائفہ مقدسین و صالحین کے بارے میں جو ایک عالم کی رائے ہے وہ قارئین کرام تک بخوبی پہنچ جاتی ہے ہمیں بھی اختصار ملحوظ ہے اس لیے اتنے پر ہی اکتفا کرتے ہیں ورنہ حضرت مولانا کاظمی صاحب نے مودودی صاحب کی کجروی اور گمراہی کی کئی ایک حقیقتیں پیش کی ہیں اور "آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے" والا منظر دکھا دیا ہے۔ آخر میں مولانا تحیر انگیز درد بھرے الفاظ میں لکھتے ہیں۔ (مرتب)

حوالہ جات منقولہ بالخصوص سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قول کو سامنے رکھ کر یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ مودودی صاحب کے نزدیک فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی کے دور میں قرآن مجید کی تین چوتھائی سے زیادہ تعلیم بلکہ اس کی حقیقی روح لوگوں کی نگاہوں سے مستور ہو چکی تھی جو چودہ سو برس کے بعد اب مودودی صاحب کو نظر آئی ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار

فتنۂ مودودیت کے صفحہ ۱۳ پر جناب کاظمی صاحب رقمطراز ہیں۔

مودودی صاحب اپنے منہ لاکھ میاں مٹھو بنیں یا ان کے حواری نہیں کتنا ہی بلند پایہ صالح متقی اور مجدد اور مجتہد بلکہ امیر الصالحین اور الامام المہدی بنا ڈالیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ مودودی صاحب اور ان کے مشن کو جمہور مسلمانوں کے مذہب سے دور کا واسطہ بھی نہیں"

فتنۂ مودودیت صفحہ ۱۴ تا ۱۶

مولانا کاظمی تحریر فرماتے ہیں :۔ مودودی صاحب نے اپنی تحریک کی بنیاد

حکومتِ الٰہیہ پر قائم کی ہے۔ حکومتِ الٰہیہ کے لفظ میں مسلمان کے لیے جو بے پناہ جاذبیت ہے، محتاجِ بیان نہیں۔

اگرچہ وہ قیامِ پاکستان کے بعد حکومتِ الٰہیہ کا لفظ کبھی اتفاقیہ ہی بول جاتے ہیں اور اب نئے ماحول میں بتقاضائے مصلحت انہوں نے اسی پرانے چولہ پر "اسلامی نظام" کا عبائے جدید پہن لیا ہے اور بجائے حکومت الٰہیہ کے نظامِ اسلامی کا نعرہ لگا رہے ہیں لیکن جب کبھی بادِ مخالف کے جھونکے سے اس عبا کا دامن اٹھ جاتا ہے تو حکومت الٰہیہ کا یہ پرانا چولہ صاف نظر آنے لگتا ہے۔ یقین نہ ہو تو ۲۳ جنوری ۱۹۵۱ء کے "کوثر" میں مودودی صاحب کے ایک مضمون کے ضمن میں نمایاں طور پر دیکھ لیجئے:

"حکومتِ الٰہیہ اور اسلام" کے عنوان سے :-

جمہور مسلمان ابھی تک اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ جس حکومتِ الٰہیہ کی شاہراہ کو ایک ایسی مستقل قوتِ اجتہادیہ سے تعبیر کیا جائے جو مجتہدینِ سلف میں سے کسی ایک کے علوم و منہاج کی پابند نہ ہو (خواہ وہ مجتہدین سلف امام ابو حنیفہؒ امام شافعیؒ، امام مالکؒ، امام احمد بن حنبلؒ ہوں یا ان کے علاوہ کوئی اور امام ہو۔ اور جس کے بانی کی نظر میں امت مسلمہ کے بڑے سے بڑے جلیل القدر الٰہیین (اللہ والے اور خدا پرست لوگ) اسلام کے مستقل اصول کی خلاف ورزی کرنے والے ہوں نیز اس کے خیال میں شاہ ولی اللہ اور اُن کے پہلے کے مجتہدین و مجددین کی اجتہادی بصیرت ناکافی ہو[2] حتیٰ کہ امام غزالی[3] مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ جیسے لوگ اس کے نزدیک ناقص اور غلط کار ہوں، اس کی بنیاد کس چیز پر قائم ہو گی۔

"المنبر اور جماعت اسلامی" کے عنوان سے جناب مولانا حکیم عبد الرحیم اشرف تحریر فرما ہیں :-

"یہاں پہنچ کر لازماً بعض حضرات کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا ہو گا کہ یہ سلوک اور یہ

---

[1] تجدید و احیائے دین مطبوعہ مرکنٹائل پریس صفحہ ۷۹ - ۸۰
[2] تجدید و احیائے دین صفحہ ۷۹
[3] تجدید و احیائے دین صفحہ ۳۷

شدید ترین احتجاج اور جماعتِ اسلامی کی حمایت کی اضطراب انگیز آواز اس شخص کے قلم سے نکل رہی ہے جو جماعتِ اسلامی کے ہاں گردن زدنی ہے جس کے بارے میں پشاور تا ڈھاکہ، جماعت کے ذمہ داروں نے ہر رکن، ہر متفق اور ہر متاثرِ جماعت کو یہ یاد کرایا ہوا ہے کہ یہ فتنہ پسند شخص مولانا مودودی کا بدترین دشمن ہے۔ دعوتِ حق کا غدار ہے۔ جماعتِ اسلامی میں جب تک رہا، اس نے فتنہ بپا رکھا اور جب سے باہر نکلا اس نے جماعت کو رسوا کرنے اور اس کی مخالفت میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی، اور یہ سب کچھ بددیانتی، حسد، ذاتی رنجش اور ایسے ہی ذلیل محرکات کا نتیجہ ہے نہ اس کے پیچھے کوئی جذبہ اخلاص ہے اور نہ ہی اس شخص کو جماعت سے کوئی دیرینہ اختلاف ہے، وغیرہ ذالک

یہ باتیں جو ہم نے ایک ہی سانس میں کہہ ڈالیں ہیں، یہ کوئی بھیانک خواب نہیں ہے جو دیکھا ہے اور اُسے سنا دیا ہے بلکہ یہ سب باتیں زبان و قلم دونوں کے ذریعہ نہ صرف جماعت کے حلقوں میں پھیلائی گئی ہیں بلکہ خطوط تک کے ذریعہ تحریری طور پر خود ہمیں بھی مسلسل پہنچائی گئی ہیں اور ابھی پچھلے دنوں جو بیسیوں خطوط ہمیں موصول ہوئے ہیں ان میں ان سب باتوں کا اعادہ پوری وضاحت سے کیا گیا ہے۔" (ہفت روزہ المنبر لائلپور ۲۸ جمادی الآخر ۱۳۸۲ھ ص ۲)

مولانا! یہ صالحین ہیں مقدسین ہیں ایسے نیک اطوار اور اعلیٰ اخلاق، پاکیزہ سیرت لوگوں کی حمایت آپ کو ضرور کرنا چاہیئے۔ آپ بھی نہیں "صالحین" میں سے تھے۔ ایک لحاظ سے آپ ان سے علیحدہ ہو چکے ہیں لیکن ہمارے نزدیک ایک لحاظ سے اب بھی آپ ان میں سے ہی ہیں۔ مولانا مندرجہ بالا تحریر سے ہر ذہن میں الگ الگ خیال پیدا ہو گا۔ ہمارے ذہن حقیقت رسا میں یہ خیال اکثر ابھرتا رہتا ہے کہ مخالفین تحریکِ قیامِ پاکستان کی اکثریت اب جماعتِ اسلامی کے خول میں آ گئی ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد اربابِ اقتدار و اختیار نے قیادت و سیادت کے علم بلند کرنیوالوں کے ماضی کا صحیح جائزہ نہ لیا۔ یہی چوک اور فروگذاشت ہے، جو یہ کرم خوردہ خلافِ قیامِ پاکستان اسلام کو جسے برہمو سماجی، گنگا جمنی اور سوراجی اسلام کہا جاتا ہے۔ اور مودودی اسلام کے لیے فضائے پاکستان میں نعرے بلند

کرنے کا سبب بنی۔ یہ بات کوئی ایسی حیرت انگیز نہیں، ماضی کے آئینہ میں سب کچھ نظر آتا ہے۔ (مرتب)

طریق کار اور طرز خطاب

"ان سطور رکا راقم جماعت اسلامی کی مساعی کے نتیجہ میں اس ملک میں اسلامی حکومت کے قیام کا کوئی امکان نہیں دیکھتا اور یہ خیال پختہ سے پختہ تر ہوتا چلا جا رہا ہے کہ جو طریق کار جماعت نے اختیار کر رکھا ہے اور جس لب ولہجہ اور طرز خطاب سے وہ اپنے مدمقابل عناصر کو مخاطب کرنا اپنا معمول بنا چکی ہے اور جس طرح وہ باقاعدہ حریف بن کر اصحاب اقتدار اور دوسری پارٹیوں کے بالمقابل خود اقتدار حاصل کرنے کو اپنا مطمح نظر قرار دے چکی ہے، اس کا قطعی نتیجہ اصحاب اقتدار اور ان کا اقتدار چھیننے والوں کے مابین شدید ترین تصادم کی صورت میں رونما ہوگا اور نہیں کہا جا سکتا کہ جب یہ نتیجہ عملاً وقوع پذیر ہوگا تو اس کے بعد ملک میں اسلام کا نام لیکر کوئی کام کرنا ممکن بھی ہوگا یا نہیں؟" ہفت روزہ المنبر لائلپور ۱۴ جمادی الآخر ۱۳۸۳ھ)

مندرجہ بالا اقتباس میں جناب مولانا حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب نے جو طویل عرصے تک جماعت اسلامی کے اراکین اعلیٰ میں شمار ہوتے تھے، پھر جنہوں نے مولانا اصلاحی صاحب کی معیت میں اس جماعت کو خیرباد کہا، اس کے طرز خطاب کے متعلق اپنی رائے پیش کی ہے۔ مولانا یہی تو آپ کی سادہ دلی سادہ لوحی یا پھر اغماض حقیقت ہے کہ مودودی صاحب کا مقصد حیات خدمت دین تھا یا ہے؟ وہ مریض ہوس اقتدار ہیں، وہ نہیں اسلام کی صورت مسخ کر کے، دین کا حلیہ بگاڑ کر، یا پاکان امت صحابہ رضی اللہ عنہم کبار، بزرگان امت کو اپنی سطح پر لا کر کھڑا کر کے مل جائے یا کمیونسٹوں کے ساتھ اتحاد کر کے یا سنہ ۱۹۴۶ء میں اجلاس پٹنہ میں گاندھی جی کی شرکت سے۔ جناب مولانا تو اسلام کے قد کو اور اسکی شکل وصورت کو اپنی اغراض ہوس کے معیاروں کے مطابق گھٹاتے بڑھاتے رہتے ہیں یہی ان کی زندگی ہے۔ یہی ان کی آرزو ہے "اللہ باقی ہوس" جن کا نعرہ تھا یا ہے وہ مودودی کے مکر وفریب اور سحر وطلسم کے بنتے ہوئے جال میں کہاں پھنستے ہیں۔ (چوہدری حبیب احمد)

تحریک ختم نبوت میں مودودی صاحب کا کردار

ماہنامہ "فیضان" ماہ ستمبر، اکتوبر ۱۹۷۸ء میں جناب شفقت عثمانی نے "تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء کی لمحہ بہ لمحہ اور لحظہ بہ لحظہ داستان" کے عنوان سے مولانا خلیل احمد قادری صاحب کے انٹرویو کی دوسری قسط شائع کرائی ہے۔

اقتباس ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں،

"۱۹۵۴ء میں حکومت نے ایک انکوائری کمیشن قائم کیا۔ اس کمیشن کے قیام سے دو روز قبل مجھے جیل میں بی کلاس دے دی گئی اور اب میرا قیام جیل کے اس حصے میں تھا جہاں مولانا عبد الستار خاں نیازی، مولانا مودودی اور نصر اللہ خاں عزیز وغیرہ تھے۔ انکوائری کمیشن کے قیام کے بعد سکھر جیل میں نظر بند تمام رہنماؤں کو سنٹر جیل کے اس حصے میں رکھا گیا جسے دیوانی گھر کہا جاتا ہے۔ جب میں پہلی بار ان حضرات سے ملاقات کے لیے دیوانی گھر کے دروازے پر پہنچا، تو سب سے پہلے سید عطاء اللہ شاہ بخاری سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے مجھے "شہید اعظم" کہکر پکارا۔ چند قدم آگے بڑھا تو شیخ حسام الدین اور تاج الدین انصاری سے ملاقات ہوئی۔ میں نے اپنے والد محترم کے متعلق دریافت کیا تو سید عطاء اللہ شاہ بخاری میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے بڑ کے درخت کی طرف لے گئے۔ جہاں میرے والد محترم ایک چارپائی پر بیٹھے قرآن پاک کی تفسیر لکھ رہے تھے، پہلی نظر میں تو میں انہیں پہچان بھی نہ سکا کیونکہ وہ بہت کمزور ہو گئے تھے اور ہڈیوں کا ڈھانچہ نظر آ رہے تھے۔ والد محترم نے مجھے دیکھا تو اٹھ کر سینے سے لگا لیا۔ میں نے عرض کی "آپ اتنے کمزور کیوں ہو گئے؟" والد محترم نے فرمایا "سکھر جیل سقر جیل تھی۔" ۱۲۵ ڈگری گرمی تھی اور جس بارک میں ہمیں رکھا گیا تھا اس کے اوپر لوہے کی چادریں تھیں، پانی بھی وقت کی پابندی کے ساتھ ملتا تھا۔ اکثر پسینے سے ہی غسل کر کے تفسیر کا کام شروع کر دیتا تھا۔"

قائدین کی آمد کے بعد جیل میں بہت زیادہ رونق اور چہل پہل ہو گئی تھی۔ اکثر علماء والد محترم سے ملاقات کے لیے آتے رہتے تھے۔ والد صاحب قبلہ جیل سے ملنے والے راشن سے مٹھائی وغیرہ تیار کر کے گیارھویں شریف کے ختم کا اہتمام کرتے تھے۔ ایک روز مولانا غلام محمد ترنم (جنھیں دیوانی گھر سے کچھ فاصلے پر واقع "بم کیس" کی بارکوں میں رکھا گیا تھا) معروف اہلحدیث عالم مولانا

محمد اسمٰعیل کا ہاتھ پکڑ کر انہیں والد صاحب کے پاس لے آئے اور انہوں نے ازراہِ مذاق فرمایا "کہ آپ اس وہابی کو گیارھویں شریف کا تبرک کھلانا ہے۔ مولانا اسمٰعیل ہنستے ہوئے گیارھویں شریف کی محفل میں بیٹھ گئے۔ ان کے علاوہ عطاء اللہ شاہ بخاری اور کئی دوسرے دیوبندی اور وہابی علماء بھی اس محفل میں شریک تھے بسوائے مولانا محمد علی جالندھری کے جو بدعت کی گردان کرتے ہوئے کمرے سے باہر چلے جاتے تھے۔ اور تبرک لینے سے بھی انکار کرتے تھے۔ مولانا محمد اسماعیل صاحب نے فاتحہ خوانی میں شرکت کرنے کے بعد کہا کہ اگر یہی گیارھویں شریف ہے تو آپ میرے گھر روزانہ آیئے اور گیارھویں شریف کی فاتحہ کیجئے۔ پھر انہوں نے تبرک بھی کھایا اور اس کے بعد وہ اکثر والد محترم سے علمی گفتگو کرتے رہتے تھے۔ ایک روز گیارھویں شریف کی محفل میں مودودی صاحب بھی شریک ہوئے اور انہوں نے تبرک بھی کھایا۔ اس دوران ان کی والد صاحب سے چند علمی موضوعات پر گفتگو بھی ہوئی۔ شام کو میں مودودی صاحب سے انکی بارک میں ملا تو وہ مجھے کہنے لگے، مولانا ابوالحسنات سے ملاقات کر کے مجھے بڑی خوشی ہوئی ہے اور ان کے تبحر علمی نے مجھے بے حد متاثر کیا ہے میرا ارادہ ہے کہ میں اپنا لٹریچر اُن کے سپرد کر دوں تاکہ وہ اسکی اصلاح کر دیں" میں نے مودودی صاحب سے کہا کہ اگر ایسا ہو جائے تو یہ بہت بڑا کام ہوگا۔ دوسرے روز میں والد محترم کی خدمت میں حاضر ہوا تو میں نے مودودی صاحب سے گزشتہ روز کی گفتگو کا ذکر کیا۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری بھی اس موقع پر موجود تھے۔ انہوں نے کہا یہ سب منافقت ہے مودودی کی کسی بات پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔" انہوں نے اس موقع پر مودودی صاحب کے خلاف اور بھی بہت سخت الفاظ استعمال کئے۔

دوسرا اقتباس

"پھر جسٹس منیر (لاہور ہائیکورٹ) انکوائری کمیشن نے تحریکِ ختم نبوت کے مقدمہ کی باقاعدہ سماعت شروع کر دی۔ عدالت میں مودودی صاحب کا رویہ انتہائی افسوسناک اور خلافِ توقع تھا۔ انہوں نے یہ موقف اختیار کیا کہ انہیں ڈائریکٹ ایکشن اور تحریک کے دیگر پہلوؤں سے کوئی اتفاق نہیں تھا۔ اس پر حافظ خادم مولانا غلام محمد ترنم اور حضرت والد محترم نے سخت جرح فرمائی۔ مودودی صاحب تو یہانتک کہہ گئے کہ انہوں نے ڈائریکٹ ایکشن کے فیصلے پر دستخط ہی نہیں کئے۔ لیکن والد

صاحب نے کہا ہمارے پاس وہ دستاویز اب بھی موجود ہے جس میں ڈائریکٹ ایکشن کے فیصلے پر
نے دستخط کئے تھے، یہ بات سن کر مودودی صاحب نے کہا "ہاں، میں نے چھوٹے سے دستخط
تھے"! والد صاحب نے فرمایا۔ "تو کیا ہمیں آپ کے دستخطوں کا بورڈ لکھوا کر لگانا چاہیئے تھا۔
مودودی صاحب لاجواب ہو گئے اور والد صاحب نے وہ دستاویز عدالت میں پیش کر دی جس
ڈائریکٹ ایکشن کا فیصلہ تحریر تھا مودودی صاحب کے علاوہ
کی راہنما نے اس بات سے انکار نہیں کیا کہ اس نے ڈائریکٹ ایکشن کے فیصلے پر دستخط نہیں کئے
نے بہرحال میں پہلے پہل تو مودودی صاحب کے اخلاق سے بہت متاثر ہوا۔ لیکن اب ان کی
صریح غلط بیانی اور بزدلانہ روش سے مجھے بڑی مایوسی ہوئی۔"

آخری اقتباس " جیل سے رہائی کے بعد مودودی صاحب نے ایک دعوت کا اہتمام
کیا جس میں انہوں نے دیگر معززین شہر کے علاوہ مجھے بھی مدعو
کیا۔ میں نے اس موقع پر مولانا مودودی سے کہا "اب حالات معمول پر آ چکے ہیں اپنا وعدہ
پورا کیجئے اور اپنا سارا لٹریچر مجھے دیجئے تاکہ میں والد صاحب سے اسکی اصلاح کروا دوں"
لیکن مولانا مودودی نے ٹالنے کی کوشش کی میں نے اصرار کیا تو کہنے لگے "جیل میں میرا ارادہ
بنا تھا لیکن اب جو چیز چھپ چکی ہے اس کو بدلنا بہت مشکل ہے۔

(ماہنامہ فیضان صفحہ ۳۹، ۴۰ ماہ ستمبر اکتوبر ۱۹۷۸ء)

قارئین کرام! مندرجہ بالا اقتباسات میں آپ نے علامہ ابوالحسنات مرحوم و
مغفور، خطیب ہند سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور جناب مولانا خلیل احمد قادری کے
مولانا مودودی کے متعلق ریمارکس پڑھ لیے سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے مودودی
کو منافق، ناقابل اعتبار جھوٹا قرار دیا۔ علامہ ابوالحسنات رح نے جسٹس منیر کے سامنے
دستاویز، جس پر ڈائریکٹ ایکشن کے لیے مودودی کے دستخط موجود تھے (اور
جس کی ذمہ داری سے اس "اللہ کے شاہکار" نے انکار کا موقف اختیار کرتے ہوئے
کہا تھا کہ میں نے دستخط نہیں کئے) پیش عدالت کر کے انہیں جھوٹا ثابت کر دیا۔
جناب مولانا خلیل احمد قادری کی رائے آپ نے دیکھ لی۔ بانی نوائے وقت جناب
حمید نظامی مرحوم نے ان حضرت کو حسن بن صباح اور راسپوٹین کا لقب دیا ہے

جو آپ اس کتاب کے کسی دوسرے صفحے پر دیکھیں گے مسلمان اور موجودہ سیاسی کش مکش حصہ سوم ص۳۷ پر "لیگ کے قائد اعظم سے لے کر چھوٹے مقتدیوں تک ایک بھی ایسا نہیں جو اسلامی ذہنیت اور اسلامی طرزِ فکر رکھتا ہو اور معاملات کو اسلامی نقطہ نظر سے دیکھتا ہو" لکھنے والا اب یہ کہے کہ میں شروع ہی سے قائد اعظمؒ کا احترام کرتا اور انہیں عزت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ اور قائد اعظمؒ پاکستان میں اسلامی قانون نافذ کرنے کے معاملے میں مخلص تھے، کوئی بھی پاکستانی عصر حاضر کا واقدی کہہ دے تو کسی کی طبع نازک پر گراں تو نہیں گزرے گا ناں ؟

علامہ ابوالحسناتؒ، مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا خلیل احمد قادری اور میر لشکر جوانانِ ملت جناب حمید نظامی مرحوم و مغفور (بانی نوائے وقت) کے فرمودات کی روشنی میں ہم نہایت فخر و ناز سے کہہ سکتے ہیں کہ ان آراء سے ہمارے اس محوری نکتہ نظر کی تائید و حمایت ہوتی ہے جو ہماری اس کتاب کا مرکزی خیال ہے اور اس صداقت سے تو کوئی بھی صاحبِ ایمان اختلاف و انکار کی جرأت نہیں کر سکتا، کہ اس کیر یکٹر کا آدمی اپنا خانہ ساز اسلام تو تراش سکتا ہے نبوی اسلام کے بارے میں مخلص و دیانت دار نہیں ہو سکتا۔ اور ہمیں یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ یہ حقیقت مودودی صاحب کے لٹریچر سے پوری طرح عیاں ہے۔ خدا ان کی عقیدت کی زنجیروں میں گرفتار ہو جانیوالوں کو ضیائے شعور دے۔

ایک اور بات جو اسی انٹرویو میں آپ حضرات کے سامنے آئی ہے، کہ علما کہلانے والے مختلف فرقوں سے متعلق حضرات نے ختم گیارھویں شریف میں شرکت فرما کر وسیع القلبی اور بلند ظرفی کا ثبوت دیا اگر یہ اصحاب شریعت اور ارباب دین سمجھے جانیوالے اپنے جزئی اختلافات کو اسی طرح حسن سلوک سے ختم کر دیں تو کتنی اچھی بات ہو۔ رہے مولانا محمد علی جالندھری کی ذہنیت کے حامل، تو ایسا ایک آدھ اڑیل طبیعت ہر جگہ، ہر مقام پر موجود ہوتا ہے بلکہ

سازی کے لیے فروعی اختلافات کا ختم کرنا از حد ضروری ہے۔ فرقے نہیں مٹیں گے تو مسلمان صفحہ ہستی سے ہٹ جائیں گے۔ کیونکہ خدا کی توحید اور حضور کی رسالت یعنی رب العالمین اور رحمۃ للعالمین ایک توحیدی نکتہ ہے وحدتِ انسانیت کے لیے وحدتِ افکار ضروری ہے (چودھری جلیب احمد)

کے تحفظ کے نام پر اس کے سامنے اپیل کی جاتی ہے تو وہ سر سے کفن لپیٹ کر ہر قسم کی قربانی کرنے کو تیار ہو جاتی ہے۔"

پانچواں اقتباس حضرات! جس قوم میں جفاکشی، ایثار اور اطاعت کی بے مثال صلاحیتیں موجود ہوں اس کو مردہ کون کہہ سکتا ہے۔ اور اس کو ارادوں کی تکمیل سے کون روک سکتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ آپ اجتماعی رنگ میں ان کی صحیح رہنمائی کریں اور کتاب اللہ اور سنّتِ رسولؐ کی روشن ترین مشعل لیکر ان میں شامل ہوں وہ حصولِ مقصد سے پہلے دم نہ لے گی۔ اور دوسری قوموں کو بتا دے گی کہ آج بھی زندہ پیغمبر کی زندہ قوم محکومی کی زندگی پر عزت کی موت کو ترجیح دیتی ہے۔ وہ مسلمان جیسے مسلمان رہنا چاہتے ہیں مسلمان رہ کر مرنا چاہتے ہیں اور انہیں یہ عشق ہے کہ ہندوستان میں اسلامی تہذیب وتمدن زندہ رہے۔"

چھٹا اقتباس حضرات! آپ سے زیادہ کون جانتا ہے کہ قرآنِ حکیم نے دوسری اقوامِ عالم کی طرح امّتِ مسلمہ کی موت وحیات، ترقی، تنزل اور کامیابی وناکامی کے جو اصولی اسباب بیان کئے ہیں ان کا عنوان اجتماع وائتلاف کو بنایا ہے اور اعلان کیا ہے کہ جب تک کسی قوم میں اجتماع وائتلاف رہتا ہے، مختلف کارکن افراد واحزاب ایک نصب العین کے لئے ایک طریق کار کے ذریعے متحدہ محاذ قائم کر لیتے ہیں اور تمام افراد زنجیر کی کڑیوں کی طرح ایک دوسرے کے متحد ومتصل ہو جاتے ہیں تو اس قوم کو زندہ قوم کہا جاتا ہے۔ اقبال وترقی اس کے قدم چومتی ہے اور وہ سعادت وفلاح سے ہمکنار ہوتی ہے اور جب معاملہ برعکس ہو جاتا ہے تو اقبال کی جگہ ادبار۔ عروج کی جگہ تنزل عظمت کی جگہ ذلت، حکمرانی کی جگہ محکومی اور زندگی کی اس پر موت طاری ہو جاتی ہے۔"

ساتواں اقتباس "ضرورت ہے کہ آپ اپنی ساری قوتوں کو اس اجتماع وائتلاف کے پیدا کرنے میں صرف کر دیں اور مسلمانوں کے اندر انفرادی اور احزابی اغراض کے ماتحت جو تفریق وانتشار موجود ہے اس کو ختم کر دینے میں کوئی دقیقہ بھی اٹھا نہ رکھیں۔ التزام جماعت کے متعلق جو آیات واحادیث صحیحہ

موجود ہیں ان کی روشنی میں ان پر واضح کریں کہ اسلام کی قومیت متفرق اینٹوں کا نام نہیں، دیوار کا نام ہے "المسلم للمسلم کالبنیان" کروڑوں افراد کی بھیڑ کا نام نہیں ایک سالم جسم کا نام ہے جس کے تمام اعضاء باہم مرتبط ہوں۔ ایک عضو میں درد ہو تو سارا جسم محسوس کرتا ہے اور اس کی بے چینی اور تکلیف میں اسی طرح حصہ لیتا ہے، جیسے خود اس کے اندر درد اٹھ رہا ہو۔"

آٹھواں اقتباس خدا تعالیٰ کے عدل و انصاف کا وہ غیر فانی قانون جو تمام کائنات ہستی میں سورج سے لیکر حشرات الارض تک کے لیے نافذ ہے اور جس کو وحیِ ربانی کی زبان میں "صراطِ مستقیم" اور رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی اصطلاح میں "حنفیت بیضا" کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جس سے صرف بدبخت انسان ہی روگردانی کر سکتا ہے۔ زمین کے ہر گوشہ میں جاری و ساری ہو کر فوز و فلاح کی بہشت بنا سکتا ہے۔"

نواں اقتباس حضرات! یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ ہندوستان کے مسلمان برسوں سے غیر مسلموں کی طرح انگریزوں کی غلامی میں جکڑے ہوئے ہیں اور جس طرح دوسرے چاہتے ہیں کہ محکومی کی زنجیریں کٹیں، ان سے بڑھ کر یہاں کے مسلمان بارگاہِ ایزدی میں سربسجود ہو کر اپنی آزادی کی تمنائیں کرتے ہیں اور جب کبھی آزادی کی کوئی صحیح تحریک یہاں پیدا ہوتی ہے تو وہ دوسروں کے مقابلے میں زیادہ زیادہ تعداد میں شریک ہوتے ہیں لیکن جب سے انگریزوں نے مشروط آزادی کے متعلق اعلان کیا ہے، برادرانِ وطن متحدہ قومیت کی آڑ لیکر چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کو محکومی کی دہری زنجیروں میں جکڑ لیں وہ اپنی تعداد اور دولت کی کثرت پر اتراتے ہوئے اور یورپی جمہوریت پر گھمنڈ کرتے ہوئے مسلمانوں کے خلاف متحدہ محاذ قائم کر رہے ہیں اور ان کے لاڈلے لیڈر اعلان پر اعلان کر رہے ہیں کہ وہ مسلمانوں کو کچل کر رکھ دیں گے۔ ان کے مطالبۂ حق خود مختاری اور ان کی مستقل قومی ہستی کو مان کر کبھی بھی ان سے صلح نہیں کریں گے اُن کے مقابلہ پر صلح پسند پیغمبر کی امت نے بھی اپنی مستقل قومی اور سیاسی اقتدار کی حفاظت کے لیے ہی شروع

کردی ہے اور ہمیں یقین ہے کہ جس طرح متکبر جالوت اور اس کی مغرور جماعت کو خدا تعالیٰ نے طالوت کے مقابلہ میں جہاد بالسیف کے ذریعہ بدترین شکست دی تھی۔ وہی زندہ رب العالمین ان کو بھی اس آئینی جنگ میں فتح دے گا۔

حضرت! یہ معرکۂ انتخاب آپ کی تقدیر کے لیے اسی طرح فیصلہ کن ہے جس طرح پانی پت کے میدان کا ہر ایک معرکہ ہندوستان کی تقدیر کے لیے فیصلہ کن تھا۔ اس معرکہ میں رضائے الٰہی کے ماتحت قوم کا جو قدم اٹھے گا اسے جو مصائب پیش آئیں گے جس قدر بھوک پیاس جھیلنی پڑے گی۔ اور عزم وعمل کو استوار رکھ کر جس قدر صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں گی، وہ اس کے نامۂ اعمال میں عمل صالح وعبادت الٰہی شمار ہوں گی۔"

دسواں اقتباس

ضرورت اس کی ہے کہ آپ حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت اور امتِ مسلمہ کی قیادت کا گراں بار فرض اجتماعی شکل میں ادا کریں جہاد کی معنوی اور شرعی وسعت آن پر واضح فرمائیں۔ آیات واحادیثِ جہاد سے ان کے دلوں کے اندر دیرپا حرارت پیدا کریں اور اخوت و وحدتِ اسلامی کے قیام کی انتہائی کوشش فرمائیں۔ جب مسلمانوں کا خدا ایک، رسول ایک قرآن ایک اور مقصد ایک ہے تو ان میں اپنی بقاء اور سربلندی کے لیے اتحاد کیوں نہیں ہو سکتا۔ خصوصاً جب کہ ان کے مخالفین اصول وعقائد میں متحد نہ ہونے کے باوجود ان کے خلاف محاذ قائم کر رہے اور ایک دوسرے کے ساتھ رواداری سے پیش آ رہے ہیں صرف آپ کی مخلصانہ توجہ سے ملت کا تشتت وانتشار دور ہو سکتا ہے۔ غیروں کے حملے بے اثر ثابت ہو سکتے ہیں اور آپ "انتم الاعلون" کا ڈنکا بجا سکتے ہیں۔ خود مختاری یا خود ارادیت حاصل ہو جانے کے بعد ہر گروہ اپنے اعلان کردہ مقاصد کے لیے اپنی بساط کے مطابق کوشش کر سکتا ہے اور یہ حق کسی کی کوششوں میں مخل نہیں ہو گا۔ جن بزرگوں کو حکومت الٰہیہ مطلوب ہے وہ اس کے لیے صحیح کام شروع کر سکتے ہیں جن بزرگوں کے نزدیک فقیہانہ اصطلاحات کے مطابق "دار الحرب" کو "دار السلام" بنانا ضروری ہے وہ اپنے خیال کے مطابق سعی فرما سکتے ہیں۔ جو بھائی غلبۂ اسلام کے داعی ہیں ان کی خدمت میں غالباً

یہ عرض کرنے کی ضرورت نہیں کہ یہ مقصد مسلمانوں کے تشتت باہمی اور بذم دپیکار سے
حاصل نہیں ہوگا۔ اور مسلمانوں کا مختلف حصوں میں اسطرح تمکن حاصل کرلینا کہ وہ اپنے تمام
اجزاء کو ملک کے ہر حصے میں بہتر طریق پر محفوظ کرنے کے قابل ہوجائیں۔ بہرحال غلبۂ اسلام
کے لیے مفید ہے مضعف نہیں ہے اور ہمارے جن بھائیوں کی زبان پر ملک کی آزادی کا نعرہ
ہے ان پر بھی واضح ہے کہ یہاں کی بڑی قوموں میں اتفاق و یک جہتی کے بغیر ترقی کے راستے
میں ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھایا جاسکتا۔

گیارھواں اقتباس "حضرات! جس سیاسی اقتدار کے لیے غیر آئینی جنگ کی بجائے انتخاب کی آئینی لڑائی کا اعلان ہوچکا ہے اسکو
قرآن کریم کی زبان میں سلطنت مملکت وراثت فی الارض، تمکن فی الارض خلافت اور استخلاف
فی الارض کہا جاتا ہے اور اسی کی بدولت اس ملک کے باشندوں کو عام امن، سکون، راحت،
اور طمانینت حاصل ہوسکتی ہے۔"........ ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں غلامانِ
محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی چاروں طرف بدترین دشمنوں سے گھری ہوئی
تھی۔ اور دشمنوں کے پے در پے جارحانہ حملوں کی وجہ سے ان کا یہ حال تھا کہ باوجود قلت
تعداد و بے سروسامانی کے جس قسم کے ہتھیار ان کو میسر تھے، انہیں کسی وقت بھی اپنے جسم سے
دور نہیں کرتے تھے۔ اس وقت شمعِ حرم کے ان پروانوں کو اسی تمکن و استخلاف فی الارض کی
بشارت ملی اور خدا تعالیٰ نے ان کو یقین دلایا کہ تمہیں عنقریب تمہارے مخلصانہ ایمان و
اعمالِ صالحہ کا پھل فضلِ ایزدی سے یہ ملے گا کہ تمہیں اس ملک میں سیاسی اقتدار سے
نوازا جائے گا۔ اسی اقتدار کامل اور آزادانہ تسلط و اختیار کے ذریعہ تمہاری خوف کی گھڑیاں
دائمی امن کی خوشحالی سے بدل دی جائیں گی۔

یہ تاریخی خطبہ "مولانا غلام مرشد کے خطبۂ صدارت" کے عنوان سے ۱۹۴۵ء
میں ایک کتابچہ کی صورت میں شائع ہوا۔ اس سے مولانا کی علمی عظمت کا اندازہ کرلینا
چنداں مشکل نہیں کہ حضرت قائداعظمؒ نے جناب مولانا غلام مرشدؒ کو اس ملی
خدمت کے لیے چنا۔ آسمانِ حقیقت پر یہ صداقت درخشاں و تاباں و رخشاں ہے

کہ علامہ اقبال علیہ الرحمۃ انہیں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے اور ان کے فہم قرآنی کا اعتراف فرماتے تھے۔ یہ مردِ حق اپنی حیثیت میں یکتا و یگانہ تھا۔ راقم کو بھی استاذ مکرم جناب مرزا عبدالحمید پروفیسر اسلامیات اسلامیہ کالج اور خطیب آسٹریلیا مسجد کی معیت میں اس درویش حق پسند کے فرمودات سننے کا شرف حاصل رہا ہے۔ بلاشبہ آپ حق گوئی و بیباکی کی صفت عالیہ سے مزین اور صاحبانِ دین و دانش اور اربابِ فہم و فراست میں سے تھے۔

چودھری حبیب احمد

انکی باتیں یاد رہیں گی

قاضی دین الحق خلف الرشید قاضی عبدالحق (مرحوم) جن کا تذکرہ میری اس کتاب میں کسی اور جگہ ملے گا، کراچی سے (بیاد مولانا غلام مرشد) علیہ الرحمۃ عنوان بالا سے رقمطراز ہیں:۔

موت العالم موت العالم) ایک حقیقت ہے۔ برصغیر پاک و ہند کی دینی اور علمی تحریکات میں مولانا غلام مرشد (مرحوم) کا نام ایک خاص مقام رکھتا ہے۔ وہ میرے مہربان، مشفق، مگر سخت گیر استاد تھے۔ مجھے جو کچھ آتا ہے صرف انہی کی نگاہِ فیض کا اثر ہے۔ میں نے قرآنِ کریم لفظاً لفظاً ان کے رفیق کار قاضی سراج احمد سے پڑھا جو اچھرہ میں قیام کرتے تھے عربی کے شعر اور زمانہ جاہلیت کے شعراء کے کلام سے باخبر تھے۔ قرآنِ پاک کی تفسیر قرآن پاک کی رو سے کرنے کے پابند تھے۔ اور اس سلسلہ میں شمالی ہند میں سوائے قبلہ حافظ محمد اسلم جیراجپوری مرحوم استاد جامعہ ملیہ دہلی) کوئی ان کا شریک و سہیم نہ تھا۔ میں اس وقت اشاعت اسلام کالج انجمن حمایت اسلام کا طالب علم تھا۔ وہ کالج کے واجب الاحترام استاد اور وائس پرنسپل تھے (۱۹۳۲ء تا ۱۹۳۴ء)

وہ درس نظامیہ کے فارغ التحصیل تھے حافظ قرآن تھے، وسیع مطالعہ کے مالک تھے انہوں نے کچھ عرصہ مدرسہ نعمانیہ لاہور میں بھی بطور مدرس کام کیا۔ پھر وہ بھاٹی گیٹ کے اندر اونچی مسجد میں بعد نماز مغرب اور پھر مسجد میں بعد نماز فجر قرآن کریم کا درس دینے لگے

درسِ قرآن کے سلسلے میں گوناگوں تکالیف و مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ مالی پریشانی اس پر مستزاد تھی۔ مگر وہ باعزم اور باہمت تھے، اس لیے درس دیتے رہے۔ یہ مخالفت کیوں تھی۔ مخالف کون تھے؟ ایک دردناک افسوسناک پہلو ہے اور ہماری ملّی جہالت کا آئینہ دار اور خود غرضی کا ایک المیہ شاہکار۔

اسوقت مساجد میں بالخصوص لاؤڈ سپیکر کا رواج کم تھا۔ قبلہ مولانا محترم قدآور آواز گرج والی، ضروری خطبہ مسنونہ کے بعد آہستہ آہستہ کلام شروع کرتے۔ چند منٹ کے بعد ان کی گرجدار آواز دور دُور تک سنائی دیتی تھی۔ مجمع دم بخود چُپ چاپ بیٹھا رہتا تھا۔ ان کی تقریر مدلّل مسکت۔ حقائق پر مبنی ہوتی تھی، لوگ تھکاوٹ محسوس نہ کرتے تھے۔ سامعین میں طالبعلم، وکلاء، مسلم آفیسرز، پروفیسر صاحبان، تاجر، صنعتکار، عام دکاندار سبھی شامل ہوتے تھے۔ اونچی مسجد (بھاٹی گیٹ) نہری مسجد رڈبی بازار اور اشاعت اسلام کالج تک ان کی علمی سرگرمیاں جاری اور محدود تھیں وہ عام جلسہ جلوس میں شاذونادر ہی جاتے تھے۔ ایک دفعہ میکلیگن کالج انجینئرنگ مغلپورہ کے پرنسپل کیخلاف ایک جلسہ ہوا۔ شاہ عطاءاللہ شاہ بخاری مرحوم، جلسہ کے خطیب تھے۔ وہ تمام حاضرین جلسہ کو پیچھے لگا کر کالج کی پکٹنگ پر لے گئے۔ مولانا بھی شاملِ حاضرین تھے۔ پولیس کی لاٹھی چارج سے گزر کر جیل کی کوٹھڑی تک نوبت پہنچی۔ انہوں نے اندر سیاسی لیڈروں کی جو قلابازیاں دیکھیں ان سے اسقدر دِل افسردہ ہوئے کہ پھر کبھی ہنگامہ آرائی میں حصہ نہ لیا۔ یہ واقعہ ۱۹۳۲ء سے پہلے کا ہے اور اُن کی زبانی:۔

انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسہ پر اُن کی تقریر کے لیے خصوصی انتظام ہوتا تھا۔ پروفیسر علم الدین سالک، مولانا عبدالمجید سالک، مولانا ظفر علی خاں (زمیندار) سیّد حبیب (سیاست) خود شاعرِ مشرق فیلسوف اسلام ڈاکٹر سر شیخ محمد اقبال، (جو اب سب مرحوم ہو چکے ہیں) مولانا محترم کے بیحد مدّاح، شائق اور چاہنے والے تھے۔ مجھے ذاتی طور پر معلوم ہے کہ ڈاکٹر مرحوم کے پاس عربی میں لکھے ہوئے کاغذات

کسی خاص موضوع پر موصول ہوتے وہ کسی سے پڑھے نہ جاتے تھے۔ بالآخر مولانا محترم کو تکلیف دی گئی۔ انہوں نے اس کا اردو میں ترجمہ کیا۔ اس کا انہوں نے سنہری مسجد کے درس میں ضمناً ذکر کیا تھا۔ وہ کاغذ کالج میں بھی لاتے تھے اور ترجمہ کرتے رہتے تھے۔ وہ قرآن کی لغت (اُس کے ماخذ) اس کے مضامین پر کامل عبور رکھتے تھے۔ محمد بخش مسلم، عبدالکریم شورش کاشمیری (چٹان) علاؤالدین صدیقی جو بعد میں وائس چانسلر ہوئے اور علامہ صدیقی کہلائے، اُن کے خصوصی تلامذہ میں سے تھے۔ علمی اور دینی مسائل پر اُن سے رجوع کرتے تھے۔

اس وقت مولانا معوان حسین بادشاہی مسجد کے خطیب تھے، ان کی وفات کے بعد ایک اور صاحب (نام یاد نہیں رہا) پھر مولانا غلام مرشد صاحب کو خطیب بنایا گیا۔ ڈاکٹر اقبال (مرحوم) نے اس انتخاب کو بے حد پسند فرمایا۔ اسوقت ایک انجمن اسلامیہ تھی جس کے ممبران بڑے بڑے سر اور خان بہادر تھے۔ گورنر پنجاب کنٹرولنگ اتھارٹی تھا۔ (ان میں سے میاں امیرالدین ابھی بقیدِ حیات ہیں) مولانا نے اپنی آزادانہ اور نقادانہ روش خطیب ہونے ہوئے بھی قائم رکھی۔ انہی کی کوشش سے محکمہ اوقاف قائم ہوا۔ مگر اس محکمہ نے سب سے پہلے انہی کو خطیب کے عہدہ سے الگ کیا کیونکہ وہ نواب کالاباغ (گورنر مغربی پاکستان) کو خوش نہ کر سکے۔ لاہور کے در و دیوار تقریباً ۵۰ سال یعنی نصف صدی ان کی آواز سنتے رہے۔ وہ لاہور کے ہردلعزیز مفسر قرآن تھے پُرشکوہ اور پُروقار لفظ سے یاد کئے جاتے تھے۔ وہ اکثر و بیشتر گھر پیدل آتے جاتے تھے۔ اور قرآنِ کریم کا ورد کرتے رہتے تھے۔ میں نے اپنے دورانِ قیام اشاعت اسلام کالج، لاہور ان کو سواری پر نہیں دیکھا۔

صحت اچھی۔ قد لمبا، پھموار کا جوتا، شلوار۔ اُس پر کوٹ۔ سر پہ ترکی ٹوپی۔ سر کے بال اکثر و بیشتر تیل سے تر، میں نے اُن کو پہلے دن اور آخری ہی طرح دیکھا۔ جمعہ کے روز یا کسی خاص موقع پر کلاہ پر پگڑی اپنے روایتی انداز میں پہنا کرتے تھے۔ اپنے ذاتی اور گھریلو حالات سے کسی کو آگاہ نہیں ہونے دیتے تھے۔ ۳ سال کی شاگردی میں اتنا معلوم ہو سکا کہ ضلع سرگودھا کے رہنے والے ہیں اور بس۔

جس روز تنخواہ تقسیم ہوتی یا وظیفہ کی رقم تقسیم ہوتی (طلباء کو انجمن حمایت اسلام کی طرف سے وظیفہ ملتا تھا) سب پرنسپل کے کمرہ میں جا کر دستخط کرتے تھے۔ مگران کی باری پر پرنسپل خود رجسٹر لے

کران کے پاس آتے تھے اور دستخط کرواتے۔ مولانا تنخواہ (جو پچاس روپے ملتی تھی) خود نہ پکڑتے تھے۔ بر نسپل صاحب سے کہتے شیخ عبدالمجید کو دے دو۔ (وہ ایک نو مسلم تھے ان کے والد گلاب سنگھ تھے) وہ رقم لے کر اپنی قیام گاہ کو جاتے ہوئے مولانا محترم کے مکان پر دیتے جاتے تھے۔ وہ ایک حق گو، بیباک، موحد خطیب تھے۔ بڑے باخبر اور علم والے، اپنی بات منوانے کے لیے دلائل و براہین ہمیشہ آراستہ پیراستہ رکھتے تھے۔ ان کے بے شمار تلامذہ اور شاگرد ہیں جن میں سے چند ایک کا ذکر کیا جاتا ہے۔

علامہ علاؤالدین صدیقی ایم اے ایل ایل بی۔ ایم او ایل سابق ڈسٹرکٹ پنچایت آفیسر ضلع ہوشیارپور (مشرقی پنجاب) جو اپنے مطالعہ اور زورِ خطابت کی بنا پر لاہور یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوئے۔ بہت خوبیوں کے انسان تھے۔

عبدالحمید مرزا ایم اے ایم او ایل (ایل ایل بی) جو اپنی خطیبانہ صلاحیت کی وجہ سے جامع مسجد آسٹریلیا بلڈنگ بالمقابل ریلوے اسٹیشن لاہور کے خطیب ہوئے۔ وہ ادارہ اصلاحِ نوجوانانِ مسلم کے بانی تھے۔

مولانا عبدالستار خاں نیازی جو اب ملک کی ایک جانی پہچانی شخصیت ہیں (یہ تینوں اصحاب یکے بعد دیگرے اشاعت اسلام کالج لاہور سے وابستہ رہے۔ ان دو نوجوانوں (عبدالحمید مرزا اور عبدالستار خاں نیازی) کی بدولت پنجاب میں مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن قائم ہوئی اور مسلم لیگ کو سہارا ملا۔ ورنہ سر فضل حسین اور سر سکندر حیات[1] خان کی یونینسٹ پارٹی کا دور دورہ تھا۔ علامہ اقبالؒ پنجاب مسلم لیگ کے صدر تھے مگر پنجاب اسمبلی میں مسلم لیگ کی کوئی آواز نہ تھی۔ صرف ملک برکت علی مرحوم نمائندگی کرتے تھے۔ انہی دو نوجوانوں کی بدولت (یہ اسوقت جواں تھے) مسٹر (بعد کے قائد اعظم) محمد علی جناح لاہور تشریف لائے مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے اجلاس کی صدارت کی اور جامع مسجد آسٹریلیا بلڈنگ میں نماز جمعہ عوام کے ساتھ مرزا عبدالحمید کی امامت میں ادا کی عبدالستار نیازی نے تھے۔ جناح صاحب انگریزی لباس میں ملبوس تھے۔ اسوقت کے جوش و خروش کا

---

[1] یہاں قاضی صاحب سے فروگزاشت ہوئی ہے۔ مولف

علامہ اقبال مرحوم کی وفات پر (اپریل ۱۹۳۸ء) مولانا غلام مرشد خود گورنر پنجاب کے پاس گئے اور ملے اور کہا کہ مرکزی حکومت ہند سے اجازت منگوا کر دیں کہ اسلامیانِ لاہور ڈاکٹر اقبال مرحوم کو اسلام کی عظمت رفتہ کے نشان کے پہلو میں دفن کرنا چاہتے ہیں۔
گورنر پنجاب نے مولانا کو اطمینان دلایا کہ حکومت پنجاب دوپہر تک اجازت نامہ کی اطلاع آپ کو پہنچا دے گی (کیونکہ شاہی مسجد لاہور اور اس کے متعلقات محکمہ آثارِ قدیمہ کے تحت ہیں جو ایک مرکزی محکمہ ہے)

مولانا محترم سے عوامی اختلاف کی چند تاریخی مثالیں

۱۔ راجپال مصنف رنگیلا رسول اور مقدمہ ہائیکورٹ پنجاب (راجپال کو علم الدین شہید نے قتل کر دیا تھا) ماتحت عدالت نے راجپال کو جرمانہ اور قید کی سزا دی۔ ہائیکورٹ نے جرمانہ بحال رکھا، سزا معاف کر دی)　　(فیصلہ جسٹس دلیپ کمار)

عوام نے جسٹس دلیپ سنگھ کے خلاف مہم چلائی۔ مولانا کا موقف یہ تھا کہ جسٹس کا کوئی قصور نہیں، قانون کی دفعات کا قصور ہے۔ ایک طرف مولانا۔ تمام پریس ایک طرف (یہ ۱۹۲۲ء سے پہلے کا واقعہ ہے) یاد رہے کہ مولانا محمد علی جوہر کا بھی یہی موقف تھا۔

۲۔ وہ جلسہ جلوس۔ ہنگامہ آرائی کے خلاف تھے۔

۱۹۳۵ء میں مسجد شہید گنج کی تحریک اٹھی۔ مولانا نے زور دیا کہ اپنی قانونی حیثیت عدالت سے منوائی جائے اور مسجد سکھوں سے آزاد کرائی جائے۔ تحریک چلا کر "لا اینڈ آرڈر" کا مسئلہ نہ پیدا کیا جائے۔ چنانچہ مولانا محترم کا موقف درست ثابت ہوا۔

ان واقعات کے تذکرہ سے مقصود یہ بتانا ہے کہ مولانائے مرحوم کا مسلک یہ تھا کہ غلط قوانین کیخلاف ہنگامہ آرائی کے بجائے انھیں آئینی اور قانونی طور پر منسوخ کرا کر ان کی جگہ صحیح قوانین نافذ کرانے چاہئیں۔ رنگیلا رسول کے کیس میں انھوں نے عدالت میں رد آیا کی صحیح پوزیشن کے متعلق جو بحث کی تھی وہ تاریخ کا ناقابل فراموش کارنامہ ہے۔

۳۔ عید قربان پر ہر جگہ قربانی کی جاتی ہے۔ مولانا نے قربانی کو حج کا رکن قرار دیا۔ رکن حج کے علاوہ وہ اس طرح قربانی کرنے کو روح اسلام کے خلاف سمجھتے تھے۔ اس بات کا اعلان انہوں نے بادشاہی مسجد لاہور میں ہزاروں لوگوں کی موجودگی میں دلائل اور براہین سے کیا۔ مخالفت کا ایک سیلاب امڈ پڑا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے مکان کو جا رہے تھے تو کسی مخالف نے اوپر سے اینٹ ان پر پھینکی جو سر میں چار انچ زخم کرتی ہوئی زمین پر گری۔ کئی ہفتہ ہسپتال میں رہے۔

۴۔ کہا یہ جاتا ہے کہ قرآن کریم سمجھنے کے لیے درسِ نظامیہ پڑھنا ضروری ہے مولانا یہ دلائل یہ موقف رکھتے تھے کہ قرآن مجید ایک واضح اور روشن کتاب ہے جو اپنی تشریح آپ کرتی ہے اور درسِ نظامیہ کی محتاج نہیں چنانچہ انہوں نے اشاعتِ اسلام کالج لاہور میں اس کو عملاً پڑھا کر سمجھا کر دکھلا دیا۔

مولانا محترم ۱۴-۱۵ ستمبر ۱۹۷۹ء کو فوت ہوئے ۸۴ سال کی عمر پائی اور اپنے آبائی گاؤں انگہ (ضلع سرگودھا) میں محوِ استراحت ہیں۔

ہماری قوم مردہ پرست ہے۔ زندہ انسانوں کی قدر نہیں کرتی۔ مگر ہمارے ریڈیو اور ٹی وی نے مردہ پرستی میں بھی سرگرمی نہ دکھائی صرف ایک مختصر سا تذکرہ ٹی وی پر آیا، وہ بھی چند دن بعد

آئندہ زمانہ مولانا غلام مرشد کو بیسویں صدی کا علامہ ابن تیمیہؒ قرار دے گا۔ قرآن کے پیغام و افکار کے عام کرنے میں مولانا محترم نے علامہ ابن تیمیہؒ کا شاندار کردار پیش کیا۔ مولانا غلام مرشد فوت ہو گئے۔ ان کے علمی کارنامے کا ملخص یہ ہے کہ انہوں نے ثابت کیا کہ قرآن عمل کی کتاب ہے، محض ثواب کے لیے پڑھنے کی کتاب نہیں۔ یہ زندگی کا دستور ہے۔ یہ اوامر و نواہی کا سرچشمہ ہے، جھاڑ پھونک کا مجموعہ نہیں۔ یہ آئین جہانگیری ہے، ضابطہ جہانبانی ہے۔ قانونِ حکمرانی ہے، اس کا قانونِ عدل ایک ایسا متوازن معاشرہ پیدا کرتا ہے جس سے دنیا جنت بن جاتی ہے۔ اس کا قانونِ اخوت اور قانونِ مساوات معاشرہ کی طبقاتی کشمکش اور اقتصادی بدحالیوں کو مٹانے اور امن و سکون پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ یہ تھے مولانا محترم غلام مرشد صاحب جنہوں نے قرآنی افکار و پیغام کے پھیلانے میں

نصف صدی یعنی ۵۰ سال اپنی عمر کے صرف کیئے۔ رحمۃ اللہ تعالیٰ۔

ان کے اسی منفرد اور مخصوص قرآنی فہم و تفہیم کا نتیجہ تھا، کہ وہ کسی سے جلد گھلتے ملتے نہیں تھے، دوسری طرف اس کا یہ بھی نتیجہ تھا کہ وہ بہت جلد بڑے بزرگ دوست چوہدری غلام احمد پرویز صاحب سے واقف و شناسا ہو گئے جو اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں قرآن کی شمع روشن کیئے ہوئے ہیں۔ ماہنامہ طلوع اسلام دسمبر ۱۹۷۹ء ص ۱۳ تا ۱۶

قاضی دین الحق صاحب جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے قاضی عبد الحق صاحب مرحوم کے بڑے صاحبزادے ہیں اور قصبہ بجواڑہ کی ایک بستی الہ آباد تحصیل

و ضلع ہوشیار پور سے ہجرت کر کے کراچی میں قیام پذیر ہیں ان کے والد گرامی تنقیدی ذہن رکھتے تھے۔ اُن کے نزدیک ہر حقیقت کو تسلیم کرنے کا معیار قرآن کریم تھا۔ ان کی تربیت اور مولانا غلام مرشد ایسے استاد کی شاگردی نے محترم دین الحق صاحب کو بھی اس جوہر سے متصف کر دیا تھا۔ اس لحاظ سے یہ بھی ہمارے علاقہ میں ایک پیغام انقلاب تھے، یہ اور ان کے برادر خورد قاضی احسان الحق خاکسار تحریک میں بھی سرگرم عمل رہے۔ قاضی دین الحق صاحب نے بطور استاد اسلامیہ سکول بستی دولت خاں (ہوشیار پور) میں بھی خدمت سرانجام دی جناب مرزا عبد الحمید مرحوم و مغفور کے اشاعت اسلام کالج کے طالب علم ہونے کے ناطے سے اور رہائش کے قرب کی وجہ سے یہ راقم سے اچھے خاصے متعارف تھے۔ یہ فرق ضرور رہا کہ میں تحریک قیام پاکستان کا کارکن تھا۔ اور یہ دونوں بھائی خاکسار ۔۔۔ یہ دونوں مسلمانوں کی سرفرازی و سربلندی کے خواہاں تھے۔ اور ہر لحاظ سے ہر لمحہ اور ہر لحظہ مسلم خوابیدہ کی بیداری کے لیے کوشاں و سرگرم رہتے تھے۔

(چودھری حبیب احمد)

جناب ایم۔بی پیرزادہ ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر کی حیثیت سے لائلپور (فیصل آباد) کی جانی
انی شخصیت ہیں۔ اب ریٹائرمنٹ کے بعد پیپلز کالونی ۲۶۲/ڈی میں رہائش پذیر ہیں
نے میری فرمائش پر مولانا غلام مرشد رح کے بارے میں اپنے تاثرات رقم فرمائے ہیں جو
قارئین کئے جارہے ہیں (چودھری حبیب احمد)

حضرت مولانا غلام مرشد رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مولانا غلام مرشد میرے صرف ایک خالہ زاد بھائی ہی نہ تھے بلکہ باپ بھی تھے
کی بڑی صاحبزادی میرے عقد میں ہیں) میں ان کو ان خونی رشتوں کے علاوہ اپنا
ت، محبوب، ہمراز، غمخوار اور روحانی رہنما بھی سمجھتا تھا۔ اور اپنا ہر دکھ ان
سامنے رکھ دیا کرتا تھا۔ جس کے بعد وہ بزرگ میرے لیے ایک ہم عمر ساتھی کا روپ
دھار لیتے تھے اور میرا دکھ بانٹ لیتے تھے۔ جوں جوں زندگی گزرتی گئی، میری ذات
زیادہ ہی اہمیت دینے لگ گئے۔ مجھ پر اتنا اعتماد کرتے تھے کہ شاید اپنی اولاد پر
نہ کرتے ہوں۔ جب بھی ملاقات ہوتی وہ مجھے بھینچ کر گلے لگاتے، میری پیشانی
بوسہ دیتے اور میرے کندھوں کو تھپتھپاتے۔ افسوس کہ وہ لمحے اب خواب ہو گئے

گزر تو جائے گی تیرے بغیر بھی لیکن
بہت اداس، بہت بے قرار گزرے گی

میں ان کی زندگی کے کس پہلو کو اجاگر کروں؟ سمجھ میں کچھ نہیں آتا اور پھر
مولانا جیسے عظیم عالم دین، اقبال کی خودی کے پیکر، مرنجان مرنج بزرگ قابل
تعظیم وصد احترام رہنمائے ملت، غریبوں، یتیموں اور بیواؤں کے سرپرست
عاشق رسول صلعم اور ہر لمحہ قرآن پاک اور سیرت مصطفوی سے رہنمائی حاصل
کرنے والے بزرگ کے متعلق کچھ کہنا یا لکھنا ایک مشکل مرحلہ ہے لیکن محترم بھائی
چوہدری حبیب احمد کے حکم کی تعمیل بھی ضروری ہے کیونکہ ایسی پیاری شخصیت
اور قابل فخر ادیب کو انکار کرنا میرے بس کی بات نہیں۔

حضرت مولانا کی عمر جب ساڑھے چار سال ہوئی تو ہمارے دیہاتی
اصُول کے مطابق ان کو مسجد میں ناظرہ قرآن پاک کی تعلیم کے لیے
والدِ گرامی لے گئے۔ حافظ صاحب نے مولانا کے والدِ بزرگوار سے بچے کے
آنے کا مطلب پوچھا، تو انہوں نے فرمایا کہ غلام مرشد کو آپ کی زیرِ نگرانی
پاک ناظرہ کی تعلیم کے لیے چھوڑنے آیا ہوُں تاکہ بعد ازاں اسے قرآن پاک حفظ کر
میں آسانی رہے۔ حافظ صاحب حیران ہوئے اور فرمایا کہ آپ کو شاید علم نہیں
تو میرے درس میں عرصہ چھ ماہ سے باقاعدگی سے آرہا ہے اور اُس نے پانچ سیپارے
بھی کر لیے ہیں یہ تھا مولانا کا قرآنِ پاک سے عشق جو ساڑھے چار سال کی عمر
ہی آشکار ہو گیا۔ اس کے بعد کی تعلیم اور حالات پر بہت کچھ لکھا جا چکا
اِس لیے اس کا اعادہ ضروری نہیں سمجھتا۔ میری نظر میں تو ہر وقت وُہ مو
جن کو مہینہ میں دو دفعہ دیکھنا میرے فرائض میں تھا۔ اور اگر کسی وجہ
فیصل آباد سے لاہور نہ جا سکتا تو ان کی پریشانی دیدنی ہوتی۔

ایک طرف تو اتنی پریشانی کہ اُن کے گھر والے بھی گھبرا جانے اور دوسری
طرف یہ حالت کہ جب میں لاہور جاتا تو ان کے مکان کی سیڑھیاں نہایت خاموشی
طے کرتا۔ دروازہ کی جھری سے اندر جھانکتا۔ اگر وہ آرام فرما رہے ہوتے تو سیڑھیاں
اتر کر نیچے کسی دُکان پر انتظار کرتا تاوقتیکہ وہ اُٹھ نہ جائیں۔ یا اگر دروازہ کھلا
ملتا اور آپ اپنی مخصُوص کُرسی پر مطالعہ میں مصروف ہوتے تو پھر اُن کا انہماک
قائم رکھنے کے لیے خاموشی سے اندر جا کر دیوار سے لگ کر کھڑا ہو جاتا۔ یہ
آدھ گھنٹہ تک بھی طوالت پکڑ جاتا۔ مقصد یہ ہوتا تھا کہ اُن کے مطالعہ میں
اُن سے زیادتی کے مترادف تھا۔ خاصے وقت کے بعد جب وُہ ادھر نگاہ
اور اشارہ فرماتے تو اُن کی قدمبوسی کرنے کی جرأت کرتا۔ کئی حضرات ان کی
محویّت کو بے نیازی پر محمول کرتے لیکن میں کہتا تھا کہ قرآن پاک کے مطالعہ میں
مصرُوف ہوتے ہیں کہ ان کو گرد و پیش کا کوئی ہوش ہی نہیں رہتا۔ یہ عرصہ

بلوں کہ کئی بار مولانا کرسی پر بیٹھے مطالعہ میں مصروف ہیں ملاقاتی آتے ہیں، اور
وہ نگہ نہیں اٹھاتے۔ ملاقاتی بے نیازی کا شکوہ لیے سیڑھیاں اتر جاتے ہیں۔
تی ایک کمرہ میں بھی داخل ہو جاتے ہیں اور جو چیز پسند آئی اٹھا لیتے ہیں۔ ایک
دفعہ ان کی گھڑی، پھر ریڈیو، پھر بٹوا اور کئی دفعہ برتن اٹھائے گئے لیکن ان کے
استغراق کا یہ عالم۔ کہ معلوم ہی نہیں کہ کون آیا اور کیا اٹھا کر لے گیا۔

ان کی پوری زندگی باطل کے خلاف جہاد میں بسر ہوئی۔ اتنے باحوصلہ اور عظیم
مر بھر کسی کی تکفیر نہیں کی۔ نتیجتاً پتھر کھائے، مخالف خنجر لے کر حملہ آور ہوئے
بارات نے شور مچایا، گالیاں کھائیں، قدِ آدم پوسٹر چھپوا کر ان کے خلاف تقسیم
ہ گئے اور یہ سب کچھ جاننے کے باوجود اور یہ بھی جانتے ہوئے کہ حملہ آور کون تھے
سے ذکر تک نہیں کیا۔ وزراء، پولیس کے اعلیٰ افسران، وکلاء اور احباب نے منّتیں کیں
ہی ایک کا نام بتا دیں لیکن آپ نے فرمایا کہ وہ کسی کو تکلیف نہیں دینا چاہتے، عفو
کرنا۔ تو جیسے ان کی گھٹی میں پڑا تھا۔

ایک دفعہ آپ کے گھر دوپہر کا پرتکلف کھانا لایا گیا۔ برتن ایک ٹرے میں
تھے۔ دینے والا ٹرے مولانا کے ہاتھ میں پکڑا کر چلا گیا کہ برتن پھر لے جائے
سوقت آپ بھاٹی دروازہ کے اندر محلہ شیش محل میں رہائش پذیر تھے۔ مکان
کی سیڑھیاں تھیں۔ اتفاق سے آپ آخری سیڑھی پر قدم رکھنے لگے تو پاؤں پھسل
ور تمام برتن فرش پر الٹ گئے۔ گھر والے دوڑے آئے اور برتنوں کو اٹھانے
کہ اتفاق سے ایک بلی بھی وہاں آگئی، اس نے سالن والے برتن سے گری ہوئی
بوٹیاں کھالیں بس نگلنے کی دیر تھی کہ تڑپنے لگ گئی۔ کوئی بہت ہی تیز زہر
ہ میں ملا دیا گیا تھا۔ مولانا نے جونہی دیکھا، فوراً ہی تمام کھانا اکٹھا کر کے نیچے
کے پانی میں بہا دیا۔ آپ خود اندازہ فرمائیں کہ کھانا بھیجنے والے نے آپ کے گھر
بلہ افراد کو مارنے کی کمینی اور بزدل سازش کی تھی لیکن اس تمام حیرانگی اور صدمہ
باوجود مولانا نے کسی پر شک نہ کیا۔ کیا اتنا عظیم بھی کوئی انسان فی زمانہ ہو سکتا

ہے ؟

ایک دفعہ اسی مکان سے باہر نکلتے ہوئے اوپر سے ایک سالم اینٹ کس
دے ماری جو آپ کے کلاہ کو پھاڑتی ہوئی سر میں تین چار انچ لمبا زخم کر گ
دنوں کی مرہم پٹی کے بعد یہ زخم ٹھیک ہوا۔ چوکی پولیس اندرون بھاٹی درو
قریب ہی زنانہ سے ایک پتھر ان کی کنپٹی کو لہو لہان کر گیا۔ ایک رات ت
بجے کسی نے زور زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ آپ صرف تہ بند باندھے تھے، دوڑ
اور دروازہ کھولا اور دیکھا کہ ایک نوجوان ہاتھ میں خنجر لئے کھڑا ہے۔ اس نے و
حملہ کر دیا۔ خنجر کی نوک ان کے سینہ میں زخم کر گئی لیکن آپ نے اس نوجوان
سے خنجر چھین لیا اور اسے کہا کہ اب چلے جاؤ۔ دوسرے دن وہ خنجر پولیس ک
حوالہ کر دیا گیا۔ انہوں نے لاکھ جتن کئے کہ مولانا اس نوجوان کا نام بتا دیں ل
آپ نے اپنی عادت و فطرت کے مطابق ہی کام لیا اور کسی کیخلاف رپور

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس! تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

میں تو کہونگا کہ یہ فراخدلی اور عفو و درگذر، اس ذات پاک رسالت مآ
اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عقیدت و شیفتگی اور آنحضورؐ کی پاک زندگی کے مطالع
قرارداد لاہور کے بعد انہوں نے اپنی خدمات قائداعظم کے سپرد کر دیں اور
پاکستان کی حمایت میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ ۱۹۴۵ء سے الیکشن میں اس ز
وزیر علی خضر حیات ٹوانہ ہمارے علاقہ سے امیدوار تھا اور اس کے مقابلہ میں ک
چچا ملک محمد ممتاز ٹوانہ جو مسلم لیگ کا امیدوار تھا۔ مولانا ایک دفعہ اپنے ہاتھ
انگہ اور پھر ضلع کے مرکزی شہر نوشہرہ میں ایک دو تقاریر فرمائیں اور واپس لاہ
گئے اور مسلم لیگی امیدوار کے حق میں علاقہ کو ہموار کرنے کی ذمہ داری مختلف حضر
پر چھوڑ گئے۔ ان دنوں لوگوں میں جو جذبہ تھا وہ شاذ ہی کبھی مسلمانوں میں
ہو سکے۔ تمام علاقہ قائداعظم کے فرمانے کے بموجب مسلم لیگ کے حق میں تھا۔

حیات ٹوانہ نے حالات دیکھے تو مولانا کی منت سماجت کی۔ جب دیکھا کہ یہ فولاد کسی طرح بھی نرم نہیں ہو سکتا تو اسے مختلف طریقوں سے آنچ دینا شروع کی۔ مجھے میرے چھوٹے بھائی احمد ندیم قاسمی اور میرے چچازاد بھائی محمد حیات مرحوم کو نہایت ہی اعلیٰ سرکاری ملازمتیں دینے کا لالچ دیا۔ مولانا کو اراضی کی پیشکش کی گئی، پھر چار بسیں مع روٹ پرمٹ منت دینے کا لالچ دیا۔ لیکن مولانا اپنے موقف پر ڈٹے رہے اور ان تمام پیشکشوں کو ٹھکرا دیا۔ اب وزیر اعلیٰ نے انتقامی کارروائی شروع کر دی آپ کو بہت زیادہ مالی نقصان پہنچایا گیا۔ مجھے نوشہرہ ہائی سکول سے تبدیل کر دیا گیا عزیزی ندیم کو اور بھائی محمد حیات مرحوم کو پولیس اور دیگر ضلعی افسران نے پریشان کرنا شروع کر دیا۔ لیکن ان تمام دھمکیوں کا الٹا ہی اثر ہوا اور وہ لوگ جو ابھی تک ڈانواں ڈول تھے، ہماری ہمدردی میں مسلم لیگ کے ساتھ شامل ہو گئے اور یوں خضر حیات ٹوانہ بالکل ہی تنہا رہ گیا۔

بود و باش میں سادگی کو ہمیشہ اپنائے رکھا۔ نہایت ہی صاف ستھرے رہتے تھے اور بانکے مولوی مشہور تھے۔ کلاہ اور طرہ دار پگڑی ان کا مرغوب لباس تھا۔ اچکن یا شیروانی پہنتے اور بلند و بالا قد اور خوبصورت ڈیل ڈول اور گونجدار آواز کی وجہ سے عوام پر چھا جاتے۔ ان کے گھر کا سامان نہایت ہی سادہ تھا۔ لکڑی کی دو کرسیاں، ایک چھوٹی سی تپائی، ایک آرام کرسی (جس پر خود بیٹھا کرتے تھے)، اور ایک چارپائی جو آج بھی اسی طرح موجود ہیں۔ اپنے کمرہ میں ملاقاتیوں کے لئے رکھی ہوتی تھیں۔ ان کرسیوں پر بڑے بڑے وزراء، منصف، وکلاء، ڈاکٹر سیاسی رہنما اور عالم دین گھنٹوں بیٹھے رہتے اور مولانا کی مجلس سے اٹھنے کا نام تک نہ لیتے تھے۔

پاکستان کے وجود میں آجانے کے بعد لاہور کے ڈپٹی کمشنر زیڈ۔ اے حسن مرحوم نے آپ کو راوی روڈ پر ایک وسیع کوٹھی کی پیشکش کی۔ اس کا موقف یہ تھا کہ چونکہ بڑے بڑے آدمی اکثر مولانا کی ملاقات کو آتے رہتے ہیں۔ یا پھر نئی حکومت کو

ان سے مشورہ بھی بنا ہو گا۔ اس لیے وہ کوٹھی میں اٹھ آئیں تاکہ آمد و رفت میں آسانی رہے۔ بھائی کے اندر جانے میں کار دروازہ ہی میں چھوڑنا پڑتی ہے۔ لیکن اس مردِ درویش نے یہ کہکر انکار کر دیا کہ یہ کوٹھیاں لٹے ہوئے مہاجرین کا حق ہیں فرمایا کرتے تھے کہ چونکہ بھائی دروازہ والا مکان کرایہ کا مکان ہے اس لیے وہ اس ضمن میں بے بس ہیں ورنہ اپنے مکان کا نصف حصہ کسی مہاجر بھائی کو ہی وقف کر دیتے۔

آپ پر ۱۹۶۸ء میں دل کا شدید دورہ پڑا اور کئی ہفتے ہسپتال میں زیر علاج رہنے کے بعد تقریباً صحت یاب ہو کر گھر لوٹے۔ اس دن سے آپ کی صحت گرنا شروع ہو گئی۔ آخر مئی ۱۹۷۰ء میں جب آپ کی بیگم صاحبہ داغِ مفارقت دے گئیں تو اس جانگداز صدمہ کو آپ برداشت نہ کر سکے اور اس طرح صحت بہت تیزی سے گرنا شروع ہو گئی۔ ڈاکٹروں نے بہتیرے جتن کیے لیکن آپ کی صحت بحال نہ ہو سکی۔ یہ نو سال بھی آپ نے اپنی روایتی مستقل مزاجی اور حوصلہ مندی سے گزار دیے۔ ورنہ نقاہت اتنی بڑھ گئی تھی کہ بغیر سہارا آپ ایک قدم بھی نہیں چل سکتے تھے۔ لیکن اس حالت میں بھی درسِ قرآن کے لیے جاتے رہتے۔ سیڑھیاں چڑھتے رہے اور اترتے رہے۔ آپ ہمیشہ موسم گرما کے دو ماہ انگہ (اپنے گاؤں) تحصیل خوشاب ضلع سرگودہا میں گزارا کرتے تھے۔ یہ علاقہ پہاڑی ہے اور انگہ سطح سمندر سے ۴۳۰۰ فٹ اونچا ہے۔ اس لیے موسم نہایت ہی خوشگوار رہتا ہے۔ اس دفعہ ۱۹۷۹ء کی گرمیاں گزارنے انگہ گئے تو پندرہ بیس دنوں کے بعد ہی واپس لاہور آنے کا پروگرام بنا لیا۔ ان کا حکم تھا کہ تیاری کرو تاکہ رمضان شریف کا چاند لاہور ہی میں نظر آئے۔ وہ سارا مہینہ درسِ قرآن کے لیے وقف کرنا چاہتے تھے بہت کوشش کی ہم نے کہ جسم میں کچھ طاقت آ جائے تو پروگرام بنائیں۔ لیکن ان کے اصرار کے آگے ہم نے سر جھکا دیا۔ میں نے اپنے ہاتھوں

آپ کو ایک بچے کی طرح اٹھا کر ویگن اور کار میں بٹھایا اور جب ہم لاہور پہنچے تو ان کے مکان کے سامنے بھاٹی دروازہ کے تمام لوگ استقبال کے لیے جمع ہو گئے۔ ایک نوجوان اُن کو سہارا دینے لگا تو آپ نے منع کر دیا اور خود کار سے نکلے اور اپنے مکان کی سیڑھیاں بغیر سہارا کے طے کر کے چارپائی پر جا کر لیٹ گئے۔ ملاحظہ ہو حوصلہ اور جرأت ؎

روا نہیں میرے مسلک میں خون خودداری
تڑپ کے شان سے راتیں گزار دیتا ہوں

اُسی شام رمضان شریف کا چاند نظر آ گیا تھا۔ آپ کا ارادہ تھا کہ ہر روز نمازِ فجر کے بعد وہ شہری مسجد درس دیا کریں گے لیکن انکے قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ آپ بستر پر لیٹے تو مسلسل ایک ہفتہ نہ اٹھ سکے نماز بھی تیمّم اور اشاروں سے ادا کرتے رہے۔ عیدالفطر کے دن خوب صاف ستھرے لباس میں اپنے احباب سے ملنے اور عید مبارک کہنے کے لیے اپنی مخصوص کرسی پر گھنٹوں بیٹھے رہے۔ یہ اُن کی آخری عید تھی۔ اسی روز شام کو طبیعت خراب ہو گئی۔ ڈاکٹر حضرات دوڑے آئے علاج شروع ہو گیا لیکن اس دفعہ معالج حضرات بھی مایوس ہو گئے۔ اور چند دنوں بعد آپ نے اپنی جان، جان آفرین کے سپرد کر دی۔

انا للہ و انا الیہ راجعون

؎ بہار اب آ کے کیا کرے گی کہ جن سے تھا جشنِ شعر و نغمہ
وہ گل شاخ جل گئے ہیں وہ دل تہِ دام بجھ گئے ہیں

مولانا غلام مرشد شاہی مسجد لاہور کے خطیب حضرت مولانا غلام مرشد جنہیں پچھلے دنوں اس منصب سے سبکدوش کیا گیا ہے۔ علامہ سوون سکیسر (ضلع سرگودہا) کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے، موصوف کے والد بزرگوار کو حضرت اللہ بخش رح سجادہ نشین تونسہ شریف کی ہدایت تھی، کہ اس بچے کو دین کی خدمت کے لیے وقف رکھیں اور صرف دینی علوم ہی پڑھائیں۔ مرشد کی ہدایت کے مطابق انہیں سب سے پہلے قرآن کریم حفظ کرایا گیا، جو موصوف نے آٹھ برس کی عمر میں حفظ کر لیا۔ ختم قرآن کی تقریب میں گولڑہ شریف کے پیر مہر علی شاہ رح بھی شریک تھے۔ اس کے بعد انہوں نے علاقے کے ایک بزرگ عالم دین مولانا محمد شریف کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ پانچ سال تک اُن سے درس لیتے رہے۔ مولانا محمد شریف نے اُن کی ذہانت اور شوق دیکھ کر فرمایا کہ میں نے سارا علم تمہارے حوالے کر دیا۔ مگر یہ کافی نہیں ہے۔ تم لاہور جاؤ۔ وہاں اورنٹیل کالج کے علاوہ دو اور دینی مدارس بھی ہیں وہاں داخلہ لیکر اپنی تعلیم مکمل کرو۔ موصوف ان کے حکم پر لاہور آگئے اور یہاں نصاب مکمل کیا اور اعزاز کے ساتھ سند حاصل کی۔ اساتذہ اُن کی محنت اور ذہانت سے بے حد متاثر ہوئے، اور انہیں دیوبند میں مزید تعلیم حاصل کرنے کی ہدایت کی اور ان کے وہاں داخلے کا انتظام بھی کر دیا۔ موصوف نے دیوبند کا امتحان بھی اعزاز کے ساتھ پاس کیا اور اسی بنا پر انہیں وظیفہ دیکر جامعہ الازہر میں تعلیم دلانے کی پیش کش ہوئی۔ مگر موصوف کے والد بزرگوار اس سے متفق نہ تھے۔ ان کی ہدایت تھی کہ وہ اجمیر شریف کی جامعہ معینیہ میں دو سال کا نصاب مکمل کریں چنانچہ انہوں نے مصر جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور جامعہ معینیہ میں داخلہ لے لیا۔ وہاں بھی اعزاز کے ساتھ کامیاب ہوئے اور اپنے گاؤں واپس گئے۔ سجادہ نشین تونسہ شریف کی ہدایت پر ہی لاہور آئے اور چند ماہ تک ایک دینی مدرسے میں درس دیتے رہے۔ بعد میں انہوں نے اونچی مسجد (بھاٹی گیٹ) میں درس کا سلسلہ شروع کیا اور خطیب کا منصب

سنبھالا۔ اس زمانے میں شاہی مسجد کے لیے کسی عالم دین خطیب کی ضرورت تھی۔ متعدد علما دُور دُور سے بلائے گئے مگر معیار پر پُورے نہ اُترے۔ منتظمین نے کئی بار مولانا غلام مرشد سے درخواست کی لیکن وہ آمادہ نہ ہُوئے۔ علامہ اقبال رح نے ایک روز انہیں بلا کر پوچھا کہ اگر ایک شخص ایک کنال زمین میں اشاعتِ دین میں مصروف ہو اور اُسے دعوت دی جائے کہ وُہ دس ایکڑ کے رقبے میں اشاعتِ دین کے لیے کام کرے وُہ یہ دعوت قبول نہ کرے تو کیا خدا اس سے ناراض نہ ہوگا! بہرحال علامہ اقبال رح کے اصرار پر انہوں نے یہ پیشکش قبول کر لی مگر اس شرط پر کہ وہ ملازم نہیں ہوں گے اور ان کا تعلق صرف اعزازی ہوگا۔ کیونکہ اس منصب پر فائز ہونے والے فرد کو ملازم کا درجہ دینا مناسب نہیں ہے۔ ساتھ ہی انہوں نے تحریری استفسار کے جواب میں کہ علامہ سیّد سلیمان ندوی مرحوم نے اس منصب کے لیے چار سو روپے ماہوار طلب کئے آپ کو کتنی تنخواہ قبول ہوگی۔ آپ نے لکھا کہ میں غلام آباد ہندوستان میں اپنی آزادی فروخت کرنے کو تیار نہیں ہوں۔ آخر علامہ اقبال رح کے اصرار پر آپ نے ایک سو روپے ماہوار بطور آمدورفت الاؤنس منظور کئے۔ اب تک مولانا صرف یہی الاؤنس وصول کرتے تھے۔ صرف الاؤنس پر قانع رہے۔ شاہی مسجد سے خطیب کی حیثیت میں مولانا کا اعزازی تعلق تقریباً سینتیس سال تک قائم رہا خطیبِ شہر کی حیثیت میں تمام حلقوں میں مولانا کی تکریم ہوتی ہے۔ اس وقت مولانا کا شمار اُن جید علماء میں ہوتا ہے برصغیر پاک و ہند میں جن کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔ (روزنامہ امروز ۱۹۶۶ء)

مولانا غلام مرشد

تحریکِ پاکستان میں ٹھوس خدمات

از:۔ راغب احسن ڈھاکہ

جامع عالمگیری لاہور کی امامت و خطابت کے منصبِ جلیلہ سے مولانا غلام مرشد کو ۳۷ سال کی طویل مدت کے بعد گزشتہ دنوں محکمہ اوقاف کے ایک سرسری حکم کے ذریعے ہٹا دیا گیا ہے۔ اس برطرفی و علیحدگی کے پس منظر میں رموز ہیں

کے بارے میں تو کچھ نہیں کہا جا سکتا تاہم یہ ایک ایسی مثال ہے کہ اگر اس نظیر کو بڑھنے سے بروقت نہ روکا گیا تو مساجد اور منبر و محراب کی شرعی آزادی ختم ہو کر رہ جائے گی۔ اور اس بات کا بڑا خدشہ ہے کہ کہیں شریعت بھی اختیار و اقتدار کے مالک افراد کے ہاتھوں بے بس و مجبور ہو کر نہ رہ جائے۔

مولانا غلام مرشد جنہیں خطیب شہر کی معزز حیثیت حاصل تھی، شیخ الہند مولانا محمود الحسن علیہ رحمۃ کے شاگرد تھے اور اب تک ملک کے ایک محترم عالم دین سمجھے جاتے رہے ہیں۔ عام روایت کے مطابق انہیں بادشاہی مسجد لاہور میں جمعہ و جماعت کی امامت و خطابت پر انجمن اسلامیہ نے حکیم الامت علامہ اقبالؒ کے مشورہ کے مطابق مامور کیا تھا۔ راقم الحروف کو لاہور میں مولانا کے خطبات سننے کا کئی بار شرف حاصل ہوا۔ یوم شہید گنج کے موقع پر راقم نے مولانا شوکت علی خادم کعبہ کے ساتھ ان کا بصیرت افروز خطبہ سنا اور نماز جمعہ ادا کی تھی۔ اسی طرح قیام پاکستان کے بعد ۱۹۴۷ء میں جب حالات بہت خراب تھے، راقم نے سید محمد عثمان سابق میئر کلکتہ کے ہمراہ ان کا خطبہ سنا تھا۔ مولانا ملک و ملت کے حالات کے مطابق قومی و جہادی تقاضوں پر زور دیتے تھے۔ غالباً ان دنوں بھی انہوں نے دفاع پاکستان و جہاد استخلاص جموں و کشمیر کی اولین و افضل ترین اہمیت و ضرورت پر زور دیا ہوگا۔ اور اس سلسلے میں ارباب اقتدار کو ان کی بعض کوتاہیوں سے آگاہ کیا ہوگا۔ اور خطیب شہر کی حیثیت سے ساتھ ہی ساتھ ان کا محاسبہ بھی اپنے فرض منصبی کی روشنی میں کیا ہوگا جو ارباب اقتدار کو ناگوار گزرا۔ اور جس سے متاثر ہو کر انہوں نے مولانا غلام مرشد کو جامع عالمگیریؒ میں خطابت و امامت کے منصب سے علیحدہ کر دینا لازمی خیال کیا۔ اگر یہ خیال درست ہے تو افسوس کا مقام ہے۔

مولانا غلام مرشد محض ایک بزرگ خطیب اور عالم و فاضل امام ہی نہیں بلکہ انہوں نے تحریک پاکستان میں بھی ممتاز حصہ لیا ہے جس وقت کانگریسی

جمعیت العلمائے ہند نے تحریک پاکستان کے خلاف محاذ بنا رکھا تھا، اور مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسین احمد مدنی وغیرہ کے زیر اثر قریباً پورا دیوبند کانگریس کا حامی تھا اور آل انڈیا مسلم لیگ کا مخالف تھا تو راقم نے کلکتہ میں کل ہند جمعیتہ العلماء اسلام کی بنیاد رکھی جس کا اجلاس ۲۵ سے ۲۸ راکتوبر ۱۹۴۵ء تک ... جاری رہا علماء عام طور پر کانگرس کے حامی مولویوں سے بڑے متاثر تھے حتیٰ کہ بڑے بڑے متقدر علماء بھی مسلم لیگ کی حمایت سے پہلو بچاتے تھے۔ اور تو اور مولانا شبیر احمد عثمانی نے بھی جمعیتہ کی تاسیس سے پہلے مسلم لیگ کی حمایت نہ کی تھی چنانچہ راقم نے جب جمعیتہ العلماء اسلام کی تاسیس وتنظیم کا فیصلہ کیا تو مولانا آزاد سبحانی، مولانا ابوالبرکات عبدالرؤف قادری مولانا عبدالواحد عثمانی، مولانا عبدالحامد بدایونی اور دوسرے علماء نے پوری تائید کی۔ راقم کی دعوت پر پنجاب سے مولانا غلام مرشد اور مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی نے کلکتہ کے اجلاس میں شرکت فرمائی تھی۔ مولانا غلام مرشد نے ایک مطبوعہ خطبہ میں کانگریس کے نظریۂ متحدہ قومیت کی تردید اور استقلال ملت اسلامیہ کی تحریک کی پر زور تائید کی۔ اسی طرح کے خیالات کا اظہار مولانا ابراہیم نے بھی کیا۔ ان باتوں کے بیان کی یہاں اس لیے ضرورت محسوس ہوئی کہ کلکتہ میں جمعیتہ کے زیر اہتمام منعقدہ اجلاس میں چند علمائے نے تحریک پاکستان کی کھل کر حمایت کی اور اس میں شرکت کے لیے پنجاب سے بہت دور بنگال کے دورہ کی زحمت اٹھائی۔ ان میں مولانا غلام مرشد اور مولانا ابراہیم سیالکوٹی نمایاں تھے۔ (نوائے وقت)

حکیم الامت علامہ اقبالؒ — قائد اعظم محمد علی جناحؒ

مولانا غلام مرشد سابق خطیب بادشاہی مسجد لاہور کے تاثرات

کے عنوان سے جناب سلیم تابانی نوائے وقت ۳ر جون ۱۹۷۶ء میں رقمطراز ہیں:-

"اسلامیانِ برصغیر کی عزیز ترین تاریخی متاع میں حکیم الامت علامہ اقبال رح اور حضرت قائد اعظم کو جو اہمیت حاصل ہے وہ محتاجِ بیان نہیں۔ حکیم الامت نے اپنی فکری و نظری سربلندی سے نہ صرف برصغیر کے مسلمانوں کے مرض کی صحیح تشخیص کر کے اس کا علاج تجویز کیا بلکہ عالمِ اسلام کے زوال کے اسباب تلاش کئے اور اس سے نکلنے کا طریقہ بتایا۔ اور قائد اعظم کی سیاسی و آئینی ارجمندی کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے برصغیر میں بیک وقت دو مسلم دشمن قوتوں ـــ ہندو اور انگریز ـــ کو شکست دی۔ حالانکہ دشمنوں کو ہر طرح کے مادی وسائل حاصل تھے۔ اور قائد اعظم کے پاس خلوص، دیانت، عزم اور ایمان کی دولت کے سوا کچھ نہ تھا۔ حکیم الامت ـــ اور قائد اعظم پر اگرچہ اب تک بہت کچھ لکھا ہے لیکن ہنوز ان کی زندگیوں کے بعض گوشے ایسے ہیں جن پر تحقیق و تدقیق کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے خصوصاً قائد اعظم کی زندگی کا مذہبی گوشہ تو افسوسناک حد تک تشنۂ تکمیل ہے۔ اس سلسلہ میں وہی لوگ کچھ رہنمائی کر سکتے ہیں جنہوں نے حکیم الامت کو دیکھا، ان کی باتیں سُنیں، ان کی عملی زندگی کا مشاہدہ کیا اور جن کو حضرت قائد اعظم کے زیرِ قیادت کام کرنے، آپ کی ہدایات، ان کے احکام سننے اور ان کی مصلحتوں اور پس منظر سے آگاہ ہونے کا موقع ملا ہے۔

مولانا غلام مرشد برصغیر کے اسی قافلہ کے رہرو ہیں جو عرصہ تک آزادی کی تگ و دو میں مصروف رہا اور جسے علامہ اقبال کی فکری اور قائد اعظم کی عملی قیادت کے تحت بھرپور کام کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ ایک ملاقات میں مولانا نے حکیم الامت اور قائد اعظم کے بارے میں اپنے ذاتی مطالعہ اور مشاہدہ کے طور پر جو کچھ فرمایا وہ درجِ ذیل ہے۔

مولانا نے بتایا کہ علامہ اقبال سے ان کا تعارف اس زمانے میں ہوا جب کنارنی بازار کی مسجد میں انہوں نے نمازِ فجر کے بعد درسِ قرآن کا سلسلہ شروع کیا۔ درس میں لاہور کے بعض اہلِ علم اور سنجیدہ طبقے کے لوگ شامل ہوتے تھے۔ جن

میں مولانا غلام رسول مہر، ڈاکٹر تاثیر اور ڈاکٹر عبداللہ چغتائی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ مولانا نے فرمایا کہ انہی لوگوں کی وساطت سے علامہ اقبال سے میرا تعارف ہوا۔ اس زمانے میں علامہ میکلوڈ روڈ پر رہائش پذیر تھے آہستہ آہستہ علامہ سے اچھی میل ملاقات ہو گئی اور اُن کے اسلامی اور ملی درد کا اندازہ ان کی صحبتوں اور گفتگوؤں سے ہونے لگا۔ پھر تعلقِ خاطر یہاں تک بڑھا کہ ایک روز حضرت علامہ نے مجھے "بدو مولوی" کے لقب سے یاد کیا۔ اور اس لقب کی وجہ دریافت کرنے پر فرمایا کہ تم چونکہ بلا لحاظ کھری کھری کہہ دیتے ہو اور کسی قسم کی مصلحت تمہارے نزدیک روا نہیں اس لیے تم "بدو مولوی" ہو۔ چنانچہ بعد میں ایسا ہوا کہ بعض خاص خاص لوگ مجھے "اقبال کے بدو مولوی" سے یاد کرنے لگے اور میں اسے ایک اندازِ محبت سمجھ کر خاموش رہتا تھا۔

مولانا گفتگو فرما رہے تھے۔ اور علامہ اقبال کی یاد ان کے دل میں انگڑائیاں لے رہی تھی۔ علامہ کی صحبت کے گزرے ہوئے لمحات رہ رہ کر اُن کے دل کو بےتاب کر رہے تھے۔ خصوصاً وہ زمانہ جب ملعون راجپال کی دریدہ دہنی کا شاہکار منظر عام پر آیا اور ملک کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک تمام مسلمان اپنے آقا و مولیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ناموس پر کٹ مرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ مولانا نے بتایا کہ اس سلسلہ میں ملعون راجپال کے خلاف جو استغاثہ دائر ہوا وہ حضرت علامہ ہی کی تحریک کا نتیجہ تھا اور مسلمانوں کے تمام فرقوں کی حمایت میرے مشورے سے حاصل کی گئی اور بعض فرقوں کے سربراہوں کے دستخط اس استغاثہ پر میں نے لیے تھے۔ اس سلسلہ میں حضرت علامہ سے میری بہت ملاقاتیں ہوئیں جن میں ایک ملاقات نے خاص طور پر متاثر کیا اور میں علامہ کی محبتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر عش عش کر اٹھا۔ اس ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے مولانا نے بتایا کہ جس روز

ملعون راجپال نے عدالت میں یہ بیان دیا کہ میں نے اس کتاب میں اپنی طرف سے کچھ نہیں لکھا بلکہ مسلمانوں کی مستند کتابوں سے مواد یکجا جمع کر دیا ہے۔ اس روز علامہ

نے مجھے یاد فرمایا۔ میں حاضر ہوا، اسوقت ان کے پاس م۔ش بیٹھے تھے۔ میری آمد پر علامہ نے ان کو باہر بھیج دیا اور پھر دھاڑیں مار مار کر رونے اور فرمانے لگے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو روزِ محشر ہم کیا منہ دکھائیں گے۔ اس سانحہ اور پھر ملعون راجپال کے بیان سے علامہ اس قدر متاثر تھے اور بے حال ہو رہے تھے کہ تاب نہیں لائی جا رہی تھی۔ میں نے عرض کیا کہ آپ ملعون راجپال کے اس بیان کو بے حقیقت سمجھیں۔ انشاءاللہ العزیز میں اس کے تار و پود بکھیر کے رکھ دوں گا۔ علامہ کو اس پر کچھ تسلی ہو گئی اور بعد میں جب میرے کہنے کے مطابق ہمارے وکیل نصیب صاحب نے ملعون راجپال کے صفائی کے گواہ کی زبان سے عدالت میں یہ کہلوا دیا کہ مدعا علیہ کا بیان خلافِ حقیقت ہے، اس پر اس کو سزا ہو گئی، تو علامہ بہت خوش ہوئے اور مجھے بلا کر دادِ تحسین سے نوازا۔

اب قائداعظم کے اذکار شروع ہوئے تو مولانا نے پہلو بدلا اور فرمایا کہ ہاں میں نے قائداعظم کی ہدایات پر عمل کرنیکا شرف پایا ہے اور اُن کے ایک ادنیٰ سپاہی کی حیثیت سے پوری سرگرمی کے ساتھ تحریکِ پاکستان میں حصہ لیا ہے، مجھے قائداعظم سے ملنے کی سعادت تو متعدد مرتبہ حاصل ہوئی لیکن ایک خصوصی ملاقات نے مجھے اُن کا گرویدہ بنا دیا اور میں اُن کی دین شناسی اور سیاسی بصیرت و قابلیت کا دل و جان سے معترف ہو گیا۔ مولانا نے فرمایا کہ قراردادِ لاہور (پاکستان) کی منظوری کے بعد ۱۹۴۰ء سے لیکر ۱۹۴۵ء کے آخر تک غیر منقسم ہندوستان کا کوئی ہندو اخبار تو درکنار، دو تین جریدوں کے سوا کوئی مسلم اخبار بھی ایسا نہ تھا، جس میں قائداعظم کی ذات پر بدترین نکتہ چینی نہ کی گئی ہو۔ ایک اسلامی ریاست کے محرک اور داعی ہونے کی وجہ سے کبھی اُن کی شادی کا مسئلہ اٹھایا جا رہا ہے اور کبھی ڈاڑھی زیرِ بحث ہے۔ کبھی ٹائی کو اچھالا جا رہا ہے اور کبھی ان کی انگریزی دانی پر زبان طعن دراز ہو رہی ہے۔ اس شور و ہنگامہ میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دنیا میں تمام عیوب کا مجموعہ صرف قائداعظم کی ذات ہے۔ لے دے کے ایک نوائے وقت

اور ایک ڈان تھا جو ان تمام حملوں کا جواب دیتے اور کبھی کبھی زمیندار بھی یہ کردار ادا کرتا تھا، لیکن قائد اعظم جیتے کہ اپنے غیر متزلزل عزم کے سہارے اسلامیانِ برصغیر کے قومی تحفظ اور ملی تشخص کے لیے اپنی منزل کی طرف بڑھے چلے جا رہے تھے

مولانا نے بتایا کہ اس زمانے کی بات ہے کہ مولانا راغب احسن مرحوم اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ کلکتہ سے لاہور تشریف لائے شاہی مسجد میں نماز جمعہ ادا کی۔ اور یہ تجویز فرمائی کہ دو قومی نظریہ کے حمایتی علماء کی ایک جماعت قائم کرنی چاہیئے۔ میں نے اس تجویز کو پسند کیا اور سراہا اور عرض کی کہ اس بارے میں قائد اعظم سے مشورہ لے لینا چاہیئے۔ چنانچہ قائد اعظم سے بات کی گئی وہ اس تجویز پر بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ میں پہلے ہی ان خطوط پر غور کر رہا تھا کہ مسلم لیگ کی پشت پر ایک خاص دینی جماعت کا ہونا ایک بہت بڑی ضرورت ہے۔ اس کے بعد قائد اعظم نے مولانا شبیر احمد عثمانی سے اس سلسلہ میں بات چیت کی اور فرمایا کہ کلکتہ میں اس جماعت کی بنیاد رکھی جائے۔ وہیں سے اس کی تنظیم کی ابتدا ہو اور مولانا شبیر احمد عثمانی کو ہدایت فرمائی کہ اس جماعت کے ابتدائی تنظیمی اجلاس کے شعبۂ عمومی و سیاسی کا خطبۂ افتتاحیہ وہ دیں۔ مولانا نے بتایا کہ یہ فیصلہ ہو گیا کہ اکتوبر ۱۹۴۵ء کے آخری ہفتہ میں جمعیت العلماء اسلام کا ابتدائی اجلاس منعقد ہوگا اور مولانا شبیر احمد عثمانی اس کا افتتاح کریں گے۔ لیکن اتفاق سے ستمبر کے آخر میں مولانا عثمانی دیوبند میں علیل ہو گئے اور کانفرنس میں شرکت کرنا ان کے لیے مشکل ہو گیا۔ اس صورتِ حال سے قائد اعظم اور بعض دوسرے مسلم لیگی رہنماؤں کو پریشانی لاحق ہوئی۔ اسی زمانے میں قائد اعظم لاہور تشریف لائے اور ممدوٹ ولا میں قیام فرمایا۔ یہیں لیگ ورکنگ کمیٹی کا اجلاس منعقد ہوا اور یہ مسئلہ خاص طور پر موضوعِ گفتگو بنا۔ بعض مسلم لیگی رہنماؤں نے اس سلسلہ میں میرا نام پیش کیا اور قائد اعظم سے درخواست کی کہ مولانا شبیر احمد عثمانی کی علالت کے پیشِ نظر

آپ مولانا غلام مرشد کو کلکتہ جانے کی ہدایت فرمائیں کہ وہ وہاں جا کر کل ہند جمعیتہ العلماء اسلام کی بنیاد رکھیں اور اس کی پہلی کانفرنس میں خطبۂ افتتاحیہ دیں۔ قائد اعظم نے اس تجویز کو پسند فرمایا اور ضروری ہدایات اور مشوروں سے نوازنے کے لیے بطور خاص مجھے طلب کیا۔

مولانا نے فرمایا کہ قائد اعظم سے میری یہ خصوصی ملاقات تھی جس نے مجھے ان کا گرویدہ بنا دیا۔ یہ ملاقات ممدوٹ ولا میں ہوئی اور اس میں میرے ترجمان مسعود کھدر پوش کے علاوہ اور کوئی شخص قائد اعظم کے پاس موجود نہیں تھا۔ اس ملاقات میں قائد اعظم سے جو چند لمحے گفتگو ہوئی وہ انتہائی اہم تھی اور میں چاہتا ہوں کہ قوم کو اس ملاقات میں ہونے والی گفتگو سے آگاہ کروں تاکہ وہ یہ جان سکے کہ اسلام کے نام پر ایک عظیم ریاست (پاکستان) قائم کرنے میں قائد اعظم کس طرح کامیاب ہو گئے۔ اور پاکستان کا جب انہوں نے مطالبہ کیا تھا تو اس کا پس منظر کیا تھا اور وہ ایک اسلامی ریاست کے دعوے میں کس حد تک مخلص تھے۔ علیک سلیک کے بعد جب گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا تو قائد اعظم نے قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ نکال کر فرمایا کہ اس کتاب میں فوجی، انتظامی، معاشی، اخلاقی، غرض ہر شعبۂ زندگی کے قوانین موجود ہیں اور ایسا آئین اس میں ہے جو قیامت تک جاری رہ سکتا ہے اور اس میں کسی ترمیم و اضافہ کی ضرورت پیش نہیں آسکتی۔ کیا اس کتاب کے جامع آئین اور ابدی قوانین کی تنفیذ و ترویج میں آپ میری مدد کریں گے؟ مولانا نے کہا کہ قائد اعظم کی سیاسی فراست اور آئینی بصیرت کا میں پہلے ہی دل سے معترف تھا، اب اُن کی زبان سے یہ بات سُن کر میں سراپا تسلیم بن گیا۔ اور عرض کیا کہ میں آپ کا ایک ادنیٰ سپاہی ہوں آپ جو حکم بھی دیں گے اور جو فرض بھی سونپیں گے سرمُو انحراف نہیں ہوگا۔ اس سے بڑھ کر میری خوش بختی کیا ہو سکتی ہے کہ قرآنی آئین و قوانین کی ترویج و تنفیذ کے لیے میں کوئی خدمت انجام دے سکوں۔ میرا تو زندگی کا مشن ہی قرآن کی تبلیغ اور قرآنی احکام کی اشاعت

ہے۔" مولانا نے بتایا کہ اس کے بعد میری بے باکی نے مجھے اکسایا اور میں نے مودبانہ گزارش کی کہ جناب نے قرآنی تعلیمات کو ابدی اور عالمگیر فرمایا ہے یہ بالکل درست ہے لیکن اس کی کوئی مثال آپ نے نہیں دی۔ قائد اعظم نے فرمایا کہ ہاں! اسکی متعدد مثالیں دی جاسکتی ہیں لیکن اسوقت میں ایک مثال دیتا ہوں۔ قرآن نے کئی مقامات پر اعلان کیا ہے کہ ہر جرم کی سزا اسکی نوعیت کے مطابق ہونی چاہیئے یہ کتنا عظیم اور ابدی و عالمگیر اصول ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ قائد اعظم کی یہ بات سنکر میرے ذہن میں یہ آیت آگئی وجزآؤ سیئۃ سیئۃ مثلہا۔ اور قائد اعظم کی قرآن فہمی سے حیرت زدہ ہو کر سوچنے لگا کہ معلوم نہیں ان کا استاد کون ہے؟ اور انہوں نے قرآن کس سے پڑھا اور سمجھا ہے۔ اس ملاقات میں قائد اعظم نے جو کچھ فرمایا اس سے انکی دینی بصیرت بھی مجھ پر واضح ہو گئی، اور میں پہلے سے زیادہ ان کا والہ و شیدائی بن گیا۔

مولانا نے فرمایا کہ مجھے ایسے بہت سے ماڈرن حضرات سے ملنے کے مواقع حاصل ہوتے جو دین کو بھی جانتے اور دین کا اچھا خاصا مطالعہ رکھتے ہیں لیکن قائد اعظمؒ کی دین شناسی نے مجھے جسقدر صرف ایک ملاقات میں متاثر کیا، اسقدر کسی دوسرے سے مہینوں اور برسوں کی ملاقاتوں میں نہ ہوا چنانچہ میں علیٰ وجہ البصیرت کہہ سکتا ہوں کہ قائد اعظم کا دینی مطالعہ کسی بڑے سے بڑے مولانا سے کم نہیں تھا بلکہ وہ دینی اصولوں کی فلاسفی پر گہری نظر رکھتے تھے۔ مولانا نے بتایا کہ پھر قائد اعظمؒ نے کل ہند جمعیت علماء اسلام کے قیام اور اس سلسلہ میں کلکتہ میں منعقد ہونیوالی کانفرنس کا ذکر فرمایا اور مجھے حکم دیا کہ مولانا شبیر احمد عثمانی کے فرائض وہاں جاکر میں انجام دوں۔ چنانچہ مجھے یہ شرف حاصل ہے کہ کل ہند جمعیت علماء اسلام کا قیام میرے ہاتھوں سے ہوا۔ اور کانفرنس کے شعبۂ عمومی و سیاسی کا افتتاحی خطبہ میں نے دیا۔ یہ بات اول تو اس لحاظ سے میرے لئے اعزاز کی حیثیت رکھتی ہے کہ اس ضمن میں قائد اعظم سے ایک خصوصی ملاقات ہو گئی جس میں ان کو

قریب سے دیکھنے اور ان کا گہرا مطالعہ کرنے کا موقعہ مجھے ملا اور دوئم اس لیے کہ کل ہند جمعیت علماء اسلام نے تحریکِ پاکستان کو کامیابی سے ہمکنار کرنے اور قیامِ پاکستان کے لیے انتہائی اہم خدمات انجام دیں اور کانگریسی نیشنلسٹ علماء کا احسن طریق سے مقابلہ کیا۔

برصغیر کے ممتاز عالمِ دین مولانا غلام مرشد انتقال کر گئے

میّت تدفین کے لیے انگہ پہنچا دی گئی:

لاہور ۱۴ ستمبر۔ برصغیر پاک و ہند کے ممتاز عالم اور تحریک پاکستان کے سرگرم رہنما غلام مرشد آج علی الصبح لاہور میں انتقال کر گئے انا للہ وانا الیہ راجعون، اُن کی عمر ۸۴ برس تھی۔ ان کی وصیت کے مطابق اُن کی میت تدفین کے لیے ضلع سرگودھا میں واقع ان کے آبائی گاؤں انگہ لے جائی گئی۔ مولانا غلام مرشد تقریباً ساٹھ برس سے لاہور میں تبلیغ دین کر رہے تھے۔ انہوں نے کم و بیش ۳۷ سال تک بادشاہی مسجد کی خطابت کے فرائض انجام دیئے۔ قائدِ اعظم محمد علی جناح کے زیرِ قیادت انہوں نے تحریکِ پاکستان کے اہم دور میں برصغیر کے مسلمانوں کے لیے ایک آزاد مملکت کے قیام میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ لاہور کے دینی و سیاسی اور سماجی حلقوں میں ان کی وفات پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا گیا۔ مولانا غلام مرشد مرحوم ممتاز ادیب شاعر احمد ندیم قاسمی کے پھوپھی زاد بھائی[1] اور نامور صحافی ظہیر بابر کے قریبی عزیز تھے۔

(امروز ۱۵ ستمبر ۱۹۷۹ء)

[1] خالہ زاد تھے۔ (مرتب)

روزنامہ "وفاق"
۱۵ ستمبر ۱۹۷۹ء

لاہور ۱۴ ستمبر (اپ پ) ممتاز عالم دین، تحریک پاکستان کے صفِ اوّل کے راہنما اور بادشاہی مسجد کے سابق خطیب مولانا غلام مرشد انتقال فرما گئے ہیں، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مرحوم کی عمر ۸۴ برس تھی۔۔۔

... مرحوم مشہور شاعر اور ادیب احمد ندیم قاسمی کے چچا زاد بھائی تھے مسلم لیگی راہنما میاں امیر الدین نے مرحوم کی وفات پر اظہار تعزیت کرتے ہوئے کہا۔ مرحوم جدوجہد آزادی کے اہم راہنما تھے اور انہوں نے تحریک پاکستان میں نمایاں کردار سرانجام دیا ہے۔

ؔ امروز نے پھوپھی زاد "وفاق" نے چچا زاد "جنگ" میں جناب احمد ندیم قاسمی نے خود خالہ زاد لکھا ہے۔ (مرتب)

روزنامہ مشرق
۱۵ ستمبر ۱۹۷۹ء

لاہور۔ تحریک پاکستان کی نامور شخصیت، ممتاز عالم دین بادشاہی مسجد کے سابق خطیب مولانا غلام مرشد کل انتقال کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ان کی عمر ۸۳ برس تھی مولانا کا تعلق ضلع سرگودھا کے سرسبز کوہستانی علاقہ انگہ سے تھا۔ مرحوم ممتاز ادیب اور شاعر احمد ندیم قاسمی کے پھوپھی زاد بھائی تھے۔ انکی میت تدفین کیلیے انگہ پہنچا دی گئی۔ آج لاہور کی متعدد مساجد میں مرحوم کی مغفرت کیلیے دعائیں مانگی گئیں۔ متعدد دینی و سماجی حلقوں نے مرحوم کی وفات پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا۔

مولانا غلام مرشد نہایت متقی اور پرہیزگار انسان تھے۔ مولانا مرحوم قیام پاکستان سے بہت پہلے سے لاہور میں مقیم تھے ...... طویل عرصہ تک بادشاہی مسجد میں خطابت کے فرائض انجام دینے کے بعد وہ بازار حکیماں اندرون بھاٹی گیٹ میں مقیم ہو گئے۔ جہاں انہوں نے اسلام کی تبلیغ، درس و تدریس اور مطالعہ کا سلسلہ جاری رکھا۔ ان کے صاحبزادوں نے تعلیمی میدان میں نمایاں کامیابیاں حاصل کیں۔"

نوائے وقت
۱۵ ستمبر ۱۹۷۹ء

مشہور عالم دین۔ جید خطیب۔ پیکر خودی و خود اعتمادی جناب مولانا غلام مرشد بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مولانا موصوف ضلع سرگودھا کے موضع انگہ میں پیدا ہوئے یہ ضلع حاکمانِ وقت کی وفاداری کا مرکز تصور کیا جاتا تھا۔ لیکن اسی خاک سے وہ

مردِ مجاہد اٹھا جس کی وفاداری خدا اعلاس کے رسول کے ساتھ ایسی شان سے نبھی کہ اہلِ ایمان کے لیے نمونہ بن گئی۔ مولانا مختلف دینی مدارس و مکاتیب سے فارغ التحصیل ہو کر اس صدی کے تیسرے دہے کے آغاز میں لاہور تشریف لائے۔ انہوں نے اونچی مسجد بھاٹی گیٹ لاہور میں درسِ قرآن شروع کیا۔ ان کی علمی فضیلت اور اسلامی درد کا شہرہ ہوا تو وہ بادشاہی مسجد لاہور کے خطیب مقرر ہوئے۔ یہ زمانہ انگریز کے اقتدار کا تھا۔ لیکن مولانا نے مسلمانان لاہور میں خودشناسی اور آزادی خواہی کا وہ ذوق پیدا کیا کہ جب آل انڈیا مسلم لیگ کی نئی تنظیم ہوئی تو مسلمانانِ لاہور نے اسے لبیک کہا اور مارچ ۱۹۴۰ء میں لاہور کو یہ شرف حاصل ہوا کہ یہاں وہ قرارداد پیش ہوئی جسے مسلمانانِ برصغیر کا قومی نصب العین قرار دیا گیا۔ ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۷ء تک مولانا غلام مرشد نے قائد اعظمؒ کے ایک سپاہی کی حیثیت سے ان کی زیرِ ہدایت مسلمانانِ لاہور کے دلوں میں تحریکِ پاکستان اور اسلام سے محبت پیدا کرنے کے سلسلے میں بڑا کام کیا۔

روزنامہ امروز ۱۵ ستمبر ۱۹۶۹ء | چودہ ستمبر کی صبح تین بجے برصغیر پاک و ہند کے ایک بہت بڑے عالم دین مولانا غلام مرشد وفات پا گئے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۹۳۵ء میں علامہ اقبالؒ کے ارشاد کے مطابق انہوں نے شاہی مسجد لاہور کی خطابت کے فرائض سنبھالے اور مارچ ۱۹۶۶ء تک نہایت خوش اسلوبی سے نبھائے۔ ان کی بے لوثی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس تمام عرصے میں انہوں نے محض سو روپے ماہوار بطور سفر خرچ الاؤنس قبول کیا۔ ۱۹۰۳ء میں خلیفہ شجاع الدین کی تحریک پر مسلم لیگ میں شامل ہو گئے اور دو قومی نظریے کے محاذ پر زبردست جنگ لڑی۔ قائد اعظمؒ کی قیادت میں تحریکِ پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ۱۹۴۵ء میں کل ہند جمعیت العلمائے اسلام کے قیام اور پنجاب کے صوبائی انتخابات میں ان کی خدمات تاریخ کے صفحات میں روشن رہیں گی۔ انکساری اور سادگی کا ثبوت ان کی یہ وصیت ہے کہ "میری میت کی نمائش نہ کی جائے اور مجھے میرے آبائی گاؤں انگہ کے قبرستان میں خاموشی سے دفن کر دیا جائے"

نوائے وقت ۱۵ ستمبر ۱۹۷۹ء

آہ! مولانا غلام مُرشد

موت العالِم، موت العالَم
ایک عالم کی موت ایک عالَم کی موت ہوتی ہے

اس عنوان سے جناب سلیم تابانی نے مولاناؒ کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے جس کے چند اقتباسات نذرِ قارئین کئے جاتے ہیں۔

پہلا اقتباس موت ایک طبعی امر ہے اور انسان تو کیا کسی جاندار کو بھی اس سے رستگاری نہیں جو چیز پیدا ہوتی ہے اس کے لیے موت ناگزیر ہے لیکن بعض اموات ایسی ہوتی ہیں جن کو تسلیم کرنے پر دل آمادہ نہیں ہوتا کیونکہ یہ جس انسان پر وارد ہوتی ہیں اسکی شخصیت اپنے اندر ایسی خوبیاں، اور محاسن رکھتی ہے کہ دل اسکی موت کا اول تو یقین نہیں آتا اور چار و ناچار اگر دل تسلیم بھی کرلے تو سخت تکلیف ہوتی ہے

مولانا غلام مرشد کا انتقال بھی ایک ایسا سانحہ ہے کیونکہ ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ مجھے دو تین مرتبہ ان کی خدمت میں حاضر ہونیکا شرف حاصل ہوا اور مختلف پہلوؤں پہ گھنٹوں اُن کی گفتگو سے محظوظ ہوتا رہا۔ ان کی آواز کبر سنی میں بھی اپنے اندر وہی گرج اور وہی رعب رکھتی تھی جو عالمِ شباب میں لوگوں نے شاہی مسجد کے منبر پر سُنی تھی۔ اور مسلسل کئی برس تک سنتے رہے بُرا ہو سیاست گری کا کہ اُس نے شاہی مسجد کو حینِ حیات ایک ایسے خطیب سے محروم کر دیا جو نہ صرف علوم دینیہ پر کامل دستگاہ رکھتا تھا بلکہ تحریک پاکستان اور ملکی سیاسیات میں بھی جس کی خدمات کا اعتراف نہ کرنا بخیلی ہی نہیں قزاقی ہے

دوسرا اقتباس حکیم الامت علامہ اقبالؒ کی نگاہِ مردم شناس نے انہیں شاہی مسجد کی خطابت کے لیے منتخب کرلیا اور مولانا نے اپنی عمرِ عزیز کا طویل حصّہ اس تاریخی مسجد کی خطابت میں لگا دیا۔ اس زمانے

میں جب غازی علم دین شہید نے راجپال کو جہنم واصل کیا اور اس پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ایک شدید قانونی کشمکش کا آغاز ہوا تو اس کے لیے علامہ اقبالؒ نے ایک کمیٹی بنائی جس میں غازی علم دین کا مقدمہ عدالت میں لڑا ۔ علامہ اقبالؒ کے ارشاد پر ہی مولانا مرشد کو غازی علم دین کے قانونی مشیر کے ساتھ لگایا گیا کہ وہ نکتہ رسی اور حاضر جوابی میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے ۔ تحریکِ پاکستان میں مولانا غلام مرشد نے جو کردار ادا کیا اور حصولِ پاکستان کے لیے وہ جس محنت اور لگن سے کام کرتے رہے اس کا اعتراف خود بانیٔ پاکستان حضرت قائدِ اعظمؒ کو تھا اور انہوں نے متعدد مواقع پر اس کا اظہار بھی کیا ۔

مسلمان بمقابلہ ہندو جو جنگ ۱۹۴۰ء میں شروع ہوئی اس میں مسلم لیگ کے مقاصد کی تکمیل کے لیے جن نامی گرامی علمائے کرام نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ، مولانا غلام مرشد ان کی صفِ اوّل میں تھے ۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ مسلم لیگ کے مقابلے میں مختلف مکاتبِ فکر کے علماء کا ایک لشکر صف آراء تھا جو آزادیٔ ہند کے لیے تو سرگرم تھا لیکن ہندو ذہنیت سے نابلد مسلمانوں کے مستقبل کی انہیں کچھ پرواہ نہ تھی ۔ اسوقت علماء کی سب سے بڑی تنظیم جمعیت علمائے ہند تھی جس کی پوری تائید و حمایت کانگریس کو حاصل تھی اور مسلم لیگ ان کی اعانت و رہنمائی سے محروم تھی ۔ حالانکہ وہ مسلمانوں کی سب سے بڑی اور اہم جماعت تھی ۔ ان حالات میں چند علمائے کرام کا نعرۂ حق لگانا بہت مشکل کام تھا ، لیکن مولانا غلام مرشد کو یہ اعزاز حاصل ہوا کہ علامہ شبیر احمد عثمانی کی رہنمائی میں جب جمعیت العلمائے ہند کے مقابلے میں جمعیت العلماء اسلام کا قیام عمل میں لایا گیا اور اس کا سب سے پہلا تنظیمی اجلاس کلکتہ میں ہوا تو قائدِ اعظم کے ارشاد پر اس کا افتتاحی خطبۂ صدارت دینے کی سعادت مولانا غلام مرشد کو حاصل ہوئی ۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

آخر میں مجھے اس بات کا سخت افسوس ہے کہ ریڈیو پاکستان لاہور کے بعض کارندوں کے اصرار اور مولانا کے اقرار کے باوجود ان کا انٹرویو ریکارڈ نہ کرا سکا۔

آخری اقتباس

مولانا کی دینی خدمات میں جہاں تدریس و خطابت کا ایک حصہ ہے وہاں ان کا وہ درسِ قرآن حکیم خاص اہمیت رکھتا ہے جو شہری مسجد لاہور میں دیا کرتے تھے اور جس کے شرکاء میں بڑے بڑے نامی گرامی حضرات تھے۔ اس کبر سنی اور ضعف کے باوجود ان کی خواہش تھی کہ تادمِ آخر اس درس کو جاری رکھیں کیونکہ فرمایا کرتے تھے کہ قرآن مجید کے نکات بیان کرتے ہوئے مجھے خاص لطف آتا ہے اس لیے میں چاہتا ہوں کہ میرا انتقال درسِ قرآن دیتے ہوئے ہو۔ اور خدا کے ہاں جب میری حاضری ہو تو میری زبان پر "قال اللہ" کے الفاظ ہوں۔ گزشتہ ایّام میں ان کی خدمت میں بیٹھ کر علم و فضل کے جو موتی میں نے سمیٹے ہیں وہ میرا سرمایہ حیات ہے۔ انہوں نے تفسیر، حدیث اور فقہ کے علاوہ معقولات کے بعض ایسے نکات مجھے سمجھائے جن کو میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔

روزنامہ جنگ راولپنڈی ۱۶ ستمبر ۱۹۷۹ء

لاہور ۱۵ ستمبر (اپ پ) تحریک پاکستان کے ممتاز رہنما، معروف مذہبی رہنما اور بادشاہی مسجد لاہور کے سابق خطیب مولانا غلام مرشد آج یہاں ۸۴ برس کی عمر میں انتقال کر گئے ...... مولانا غلام مرشد ممتاز شاعر اور ادیب احمد ندیم قاسمی کے کزن تھے۔ انہوں نے قائد اعظم محمد علی جناح کی قیادت میں تحریکِ پاکستان میں بھرپور حصہ لیا۔ ایوب خان کے دورِ میں آمریت کے خلاف احتجاج کے طور پر وہ بادشاہی مسجد کے خطیب کے عہدے سے مستعفی ہو گئے تھے۔

روزنامہ امروز ۱۶ ستمبر ۱۹۷۹ء

لاہور ۱۵ ستمبر گورنر پنجاب لیفٹیننٹ جنرل سوار خان نے مولانا غلام مرشد کی وفات پر

گہرے رنج کا اظہار کیا ہے مرحوم کے صاحبزادے ملک منظور الحق کے نام ایک تعزیتی پیغام میں گورنر نے کہا کہ آپ کے والد کی وفات کی المناک خبر گہرے رنج و غم سے سنی بلاشبہ وہ اسلامی تاریخ کے بلند پایہ عالم تھے اور قیام پاکستان کے سلسلہ میں ان کی خدمات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔

روزنامہ جنگ کراچی

میرا ٹیپ ریکارڈر پڑا رہ گیا مولانا چل بسے

موت وحیات کا راز کون جانے ؟ امید فردا پر بہت سے کام ٹل جاتے ہیں اور لبسا اوقات اس امید پہ قربان ہو جاتے ہیں اور وہ کل پھر نہیں آتی جس کی امید پر آج کا کام چھوڑا تھا۔ یہی ماجرا کچھ میرے ساتھ ہوا۔ اور جس عظیم اور جلیل القدر ہستی کی عالمانہ اور محققانہ باتیں ریکارڈ کرنے کے لیے ایک ہزار روپے کی لاگت سے ٹیپ ریکارڈر خریدا تھا، اسے استعمال کرنے کا موقع ہاتھ سے نکل گیا۔ اور وہ نایاب ہستی مولانا غلام مرشد رحمۃ اللہ علیہ لقمۂ اجل ہو کر ہم سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے۔ اب اس ٹیپ ریکارڈ کو دیکھ کر آہ نکلتی ہے۔ خیر یہ تو علم دوست حضرات کا نقصان تھا جو علم وحکمت کے انمول موتیوں سے محروم ہو گئے جو میں اپنے اس ٹیپ ریکارڈ میں محفوظ کرنا چاہتا تھا۔

دوسرا اقتباس

"ہم نے مولانا کے منہ سے کبھی کسی عالم کی غیبت نہ سنی تھی۔ مولانا پر کفر کے فتوے لگائے گئے لیکن انہوں نے کبھی جواب نہ دیا اور بھی کئی ایک شرعی مسائل میں مولانا نے علماء کے مسلک کے خلاف اپنی رائے کا اظہار کیا جس پر سخت تنقید اور طعن و تشنیع کی بوچھاڑ ہوئی لیکن مولانا نے جب یہ کہا کہ قربانی کی رقم حاجت مندوں میں تقسیم کی جا سکتی ہے اور یہ بہتر مصرف ہو سکتا ہے اس پر بھی ہنگامہ ہوا مولانا کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن مولانا ثابت قدم رہے

تیسرا اقتباس ۱۹۶۹ء میں جب میرا تقرر ناظم اعلیٰ اوقاف کے عہدے پر ہوا تو اسوقت مولانا شاہی مسجد کی خطابت سے علیحدہ ہو چکے تھے۔ نواب کالا باغ گورنری کے عہدے سے ہٹ چکے تھے اور گورنر موسیٰ خاں کی رضامندی کے ساتھ اوقاف نے مولانا کو دوبارہ خطابت پر واپس آنے کی دعوت دی لیکن اب وہ کسی قیمت پر بھی حکومت کی ملازمت میں آنے کو تیار نہ تھے کیونکہ نواب کالا باغ نے مسئلہ تاشقند پر اُن کی تقریر کو ناپسند کرتے ہوئے خطابت کے عہدے سے علیحدہ کرنیکا حکم جاری کیا تھا جس سے مولانا کی خودداری کو سخت ٹھیس پہنچی تھی اور گورنر صاحب نے یہ بھی دریافت کرنے کی زحمت نہ کی تھی کہ مولانا بغیر معاوضہ کے فرائض انجام دے رہے تھے اور انہیں ایک سرکاری ملازم سمجھنا ہرگز مناسب نہ تھا اب جبکہ شاہی مسجد کی خطابت کے لائق ملک میں کوئی اور عالم موجود نہ تھا۔ ہم نے مولانا سے بار بار درخواست کی لیکن وہ راضی نہ ہوئے تھوڑے عرصے بعد جامع اسلامیہ بہاولپور کا وائس چانسلر بننے کی پیش کش کی گئی۔ اور بارہا انہیں منانے کی کوشش کی گئی کیونکہ ان کے علم و فضل سے جامع اسلامیہ کا علمی درجہ بہت بلند ہو جاتا تھا لیکن ہماری کوششیں ناکام رہیں اور تین ہزار روپے کی ماہانہ تنخواہ کی پیش کش جو آج کل کے حساب سے دس ہزار روپے ماہانہ ہوتی ہے' ان کے ارادے کو بدلنے میں ناکام رہی۔ مولانا سرکاری ملازمت میں ہرگز آنے کو تیار نہ تھے۔

جناب مسعود سابق ناظم اوقاف کا یہی خراج تحسین امروز ۳ر اکتوبر ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا (مرتب)

لاہور لاہور ہے ملک کے مایہ ناز حامل تمغۂ امتیاز شاعر و ادیب و افسانہ نگار جناب احمد ندیم قاسمی روزنامہ جنگ کراچی ۲ر اکتوبر ۱۹۷۹ء میں "لاہور، لاہور ہے" کالم میں رقمطراز ہیں :۔

"جنگ کے پرانے قارئین کرام کو یاد ہوگا کہ آج سے ساڑھے تیرہ برس پہلے میں نے اس کالم میں شاہی مسجد لاہور کے خطیب گرامی حضرت مولانا غلام مرشد کے بارے میں لکھا تھا کہ کس طرح انہوں نے جمعہ کے خطبے میں اعلانِ تاشقند کے خلاف احتجاج کرنے

والے نوجوانوں پر گولی چلانے کی بالکل واضح اور غیر مبہم مذمت فرمائی تھی۔ اور اس خطبے کے چند گھنٹے بعد انہیں بادشاہی مسجد کے خطیب کے منصب سے ہٹا دیا گیا تھا جو علامہ اقبال کے توسط سے ۱۹۳۵ء میں ان کے سپرد ہوا تھا۔ اور جو گزشتہ ۳۱ برس سے ان کے پاس تھا۔ آج وہ نڈر عالم دین وہ مرد حق آگاہ ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں۔ ۱۴۔ ستمبر ۱۹۷۹ء کو طویل علالت کے بعد وہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے اور ۱۵ ستمبر کو اپنے گاؤں انگہ (ضلع سرگودہا) کے قبرستان میں دفن کر دیے گئے۔ پاکستان کے بہت کم لوگوں کو اس حقیقت کا احساس ہے کہ ان سے کتنی عظیم دینی شخصیت چھن گئی ہے۔ سبب اس کا یہ ہے کہ حضرت مولانا نے نہایت درویشانہ زندگی بسر کی ہے انہیں نام و نمود کا کوئی شوق نہیں تھا۔ وہ چاہتے تو بڑی آسانی سے سیاست میں آسکتے تھے مگر انہوں نے ہمیشہ اپنے کام سے کام رکھا۔

دوسرا اقتباس "علیل تو وہ ایک عرصے سے تھے مگر ان دنوں بیماری شدت اختیار کر گئی تھی۔ ان کے صاحبزادگان بتلاتے ہیں کہ انہیں جب بھی ہوش آیا میرا نام لے کر پکارا اور مجھے بہت یاد کیا۔ دراصل وہ میرے ساتھ انتہائی شفقت سے پیش آتے تھے اور میرے ساتھ ہمیشہ یوں مخاطب فرماتے تھے "میری سب سے چھوٹی اور سب سے پیاری خالہ کے بہت پیارے بیٹے" اس روز میں ان کی مزاج پرسی کے لیے پہنچا تو وہ سو رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ کئی روز سے اس عالم میں ہیں۔ آنکھ کھولتے بھی ہیں تو بات کم کرتے ہیں البتہ تمہیں بہت یاد کرتے ہیں۔ میں دیر تک وہاں بیٹھا رہا اور دیکھتا رہا کہ کس طرح ایک قد آور اور وجیہہ شخص ہڈیوں کا ڈھانچہ بنکر رہ گیا ہے۔ اور وہ جس کی گرجدار گونجیلی آواز پر اہل لاہور کا دل دھڑکتا تھا آج مہر بلب پڑا ہے۔ پھر جب انہوں نے آنکھ کھولی اور انہیں بار بار بتایا گیا کہ ندیم آیا ہے تو انہوں نے اپنے بازو اٹھا دیئے اور میں ان مقدس ہاتھوں میں سما گیا۔ وہ بستر پر دراز تھے اور میں ان پر جھکا ہوا تھا۔ تب انہوں نے پیار سے میرے سینے پر ہاتھ مار مار کر گفتگو شروع کی اور حاضرین حیران رہ گئے کہ وہ جو علالت کے اس دور میں بہت

کم بولے ہیں آج یوں مسلسل بولے چلے جا رہے ہیں جیسے انہیں روکا نہ گیا تو رات بھر بولتے رہیں گے۔ دو ڈھائی گھنٹے کی گفتگو کے بعد انہوں نے پانی مانگا۔ پھر آنکھیں بند کر لیں۔ میں پلنگ کی پٹی سے ہٹ کر کرسی پر آ بیٹھا مگر یکایک انہوں نے پھر آنکھیں کھول دیں اور میرا نام لیکر بازو بلند کر دیئے۔ میں ایک بار پھر ان پر جھک گیا۔ اور انہوں نے ماضی کی بازیافت پھر سے شروع کر دی۔ یوں جو کچھ ان کے بارے میں عرض کرونگا۔ وہ بیشتر خود اُن کے ارشادات کا خلاصہ ہوگا۔

تیسرا اقتباس

دس برس کی عمر میں جب مولانا نے قرآن مجید حفظ فرما لیا تو ختم قرآن شریف کی تقریب میں گولڑہ شریف کے سجادہ نشین حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب نے بطورِ خاص شرکت فرمائی۔ مولانا کے حافظے اور عربی صرف و نحو پر عبور کے سلسلے میں ان کا امتحان بھی لیا اور اتنے خوش ہوئے کہ دیر تک انہیں اپنی دعاؤں سے سرفراز فرماتے رہے۔

علامہ اقبالؒ اور قائد اعظم
چوتھا اقتباس

علامہ اقبال کو جب بھی کسی دینی مسئلے کو سمجھنے میں دقت پیش آتی مولانا غلام مرشد سے رجوع فرماتے۔ علامہ اُن کے تبحر علم اور ژرف نگاہی کے بے حد معترف تھے۔ قائد اعظم نے انہیں علامہ شبیر احمد عثمانی کے ہمراہ جمعیت علماء اسلام کے قیام کا فرض سونپا۔ چنانچہ کلکتہ میں اس جمعیت کا جو پہلا کنونشن ہوا۔ اسمیں مولانا نے شرکت کی۔ فرماتے تھے کہ لاہور سے خبردار کیا جاتا رہا ہے بلکہ ڈرایا جاتا رہا کہ کلکتہ مولانا ابوالکلام آزاد کا گڑھ اور جمعیت علماء ہند کے نیشنلزم کا مرکز ہے اس لئے وہاں کا سفر منسوخ کیجئے۔ بصورتِ دیگر آپ کی جان تک کا خطرہ ہے مولانا سبھی کو یہ جواب دیتے ہوئے کلکتہ کی طرف بڑھتے رہے کہ جب برصغیر کے کروڑوں مسلمانوں کی زندگیوں اور اُن کے پورے مستقبل کو خطرات درپیش ہیں تو اُن کے سامنے میری ایک جان کو خطرہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔

جمعیت علمائے اسلام کا قیام

کلکتہ کے اس کنونشن میں علامہ شبیر احمد عثمانی علالت کی وجہ سے شرکت نہ فرما سکے۔ اس لیے علمائے اسلام کے اس کنونشن کی رہنمائی کا فرض مولانا غلام مرشد پر عائد ہوا جو انہوں نے باحسن طریق پورا کیا۔ علمائے ہند کے نیشنلزم کے مقابلے میں علماء و مشائخ کی طرف سے تحریک پاکستان کو بڑی قوت اور توانائی حاصل ہوئی۔ بعد میں مولانا نے جمعیت کی شاخیں ملک کے طول و عرض میں قائم کیں اور ۱۹۴۵ء میں لاہور کے مقام پر ملک بھر کے علماء و مشائخ کا ایک عظیم الشان اجتماع منعقد کیا۔ مولانا غلام مرشد مجلس استقبالیہ کے صدر تھے۔ چنانچہ انہوں نے اس اجتماع میں خطبہ استقبالیہ ارشاد فرمایا۔ اس خطبے کو نظریۂ پاکستان کے لٹریچر میں ایک اہم اور مثبت اضافہ تسلیم کیا گیا ہے۔ بعض اصحاب کے پاس اس کی نقول موجود ہیں اس کی مکرر اشاعت سے نظریۂ پاکستان کے بارے میں متعدد الجھنیں آج بھی دور ہو سکتی ہیں۔ مولانا شاہی مسجد کے منبر سے اہل لاہور کو تحریک پاکستان کے مقاصد سے مسلسل آگاہ فرما رہے تھے۔ اس تحریک نے زور پکڑا تو مولانا نے ملک کے گوشے گوشے کے دورے فرمائے اور قیام پاکستان کے بعد جب مہاجرین کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا تو مہاجر کیمپوں میں مولانا کی انتھک خدمات اور ان کے بے پناہ ایثار کے مناظر دیدنی تھے۔

پانچواں اقتباس

آج سے کم و بیش ۴۵ برس پہلے عرب کے ایک اخبار "ام القریٰ" نے جنوبی ایشیا میں اسلام اور مسلمانوں کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا تھا کہ جنوبی ایشیا میں جن نامور علمائے دین نے اسلام اور قرآن کو صحیح معنوں میں سمجھا وہ فی الوقت صرف دو ہیں علامہ سید سلیمان ندوی، اور مولانا غلام مرشد — انہوں نے پوری عمر درس قرآن پاک اور خطبات جمعہ ارشاد فرمانے میں بسر کی، مگر آتش تقریر نہیں تھے۔ وہ اپنی گھمبیر اور گونجیلی آواز میں نہایت مدلل متوازن منطقی اور دل و دماغ کی گہرائیوں میں اتر کر وہاں گھر کر جانے والی تقریریں کرتے تھے۔ سبب اس کا یہ تھا کہ وہ جو کچھ بھی فرماتے تھے اس کی تائید قرآن پاک سے

حاصل کرتے تھے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مولانا نے عمر بھر کبھی کسی کی تکفیر نہیں کی۔ انہیں بڑی بڑی آزمائشوں سے بھی گزرنا پڑا۔ ان پہ پتھر بھی برسائے گئے۔ انہیں لہو لہان بھی کر ڈالا گیا۔ اُن کے خلاف قدِ آدم پوسٹر بھی چسپاں ہوئے مگر انہوں نے کبھی کسی کو کافر قرار نہیں دیا۔ مثال کے طور پر آج سے پچاس سال پہلے بعض مفتیانِ دین نے اُن سے مطالبہ کیا کہ اس وقت کے والئ افغانستان شاہ امان اللہ خان کے خلاف کفر کا فتویٰ دیں تو مولانا نے یہ کہکر تکفیر سے انکار کر دیا کہ روشن خیالی کفر نہیں ہے۔ مولانا کی اس جرأت اور بے باکی سے متاثر ہو کر مولانا ظفر علی خان نے اپنی ایک نظم میں مولانا غلام مرشد کو "اللہ کی تلوار" قرار دیا تھا۔ مولانا نے حق بات کے اعلان میں کوئی لگی لپٹی اٹھا نہ رکھی ہمیشہ بات صاف صاف کی اور کھری بات کی۔ وہ خودداری اور خود اعتمادی کے پیکر تھے۔ اور اس لیے نڈر اور دلیر تھے اسلام کو وقت کے جدید تقاضوں سے مربوط کر کے یوں پیش فرماتے تھے کہ ایک غیر مسلم کو بھی یقین آجاتا تھا کہ اسلام ہی کائنات کا واحد اور آخری سچائی ہے۔ مرزا غالب کے اس مصرعہ کا ایک ایک لفظ مولانا غلام مرشد مرحوم و مغفور کے سے مردِ درویش اور عالم حق آگاہ پر کیسا صادق آتا ہے۔

"حق مغفرت کرے، عجب آزاد مرد تھا۔

پاکستان ٹائمز لاہور ۱۵ ستمبر ۱۹۷۹ء ملک کے مشہور مذہبی عالم، تحریکِ پاکستان کے صفِ اوّل کے لیڈر بادشاہی مسجد کے سابقہ عظیم خطیب مولانا غلام مرشد بروز جمعرات ۸۴ سال کی عمر میں لاہور میں وفات پا گئے ..... مولانا عظیم شاعر اور ادیب احمد ندیم قاسمی کے کزن تھے۔ احمد ندیم قاسمی نے پاکستان بننے سے پہلے اور معرضِ وجود میں آنے کے بعد تک اسکی عظمت کے لیے بہت کام کیے۔ مولانا غلام مرشد نے تحریک پاکستان میں مسلمانوں کی آزادی خواہی کے لیے بابائے قوم کی قیادت میں نمایاں خدمات سرانجام دی ہیں۔

مولانا ہمدردی، سادہ زندگی اور وطن سے محبت کے باعث قدر کی نگاہ سے

دیکھے جاتے تھے۔ عظیم سیاستدان اور مسلم لیگی لیڈر میاں امیر الدین نے بھی مولانا غلام مرشد
کی وفات پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا ہے۔ ایک تعزیتی پیغام میں انہوں نے
کہا ہے کہ مولانا تحریک آزادی کے عظیم لیڈر تھے اور قائد اعظم کی قیادت میں پاکستان
کو معرضِ وجود میں لانے کے لیے ان کی کوششوں کا بڑا حصّہ ہے۔ ان کی موت
پاکستانی قوم کے لیے ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔

پاکستان ٹائمز ۱۶ ستمبر ۱۹۷۹ء

۱۵ ستمبر کو صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق نے مشہور
مذہبی عالم مولانا غلام مرشد کی وفات پر گہرے رنج
و غم کا اظہار کیا ہے جنہوں نے اپنی تمام زندگی اسلام کی راہ میں وقف کر دی۔ مولانا
غلام مرشد کے بیٹے کو ایک تعزیتی پیغام میں صدر پاکستان نے کہا کہ آپ کے جیّد
عالم فاضل والد محترم کی وفات پر مجھے انتہائی صدمہ پہنچا ہے۔ مولانا غلام مرشد مشہور
مذہبی عالم تھے جنہوں نے اپنی تمام زندگی اسلام کی خدمت میں وقف کی۔ انہوں نے
اپنے علم سے برصغیر کے بے شمار مسلمانوں کو مستفید کیا۔ انہوں نے تحریکِ پاکستان
میں مسلمانوں کی آزادی کے لیے قابلِ قدر خدمات سرانجام دیں۔
اللہ تعالیٰ انہیں جوارِ رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا کرے۔
گورنر پنجاب لیفٹیننٹ جنرل سوار خان نے بھی گہرے غم کا اظہار کیا ہے ایک
تعزیتی پیغام جو بروز جمعہ انہوں نے ان کے بیٹے ملک ظہور الحق کو بھیجا گورنر نے کہا
آپ کے باپ کی وفات کا جو عظیم سانحہ ہوا ہے ناقابلِ تلافی ہے۔ بلاشبہ وہ
ایک عظیم مذہبی عالم تھے۔ اور پاکستان کی آزادی کے لیے اُن کی خدمات ناقابلِ
فراموش ہیں۔ حکیم آفتاب احمد قرشی صدر "موتمر عالم اسلام" نے بھی اس عظیم مذہبی
راہنما کی وفات پر دکھ کا اظہار کیا ہے۔

امروز ۶ فروری ۱۹۸۰ء

غلام مرشدؒ از عظمت جہاں

پہلا اقتباس:- ۲۰ شوال المکرم بروز جمعہ
صبح کے تین بجے میرے دروازے پر کسی نے
دستک دی۔ میری چھوٹی حسن تڑپ اٹھی ایک

انجلا نے خوف سے لرزتے ہوئے دروازہ کھولا تو یہ دردناک خبر سُنی کہ اس صدی کا ایک فانوسِ علم و حکمت، لاثانی فقیہہ اور لاکھوں دِلوں کو اسلام سے منور کرنے والے حضرت مولانا علام مرشد اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے ہیں۔ میں یہ خبر سننے کے لیے بالکل تیار نہ تھی مجھے ربّ قدوس پر پورا پورا یقین تھا کہ وُہ لاکھوں دلوں کی التجائیں اور دعائیں ضرور سُن لے گا۔ اور یہ بابرکت اور پُرشفقت سایہ کچھ دن اور ہم سب کے سروں پر قائم رکھے گا مگر قدرت کے قانون اٹل ہیں۔ فرشتۂ اجل ہماری خون روتی ہوئی آنکھوں کے سامنے کیسے کیسے نایاب گوہر چھین کر لے جاتا ہے اور ہم ہاتھ ملتے رہ جاتے ہیں کچھ بھی نہیں کر پاتے۔ صرف تڑپ سسک اور ان مٹ یادیں ہی ہمارے پاس رہ جاتی ہیں۔

دُوسرا اقتباس میں ان کی منجھلی بہو ہُوں جب بھی ان کی خدمت میں حاضری دیتی تو وہ قرآن پاک کا مطالعہ فرما رہے ہوتے۔ فرمایا کرتے تھے کہ کوئی بھی دینی یا دنیاوی مسئلہ درپیش ہو، اللہ تعالیٰ اور قرآن شریف کی طرف رجوع کرو۔ کیونکہ قرآنِ پاک میں تمام مسائل کا حل موجود ہے۔ جب کبھی رسولِ پاک کی حیاتِ طیبہ کا ذکر چھڑتا تو گھنٹوں گفتگو فرماتے اور حضورؐ کے اسوۂ حسنہ پر عمل کو ہر مسلمان کا فریضہ قرار دیتے۔ اُن کا ٹھہر ٹھہر اور سوچ سوچ کر بولنے کا انداز اور ان کا پروقار لہجہ آج بھی میرے کانوں میں گونج رہا ہے وہ لمحے جو میں نے حضرت مولانا کے ساتھ گزارے انہیں میں زندگی کے گراں بہا لمحوں میں شمار کرتی ہوں۔

کتنے خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو اُن کے چشمۂ فیض سے سیراب ہوئے ــــ

قابلِ صد ستائش ہیں وہ اصحاب جنہوں نے گاہے بگاہے اُن کی خدمت میں حاضر ہو کر علم و حکمت کے موتی چُنے۔

مجھے ۷ مارچ ۱۹۶۵ء کا جمعہ یاد آ رہا ہے جب حضرت مولانا نے حسبِ عادت بڑی محنت سے خطبہ تیار کیا اور بادشاہی مسجد جانے کے لیے بالکل تیار

کھڑے تھے، کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی، مولانا صاحب نے ریسیور اٹھایا، کچھ بات سُنی، اور "الحمدللہ" کہہ کر ٹیلیفون بند کر کے گھر کی سیڑھیاں اُتر گئے۔ معاً میں نے گلی میں دبا دبا شور سُنا۔ ہجوم میں اضطراب اور بے چینی دیکھی۔ پتہ کرنے پر معلوم ہوا کہ مولانا صاحب کو منبرِ رسول ؐ سے کلمۂ حق بلند کرنے سے روک دیا گیا ہے بلکہ سنہری مسجد میں وہ درسِ قرآن بھی بند کر دیا ہے جو وُہ کئی برس سے دے رہے تھے۔

تیسرا اقتباس "اپنے عقیدت مندوں سے مولانا صاحب نے صرف اتنا کہا کہ "مجھے خطبہ دینے سے باز رکھنے کا کوئی قلق نہیں اگر اگر اس کے دوبارہ اجراء کے لیے مجھے کہا گیا تو میں انکار کر دوں گا (اس کی مثال قوم کے سامنے ہے) دُکھ تو اس بات کا ہے کہ درسِ قرآن جسے انگریزوں نے بھی بند نہیں کیا تھا وُہ ایک اسلامی مملکت میں بند کرا دیا گیا۔"

میں نے پاک و بھارت کے نامور، ممتاز شاعر، معروف افسانہ نگار اور مشہور مزاح نگار جناب احمد ندیم قاسمی (حضرت مولانا غلام مرشد علیہ الرحمۃ کے خالہ زاد بھائی) کی خدمتِ عالیہ میں حاضر ہو کر گزارش کی کہ وہ مولانا کے بارے میں اپنے مشاہدات و تاثرات اور خیالات و جذبات رقم فرمائیں۔ اس عظیم المرتبت قلبِ حساس نے میری اس خواہش کو شرفِ قبولیت بخشا۔ لہٰذا آپ نے حضرت مولانا غلام مرشدؒ کے بابِ خصوصی کے لیے، خصوصی طور پر جو کچھ سپردِ قلم کیا، نذرِ قارئین کیا جا رہا ہے۔ راقم جنابِ ندیم کے اس التفات کو بنظرِ استحسان و تشکر دیکھتے ہوئے ان کی اس عنایتِ خاص کے لیے لحسان مند ہے کہ انہوں نے اپنی بے پناہ شبانہ روز مصروفیات کے باوجود مجھے مایوس نہیں کیا ہے (چودھری حبیب احمد)

حضرت مولانا غلام مرشد مرحوم و مغفور کے
مزاج کی چند خصوصیات

حضرت مولانا غلام مرشد مرحوم کے کردار و مزاج کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ وہ اعلانِ حق کے معاملے میں انتہا درجہ کے بے خوف اور حوصلہ مند انسان تھے۔ انہیں حق بات کے تعین کا حق بھی حاصل تھا، کیونکہ قرآن مجید کا مطالعہ انہوں نے اتنی گہرائیوں میں جا کر کیا تھا اور دیگر متعلقہ دینی علوم پر انہیں اس حد تک تبحر حاصل تھا کہ حق بات اُن سے چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ عمر بھر معتوب ہی رہے۔ بیشتر علماء انہیں اپنی صف میں شمار کرنے سے گریز کرتے تھے۔ اور بیشتر اربابِ حکومت ان سے خوفزدہ رہنے کی وجہ سے انہیں ان سرکاری اداروں سے دُور رکھنے کی کوشش کرتے رہتے تھے جن کا تعلق دین واخلاق یا قرآن و شریعت سے ہوتا تھا۔ دراصل حق ہر زمانے میں کڑوا رہا ہے اور آج بھی کڑوا ہے بلکہ آج تو کچھ زیادہ ہی کڑوا ہے۔ آج حق گوئی کے دعویدار تو لاکھوں ہیں مگر شاید ہی کوئی حق بات سننے پر آمادہ ہو۔ حضرت مولانا کا یہ معمول رہا کہ انہوں نے حق بات کو کبھی لپیٹ کر پیش نہیں کیا اور بڑے بڑے

بڑوں کے طیش کا ہدف بنے۔ مگر انہیں کسی بھی قسم کی صورتِ حالات، اعلانِ حق سے باز نہیں رکھ سکتی تھی۔ اور یہ خصوصیت اُن کے کردار کی عظمت کا بہت بڑا ثبوت ہے۔

حضرت مولانا جس طرح اعلانِ حق کے معاملے میں جری تھے، اسی طرح اخفائے حق کی مخالفت میں بھی پیش پیش تھے۔ جب بھی انہیں معلوم ہوتا تھا کہ کسی مقام پر حق کو چھپانے کی کوشش کی جا رہی ہے، وہ حوصلہ مندی اور خود اعتمادی کے ساتھ آگے بڑھتے تھے۔ اور مصلحتوں کے پردے تار تار کر کے رکھ دیتے تھے۔ تاکہ آفتابِ حق کے چہرے پر دھند کا کوئی دھبا بھی نہ رہنے پائے۔ اخفائے حق ہمارے ہاں کی کتنی ہی شخصیات کا دل پسند مشغلہ رہا ہے چنانچہ حضرت مولانا کو ان سبھی شخصیات کی عداوت مول لینا پڑی۔ مگر اُن کے لیے یہ کوئی خسارے کا سودا نہ تھا۔ اگر اللہ تعالیٰ کے فرمان اور حضور ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا حق ادا ہوتا ہے تو یہ سودا سراسر منافعے کا تھا۔ پھر حضرت مولانا کو نہ محل بنوانا تھے، نہ عہدے حاصل کرنا تھے۔ نہ انہیں قربِ سلطانی کی ہوس تھی۔ وہ ایک عزت مندانہ، غیرت مندانہ اور درویشانہ زندگی کے قائل تھے۔ اور جب انسان اپنی ضروریات کو اتنا محدود کر لے تو ہوسِ زر ختم ہو جاتی ہے۔ اور ہوسِ زر نہ رہے تو تمام دنیاوی خوف بھی ختم ہو جاتے ہیں، صرف خوفِ خدا باقی رہ جاتا ہے جو تقویٰ کی جان ہے۔

یہ کتنی عجیب بات ہے کہ جہاں تک میری یادداشت میرا ساتھ دیتی ہے، اور جہاں تک مجھے حضرت مولانا کے ساتھ طویل مکالمے یاد ہیں، انھوں نے کبھی کسی کلمہ گو کے خلاف کفر کا فتویٰ عائد نہیں فرمایا۔ وہ مسلمانوں کی صفوں میں سے مسلمانوں کو خارج کر دینے کی بجائے ان کی صفوں میں زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کو شامل کرنے کے حق میں تھے۔ فتویٰ دینا ہر ان صاحب کا محبوب مشغلہ ہے جو علم دینیات پر حاوی ہونے کے دعویدار ہوتے ہیں۔ مولانا اگر فتویٰ دینا چاہتے تو وہ قرآن مجید اور احادیث کے حافظ ہونے کے علاوہ فقہ پر پورے اعتماد کے ساتھ عبور رکھتے تھے۔ اور پوری ذمہ داری کے ساتھ فتویٰ صادر

فرما سکتے تھے۔ مگر فرمایا کرتے تھے کہ وہ جو خدا کی وحدت پر ایمان رکھتے ہیں اور خدا کے آخری نبیؐ کا کلمہ دہراتے اور نماز پڑھتے اور روزے رکھتے اور زکوٰۃ دیتے ہیں اُن میں سے کسی کو کافر قرار دینے سے پہلے ایک بار نہیں بلکہ ایک ہزار ایک بار سوچ لینا چاہیئے کہ کافر سازی کی اس مہم کو اگر اس کے منطقی نتیجے تک پہنچایا گیا تو کوئی بھی کافر ہونے سے نہیں بچ سکے گا۔ مسلمان کی حیثیت میں ہم سب کتنی ہی غیر اسلامی خامیوں میں ملوث ہیں۔ اس طرح تو کافر سازوں کو بھی کافر قرار دینے کی نوبت آ جائے گی۔ صحیح طریقِ کار تو یہ ہونا چاہیئے کہ مسلمان اپنے افراد اور گروہوں اور فرقوں کی خامیوں اور کوتاہیوں کو افہام و تفہیم سے دور کریں کیونکہ باہمی اصلاح ہی مسلمانوں کے اندر اسلام کی بہترین تبلیغ ہے۔ ایک مسلمان کو مسلمانوں کی صف میں سے خارج کر دینا آسمان پر ایک ستارہ بجھا دینے کے مترادف ہے۔

میں جب بھی حضرت مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بیوی بچوں اور دیگر اعزہ و احباب کی خیر و عافیت پوچھنے کے بعد انہوں نے کوئی نہ کوئی اہم مسئلہ چھیڑ دیا اور اس پر اسلامی نقطۂ نظر سے اتنی بھرپور روشنی ڈالی کہ میرے ذہن کی کتنی ہی گتھیاں سلجھ گئیں۔ مجھے کوئی بھی ملاقات یاد نہیں ہے جس میں حضرت مولانا نے کسی نہ کسی بنیادی سیاسی، قومی یا بین الاقوامی مسئلے کو موضوعِ گفتگو نہ بنایا ہو۔ اس مسئلے کی نوعیت اور حیثیت متعین کرنے کے بعد، وہ قرآن و حدیث اور تاریخ اسلامی اور فقہ و منطق کے حوالوں سے اس مسئلے کی پرتوں پر پرتیں کھولتے چلے جاتے تھے۔ اور جب گفتگو کو ختم فرماتے تھے، تو، اس موضوع کے دور دراز کے کونے کھدرے بھی منور ہو چکے ہوتے تھے۔ اس پر مستزاد حضرت مولانا کا اندازِ گفتگو کہ باتیں کرتے ہوئے آنکھیں بند کر لیتے تھے جیسے علوم کے سمندر میں غوطہ زن ہو گئے ہیں اور پھر جب آنکھیں کھولتے تھے تو کتنے ہی گوہرہائے آبدار ان کی مٹھیوں میں ہوتے تھے۔ اس سلسلے میں وہ عربی فارسی اور اردو کے اشعار بھی انگوٹھی میں نگینوں کی طرح سجاتے جاتے تھے۔ اور اگر کوئی شگفتہ بات یاد آتی تھی، تو اس کے شائستہ اظہار سے بھی گریز

نہیں کرتے تھے۔ کئی بار خیال آیا کہ ان کی گفتگو چپکے سے ٹیپ کر لی جائے۔ مگر یہ توفیق کبھی نہ ہوئی۔ البتہ نصف صدی کے درسِ قرآن اور مسجدِ شاہی میں ڈیڑھ ہزار سے اوپر خطبوں میں انہوں نے حق و صداقت اور علم و فن کے جو موتی لٹائے ہیں وہ ہزاروں لاکھوں مسلمانوں کے ذہنوں اور ضمیروں میں محفوظ ہیں اور ان شاء اللہ ان کی اولادوں کے ذہنوں اور ضمیروں میں بھی منتقل ہوتے جائیں گے۔ یہ کتابیں لکھنے سے بھی بڑا کام ہے۔ حضرت مولانا نے کاغذوں کی بجائے دلوں پر کتابیں لکھیں کاغذ کی کتابیں تو لوگ طاق پر رکھ کر بھول بھی جاتے ہیں مگر دلوں پر کھدی ہوئی تحریریں کون کھرچے۔!

حضرت مولانا کی بے نیازانہ درویشانہ زندگی کے بارے میں تو ان کے صاحبزادگان اور میرے برادرِ گرامی پیرزادہ محمد بخش صاحب (جو حضرت مولانا کے داماد بھی ہیں) زیادہ یقین اور وضاحت کے ساتھ بتا سکتے ہیں کہ ان کا مشاہدہ اس ضمن میں مجھ سے کہیں زیادہ ہے۔ میں نے جو کچھ دیکھا ہے وہ مکمل نہیں ہے۔ بس اتنا جانتا ہوں کہ جب میں نے ۲۷ــــ ۱۹۲۸ء میں گاؤں سے آکر بھاٹی دروازہ میں ان کے ہاں چند روز قیام کیا تو اس وقت ان کے ہاں جو کچھ تھا ۷۸ــ ۱۹۷۹ء میں بھی تھا۔ وہی چند کرسیاں، وہی کھاٹ، وہی گنے چنے برتن اور اللہ اللہ خیر سلا۔ جب تک تندرست تھے، میں جب بھی حاضر ہوا، چائے اپنے ہاتھ سے بنا کر پلائی۔ بیوی تھی۔ بچے تھے، بہوئیں تھیں مگر جو طرزِ حیات انہیں پسند تھا وہ عمر بھر پسند رہا۔ بیٹوں بچوں کے برسرِ روزگار ہونے کی وجہ سے وافر سہولتیں بھی میسر آئیں مگر اپنے طرزِ زندگی سے کبھی دست کش نہ ہوئے۔ یہ ان کے مزاج کے استقامت کا ایک پہلو ہے۔

دراصل میں اس ضمن میں تفصیل سے کچھ عرض نہیں کر سکتا کہ اگرچہ میں ان کی سب سے چھوٹی خالہ کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا اور وہ مجھے بہت عزیز رکھتے تھے مگر ہم دونوں بھائیوں کا رشتہ زیادہ تر ذہنی تھا۔ وہ گفتگو فرماتے تھے تو جانتے تھے کہ ان کے الفاظ صحت کے ساتھ میرے ذہن میں منتقل ہو رہے ہیں۔ یہ میرا بڑا اعزاز ہے اور مجھے اس اعزاز پر ناز ہے۔

احمد ندیم قاسمی

باب ۳۱ ماضی بالکل فنا نہیں ہوتا

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ

ایک مربع میل کا رقبہ :۔ خصوصی توجہ فرمایئے مولانا مودودی کیا ارشاد فرماتے ہیں

"مسلمان ہونے کی حیثیت سے میری نگاہ میں اس سوال کی کوئی اہمیت نہیں کہ ہندوستان ایک ملک رہے یا دس ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے۔ مجھے اس سے کیا دلچسپی کہ یہ ایک ملک رہے یا دس ہزار ٹکڑوں میں بٹ جائے؟ اس بت کے ٹوٹنے پر تڑپے وہ جو اسے معبود سمجھتا ہو۔ مجھے تو اگر یہاں ایک مربع میل کا رقبہ بھی ایسا مل جائے جس میں انسان پر خدا کے سوا کسی کی حاکمیت نہ ہو تو میں اس کے ایک ذرۂ خاک کو تمام ہندوستان سے زیادہ قیمتی سمجھوں گا۔"

(مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم ص ۱۲۶، ۱۲۷)

ناشر مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی اچھرہ، لاہور طبع ہفتم ۱۹۵۵ء

قارئین کرام! امیر جماعت اسلامی (سابق) مودودی صاحب کی محولا بالا تحریر سے صاف طور پر واضح اور عیاں ہے کہ مولانا جو برسوں کانگریسی اخبار کے ایڈیٹر رہے اور جنھوں نے گاندھی جی کی سوانح حیات بھی لکھی (مرتب) وہ تقسیم ہندوستان کے حق میں نہ تھے۔ اس جماعت کے حالیہ امیر جناب میاں طفیل محمدؒ نے نے کس دھڑلے سے کہدیا کہ پاکستان جن تین شخصیتوں نے بنایا ان میں اس تحریر کے راقم ان کے پیر و مرشد مولانا مودودی بھی تھے۔ یہ ٹھیک ہے کہ مسلمان وطن کو معبود نہیں سمجھتا اور خاکِ وطن کا ہر ذرہ اس کے لیے دیوتا نہیں ہوتا لیکن وہ سرزمین، وہ مملکت جو اسلامی نظام کے قیام اور قرآنی قوانین کے نفاذ کے لئے حاصل کرنے کے لیے مطلوب ہو اسکی حمائت اور اس تحریک کی اعانت تو مولانا صاحب کو کرنی چاہیئے تھی جس کا ایک ذرۂ خاک یقیناً ایسے ہندوستان سے قیمتی تھا جس کی نیشنلسٹ ہندو مسلم قیادت ذرۂ خاکِ وطن ہی کو معبود سمجھتی تھی لیکن وائے بدنصیبی اور بدقسمتی کہ امیر جماعت اسلامی (سابق) کے مقدر

میں یہ عظمت اور یہ شرف نہ لکھا تھا اور انہوں نے تا دمِ آخر مسلم لیگی قیادت
اور پاکستان کے قیام کی سرگرم مخالفت کی۔ جناب خواجہ عبدالرحیم مرحوم و مغفور
بیرسٹرایٹ لا مخلص پاکستانی اور حضرت حکیم الامت علامہ اقبالؒ کے حلقۂ ارادت
سے منسلک تھے اور اس ناتے سے راقم کے ساتھ بزرگانہ شفقت اور برادرانہ سلوک
فرمایا کرتے تھے۔ ان سے اور محترم جناب راجہ حسن اختر مرحوم و مغفور سے اکثر ملاقاتیں
اور نشستیں ہوتی تھیں۔ کئی بار دورانِ گفتگو خواجہ صاحب نے فرمایا کہ جب دارالسلام
پٹھانکوٹ سے ذاتی تمام تر مخالفت کے باوجود قائم ہونے والے پاکستان میں آنے
کے لیے انہوں نے (یعنی جماعت اسلامی والوں نے) لاہور آکر ٹرکوں کے لئے خواجہ
صاحب سے کہا (یہ انتظام ان کے سپرد تھا) تو محترم راجہ صاحب اور خواجہ صاحب نے
انہیں کہا تھا کہ دارالاسلام کا کچھ رقبہ تو ہے ہم ہندوستان گورنمنٹ سے بات کر
کے آپ کو ایک مربع میل زمین وہاں لئے دیتے ہیں آپ وہاں "خدا کی حاکمیت"
قائم کریں۔ اب "ناپاکستان" میں آنے کی زحمت گوارا نہ کریں۔ یہ آپ کی شدید مخالفت
کے باوصف معرضِ وجود میں آیا ہے۔ حضور اقدس و اعظم نے تو اپنے نسلی، نسبی
اور وطنی رشتہ داروں اور برادری کے لوگوں سے خدا کے نام پر جنگ کی۔ آپ
بھی اپنے پاکستان کے قیام کے مخالف اسلام سے لیس ہو کر ہندوؤں سے جنگ
کر کے اس علاقے کو اسلامی سلطنت بنا لیں تو ہندوستان کی تقسیم کے لیے دلچسپی
نہ رکھنے والے مولانا مودودی کے آدمیوں نے عجز و لجاجت سے ٹرکوں کے
حصول کے لیے خواہش کا اظہار کیا۔ چنانچہ انہیں ٹرک مہیا کر دیئے گئے۔ یہ
پھر جس انداز سے دارالاسلام پٹھانکوٹ سے لاہور آئے یہ روئیداد (خان
محمد ایوب خان سابق جنرل سیکرٹری شہری مسلم لیگ لائل پور) نے ایک پمفلٹ
کی صورت میں ۱۹۴۹ء میں حضور ملت پیش کی تھی، جو ضلع گورداسپور کے مہاجر
ہیں) یہ پمفلٹ تو وہ دستیاب نہ کر سکے۔ تاہم میری گزارش پر خان صاحب
نے چند ضروری اور اہم باتیں اپنی یادداشت کے زور پر تحریر فرما دی ہیں، جو

نذرِ قارئین کی جاتی ہیں

ماضی بالکل فنا نہیں ہوتا
آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ

محترم چوہدری حبیب احمد صاحب کے ارشاد کی تعمیل میں بغیر کسی تمہید کے آج سے ۳۱ تیس سال پہلے ایک گزرے ہوئے واقعہ کو قلمبند کر رہا ہوں اتنے طویل سالوں کی گرد کے نیچے دبے ہوئے اس واقعہ کی تلخی آج بھی قائم ہے اس افسوسناک واقعہ کو ضبطِ تحریر میں لاتے ہوئے یقیناً میں قارئین کرام کو اس شدت سے متاثر نہ کر سکوں گا جس نے مجھ جیسے جذباتی انسان کو پاگل پن کی حد تک پہنچا دیا تھا۔

میں ۲۴ اگست ۱۹۴۷ء کو موضع سرنا سے جو پٹھانکوٹ سے مغرب کی طرف تین میل کے فاصلہ پر نہر اپر باری دواب کے کنارے واقع تھا۔ جان جوکھوں میں ڈال کر اپنے مرحوم برادر بزرگ خان رمضان سرور خاں کے پاس لائل پور پہنچا تھا۔ کیونکہ لاہور سے جو کنوائے چلتا تھا اول تو امرتسر میں رک جاتا تھا، ورنہ بٹالہ اور حد گورداسپور تک پہنچتا تھا۔ سرنا کیمپ میں مہاجرین تک اس وقت صرف دو کنوائے پہنچے تھے۔ وہ بھی پرائیویٹ انتظام کے تحت، چونکہ میں نے بھائی جان مرحوم سے پانچسو روپے لے کر انتظام کے لیے لاہور پہنچا تاکہ اپنے بہن بھائیوں اور دوسرے اعزہ و اقربا کو سرنا سے لاسکوں لاہور سول سیکرٹریٹ میں ریفیوجی کمشنر جناب خواجہ عبدالرحیم صاحب[۱] کا دفتر تھا۔ ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ان سے ان کی لائل پور میں ڈپٹی کمشنری کی تعیناتی کے دوران بھائی جان مرحوم کی وجہ سے کافی نیازمندی چلی آ رہی تھی۔ عرض حال بیان کیا تو انہوں نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ بہت اچھا ہوا۔ یہ اصحاب بھی سرنا تک پرائیویٹ کنوائے لے جانا چاہتے ہیں آپ سب ملکر پروگرام ترتیب دے لیں معلوم ہوا کہ وہ جماعتِ اسلامی کے رہنما مولانا عبدالجبار غازی، آسٹریلوی انگریز نومسلم مولانا محمد اسد ہیں۔ ان کے ساتھ ہی جہاں تک میری یادداشت کا تعلق ہے، کمال پور یا جمال پور کے صراف عبدالعزیز بیٹھے تھے۔ طے پایا کہ ڈسٹرکٹ

---

[۱] خواجہ عبدالرحیم بیرسٹرایٹ لا مرحوم و مغفور تحریک پاکستان کے بیدار مغز دردمند مسلمان (مرتب)

ٹرانسپورٹ سروس والوں سے معاملہ طے کیا جائے۔ چنانچہ ڈسٹرکٹ ٹرانسپورٹ والے ۳۰ روپے فی بس کے حساب سے جانے پر رضامند ہو گئے۔

اگلے روز یعنی ۲۹ اگست ۱۹۴۷ء کو پانچ بسوں اور ایک ملٹری جیپ پر مشتمل یہ قافلہ روانہ ہوا۔ ان پانچ بسوں میں دو جماعت اسلامی، دو چوہدری عبدالعزیز اور ایک میری بس تھی۔ اس قافلہ میں مولانا عبدالجبار غازی، مولانا محمد اسد، عبدالمجید، اور ایک اور صاحب جو جماعت اسلامی سے تعلق رکھتے تھے۔

چوہدری عبدالعزیز۔ ماموں مرحوم مظفر خاں اور راقم الحروف کے علاوہ پانچ فوجی سپاہی اور صوبیدار میجر تھے۔ فوجیوں کے پاس ۳۰۳ رائفلوں کے علاوہ ایک سٹین گن بھی تھی۔ دوسرے واقعات سے صرفِ نظر کرتے ہوئے صرف اسی پر ہی اکتفا کرتا ہوں کہ ہمارا قافلہ شام کے قریب سرنا پہنچ گیا۔ وہاں نہر کے بائیں کنارے چوہدری نیاز محمد ایس ڈی او کی کوٹھی تھی۔ جو مہاجرین کا کیمپ بنا ہوا تھا۔ دائیں طرف جماعت اسلامی نے ایک کرٹھای سی بنا رکھی تھی جو دارالسلام کہلاتی تھی۔ رات کو ہم نے جماعت اسلامی کے بانی مولانا مودودی کے ساتھ کھانا کھایا۔ ان کی کتابیں پڑھ پڑھ کر میں ان کا بہت بڑا مداح بن چکا تھا۔ شوقِ ملاقات فزوں تر تھا۔ میں ان کی نہایت نفیس اور دلکش شخصیت سے بہت متاثر ہوا۔ اور دل ہی دل میں کہا کہ مولانا اپنی تحریر کی طرح نہایت صاف وشفاف شخصیت ہیں۔ ہماری تین بسیں کیمپ میں کھڑی تھیں اعلان کیا گیا کہ عورتیں، بچے، بوڑھے اور بیمار صرف بسوں میں سوار ہوں کوئی جوان مرد نہ بیٹھے۔ راتوں رات تینوں بسیں ٹھساٹھس بھر گئیں اندر اور چھت ایک برابر تھے جہاں کسی کا پاؤں جم سکا، وہیں کا ہو کر رہ گیا۔ جماعتِ اسلامی والی بسیں ان کے علاقہ میں رات بھر رہیں۔ صبح نو بجے کوچ کا وقت مقرر تھا۔ ملٹری والے بہت مستعدی سے چھوٹے چھوٹے معاملات کو نمٹا رہے تھے۔ صوبیدار صاحب بہت نیکدل اور ہمدرد انسان تھے۔ خود عورتوں اور بچوں کے لیے آسانیاں مہیا کر رہے تھے۔ ہر ایک کا دل انسانی ہمدردی سے ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ رواداری، تحمل، بردباری، ایثار اور باہمی

تعاون کا ایک ایمان افروز منظر تھا۔ صوبیدار صاحب نے ساڑھے آٹھ بجے "ریڈی" ہونے کا حکم دیا۔ اب انتظار صرف جماعتِ اسلامی کی بسوں کا تھا۔

صوبیدار صاحب اور میں جماعت اسلامی کے علاقہ میں گئے تاکہ صورتِ حال معلوم کر سکیں پتہ چلا کہ بسیں تیار کھڑی ہیں صرف مولانا صاحب کا انتظار ہے یہ سنکر ہمیں سخت تعجب ہوا کہ بسیں ہماری بسوں کے مقابلہ میں بالکل خالی نظر آ رہی تھیں معلوم ہوا کہ اس بس میں کتابیں اور اسلحہ بھرا ہوا ہے اسکی اگلی دو سیٹوں پر سات آٹھ افراد بیٹھے تھے۔ دوسری بس جس میں پردوں کا خصوصیت سے انتظام کیا گیا تھا۔ مولانا صاحب اور جماعتِ اسلامی کے رہنماؤں کی بیگمات واہلِ خانہ سوار تھیں۔ اس زمانہ میں ڈرایور کی سیٹ کے پیچھے دو متوازی سیٹیں ہوا کرتی تھیں۔ ایک سیٹ پر چند اصحاب بیٹھے تھے اور اگلی سیٹ بالکل خالی تھی۔ دونوں بسوں کی چھتیں خالی تھیں۔ یہ منظر دیکھ کر مجھے سکتہ سا ہو گیا۔ میں نے مولانا عبدالمجید سے جو سفر کے دوران کافی بے تکلف ہو گئے تھے، دریافت کیا کہ یہ کیا معاملہ ہے؟ کوئی بارات جا رہی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ پچھلی بس میں کتابوں کے نیچے اسلحہ ہے۔ وزن بہت زیادہ ہے۔ بس میں اس میں مزید بوجھ کی گنجائش نہیں رہی اور دوسری بس میں مولانا مودودی اور دوسرے علماء کے اہلِ خانہ ہیں۔ چونکہ پردہ کے سخت پابند ہیں اس لیے پردے لگائے گئے ہیں۔ میں نے انہیں کہا۔ مولانا ساری قوم کے سر پر سے پردہ چھین لیا گیا ہے۔ دوپٹے گلوں میں ڈالکر جوان لڑکیوں کو برہنہ نچایا جا رہا ہے۔ تمہیں ان چند بیبیوں کے پردہ کی پڑی ہوئی ہے۔ کیمپ میں دوسری خواتین پردہ دار بھی موجود ہیں جنہوں نے کبھی نیلے آسمان کو بھی ننگے سر نہ دیکھا ہو گا وہ بھی انہیں کی طرح لائقِ احترام ہیں ان کو ساتھ کیوں نہیں بٹھا لیتے۔ وہ کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکے۔ اتنے میں مولانا مودودی سفید شارکن کی اچکن، ریشمی چوڑی دار پاجامے سفید ململ کا کرتہ زیبِ تن کیئے خوشبو میں لبسے سرمہ لگائے سر پر کالی ٹوپی رکھے جس میں سے کالی رات کی طرح سیاہ پٹے باہر اپنی شان بے نیازی دکھا

رہے تھے، ہاتھ میں نازک سی چھڑی لیے شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ سے پانچ چھ مولانا ؤں کے جلو میں خراماں خراماں چلے آ رہے تھے۔ میں اس غمزدہ ماحول میں یہ شان بان دیکھ کر جل اٹھا۔ قوم پر قیامت بیت رہی تھی، اور یہاں یہ چونچلے، اندر ہی اندر کڑھ کر رہ گیا۔ مولانا عبدالجبار غازی اور دوسرے اصحاب پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ مولانا کے ساتھ اگلی پوری سیٹ پر دو افراد بیٹھ گئے۔ صوبیدار صاحب بسوں کا آخری معائنہ کر رہے تھے۔ میں شدتِ جذبات سے پاگل ہو رہا تھا۔ میں نے کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر مولانا صاحب سے مخاطب ہو کر نہ جانے کیا کچھ کہہ دیا۔ جو منہ میں آیا اگل دیا۔ وہ شدتِ احساس آج تک قائم ہے۔ میں نے مولانا صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

محترم المقام مولانا صاحب زندگی بھر یہ شوق رہا تھا کہ میں آپ آئیڈیل انسان سے شرفِ ملاقات حاصل کروں جس کی تحریروں نے مجھے سوچ بچار کے ایک نئے افق سے روشناس کرایا ہے۔ میں نے آپ کی تقریباً تمام کتابیں پڑھ لی ہیں۔ باوجود آپ سے سیاسی اختلاف کے آپ کے دینی مؤقف کا گرویدہ ہوں۔ علامہ اقبالؒ کے بعد میں آپ سے متاثر ہوا ہوں۔ اگرچہ معاملات تک (APPROACH) مختلف ہے مگر منتہائے مقصود ایک ہے۔ رات کھانے پر آپ کو دیکھ کر آپ کا احترام پہلے سے بھی دہ گنا ہو گیا تھا۔ مگر اس وقت آپ کے قول و فعل میں تضاد نے مجھے ہلا کر رکھ دیا ہے معلوم ہوا ہے کہ آپ کی طبیعت ناساز ہے۔ اس وقت ایک فرد کی نہیں ساری قوم کی طبیعت ناساز ہے۔ مسلمان قوم ایک قیامتِ کبریٰ سے دوچار ہے مسلمان قوم خون میں لتھڑی کراہ رہی ہے۔ نوجوان شہید ہو رہے ہیں۔ جوان عصمتیں لُٹ رہی ہیں قافلوں کے قافلے گاجر مولی کی طرح کٹ رہے ہیں دل خون کے آنسو رو رہے ہیں۔ ماں باپ اپنی اولاد سے۔ بہن اپنے بھائی سے بیوی اپنے شوہر سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا ہو رہی ہے، آپ نے اپنی تحریروں میں انسانی ہمدردی کے ہزاروں واقعات بیان کیے ہیں آپ نے اسوۂ حسنہ پر گامزن رہنے اور اعلیٰ انسانی اقدار کو اپنانے پر جتنا زورِ قلم صرف کیا ہے۔ کیا اس کا عملی نمونہ یہ ہے جو آپ پیش کر رہے ہیں۔ دور جانے کی ضرورت نہیں

یہ نہر کے اس پار کیمپ میں کئی مسلمان موت و حیات کے درمیان لٹک رہے ہیں۔ ان کو اپنے ساتھ پاکستان لے چلیں۔ آپ کی ان ہزاروں کتابوں سے ایک مسلمان کی زندگی زیادہ قیمتی ہے۔ آپ کے اہل خانہ کی طرح دوسری خواتین بھی قابلِ عزت و احترام ہیں ان کو بھی دوسری بسوں کی طرح اپنی بس میں بھر لیں۔ میں شدتِ جذبات سے پاگل ہو رہا تھا۔ قریب تھا کہ میں پھٹ پڑتا۔ مجھے صوبیدار صاحب نے وہاں سے ہٹا لیا۔ اور مجھے دم دلاسہ دے کر اپنی جیپ میں لے گئے۔ میں رو رہا تھا اور مجھے کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ قافلہ پاکستان کی جانب روانہ ہو گیا۔ ہم عین اس وقت گورداسپور پہنچے جبکہ ہمارے سروں کے اوپر شہید ملت لیاقت علی خاں اور پنڈت نہرو ہوائی جہاز میں سوار قافلوں کا سروے کرتے ہوئے گزر رہے تھے۔ رکنوائے روک لیا گیا۔ لوگوں کو پانی پینے اور پیشاب وغیرہ کرنے کا موقع مل گیا۔ ہم بھی اتر گئے۔ تھوڑی دیر بعد مجھے ایک آدمی نے بتایا کہ میرے ساتھ جو بزرگ تھے انہیں سکھ سپاہی پکڑ کر لے گئے۔ وہ ان سے اُن کی چھڑی کرپان سمجھ کر چھین رہا تھا اور وہ اسے دے نہیں رہے تھے۔ میں بہت حیران ہوا۔ پولیس کیمپ سامنے خیمہ میں واقع تھا۔ میں نے اندر جانے کی کوشش کی تو ایک سپاہی نے مجھے روک لیا۔ اس کش مکش میں اندر سے ایک پولیس افسر باہر آیا۔ دیکھتے ہی ہم دونوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا۔ وہ میری کلاس فیلو کرن بخشی کے والد پولیس انسپکٹر این سی بخشی تھے جو لائل پور میں ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۳ء تک تعینات رہے، بڑی گرمجوشی سے ملے۔ بھائی جان کا پوچھا۔ انہوں نے بتایا کہ لائل پور کا جو ہندو اور سکھ شرنارتھی یہاں سے گزرتا ہے رمضان سرور کی بہت تعریف کرتا ہے وہ مجھے کیمپ کے اندر لے گئے اور بڑی عزت سے بٹھایا۔ میں نے سب سے پہلے اپنے ماموں جان کی گلو خلاصی کرائی۔ پھر جس قدر باقی دوسری ضروریات میسر آسکتی تھیں بسوں پر سوار لوگوں کے لیے بھجوا دیں۔ بخشی صاحب نے لائل پوری ہونے کا حق ادا کر دیا۔ انہوں نے بھائی جان کے نام ایک نہایت رقت بھرا خط تحریر کر کے مجھے دیا۔ چلنے کا وقت آگیا۔ خدا کی قدرت دیکھیے کہ اسی بس کا ٹائر پنکچر ہو گیا جس میں مولانا مودودی سوار تھے۔ یہ حقیقت ہے فسانہ نہیں، نہ اس میں غلو ہے۔ نہ داستان سرائی۔ اس ابتلاء

کے دور میں بھلا زائد سکینی بس والوں کے پاس کہاں سے آتی ۔ اب ایک نئی مصیبت پیدا ہو گئی تھی ۔ نہ ساتھ لئے بنتی تھی نہ چھوڑے بنتی تھی ۔ صوبیدار صاحب نے مجھے کہا چونکہ انسپکٹر پولیس سے میرے کافی تعلقات ہیں ۔ اس لیے اسکی معرفت ایک ٹائر منگوایا جائے ۔ نے بخشی صاحب سے ایک ٹائر مہیا کرنے کے لیے کہا ۔ شہر میں کرفیو نافذ تھا ۔ ٹائر سے ملنا ۔ بہر صورت بخشی صاحب نے پتہ نہیں کہاں سے اور کسطرح ایک ٹائر منگوایا ۔ بدلا گیا اور قافلہ سوئے منزل مقصود روانہ ہوا ۔

لاہور پہنچ کر کئی دن بعد معلوم ہوا کہ کتابوں والی بس میں اسلحہ کی بجائے پریس مشینری بھری ہوئی تھی ۔ اوپر کتابوں کی تہہ جمائی ہوئی تھی ۔ چونکہ ان دنوں کنوائے والی بسوں کی تلاشی نہیں لی جاتی تھی ۔ اس لیے پریس صحیح سالم پاکستان پہنچ گیا ۔ (ایوب سرور خاں)

جناب ایوب سرور خاں صاحب تحریکِ قیامِ پاکستان کے صفِ اوّل کے کارکن ہیں ۔ انہوں نے تحریر فرمایا ہے کہ میں مولانا صاحب کا لٹریچر پڑھ کر بہت متاثر ہوا ۔ پھر شام کے کھانے میں ان کا سفید لباس دیکھ کر مزید اثر لیا کہ وہ اپنی تحریروں ہی کی طرح صاف و شفاف ہیں ۔ کیا خاں صاحب نے اُن کے فرمودات میں یہ نہیں پڑھا تھا کہ جنابِ مولانا کو نسلی اور پیدائشی مسلمانوں سے دور کا بھی علاقہ نہ تھا ۔ آخر وہ کیوں نسلی اور پیدائشی مسلمانوں کی ماؤں بہنوں اور بیٹیوں کو اپنی بسوں میں بٹھاتے اور انہیں پاکستان لاتے ۔ وہ پریس جس کا ذکر ایوب سرور خاں صاحب نے آخر میں کیا ہے ۔ وہ پریس نسلی پیدائشی مسلمانوں سے اس لیے عزیز اور ان کی نظر میں (یعنی مودودی صاحب) متاع گراں بہا تھا کہ اس سے آپ ایسا مزید مواد شائع کر سکتے تھے جس میں پیدائشی اور نسلی مسلمانوں کو مطعون کیا گیا تھا ۔ خاں صاحب آپ پہلے ان کی ظاہری صفائی اور قلمکاری پر مر مٹے پھر ان کی ہاتھ کی صفائی دیکھ کر کیوں سکتے میں آ گئے ۔ ؟ بزرگوں نے صحیح ہی تو کہا ہے کہ ہر چمکدار چیز سونا نہیں ہوتی ۔ رہا یہ کہ انہوں نے پریس کے علیحدہ علیحدہ کر کے رکھے ہوئے پرزوں

کو اسلحہ بتایا تو ان کے اسلام میں بوقت ضرورت جھوٹ بول لینے میں کوئی ہرج نہیں۔ اس موقع پر انہوں نے اپنی فیکٹری کا ڈھلا ہوا اسلحہ آپ کی تسلی و تشفی کے لیے استعمال کر لیا۔

(چوہدری حبیب احمد)

تحریکِ پاکستان اور جماعتِ اسلامی

جناب ابو سعید انور میرے رفقائے تحریکِ پاکستان میں سے ایک نامور کارکن ہیں۔ کارکنانِ تحریکِ پاکستان میں انہیں امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ میرے اس کتاب کے مرکزی اور محوری نکتہ کی تائید ان کی اس حقائق پرور تحریر سے بھی نمایاں ہے۔ آپ نے تحریکِ قیامِ پاکستان کی تاریخی صداقتوں کو بھی پیش کرنے کے ساتھ ساتھ مصالحانہ اور مفاہمانہ رویہ بھی اختیار کیا ہے۔ میں نے تاریخ تحریکِ قیامِ پاکستان کو محفوظ کرنے کی امکان بھر کوشش کی ہے۔ میری مفاہمت ناآشنائی کی قدر ہی نے جناب حمید نظامیؒ بانی نوائے وقت کے ایمان افروز سینے میں میرے لیے محبت و پیار اور شفقت کے جذبات و احساسات موجزن رکھے۔ انہیں اعتراف و اقرار تھا کہ میں نے زہرِ ہلاہل کو کبھی قند نہیں کہا۔ (خیر یہ بات ضمناً آگئی) میں خوش ہوں کہ جناب ابو سعید انور نے تاریخِ پاکستان کو مسخ کرنے والے صالحین کرام کو سیدھی راہ دکھانے کی سعی مشکور فرمائی ہے۔ اگر یہ حضرات قیامِ پاکستان کے بعد تاریخِ قیامِ پاکستان کو مسخ کرنے دینی لحاظ سے مولانا مودودی مرحوم کے تضادات کو چھپانے اور انکی تضاد بیانیوں اور قلابازیوں پر پردہ ڈالنے سے احتراز کرتے تو مجھے بھی برسہا برس ان کے تعاقب میں صرف کر کے یہ مواد جمع نہ کرنا پڑتا۔ (چوہدری حبیب احمد)

"نوائے وقت" (۱۴ اگست) میں بانی جماعتِ اسلامی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے مضمون کے سلسلے میں جو بحث شروع ہوگئی ہے۔ ابو سعید انور صاحب کے اس مضمون کے ساتھ اس کا سلسلہ بند کیا جا رہا ہے چنانچہ اس ضمن میں مزید مضامین و مراسلات شائع نہیں کیے جائیں گے

(ادارہ)

- جماعتِ اسلامی نے تحریکِ پاکستان کی مخالفت کی تھی۔
- جماعتِ اسلامی کے بانی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے فکرِ پاکستان عطا کیا ہے۔
- جماعتِ اسلامی تحریکِ پاکستان میں شریک نہیں تھی۔

ان موضوعات پر کچھ عرصہ سے نوائے وقت میں مضامین اور مراسلات شائع ہو رہے ہیں۔ ان میں سے بعض مضامین ایسے تھے جن سے جماعتِ اسلامی کے ہم خیال لوگوں کی ایک طرف اور تحریکِ پاکستان سے وابستہ لوگوں کی دوسری طرف ضرور دل شکنی ہوئی ہے۔ اندازِ بیان اور طرزِ استدلال میں جب طعن و تشنیع اور ملاحیوں کا عمل دخل ہو جائے تو تلخیاں بڑھتی ہیں، دلوں میں کدورت پیدا ہوتی ہے اور واضح مسائل بھی اُلجھ کر رہ جاتے ہیں۔

اس بحث کا آغاز دراصل امیر جماعتِ اسلامی میاں طفیل محمدؒ کے اس "انکشاف" کے طفیل ہوا کہ جماعتِ اسلامی کے امیرِ اوّل سید ابوالاعلیٰ مودودی نے تحریکِ پاکستان کو فکر عطا کیا اور اس طرح وہ شاعرِ مشرق اور قائداعظمؒ کے ہم پلہ یکے از بانیانِ پاکستان ٹھہرے۔ میاں طفیل محمدؒ ایک نیک دل بزرگ ہیں اور ظاہر ہے کہ جماعتِ اسلامی کے امیر ہونے کی حیثیت میں وہ یقیناً صالح انداز میں سوچتے اور پھر بولتے ہوں گے۔ مگر ان کی اس تتی پھلجھڑی نے خاصہ طوفان برپا کر دیا۔ آخرکار خود مولانا مودودی نے ان کے اس بیان کا نوائے وقت ۴ اگست میں ابطال کیا۔

بانی جماعت نے فرمایا :-

" زیادہ سے زیادہ اگر کچھ کہا جا سکتا ہے تو وہ بس یہ کہ ہم نے تحریکِ پاکستان میں حصّہ نہیں لیا۔

اظہارِ حقیقت کے بعد میاں طفیل کے بیان کی کیا حقیقت رہ جاتی ہے؟ ظاہر ہے کہ مولانا مودودی کسی ایسی تحریک سے کیوں کر پیچھے رہ سکتے تھے۔ جس کے "نئے فکر" ان کا اپنا عطا کردہ ہو؟ اگر مولانا مودودی نظریۂ پاکستان پیش کرتے تو پھر اس کے حصول کے لیے سوادِ اعظم نے جو تحریک چلائی تھی۔ اس سے کنارہ کشی یا اس کی

مخالفت کیوں کر گوارا کر سکتے تھے ؟ ظاہر ہے ایسا ہرگز نہیں تھا۔ مولانا موصوف کی اس تحریر سے ظاہر ہے کہ وہ صرف اسلامی نظامِ زندگی کے لیے کوشاں تھے۔ اسلامی ریاست کے قیام کے لیے نہیں۔ وہ اس خدشے سے تو آگاہ تھے کہ " وطنی قومیت کے جھوٹے، بے اصل اور سرفہرست نام سے غیر مسلم اکثریت کی جو نام نہاد جمہوری حکومت قائم ہوگی وہ مسلمانوں کے لیے تباہ کن ہوگی " مگر ان کا اسلامی نظامِ زندگی کہاں نافذ ہو گا ؟ اس کے لیے ان کے ذہنِ رسا نے ان کا ساتھ نہ دیا۔

۱۹۳۳ء سے قیامِ پاکستان تک وہ ایک جماعت تیار کرتے رہے۔ تاکہ ان کے تصوراتی اسلامی نظامِ زندگی کے نفاذ کا بندوبست ہو سکے۔ اس سلسلہ میں انہیں ۱۹۴۷ء تک پورے برصغیر میں صرف ۶۲۵ حضرات میسر آئے۔ بہرحال مولانا موصوف کو اصرار ہے کہ ان کا تحریکِ پاکستان میں شامل نہ ہونا ایک سوچا سمجھا ہوا اقدام اور فیصلہ تھا کیوں کہ ان کے بقول " جماعتِ اسلامی کے تحریکِ پاکستان میں شریک ہونے کے بعد بھی کیا یہ ممکن تھا کہ ہندوستان اور مقبوضہ کشمیر میں اسلامی نظامِ زندگی کی علمبرداری کا وہ فریضہ اتنے بڑے پیمانے پر انجام دیا جا سکتا جو جماعت اسلامی ۲۹ سال سے انجام دے رہی ہے۔

مولانا یہاں بنگلہ دیش کو بھول گئے۔ بہرحال ان کا دعویٰ شروع سے یہی ہے کہ وہ ایک عالمگیر اسلامی تحریک کے بانی ہیں جسے جغرافیائی حدود میں قید کرنا زیادتی ہے مولانا کا یہ دعویٰ اپنی جگہ مسلّم اور ثابت بھی مان لیا جائے تو یہ کیا محض اتفاقی بات ہے کہ ان کی جماعت بھی تحریکِ پاکستان کے جملہ مخالفین اور اکھنڈ بھارت کے حامیوں کی صفوں میں کھڑی نظر آتی ہے۔ ؟ قیامِ پاکستان سے پہلے جب بھی مسلم لیگ پر اس کے مخالف انگریز اور ہندو حملہ آور ہوئے تو انہوں نے ہمیشہ مسلم لیگ کو طعنہ دیا کہ تم مسلمانوں کے نمائندہ نہیں ہو۔ مجلس احرار، جمعیت العلماء، خاکسار، خدائی خدمت گار، جماعتِ اسلامی وغیرہ تمہارے موقف کے خلاف ہیں اور تمہاری قیادت قبول نہیں کرتے۔

کیا یہ بھی محض شوئے اتفاق ہے کہ اسلامی نظام کا داعی اپنے ترجمان القرآن اور مختلف مدوّن کتابوں سمیت مسلم لیگ کی مخالفت میں امام الہند ابوالکلام آزاد،

مولانا حسین احمد مدنی، مولانا مفتی کفایت اللہ، مولانا عطاءاللہ شاہ بخاری وغیرہ کی ہاں میں ہاں ملاتا نظر آتا ہے۔

مولانا مودودی کو یہ بھی اعتراف ہے کہ ۶۲۵ اصحاب کے شریک نہ ہونے سے پاکستان کا قیام تو نہ رک سکتا تھا" بالکل بجا ارشاد ہوا مگر جس کے ٹا پھیٹے پاکستان کے حصول پر مسلم لیگ اور اس کی قیادت کو ہدفِ ملامت بنایا جاتا ہے۔ اگر سنہ ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۶ء تک مسلمانوں کے اپنے گھر کے چراغ شعلہ انگیزی پر مصر نہ رہتے تو پاکستان کا یہ نقشہ نہ ہوتا۔ جماعتِ اسلامی کو اسلام سے اسقدر عشق ہوتا جس کی وہ دعویدار ہے تو یہ ۶۲۵ آدمی اپنی انانیت کو کچھ عرصہ کے لیے کیوں ایک طرف نہ رکھ سکے اور کم سے کم آٹھ کروڑ کلمہ گو مسلمانوں کو انگریز اور ہندو کی غلامی سے نجات دلانے کی تحریک میں شامل ہونا کیوں ضروری نہ سمجھا؟ لیکن جب گنہگار مسلمانوں کی قیادت میں برصغیر کے ضعیف مسلمانوں نے آزادی حاصل کر لی۔ تو جماعتِ اسلامی اس دعویٰ کے ساتھ میدانِ سیاست میں کود پڑی کہ "ہم بتائیں گے اسلامی ریاست کیا ہوتی ہے۔"

یہیں سے سارے فساد کی ابتدا ہوتی ہے جب آپ نے تحریکِ پاکستان کی مخالفت کی تھی یا بقول آپ کے اس میں حصہ نہیں لیا تھا تو کسی نے اس سے زیادہ تعرض بھی نہ کیا کہ محض شکوہ کے طور پر کبھی ذکر کر دیا ہو یا علم بیان سے کچھ ناواقف لوگوں نے غلط زبان میں بھی نکتہ چینی کر دی ہو۔ مگر اس سے زیادہ کچھ نہ ہوا۔ اس کے برعکس جماعت نے مخصوص انداز میں پاکستان کی اولین قیادت کو قائدِ اعظمؒ کی استثنا٭ کے ساتھ کشتنی اور گردن زنی قرار دینا شروع کیا۔ کوئی کہتا ہے کہ قائدِ اعظمؒ نے اپنے ساتھیوں کو کھوٹے سکے کہا تھا۔ سوال یہ ہے کہ کیا مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا حسرت موہانی، مولانا ظفر علی خاں، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولوی تمیز الدین خاں، خواجہ ناظم الدین

٭ استثنا کہاں؟ مودودی صاحب نے لکھا ہے کہ لیگ کے قائدِ اعظم سے لیکر اسکے مقتدیوں تک ایک بھی اسلامی ذہنیت نہیں رکھتا۔ باقی اس جماعت کے دیگر اہلِ قلم نے تو قائدِ اعظمؒ پر طرح طرح کی پھبتیاں کسی ہیں۔

(چودھری حبیب احمد)

سردار عبدالرب نشتر، نواب اسماعیل خاں، مولانا اکرم خاں تھوڑے سے تھے؟ ان میں سے بعض بزرگ یقیناً جماعت اسلامی کے قائدین سے کسی طرح کم درجہ مسلمان نہ تھے اور نہ حق و صداقت کے لیئے ان کی قربانیاں جماعت سے فروتر تھیں۔ پھر یہ اندازِ گفتگو کیا ہے؟

مسلم لیگ کے عظیم کارناموں کو جھٹلانا مناسب نہیں"

جماعتِ اسلامی کی موجودہ قیادت میرے خیال میں ایک احساسِ کہتری میں مبتلا ہے۔ بانی جماعت ان میں کچھ صلاحیتیں تو ضرور پیدا کر چکے ہوں گے۔ مگر زندگی کے انداز سکھانے سمجھانے کی طرف شائد توجہ نہیں دے سکے۔ چنانچہ یہ احساس کہتری انہیں غیر یقینی فضا میں اڑاتا رہتا ہے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی ذات اپنے حواریوں کے نت نئے انکشافات اور عجیب و غریب بیانات کی مرہونِ منت نہیں۔ ان کا اپنا اعلیٰ مقام ان کی اپنی علمی کاوشوں اور دلیرانہ زندگی کا ثمرہ ہے۔ انہیں اپنی قیادت کو چمکانے کے لیے ہرگز ایسے دعووں اور دلیلوں کی ضرورت نہیں کہ انہوں نے فلاں مسئلہ میں آج سے اتنے برس پہلے یوں فرمایا تھا اور اس طرح سمجھایا تھا۔ ان کی شخصیت قومی اور بین الاقوامی سطح پر ایک ارفع و اعلیٰ مقام رکھتی ہے۔ اس سے انکار محض حماقت ہے۔ رہا سوال تحریکِ پاکستان میں کام کرنے والے حضرات کے اعتراضات اور مسلسل اعتراضات کا تو اسی سلسلہ میں صرف اتنا عرض کرنا کافی ہے کہ بانیٔ پاکستان قائدِاعظم محمد علی جناحؒ نے مخالفینِ پاکستان سے کبھی تعرّض نہیں کیا بلکہ ہمیشہ اُن کے تعاون کے طلبگار رہے۔ ان کے جانشینوں نے بھی ایک عرصہ تک اس پر عمل کیا۔ تعزیراتِ پاکستان میں ایسی کسی شق کا اضافہ نہیں کیا گیا کہ جن لوگوں نے قیامِ پاکستان کی مخالفت کی تھی یا اس سے الگ تھلگ رہے تھے انہیں اتنے برس قید کی سزا دی جائے گی۔ یا انہیں ووٹ دینے کے حق سے محروم کیا جائے گا! جب ایسی کوئی بات نہ تھی اور نہ آج تک ہے۔ اور پاکستان کا ہر شہری مساوی درجے کا شہری ہے۔ تو کسی کو محض اسی بنا پر ہدفِ ملامت بنانا کہ ۱۴ راگست ۱۹۴۷ء سے پہلے اس کا رویہ مخالفِ پاکستان کا تھا۔

کسی طرح بھی جائز نہیں۔" ہر شہری کو بلا امتیاز ایک ہی کسوٹی پر پرکھنا چاہیئے کہ اس کا موجودہ کردار پاکستان کے مفادات کے مطابق ہے یا خلاف اس لیے ایسے تمام مباحث کو ختم کر دینا چاہیئے۔ جس سے نت نئے فتنے اٹھیں اور باہمی کدورتوں میں اضافہ ہو! جماعت اسلامی کو پورا حق ہے کہ وہ اس "قومی ریاست" کو اسلامی ریاست میں تبدیل کرنے کی کوشش کرے، مگر اس کے لیے اسے موعظہ حسنہ اختیار کرنا چاہیئے نشتر زنی اور تیر افگنی کا انداز نہیں۔

موجودہ ناگوار بحث خود موجودہ امیر جماعت اسلامی کے بیان کی پیدا کردہ ہے۔ اور میرے خیال میں جماعت اسلامی کے موجودہ طرز عمل اور سیاسی اقدامات سے نہ صرف جماعت کے وقار کو نقصان پہنچ رہا ہے بلکہ پاکستان میں اسلام کے لیے بھی (خاکم بدہن) ہزیمت کا بالواسطہ سامان پیدا ہو رہا ہے۔ بانی جماعت اسلامی نے جس ارفع و اعلیٰ مقصد کے لیے اپنی جماعت قائم کی تھی، اس کے اعمال سے یکسر الٹا نقشہ بنتا جا رہا ہے۔

جماعت اسلامی نے قیام پاکستان کے فوراً بعد "ماہرین اسلام" کا لبادہ اوڑھ لیا اور ان کی اس اجارہ داری میں اس قدر غلو اختیار کیا کہ اسلام کو سمجھنے سمجھانے اور نافذ کرنے کا حق صرف اور صرف جماعت اسلامی کو ہے۔ اس کے لیے انہیں اقتدار کی ضرورت رہتی۔ چنانچہ انتخابات میں حصہ لینا شروع کیا گیا لیکن ہر بار ان کے امیدوار ناکام ہوتے رہے۔ جس سے فائدہ اٹھا کر دین حق کی مخالف قوتوں نے برملا کہنا شروع کر دیا کہ مسلمانان پاکستان (نعوذ باللہ) اسلام میں دلچسپی نہیں رکھتے حالانکہ ایسا نہیں ہے انتخابات میں ناکامی جماعت اسلامی کی پالیسی اسکی غیر سیاسی حرکتوں اور اپنی جماعت کی رکنیت محدود و مسدود رکھنے دوسروں کی بات نہ سننے اور اپنی بات سنانے پر بجا

لہ تاریخی کردار تو تاریخ پاکستان قیامت تک دہراتی رہے گی۔ اور یہ سایہ کی طرح ان کے ساتھ ساتھ چلے گا جیسے کہ قرآن عزیز میں بولہب کا مذموم کردار مذکور ہے۔ تحریک قیام پاکستان کے بولہبوں اور ابوجہلوں کے سیاہ کارنامے دہرائے جاتے رہیں گے ۔

(مرتب)

[ک]ردار کا نتیجہ تھی۔ بہرحال جماعت اسلامی کو اپنے اصلی مشن کے علاوہ سیاست کے میدان [می]ں بھی دوسری جماعتوں کی طرح پورا حق ہے کہ وہ ملک میں مروجہ آئینی اور جمہوری [ط]ریقوں سے عنانِ اقتدار اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کرے مگر درمندانہ التجا ہے کہ [و]ہ اپنے ہر اچھے بُرے فعل کے لیے اسلام سے جواز ڈھونڈنے یا اپنی غلطیاں اسلام کے [کھ]اتے میں ڈالنے کی روایت ترک کر دے۔

نوائے وقت میں جماعت اسلامی کے قیام پاکستان سے قبل کے کردار کے سلسلے [م]یں مخالف و موافق جو مضامین و مراسلات شائع ہوئے اگرچہ ان میں رُوئے سخن زیادہ [ت]ر جناب سلیری کی طرف تھا مگر ان میں کئی ایسی باتیں بھی کہی گئی ہیں کہ تحریک پاکستان سے تعلق رکھنے والے یا مسلم لیگ کے ہراول دستے میں شامل اصحاب کو ان کا جواب دینا چاہیئے۔ ان مضامین و مراسلات کا لب و لہجہ اگرچہ شدت اور نفرت سے بھرپور ہے مگر میری کوشش یہ ہے کہ تلخی پیدا نہ ہو۔

میرے پیشِ نظر اسوقت وہ خطوط ہیں جو نوائے وقت (۱۶ اور ۱۷ ستمبر) میں شائع ہوئے تھے۔ ایک صاحب عصمت اللہ ملک کے خط کا مقصد اس کے سوا کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ شریکِ بحث ہو سکتے ہیں۔ انہوں نے سید مودودی کے مضمون اور سلیری صاحب کے سوالات کو آگے پیچھے کر کے لکھ دیا ہے البتہ کہیں کہیں ایک آدھ فقرہ اپنی طرف سے چسپت کر دیا ہے کر دیا ہے اُن کے بقول جماعت اسلامی کے متعلق یہ تاثر کہ وہ مخالفِ پاکستان تھی، جماعت کے مخالفین نے اطلاعات و نشریات کے تمام ذرائع کنٹرول میں ہونے کی بنا پر پیدا کیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا قیام پاکستان سے پہلے اس قسم کا کوئی کنٹرول تھا۔ اگر کبھی ہندو پریس گلا گھونٹتا تھا، تو صرف مسلم لیگ کی خبروں اور اس کے قائدین کے بیانات کا، اس کے برعکس نیشنلسٹ مسلمانوں کی جماعتوں خدائی خدمتگار، مجلس احرار، جمعیت علماء اسلام وغیرہ کے ساتھ جماعت[1] اسلامی کو بھی ہندو پریس میں پوری پبلسٹی ملتی تھی۔

---

[1] پٹنہ کے جماعت اسلامی کے اجلاس میں مہاتما گاندھی شریک ہوئے اور انہوں نے

انہیں جناب سیفری کے اس دعویٰ پر اعتراض ہے کہ مسلم لیگ نے تن تنہا یہ ملک حاصل کیا۔ حالانکہ یہ اس فکر کا ثمرہ ہے جس کی آبیاری شاہ اسمٰعیل شہید، سید احمد بریلوی نے بھی کی تھی۔ اسلاف کی قربانیوں سے مسلم لیگ نے کبھی انکار نہیں کیا۔ ان بزرگوں کے علاوہ بھی بہت سی شخصیتیں اور طاقتیں تھیں جنہوں نے مسلم انڈیا کی نشاۃ ثانیہ میں حصّہ لیا۔ مگر مقصد کے حصول کا ذریعہ یہی مسلم لیگ ٹھہری۔ اس سے انکار "تاریخی بخیلی کے سوا اور کچھ نہیں۔

انہیں مسلم لیگیوں کی اکثریت پر بھی اعتراض ہے۔ دراصل یہ بغض بول رہا ہے جب ساری قوم ہی مسلم لیگ تھی، تو وقت گزرنے پر اس میں اختلافات پیدا ہونے ضروری تھے۔ عظیم نصب العین کے لیے تو سب ایک جھنڈے تلے جمع تھے۔ پھر نظریات، ذاتی خواہشات اور پسند ناپسند کی بنیاد پر الگ الگ جماعتیں بنائی گئیں یا ہوسِ اقتدار میں کمزور روحوں نے ہر حکومت کا ساتھ دینا شروع کر دیا۔ بہر حال لاکھوں ارکان والی جماعت سے علیحدہ ہونے والے ہی جماعتیں بنا سکتے تھے۔ برسوں کی کاوش کے باوجود جس جماعت کے ارکان کی تعداد چند سو سے آگے نہ بڑھے اس سے علیحدہ ہونے والے کتنی جماعتیں بنا سکتے ہیں۔ ویسے مولانا امین احسن اصلاحی، کوثر نیازی ڈاکٹر اسرار احمد، صفدر صدیقی کی علیحدگی تو ہم نے سُنی تھی چند اور بھی ہوں گے جن سے ہمیں نیاز حاصل نہیں۔

امتیاز حسین فاروقی نے (۷ ستمبر) کئی سوالات اٹھائے ہیں اور ان میں سے اکثر کا تعلق مولانا مودودی کی ذاتِ گرامی سے ہے۔ مگر ان کا خط اس بات کا مظہر ہے کہ وہ اس بحث سے بہت رنجیدہ ہیں۔ لیکن سرگودہا والے ڈاکٹر محمد سعید قریشی تو تمام حدیں پھلانگ گئے ہیں ان کی طعن و تشنیع کے انداز سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندو مہاسبھا کا کوئی نمائندہ مسلم لیگیوں کو للکار رہا ہے۔ البتہ انہوں نے اپنی

ان کے ایک مقرر کی تقریر سُنکر کہا کہ میں بہت خوش ہوا ہوں خوش کیوں نہ ہوتے۔ تقریر بھی تو مسلم لیگ اور پاکستان کے خلاف تھی۔ (مرتب)

صاف گوئی سے کام لیا ہے کہ یہ اعتراف کیا ہے کہ اس پاکستان کے قیام میں ان کی جماعت کا کوئی دخل اور حصہ نہیں تھا جو مسلم لیگ کی بزدلی بر صغیر کی غلط تقسیم سے معرض وجود میں آیا۔ لیکن اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جو تکلف خود سید مودودی نے اپنے ۱۴ اگست والے مضمون میں برتا۔ ان کے حواری اس سے بدستور بے نیاز ہیں۔

جماعت اسلامی کے نام لیواؤں کے ان مضامین و مراسلات میں مجموعی طور پر اور شروع سے آخر تک مسلم لیگ پر تابڑ توڑ حملے کیئے گئے ہیں۔ جن میں کوئی تخصیص روا نہیں رکھی گئی۔ نئی جماعتیں بنانے، روٹ پرمٹ اور لائسنس لینے اور لوٹ کھسوٹ کے طعنے بھی دیئے گئے ہیں۔ ان الزامات کی صحت سے ہرگز انکار نہیں۔ لاکھوں کارکنوں میں کچھ ایسے بھی ضرور ہوں گے۔ جن پر یہ الزامات درست ہیں مگر آج بھی اللہ کے فضل سے آپ کو بڑی تعداد میں مسلم لیگ کے موجودہ اور سابق کارکن مل جائیں گے۔ جن کے دامن ایسی آلائشوں سے پاک ہیں۔ اور اکثر ایسے بھی ہیں جنہوں نے تحریک پاکستان میں بڑی قربانی دی۔ مگر اب عسرت اور گمنامی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ قربانی اور صبر و ضبط پر صرف جماعت والوں کا ہی اجارہ نہیں، عام مسلمان بھی ارفع و اعلیٰ کردار کے مالک ہوتے ہیں۔

جماعتِ اسلامی نے گزشتہ تیس برس میں اپنے موقف کی حمایت میں ایک سے زیادہ مرتبہ ایسا رویہ اختیار کیا کہ فضا مکدّر ہو گئی اور جذبات کی شدّت خود جماعت کو بھی اس کے مقصدِ عظیم سے دور لے گئی۔ اگر مولانا مودودی کا اپنی بنا کردہ جماعت میں اثر و نفوذ پہلے کی طرح قائم ہے تو یقیناً جماعتِ اسلامی کے لیئے "اسلامی ریاست" بنانے کے بہت اچھے مواقع ہیں مگر اس کے لیے خالصتاً اسلامی کردار کی ضرورت ہے۔ اس لیے جماعتِ اسلامی کو منفی اور جارحانہ حکمت عملی سے گریز کرنا چاہیئے اور وقتاً فوقتاً ایسے مباحث میں الجھ کر اپنے اور دوسروں کے لیے دردِ سر پیدا کرنے کی کوشش نہ کرنی چاہیئے۔

پاکستان کو ایک اسلامی ریاست بنانے کا مقصد بہت نیک ہے اور جماعت اسلامی کے ساتھ کئی دوسری جماعتیں بھی اس بات کی مدعی ہیں یہ ملک اسلامی ریاست، کب اور کس کے ہاتھوں بنتا ہے، اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ مگر اس مقدس مقصد کو مسلمانوں میں وجہ فساد و انتشار نہیں بنانا چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق عطا فرمائے کہ ہم اس نیک مقصد کے حصول کے لیے طریق کار اور ذرائع بھی نیک اور درست استعمال کریں۔

لمعات مرقومہ ۲۰ ستمبر ۱۹۷۹ء پیش خدمت کر رہے ہیں تاکہ ماضی وحال و مستقبل نکھر کر آپ کے سامنے آجائے اور حقائق ابھر کر آپ کو دعوت فکر دیں۔

مرتب

"پنڈت جواہر لال نہرو ایک طرف تقسیم ہند کی دستاویز پر دستخط کر رہے تھے۔ اور دوسری طرف اپنی قوم سے کہہ رہے تھے کہ:

"ہماری اسکیم یہ ہے کہ ہم اس وقت مسٹر جناح کو پاکستان بنا لینے دیں اور اس کے بعد معاشی طور پر یا دیگر انداز سے ایسے حالات پیدا کرتے جائیں جن سے مجبور ہو کر مسلمان گھٹنوں کے بل جھک کر ہم سے درخواست کریں کہ ہمیں پھر سے ہندوستان میں مدغم کر لیجئے۔"

(مرحوم) مشرقی پاکستان کے اندر ایسے حالات پیدا کرنے میں ہندوؤں کے لیے کوئی دشواری نہیں تھی۔ وہاں قریب ڈیڑھ کروڑ ہندو تھے۔ جن سے کہدیا گیا کہ وہ وہیں رہیں ——— وہ صرف تعداد میں اتنے کثیر نہیں تھے، اُن کی حیثیت بھی ایسی مؤثر تھی کہ وہاں کے مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبے پر چھائے ہوئے تھے مغربی پاکستان میں یہ کیفیت نہیں تھی اس لیے یہاں تخریبی حالات پیدا کرنے کے لیے ہندوستان سے تخریب کار عناصر کو یہاں بھیجنا ضروری تھا۔ ہندوؤں کی دور رس نگاہ نے بھانپ لیا تھا کہ یہاں کے عوام پر مذہب کی گرفت بڑی مضبوط ہے اس لیے یہاں وہ حالات جن کی طرف پنڈت نہرو نے

اشارہ کیا تھا مذہب کے نقاب ہی میں پیدا کیئے جا سکتے ہیں۔ اس لیے ضرورت تھی ایسی مذہبی جماعتوں کی جو تشکیل پاکستان کی دل سے مخالف ہوں۔ ان جماعتوں میں پیش پیش جمعیت علماء ہند اور جماعت اسلامی تھیں۔ انہوں نے منظم اور مسلسل انداز سے تحریک پاکستان کی مخالفت کی تھی۔ جمعیت العلماء ہند سے وابستگان جس کے اس زمانے کے سربراہ مفتی محمود کے پیر و مرشد اور استاد مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) تھے، کھلے بندوں کانگریس کے ساتھ تھے، انہیں کہا ہی کانگریسی علماء جاتا تھا۔ اس لیے ان پر ہندوؤں کو پورا پورا اعتماد تھا۔ جہاں تک جماعت اسلامی کا تعلق ہے۔ انہوں نے سات سال تک تحریک پاکستان کی ناکام مخالفت کے بعد اپریل ۱۹۴۷ء میں مسلمانوں کے اقلیتی صوبوں میں جاکر انہیں ورغلانا شروع کیا تھا کہ تشکیل پاکستان کے بعد تم پر جو قیامت ٹوٹے گی اس سے محفوظ رہنے کی اب ایک ہی صورت ہے کہ تم تقسیم ہند کی مخالفت کرو۔ اس سلسلے میں ان کا جو اجلاس پٹنہ میں منعقد ہوا تھا۔ اس میں خود مہاتما گاندھی نے شریک ہو کر اطمینان ومسرت کا اظہار کیا تھا۔ ملاحظہ ہو روئیداد جماعت اسلامی حصہ پنجم ص۱۷۲)

جمعیت العلماء ہند سے مفتی محمود یہاں کے رہنے والے تھے اور دیوبندی علماء کچھ تو پہلے یہاں پھیلے ہوتے تھے اور کچھ بعد میں آگئے اور انہوں نے مساجد اور مکاتب سنبھال لئے۔ جماعت اسلامی کا مسکن ضلع گورداسپور کی بعید ترین تحصیل پٹھانکوٹ میں واقع تھا جو ہندوؤں کا گڑھ تھی۔ وہاں سے یہ جماعت نہایت امن و امان سے پاکستان پہنچ گئی حالانکہ اس ضلع کے ان علاقوں کے مسلمان بھی جہاں ان کی اکثریت تھی، بری طرح لٹے پٹے اور قتل ہوتے تھے۔ ہم کسی کے خلاف بہتان نہیں تراشا کرتے۔ لیکن قرائن کی بعض شہادات ایسی ہوتی ہیں جن کی بنا پر انسان بآسانی کسی نتیجے پر پہنچ سکتا ہے۔ ہندوستان میں مودودی صاحب[1] کی کوئی نمایاں حیثیت نہیں تھی نہ ہی جماعت اسلامی کوئی اہم

---

[1] طلوع اسلام نے لکھا ہے کہ کاپیاں پریس میں جا رہی تھیں کہ مودودی صاحب کی وفات کی خبر موصول ہوئی۔ معمول کے مطابق انہیں مرحوم لکھنا چاہیئے تھا۔ (مرتب)

سیاسی مقام کی مالک تھی۔ یہاں پہنچنے پر انہوں نے جو پہلا بیان دیا اس میں تقسیم ہند کی روئیداد بیان کرنے کے بعد کہا تھا کہ

"یہ بحث ان سب لوگوں کا منہ کالا کر دینے والی ہے، جنہوں نے ربع صدی میں ہماری سیاسی تحریکوں کی قیادت فرمائی ہے۔ ..... یہ ساری جماعت بازیگروں سے پٹی پڑی تھی۔ جنہوں نے عجیب عجیب قلابازیاں کھا کر دنیا کو اپنی بودی سیرت اور کھوکھلے اخلاق کا تماشا دکھایا اور اس قوم کی رہی سہی عزت بھی خاک میں ملا دی جس کے وہ نمائندے بنے ہوئے تھے۔"
(ترجمان القرآن جون و اگست ۱۹۴۸ء)

یہ کون لوگ تھے جن کا منہ کالا کر کے ان کی بودی سیرت اور کھوکھلے اخلاق کا تماشا دنیا کو دکھایا جا رہا تھا؟ ان میں سرفہرست مملکتِ پاکستان کا گورنر جنرل قائداعظم محمد علی جناحؒ اور اس کے بعد حکومتِ پاکستان کے جملہ اعیان و ارکان شامل تھے، آپ سوچئے کہ ایک شخص جو بے گھر اور بے در، اس ملک میں پناہ لینے آیا ہو، اس کے گورنر جنرل اور اربابِ حکومت کے خلاف ایسا کچھ بے باکانہ کہنے کی از خود جرأت کر سکتا تھا؟ ایسا قطعاً ناممکن تھا۔ جب تک اس کے پیچھے کوئی بہت بڑی مضبوط طاقت نہ ہوتی جس کے بل بوتے پر وہ ایسا کہنے کی جسارت کر سکتا۔ اس کے بعد انہوں نے ملک کے بڑے بڑے شہروں میں جلسے کئے اور ان میں یہی زہر پھیلاتے چلے گئے۔ ظاہر ہے کہ ان دوروں اور جلسے جلوسوں کے لیے کافی اخراجات درکار تھے۔ سوال یہ ہے کہ ان کے پاس یہ روپیہ کہاں سے آیا۔ یہ تو کسی صورت باور نہیں کیا جا سکتا کہ قیامِ پاکستان کے فوری بعد یہاں ایسے ایسے سرمایہ دار موجود تھے جنہوں نے تخریبِ پاکستان کے لیے اس قدر سرمایہ اس جماعت کے حوالے کر دیا تھا۔ پھر یہ روپیہ کہاں سے آیا تھا؟ تقسیم ہند کے مطالبہ کیخلاف اس قسم کی دلیلیں دیا کرتے تھے کہ:

"یہ لوگ ہندوستان کے ایک ذرا سے کونے میں پاکستان بنانے کو اپنا انتہائی مقصد بنائے ہوئے ہیں۔ لیکن اگر یہ فی الواقعہ خلوصِ قلب سے اسلام کی نمائندگی کے لیے کھڑے ہو جائیں تو سارا ہندوستان پاکستان بن سکتا ہے۔ ..... اگر یہ لوگ

تحریک پاکستان کے بجائے میری دعوت کو قبول کر لیتے تو دو چھوٹے چھوٹے پاکستانوں کی جگہ سارے ہندوستان کے پاکستان بن جانے کے امکانات ان کی آنکھوں کے سامنے ہوتے۔" (روئداد جماعت اسلامی حصہ پنجم صفحہ ۱۶۵ و ۱۷۰)

ایک طرف عوام کے دل میں یہ خلش پیدا کرنے کی کوشش کی گئی کہ تقسیم ہند کی تجویز اور مطالبہ مسلمانوں اور خود اسلام کے خلاف تھا اور دوسری طرف ان کے دل میں یہ زہر بھرتے چلے گئے کہ ان لوگوں نے جو دعویٰ کیا تھا کہ اس خطۂ زمین کو اس لیے حاصل کیا گیا ہے کہ اسے اسلامی مملکت بنایا جائے دھوکہ تھا، فریب تھا، فراڈ تھا۔ ان کے الفاظ میں :-

"یہاں معاملہ یہ ہے کہ پاکستان حاصل کرنے کے لیے بڑی کوششیں کی گئیں، اور یہ حاصل اس لیے کیا گیا کہ ہم یہاں اسلامی قوانین نافذ کریں گے۔ پاکستان کا مطلب لا الہ الا اللہ بیان کیا گیا۔ لاکھوں آدمیوں کی جانیں کٹوا دی گئیں۔ لاکھوں آدمیوں کی عزتیں گنوا دی گئیں۔ لاکھوں کی جائیدادیں تباہ کروا دیں ....
میں کہتا ہوں کہ اس سے بڑا فراڈ دنیا میں کوئی نہیں ہو سکتا۔ جو کیا گیا اور اس سے زیادہ دھوکا بازی کوئی نہیں ہو سکتی کہ ملک حاصل کرتے وقت تو نام اسلام کا لیا جائے مگر پھر ارادہ کر لیا جائے کہ یہاں اسلام کو نافذ نہیں ہونے دیا جائے گا۔" (ایشیا مورخہ ۹ مئی ۱۹۷۶ء)

اس سے لازماً یہ سوال سامنے آتا تھا کہ اس مملکت کو اسلامی بنانے کے لیے کیا کیا جائے؟ انہوں نے اس کا جواب ان الفاظ میں دیا :-

"میں واضح طور پر یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اسلامی قانون کا نفاذ اگر ہو سکتا ہے تو صرف اس طرح ہو سکتا ہے کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار ہے ان کو اقتدار سے ہٹایا جائے اور ملک کا اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ میں منتقل ہو جو اسلام کو جانتے بھی ہیں، دل سے مانتے بھی ہیں۔ اور اس کو نافذ کرنے کا ارادہ بھی رکھتے ہیں۔ ایسے لوگ موجود ہیں اور جس روز ان کے ہاتھ اقتدار آئے گا، اس کے دوسرے روز اسلامی احکام نافذ ہو جائیں گے" (ایشیا ۹ مئی ۱۹۷۶ء)

یہاں سے بات نکھر کر سامنے آگئی۔ علامہ اقبالؒ نے پاکستان کا تصور دیتے وقت اور قائداعظمؒ نے پاکستان کی تشکیل کے وقت یہ کہا تھا کہ اس مملکت کے لیے سب سے بڑا خطرہ تھیاکریسی ہے اور ہم یہاں تھیاکریسی قائم نہیں ہونے دیں گے۔ مودودی صاحب نے قریب تیس سال کی مسلسل اسکیموں اور سازشوں کے بعد بالآخر اس کا اعلان کر دیا کہ یہاں تھیوکریسی قائم کی جائے۔ اس مقصد کے لیے مذہب پرست جماعتوں نے ایک متحدہ محاذ قائم کیا۔ ان جماعتوں کے باہمی اختلاف کی شدت کا یہ عالم تھا کہ مفتی محمود نے اعلانیہ مودودی صاحب کے خلاف یہ فتویٰ صادر کیا تھا کہ وہ کافر، دائرہ اسلام سے خارج اور امریکہ کے ایجنٹ ہیں۔ مفتی صاحب اور نورانی صاحب کے باہمی اختلاف کی یہ کیفیت تھی کہ اس اتحاد کے دوران بھی وہ ایک دوسرے کے پیچھے نماز تک نہیں پڑھتے تھے۔ ۔۔۔۔۔ آپ سوچیے کہ جو لوگ ایک دوسرے کو کافر کہیں اور نماز تک میں متحد نہ ہوسکیں وہ نظامِ مصطفےٰؐ قائم کر سکتے تھے؟ اس تحریک سے مقصد یہ تھا کہ یا تو (مودودی صاحب کی منشاء کے مطابق) براہِ راست اقتدار حاصل کر لیا جائے اور اگر جستِ اوّل میں ایسا ممکن نہ ہو تو جو بھی حکومت قائم ہو اس کے دل میں یہ دھاک بٹھا کر یہ خیال راسخ کر دیا جائے کہ اس ملک میں مذہبی پیشوائیت کی تائید و حمایت کے بغیر کوئی حکومت قائم نہیں رہ سکتی۔ اس طرح بالواسطہ اقتدار حاصل ہو جائے گا۔ چنانچہ یہ حضرات اس مقصد میں کامیاب ہوگئے اور انہوں نے مسلسل پراپیگنڈہ سے زور پہ "شرعی قوانین" کے نفاذ کی طرح ڈال دی۔ اس کی قسط اوّل چند شرعی حدود کی شکل میں نافذ ہوچکی ہیں اور اس کے بعد کے اقدامات زیرِ غور ہیں۔ جیسا کہ کہا جا چکا ہے یہ تھیاکریسی ہی کی ایک شکل ہے۔ تھیاکریسی کے معنی ہوتے ہیں مذہبی پیشوائیت کے خودساختہ قوانین کو مملکت کے قوانین کی حیثیت سے نافذ کرنا اور "خدا اور رسول کے قوانین" کہہ کر ان کی اطاعت کرانا۔ علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ نے تھیاکریسی کو مملکت کے لئے سب سے بڑا خطرہ قرار دیا تھا۔ تھیاکریسی کی اس ابجد سے پاکستان میں جو خطرات ابھر کر

سامنے آرہے ہیں ان سے اس خطرہ کی نمایاں شہادت مل رہی ہے۔ مختصر الفاظ میں یہ دیکھیے کہ شرعی سزاؤں کے سلسلے میں شیعہ اور سنّی حضرات اپنی اپنی فقہ کو اسلامی تصوّر کرتے ہیں لیکن اُن کے اختلافات مناظروں اور مباحثوں سے آگے نہیں بڑھتے تھے۔ لیکن جب ان مسائل کو مملکت کے قوانین کی حیثیت سے نافذ کر دیا گیا تو ان کے باہمی اختلافات نظری اور مبحثی نہ رہے۔ چنانچہ شیعہ حضرات نے اعلانیہ کہہ دیا کہ اگر ہمیں ان قوانین کی اطاعت پر مجبور کیا گیا تو ہم کوئی دوسری راہ اختیار کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ آپ سوچیے کہ تھیاکریسی کے اس قدم اوّل سے مملکت کی بنیادوں میں کسی قسم کے تنزل کے خطرات نمودار ہو رہے۔ اس کے ساتھ ایک دوسرا گوشہ بھی سامنے لائیے۔ شرعی حدود سے متعلق قوانین، ۹۔ فروری کو نافذ ہوتے اور اس کے دو ہی دن بعد خود صدر مملکت نے کہہ دیا کہ یہ ناممکن العمل ہیں لیکن مذہبی پیشوائیت نے اپنی سوچی سمجھی سکیم کے مطابق اسے پروپیگنڈے کا حربہ بنا لیا یعنی پہلے تو یہ حضرات کہتے تھے کہ یہاں کے ارباب حکومت فریب کار ہیں جو اسلامی قوانین نافذ کرنا نہیں چاہتے۔ اور اب کہتے ہیں کہ موجودہ حکومت نے قوانین تو نافذ کر دیے ہیں لیکن یہ ان پر عمل نہیں کرا رہی۔ یہ پروپیگنڈہ عوام میں پھیلایا جا رہا ہے جہاں تک ہماری نئی نسل کا تعلق ہے وہ اعلانیہ کہہ رہے ہیں کہ اگر یہی وہ اسلام تھا جس کے لیے پاکستان قائم کیا گیا تھا تو اس سے تو سیکولر نظام ہزار بہتر تھا۔

آپ سوچیے کہ کیا ہماری مذہبی جماعتوں نے یہاں وہ حالات پیدا نہیں کر دیے جن کی طرف پنڈت جواہر لال نہرو نے تقسیم ہند کی دستاویز پہ دستخط کرتے وقت اشارہ کیا تھا.... یہ حضرات اپنی اس کامیابی پر خوش تو ضرور ہوں گے لیکن یہ فطرت کی نگاہوں کو نہیں دیکھ سکتے جو ان کی اس خود فریبی پر مسکرا رہی ہے۔ تخریب سازی کی تلوار دو دھاری ہوتی ہے۔ اگر یہ اپنے مخالف کو مضروب کرتی ہے تو پلٹ کر اس سے کہیں زیادہ زخم خود تلوار چلانے والے کو بھی لگاتی ہے۔ قرآنِ کریم نے جو کہا ہے کہ تخریبی تدابیر پلٹ کر ان تدابیر کرنیوالوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا کرتی ہیں تو اس سے

یہی مراد ہے۔ یہ حضرات جسے اپنی کامیابی سمجھ رہے ہیں، وہ درحقیقت ان کی سب سے بڑی ناکامی ہے۔ جب تک انہوں نے اپنے آپ کو خالص مذہبی دائروں تک محدود رکھا لوگوں کے دلوں میں ان کی عزت اور احترام تھا۔ لوگ ان کے پاؤں بھی چومتے تھے اور نذرانے بھی پیش کرتے تھے۔ لیکن ہوسِ اقتدار کی مدہوشیوں سے ان سے ان سے جو حرکات سرزد ہوئی ہیں ان سے یہ بالکل برہنہ ہو کر لوگوں کے سامنے آگئے ہیں۔ کیا یہ حقیقت عبرت انگیز اور فطرت کا انتقام نہیں کہ آج ملک میں سب سے زیادہ قابلِ نفرت یہی طبقہ ہے۔ یہ تو ابھی قدمِ اوّل ہے تاریخ کے اوراق اس پر شاہد ہیں کہ تھیاکریسی کا انجام یہ ہوتا ہے کہ مذہبی پیشوائیت کا وجود ہی ختم ہو جاتا ہے۔ یورپ، روس، چین کا سیکولر نظام تھیاکریسی کے ردِّ عمل ہی کا پیدا کردہ ہے۔ ہمارے ہاں کی مذہبی پیشوائیت نے سیکولر نظام کے لیے زمین ہموار کر دی ہے لیکن انہیں اپنی اس کامیابی پر خوش نہیں ہونا چاہیئے۔ سیکولر نظام میں مذہب جاتا ہے ساتھ ہی مذہبی پیشوائیت کا وجود بھی ختم ہو جاتا ہے۔ ہندوستان میں دیکھئے، وہ قوم مذہب میں گلے گلے تک ڈوبی ہوئی تھی اور برہمن کے اشلوکوں کے بغیر وہ لقمہ تک اٹھا نہیں سکتے تھے۔ چند سالوں کے سیکولر نظام سے نہ وہ اشلوک باقی رہے نہ اشلوک پڑھنے والے پنڈت۔ جواہر لال نہرو پاکستان میں ایسے ہی حالات پیدا کرنا چاہتا تھا، سو وہ اس میں کامیاب ہو گیا اور اسے کامیاب بنانے والوں نے سوچا ہی نہیں کہ اس سے انہیں کس قدر ذلت آمیز شکست ہوئی۔

؏ حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

یہ صورتِ حالات بظاہر بڑی یاس انگیز ہے لیکن جن کی نگاہیں قرآن پر ہیں وہ نہ صرف یہ کہ ان حالات کی وجہ سے مایوس نہیں بلکہ وہ انہیں قرآنی اقتدار کے لیے بڑا سازگار پاتے ہیں۔ قرآن نے الا اللہ تک پہنچنے کے لیے لا الٰہ کی منزل کو ناگزیر قرار دیا ہے۔ مذہبی پیشوائیت کے خلاف اس قدر عام نفرت اور ان کے پیش کردہ مذہب کے خلاف سرکشی، لا الٰہ ہی کے مظاہر ہیں۔ اس کے بعد الا اللہ کے لیے راستہ ہموار ہو جائیگا۔

اقبالؒ کے الفاظ میں:۔ مرگِ تو اہلِ جہاں را زندگیست
باش! تا بینی کہ انجامِ تو چیست!

پرویز صاحب یقیناً اقبالؒ و جناحؒ کے مداحین و متاثرین میں سے ہیں بقولِ خود آپ قرآن کے ادنیٰ طالب العلم ہیں آپ عرصۂ دراز سے قرآن کریم کو سمجھنے سمجھانے کی سعی مشکور میں مصروف و منہمک ہیں آپ کا اندازِ تخاطب دلکش خیال انگیز اور فکر خیز ہے۔ تحریرات اثر آفریں اور "انقلاب اندر شعور" کی داعی حیات آفرین اور زندگی بخش ہیں، لیکن ہر سوچنے والے اور غور و فکر سے کام لینے والے کے دل میں یہ سوال ضرور اُبھرتا ہے کہ ابھی تک ان کا کوئی متاثر میدانِ سیاست و قیادت بھی اسطرح نہیں اترا جسطرح حضرت قائدِ اعظمؒ علامہ اقبال علیہ الرحمۃ سے متاثر ہو کر ملّت کے سامنے آئے تھے۔ آپکی ایک تصنیف "نظامِ ربوبیت" جسے آپ اپنی قرآن فہمی کا شاہکار قرار دیتے ہیں اب جبکہ مارکسزم اور امپیریلزم میں شدید ٹکراؤ، مخالفت اور رزم آرائی ہے کیا وجہ ہے کہ کوئی حساس و دردمند اُن کی قرآنی فکر کے نچوڑ، قرآن کے پیش کردہ "نظامِ ربوبیت" کو لیکر عامۃ الناس کے سامنے نہیں آیا۔ یہ ٹھیک ہے کہ اسلام اسوقت جنگاہ میں کھڑا ہے اور اگر اس نے مارکسزم، سوشلزم اور کمیونزم کو شکست نہ دی تو حاملینِ اسلام کو یہ اعتراف و اقرار کرنا پڑے گا کہ اسلام میں یہ اہلیت و صلاحیت اور خوبی رکھت ہی نہیں مگر کیا وجہ ہے رب العالمین اور رب الناس قرآن میں پڑھنے والا مسلمان اور (و الی ربک منتہٰہا) کہنے والا بندۂ زمانہ، بندۂ خدا بنکر سامنے نہیں آیا۔ مودودی مرحوم جیسا تیسا اسلام پیش کرتے رہے۔ ان کا ایک حلقہ اثر بنا اور وہ ان کے تشریح کردہ اسلام کے قیام کے لیے کوشاں ہے۔ لیکن شعور و آگہی سے بہرہ ور، جناب پرویز کے قرآنی مفہومات اور تشریحات سے متاثر فرزندانِ

ملت جو انہیں صحیح مفکرِ قرآن اور اقبال شناس قرار دیتے ہیں ان میں یہ عملی تڑپ۔ یہ ولولہ یہ عزم اور بلند حوصلگی آخر کیوں پیدا نہیں ہو رہی کہ وہ ان کی فکری کاوشوں اور نظری کاہشوں کو عمل کے سانچوں میں ڈھالیں حالاتِ زمانہ پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ سیلابِ مارکسزم اور مادّہ ازم کی تند و تیز طغیانیوں سے جہانِ انسانیت کو محفوظ و مصئون کرنے کے لیے اس کے سامنے اگر خدائی قانونِ ربوبیّت کا حصار نہ بنایا گیا اور قافلۂ انسانیت اور کاروانِ آدمیت کی اگر صحیح رہنمائی نہ کی جسطرح رہبرِ انسانیت محمّد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کی تھی تو وحدتِ آدم فرد فرد ہو کر اس سیلاب بلا انگیز کی جولانیوں میں تنکوں کی طرح بہہ جائے گی۔ چشمِ بیدار کو صاف طور پر نظر آ رہا ہے کہ سرمایہ داری کا بکرا جان سے ضرور جائے گا۔ اب فیصلہ کرنا یہ ٹھہرا ہے کہ جھٹکا مطلوب و مقصود ہے یا تکبیر (اللہ اکبر) کے ذریعہ حلال و طیب بنانا منظور! کمیونزم یعنی سوشلزم اور مارکسزم میں خدا کا تصوّر تک نہیں یہ سرمایہ داری کے بکرا کا گوشت، جھٹکا کی حیثیت سے کھلائے گا۔ اس سے مساواتِ شکم کا تقاضا تو ضرور پورا ہو گا۔ لیکن یہ حیوانی زندگی ہو گی۔ اس سے انسانی سطح کی زندگی نہیں ابھرے گی۔ ہاں! اگر اسے اللہ کے نام پر ذبح کیا جائے گا تو یہ حلال کی صورت ہو گی۔ ایک علم و عرفاں کی لذّت سے آشنا انسانوں کے ہجوم میں تنہا یہ سوچتا ہے کہ کیا ابھی وہ وقت نہیں جس کا تقاضہ فکرِ پرویز ہے یا بقول اقبال ؒ

یہ ایک مردِ تن آساں تھا تن آسانوں کے کام آیا

والا معاملہ ہے؟ میری حقیر سی رائے ہے (اور اسی امید کو سینۂ سوزاں میں سموئے ہوئے ہوں)، کہ ریگِ زمانہ پر ابھی تک "رہبرِ انسانیت" کے لیے نقوشِ پا کاروانِ انسانیت کے لیے رہنما بنکر درخشندہ درخشندہ ذرّوں کی صورت میں جگمگا رہے ہیں یہ منزل فراموش اور مقصدِ حیات

سے بلے خبر انسان ایک دن ضرور انہی نشانات راہ کو دیکھ منزل حیات کو طے کرنے کے لیے اپنے کو مجبور پائے گا۔ اور جس ہمدرد و غمگسار انسانیت نے جایدادیں کھڑی کیں نہ سرمایہ جمع کیا۔ اور نہ ہی علماء کرام کی بتلائی ہوئی ڈھائی فیصد زکوٰۃ دی اور قافلۂ آدمیت کو لقائے رب کی کیف آور لذت سے شناسا کیا۔ اسی کے پیش کردہ رب العالمین اور رب الناس کے عطا کردہ قانون حیات کو قبول و تسلیم کرکے قرآن کی ابدیت و صداقت کو ماننے پر مجبور ہوگا۔ اور اس مجبوری میں جبر و اکراہ کا شائبہ تک نہیں ہوگا اسے یہ بخوشی مانے گا۔

(چودھری حبیب احمد)

مولانا مودودیؒ حیدرآباد دکن میں

جناب ڈاکٹر احمد توفیق مولانا مودودی (مرحوم) کے ایک مداح نے نوائے وقت ۱۸ اکتوبر ۱۹۷۹ء میں مندرجہ بالا عنوان سے ایک مضمون سپرد قلم کیا ہے جس سے ایک تاریخی مغالطہ آفرینی کا احتمال ہے۔ بدیں وجہ باقی مضمون کے جستہ جستہ حصے اور اس خصوصی تحریر کو قارئین کے سامنے لا رہے ہیں تاریخ تحریک پاکستان کے ایک مورخ کی حیثیت سے میرا یہ فرض ہے کہ اپنی بساط کی حد تک تاریخی حقائق کو مسخ نہ ہونے دوں۔ یہی کٹھن، پرخار، دشوار گزار اور ناگوار فرض ادا کرتا رہا ہوں اور یہی مشکل مراحل طے کر رہا ہوں۔ امید ہے کہ حقیقت بیں آنکھ میری تحریر میں تاریخی صداقت کو دیکھ لے گی۔

ڈاکٹر احمد توفیق رقمطراز ہیں :-

"بہت دنوں سے یہ خیال دل میں آرہا تھا کہ میں مولانا مودودیؒ کے حیدرآباد دکن کے قیام کے متعلق کچھ تحریر کروں۔ دریں اثنا کراچی سے ایک اخبار میں اسی عنوان سے ایک مضمون نظر سے گزرا جس میں دو اصحاب مولانا ابو یوسف اور لئے محبوب کی یادداشتیں درج تھیں تاہم میں اس ضمن میں مولانا کی زندگی پر مزید روشنی ڈالنا چاہتا ہوں۔

مولانا اورنگ آباد میں ۱۹۰۳ء میں تولد ہوئے۔ اورنگ آباد حیدرآباد دکن کے ایک صوبہ اور ضلع کا صدر مقام تھا۔ یہ شہنشاہ اورنگ زیب کے نام سے موسوم ہے۔ اورنگ زیب

کی بیوی رابعہ درانی یہاں دفن ہے۔ اس کا مقبرہ تاج محل کی ہو بہو نقل ہے۔ البتہ یہ چونے کا بنا ہوا ہے۔ اورنگ زیبؒ نے اس شہر کے لیے پانی کی بہم رسانی کا جو سسٹم بنایا آجتک چل رہا ہے۔ خود اورنگ زیبؒ دولت آباد میں دفن ہے۔ دولت آباد کا پرانا نام دیوگری ہے۔ اورنگ آباد کے اطراف میں ایلورا اور اجنٹا کے غار ہیں۔"

آگے چلکر مولانا مرحوم کی گھریلو تعلیم، مدرسہ دارالعلوم حیدر آباد سے مولوی عالم کی تعلیم پھر ۱۵ برس کی عمر میں صحافت سے وابستگی "الجمعیتہ" اور "تاج" کی ادارت اور محکمہ دارالترجمہ حیدر آباد میں برادر اکبر سید ابوالخیر مودودی کے زیر سایہ ملازمت کا ذکر ہے جس سے ناگفتہ حالات کے سبب مولانا مرحوم سبکدوش ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں :-

" اسی زمانہ میں مولانا ابو محمد مصلح صاحب نے ایک جریدہ "ترجمان القرآن" شروع کیا جس میں مولاناؒ کو مضامین لکھنے کی دعوت دی گئی۔ مضامین بہت مقبول ہوئے۔ بہت جلد ہی انہوں نے مولاناؒ کو اس کی ادارت سونپ دی۔ یہ اسی زمانہ کی باتیں ہیں جب کہ قرآن پڑھنا تو ضروری خیال کیا جاتا تھا مگر تفسیر قرآن پر زیادہ زور نہیں دیا جاتا تھا۔ تفاسیر موجود ضرور تھیں مگر وہ عام لوگوں کے لیے مشکل تھیں۔ مولاناؒ نے جس آسان اور سلیس طریقہ سے "ترجمان القرآن" میں آغاز کیا۔ وہ باتیں لوگوں کے دل کو لگیں اور ان کا جریدہ بہت ہی مقبول ثابت ہوا۔ حیدر آباد تو خیر ایک طرف پورے ہندوستان میں تہلکہ مچ گیا اور اس کی مانگ بڑھتی گئی۔"

اب ہم اس مقام پر آپہنچے ہیں جس کے متعلق عرض کیا تھا کہ یہاں پر تاریخی مغالطہ آفرینی کا احتمال ہے جس کا ازالہ میرا مورخانہ فرض اور تحریک پاکستان کی تاریخ کے تحفظ کے لیے اشد ضروری ہے۔ میری اس کتاب کا مرکزی و محوری نکتہ یہی حقیقت سوزی ہے۔

ڈاکٹر توفیق تحریر فرماتے ہیں :- " مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہفتہ میں کم از کم تین دن مغرب کے بعد ہمارے یہاں بیٹھک ہوا کرتی تھی میرے والد صاحب قبلہ مرحوم فخرالدین احمد خاں المخاطب فخر یار جنگ محکمہ مالیات کے معتمد تھے اور بعد میں وزیر مالیات رہے ان

کو مولانا صاحب سے بہت انس تھا۔ اس بیٹھک کا موضوع زیادہ تر قرآن مجید ہی ہوتا۔ اس مجلس میں مولانا مودودی اور والد صاحب قبلہ مرحوم کے علاوہ مولانا ابو محمد مصلح، حکیم حامد محسن، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی، مولانا ہاشمی فرید آبادی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ یہ مجلس زیادہ تر نو یا ساڑھے نو بجے اختتام پذیر ہوتی۔ علامہ اقبالؒ جب کبھی حیدر آباد تشریف لاتے تو کبھی کبھار اس مجلس کو زینت بخشتے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ علامہ اقبالؒ کا مولاناؒ سے اسی بیٹھک میں تعارف ہوا تھا۔ مرزا محمد مار ماڈیوک پکتھال جن کا انگریزی میں قرآن مجید کا ترجمہ بہت مقبول ہے ہمارے ہمسایہ تھے۔ اکثر ٹہلتے ہوئے آتے اور اس بیٹھک میں شمولیت کرتے۔ مولانا ظفر علی خاںؒ کو بھی اس مجلس میں دیکھا ہے۔ (رح یہ علامت ہیں نے اپنے طور پر دی ہے ڈاکٹر صاحب نے نہیں (مرتب)) آپ کو شرکاءِ مجلس سے علم ہو جائے گا کہ کس نوعیت کی گفتگو ہوتی تھی۔

ذرا آگے چل کر :۔

"یہ وہی زمانہ تھا جب قادیانیت نے بڑے زور اور شور سے سر اٹھایا۔ اسی وجہ سے علامہ اقبالؒ نے مولانا مودودیؒ کو دعوت دی کہ وہ پنجاب منتقل ہو جائیں اور اس کے خلاف برسرِ پیکار ہوں۔"

آگے بڑھیئے :۔ "ان کی آواز میں تھوڑی سی کرختگی ضرور تھی مگر جب وہ اپنے خیالات کا اظہار فرماتے تو کرختگی معدوم ہو جاتی اور ان کے الفاظ دلنشیں ہو جاتے"

ہم کسی اور مقام پہ اتفاق و اختلاف کا اظہار ضروری نہیں سمجھتے۔ ہاں! ڈاکٹر صاحب کا یہ فرمانا کہ مولانا مرحوم کا تعارف حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمہ سے ان کی بیٹھک میں ہوا، قرینِ صداقت نہیں اسے بعید از حقیقت اس لیے بھی قرار دیا جا سکتا ہے کہ سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کی زندگی میں بھی جن لوگوں نے یہ سعیٔ نامشکور فرمائی ہے کہ کہ مولانا مرحوم کو حضرت علامہؒ نے لاہور بلایا تھا کہ دارالاسلام میں بیٹھ کر کام کریں، انہوں نے بھی تو کہیں یہ نہیں لکھا کہ مودودی مرحوم کا پہلا تعارف فخر الدین احمد خاں المخاطب فخر یار جنگ معتمد محکمہ مالیات کی بیٹھک میں ہوا تھا (یہ کم از کم اس

موضوع پر اتنے گہرے مطالعہ و تحقیق کے باوجود میری نظر سے کہیں نہیں گزرا۔ اگر کوئی صاحب کہیں دکھا دیں تو مشکور ہوں گا۔ (مرتب)

مجھے احساس ہے کہ متاثرین مولانا مودودی مرحوم کی نوکِ قلم پر عقیدت و احترام کی بہت سی تحریریں آئیں گی۔ اور محبت و ارادت کی کئی ایک تفسیریں نظر سے گزریں گی۔ انہیں یہ حق حاصل ہے کہ وہ یہ کچھ کریں لیکن جہاں تک تاریخی حقائق کا تعلق ہے قدرت نے جبتک مہلت دی ہے کم از کم انہیں مسخ ہونے نہیں دیا جائیگا۔ ہم پرورشِ حقائق کرتے رہیں گے۔ آپ میری اس کتاب میں جگہ جگہ دیکھیں گے کہ مودودی صاحب مرحوم کو پرویز صاحب کی نشاندہی پر چوہدری نیاز علی خاں صاحب مرحوم و مغفور نے دارالاسلام بلایا تھا۔

رہا قادیانیت اور اس کے زور و شور کا معاملہ، اس کا معقول مبنی بر قرآن جواب جو حکیم الامت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ نے دیا تھا، لٹریچر اس کا جواب پیش کرنے سے قاصر ہے۔ ان کے بعد جناب پرویز جو حقیقت میں متاثرِ اقبالؒ اور مفکرِ قرآن ہیں، جن کی تحریر کو اس مقدمہ میں جو پہلا عدالتی فیصلہ تھا، جج نے عنوان بنایا۔ نیز ان کی کتاب "ختمِ نبوت اور تحریکِ احمدیت" کے علاوہ "شاہکارِ رسالتؐ" جس کے مطالعہ نے جناب شورش کاشمیری مرحوم کو ان کی تعریف و توصیف اور اس حقیقت کو تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا، کہ پرویز صاحب نے علامہ اقبالؒ کی آرزو کی تکمیل کی ہے، قادیانی مسئلہ پر سند کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے رشحاتِ قلم کی روشنی میں یہ کچھ بھی عرض کر دیا گیا۔ ورنہ مقصود و مطلوب اُن کی بیٹھک میں علامہ اقبالؒ اور مولانا مودودی مرحوم کے پہلے تعارف کو بعید از صداقت ثابت کرنا تھا۔ (چودھری حبیب احمد)

حرفِ آخر

قارئین کرام! جیسا کہ پیش لفظ میں وضاحت کی جاچکی ہے اور صراحت سے عرض کرچکا ہوں کہ میں نے تاریخ تحریک پاکستان پر وہ حقائق نقش کرنے کی کوشش کی ہے جو مخالفین تحریک کی نامرادیوں، ناکامیوں اور حسرت انگیزیوں کی داستانوں کے سوا اور کچھ نہیں۔ ایک عرصہ تک گومگو کی کیفیت میں رہ کر میں نے عزم کرلیا کہ جس طرح "تحریکِ پاکستان اور نیشنلسٹ علماء" لکھ کر متحدہ قومیت کے علمبردار علماء کے کردار کو صفحاتِ تاریخ میں محفوظ کرچکا ہوں۔ اسی طرح مولانا مودودی (مرحوم) اور اُن کے ہمنواؤں کے افکار و کردار اور اعمال و افعال کو بھی جو تاریخ پاکستان سے متعلق ہیں انہیں بھی کتاب تاریخ میں سمودوں (اس دور کی یہ دو نمایاں مخالفِ قیامِ پاکستان قوتیں ہیں جنہوں نے دین کے نام پر دینی مملکت کے قیام کی مخالفت کی تھی) چنانچہ میں نے ان کے بارے میں مواد جمع کرنا شروع کردیا۔ یہی وہ بنیادی جذبہ تھا جو میری اس تمام کوشش کو محیط ہے۔ اس تگ و تاز میں میرے قریباً سات سال صرف ہوئے۔ بصائر و دلائل کا یہ مجموعہ جو ۸۹۸ صفحات اور ۳۱ ابواب پر مشتمل ہے ایک حوالہ جاتی ریکارڈ کی صورت میں آپ کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے، اس اعتماد و بھروسہ کے ساتھ کہ اس سے حق و باطل نکھر کر آپ کے سامنے آجائیگا۔ میں نے اس صداقت کی شہادت میں ان کی سابقہ سرگزشتوں کو جمع کیا ہے اور آئینہ تحریر میں یہ دکھایا ہے کہ یہ سب کچھ تمہارے اپنے اعمال و کردار کا عکس ہے جو کچھ تم کیا کرتے تھے۔ ابتداءً چلتے چلتے یہاں رک کر یہ بھی عرض کرتا چلا جاؤں کہ رسمی مذہب پرستوں، علماءِ مذہب اور مفکرِ قرآن جناب پرویز میں بعض دوائر میں شدید اختلافات ہیں لیکن ایک حقیقت پر سب متفق و متحد ہیں کہ جناب مولانا مودودی مرحوم نے صحابہ کبارؓ، مجددِ دین اور دین کو نہایت غلط انداز اور غلط رنگ میں پیش کیا اور خود ساختہ اسلام کو اپنی اغراض کے سانچوں میں ڈھالا ہے جسے یہ بیک زبان مصلحتی اسلام کہہ لیتے ہیں یہاں یہ ذکر کرنا ضروری اس لیے سمجھا گیا کہ اس کتاب میں جگہ بجگہ مولانا مرحوم کی دینی قلابازیوں کے نمونے بھی پیش کیے

گئے ہیں جن کی وجہ سے علمار کرام (مودودی مرحوم) کی اسلام سوزی سے تلملا اٹھے ہیں
ناظرین کرام! آپ تاریخ کے ان نوشتوں کو سامنے رکھتے ہوئے اس محکم اصول کو پیش نظر رکھیں کہ جس طرح ہم اقوام گزشتہ کی داستانوں سے واقعات کا اندازہ لگاتے ہیں اسی طرح ہماری نسل نو جو جنگ پاکستان کے زمانہ میں موجود نہ تھی، وہ ہمارے ہی جمع کردہ تاریخی مواد سے صحیح نتیجہ اخذ کر سکے گی۔

ہاں! جو عقل و فکر سے کام لینا چھوڑ دیتے ہیں۔ اس قابل نہیں ہوتے کہ صحیح بات کو قبول کر سکیں۔ اُن میں قبولِ حق کی استعداد ہی نہیں ہوتی۔

میں نے یہ حقیقتوں کا جگمگاتا ہوا چراغ، ستارہ صبح کی طرح روشن جو ہر دلِ متجسس میں اجالا کر دیگا۔ باطل آرائیوں کی پھیلاتی ہوتی تاریکیوں میں جن سے اکثر نگاہیں دھندلا اٹھی ہیں آپ کے سامنے رکھ دیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس سے اُن دلوں کی کیفیات بدل جائیں گی جن میں حق قبول کرنے کی صلاحیت ابھی باقی ہے اور یہ اعتماد بھی کہ یہ چراغِ حقیقت پورے خطہ ارض کو روشن و منور کر دے گا۔ یہاں مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ حق قبول کرنے کے لیے عزم راسخ اور ہمت بلند کی ضرورت ہوتی ہے۔

وُہ بندگانِ خدا جنہوں نے فکرِ اقبالؒ کی روشنی میں حضرت قائد اعظم علیہ الرحمہ کی رفاقت و سیادت و قیادت میں مقدور بھر کام کیا ہے، تاریخ تحریک پاکستان میں اُن کی عظمتیں اور بلندیاں انتہا کو پہنچیں اور انہوں نے شہرت کی رفعتوں کو پا لیا۔ وہ جانبازانِ ملت جنہوں نے انتہائی قربانیوں اور جاں فشانیوں سے جناحؒ کے مشن کو کامیاب بنایا! لائق صد احترام و عظمت ہیں رہے وہ جنہوں نے دن رات اس قسم کی چالیں چلیں اور تاریخ پاکستان کو مسخ کرنے کے لیے قلمی فریب کاریاں کیں انہوں نے اپنی اجتماعی بداعمالیوں کا دھکایا ہوا جہنم خود اپنے ہاتھوں اپنے لیے تیار کیا جس میں اُن کی باطل نگاریوں کے تیز شعلے لپک لپک کر انہیں بھسم کر کے رکھ دیں گے راقم اپنے جھکے ہوئے سر اور پرنم آنکھوں سے حضورِ ربّ العزت نذرانہ شکر پیش کرتا ہے جس نے میری بے بضاعتی کو یہ توانائی و قوت بخشی کہ میں اکیلا اتنا اہم اور مشکل کام سرانجام دے سکوں۔ اقبالؒ نے درست ہی تو فرمایا تھا۔

ع کرتک ہے ہر راہ کو روشن چراغ آرزو

اِس ضمن میں یہ بھی عرض کرتا چلا جاؤں کہ ہو سکتا ہے کہ عصرِ حاضر کے سامری فن کے افسوں کی وجہ سے میرا یہ احساس زیادہ اثر انگیز نہ ہو اور بہت کم طبیعتیں میری اس مخلصانہ کاوش سے اثر پذیر ہوں لیکن مجھے صاف و شفاف روشن دماغ جوانانِ ملّت کے جراَت مندانہ ارادوں، بلند حوصلوں اور متجسّانہ تمناؤں سے یہ امید ضرور ہے کہ وہ میرے پیش کردہ حقائق کی تہ تک پہنچنے کی ضرور کوشش کرینگے۔

عزیزانِ ملت! آج میری نگاہیں حقیقت کے پانی کے لیے اُن پیاسوں کی طرف اُٹھ رہی ہیں جو ذہنوں کے تاحدِ نگاہ پھیلے ہوئے صحراؤں میں (صحرا تو تاحدِ نگاہ صحرا ہی ہوتا ہے اسمیں کوئی حدبندی نہیں ہوتی، پھر پیاس کی شدّت کا صحرا نوردوں سے پوچھیئے) جو آپ حقیقت کی تلاش میں کوشاں و سرگرداں ہیں۔

اِن صداقت طلبوں کی یہ کیفیّت دیکھ کہ یہ چمکتی ہوئی ریت کے سراب ہی کو پانی نہ سمجھ بیٹھیں میں نے ارادہ کرلیا کہ دیکھا ہے جو کچھ تو نے اوروں کو بھی دکھلا دے، میں نے سراب کو پانی سمجھنے والوں کی راہنمائی کے لیے یہ کتاب ترتیب دی ہے (یہاں مجھے یہ عرض کرنے کی ضرورت نہیں کہ سراب کو پانی سمجھنے والوں کی جتنی کوششیں ہوتی ہیں لاحاصل اور بے نتیجہ چلی جاتی ہیں۔) وہ جس چٹیل میدان میں چمکنے والی ریت کو دیکھ کر اس پر پانی کا گمان کرنے لگ جاتے ہیں وہ سراب ہوتا ہے، پانی نہیں ہوتا۔

اگر یہ حضرات جہانِ عقل و فکر میں رک کر سوچتے تو یقیناً اس نتیجہ پر پہنچ جاتے کہ جہاں پانی ہو وہاں سرسبزی، درخت، پودے اسکی علامت ہے کہ یہاں پانی ہے جس جگہ یہ کچھ نہ ہو وہاں فریب ہی فریب اور دھوکہ ہی دھوکہ ہے۔ اور فریب خوردگی ہی دلِ زندہ کی موت ہے۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ اگر اعتقاد کی شدّت علم و فکر کی قوتوں پر غالب آجائے تو یہ انسان کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کو ماؤف کر دیتی ہے، اور ایسے جذباتِ عقیدت سے مغلوب جو ایسا کچھ کر رہے ہوتے ہیں وہ نہیں سمجھتے کہ سعیٔ بے حاصل کی لذّت جو تمہیں یہ کچھ کرنے پر مجبور کر رہی ہے وہ کبھی بھی تمہیں مقصد پیشِ نظر میں کامیاب نہیں کرا سکے گی۔ اور آپ اپنے اس عمل کی نتیجہ خیزی کو کبھی بھی اپنے موافق اور مفید مطلب نہ پاسکو گے۔

عزیزانِ گرامی! ہر صاحبِ شعور و فکر انسان کھڑا ہو کر یہ سوچتا ہے کہ مجھے وہاں جو پانی دکھائی دیتا ہے اگر وہاں ہر اول، لہلہاہٹ اور سرسبزی کے علاوہ درخت اور پودے نہیں ہیں تو پھر یہ محض چمکتی ریت (سراب) ہے، پانی نہیں۔ لہٰذا یہ زاویۂ نگاہ بدل جانے سے جہانِ چارسُو بدل جاتا ہے۔ نوع دیگر بیں جہاں دگر شود

فرزندانِ ملت! فکرِ اقبالؒ کی روشنی میں پانی، پانی نظر آتا ہے، سراب سراب آپ جب بھی جھوٹے اعتقاد کی شدت سے لبریز جذبات کو عقل و فکر کی کسوٹی کے سامنے لاؤ گے تو وہ کپکپا اُٹھیں گے۔ کیا خوب فرمایا ہے حضرتِ اقبالؒ نے ؎

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

صحرا لق و دق، چٹیل میدان میں ریت سورج کی چمک سے پانی کی جھیل بن کر دکھائی دیتی ہے۔ یہاں شہروں میں بھی تارکول کی سڑکیں، سورج چمک رہا ہو تو، سڑک پر پانی نظر آتا ہے۔

نگاہِ مومن، فراستِ مومن فوراً حقیقت کو دیکھ لیتی ہے، اسے جھوٹا نگ، جھوٹا نگ سچ سچ اور جھوٹ، جھوٹ نظر آتا ہے۔ لیکن یہ سب کچھ صداقت طلبی کے لیے ہے۔ سعیٔ بے مقصد کے پُر فریب ماحول میں رہنے والوں کے اعمال تو میزانِ خداوندی میں تولنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی جاتی (اولٰئک حبطت اعمالھم) اُن کے اعمال رائیگاں چلے جاتے ہیں۔

ناظرین کرام! جھوٹے اعتقاد کی شدت میں سراب بھی آبِ حیواں بنکر دکھائی دیتا ہے۔ شدتِ جذبات اُسے سوچنے ہی نہیں دیتی کہ یہ چمکتی ریت پانی نہیں۔ میری یہ سعیٔ مسلسل اور کوششِ پیہم ان کے لیے ہے جو منزلِ حقیقت تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ میں نے یہ نشاناتِ راہ ان کے لیے نصب کئے ہیں جن میں دیکھنے بھالنے اور سمجھنے سوچنے کی صلاحیت موجود ہے۔ بصیرت کے اندھوں کے لیے نہیں اور اُن کے لیے بھی نہیں جس کے کانوں میں اغراض کے ڈاٹ لگ چکے ہیں اور وہ آوازِ جرس سے بھی کارواں کا سراغ نہیں پاتے۔ اُن کے لیے بھی نہیں کہ اردگرد کی فضا روشن ہو، لیکن ان کی سوجھ بوجھ کے راستے اندھی عقیدت کی تاریکیوں میں گم ہو کر رہ گئے ہوں،

وہ جنگی غلط روی، سرکشی اور غلط بینی انکا زاویۂ نگاہ درست نہ ہونے کی وجہ سے انہیں نشانِ حقیقت سے کھینچ کر بہت دُور لے جا چکی ہے' مجھے اُن سے کوئی پرخاش نہیں۔ میرا مقصدِ تحریر حقیقتوں کا اجالا ہے۔ یہ چراغ میں نے تحریکِ قیامِ پاکستان کا ایک ادنیٰ کارکن ہونے کی حیثیت میں' اپنا فرض سمجھ کر روشن کیا ہے تاکہ رہروانِ منزلِ حقیقت، سفرِ جستجو میں پریشان نہ ہوں۔ میں نے جو کچھ لکھا ہے مفکرِ پاکستان حضرت علامہ کی تعلیمات، تاکیدات اور تنبیہات کی روشنی میں لکھا ہے اور میں نے پوری پوری کوشش کی ہے کہ قارئین کی چشمِ بصیرت کے لیئے نورِ حقیقت مہیا کر دوں۔ اس کے باوجود جن کے دِل ابھی تک پاکستان مخالفت کے پردوں میں لپٹے ہوئے ہیں' اور اُن پر ایسے تالے پڑ چکے ہیں جو کہیں خارج سے نہیں' یہ تالے خود ان کے دِلوں کی پاکستان کے بارے میں نفرت و عداوت کی کارگاہ میں ڈھلے ہیں۔ اور انہوں نے اپنے دلوں پر اپنے خود ساختہ تالوں کو ڈال کر حقیقت بینی کے لیے بند کر لیا ہے، میرا تخاطب ان کے لیے نہیں ہے۔

آخر میں راقم یہ گزارش کرنا ضروری سمجھتا ہے کہ یہی کشاکشِ پیہم اور یہی آرزوِ مقدس ہے جس کی وجہ سے میں نے آجتک تاریخِ پاکستان کے خلاف غلط نگاریوں غلط نویسیوں اور صداقت سوزیوں کا تعاقب کیا ہے۔ یہ حقیقت آپ کو اس کتاب کے اوراق میں ہر جگہ جلوہ افروز نظر آئیگی۔ میں نے نہایت دیانت سے' بلا سند و دلیل اور بلا حوالہ و تحقیق' اپنے علم کی حد تک کوئی ایسی بات ریکارڈ نہیں کی جسے میں نے درست نہ جانا ہو، باقی رہا یہ کہ کوئی انسانی کوشش (جیسا کہ پیش لفظ میں عرض کیا جا چکا ہے) سہو و خطا سے مبرّا و منزّہ اور پاک نہیں ہوتی۔ اس لیے میری اس جہد و کاوش میں بھی اس کا احتمال ہے۔ اس کتاب "اقبالؒ و جناحؒ، پرویز اور مودودی" میں تاریخی حقیقتیں صاف صاف بیان کر دی گئی ہیں۔ کوئی اپنے عیوب برہنگی چھپانے کی لاکھ کوشش کرے تاریخی نوشتے بہرحال اس کے تعاقب میں رہیں گے اور مخالفینِ قیامِ پاکستان کی تاریخی غلطی اور ناپسندیدہ کردار کو نمایاں کرکے رہیں گے۔

مجھے علم ہے کہ ان صداقت افروز، حقیقت آمیز اور روشن و تابناک حقائق کو سامنے لانے کے جرم میں متاثرین کئی ایک اتہامات اور کئی ایک الزامات میرے

پتّے باندھنے کی پرانی حرکت کریں گے۔ لیکن ہوتا آیا ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں کے مصداق میں اسے نہایت صبر و تحمل سے برداشت کروں گا۔ ان کی طرف سے یہ کوئی نئی بات نہیں ہوگی۔ بقولِ شاعر ؎

نظر نیچے کیے وہ سوچتا تھا جورِ تازہ کی،
میں سمجھا تھا، جفاؤں پر پشیماں ہوتا جاتا ہے

جب اعتقاد کی جھوٹی لذت پختگی حاصل کر لیتی ہے تو نگاہ کا زاویہ بدل دیتی ہے۔ پھر رنگین چشمے میں باہر کی ہر شے رنگین نظر آتی ہے۔ انسان فریب کھاتا ہی اس وقت ہے جب اعتقاد کی قوت، فکر کی قوتوں پر غالب آجاتی ہے۔ اس لیے ان کا یہ "عملِ صالحہ" میرے لیے وجۂ حیرانی نہ ہوگا۔

راقم نے "اقبالؒ و جناحؒ" کے فرمودات و ارشادات کی روشنی میں تاریخِ پاکستان مرتب کرنے والے مورخین کے لیے کافی کچھ جمع اور اس ضمن میں اُن کے لیے ایک ذہنی اور فکری رُخ متعین کر دیا ہے۔ امید ہے کہ وہ ان خطوط پر اس کام کو مزید آگے بڑھائیں گے — اس نیک خواہش کے ساتھ یہ کتاب نذرِ مطالعہ و تحقیق کی جا رہی ہے۔

اے ربّ الارضِ والسموٰت! اے (جملہ کائنات) کو نشو و نما دینے والے، تیری عطا کردہ ہمت و توفیق سے میں اس کتاب کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں کامیاب و کامران ہوا ہوں۔ اس بندۂ ناچیز کے پاس اظہارِ تشکر و سپاس گزاری کے لیے وُہ الفاظ کہاں جو تیری شایانِ شان ہوں۔ بہر حال اپنے تشکر کے جذبات بارگاہِ ربّ العزت میں اس اعتراف و اقرار کے ساتھ پیش کرتا ہوں کہ اگر تیرا فضل شاملِ حال نہ ہوتا تو میں اس لمبے سفر کو اس طرح طے نہ کر پاتا۔ اگر حالات نے یاوری، اور طبعی زندگی نے وفا کی تو آئندہ اپنی تصنیف "کشمکش اندر" لکھنے کا ارادہ ہے۔

چودھری حبیب احمدؒ

پروفیسر چودھری رفیق احمد

خَلفُ الصّدق :- چودھری حبیب احمد مرحُوم (مؤلف کتاب)

باب -۳۲

حالات

چودھری حبیب احمد مرحوم

★ ———— رفیق احمد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

چودھری حبیب احمد مرحوم

جولائی کا مہینہ تھا اور تسبیح عیسیٰؑ کا ۱۹۱۹ء واں دانہ شمار میں، یا یوں کہیئے کہ سنِ ہجری کی ۱۳۳۷ ویں کڑی لڑی میں پروئی جا رہی تھی جب چودھری حبیب احمد بجواڑہ ضلع ہوشیارپور (مشرقی پنجاب۔ انڈیا) میں ایک معززالرّاعی خاندان میں پیدا ہوئے۔ والد ماجد ڈاکٹر امام بخش تھے، نانا چودھری عمر بخش سفید پوش اور ماموں عبدالرشید جالندھر ڈویژن کے پہلے مسلمان کیپٹن ڈاکٹر جو کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور کے پروفیسر بھی تھے ادھیال اور ننھیال کے بزرگ قصبۂ مذکور کی گدّی کے بزرگوں حضرت میاں اعظم شاہ اور حضرت مولینا برکت علی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہم کی بیعت سے مشرف تھے۔ یہ قادری اویسی سلسلہ حضرت قبلہ رسول نما دہلویؒ سے جا ملتا ہے۔ چودھری صاحب کے والدِ گرامی ان بزرگوں کی عقیدت کی وجہ سے حکیم الامّت حضرت اقبالؒ سے بہت متاثر تھے۔

ابتدائی تعلیم قصبہ بجواڑہ کے پرائمری و ہائی سکول، پھر عالیہ ہائی سکول میں حاصل کی۔ ۱۹۳۴ء میں ان کے والدِ گرامی راہیِ ملکِ عدم ہوئے۔ قصبہ کے کئی لوگ ڈاکٹر صاحب کے ہزاروں روپے کے مقروض تھے، چودھری صاحب نے اپنے برادرِ اکبر میاں رشید احمدؒ کو راضی کر کے ان تمام لوگوں کو قرضہ معاف کر دیا، آج جس کا تصوّر بھی ذرا مشکل ہی ہے۔

۱۹۳۸ء کو رسول ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ لاہور میں داخلہ لیا۔ اس دور میں ہندو کاروبار پر چھائے ہوئے تھے آپ کے بڑے بھائی میاں رشید احمد مرحوم کی یہ خواہش تھی کہ ہندو کے مقابلے پر لوہے کا کارخانہ لگایا جائے اسلیئے اس انسٹی ٹیوٹ میں ٹریننگ حاصل کی۔ قدرت کو ملّی خدمات لینا مقصود تھیں، اس ادارے کے قریب ہی "اسٹریلا" مسجد تھی وہاں مرزا عبدالحمید مرحوم[۲] (داعی الی القرآن) خطبہ جمعۃ المبارک اور درس قرآن حکیم دیا کرتے تھے؛ ان کے خطبات میں فکرِ اقبال کی جھلکیاں نمایاں اور قرآن مجید کی حیات پرور روح موجزن تھی۔ چودھری صاحب بھی فکرِ اقبال

---

[۱]: ہوشیارپور کے مشہور ہندو سیٹھ مادھو پنساری کے سامنے مشرقی پنجاب میں کسی مسلمان پنساری کی غالباً سب سے بڑی دکان۔ وفات مئی ۱۹۶۸ء۔

[۲]: وفات دسمبر ۱۹۷۲ء۔

کے شیدائی تھے لہٰذا دن بدن مرزا صاحب کے قریب ہوتے چلے گئے۔ مرزا عبدالحمید جب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن پنجاب کے صدر بنے تو چوہدری صاحب نے ان کے ہمقدم و ہمنوا ہو کر پوری سرگرمی اور جنون و عشق سے تحریک پاکستان میں حصّہ لیا، اسی دوران آپ نے ادیب عالم کا امتحان بھی امتیازی حیثیت سے پاس کر لیا۔

پروفیسر مرزا عبدالحمید مرحوم نے بحیثیت صدر پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن اس قافلہ حریت کے متعلق "یہ بچوں کا کھیل ہے" کے عنوان سے ۱۷ دسمبر ۱۹۶۱ء کے ہفت روزہ "وفاق" کے صفحہ نمبر ۱ پر تحریک پاکستان اور طلباء کے ضمن میں یوں تحریر فرمایا ہے کہ:۔

"میں نے ۱۵ جون ۱۹۴۰ء سے ۳۰ جون ۱۹۴۰ء تک اپنے پیپرز سے درست کئے جو طلباء اور نمازی میرے غمگسار تھے اور جو احباب مجھے قریب سے دیکھتے، سمجھتے اور اس ذمہ داری کا احساس کرنے میں میرے دکھ کے ساتھی تھے وہ ابتداً بہت کم لوگ تھے، ان میں چوہدری نصر اللہ خان ایڈووکیٹ کو نہیں بھول سکتا جو خاموش نگاہوں اور درد بھرے دل کے ساتھ اس "بچوں کے کھیل" کو قومی معرکہ بنانے میں میرے دست راست بن گئے، مرحوم جنرل سکیرٹری تھے اور میرے درس کے طلباء اور رفقاء میں سے حافظ نذر احمد، حبیب چوہدری، ڈاکٹر محمد شریف اور کچھ دوسرے رفقاء ابتدائی کام کے لئے آگے بڑھے۔ اشفاق احمد، محمد صادق، سید محمد اصغر اور کچھ دوسرے سینئر طلباء بھی آ ملے"

اس طرح چوہدری صاحب تحریک پاکستان کی صف اوّل کے نوجوان کارکنوں کے ہمراہ حصول پاکستان کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ لاہور سے جب کبھی گھر جاتے تو تنظیمی اور تعمیری سرگرمیوں سے غافل نہ رہتے، مرزا عبدالحمید کے تربیت دادہ تحریک پاکستان کے ہراول دستے کا یہ سپاہی ہر لمحہ اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہتا ۱۹۴۰ء میں "ادارہ اصلاح و تبلیغ بجواڑہ" کے نام سے مسجد سے ملحق ایک عمارت میں لائبریری کی بنیاد رکھی اس ادارے کی ترقی اور دیکھ بھال کے لئے پندرہ مسلمان نوجوانوں کی ایک تنظیم بنائی گئی جس میں چوہدری حبیب احمد کے علاوہ بابو محمد امین، لالہ محمد رفیق، میاں محمد شفیق، نیاز احمد شفقت، حافظ بشیر احمد، حافظ محمد سعید اور محمد ابراہیم قابل ذکر ہیں، دراصل یہ تنظیم تحریک قیام پاکستان کے لئے ہی معرض وجود میں

آئی تھی اور انہوں نے تحریک قیام پاکستان کے لئے انتھک جدوجہد کی، اس تنظیم کے ہر فرد پر لازم تھا کہ وہ باری باری نماز کی امامت کے فرائض بھی ادا کرے۔ یہ نوجوان اپنے جیب خرچ سے ادارے کے لئے کتابیں فراہم کرتے، یہاں تک کہ ۱۹۴۳ء میں قرآن حکیم کی کئی جلدوں، تفسیروں اور احادیث کی کتب کے علاوہ نوسو دوسری نادر اور اہم کتابیں ادارے کی لائبریری میں جمع ہو چکی تھیں۔ ان کتابوں میں اضافہ ہوتا رہا یہ کہ ہجرت کے وقت اس ادارے میں دو ہزار سے زائد کتابیں موجود تھیں۔ قیام لاہور کے دوران مولانا عبدالستار نیازی، علامہ علاؤالدین صدیقی مرحوم حمید نظامی مرحوم، سید قاسم رضوی مرحوم، شیخ خورشید مرحوم، میاں محمد شفیع (م۔ش) حکیم آفتاب احمد قرشی اور دیگر رہبران قافلۂ تحریک پاکستان کے ساتھ ایک ہی منزل کے راہی اور حضرت قائداعظمؒ کے سپاہی کے ناطے تعارف ہوا۔

۱۹۴۲ء میں اپنے قصبہ واپس ہوئے تو تحریک پاکستان اپنے عروج کی طرف گامزن تھی ایک جلسہ کا انتظام کیا گیا جس میں مرزا عبدالحمید، مولوی اصغر علی تلونڈی والے اور حکیم مولوی ابوسعید نے حصول پاکستان کے اغراض و مقاصد مسلمانوں کے اذہان و قلوب میں اتارے۔ تحریک کے وقت قصباتی ماحول کچھ اس قسم کا تھا کہ ان دنوں اس علاقے میں راشٹریہ سیوک سنگھ اور مہاویردل کا بہت زور تھا جو تلواروں، کلہاڑیوں اور لاٹھیوں سے مسلح ہو کر پریڈ کیا کرتے تھے، علاقہ میں ان تنظیموں کا زور توڑنے کے لئے اس متذکرہ ادارے کے نوجوانوں نے بھرپور کردار ادا کیا۔ راشٹریہ سیوک سنگھ اور مہاویردل نے محلہ بیرون نزد دھرم سالہ گوکل داس میں ایک جگہ پر دو آشرم بنایا، چوہدری صاحب نے اپنے چچا ڈاکٹر علی بخش، چوہدری امیرالدین میراں بخش نمبردار، چوہدری نور محمد ملؒ اور چوہدری عبدالحفیظ قادری کی تائید کے ساتھ اس کے بالمقابل ایک ہندو مسلم متنازعہ رقبہ میں ایک کنال سے زائد جگہ پر چار فٹ اونچا چبوترا بنوا دیا۔ قصبے کا کوئی مسلمان گڈے والا کسان ایسا نہیں تھا جس نے اس چبوترے کیلئے مٹی لا کر نہ دی ہو چوہدری صاحب نے یہ جنگ جیت لی۔

۱۹۴۳ء کے آخر میں ہندو کانگرس نے ایک جلسہ کیا جو تین دن رہا اس میں مولوی حبیب الرحمٰن لدھیانوی اور دیگر دو مولویوں کے علاوہ ہندو مقرر بھی تھے جنہوں نے ہندو مسلم اتحاد

پر زور دیا خصوصاً مولوی حبیب الرحمن لدھیانوی نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ہم ہندو اور مسلمان ایک ہی باپ کے بیٹے ہیں اور ہمارے سکھر کا وقار ہندو مسلم اتحاد ہی کی صورت میں ہے۔
اس کے بعد مسلم لیگ کی طرف سے ادارہ کے ان نوجوانوں نے مولانا محمد عمر اچھروی کو بلایا پھر مسلم لیگ کے لئے کم و بیش تین جلسے ہوئے جن میں مولانا عبدالستار خان نیازی صاحب، مرزا عبدالحمید صاحب اور مولوی اصغر علی صاحب ٹلونڈی والوں کے علاوہ دوسرے اکابرین نے بھی مسلمانانِ علاقہ کو اپنے افکار سے نوازا اور اس طرح یہاں تحریک قیام پاکستان اپنے عروج کو پہنچ گئی۔

یکم مارچ ۱۹۴۱ء کو قائداعظم محمد علی جناح لاہور تشریف لائے تو اسلامیہ کالج لاہور کے میدان میں جو تقریر فرمائی چوہدری صاحب کے الفاظ میں اس کا ایک جملہ یوں تھا کہ "آپ نے ہم سے بڑا بڑا محبت کیا ہے لیکن تھوڑا تھوڑا تنگ بھی کیا ہے" اس کا پس منظر یوں ہے کہ قائداعظم کو آدھ پون گھنٹہ کی مسلسل جدوجہد اور انتہائی کوشش کے بعد بے پناہ ہجوم میں سے اسٹیشن سے باہر لایا گیا تھا۔ حضرت قائداعظم نے مختصر تقریر میں مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کا شکریہ ادا کیا اور پھر یہ تاریخی ارشاد فرمایا کہ:-

"یہ عجب حسنِ اتفاق ہے کہ مسلم لیگ کی قرار داد لاہور (قرار داد پاکستان) بھی اسی شہر میں ۲۳ مارچ کو منظور ہوئی تھی اور آج آپ کی کانفرنس بھی یکم مارچ کو منعقد ہو رہی ہے، میں آپ سے کہوں گا "مارچ آن" (march on) یعنی بڑھے چلو۔"

لاء کالج کے طلباء کا ایک وفد چوہدری صاحب کی موجودگی میں آسٹریلیا مسجد میں مرزا عبدالحمید صاحب کے پاس آیا اور دلائل و براہین اور نیاز و انداز سے اصرار کیا کہ قائداعظم نماز جمعہ شاہی مسجد لاہور میں ادا کریں، لیکن مرزا صاحب کی یہ دلیل کہ میں فیڈریشن کا صدر اور آسٹریلیا جامع مسجد کا خطیب بھی ہوں، اسلئے قائداعظم نماز جمعہ اسی مسجد میں ادا کریں گے۔ اس وفد میں چوہدری سراج دین ناگرہ، چوہدری نصراللہ خان، چوہدری محمد اشرف چیمہ اور غالباً چوہدری مختار دسوہہ والے شامل تھے (یہ تمام حضرات فیصل آباد سے ہی متعلق ہیں) طے یہی پایا کہ قائداعظم آسٹریلیا مسجد میں نماز جمعہ ادا کریں گے۔ چنانچہ آپ آسٹریلیا مسجد میں تشریف لائے، نماز جمعہ کے بعد پروفیسر

یوسف سلیم چشتی اور جناب پروفیسر مرزا عبدالحمید خطیب مسجد ہذا نے بہت اصرار کیا کہ قائداعظمؒ کچھ ارشاد فرمائیں، پہلے تو حضرت قائداعظمؒ نرمی اور پیار کی مسکراہٹوں سے فرماتے رہے کہ یہ میرا میدان نہیں مگر جب ان بزرگوں کی طرف سے اصرار شدت اختیار کر گیا تو حضرت قائداعظمؒ نے چہرے پر مسکراہٹیں بکھیرتے ہوئے نہایت متانت اور سنجیدہ لہجے میں فرمایا "obey me, I am your leader" مرزا صاحب اعترافِ شکست کم ہی کیا کرتے تھے لیکن قائداعظمؒ کے اس فرمان پر انہیں ساکت وصامت ہونا پڑا۔[1] ۲۲ مارچ ۱۹۴۰ء کی قرارداد پاکستان کے تاریخی اجلاس میں چوہدری صاحب کے ہمراہ حافظ نذر احمد اور ابراہیم بھی موجود تھے۔

چوہدری صاحب اپنے دوسرے ساتھیوں کو ساتھ لیکر ضلع کے دور دراز علاقوں میں جاتے اور وہاں کے چوہدریوں اور عام مسلمانوں کو تحریک پاکستان کے مقاصد سے آگاہ کرتے رہتے، فکرِ معاش ثانوی حیثیت اختیار کر گیا تھا، اپنی تین دوکانوں میں سے ایک پر اپنے ہم زلف کو اپنے ساتھ شریک کار کیا اور دوسری دونوں پہ ملازم کاروبار چلاتے تھے اور خود تحریک پاکستان کے لئے وقف تھے۔

۱۹۴۶ء کے انتخابات میں ضلع ہوشیار پور دو حلقوں میں منقسم تھا۔ تحصیل ہوشیار پور اور تحصیل گڑھ شنکر کی طرف سے مسلمانوں کی سیٹ پر رانا نصر اللہ خاں صاحب مسلم لیگ کے نمائندہ تھے اور رانا محمد حسین یونینسٹ پارٹی کی طرف سے امیدوار تھے۔ رائے دہندگان کی تعداد بہت محدود تھی کیونکہ ہر بالغ مسلمان کا ووٹ نہ تھا۔ رانا محمد حسین صاحب سے چوہدری صاحب کے خاندانی مراسم بہت مدت سے چلے آ رہے تھے لیکن چوہدری صاحب نے تحریکِ قیام پاکستان کے مسلم لیگی نمائندہ کے لئے حلقہ میں دن رات کام کیا اور رانا نصر اللہ خاں صاحب سات سو ووٹ کی بھاری اکثریت سے جیت گئے۔ دوسری دو تحصیلوں دسوہہ اور اونہ سے چوہدری علی اکبر (سابق وزیر داخلہ پاکستان) مسلم لیگ کی طرف سے اور میاں نور محمد گجر یونینسٹ پارٹی کی طرف سے امیدوار تھے، مقابلہ نسبتاً سخت تھا تاہم مسلم لیگ کے امیدوار کو کامیابی نصیب ہوئی۔ اس حلقہ میں بھی چوہدری صاحب نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کیا جہاں ضرورت محسوس کی موقع پر تشریف لے گئے۔

۱۹۴۷ء میں جب وزیر اعظم پنجاب سر خضر حیات خاں ٹوانہ کے خلاف سول نافرمانی کی تحریک شروع ہوگی تو چوہدری صاحب نے دیوانہ وار میدانِ عمل میں قدم رکھا۔ پورے قصبے میں صرف آپ کو گرفتار

---

[1]: مجلہ "روشنی"، گورنمنٹ کالج فیصل آباد (لائلپور) قائداعظم نمبر ص ۹۲-۹۳ ۱۹۷۶ء

کیا گیا اور آپ تحریک کے اختتام تک ہوشیارپور جیل میں رہے ۔ جب تحریک قیام پاکستان زوروں پر تھی تو آپ نے اپنے رفقاء کار کے وفود بنا کر قائداعظمؒ کے پیغام کو اپنے ضلع کے گوشہ گوشہ میں پہنچایا۔ بچوں کیلئے قرآن پاک کی تعلیم کا بندوبست بھی کیا جہاں حافظ کمال الدین شہید، قیام پاکستان تک پڑھاتے رہے اور انہوں نے کئی ایک حفاظ شاگرد پیدا کئے ۔ اندرونی مسجد میں آپ ہی کی کوششوں سے باقاعدہ جمعۃ المبارک شروع ہوا ۔ قصبہ کے اردگرد جو دیہات الگ الگ نماز عید ادا کرتے تھے انہیں ایک مرکز پر لاکر تحریک کے جانثار سپاہی بنا دیا۔

۱۴ راگست ۱۹۴۷ ء کو جب آزادی کا سورج طلوع ہوا تو چوہدری صاحب کو ہجرت فرما کر اپنے خوابوں کی تعبیر پاکستان میں آنا تھا ۔ ۲۷ راگست ۱۹۴۷ ء کو پاکستان آنے کیلئے بارہ ملٹری ٹرک لے کر لاہور سے بجواڑہ ضلع ہوشیارپور کے لئے روانہ ہوئے تاکہ اپنے تمام خاندان کو پاکستان لے آئیں جب ہوشیارپور نصرالہ اسٹیشن کے قریب پہنچے تو ایک بوڑھا اپنے کندھے پر ایک بچہ اٹھائے ہوئے پریشانی کے عالم میں ان ٹرکوں کے سامنے آگیا اور ہاتھ جوڑ کر بتایا کہ سکھوں نے ہمارے اوپر حملہ کر دیا ہے ، بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کو قتل کر رہے ہیں اور نوجوان لڑکیوں کو اٹھا اٹھا کر لے جا رہے ہیں خدا کے لئے ہمیں اس ظلم سے بچاؤ ۔ والد گرامی نے ایک ملٹری افسر سے کہا کہ گیارہ ٹرک اس بوڑھے کے ساتھ بھیج دیں۔ اس افسر نے جواب دیا کہ ہمیں حکم یہ ہے کہ آپ کے ساتھ جائیں اور آپ کے خاندان کے لوگوں کو لائیں ۔ چوہدری صاحب نے جواباً کہا کہ ایسا نہیں ہوگا آپ میری درخواست پر بھیجے گئے ہیں اور اب میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ صرف ایک ٹرک ہمارے لئے رہنے دیں اور دوسرے گیارہ ٹرک ان بے یار و مددگار مسلمانوں کے لئے روانہ کر دیں ۔ چنانچہ ایسے ہی ہوا اور گیارہ ٹرک اس بوڑھے کے ساتھ بھیج دیئے گئے ۔ آگ اور خون کے اس کھیل میں بھی اپنی ضرورت تک کو پیش نظر نہ رکھا ۔ اپنا سارا سامان ادھر ہی چھوڑ آئے اور ستر کے قریب افراد اس واحد ٹرک پر سوار ہو کر پاکستان آئے ۔ پندرہ بیس روز لاہور میں ، دو ماہ (لائلپور) فیصل آباد میں ، چھ ماہ میاں چنوں ضلع ملتان میں ، ایک برس میانوالی میں پھر فیصل آباد آکر مستقل رہائش اختیار کر لی ۔

میانوالی میں ، ہوشیارپور کے ایک مہاجر محمد شفیع خاں صاحب بازار میں نظر آئے اتفاق ایسا تھا کہ مولانا عبدالستار خان نیازی صاحب بھی مل گئے انہوں نے فرمایا کہ جیب میں نے تمہارے لئے

برف کا کارخانہ رکھا ہوا ہے (اسوقت میانوالی میں برف کا صرف ایک ہی کارخانہ تھا) تو چوہدری صاحب نے گذارش کی کہ یہ کارخانہ شفیع خاں صاحب کو دیدیں حضرت مولانا نے فرمایا کہ یہ تو صرف حبیب کے لئے ہی رکھا ہوا ہے تو چوہدری صاحب نے فرمایا کہ شفیع خانصاحب ہی کو حبیب سمجھ لیا جائے اور انہیں کارخانہ دیدیا جائے چنانچہ نیازی صاحب نے ایسا ہی کیا حالانکہ چوہدری صاحب کے پاس اس وقت وہاں کوئی ذریعہ معاش نہ تھا۔

"ملکی مصنوعات کو فروغ دیجئے" کی تحریک فیصل آباد میں مستقل رہائش اختیار کرنے کے بعد جنوری ۱۹۵۳ء میں ملکی مصنوعات کے فروغ کیلئے کمر ہمت باندھی وزیر محنت پنجاب اور وزیر تعلیم پنجاب چوہدری علی اکبر، خان عبدالقیوم خاں[ل] اور دوسرے اکابرین نے بھی چوہدری صاحب کی تحریک پر دیسی کھدر کا استعمال شروع کر دیا۔ ۲۱ ستمبر ۱۹۵۳ء کے روزنامہ "غریب" لائل پور میں چند مسائل کے عنوان سے لیڈر کی گفتار اور کردار کے ضمن میں یوں تحریر ہے "واجب الاحترام اپوزیشن لیڈر جناب حسین شہید سہروردی لائل پور تشریف لائے دوران گفتگو میں نے ان سے عرض کیا، آپ نے ڈھاکہ کی تقریر میں ارشاد فرمایا ہے کہ غیر ملکی سوتی کپڑے کی درآمد فوری طور پر بند کر دینی چاہیئے۔ فرمانے لگے ہاں ہم نے ایسا کہا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ حکومت تو ایسا کرنے پر آمادہ ہو ہی جائے لیکن آپ سے کچھ بھی ہوئی ہے"

جناب کیوں؟ اپنے خاص موڈ میں فرمایا میں نے جسارت کی اور عرض کیا کہ وہ اس تشویش میں ہیں کہ جناب سہروردی کے لئے غیر ملکی کپڑا کہاں سے فراہم کریں گے۔ ہنس کے فرمانے لگے۔ چوٹ مارتے ہو جناب! عرض کیا گیا جو طالب علم الف۔ ب تک نہیں پڑھتا کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ وہ بڑے بڑے علمی مسائل کی گہرائی تک پہنچے گا سو وہ سپاہی میدان کارزار میں کیا کرے گا جو روزانہ جنگی مشق نہیں کرتا آمدم بسر مطلب جو لیڈر غیر ملکی سوتی کپڑے کی درآمد بند کرنے میں ملک و قوم کی نجات سمجھتا ہے اور معاشی حالات میں ایک اہم تبدیلی کا ذریعہ خود ملکی کپڑا نہیں پہنتا وہ قوم کو ملکی کپڑا استعمال کرنے کیلئے کیسے آمادہ کر سکتا ہے؟" سہروردی صاحب (سابق وزیر اعظم پاکستان) نے چوہدری صاحب سے اتفاق کیا۔

ملکی استحکام کیخاطر ملکی مصنوعات کے استعمال کے سرگرم مبلغ یوں گویا تھے کہ:

چھوڑ کے کھادی کروں اطلس و کمخواب قبول ؎ مانچسٹر کے جولاہو! مجھے منظور نہیں!
تو اپنی سرنوشت خود اپنے قلم سے لکھ ؎ خالی رکھی ہے خامۂ حق نے تیری جبیں

ل:۔ اس وقت سرحد کے مرد آہن پاکستان کے وزیر صنعت تھے۔

چوہدری صاحب کی تحریک پر وزیراعظم پاکستان محمد علی (بوگرہ) نے یکم اکتوبر ۱۹۵۲ء کی ماہانہ نشری تقریر میں کہا کہ "ملکی صنعتوں کو فروغ دینے کیلئے آپ کو عیش و آرام کی اشیاء کا استعمال ترک کرنا ہوگا"

روزنامہ "نوائے وقت" لاہور کے ۴ اکتوبر ۱۹۵۲ء کے شمارے میں "لائل پور کی ڈائری" میں ایک مفید تحریک کے زیر عنوان یوں تحریر ہے کہ "حبیب احمد چوہدری جو کہ اس تحریک کے روح رواں ہیں مستحق مبارک باد ہیں کہ انہوں نے اپنے عزمہائے عظیم کو عملی جامہ پہنایا اور اس راستے کی بہت سی صعوبتوں کو پاٹنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس قسم کی مفید ملت تحریک چلانا آسان کام نہیں لیکن ان لوگوں نے اپنی سرگرمیٔ عمل سے کافی حد تک کامیابی حاصل کی ہے چنانچہ اب اس شہر میں دیسی کپڑا پہننے والوں کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے"

چوہدری صاحب نے تقریباً بیس برس خاکی کھدر زیب تن کیا گرمیوں سردیوں میں یہی پہنتے پھر آہستہ آہستہ بوجوہ کم کر دیا۔

نظریۂ پاکستان کی اصطلاح عمر بھر نظریۂ پاکستان کی تبلیغ و ترویج کو حرز جان بنائے رکھا۔ "نظریۂ پاکستان" کی اصطلاح کو فضائے پاکستان میں عام کرنے کیلئے قلمی محاذ پر اس قدر کام کیا کہ اس میدان میں ان کا کوئی ہمسر نظر نہیں آتا، یہاں تک کہ چوہدری خلیق الزماں مرحوم اور جناب اصفہانی مرحوم نے یہ دعوی بھی کیا کہ یہ اصطلاح نئی ہے اور قائداعظم رحمۃ اللہ علیہ کے وقت میں نہ تھی تو چوہدری صاحب نے جولائی ۱۹۷۲ء میں روزنامہ "نوائے وقت" لاہور کے ایک شمارہ میں ان حضرات کے بودے دعوے کا منہ توڑ جواب دیا۔ ۱۹۶۲ء سے پہلے اور قیام پاکستان کے بعد یہ لفظ صرف ایک آدھ بار ہی تحریر میں آیا اور وہ بھی شاید اپنے درست مفہوم کا حامل نہیں تھا۔ پاکستان کی فضائے بسیط میں "نظریۂ پاکستان" کی اصطلاح کا اس قدر عام ہو جانا چوہدری صاحب ہی کی کوششوں کا حاصل ہے۔ محقق کی تحقیق کی صورت میں یہی نتیجہ سامنے آئیگا "نظریۂ پاکستان" کی اصطلاح اور چوہدری حبیب احمد لازم و ملزوم ہیں یہ انہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ پاکستان کا کوئی شخص خواہ اس اصطلاح کے مفہوم سے آشنا ہو یا نہ ہو لیکن اس لفظ "نظریۂ پاکستان" سے ضرور آشنا ہے۔ آج پورے پاکستان کی فضاء لفظ "نظریۂ پاکستان" سے معمور ہے اور اس کی بستی بستی، قریہ قریہ اور کونہ کونہ نظریۂ پاکستان کے لئے دل و جان کے نذرانے پیش کرنے کے لئے تیار!

سیاسی زندگی فیصل آباد (لائل پور) میں رہائش پذیر ہونے کے بعد آپ کی سیاسی وابستگی بدستور مسلم لیگ سے رہی۔ سٹی مسلم لیگ میں نمایاں خدمات انجام دیں ضلع مسلم لیگ کے آرگنائزنگ سیکرٹری

بھی رہے اس کے بعد جناح عوامی مسلم لیگ کے ضلع لائل پور کے سیکرٹری اور پھر کنوینر رہے۔

حسین شہید سہروردی جناح عوامی مسلم لیگ کے لیڈر تھے۔ جب وہ وزیر قانون بنائے گئے تو اتفاق ایسا تھا کہ ان کی تقرری دس نمبر پر ہوئی۔ اسوقت ہندوؤں کی بعض متروکہ فیکٹریاں اور کارخانے کسی قانونی پہلو سے ابھی مہاجرین کو الاٹ کئے جا سکتے تھے۔ ایک مجلس میں حسین شہید سہروردی، راجہ حسن اختر[1]، خواجہ عبدالرحیم[2] اور چوہدری صاحب اکٹھے تھے۔ شہید صاحب، چوہدری صاحب کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ فرمانے لگے حبیب صاحب کوئی کارخانہ دلوا دوں؟ چوہدری صاحب نے راجہ صاحب کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ راجہ صاحب ہیں! درمیان میں دوسری باتیں آگئیں شہید صاحب کو پھر خیال آیا تو وہی بات دہرائی چوہدری صاحب نے پھر پہلوتہی کی اور خواجہ صاحب کی طرف اشارہ کر دیا۔ اس پر شہید صاحب نے فرمایا میں جانتا ہوں! ہاں! یہ راجہ صاحب ہیں! یہ خواجہ صاحب ہیں! میں تو حبیب چوہدری کے لئے کچھ چاہتا ہوں۔ اس استغناء کے پیکر نے شوخ لہجے میں جواب دیا کہ شہید صاحب ابھی آپ دس نمبر میں ہیں، ایک نمبر پر ہوں گے تو پھر بات کریں گے۔

جب سہروردی وزیر اعظم بنے تو انہوں نے مخلوط انتخاب کی حمایت کی۔ پاکستان دو قومی نظریہ کی بنا پر معرض وجود میں آیا تھا اس لئے یہ مرد قلندر اور پاکستان کا شیدائی یہ کیسے برداشت کر سکتا تھا وہ تو دو قومی نظریہ کا زبردست موید و حامی تھا، اسی وقت جناح عوامی مسلم لیگ سے علیحدگی اختیار کر لی۔ یہ تھا لالچ و حرص سے پاک وہ مرد جلیل جو اصولوں کی خاطر حسین شہید سہروردی کے ایک نمبر سے بھی پہلوتہی کر گیا! سہروردی جب وزیر اعظم کی حیثیت سے فیصل آباد تشریف لائے تو چوہدری صاحب ملنے تک نہ گئے۔ شہید صاحب کی طرف سے بلاوا بھی آیا لیکن پھر بھی ملاقات نہ کی۔ یہ بھی ان کے عظمت کردار کی ایک جھلک.....

سابق صدر محمد ایوب خان کو مسلم لیگ کے ذریعے خدمت کرنے کی ترغیب سب سے پہلے آپ نے روزنامہ "عوام" لائل پور اور روزنامہ "نوائے وقت" لاہور میں ایک مدلل مضمون لکھ کر دی۔ راجہ حسن اختر اور خواجہ عبدالرحیم (مرحومین) جیسے فدایانِ اقبال کے ساتھ پاکستان مسلم لیگ میں سرگرم عمل رہے۔

پیامِ اقبالؒ پیام اقبالؒ کو عام کرنا آپ کا مقصدِ وحید تھا۔ یہ اقبالؒ کے شیدائی فکر اقبال کی گہرائیوں میں مستغرق رہتے۔ فکر اقبال کے ہر پہلو پر ان کی گہری نظر تھی۔ ۱۹۳۸ء سے لیکر تادم

---

[1] :- راجہ حسن اختر ضلع ساہیوال کے ڈپٹی کمشنر رہے اور بعد میں پاکستان مسلم لیگ کے مغربی پاکستان کے صدر بھی رہے

[2] :- خواجہ صاحب کمشنر رہے۔ اور سرکاری ہوتے افسر ہوتے بھی انہوں نے تحریک پاکستان کیلئے سرفروشانہ خدمات سرانجام دیں۔

مگر شاید کوئی ہی دن ایسا گزرا ہو جس میں فکرِ اقبال کی رعنائیوں سے فیضیاب نہ ہوئے ہوں، میں زندگی بھر ان کا یہ تسلسل دیکھتا رہا کہ وہ ہر حالت میں کم از کم دو چار گھنٹے کلامِ اقبال کو پڑھتے لکھتے اور غور فرماتے رہتے یہاں تک کہ عید کے روز بھی ان کے اس عمل میں کوتاہی نہ ہوتی۔ انہیں یقین کامل تھا کہ جب تک انسان سالارِ انسانیت ﷺ کے لائے ہوئے قانونِ زندگی پر عمل پیرا نہیں ہوتا اس وقت تک ناہمواریوں کے جگر سوز شعلے انسانیت کو امن و سلامتی کے گہوارہ تک پہنچنے نہیں دیں گے۔ محمد الرسول اللہ والذین معہٗ کا پیش کردہ قانونِ حیات (دین) سلامتی کا ضامن اور اس پر ایمان لانے والے مومنین معاشرتی امن کی ضمانت دیں گے۔ یہی وہ درخشندہ اور حیات بخش نظام ہے جس کی ضو فشانیوں سے عالمِ انسانیت کو منور کرکے کہا جاسکے گا کہ — اس کو کہتے ہیں عالم آرائی — ابھی دنیا اپنے رزق کی مشکلات کا حل کمیونزم اور سوشلزم جیسے میکانکی طریقوں سے کرنا چاہتی ہے جو کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے جب وہ ان طریقوں اور تدبیروں کو آزما دیکھے گی تو اس کے بعد وہ قرآنی علاج کی طرف آئیگی اور اس کے دکھوں کا مداوا بھی اسی وقت ہوگا اپنی دنیا سے "خدا" کو نکال کر امن کی آرزو کرنا — محال است و خیال است و جنوں — اب سوشلزم اور کمیونزم کی ماری ہاری دنیا امن و سکون کی متلاشی ہے اس کے لئے دینِ اسلام ہی ایک اور واحد راستہ ہے۔ پیامِ اقبال کو عام کرنے کیلئے آپ نے اپنے شہر میں مجلس اقبال تشکیل دی۔ پنجاب یونیورسٹی کے پروفیسر محمد منور مرزا صاحب نے ہفت روزہ "وفاق" لائلپور ۲۲ اپریل ۱۹۶۱ء کے اقبال نمبر صفحہ ۵ کالم ۱ میں یوں تحریر فرمایا ہے کہ:۔ "ہوا یوں کہ گورنمنٹ کالج لائل پور میں پروفیسر راجہ عبدالقادر صاحب کی کوشش سے ۱۹۵۶ء میں "یوم اقبال" منایا گیا صدارت جناب راجہ حسن اختر نے فرمائی اس اجتماع میں ایک مقالہ میرا بھی تھا جب مجلس برخاست ہوئی تو میں اٹھ کر چلا گیا راجہ حسن اختر صاحب سے میرا کوئی تعارف نہ تھا مگر میری جو لزل آئی تو راجہ صاحب نے میرے مقالے کے حق میں میری غیر حاضری میں کلمۂ خیر کہہ دیا جو میری مزید بدقسمتی سے چوہدری حبیب احمد صاحب جو راجہ صاحب کے نیاز مندوں میں ہیں آن لیا — بس پھر کیا تھا چوہدری حبیب احمد صاحب مجھ سے انتقام لینے کے طریقے سوچنے لگے مجھ سے ان کا اس وقت تک بھی تعارف نہ تھا۔ ورنہ شاید ان کے لئے انتقام کی منزل سہل تر ہو جاتی۔

آخر ہوا یہ کہ حبیب صاحب اپنے ایک دوست رانا اکرام صاحب کو لے کر مجھ پر حملہ آور ہوئے یہ بات ۱۹۵۷ء کے مارچ کی ہے — حبیب صاحب اور رانا صاحب نے بلا تمہید گفتگو شروع کی اور کہا کہ ادب کے نام ہمارے شاہین بچوں کو خاکبازی کا درس دیا جا رہا ہے ہم اہم چاہتے

ہیں کہ یہاں "مجلسِ اقبال" قائم کیجائے جو "مرکزیہ مجلس اقبال" لاہور کی شاخ ہو اس مجلس کے ذریعے ہم کوشش کریں گے کہ حضرت علامہ کے خیالات کی تبلیغ ہوتی رہے۔ یہ تبلیغ درحقیقت اسلام کیا انسانیت کی ترجمانی ہے۔

میں کہا "خوب ہے۔ ضرور مجلسِ اقبال قائم کیجئے"۔ کہا گیا "آپ ہماری مدد کریں" میں نے جواباً عرض کیا کہ بھئی میں گوشہ نشین شخص ہوں۔ تنہائی بہت زیادہ پسند ہے کم ملتا ہوں کم نکلتا ہوں"

پروفیسر افتخار احمد چشتی صاحب فیصل آباد کی مشہور علمی شخصیت ہیں ان کی یکم صفر ۱۴۰۲ھ کی تحریر کا اقتباس ملاحظہ ہو:۔

"میں ۱۹۵۵ء میں جھنگ سے تبدیل ہو کر گورنمنٹ کالج لائل پور (حال فیصل آباد) کے شعبۂ اسلامیات میں بطور لیکچرر آیا تو جن احباب سے ملاقات ہوئی اور پھر دوستی ہو گئی ان میں جناب حبیب چودھری کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ حبیب چودھری علامہ اقبال کے شیدائی تھے انہوں نے "تکلوں اور تکلیفوں" کے اس شہر میں مجلس اقبال کے قیام کا فیصلہ کیا تو گورنمنٹ کالج کے شاف روم پر حملہ آور ہوئے۔ ملاقات کے بعد فیصلہ ہوا کہ ابتدائی اجلاس بلایا جائے اور مجلسِ اقبال قائم کر دی جائے۔

مئی ۱۹۵۶ء میں مسلم لیگ ہال میں ایک اجلاس ہوا جس میں مجلس اقبال کی تشکیل دی گئی۔

مجلس اقبال کے پہلے صدر پروفیسر مرزا محمد منور تھے مگر اس مجلس کی اصل روح حبیب چودھری کی ذات تھی۔ پروفیسر مرزا محمد منور نے ہفت روزہ "وفاق" لائلپور کے اقبال نمبر میں چودھری کے بارے میں لکھا تھا:۔

"ہر مجلس میں کوئی نہ کوئی دیوانہ ایسا ہوتا ہے جس کی دیوانگی اور شغف اس مجلس کی جان و روان بن جاتی ہے۔ مجلس اقبال میں یہ مقام شرف چودھری حبیب احمد صاحب کو حاصل ہے جن کے بارے میں ابتداً عرض کر چکا ہوں کہ وہ اچھے خاصے خدائی فوجدار ہیں۔ میں نے دیکھا کہ اگر کسی بزرگ یا عزیز کے پاس حبیب صاحب درخواست لیکر گئے کہ جناب اگلے مہینہ کے پہلے جمعہ کو آپ مجلسِ اقبال میں مقالہ پڑھیں گے تو اس بزرگ یا عزیز سے انکار کرنا مشکل ہو گیا۔ نہ چوہدری محمد علی انکار کر سکے نہ راجہ حسن اختر، نہ میاں محمد شفیع اور نہ میاں عبدالباری صاحب۔"

مجلسِ اقبال برسوں قائم رہی۔ اب بھی ہے۔ ہمیشہ قائم رہے گی۔ جب تک اقبال ہے مجلس اقبال بھی ہے۔ مگر جو کام حبیب چودھری کے زمانہ میں ہوا وہ پھر نہیں ہو سکا۔ مقالہ نگار کا انتخاب، اس کی تلاش، اس سے ہاں کرانا، وقت کا تعین، اراکین کو اطلاعات، سامعین کی تلاش، نشست گاہ کی ترتیب اور بعد ازاں چائے کا اہتمام

عرضیکہ ابتدا تا انتہا ان کی انتھک مساعی مجلس کی شامل حال رہتی تھیں مجلس اقبال کے لئے سید کرامت حسین جعفری مرحوم، جناب خلیق قریشی صاحب مرحوم اور سب سے زیادہ جناب حبیب چودھری مرحوم کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں"

عارف رضا صاحب گورنمنٹ کالج فیصل آباد میں نفسیات کے پروفیسر ہیں اور مجلس اقبال کے سیکرٹری ان کی تحریر ملاحظہ ہو:-

"مرحوم کو علامہ اقبالؒ سے عشق کی حد تک لگاؤ تھا، وہ مجلس اقبال" فیصل آباد کے بانی ارکان میں سے تھے اور سالہا سال تک "مجلس اقبال" کی علمی اور مجلسی سرگرمیوں میں بھرپور اور عملی حصہ لیتے رہے وہ اکثر اوقات تن تنہا ماہوار مجالس اور سالانہ جلسوں میں سامعین کی نشستوں اور چائے وغیرہ کا انتظام اپنے ہاتھوں سے کرتے وہ اقبال کی مجالس میں وقتاً فوقتاً مضامین و مقالات پڑھتے رہے اور نہایت دردمندی اور دلسوزی کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہے۔

قبلہ پروفیسر افتخار احمد چشتی نے (۱۴ر اپریل ۱۹۷۵ء) ریٹائر ہونے کے بعد تبلیغ اسلام اور اسلامی تصوف کی نشر و اشاعت کے لئے اپنے تئیں وقف کر لینے کے بعد مجلس اقبال کی صدارت سے سبکدوش ہونے کا فیصلہ کیا تو راقم سیکرٹری اور مرحوم چوہدری حبیب احمد صدر بنے تو اس طرح مجھے چوہدری صاحب کو زیادہ قریب سے دیکھنے اور ان کے ساتھ کام کرنے موقع ملا۔ چوہدری صاحب دھن کے پکے اور جنون کی حد تک علامہ مرحوم کے پرستار تھے۔

مجھے معلوم ہے کہ سخت گرمیوں میں ایک دفعہ ۱۰۵ درجے بخار میں مبتلا ہونے کے باوجود، چوہدری صاحب مجلس اقبال کے اجلاس میں شریک ہوئے اور حسب عادت و روایت کرسیاں درست کیں"

وفات سے ایک ڈیڑھ سال پیشتر مرحوم نے علامہ غلام احمد پرویز کو مجلس اقبال کے یوم اقبال[۱] کی صدارت کرنے کی دعوت دی جسے مجلس کے اکثر ارکان نے علامہ کی مذہبی اعتبار سے متنازعہ فی حیثیت کی بنا پر قبول نہ کیا، مرحوم کو اس بات کا قلق ہوا اور وہ مجلس اقبال سے الگ ہو گئے اور مجلس فکر اقبال قائم کی جس کے تحت وہ سرگرمی کیساتھ مجالس اقبال منعقد کرتے رہے۔ تاہم انہوں نے ذاتی تعلقات

---

[۱]: مسلم لیگ ہال منٹگمری بازار میں تھا۔

ہیں کوئی فرق نہ آنے دیا۔"

تحریکِ پاکستان کے سلسلہ میں لکھی گئی ایک قابلِ قدر کتاب "اکابر تحریکِ پاکستان" کے مؤلف محمد صادق قصوری صاحب نے چوہدری حبیب احمد اور علامہ اقبالؒ میں جو تعلق تحریر فرمایا ہے ملاحظہ ہو:۔

" بڑا ہی خوش نصیب ہے لاہور کہ اس میں نہ صرف پنجاب بلکہ ہندوستان بھر کا بہترین سمجھ دار اور روشن دماغ شخص اقبالؔ موجود ہے اور بڑا ہی بدنصیب ہے لاہور کہ اُس کے باشندوں نے اقبالؔ کی صحبتوں سے فائدہ اٹھانے اور فیضیاب ہونے کی کماحقہٗ کوشش نہیں کی۔ ایک زمانہ ضرور ایسا آنے والا ہے کہ ہندوستان کی تاریخ میں پنجاب کے موجباتِ عظمت جب لکھے جائیں گے، تو اُن میں ڈاکٹر اقبالؔ کا نام نمایاں حروف میں نظر آئیگا اور ہر سیالکوٹی و لاہوری اقبالؔ کا نام لے لے کر فخر کریگا لیکن یہ فخر ندامت و شرمندگی سے تبدیل ہو جائیگا، جب اس حقیقت کا انکشاف ہوگا کہ روہیل کھنڈ کا ایک شخص صرف ڈاکٹر اقبالؔ کی صحبت میں چند گھنٹے گزارنے اور بعض مسائلِ علمیہ کو سمجھنے کیلئے گنگا، جمنا، ستلج، بیاس وغیرہ دریاؤں کو عبور کرکے راوی کے کنارے لاہور پہنچ سکتا تھا، لیکن لاہور میں رہنے والوں کو کبھی برسوں میں بھی اس امر کی خواہش نہیں ہوتی تھی کہ ڈاکٹر اقبالؔ سے کچھ سُنیں اور پوچھیں۔"

یہ ہیں وہ الفاظ جو مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی نے حکیم الامّت علامہ اقبالؒ سے ملاقات کے بعد اپنے رسالہ "عبرت" میں لکھے۔ اگر مولانا زندہ رہتے تو چوہدری حبیب احمد مرحوم سے ملاقات کرنے کے بعد بلاشک و شبہ فیصل آباد کے لوگوں کی بےحسّی و بےنیازی کی مرثیہ خوانی کرتے۔ کیونکہ چوہدری حبیب احمد، حضرت اقبالؒ کے بعد دو قومی نظریہ کے سب سے بڑے مبلغ تھے۔ پاکستان میں نظریۂ پاکستان کی اصطلاح کو عام کرنا اور نظریۂ پاکستان کے دشمنوں کی سرکوبی ان کا وہ سنہری کارنامہ ہے جسے قوم کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔ انہوں نے فکرِ اقبال کی روشنی میں اسلام و پاکستان کے دشمنوں کا اس طرح پوسٹ مارٹم کیا کہ موجودہ دور کی تاریخ ایسی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔ مگر افسوس کی بات ہے کہ فیصل آباد کے شہریوں نے ان کی کوئی قدر نہ کی جبکہ اکنافِ ملک سے لوگ استفادہ کرتے رہتے تھے۔

چوہدری صاحب کی فکرِ اقبالؒ کے عام کرنے کی تڑپ اہلِ قلم حضرات سے اس خطاب کی تحریر سے عیاں ہے۔

؎ اے قلم بردارِ ملّت! میں کلکِ ازل کا یہ پیغامِ ابدی سنانے آیا ہوں کہ

خیز و قانونِ اخوت ساز دہ

ہم اپنی عزیز مملکت میں پھیلی ہوئی سازشوں کی مدافعت اسی طریقہ سے کر سکتے ہیں۔ میں وہ خواب رُبا قصہ چھیڑنا نہیں چاہتا کہ ہمارے سینوں سے وہ حرارت ایمانی کس ابلیس نے چھین لی جو اقبالؒ کے دنوں کی تپش اور شبوں کے گداز اور گریۂ آہ سحر گاہی نے ہمیں عطا کی تھی"۔

نظریۂ پاکستان اور قلمی محاذ

آپ قلمی محاذ پر زندگی کے آخری دن تک نظریہ پاکستان اور تحریکِ قیام پاکستان کے مخالفین اور معاندین کے خلاف صف آرا رہے، "جماعت اسلامی کا رخِ کردار" "تحریکِ پاکستان اور نیشنلسٹ علماء" اور "نظریۂ پاکستان" جیسی شہرت یافتہ کتابیں لکھ کر اپنی قابلیت، تاریخ دانی اور حب الوطنی کا لوہا منوایا ہے۔ انہوں نے زیرِ نظر مکمل کتاب کے نو صد صفحات تحریر فرمائے ہیں۔

آپ کا مفاہمت نا آشنا قلم تحریکِ پاکستان کی تاریخ کو دھندلا کرنے کی ہر اس کوشش کے خلاف نبرد آزما ہوا جس نے ذرا بھر بھی حقیقت کو غلط روپ میں پیش کرنے کی جسارت کی۔ زندگی بھر تحریکِ پاکستان پر غلط نویسی اور غلط بیانیوں کے گرد و غبار کو ہٹاتے رہے۔ یہ ان کا ایک ایسا عظیم کارنامہ ہے جسے کوئی بھی مورخ نظر انداز نہیں کر سکتا۔

آپ نے نظریۂ پاکستان کو لوگوں کے قلوب و جگر میں راسخ کرنے کیلئے ایک جریدہ ہفت روزہ "نظریۂ پاکستان" کا اجراء کیا۔ پہلا شمارہ ۲۸ جون ۱۹۷۱ء بروز پیر شائع ہوا، اس نے پاکستان کے طول و عرض میں حُبّ الوطنی کی حرارت پیدا کر دی۔ چوہدری صاحب نے تین برس کے اندر چالیس پچاس ہزار روپیہ اس نظریاتی جریدے کی نذر کر دیا۔ ان کی جیب کب تک یہ بوجھ برداشت کر سکتی تھی۔ دفتری عملہ نے ان کی مالی مجبوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے خود چلانے کا ذمہ لیا لیکن یہ عملہ کی غلط کاری، غلط نویسی اور غلط کرداری کی وجہ سے بند ہو گیا۔ اس کتاب کی اشاعت کے بعد اس کے دوبارہ اجراء کے لئے کوشش کرنا چاہتے تھے کہ حکمِ ربّی آن پہنچا۔ جہاں پاکستان کے بڑے بڑے اخبارات و رسائل میں مختلف موضوعات پر ان کے مضامین چھپتے رہے وہاں انہوں نے چند کتابچے بھی تحریر کئے ان میں "تحریکِ نظریۂ پاکستان — قائداعظمؒ کا فرمان" فیصل آباد میں ۲۶ جنوری ۱۹۶۸ء کو بھٹو کی تقریر کے جواب میں "پیپلز پارٹی اور انقلابی جدوجہد" کے عنوان سے ایک مدلل کتابچہ تحریر فرمایا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:-

"جہاں ازم کا لفظ آئے گا اس کا مفہوم و معنی "نظام" ہوگا۔ اسلامی سوشلزم کہتے سے اسلام کچھ اس طرح کمزور، وناتواں اور مجبور و بے بس نظر آتا ہے جیسے کہ اسے خارجی سہاروں کے بغیر چلنا ممکن نہیں، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ اسلام ہر دور کے ابھرتے تقاضوں کے مطابق کاروان انسانیت کی رہنمائی و راہبری کے لئے اپنے اندر اعلیٰ صلاحیتیں اور بہترین جوہر رکھتا ہے۔ یہ قافلۂ آدمیت کو زندگی کے کسی موڑ پر یہ کہکر مایوس نہیں کرتا کہ اب مجھ میں تمہاری رہنمائی کرنے کے لئے ہمت و اہلیت نہیں ہے" ؎

"شنیدم آنچہ از پاکان امت   ؛   ترا با شوخیٔ رندانہ گفتم"

تحریک قیام پاکستان کے مخالفین و معاندین کے بارے میں آپ کا رویّہ کسقدر سخت تھا اس کی ایک جھلک تحریک پاکستان کی ایک قابل قدر اور با اصول شخصیت حمید نظامی کی وفات سے چند روز پہلے کی چوہدری صاحب سے ایک ملاقات میں چوہدری صاحب کیلئے نظامی مرحوم کا خراجِ تحسین ملاحظہ ہو:۔

" حبیب! میں بھی شورش کاشمیری سے سمجھوتہ کر چکا ہوں، لیکن تم نے آج تک تحریکِ پاکستان کے کسی بھی مخالف کو کوئی احترام نہیں دیا"

آپ کی وفات حسرت آیات پائلٹ گراؤنڈ پیپلز کالونی میں تقریباً چار میل کی سیر اور ورزش کے تھوڑی دیر بعد ۱۶ ار رجب المرجب ۱۴۰۰ھ / ۳۱ مئی ۱۹۸۰ء بروز ہفتہ صبح سوا چھ بجے حرکتِ قلب بند ہو جانے کی وجہ سے ۱۳۲۹۔ بی پیپلز کالونی فیصل آباد میں ہوئی۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ط

آپ کی شخصیت کے بارے میں تحریک پاکستان کی صفِ اوّل کے چند ساتھیوں، دوستوں اور دوسرے رفقائے کار کے تاثرات پیش کئے جاتے ہیں:۔

مولانا عبدالستار خان صاحب نیازی سے تحریک پاکستان کے اوّلین کارکنوں میں سے ایک ہونیکے ناطے ذاتی اور دوستانہ مراسم تھے انہوں نے اپنے تاثرات کو تعزیتی خط میں یوں تحریر کیا ہے۔

" چودھری حبیب احمد صاحب مرحوم و مغفور تحریک پاکستان کے نڈر مجاہد اور نظریۂ پاکستان کے باغیرت محافظ تھے۔ کانگریسی ایجنٹوں، مخلوط قومیت کے پرستاروں اور سوداگری اسلام کے علم برداروں کے دوغلے کردار کو انہوں نے ہمیشہ بے نقاب رکھا اور ان کے ساتھ معاملات میں کبھی رواداری، مداہنت، مجاملت اور تسامح کو روا نہیں رکھا وہ شمشیر برہنہ تھے۔

؎ ۔۔۔ ۴ اگست ۱۹۷۰ء

اور دشمنانِ تحریک کی بابت ان کا نقطۂ نگاہ بالکل غیر مصالحانہ (uncompromising) تھا۔ "تحریک پاکستان اور نیشنلسٹ علماء" جیسی ایک ضخیم محققانہ کتاب لکھ کر انہوں نے کاسہ لیسان کانگرس کے رخِ کردار کی نہایت ہی بھرپور اور قلندرانہ انداز میں نشاندھی کی اور بمصداق سے

تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را گاہے گاہے بازخواں ایں قصۂ پارینہ را

نئی نسل کو ایک بار پھر "دوست و دشمن" کے امتیاز سے آگاہ کر دیا۔

آجکل گاندھی جی کے دیرینہ چیلوں نے دینی مراکز کی کمینگاہوں سے پنڈت نہرو کی سپتری کے ساتھ ناطہ قائم کر کے عہدِ وفا باندھ لیا ہے اور حال ہی میں دار العلوم دیوبند کا صد سالہ جشن منا کر متحدہ قومیت کے ناپاک و مردود اور مسترد نظریہ کی نہ صرف تائید کی ہے بلکہ غارت گرِ دین و ایمان دشمن پاکستان مسز اندرا گاندھی سے تجدید بیعت کر لی ہے۔ برہمنی کے افسوں میں آ کر وہ اپنی نجی محفلوں میں کہتے پھرتے ہیں کہ قیام پاکستان کا منصوبہ غلط تھا معلوم ہوتا ہے بمصداق آیت قرآنی وَاُشْرِبُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْعِجْلَ۔ (گاو سالہ سامری کی محبت ان کے دلوں میں رچ بس گئی ہے) ان کے قلوب میں اکھنڈ بھارت کی محبت رچ بس گئی ہے۔

"حکیم الامت حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے دور کے فقیہانِ حرم کی "بے توفیقی" اور لغت ہائے حجازی" کے قارونوں کا شکوہ کیا تھا اور ع "چہ خبر زمقام محمد عربی است"، کہہ کر نشاندہی کی تھی۔ ان کے بعد چوہدری حبیب احمد صاحب (جو اقبالؒ کے روحانی فرزند ہیں) نے ان کو بار بار للکارا، دعوت مبارزت دی اور ان کے قلبی دوغلاہٹ کو جسے انہوں نے جبہ و دستار کے پیچ و خم میں چھپا رکھا تھا، جرأتِ رندانہ اور فکرِ حکیمانہ سے طشت از بام کر کے انہیں ساری قوم کے سامنے مجرموں کے کٹہرے میں لا کھڑا کیا۔

کچھ لوگ "تاویلات کے پاژند" بن اپنی "صالحیت" اور "اصلحیت" کے زعم میں یہ مغالطہ دینا چاہتے ہیں کہ وہ روزِ اوّل سے ہی نظریۂ پاکستان کے حامی تھے حالانکہ ان کی "ژولیدہ مغزی" نے اس وقت (Primium mobile) (The Premium) "سلطنت در سلطنت" کا فلسفہ گھڑ کر کے برصغیر کے اہم

آئینی مسئلہ کو نہ صرف نظر انداز کیا بلکہ تحریکِ پاکستان کی قیادت کا مذاق اڑایا۔ وہ متحدہ ہندوستان میں رہ کر "اقامت دین" کے سہانے خواب دیکھتے تھے۔ چوہدری حبیب احمد کا کمال یہ ہے کہ ان تمام تحریفی، انحرافی اور اعتزالی رجحانات کیخلاف جو مکھی لڑائی لڑ کے ایک ایک دشمنِ پاکستان کا محاسبہ کر کے اسے بے نقاب کیا۔

مالی وسائل کے فقدان، خانگی ذمہ داریوں اور اپنوں اور بیگانوں کی سرد مہریوں کے باوجود اپنا مشن جاری رکھا اور بقول حضرت مولانا ظفر علیخاں مرحوم "قلم" سے تیغ بُراں کا کام لیکر نیشنلسٹ علماء کو فکری اعتبار سے گھائل اور سیاسی لحاظ سے لاطائل بنا دیا۔ حضرت علامہ علیہ الرحمۃ نے ؎

"مرا طریق، امیری نہیں فقیری ہے ؛ خودی نہ بیچ! غریبی میں نام پیدا کر"

کا اعلان فرما کر جو نشانِ راہ تجویز کیا تھا، چودھری صاحب ساری عمر اسی پر گامزن رہے اور بلا شبہ بحیطۂ فکر سیاست میں اپنا نام اور مقام پیدا کر لیا" شرکت میانۂ حق و باطل" کو مسترد کر کے "لاشریک حق" کا غلغلہ بلند کیا اور ہمیشہ ہمیشہ کیلئے باطل کی منافقت اور "دوئی پسندی" کو طشت از بام کر کے حکیم الامت کا یہ پیغام سنا دیا کہ ؎

باطل دوئی پسند ہے، حق لاشریک ہے ؛ شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

چودھری صاحب نے "فقرِ غیور" کو اپنا نصب العین بنایا اور اسی کی خاطر کشمکشِ حیات میں شدائد و بلیّات کا مقابلہ کرتے رہے۔ وہ اگر چاہتے تو اپنے گرد زر و سیم کے ڈھیر لگا سکتے تھے اور اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "تحریکِ پاکستان اور نیشنلسٹ علماء" کی بدولت سرکار دربار میں زبردست رسوخ حاصل کر سکتے تھے فیلڈ مارشل محمد ایوب خان مرحوم صدر پاکستان نے ذاتی طور پر مصنف کی کاوش کی تعریف کی اور اسے ہر وقت زیرِ مطالعہ رکھتے تھے۔ وفات سے قبل اپنی تحقیق انیق پر مشتمل ایک نئی کتاب شائع کرنا چاہتے تھے مگر عمر نے وفا نہ کی۔ انشاء اللہ یہ کتاب ان کے فرزند ارجمند خلف الصدق چودھری رفیق احمد صاحب ایم۔ اے کی مساعی جمیلہ سے جلد زیورِ طبع سے آراستہ و پیراستہ شائقین کے ہاتھوں تک پہنچ جائے گی۔[1]

چودھری حبیب احمد صاحب مرحوم و مغفور سے میرا رابطہ قیام پاکستان سے قبل

---

[1] : خدا کے فضل و کرم سے اب یہ کتاب شائقین کیلئے حاضر ہے۔

قائم ہوا اور ان کے اخلاص و مودت کی بدولت آخر دم تک قائم رہا۔ ۱۹۴۵ء میں مجھے ایک ملی تقریب میں شرکت کیلئے ہوشیار پور جانا پڑا۔ اس موقع پر چودھری حبیب صاحب نے مطالبۂ پاکستان کی حمایت میں ایک جلسہ منعقد کیا جس میں مجھے شمولیت کی دعوت دی گئی۔ رات کو جلسہ ہوا اور دوسرے دن ان کی معیت میں کوٹ عبدالخالق رحمۃ اللہ علیہ اور بستی جہان خیلاں کا دورہ کیا گیا۔ ہجرت کے بعد وہ میانوالی تشریف لائے ——— اور بعد میں مستقل طور پر لائل پور (فیصل آباد) میں آباد ہو گئے، وہ جب کبھی لاہور آتے، مجھ سے ضرور ملتے بلکہ جب کبھی مجھے لائل پور جانے کا موقع ملتا وہ بالالتزام میری ملاقات کے لئے تشریف لاتے تھے۔

مرحوم ایک راسخ العقیدہ مرد مومن تھے، پابند صوم و صلوٰۃ تھے اور حضور ختمی مرتبت سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس سے والہانہ عشق رکھتے تھے۔ صلوٰۃ و سلام کی محافل میں شریک ہوتے اور سوادِ اعظم کی وحدت و استحکام کو ملکی سلامتی و بقاء کی ضمانت قرار دیتے تھے۔ علمی تحقیقی کام میں برابر مجھ سے رابطہ رکھتے تھے۔ افسوس! اُن کی وفات سے میرے حلقۂ احباب میں ایک زبردست خلا پیدا ہو گیا ہے جس کی تلافی از قبیل ناممکنات ہے۔ جس شخص کے ساتھ مسلسل چالیس سال رابطہ رہا ہو اور جس سے بے تکلف قلبی کیفیات اور واردات کا تبادلہ ہو سکتا ہو اس کی جدائی یقیناً ایک ابتلاء اور سانحۂ عظیم ہے۔ چودھری صاحب حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے درج ذیل ارشاد کی عملی تصویر تھے ؎

مرد درویش کا سرمایہ ہے نقط آزادی و مرگ ؛ ہے کسی اور کے واسطے یہ لعاب زر و سیم

جناب حکیم آفتاب احمد قرشی ایم اے تحریک پاکستان کے صف اوّل کے چند نامور سپاہیوں میں سے ایک ہیں اور موتمر عالم اسلامی پاکستان کے صدر ہیں۔ "تحریک پاکستان کا شعلۂ جوالہ" کے عنوان کے تحت ضبطِ تحریر میں لاتے ہیں کہ:۔

" چوہدری حبیب احمد مرحوم تحریک پاکستان کے شعلۂ جوالہ تھے۔ ان کے قلب میں پاکستان کی محبت اس درجہ تھی جو انہیں بے قرار رکھتی تھی۔ پاکستان کے لئے وہ حد درجہ مضطرب رہتے تھے، انہیں ہر دم پاکستان کی فکر تھی، اسی اضطراب نے انہیں

شعلۂ بیباک بنا دیا تھا۔ بسا اوقات ان کا قلم انگارے برساتا تھا اور ان کی زبان سے بھی تلخ کلمات نکلتے تھے۔ مگر یہ سارا ردِعمل پاکستان کے لئے تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ قیامِ پاکستان ہماری منزلِ مقصود نہیں ہے بلکہ آغازِ سفر ہے۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ بہت سے مسافر قیامِ پاکستان کو اپنی منزل سمجھے اور قافلۂ پاکستان چوہدری حبیب احمد جیسے سرفروش عاشقیوں کو ساتھ لئے جادۂ پیما رہا۔ چوہدری حبیب احمد تحریکِ پاکستان کے نامور کارکن تھے۔ وہ مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے ممتاز راہنما تھے۔ بڑے مخلص دوست تھے۔ اُن کی رفاقت میں جو لمحات گذرے وہ میری زندگی کا سرمایۂ عزیز ہیں۔ چوہدری حبیب احمد سے جب بھی ملاقات ہوتی وہ بڑی محبت اور خلوص سے ملتے۔ ایسا خلوص جو تحریکِ پاکستان کے پُرخلوص دور کی یاد تازہ کر دیتا۔ ان میں بڑی وضع داری تھی جس سے ایک دفعہ رشتۂ وفا استوار ہوا، انہوں نے زندگی بھر نبھایا۔ وہ اقتدار کے عروج و زوال کی پرواہ نہ کرتے تھے۔ مرزا عبدالحمید مرحوم سے انہیں بڑی محبت و عقیدت تھی۔ مرزا صاحب مرحوم تحریکِ پاکستان کے نامور راہنما تھے۔ اُن کا لاہور میں طوطی بولتا تھا۔ مرزا صاحب کا لاہور میں ایک ایسا وقت بھی آیا کہ وہ تنہا رہ گئے۔ راہِ محبت میں وہ اپنے رفیق خود تھے۔ اگر کوئی ان کا ساتھی تھا تو چوہدری حبیب احمد تھے جو ہمیشہ اُن کے ساتھ رہے اور ان کے پائے ثبات میں کبھی لغزش نہ آئی۔ چوہدری حبیب احمد پاکستان کے چمن کا ایسا پھول تھا جس نے اپنی خوشبو سے پاکستان کو معطر کر رکھا تھا۔ رضوان کو اس پھول کی ادا پسند آئی اور اُس نے باغِ جنت کیلئے چن لیا[1]

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

تحریکِ پاکستان کے صفِ اوّل کے مجاہد اور ساتھی حافظ نذر احمد صاحب شبلی کالج ۵۔ علامہ اقبال روڈ لاہور قلم کو یوں حرکت میں لاتے ہیں کہ :-

" مرحوم کے ساتھ تعلقات کی ابتدا غالباً ۱۹۳۸ء یا ۱۹۳۹ء میں ہوئی تھی جب کہ وہ لاہور میں تعلیم کے لئے آئے تھے یہ رفاقت برسوں قائم رہی، تحریکِ پاکستان سے قبل اور تحریک کے دوران کامل ہم آہنگی سے شریکِ سفر رہے۔ ان کی صاف گوئی، حق پرستی ایک ایسی منفرد خصوصیت تھی، جو نادر خوبی سے کسی طرح کم نہیں۔ یہ جوہر

---

[1] ۔ ۱۸-۶-۸۰ء

خاص بہت بڑی بات ہے۔

مرحوم کے ساتھ درمیان میں تعلقات سرد پڑ گئے، اس کی وجہ مرحوم مرزا عبدالحمید اوران کی تصنیفات کے بعض حصے تھے۔ شدید فکری اختلاف کے باوصف ہم کبھی ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما نہیں ہوئے ——— ملاقات جب بھی ہوتی اس میں وہی پرانی محبت اور خلوص موجود ہوتا ——— قیام پاکستان کے بعد مرحوم نے ایک طویل عرصہ بڑی ابتلاء اور آزمائش میں گذارا مگر اپنی خوداری اور غیرت پر آنچ نہ آنے دی[1]"

تحریک پاکستان کے مشہور لیڈر اور صحافی ابوسعید انور صاحب کی تحریر پیش خدمت ہے

" آپ کے والد گرامی ان چنیدہ فدایانِ پاکستان میں سے تھے جنہیں اللہ تعالیٰ نے علم وعمل دونوں دولتوں سے نوازا تھا، دردمند دل، عقیدے کی پختگی، عمل کی پاکیزگی اور قدرت بیان یہ سب اللہ کی دی ہوئی دولت ہی تو تھی جو انہیں وافر نصیب ہوئی تھی۔

تحریک پاکستان یا مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے لئے جدوجہد میں ان کی شمولیت محض قائدِ اعظمؒ یا سرکردہ رہنماؤں کا اندھا تتبع نہ تھا وہ اس میدان میں سوچ سمجھ کر کودے تھے اور اس کا ثبوت انہوں نے اپنی بے لوث زندگی میں دیا اور دوسروں کی رہنمائی کے لئے کتابوں کی صورت میں بھی مواد چھوڑ گئے، تاریخ یا تحریک دونوں کے طالب علموں کے لئے ان کی نگارشات بہت قابلِ قدر ورثہ ہیں، ان کی خدمات کو کس طرح گنوایا جائے، بعد از مرگ چند کلمات یا اُلٹی سیدھی لکیریں ان کی عظمت کو بڑھا نہیں سکتیں، ۱۹۴۰ء سے وہ ہر موڑ پر بلاتی ہوئے، ہمسفر رہے، کون کون سے معرکے ہیں جن کے تذکرے کئے جائیں[2]....."

تحریک پاکستان کے ہراول دستے کے سپاہی جناب میاں محمد شفیع (م۔ش) ۲۰ جون ۸۰ء کے "مشرق" میں رقمطراز ہیں کہ:۔

" انہوں نے پاکستان بننے سے پہلے اور پاکستان بننے کے بعد ان لوگوں کیخلاف اپنا جہاد جاری رکھا جنہیں وہ نیشنلسٹ مسلمان سمجھتے تھے۔ انہوں نے نیشنلسٹ مسلمانوں کے رخِ زیبا سے پردہ اٹھانے کیلئے ایک ضخیم کتاب مرتب کی تھی جس میں انہوں نے شرح وبسط سے تاریخی شواہد کے حوالے سے نیشنلسٹ مسلمانوں کے سیاسی کردار کی

---

[1] : ۔ ۹ جولائی ۱۹۸۰ء [2] : ۔ ۲۷ — ۷ — ۸۰ء

نقاب کشائی کی تھی اس ضمن میں انہوں نے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کو بھی معاف نہیں کیا بلکہ ان کی مجھ سے ہمیشہ اس بات پر لڑائی رہی کہ میں نے قیام پاکستان کے بعد نیشنلسٹ مسلمانوں کے متعلق اپنے سابقہ مؤقف میں تبدیلی کیوں کی، ان کا نظریہ یہ تھا کہ جن لوگوں نے قائداعظمؒ کا ساتھ دینے کی بجائے ان کی مخالفت کی بلکہ جنھوں نے قائداعظمؒ کے مخالفوں کا ساتھ دیا وہ پاکستان کے کبھی خیر خواہ نہیں ہوسکتے"

جناب میاں صاحب کے میرے نام ایک خط کا اقتباس بھی ملاحظہ ہو: ۔

" آپ ان کی رقم کردہ کتاب کو زیور طباعت سے آراستہ کرنے کی ضرور سعی کریں۔ وہ فکر و فہم کرنے والے دردمند انسان تھے۔ ان کی سوچ کے نتائج کو تاریخی نقطۂ نگاہ سے محفوظ کرنا ضروری ہے اگر آپ مناسب خیال کریں تو آپ مولینا غلام احمد پرویز سے مشورہ کرلیں۔ مرحوم کو علامہ پرویز سے بہت راہ و رسم تھی[1]

جناب غلام احمد پرویز کی زندگی کا نہایت ہی درخشاں پہلو یہ بھی ہے کہ وہ تحریک قیام پاکستان کے اوّلین قافلہ سالاروں میں سے ہیں۔ انگریز تسلّط کے ایک بہت بڑے افسر ہوتے ہوئے بھی تحریک قیام پاکستان کے قلمی محاذ پر ایک زبردست کردار ادا کیا ہے اور تحریک پاکستان کی مخالفت کے ہر وار کو بڑی سختی سے روکا ہے۔ چوہدری صاحب کے بارے میں ان کے ایک خط کی تحریر پیش خدمت ہے:

" مرحوم تحریک پاکستان کے السابقون الاولون میں سے تھے۔ حصول پاکستان کے بعد زمانۂ تحریک کے اکثر مجاہدین کی سرگرمیاں ماند پڑ گئی تھیں۔ لیکن حبیب مرحوم کے جوش اور حرارت میں ذرہ بھی کمی نہیں آئی تھی۔ پاکستان کے خطۂ زمین کا تحفظ اور اس میں قرآنی نظام کا نفاذ ان کا جزو ایمان بن چکا تھا۔ ان کی کیفیت یہ تھی کہ کوئی تحریک یا اقدام تو ایک طرف، کسی گوشے میں اگر وہ کوئی خفیف سی جنبش بھی محسوس کرتے جو ان کے نزدیک پاکستان کے لئے خطرہ کا موجب ہوسکتی تھی، تو وہ تڑپ اٹھتے تھے بافور اً میرے پاس تشریف لاتے اور یا ٹیلیفون پر مجھے اس سے متنبہ کرتے اور خود شمشیر برہنہ کی طرح اس مدافعت کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے۔ حق گوئی اور بے باکی ان کی اہم خصوصیت تھی۔ جو کچھ دل میں ہوتا لگی لپٹی بغیر دوسرے کے منہ پر کہہ دیتے اور اپنے مؤقف میں کسی قسم کی مفاہمت یا مصالحت کے لئے کبھی آمادہ نہ ہوتے۔

---

[1] : ۔ ۱۰ر جولائی ۸۰ء

قوم کی بدنصیبی ہے کہ ابھی تک تحریکِ پاکستان کی کوئی مستند تاریخ مرتب نہیں
ہوئی۔ اور جو اس کے عینی شاہد ہی نہیں، عملاً ان معرکوں میں شریک تھے وہ ایک
ایک کرکے اٹھتے جارہے ہیں۔ میں محسوس کررہا ہوں کہ اس طرح کچھ عرصہ کے بعد ہماری
نئی نسل کو اتنا بتلانے والا بھی کوئی نہیں ہوگا کہ ہم نے پاکستان کیوں مانگا تھا! مرحوم
ان میں سے تھے جو یہ بتاسکتے تھے۔ ان کی کتاب "تحریکِ پاکستان اور نیشنلسٹ علماء"
بڑی اہم معلومات کا ذخیرہ ہے[1] "

جناب عبداللطیف مسافر نظامی صاحب ریڈیو پاکستان لاہور کے دیہاتی پروگرام میں
"چوہدری صاحب" کے نام سے پورے پاکستان میں جانی پہچانی شخصیت ہیں، ان کے خط کا اقتباس
ملاحظہ ہو:۔

" چوہدری حبیب احمد صاحب تحریکِ پاکستان کے ہراول دستے میں تھے اور
تشکیلِ پاکستان کے بعد درویشانہ انداز میں نظریۂ پاکستان کو سمجھانے اور عام کرنے
میں دن رات مشغول رہے اور اسی دھن میں اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔
محترم چوہدری حبیب احمد صاحب کی خدمات کا نمایاں اور منفرد پہلو یہ ہے
کہ موصوف نے اُن دشمنانِ پاکستان کو جنہوں نے تحریکِ پاکستان کو نازک مراحل پر
اغیار سے ملکر شدید نقصان پہونچایا اور پھر تقسیم کے بعد "بنی اسرائیل کے سامری"
کی طرح بھاگ کر پاکستان آگئے اور کبھی دل سے نظریۂ پاکستان کو تسلیم نہیں کیا
اور نہ ہی مملکتِ پاکستان کو نقصان پہونچانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت کیا، ؛
بے نقاب کرنے کا فرض اپنے ذمہ لیا اور آخری وقت تک کمال وفاداری سے
اس مقدس فرض کو نبھایا۔
خدا رحمت کند این عاشقانِ پاک طینت را[2]۔"

جناب پروفیسر محمد منوّر مرزا رقمطراز ہیں کہ:۔

" مرحوم چوہدری حبیب احمد صاحب نے بڑی معروف زندگی گذاری،
وہ قوم کے مفید اور انتھک فرد تھے۔ تحریکِ پاکستان کے سپاہی تھے اور نظریۂ
پاکستان کے پرجوش علمبردار، قومی معاملات سے فقط دلچسپی ہی نہ رکھتے تھے وہ

---

[1]:۔ ۶ر جولائی ۱۹۸۰ء [2] ۲۹ر جون ۱۹۸۰ء

حسب ہمت قومی مصالح کے امور سے وابستہ بھی رہتے تھے۔ انہوں نے قومی مسائل کے بارے میں خاصہ مطالعہ بہم پہنچایا تھا خصوصاً برعظیم کی اس سیاسی تاریخ کا جو تحریک پاکستان سے کسی طرح کا بھی تعلق رکھتی تھی۔ قائداعظمؒ سے عشق تھا۔ حضرت علامہ اقبالؒ کے پروانے تھے۔[۱]"

جناب پروفیسر افتخار احمد چشتی یوں خامہ فرسائی کرتے ہیں کہ:۔

"حبیب چودھری صاحب اسلام سے اور داعیٔ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے بے پناہ محبت رکھتے تھے۔ قائداعظمؒ اور علامہ اقبالؒ کے عاشق تھے۔ مسلم لیگ اور پاکستان سے قلبی وابستگی تھی۔ محبینِ پاکستان کے خادم تھے مگر مخالفینِ پاکستان و نظریۂ پاکستان کے دشمن۔ صاف گو تھے۔ صاف دل تھے۔ صاف باطن تھے۔ جو اسلام، پاکستان، قائداعظمؒ اور اقبالؒ سے محبت رکھتا تھا اس سے محبت کرتے تھے۔ حق گوئی اور بے باکی ان کے خاص جوہر تھے۔ منافقت قطعاً نہ تھی۔ جو بات دل میں ہوتی زبان پر آجاتی نہ ڈر نہ خوف نہ حرص نہ مصلحت۔ کوئی چیز بھی انہیں سچی بات کہنے سے باز نہ رکھ سکتی تھی ان معنوں میں وہ جواں مرد تھے! ؎

آئینِ جوانمرداں حق گوئی و بیباکی ۔ اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی[۲]"

جناب پروفیسر ڈاکٹر غلام سرور خاں نیازی ایم اے پی ایچ ڈی صدر شعبۂ تاریخ گورنمنٹ کالج فیصل آباد قلمبند کرتے ہیں کہ:۔

"برسوں پہلے کی بات ہے میں یہاں کے گورنمنٹ کالج میں تاریخ کے استاد کی حیثیت سے تعینات ہو کے آیا۔ چند ہی دنوں میں دوستوں کا ایک حلقہ بن گیا۔ جس میں پروفیسر اور وکیل صاحبان شامل تھے کچھ مقامی اذیب اور شاعر بھی تھے۔ اس حلقہ میں ایک نام بار بار آتا رہا وہ نام نامی چوہدری حبیب صاحب کا تھا۔ آخر ایک دن مجلس اقبال کے ایک جلسے میں ان سے ملاقات ہو گئی وہ تو میرے اپنے ہی بزرگ نکلے کیونکہ وہ میرے ماموں امان اللہ خاں ایڈووکیٹ میانوالی کے دوست تھے اور وہ قیامِ پاکستان کے بعد کچھ دن میانوالی میں ان کے پاس رہے تھے۔

ان کے لباس اور مزاج میں درویشی، ان کے علم و مطالعہ میں بہت وسعت

---

[۱] ۲۷ رجون ۱۹۸۲ء [۲] یکم صفر ۱۴۰۲ھ

ان کی سوچ اور باتوں میں بڑی گہرائی اور گیرائی تھی جس نے کہ ان کی شخصیت کو بہت ہی
بلند و بالا بنا دیا تھا ان کے سامنے ایک بالکل واضح مشن تھا اور وہ مشن تھا۔
تحفظ نظریۂ پاکستان۔

پاکستان منصۂ شہود پر آچکا تھا۔ ہندو اور ہندو کے مسلمان
دوست شکست کھا چکے تھے۔ قیام پاکستان کی مخالفت کرنے والے یہ شکست خوردہ مسلمان
سب قائداعظم کے پاکستان میں پناہ کی تلاش میں تھے۔ یہاں ان سے عزت کا سلوک
کیا گیا لیکن ملک میں ان کی مطمئن زندگی بھی ان کے دلوں سے پاکستان دشمنی کے
جراثیم نہ نکال سکی ٹھیک اسی طرح سے جیسے رات کی سردی کے مارے ہوئے بے ضرر
سانپ کو صبح کی میٹھی دھوپ پھر سے سانپ بنا دیتی ہے اور اس کا انعی پن جاگ
اٹھتا ہے تو یہی حال ان پاکستان دشمن حضرات کا تھا۔ انہیں کمین گاہیں میسر آگئی
تھیں اور انہوں نے مختلف محاذوں پر اپنی نیش زنی شروع کر دی۔

اب یہاں کا یہ حال تھا کہ کچھ پکے اور پرانے پاکستانی تو اللہ کو پیارے ہو چکے
تھے، کچھ ہوس واقتدار کا شکار ہو گئے اور کچھ جنگ زرگری میں شامل ہو گئے
جو باقی ماندہ تھے، پاکستان کے دکھ کو بھی سمجھتے تھے اور اس کے دکھوں کا مداوا بھی
جانتے تھے ان میں ایک چوہدری صاحب کی ذات گرامی بھی تھی۔ وہ پاکستان
کے نظریاتی مورچے کے سرخیل تھے۔ ان کے کردار میں بہت خوبیاں تھیں لیکن
نظریۂ پاکستان سے وفاداری ان کے سر کا تاج تھی اور یہ تاج ان کے شفیق اور مسکراتے
چہرے پر خوب سجتا تھا۔"[1]

سید قیصر رضوی گورنمنٹ میونسپل ڈگری کالج فیصل آباد میں انگریزی کے استاد ہیں زندگی کے آخری
دنوں میں ان کے ساتھ کافی رابطہ رہا۔ وفات سے ایک دو دن پہلے ان دونوں کے درمیان بہت
دیر تک تبادلۂ خیالات ہوتا رہا۔ ان کی تحریر ملاحظہ ہو:۔

"حضرت علیؓ کا قول ہے کہ دنیا رہنے کے قابل جگہ تھی جب تک جھوٹ جھوٹ
تھا اور سچ سچ، اور انسان نے سچ میں جھوٹ اور جھوٹ میں سچ کی آمیزش کا فن
نہ سیکھا تھا۔ حبیب احمد چودھری کے زمانہ تک یہ فن خاصا ترقی کر چکا تھا چنانچہ

---

[1] ۔ ۱۴-۱۲-۸۱

مرحوم کی زندگی کا شعوری حصہ جھوٹ کو سچ سے علیحدہ کرنے کی تکلیف دہ جدوجہد میں گزرا۔ انہوں نے جس بات کو صداقت سمجھا وہ اس کی حمایت پورے خلوص اور اپنی تمامتر ذہنی وفکری اور جسمانی توانائیوں کے ساتھ کرتے رہے اور خلوص و توانائی کی ان میں کوئی کمی نہ تھی۔

فکری وعلمی سطح پر ایک سچے مسلمان ہونے کی حیثیت سے انہوں نے نظریۂ و تحریک پاکستان سے وابستگی اختیار کی اور غالب کی شاعرانہ پختگیٔ ایمان کی عملی تفسیر بن کر اس طویل جدوجہد میں شریک رہے۔ نظریہ و تحریک کے مخالفوں کی بھرپور مخالفت کی اور اس میں دیوہیکر شخصیت سے بھی ذرہ برابر مرعوب نہ ہوئے۔
اور پھر اقبالؒ کے خوابوں کا پاکستان قائد اعظمؒ کی معجزانہ صلاحیتوں اور مسلمانوں کی اجتماعی جدوجہد کی بنا پر ایک حقیقت بن گیا۔ آگ اور خون کا دریا عبور کر کے وہ اس پاک سرزمین میں داخل ہوئے وہ بہت خوش تھے لیکن ایک ایسا عمل شروع ہو گیا کہ رہزن رہبر کے بھیس میں ملت کے ساتھ ایک سنگین مذاق کرتے رہے۔ خواب ٹوٹتا رہا، بکھرتا رہا اور پھر سے

منزل انہیں ملی جو شریک سفر نہ تھے،

تاہم نظریہ و تحریک پاکستان کا یہ بے خوف داعی، مورخ اور محقق شکستہ دل ہو کر بھی اپنے منتخب محاذ پر ایک سپاہیانہ عزم کے ساتھ لڑتا رہا اور اس نے "روپ وبہروپ" کا یہ ڈرامہ رچانے والوں کو بے نقاب کرنے کی مہم جاری رکھی ـــ اور یہ عمل زندگی کی آخری سانس تک جاری رہا اور وہ "جنوں کی حکایات خونچکاں" لکھتا ہی رہا ـــ

حبیب احمد چودھری وفات پا گئے، لیکن حبیب احمد زندہ ہیں اور اسوقت تک زندہ رہیں گے جب تک پاکستان زندہ ہے"

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق ❊ ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

جناب عبد المجید سچ جالندھری قیام پاکستان سے ان کے رفیق رہے، فرماتے ہیں کہ :۔
"چودھری صاحب سخت پریشان تھے کہ جن لوگوں نے تحریک پاکستان میں اپنوں

اور بیگانوں کی مخالفت کے باوجود، جن نیک خواہشات، توقعات اور پرخلوص عزم کے ساتھ پاکستان کے لیے جدوجہد کی تھی وہ ثمر نہ پا سکے اور یہاں مخالفینِ تحریکِ پاکستان پہلے سے بھی زیادہ کامیاب و سرفراز ہیں اور کارکنانِ تحریکِ پاکستان رسوا بر سرِ بازار پھر رہے ہیں۔

مرحوم اپنے نظریے سے جس قدر مخلص تھے اس دورِ قحط الرجالی میں شاید ہی کوئی اور ہو"

چودھری سراج الدین ناگرہ صاحب ایڈووکیٹ (فیصل آباد) تحریکِ پاکستان کے اولین مجاہدوں میں بہت نمایاں ہیں اور مرحوم کے ساتھی بھی، یوں گویا ہوتے ہیں کہ:-

"چودھری حبیب احمد نے ساری عمر نظریۂ پاکستان کے لئے کام ہی نہیں کیا بلکہ تمام عمر اسی نظریہ کی نشر و اشاعت میں صرف کر دی۔ حبیب صاحب صحیح پاکستانی تھے اور پاکستان کی بقا اور استحکام ان کی زندگی تھی۔ حبیب صاحب تاریخ کے مطالعہ میں گہری دلچسپی لیتے تھے لیکن مجھے حبیب صاحب نے سب سے زیادہ متاثر اس بات سے کیا ہے کہ وہ کسی بڑی سے بڑی شخصیت کی بھی پرواہ نہیں کرتے تھے اگر اس شخصیت نے کبھی پاکستان کی تحریک یا پاکستان کی مخالفت کی ہو"

جناب حکیم محمد موسیٰ امرتسری ۵۵ ریلوے روڈ لاہور اپنے ۲۰ اگست ۱۹۸۰ء کے خط میں تحریر فرماتے ہیں کہ:-

"جناب چوہدری حبیب احمد مرحوم نظریہ پاکستان اور مملکتِ خداداد پاکستان کے نہ صرف سچے وفادار، بلکہ نظریۂ پاکستان کی حقانیت کے عظیم مبلغ اور زبردست منادی بھی تھے، نیز معاندین و مخالفین پاکستان کو بھی خوب پہچانتے تھے"

جناب علامہ اقبال احمد فاروقی مکتبہ نبویہ گنج بخش روڈ لاہور فرماتے ہیں کہ:-

"وہ ایک نیکدل دوست، راسخ العقیدہ مسلمان اور محبتِ رسولؐ میں سرشار تھے اور اپنے سیاسی نظریات میں صاف ذہن رکھتے تھے --- وہ ایک مجلسی زندگی رکھتے تھے بلکہ اپنی ذات میں خود ایک مجلس تھے، ان کا یوں اٹھ جانا ہم ایسے نیازمندوں کے لیے بے پناہ نقصان ہے جسے ہم کسی دوسری شخصیت سے پورا نہیں کر سکتے۔ وہ وضعداری میں اپنی مثال آپ تھے۔ انہیں نظریۂ پاکستان سے جو لگاؤ تھا وہ

عشق کی حد تک تھا ۔ قائداعظمؒ اور نظریۂ پاکستان کے خلاف ایک لفظ سننا بھی گوارا نہ کرتے تھے ، انہوں نے نیشنلسٹ علماء کو عمر بھر معاف نہیں کیا اور وہ اس سلسلہ میں ایک تاریخی کام کر گئے ، اللہ تعالیٰ انہیں غریق رحمت کرے ، انہیں آقائے دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو محبت تھی وہ ان کی بخشش اور ان کے حق میں شفاعت رسول صلعم کی ضمانت ہے [1]

جناب ناسخ سیفی مدیر مسئول روزنامہ "سعادت" فیصل آباد اپنے ۷ رجولائی ۸۰ء کے شمارے کے صفحہ اول پر تحریر فرماتے ہیں کہ :۔

"چوہدری حبیب احمد اپنے دوستوں میں نظریۂ پاکستان کے نام سے پہچانے جاتے تھے ، زندگی کے آخری لمحات تک نظریۂ پاکستان کے فروغ اور نفاذ کے لئے سرگرم عمل رہے ، چوہدری حبیب احمد کو سیاسی طور حضرت قائداعظمؒ ، علامہ اقبالؒ اور مسلم لیگ سے بے پناہ عقیدت تھی ۔

چوہدری حبیب احمد کی زندگی جہاں تحریک پاکستان کے کارکنوں کیلئے مثالی ہے وہاں ارباب اختیار کے لئے بھی یہ درس رکھتی ہے کہ وہ استحکام پاکستان کیلئے تحریک پاکستان کا جذبہ رکھنے والے جوانوں اور افسروں کو ڈھونڈنے کی کوشش کرے ۔ پاکستان کے استحکام اور ترقی کا باعث وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو اپنے فرائض کو عبادت تصور کر کے انجام دیں [2]"

چوہدری رشید احمد مسلم کمرشل بنک لمیٹڈ فیصل آباد کے اسسٹنٹ وائس پریذیڈنٹ ہیں اور پیپلز کالونی کی پائیلٹ گراؤنڈ کے سیر کے ساتھی ، ان کے تاثرات بھی ملاحظہ ہوں ۔

"میں مرحوم کو عرصہ دس سال سے جانتا ہوں ہم چند دوست ملکر روزانہ صبح سیر کیا کرتے تھے وہ بڑی پابندی سے سیر کو آتے لیکن ہم سے کوئی نہ کوئی ناغہ کر لیتا وہ اگلے دن جواب طلبی کرتے اور بغیر معقول وجہ کے ناغہ کرنے والے کو میٹھی سی ڈانٹ ڈپٹ کرتے ۔ دوران سیر حالات حاضرہ پر ، ملکی سیاست اور اہم بین الاقوامی حالات پر تبصرہ کرتے اور نہایت صائب رائے رکھتے ۔ ایک بات ان کو ہر وقت فکر مند رکھتی اور وہ "نظریۂ پاکستان" تھا ۔ ہر وقت یہ فکر دامنگیر رہتی کہ ملک

---

[1] : مکتوب ۲۲ جون ۸۰ء اور روزنامہ سعادت فیصل آباد ۷ رجولائی ۸۰ء صفحہ ۳

[2] : خدا تعالیٰ کا شکر ہے کہ موجودہ حکومت اس کے لئے دن رات کوشاں ہے ۔

لوگ آہستہ آہستہ چلتے جا رہے ہیں۔

پرانے وقتوں کی باتیں کر کے ہمیں یاد دلاتے کہ کس طرح انہوں نے دوسرے احباب سے ملکر پاکستان کے لئے رات دن کام کیا۔ مرحوم بڑے خوش مزاج انسان تھے۔ سادہ لباس پہنتے اور سادہ خوراک کھاتے اور دوسروں کو ہمیشہ سادہ زندگی بسر کرنے کی تلقین کرتے۔ وقت کے بڑے پابند تھے۔ گھر جانے کا اتفاق ہوتا تو کبھی بغیر تواضع کے اٹھنے نہ دیتے غرضیکہ مرنجان مرنج انسان تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کو غریق رحمت کرے اور ان کے درجات بلند فرما دیں (آمین)"[1]

میں خود تو کیا تحریر کروں گا چند ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں ان کی شخصیت کی عکاسی کی کوشش کرتا ہوں۔

ہوشیار پور کا یہ اعزاز کہ اس کے دو مایۂ ناز فرزند جن میں سے چودھری رحمت علیؒ نے ہمیں "پاکستان" کا لفظ عطا کیا اور چودھری حبیب احمدؒ نے پاکستان کے ذرہ ذرہ کو "نظریۂ پاکستان" کی اصطلاح اور لفظ سے معمور و آشنا کر دیا۔ یہی شرف فیصل آباد کو بھی حاصل ہے کہ دونوں محسن شخصیتیں اس ہی ضلع کی متعلقین اور مکین تھیں[2]

بعض اوقات کسی شخص میں اسقدر خوبیاں ہوتی ہیں کہ اس کے اوصاف غلو معلوم ہوتے ہیں لیکن اس شخصیت کی درست تصویر پیش کرنا بھی بے انصافی ہی ہے۔ ذہن ادیب کا ہو، گفتگو مصلح کی، عمل سپاہی کا ہو، نظر مفکر کی، طرز فکر تعمیری ہو، سوچ مدبر کی، ملت کیلئے مضطرب ہو، ملک کیلئے متفکر، شرافت میں مثال ہو، دیانت میں مسلّم، ہر قدم اٹھانے سے پہلے غور و فکر کا عادی ہو اور پھر طوفانوں کی شدت کا غرور توڑ کر آگے بڑھنے والا مجاہد، تحریک پاکستان کی صف اوّل کا سپاہی ہو اور ملک کا دیانتدار ہمدرد، نہ صرف نظریۂ پاکستان کا داعی ہو بلکہ اس ملک میں اس اصطلاح کا نقیب اوّل، یہ پیکر چودھری حبیب احمد ہی کے وجود کا غماز ہے۔

چودھری حبیب احمدؒ یہ احساس دامن میں لئے خالق حقیقی سے جا ملے کہ!۔

بادہ گراں عجم وہ عربی میری شراب
میرے ساغر سے جھجکتے ہیں مے آشام ابھی!

---

[1] : ۵ دسمبر ۱۹۸۱ء [2] : چودھری رحمت علیؒ کے بھائی اور اہل خاندان دھاندرہ ۶۶ / ج ب تحصیل فیصل آباد میں رہائش پذیر ہیں۔ چودھری حبیب احمدؒ کی شہری جائداد فیصل آباد شہر اور زمین ۲۸۶ / ج ب تحصیل ٹوبہ ٹیک سنگھ ضلع فیصل آباد میں ہے۔

مقالِ کمال

سب سے پہلے میں خدائے بزرگ و برتر کا شکر ادا کرتا ہوں کہ جس نے اپنے فضل و کرم سے مجھے یہ توفیق بخشی اور میں اس قابل ہوا کہ اپنے اس فرض سے عہدہ برآء ہو سکوں جو مجھ پہ ملک و ملّت اور اپنے والدِ محترم کی طرف سے عائد ہوتا ہے۔

اس کے بعد میں اُن تمام بزرگوں، ساتھیوں اور دوستوں کا نہایت ہی ممنون ہوں جنہوں نے مجھے والد محترم کے حالاتِ زندگی مرتب کرنے میں اطلاعات و تاثرات بہم پہنچائے۔

تمام اہل خانہ اور خصوصاً والدہ محترمہ کا بے حد شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اس کتاب کی طباعت میں میری مدد کی اور والد محترم کی زندگی کے بعض خاص واقعات سے آگاہی دی۔

——— رفیق احمد